علم الانسان ما لم یعلم

۱۳۳۹

کتبخانہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی

شعبہ ۰۵۱

شمارہ ۷۷ ن

عدد داخلہ ۱۳۶۱۷



تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

نگارستان
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت عـہ

گہوارۂ تمدن
مولانا نیاز کی وہ معرکتہ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا کی تہذیب شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول [illegible]

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اس کی انشاء عالیہ تعریف سے مستغنی ہے قیمت علاوہ محصول عـہ

فراست الید
مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص باسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر [illegible] شخص کی [illegible] صحت و بیماری [illegible] کے متعلق صحیح پیشینگوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عـہ

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نقشہ کش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود [illegible] انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسرا [illegible] نہیں [illegible]۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے [illegible] یہ پہلی کتاب [illegible] موضوع پر [illegible] قیمت [illegible] محصول

صحابیات
جس میں عہد سعادت کی ۵۸ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دیئے گئے ہیں اس کا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں سیر الصحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول عـہ

نقاب اٹھ جانے کے بعد
تین افسانوں کا مجموعہ جن میں بتایا گیا ہے کہ آزردہ نہیں جو جھکتی ہے سونا نہیں [illegible] زبان و بلاغت انشاء و تخیل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت ۵ علاوہ محصول۔

مذاکرات نیاز
یعنی حضرت نیاز کی [illegible] جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۲ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم
اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں
۱۔ حیات فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ
۲۔ مادیین کا مذہب
۳۔ حرکت کے کرشمے
نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عـہ علاوہ محصول

تاریخ الدولتین
جرجی زیدان کے تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے قیمت عـہ علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ
مصطفیٰ کامل پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کے سیاسیات میں ہلچل ڈال دی تھی اور جس نے سب سے پہلے ترکی و مصر، عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونکی قیمت عـہ علاوہ محصول

تذکرۂ خندۂ گل
مولفہ عبد الباری آسی جس میں ۳۰۰ صفحات سے زائد اردو و فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت مع محصول عـہ

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں

مثنوی لالہ رخ
طامس مور کی معرکتہ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت مع محصول عـہ

مثنوی زہر عشق
مرتبہ عنبوری گورکھپوری جس میں ملک کے چند بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ایک تصویر رنگین ہے عـہ

فراست التحریر مکمل
یعنی اردو اور انگریزی کا رسم خط اور طرز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۸ علاوہ محصول۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا۔
سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۲ | فہرست مضامین ماہ جولائی ۱۹۳۲ء | شمارہ ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز۔ فتحپوری

شمار ۱	جولائی سنہ ۳۲ء	جلد ۲۲

ملاحظات

بہ سلسلۂ

"عبدالماجد دریابادی بے نقاب"

گزشتہ ماہ کے نگار میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ رسول اللہ صلعم کے واقعات طلاق پر جنھیں عبدالماجد دریابادی نے سنداً پیش کرکے اپنے فعل طلاق کو جائز و مناسب قرار دیا ہے، بحث کریں گے، چنانچہ اس ماہ کے ملاحظات پھر اسی مسئلہ کے لئے وقف کئے جاتے ہیں۔

عبدالماجد دریابادی نے اپنے خطوط و مضامین میں تحریر کیا ہے کہ "رسول اللہ نے جناب سودہ و جناب حفصہ کو طلاق دینے کے بعد رجعت فرمالی اور عمرہ بنت یزید و اسماء بنت نعمان کو طلاق دی اور واپس نہیں لی"

عبدالماجد نے اس بیان سے گویا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ نے بارہا طلاقیں دی ہیں

اور اس لئے اگر کوئی مسلمان رسول اللہ کے تتبع میں نکاح کر کر کے طلاقیں دیتا رہے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ چونکہ عبد الماجد کا یہ استدلال رسول اللہ کے اخلاق گرامی پر ایک سخت حملہ کی حد تک پہونچتا ہے اور بہ الفاظ دیگر گویا غیر مسلمین کے اس الزام کی تائید ہے کہ رسول اللہ کی کثرت ازدواج خواہش نفسانی کی بنا پر تھی اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے واقعات طلاق پر روایتاً و درایتاً دونوں طرح نگاہ ڈالی جائے اور دیکھا جائے کہ کیا واقعی رسول اللہ کا اخلاق ویسا ہی تھا جیسا عبد الماجد کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے یا حقیقت اس کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم جناب سودہ کے واقعۂ نکاح و طلاق سے بحث کرتے ہیں۔

(۱) جناب سودہ سب سے پہلے اسلام لانے والی خواتین میں سے تھیں اور آپ کا پہلا نکاح سکران بن عمرو سے ہوا تھا۔ جب آپ معہ اپنے شوہر کے اسلام لے آئیں تو مشرکین مکہ نے سخت اذیتیں پہونچانا شروع کیں اور آپ اپنے شوہر کو ساتھ لیکر حبش کی طرف ہجرت کر گئیں۔

ہجرت نبوی سے تین سال قبل آپ پھر مکہ واپس آئیں اور چند دن بعد آپ کے شوہر جنھوں نے حبش جاکر عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا، انتقال کر گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب جناب خدیجہ کا انتقال ہو چکا تھا اور اس وقت تک کوئی اور نکاح رسول اللہ نے نہ کیا تھا۔ آپ کی عمر ۵۰ سال کی ہو چکی تھی اور جناب سودہ آپ سے غالباً کچھ بڑی ہونگی۔ بعثت کے بعد صرف دس سال کی مدت گزری تھی، کفار مکہ مسلمانوں کی مختصر جماعت کو ہر طرح کی اذیتیں پہونچا رہے تھے اور آپ کا کوئی لمحہ اس فکر سے خالی نہ گزرتا تھا کہ متبعین اسلام کو کیونکر ان مصائب سے نجات دلائیں۔ اور کس طرح ان کی ہمدردی کریں، پھر چونکہ جناب سودہ اسلام لانے کے لحاظ سے سابقون الاولون میں داخل تھیں اور جلا وطنی، خانماں بربادی کے علاوہ ہر طرح کی مالی و بدنی تکالیف برداشت کر چکی تھیں اس لئے سخت ضرورت تھی کہ عالم بیوگی میں انکی مدد کیجائے اور اس کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہ ہو سکتا تھا کہ آپ اُن کو حبالۂ عقد میں لے آتے۔ چنانچہ آپ نے اُن سے نکاح کر لیا۔

اب اس کے ساتھ ہی ان وجوہ پر بھی غور کر لیجئے جن کی بنا پر رسول اللہ کا آپ کو طلاق دینا یا طلاق دینے کا ارادہ کرنا بتایا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ۸ھ ہجری میں (یعنی نکاح کے تقریباً گیارہ سال بعد) رسول اللہ نے جناب سودہ کو طلاق دی یا دینا چاہی اس بنا پر کہ آپ بہت ضعیف ہو گئی تھیں اور جسم میں غیر معمولی فربہی پیدا ہو گئی تھی، لیکن جب آپ نے اپنی باری کا دن جناب عائشہ کے حق میں چھوڑ دیا تو رسول اللہ نے طلاق واپس لے لی یا طلاق کے ارادہ سے باز آ گئے اور یہ آیت نازل ہوئی:۔

وان امرأة خافت من بعلها نشوزا او اعراضا فلا جناح عليهما ان يصلحا بينهما صلحا والصلح خير

(یعنی اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے علیحدگی و بے پروائی کا اندیشہ پیدا ہو تو کوئی حرج نہیں اگر آپس میں صلح کرلیں کیونکہ ملاپ بہرحال بہتر ہے)

اگر ہم اس بیان کو صحیح باور کرلیں تو لامحالہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ رسول اللہ نے صرف اس لئے آپ کو طلاق دینی چاہی کہ آپ زیادہ ضعیف ہوگئی تھیں اور آپ یہ چاہتے تھے کہ جو دن ان کے پاس بسر ہوتا ہے وہ جناب عائشہ کے پاس بسر ہو جو زیادہ کمسن و محبوب بیوی تھیں۔

پھر کون ہے وہ شخص جو درایتاً ایک لمحہ کے لئے اس کی صحت پر یقین لا سکتا ہے اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ رسول اللہ نے ایک ایسی خاتون کو جو سب سے پہلے اسلام لائی ہوں، جنھوں نے اسلام کے لئے ایسی ایسی سختیاں برداشت کی ہوں اور ضعیفی و بیکسی کے عالم میں جن کی سرپرستی آپ نے قبول فرمائی ہو، ان کو محض بڑھاپے کے عذر پر یا صرف اس غرض سے کہ دوسری کمسن بیوی کے پاس آپ کو زیادہ وقت صرف کرنے کو ملے، طلاق دیدی ہو یا طلاق دینے کا ارادہ کیا ہو ایک معمولی انسان بھی ایسی حرکت نہیں کرسکتا چہ جائیکہ ذات نبوی جو یکسر ایثار و قربانی، از سرتا پا رحم و کرم اور ہمدردی و الفت تھی۔

جناب خدیجہ سے جس وقت آپ نے نکاح کیا آپ کی عمر ۲۵ سال اور جناب خدیجہ کی ۴۰ سال تھی، لیکن اس وقت آپ نے عمر کی اس تفاوت کا خیال نہ کیا درآنحالیکہ آپ کا عنفوان شباب تھا۔ لیکن جب آپ کی عمر ۶۰ سال کی ہو جاتی ہے تو آپ کو ایک اپنی ہمسن بیوی سے بھی نباہ کرنے میں تامل ہونے لگتا ہے!

اگر یہ صحیح ہے، تو اس کے معنے صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ چونکہ جناب خدیجہ کے ساتھ نکاح ہونے کے وقت آپ بالکل بے یار و مددگار تھے اس لئے کچھ نہ بولے اور جب ہجرت کے بعد آپ کا اقتدار بڑھ گیا تو طبیعت میں رنگینی پیدا ہوگئی کہ دس سال کی رفیق حیات کو صرف اس لئے چھوڑ دینا چاہا کہ وہ آپ کی ہمسن تھیں اور دوسری بیوی زیادہ کمسن مل گئی تھیں! (نعوذ باللہ)

اگر ایک نبی کے اخلاق یہی ہو سکتے ہیں، اگر ایک رسول کی سیرت اسی طرح کی ہوا کرتی ہے اور اگر محض روایات کی بنا پر بغیر درایت کو استعمال کئے ہوئے رسول کی ذات گرامی سے ایسے افعال کو منسوب کرنا جائز ہو سکتا ہے تو کیوں ان غیر مسلمین کے اعتراضات پر ہمارے علمائے کرام چراغ پا ہوتے ہیں۔ جنھوں نے خود مسلمانوں ہی کے مذہبی روایات سے اعتراض کا تمام مواد فراہم کیا ہے۔

کس قدر افسوسناک امر ہے کہ ہم روایات کی بناء پر رسول اللہ کی سیرۃ متعین کرتے ہیں لیکن اصول اخلاق متعین کرکے ان روایات کی جانچ نہیں کرتے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اہل عرب میں جہاں اور بہت سی معاشرتی تنگ نظریاں پائی جاتی تھیں وہیں

ایک تنگ نظری یہ بھی تھی کہ جب عورت ضعیف و ناکارہ ہو جاتی تھی تو اُسے طلاق دیدیتے تھے، اس لئے جناب سودہ کو خود ہی اپنے دل میں کبھی کبھی یہ اندیشہ پیدا ہو جاتا تھا کہ مبادا رسول اللہ بھی ایسا ہی کریں، اس لئے آپ نے بطور دفع دخل پہلے ہی سے اپنی باری کا دن حضرت عائشہ کے حق میں تفویض کر دیا، درانحالیکہ رسول اللہ کے ذہن میں بھی کبھی یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا اور نہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایسی مخیرہ اور دس سال کی رفیق حیات بیوی کو بغیر کسی معقول وجہ کے چھوڑ دیں۔ چنانچہ بخاری کے اکیسویں جزو میں جو روایت مالک بن اسمٰعیل سے نقل کی گئی ہے، اس میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ رسول اللہ نے طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اسکے الفاظ یہ ہیں :۔

ان سودۃ بنت زمعۃ وھبت یومھا لعائشہ وکان النبی صلعم تقسیم لعائشہ بیومھا ویوم سودۃ

(یعنی سودہ بنت زمعہ نے اپنا دن عائشہ کو دیدیا تھا اور رسول اللہ جناب عائشہ کے پاس علاوہ ان کے یوم مقررہ کے سودہ کا دن بھی بسر کیا کرتے تھے)

کلام مجید کی جو آیت پہلے نقل کی گئی ہے اس کے متعلق بھی بعض مفسرین کا خیال یہی ہے کہ وہ عام حکم ہے اور اسکا تعلق جناب سودہ سے نہیں ہے۔

لیکن اگر اس کے بعد بھی عبدالماجد دریابادی یا کسی اور کو اس امر پر اصرار ہے کہ نہیں رسول اللہ نے یقیناً جناب سودہ کو طلاق دی یا طلاق دینے کا ارادہ کیا تو براہ کرم یہ بھی بتایا جائے کہ طلاق کس سبب کی بناء پر دی گئی تھی اگر وہ سبب صرف جناب سودہ کی ضعیفی تھا جیسا کہ یقین کیا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ نکاح کا تعلق صرف شہوانی جذبات سے ہے اور جب کسی کی بیوی ضعیف ہو جائے تو بڑھاپے میں اس کو گھر سے نکال دینا کوئی معیوب بات نہیں۔

کم از کم میں تو قیامت تک اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں۔ اور اگر عبدالماجد اسپر اصرار کر کے رسول اللہ کے اخلاق کی توہین گوارا کر سکتے ہیں تو اُن کو یہ گستاخی مبارک ہو۔

(۲) جناب حفصہ کے متعلق۔ جناب عبدالماجد صاحب دریابادی نہایت ہی فاضلانہ و عالمانہ انداز سے بیچ میں فرماتے ہیں کہ حضور کا حضرت حفصہ کو طلاق دینا اور پھر اُسے واپس لینا ایک مشہور و معلوم واقعہ ہے" درانحالیکہ "یہ مشہور و معلوم" واقعہ کسی ایک معتبر روایت سے بھی ثابت نہیں۔

جناب حفصہ کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم واقعہ وہ ہے جو تحریم کے نام سے موسوم ہے لیکن اس کو طلاق سے کوئی واسطہ نہیں، دوسرا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی بات راز کی رسول اللہ نے جناب حفصہ سے کہی تھی اور تاکید کر دی تھی کہ کسی سے بیان نہ کرنا، لیکن جناب حفصہ نے حضرت عائشہ سے کہدی، اسپر یہ آیت نازل ہوئی

اذا اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثا الخ

اس کے بعد حضرت عائشہ و حضرت حفصہ دونوں نے متفق ہو کر معاملہ کو سلجھانا چاہا تو یہ آیت اُتری :۔

وان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما الخ

اگر اسی واقعہ کو ان آیتوں کی شان نزول باور کر لی جائے تو بھی اس سلسلہ میں کوئی حدیث ایسی نہیں پائی جاتی جس سے جناب حفصہ کی طلاق ثابت ہوتی ہو۔

ایک اور خاص واقعہ ایلا و تخییر کا ہے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ازواج مطہرات نے ایک بار رسول اللہ سے مطالبہ کیا کہ ان کو مصارف کے لئے مال غنیمت میں سے کچھ اور زیادہ دیا جائے، ان اصرار کرنے والیوں میں جناب عائشہ و جناب حفصہ بھی تھیں اتفاق سے اسی زمانہ میں آنحضرت کے پاؤں میں موچ آگئی اور آپ نے ایک بالاخانہ میں قیام فرما کر ارادہ کیا کہ ایک ماہ تک کسی بیوی سے نہ ملیں گے۔ منافقین نے مشہور کر دیا کہ رسول اللہ نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی، جب حضرت عمر نے سنا تو آپ گھبرائے ہوئے آئے اور رسول اللہ سے دریافت فرمایا تو آپ نے کہا کہ یہ خبر غلط ہے میں نے کسی کو طلاق نہیں دی۔

جب ۲۹ دن کے بعد رسول اللہ بالاخانہ سے نیچے اترے تو حضرت عائشہ کے پاس آئے اور سورۂ احزاب کی آیت تلاوت فرمائی جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اے نبی اپنی بیویوں سے کہدو کہ اگر دنیاوی راحت مطلوب ہے تو آؤ میں تمکو اچھی طرح رخصت کردوں اور اگر اللہ، رسول و دار آخرت پسند ہے تو تم میں کی نیک عورتوں کے لئے خدا نے بڑا ثواب رکھا ہے (سورۂ احزاب آیت ۲۸-۲۹)

اس سلسلہ میں بھی کسی جگہ طلاق کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ ابن ماجہ میں ایک حدیث حسب ذیل ضرور پائی جاتی ہے :۔

"حدثنا سوید بن سعید وعبد اللہ بن عامر بن زرارۃ ومسروق ابن المرزبان قالوا حدثنا یحیی بن زکریا بن ابی زائدہ عن صالح بن صالح بن حی عن سلمہ بن کہیل عن سعید بن جبیر عن ابن عباس عن عمر بن الخطاب ان رسول اللہ صلعم طلق حفصۃ ثم راجعہا"

اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے جناب حفصہ کو طلاق دی اور واپس لی۔ لیکن اس کے آخری راوی سوید بن سعید کے متعلق خلاصۃ التہذیب میں یہ عبارت پائی جاتی ہے کہ :۔

"ضعفہ ابن المدینی والنسائی وابن عدی وافحش ابن معین فکذبہ"

اور ایک اور درمیانی راوی، سلمہ بن کہیل جس طبقہ سے متعلق تھے ظاہر ہے اور اس لئے حضرت عمر کی صاحبزادی کے متعلق ان کی کوئی روایت اصول حدیث کے رو سے قابل تسلیم نہیں ہو سکتی۔

پھر جب یہ روایت کسی معتبر کتاب حدیث میں نہیں پائی جاتی اور ابن ماجہ میں بھی اس صورت سے پائی جاتی ہے

لہ صحیح بخاری میں انس بن مالک کی روایت ہے کہ۔ آلی رسول اللہ صلعم من نساءہ وکانت انفکت رجلہ (پاؤں میں موچ آگئی تھی) فاقام فی مشربۃ

کہ اس کے بعض راوی مجروح وغیر ثقہ ہیں تو میں حیران ہوں کہ حضرت حفصہ کے واقعۂ طلاق کو "مشہور و معلوم" واقعہ کہنا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔اور عبدالماجد دریابادی نے کس وثوق پر ایسا لکھدیا۔کیا صرف اس لئے کہ انھیں اپنے واقعۂ طلاق کے لئے کوئی نہ کوئی سند پیش کرنا لازم تھا۔

(۳) عمرہ بنت یزید و اسماء بنت نعمان کو طلاق دینا بیشک ثابت ہوتا ہے، لیکن ان دونوں بیویوں کو آپ نے مباشرت سے قبل طلاق دیدی تھی۔یعنی عملی طور سے رشتۂ نکاح وابستہ نہ ہوا تھا کہ اُن کو علیحدہ کر دیا گیا۔علاوہ اس کے طلاق دینے کے کھلے اسباب موجود تھے۔کیونکہ عمرہ بنت یزید کے سفید داغ بعد کو ظاہر ہوئے اور اسماء بنت نعمان نے خود ہی مباشرت کو پسند نہ کر کے خدا سے پناہ مانگی۔

چنانچہ تاریخ الخمیس میں عمرہ بنت یزید کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

"فرای بہا بیاضا فقال دلستم علی فرقھا"

یعنی اُس کے سفید داغ دیکھے گئے پس رسول اللہ نے فرمایا تم نے دھوکا دیا اور اس کو واپس کر دیا اور اسماء بنت نعمان کے متعلق بخاری میں یہ حدیث موجود ہے :۔

"لما دخلت علی رسول اللہ صلعم ودنا منہا فقالت اعوذ باللہ منک فقال صلعم لقد عذت بعظیم الحقی باہلک"

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسماء نے خدا سے پناہ مانگ کر گویا خود ہی علیحدگی چاہی تھی۔اور سورۂ بقر کی حسب ذیل آیت اسی سلسلہ میں نازل ہوئی تھی :۔

لاجناح علیکم ان طلقتم النساء مالم تمسوھن (کوئی حرج نہیں اگر ہاتھ لگانے سے پہلے تم نے طلاق دی)

اسی آیت سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ خلوت کے بعد طلاق دینے میں حرج ہے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے غالباً یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ جناب سودہ حفصہ کی طلاق تو کسی طرح ثابت نہیں ہوتی لیکن اسماء اور عمرہ کو آپ نے ضرور طلاق دی مگر خلوت سے قبل اور ایسے اسباب کی بناء پر کہ سوائے طلاق کے کوئی اور چارہ نہ تھا۔اسلئے عبدالماجد دریابادی کا اپنے فعل طلاق کی توجیہ میں ان مثالوں کو پیش کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

اب رہا یہ امر کہ نفس فعل طلاق کیا حیثیت رکھتا ہے سو اس کے متعلق کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جس طرح بعض صورتوں میں طلاق معصیت کی حد تک پہونچ جاتی ہے، اسی طرح بعض صورتوں میں وہ ضروری بھی ہو جاتی ہے بشرطیکہ اسباب نہایت قوی ہوں اور صرف مردانہ زبردستی سے کام نہ لیا جائے۔

یقیناً عبدالماجد دریابادی کا واقعۂ نکاح و طلاق دنیا یا دین کا کوئی ایسا اہم واقعہ یا مسئلہ نہ تھا کہ اسپر توجہ

کی جاتی، لیکن چونکہ اُنھوں نے اپنے فعل طلاق کو ایسی رکیک تاویلوں سے درست و جائز ثابت کرنا چاہا ہے جنسے نہ صرف اخلاق اسلامی بلکہ خود ذات رسالتمآب پر نکتہ چینی کا موقعہ لوگوں کو ملتا ہے، اس لئے ضرور تھا کہ تمام واقعات وحالات پر روشنی ڈالی جاتی اور دنیا کو بتایا جاتا کہ عبد الماجد کے اس فعل کو اباحت وجواز سے کوئی تعلق نہیں ہے جو طلاق کے باب میں اسلام نے بتائی ہے اور عبد الماجد کا یہ فعل خود اُنھیں کی ذاتی اخلاق کا نتیجہ تھا جسے تعلیمات نبوی سے کوئی واسطہ نہیں۔

شادی سے قبل جو تحریریں خاتون کے مانوس کرنے کے لئے اُنھوں نے روانہ کی ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہی کوئی شخص ایثار وصداقت کی ایسی مثالیں پیش کر سکے جیسی اس "بیتاب نکاح" کی طرف سے ظاہر ہو رہی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی غیر اختیارانہ افتادِ مزاج کو بھی قابو میں رکھنے کا حتمی وعدہ کر لیتا ہے[1]، لیکن جب ان تمام ترکیبوں سے وہ صرف اکیاون روپیہ کی ادائی نہیں بلکہ صرف وعدۂ ادائی سے مواصلت کا ارزاں سودا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اُسے خاتون کا اپنے پاس رکھنا بھی گوارا نہیں ہوتا ان کی خط وکتابت بھی ناگوار ہوتی ہے اور آخر کار طلاق دیکر بے مروتی وناآشنائی، بیدردی وشقاوت کو اس حد تک پہونچا دیتا ہے کہ غریب مطلقہ سے اس حقیر وذلیل رقم کی رسید طلب کرتا ہے اور وہ بھی روپیہ ادا کرنے سے قبل! ممکن ہے قرض دینے والے آغاؤں کے یہاں یہ دستور ہو، سود خور بقالوں اور مہاجنوں کے یہاں یہ قاعدہ جاری ہو، حکومت برطانیہ کے دفاتر میں یہ طریق عمل نظر آتا ہو، لیکن شرع اسلام نے تو روپیہ کی ادائی سے قبل رسید کو کبھی جائز قرار نہیں دیا۔ ممکن ہے یہ شخص اپنی اس حرکت کو بھی رسول اللہ یا صحابۂ کرام کی مقدس سیرتوں میں ڈھونڈھ نکالے اور کوئی حدیث یا قول اس کے جواز میں پیش کر دے ——

ہم یہ نہیں کہتے کہ عبد الماجد کا فعل طلاق، محض طلاق ہونے کے لحاظ سے کوئی فعل مکروہ تھا۔ یقیناً انکو طلاق دیدینی چاہئے تھی اگر اس کے اسباب موجود تھے، لیکن اس بیدردی وقطع مروت کے کیا معنی کہ نکاح سے قبل کی تمام شیفتگیاں اور بیتابیاں دفعتہً جھڑکیوں، بیزاریوں اور ایذا رسانیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور بجائے اظہار مجبوری وندامت کے، نفس پرستانہ سرکشی کا اظہار ہونے لگتا ہے کیا تعلق نکاح قطع ہونے کے بعد انسانیت واخلاق کا تعلق بھی محو ہو جاتا ہے؟ اور کیا ایک عورت دنیا میں صرف بیوی رہنے کے بعد ہی مرد کی ہمدردی حاصل کر سکتی ہے، اور کیا اسلام نے یہی بتایا ہے کہ جب کسی عورت کو طلاق دیدی جائے تو اُس سے متنفر ہو کر ستانا بھی ضروری ہے۔ (ملاحظہ ہو بقیہ ملاحظات صفحہ ۵۷ سے)

---

[1] نکاح سے قبل خاتون کے بھائی کو عبد الماجد ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میں عقد وہ بھی ہوں لیکن اُن کے (یعنی خاتون کے) ساتھ نہیں کرونگا"

فلکیات کے بعض دلچسپ حقایق

مسلسل

عطارد ہر چند ہم یہ کہنے کے لئے تیار نہیں کہ عطارد میں کسی ذی حیات کا وجود محال ہے - لیکن بعض قوی وجوداس خیال کی تائید میں ضرور موجود ہیں کہ عطارد میں کسی جاندار شے کا وجود سمجھ میں نہیں آتا -

اول تو اس سیارہ کا مدار آفتاب سے اسقدر قریب ہے کہ اس کی سطح پر جو کچھ بھی مادۂ حیات رہا ہوگا - وہ گرمی کی شدت سے جل کر بالکل فنا ہوگیا ہوگا،

پروفیسر ڈیوڈ ٹاڈ لکھتے ہیں کہ " عطارد کا رنگ بالکل چاند کی طرح زرد ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ چاند کی طرح وہ بھی غیر آباد ہے —— مسٹر لوویل کے مشاہدات اور ان نقشوں سے جو انھوں نے سطح عطارد کے متعلق تیار کئے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ عطارد کے خطوط بالکل بے رنگ ہیں - اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اس سیارہ کی روزانہ گردش اور گردش فصلی ایک ہے - یعنی قمر کی طرح عطارد کا بھی صرف نصف حصہ ہمیشہ آفتاب کی شعاعوں کے سامنے رہتا ہے -

ایب مور یو کا خیال ہے کہ کرۂ عطارد کا جو نصف حصہ آفتاب کے سامنے رہتا ہے اس میں اتنی حرارت پائی جاتی ہے - کہ سیسہ اور رانگا منجمد حالت میں وہاں نہیں رہ سکتا - اگر یہ قول صحیح ہے تو ضرور ہے کہ عطارد کا اوسکا ٹمپریچر کم از کم ۲۲۷ درجہ سنٹی ہوگا - کیونکہ سیسہ ہماری زمین پر اسی درجہ کی آنچ سے پگھلتا ہے - پھر چونکہ عطارد میں درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہے اس لئے ظاہر ہے کہ وہاں فاسفورس پوٹاسیم اور سوڈیم بھی نہ ہوں گے کیونکہ یہ تو اس سے بھی کم گرمی میں پگھل جاتے ہیں، اور یہی وہ عناصر ہیں جنھیں لوازم حیات سمجھا جاتا ہے جھیلیں اور دریا تو درکنار ایسے سیارہ کی زمین میں رطوبت تک نہ ہوگی

ڈاکٹر ایبٹ نے کافی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ کرۂ عطارد کا ٹمپریچر ۴۰۵ فارہنیٹ ہے - اگر یہ صحیح ہے تو غور فرمائیے کہ ہماری زمین پر معمولی ہوا کے دباؤ میں ۲۱۲ درجہ فارہنیٹ (یا ۱۰۰ درجہ سنٹی) پر پانی ابلنے لگتا ہے - اس لئے عطارد میں اور زیادہ کم درجہ پر ابلیگا - لہذا تمام پانی جو اس کرہ کی سطح پر رکھا جائے وہ فوراً نہایت گرم بھاپ میں منتقل ہوجائے گا - اس لئے جہاں تک ہم کو شرایط حیات معلوم ہیں سطح عطارد پر کوئی جاندار چیز نہیں رہ سکتی -

لیکن گاریٹ پی سروس ([illegible]) کا خیال ہے کہ " ممکن ہے وہاں ایسے حالات موجود

ہوں جنھیں ہم نہ سمجھ سکتے ہوں اور گرمی کی شدت وہاں کے حالات کے لحاظ سے مناسب ہو۔"
مسٹر سی فنٹر ہیوٹالمن لکھتے ہیں کہ " یہ سمجھنا غلط نہیں کہ اگر قدرت نے ہماری زمین کے علاوہ دیگر سیارگان پر بھی ذوی الارواح پیدا کئے ہیں تو ان کی صورت شکل اور وضع قطع ایسی ہوگی جس کا ہم کو قطعی علم نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ مخلوق ایسی ہو۔ جسے نہ نباتات میں داخل کیا جاسکے نہ حیوانات میں "
گذشتہ ربع صدی میں تمام ماہرین فلکیات کا یہی خیال تھا کہ سیارہ عطارد اپنے محور پر ایک ہی بار گردش کرتا ہے۔ اور ایک ہی بار آفتاب کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن جبل ولسن رصدگاہ میں ایک "حرارتی جفت" (Thermo Couple) کے ذریعہ سے جس میں ایک "مقناطیسی برق پیما" (Galvanometer) بھی نصب کر دیا گیا تھا، جو حالات معلوم ہوئے ہیں، ان سے مندرجۂ بالا نظریہ کی صحت میں کچھ شبہات پیدا ہوگئے ہیں ان تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ کرۂ عطارد سے جو اشعاع نور (Radiation) پیدا ہوتا ہے اس کی تحلیل طیفی (Spectral distribution) قریب قریب چاند کی طرح نظر آتی ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان دونوں اجرام سماوی کا سطحی ٹمپریچر (اشعاع) تقریباً یکساں ہے۔ اسی کے ساتھ اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ کرۂ عطارد کے تاریک حصہ کی طرف سے بھی حرارت و نور پیدا ہوتا ہے اور یہ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ کرۂ عطارد کا زمانۂ تحویل (Rotation) بہت تھوڑا ہے

زہرہ زہرہ کے زمانۂ تحویل کے باب میں ماہرین فلکیات متفق نہیں ہیں۔ بعض کا یہ قول ہے کہ کرۂ زہرہ بھی کرۂ عطارد کی طرح اپنے محور پر آفتاب کے گرد گردش کرتے ہوئے گھومتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس ایک طرف ہمیشہ نور (دن) اور دوسری طرف ہمیشہ ظلمت (رات) رہتی ہے۔
اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت سیارۂ مذکور رزم اور لچک دار حالت میں تھا، اس وقت تمازت آفتاب کی شدت کے باعث اس میں زبردست مدوجزر واقع ہوتا تھا۔ جس سے بہت سی سطح ابھر گئی۔ اور بہت سی .... دب کر رہ گئی، پھر جب ابھری ہوئی سطح نے بطور "بریک" (Brake) کام کیا تو گردش میں سخت رگڑ پیدا ہوئی، جسکے باعث زہرہ کا زمانۂ تحویل رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا۔ یہ امر یقینی ہے کہ زہرہ کا کرۂ ہوائی زیادہ کثیف (Dense) ہے۔ اور جب کسی کرہ کا ایک ہی نصف حصہ ہمیشہ آفتاب کی طرف رہیگا تو گمان غالب ہے کہ ہوا زیادہ گرم شدہ نصف کرہ پر سے بیرونی سرد و تاریک نصف کرہ کی طرف چلے گی۔ اور اپنے ساتھ روشن نصف کرہ کا پانی اور رطوبت لے جاکر کرہ کی سمت تاریک میں برف کی طرح منجمد کر دے گی۔
زہرہ کا مشاہدہ کرتے وقت اکثر دیکھا گیا ہے کہ قرص زہرہ کی غیر روشن سمت میں خفیف سی چمک دکھائی دیتی ہے جس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ وہ جمع شدہ برف کی چمک ہے۔ بعض اوقات زہرہ کے قطبین پر برف کے تودے بھی دیکھے گئے ہیں۔ اور دائرہ نور و ظلمت کے انحنار میں جو بے قاعدگی پائی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زہرہ کی سطح پر بڑے بڑے اونچے

پہاڑ بھی ہیں۔

ڈاکٹر لوویل اور ان کے رفقا نے رصدگاہ لوویل میں زہرہ کا مطالعہ کرکے وہاں وسیع منطقے مشاہدہ کئے ہیں لیکن بہت سے ماہرین فلکیات ان نشانات کو محض خیالی سمجھتے ہیں۔ البتہ ارصاد طیفی سے جو ثبوت حاصل ہوئے ہیں۔ان سے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ زہرہ کا زمانۂ تحویل ۲۲۵ یوم ارضی ہے۔

مشہور و معروف اطالوی ماہر فلکیات ڈاکٹر جی۔ دی۔ شیا پرلی (Selina parrelli ت۔ ا۔ ح) نے اور جس نے کرۂ مریخ کی سطح پر "نہریں" معلوم کی تھیں۔ سب سے پہلے یہ بیان کیا کہ سیارۂ زہرہ کا ہمیشہ ایک ہی رخ آفتاب کے سامنے رہتا ہے۔ اسی وقت سے تمام ماہرین فلکیات اس مسئلہ پر مختلف رہے ہیں کہ اس کا زمانۂ تحویل طویل ہے یا قلیل سنہ ۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر ڈبلو۔ اسچ پکرنگ ہارورڈ یونیورسٹی نے جزیرہ جمیکا کی صاف اور مستقل فضا میں، جو خط استواء کے قریب ہے، جب زہرہ کا مشاہدہ فرمایا تو انھوں نے ایک جدید اور حیرت انگیز توجیہہ پیش کی یعنی یہ کہ زہرہ کا زمانہ تحویل ۶۸ گھنٹے ہے۔ اور اس کا محور تحویل اس کے فلک کی سطح میں واقع ہے یعنی صرف چار یا پانچ درجہ کا زاویہ بناتا ہے۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو وہاں کی آب و ہوا نہایت خوشگوار ہوگی۔ نہ گرمی ہوگی نہ سردی۔ اگرچہ قرب آفتاب کے باعث نظری طور پر اس کا اوسط ٹمپریچر ۵۰ ادرجہ فارنہیٹ بمقابلہ ۶۰ درجہ فارنہیٹ ہماری زمین کے ہوگا۔ لیکن چونکہ اس کا ہوائی لفافہ زیادہ کثیف ہے اس لئے کرۂ زہرہ تمازت آفتاب کی شدت سے محفوظ رہتا ہے۔ اور اس طرح اس کا ٹمپریچر صرف ۶۸ درجہ فارنہیٹ رہ جاتا ہے۔

اگر زہرہ کا خط محور واقعی اس کے فلک کی سطح میں عمودی طور پر واقع ہوا ہے۔ تو ہماری زمین کے خلاف وہاں کے باشندے تغیرات فصلی سے واقف ہی نہ ہوں گے، سال بھر یکساں حالت رہتی ہوگی۔ اور ہر منطقہ کی آب و ہوا میں بلحاظ عرض البلد فرق ہوگا۔ اور اگر وہاں کا نظام معاشرت و مدنیت زمین جیسا ہوگا تو لوگ زیادہ تر قطبین کی طرف رہنا پسند کرتے ہوں گے کیونکہ باوجود کثافت ہوا بھی ممالک خط استوا میں رہنا غیر قابل برداشت ہوگا۔ اگرچہ عادی ہونے کے باعث ممکن ہے لوگ ان استوائے ممالک میں بھی رہتے ہوں۔

چونکہ کرۂ زہرہ کا ہوائی لفافہ بہت زیادہ کثیف ہے۔ اور وہاں زیادہ تر ابر چھایا رہتا ہے۔ اس لئے ہمارے لیے اس کی سطح کا مشاہدہ سخت دشوار ہوگیا ہے۔ اور اس کے زمانۂ تحویل کے متعلق کوئی خاص نظریہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔

مسٹر سروس (د س ت ر ، ہ ت ی) فرماتے ہیں کہ " اگر زہرہ اپنے چہرۂ زیبا سے تھوڑی دیر کے لئے وہ عجیب و غریب نقاب ہٹا دے جو ہر وقت اس کے روئے روشن پر پڑا رہتا ہے تو وہ تمام نظام شمسی کے اندر یقیناً سب سے زیادہ دلچسپ سیارہ نظر آئے۔"

ڈاکٹر سی جی ایبٹ کا خیال ہے کہ " بقائے حیات کے لئے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ وہ سب زہرہ

میں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ اس سیارہ کی زبردست انعکاسی قوت یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ زیادہ تر پردۂ سحاب میں روپوش رہتا ہے
جس سے غالباً وہاں کا ٹمپریچر بالکل ہماری زمین جیسا ہوگا۔

چنانچہ ڈاکٹر ایبٹ بھی کہتے ہیں کہ اس سیارہ کی زبردست انعکاسی قوت جو ۹۰ فیصدی کے قریب ہے بادلوں کے وجود کے وجود کی متقاضی ہے، اور یہ بادل بجز پانی اور کسی مادہ کے بشکل ہو سکتے ہیں۔ اگر زہرہ کی تحویل کا زمانہ اس کی آفتاب کے گرد گردش کے زمانہ کی برابر ہوتا تو گرم طرف کا تمام پانی بھاپ بنکر اڑ جاتا۔ اور سرد جانب آجمتا۔ اور بایں صورت تمام چادر سحابی غائب ہو جاتی۔

بعض لوگوں نے مشاہدہ کرکے بیان کیا ہے کہ زہرہ کی بعض سطحی خصوصیات غائب ہوکر پھر ۲۳ گھنٹہ اور ۲۱ منٹ بعد نمایاں ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر ٹی جے۔ سی نے لکھا ہے کہ "بمقابلہ مریخ کے زہرہ میں آبادی کا امکان زیادہ ہے، کیونکہ زہرہ کا زمانۂ تحویل ۲۳ گھنٹہ ۲۱ منٹ ہے۔ اور تمام باتوں میں کرۂ ارض سے اسقدر مشابہ ہے گویا زہرہ وارض دونوں توام بہنیں ہیں۔ زہرہ کے اندر ہوا، بادلوں، پانی، پہاڑوں، جھیلوں، سمندروں، اور دریاؤں کی کثرت ہے۔ موسم بھی قریب قریب ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے زمین پر، صرف اسقدر فرق ہے کہ وہاں کا ہر موسم چھوٹا ہوتا ہے۔ کیونکہ زہرہ کا سال صرف ۲۲۵ دن کا ہوتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے سیارہ میں کوئی ذیحیات نہ پائی جائے"

لیکن ڈاکٹر سینٹ جان نے آلۂ طیف پیما سے مشاہدہ کرکے یہ معلوم کیا ہے۔ کہ "زہرہ کے گرد جو ہوا ہے اس میں آکسیجن ہی نہیں" بہرحال زہرہ کے متعلق اس وقت تک جتنی تحقیق ہو چکی ہے، اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کسی ذی حیات کا پایا جانا مستبعد نہیں ہے۔ اور بالکل ممکن ہے کہ وہاں بھی انسان ہی کی طرح کوئی ذی شعور مخلوق پائی جاتی ہو، لیکن چونکہ زہرہ کے چاروں طرف ہوا اور بادل کی نہایت کثیف تہ موجود ہے اس لئے ہمارے آلات رصد ابھی تک سطح زہرہ کا کوئی صحیح حال معلوم نہیں کر سکے۔

مشتری — مشتری اپنے حجم و وزن کے لحاظ سے نہایت عظیم الشان سیارہ ہے یعنی اگر کسی ترازو کے ایک پلڑے میں مشتری کو رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں نظام شمسی کے اور تمام سیارے تو مشتری کا پلہ بھاری رہیگا۔

جس طرح ہماری زمین کے ساتھ ایک چاند ہے اسی طرح سیارۂ مشتری کے ساتھ نو چاند ہیں۔ ان میں سے چار چاند سنہ ۱۶۱۰ء میں گلیلیو (Galileo) نے دریافت کئے تھے۔ ان میں سے ایک چاند جسکا نام "گانمیڈ" ہے عطارد کے قطر سے ۶۰۰ میل بڑا قطر رکھتا ہے، دوسرا چاند "کالسٹو" عطارد کے برابر ہے۔

اس عظیم الشان کرہ کی طبیعی حالت جسقدر ہم کو معلوم ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کسی جاندار چیز کا وجود نہیں پایا جا سکتا اس عظیم الشان سیارہ کا ٹمپریچر اسقدر زیادہ ہے کہ اس کی سطح پر باریک سا چھلکا یا ٹھوس خول بھی ابھی تک پیدا نہیں ہوا علاوہ

ازیں تحلیل طیفی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو مادی اشیا اس کی بیرونی سطح پر پائی جاتی ہیں وہ ان اشیا سے قطعی مختلف ہیں جو ہم کو سطح ارض پر اب تک معلوم ہو سکی ہیں۔

ابھی یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ ہم مشتری کی اصلی سطح اب تک دیکھ سکے ہیں یا نہیں، کیونکہ اس کی سطح پر رنگین بادل بکثرت نظر آتے ہیں۔ جو ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا بڑے بڑے دخان دریا بہہ رہے ہیں۔ یہ سحابی منطقے خود بھی کسی قدر بدلتے رہتے ہیں یعنی کبھی شمال کی طرف مایل ہو جاتے ہیں اور کبھی جنوب کی طرف۔ ان سحابی منطقوں کے کناروں پر اکثر سرخ رنگ روشنی دیکھی گئی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نیچے جو مواد پایا جاتا ہے، وہ بالکل آگ کی طرح سرخ ہے۔

کرۂ مشتری کے منطقۂ خط استوا میں طاقتور دوربینوں کے ذریعہ سے دیکھا گیا ہے کہ مختلف قسم کے دھبے اور عجیب و غریب ہاریں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس کے کرۂ ہوا میں چھوٹے چھوٹے مختلف الالوان دھبے نظر آتے ہیں۔ جو دھبے خط استوا پر ہیں ان کا زمانہ تحویل ۹ گھنٹہ ۵۰ منٹ اور جو دھبے زیادہ جنوب کی طرف واقع ہیں ان کا زمانہ تحویل ۹ گھنٹہ ۵۵ منٹ ہے۔ اگر سیارۂ مشتری کی سطح سخت ہوتی تو خط استوا پر حرکت زوا یا شمالی و جنوبی منطقوں کی حرکت سے زیادہ تیز نہ ہوتی۔

گذشتہ چالیس برس سے جرم مشتری پر جو سب سے زیادہ نمایاں داغ نظر آرہا ہے اس کو عرف عام میں "داغ سرخ کبیر" (Great Red Spot) کہتے ہیں۔ ایک انگریز ماہر فلکیات کا قول ہے کہ یہ کرۂ مشتری کا ایک چاند ہے جو ہنوز دور تکوین میں ہے۔ اس انگریز کا دعوے ہے کہ یہ مادہ جسے ہم "سرخ داغ" کہتے ہیں، آہستہ آہستہ مشتری کی سطح سے پیچھے کی طرف ہٹ رہا ہے۔ اور ایک دن آئے گا جب یہ مشتری سے بالکل علیحدہ ہو کر اس کا دسواں چاند بن جائے گا۔ اس وقت تک جو ۹ چاند مشتری کے معلوم ہوئے ہیں، ان میں سے آٹھویں اور نویں چاند کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ اُلٹے چلتے ہیں یعنی بائیں سے داہنے یا مشرق سے مغرب کی طرف چلتے ہیں۔ حالانکہ خود مشتری کی حرکت مغرب سے مشرق کی طرف ہے۔

بعض کی رائے ہے کہ وہ "داغ سرخ" کوئی چاند نہیں ہے۔ بلکہ سطح مشتری پر ایک ٹھوس چھلکا بن رہا ہے۔ اگر یہ داغ آہستہ آہستہ مشتری کے گرد پیچھے کی طرف نہ ہٹتا ہوتا تو یہ کہا جا سکتا کہ وہ کسی عظیم الشان کوہ آتش فشاں کا وسیع دہانہ ہے جو ۱۸۸۵ء میں تیس ہزار میل طویل اور آٹھ ہزار میل عریض تھا۔

۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۴ء تک یہ داغ قریب قریب غائب ہو گیا تھا۔ مگر ۱۹۰۸ء میں یہ بیضوی شکل میں نظر آنے لگا، رنگ البتہ سُرخ کے بجائے کسی قدر سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں یہ داغ قطعی نظر نہ آتا تھا۔ لیکن ۱۹۱۰ء میں وہ کئی ہفتہ تک زیادہ نمایاں رہا۔ یہ داغ اب بھی نظر آتا ہے مگر بہت دھندلا ہے، جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اب وہ رفتہ رفتہ سرد ہوتا جاتا ہے، اور جو گہرا سُرخ رنگ اس داغ کا ۱۸۷۸ء میں دیکھا گیا تھا۔ پھر نہیں دیکھا گیا

مشتری کی ہوا بہت کثیف اور گرم ہے، ڈاکٹر ای۔ سی۔ سلیز کا قول ہے کہ "جسقدر معلومات ہم کو بابت سیارۂ مشتری کے متعلق حاصل ہوئی ہیں وہ اس امر کی شاہد ہیں کہ مشتری کے اندر شدید ہیجان کا باعث سیارۂ مذکور کی سخت اندرونی حرارت

ہے، جس کا اثر اس کے کثیف لفافۂ بخاراتی پر بھی پڑتا ہے۔

ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو کیمبل (W. W. Campbell) مشتری کے کرۂ ہوائی" کی نسبت لکھتے ہیں کہ وہ ہنوز بالکل گرم ہے"

ہم لکھ چکے ہیں کہ ستارہ مشتری کے نو چاند ہیں منجملہ ان کے دو چاند سب سے بڑے ہیں۔ ایک کا نام "گا نمیڈ" ہے۔ اس کا قطر ۳۵۵۰ میل یعنی سیارۂ عطارد کے قطر سے تقریباً ۶۰۰ میل زیادہ ہے۔ اس چاند کا مدار مشتری کے مرکز سے ۶۶۴۰۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور خود مشتری کا قطر ۸۰ ہزار میل ہے۔ چونکہ یہ قمر جرم مشتری سے بہت قریب واقع ہے، اس لئے وہاں مشتری سے بیحد حرارت پہونچتی ہوگی، لیکن نہ اتنی جتنی ہمارے چاند کو آفتاب سے پہونچتی رہتی ہے۔ کیونکہ مشتری کا یہ چاند بہ نسبت ہمارے چاند کے آفتاب سے بہت زیادہ دور واقع ہے۔

جہاں تک ٹمپریچر کا تعلق ہے گا نمیڈ اور آیو دونوں چاند ہیں نہایت منظم آبادی ہونا چاہیے، لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ ان دونوں کی ہوا میں آکسیجن کی بھی کافی مقدار موجود ہے یا نہیں۔

زحل

یہ خوبصورت حلقہ دار سیارہ بمقابلہ ہماری زمین کے آفتاب سے ساڑھے نو گنا دور ہے۔ اور اس کا حجم ہماری زمین سے ۶۲، گنا بڑا ہے۔ چونکہ یہ سیارہ آفتاب سے ۸۸۶۰۰۰۰۰۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس لئے اس کی سطح تک سطح ارض کے مقابلہ میں نور و حرارت شمسی کا صرف ۱/۹۰ حصہ پہونچتا ہے۔ اگر جرم زحل تک صرف آفتاب ہی کی حرارت پہونچتی ہے تو اس کا ٹمپریچر درجۂ صفر سے ۲۳۰۰ درجہ فارنہیٹ نیچے ہوگا۔ جو یقیناً اس قدر کم ہے۔ اس میں کوئی ذی حیات چیز نہیں پائی جاسکتی۔ مشتری کی طرح زحل بھی ٹھوس جرم کی طرح حرکت نہیں کرتا، بلکہ اس کے اندر کے طبقات اندر ہی اندر تیزی کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ طبقات غیر مساوی سرعت کے ساتھ گردش کرتے ہیں اس لئے آپس کی رگڑ سے یقیناً زبردست حرارت پیدا ہوجاتی ہوگی۔ مشتری کی طرح یہ سیارہ بھی گداختہ بلکہ گیس کی سی حالت رکھتا ہے۔ اگر اس سیارہ کی ترکیب انھیں اجزاء سے ہوئی ہے جو کرۂ ارض کے ہیں (اور بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو) تو پھر اس کی سطح پر کوئی سخت چھلکا نہیں ہوگا۔ بلکہ صرف گیسوں کے طبقات ہوں گے، جو بوجہ عمق بہت زیادہ کثیف بن گئے ہوں گے۔ اور مرکز کے قریب بدرجۂ غایت تاریک ہوں گے۔

لاؤ کا خیال ہے کہ :- " زحل کا طیف بھی بالکل مشتری جیسا ہے، اور معلوم ہوتا ہے۔ زحل کے جرم میں بعض ایسے عناصر گیس موجود ہیں جو ابھی تک زمین یا آفتاب میں دریافت نہیں ہوئے

سیارۂ زحل کے دس چاند ہیں جن میں ایک (یا پیتوس) کا قطر ۲۰۰ میل ہے اور دوسرا چاند (ٹائیٹان) سیارۂ عطارد کے برابر ہے۔ چونکہ یا پیتوس سیارۂ زحل سے ۲۲۲۱۰۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس لئے اسے زحل سے کافی حرارت نصیب نہیں ہوتی لیکن چونکہ اس کا کرۂ ہوا نہایت ہی لطیف اور سبک ہے اسلئے اس بات کا قوی گمان ہے کہ اس کی سطح پر اعلیٰ طبقہ کے نشو و نما یافتہ جاندار موجود ہوں گے۔

دوسرے چاند (ٹائیٹان) کی حالت دوسری ہے، اور بہ نسبت ہماری زمین کے اس میں زیادہ ادنیٰ قسم کے جاندار پائے جانے کا امکان ہے۔

یورانوس و نپچون

ان دونوں سیاروں کو آفتاب سے نسبتاً بہت کم حرارت و روشنی پہونچتی ہے۔ یعنے یورانوس کو بمقابلہ زمین کے $\frac{1}{368}$ حصہ نور و حرارت کا پہونچتا ہے، نپچون کو صرف $\frac{1}{900}$ اس لئے نپچون میں دوپہر کو صرف اتنی روشنی ہوتی ہوگی، جتنی زمین پر شام کے وقت ہوتی ہے۔ اور یورانوس میں اس سے کچھ زاید۔ یورانوس کا ٹمپریچر (۳۸۰) درجہ اور نپچون کا ٹمپریچر (۴۰۰) درجہ بتایا جاتا ہے۔ اس لئے وہاں سردی اتنی شدید ہوگی۔ کہ اگر ہماری زمین کی ہوا کسی صورت سے نپچون تک پہونچا دی جائے تو فوراً منجمد ہوکر ایک "ٹھوس" چیز کی حیثیت اختیار کرلے گی۔

بعض کا خیال بالکل اس کے برعکس ہے وہ کہتے ہیں کہ یورانوس جو کرۂ ارض سے ۱۶ گنا اور نپچون جو زمین سے ۸۵ گنا بڑا ہے۔ دونوں سخت گرم سیارے ہیں۔ اور گیس کی صورت رکھتے ہیں۔

دوربین کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یورانوس بہت دور واقع ہے یہاں تک کہ اس کے ہلکے سبز رنگ کی سطح پر جو نشانات ہیں وہ اچھی طرح دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن بعض ماہرین فلکیات نے یورانوس میں مشتری جیسے طبقات بھی دیکھے ہیں

تقریباً پندرہ سال گزرے اس امر کا اعلان ہوا تھا کہ آلہ طیف پیما یا موشور کے ذریعہ سے یورانوس اور نپچون میں "کلوروفائل" (Chlorophyll)۔ وہ چیز جس سے نباتات میں سبز رنگ پیدا ہوتا ہے) کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور یورانوس اور نپچون میں ویسے ہی حلقے نظر آتے ہیں جیسے کلوروفائل کے محلول سے شعاعیں گزرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

واضح ہو کہ کلوروفائل کوئی عنصر نہیں بلکہ نائٹروجن کا ایک نہایت ہی پیچیدہ مرکب ہے جو پودوں کے بعض خلایا میں پایا جاتا ہے اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مرکب یورانوس اور نپچون کے ہوائی طبقات کے اندر کیونکر آگیا

مسٹر گاریٹ پی سروس کہتے ہیں کہ جو سیارے گیسی حالت میں ہوتے ہیں، وہاں کی مخلوقات بھی ویسی ہی گیس کی قسم کی ہوتی ہے۔ اگر یہ وہ لوگ جو اشیاء کو دنیوی اوزان اور پیمانوں کے معیار سے جانچنے کے عادی ہیں، یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک گیسی صورت حیات کیا ہوسکتی ہے۔ لیکن مخلوقات کا تنوع ایک ایسی ہدایت ہے کہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی دلیل کی جستجو کرنا بیکار ہے۔

مریخ

۲۲، اگست ۱۹۲۴ء کو مریخ کرۂ ارض سے بقدر ۷۷۰۰۰۰۰ میل قریب آگیا تھا۔ اور یہ قرب اتنا تھا کہ گزشتہ ایک سو بیس سال میں نہ ہوا تھا۔ اور نہ آیندہ ایک سو سال تک اس کا امکان ہے۔ اس تاریخ کی شام کو مریخ زمین سے صرف ۳۴۵۰۰۰۰۰ میل کے فاصلہ پر تھا۔

جب زمین اور مریخ اس طرح واقع ہوں کہ اگر آفتاب سے ایک خط مستقیم مریخ تک کھینچا جائے تو کرۂ ارض سے ہوتا ہوا گذرے تو اس وقت اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ ان تینوں کا "قران" ہوگیا ہے۔ لیکن چونکہ مریخ کا مدار بہت ہٹا ہوا ہے

اس لئے وہ زمین سے قریب تر آجانے کے باوجود بہت دور رہتا ہے ۔ مثلاً اگر کرۂ ارض کا فاصلہ آفتاب سے اوج شمسی کے وقت صرف ۰۰ ۔۔۔ ۳۰۰۰ میل ہوتا ہے ، تو مریخ اسی نقطہ پر ۰۰۰۰۰ ۔۔ ۲۶۰ میل دور ہوتا ہے ۔

فروری یا مارچ کے مہینے میں جب آفتاب مریخ اور زمین تینوں ایک خط میں ہوتے ہیں تو اس وقت مریخ اور زمین کے درمیان تقریباً ۰۰۰۰۰ ۔۔ ۶۱ میل کا فاصلہ ہوتا ہے ، اور اگر یہی صورت اگست یا ستمبر میں واقع ہو تو فاصلہ کم ہو کر ۰۰۰۰ ۔ ۲۵۵ میل رہ جاتا ہے ۔ الغرض ایسے تمام قرانوں کا بُعد اوسط ۰۰۰۰ ۔ ۱۸۶۰ میل ہوتا ہے

دوربین کے ذریعہ سے مریخ کا قطر اقتران کے وقت ۲۵ انچ نظر آتا ہے ۔ مگر اسکا انحصار دوربین کی طاقت پر ہے کیونکہ اگر دوربین بہت قوی ہو تو مریخ ، ہمارے چاند کے برابر نظر آسکتا ہے ۔

پروفیسر پکرنگ نے کافی مشاہدہ کرنے کے بعد یقین کرلیا ہے کہ کرۂ مریخ میں جاندار مخلوق ضرور موجود ہیں ، علاوہ ازیں ماہرین فلکیات نے رصد گاہ لوویل سے معلوم کیا ہے کہ وہاں نہروں کا ایک سلسلہ پایا جاتا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ مریخ میں نباتات کا ہونا لازم ہے ۔

رہا یہ امر کہ مریخ میں جاندار مخلوق ہیں یا نہیں اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی جگہ نباتات کا وجود ثابت ہو جائے تو ادنےٰ درجہ کے حیوانات تو یقیناً پائے جائیں گے ، اس لئے ظاہر ہے کہ مریخ میں حیوانات کا وجود یقیناً ہوگا ۔

سنہ ۱۶۵۹ء میں ماہر فلکیات کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کرۂ مریخ کی سطح پر خاص قسم کے داغ دھبے موجود ہیں ۔ لیکن سنہ ۱۸۴۰ء میں سب سے پہلے مریخ کا نقشہ مشہور جرمن ہیئت داں جے - ایچ - فان ماڈلر نے کھینچا ۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۷۷ء میں ایک اطالوی ہیئت داں جی - ڈی - شیاپریلی نے ان دھبوں کو معلوم کیا جنھیں "سلسلہ انہار" کہتے ہیں ۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں اسی شخص نے اعلان کیا کہ بعض اوقات یہ نہریں بہت بڑی ہو جاتی ہیں ۔ اور اس زمانہ سے ان نہروں کا خاص طور پر مطالعہ ہونے لگا ۔

سر ولیم ہرشیل نے معلوم کیا کہ مریخ کے قطبین پر برف کے تودے ہیں ۔ اور جب کبھی ان تودوں میں سے کوئی کم ہوتا ہے تو سطح مریخ پر عجیب قسم کے نشانات پیدا ہو جاتے ہیں ۔ اور باریک خطوط کا ایک جال سا پیدا ہو جاتا ہے ۔

مریخ کا مدار بیضاوی شکل کا ہے اس کا قطر ۴۲۱۵ میل ہے ، اس کا حجم زمین سے ۱/۷ ہے ۔ اور اس کی سطحی رقبہ زمین کا ۲/۷ ہے ۔ اور اس کی کثافت ۷/۱۰ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریخ میں بمقابلہ زمین کے کشش ثقل کی نسبت ۳۸/۱۰۰ ہوگی یعنی جو چیز زمین پر سو پونڈ وزن رکھتی ہے وہ مریخ پر ۳۸ پونڈ ہوگی ۔

مریخ کے خط استوار کا جھکاؤ اپنے مدار کی طرف تقریباً ۲۴ درجہ ۵۰ دقیقہ ہے ۔ اس لئے کرۂ مریخ پر موسم بھی کرۂ ارض کی ہی طرح بدلتے ہوں گے اس کی رفتار تحویلی بھی قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی کہ کرۂ ارض کی یعنی ۲۴ گھنٹہ ، ۳۷ منٹ ۲۲٫۶۷ سکنڈ ۔ مریخ اپنے فلک پر سورج کے گرد بہ حساب ۱۴٫۹۸ میل فی سکنڈ ۶۸۶٫۹۷ دن میں گردش کرتا ہے ۔

آفتاب کے گرد مریخ کی گردش کا زمانہ ایک سال ساڑھے دس مہینہ ہوتا ہے۔ یہ گویا مریخ کا "ایک سال" ہے۔ اور زمین ہی کیطرح وہاں بھی بہار، گرما، خزاں اور سرما ہوتے ہیں۔ مگر ہر فصل کی مدت تقریباً دگنی ہوتی ہے۔ جب زمین پر جون کا مہینہ ہوتا ہے تو مریخ پر خزاں ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ۴ جون کو مریخ پر پہلی برف پڑی تھی

جس طرح زمین کے شمالی و جنوبی حصوں میں تفریق موسم ہوتی ہے۔ اسی طرح کرۂ مریخ میں بھی ہے۔ مریخ میں فصل بہار ۱۹۹ دن، گرما ۱۸۳ دن خزاں ۱۴۷ اور سردی ۱۵۸ دن ہوتی ہے۔

مریخ کے درجۂ حرارت کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ ۴۰ درجہ ہے اور بعض نے ۶۰ درجہ اندازہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اقوال محض ریاضیات فلکی کے بعض اصول کی بنا پر ہیں، صحیح علم اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکا۔ چنانچہ پکرنگ کا قول ہے کہ:۔ مریخ کا اوسط ٹمپریچر ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن وہ ۳۲ درجہ سے یقیناً کم ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے۔ کہ ۲۰ درجہ ہو۔ کیونکہ مریخ کے استوا پر دوپہر کے وقت کبھی برف نظر نہیں آتی، لیکن جب مریخ نقطۃ الذنب کی طرف ہوتا ہے تو طلوع آفتاب کے بعد استوا پر برف نمودار ہو جاتی ہے، نیز سہ پہر کے وقت منطقہ حارہ میں کہر اور دھند بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے اس زمانہ میں بوقت شب ٹمپریچر ۳۲ درجہ سے کم ہو جاتا ہوگا۔ اور دوپہر کے وقت غالباً ۶۰ یا ۷۰ درجہ تک پہونچ جاتا ہوگا۔

کرۂ مریخ میں ایسا کوئی کرۂ ہوا نہیں ہے۔ جیسا زمین کے گرد پایا جاتا ہے۔ نہ وہاں دوپہر کے وقت ابر ہوتا ہے، نہ ٹھنڈے سمندر ہوتے ہیں، صرف قطبین پر کسی قدر برف ہوتی ہے۔ مریخ کی سطح کا مقابلہ کرۂ ارض کے ریگستانی علاقوں سے کسی قدر ہو سکتا ہے۔

الغرض دوربین کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مریخ میں اس کے قطبین کے قریب دو سفید داغ پائے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اسی قسم کے سفید داغ اس کی سطح کے اور حصوں پر بھی نظر آتے ہیں، چنانچہ ۹ جولائی سنہ ۱۹۲۲ء کی شب کو تین لاکھ مربع میل کی وسعت کا ایک بہت بڑا سفید دھبہ یکایک نمایاں ہو گیا تھا۔ قطبین کے گرد جو سفید دھبے نظر آتے ہیں۔ وہ قطر میں ۱۲ ہزار میل سے زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ برف کے تودے ہیں۔ لیکن ۹ جولائی کی شب کو جو سفید دھبہ یکایک نمایاں ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کرۂ ہوا میں منجمد ہو جانے والے بادل تھے۔

یہ ابر مریخ کے باشندہ کو تو سیاہ نظر آتا ہوگا۔ مگر ہم کو آفتاب کی شعاعوں کی وجہ سے سفید دکھائی دیتا ہے۔ اور اس لئے سطح مریخ پر اس قسم کے سفید دھبے نظر آنے کے معنے یہ ہیں کہ وہاں سخت گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ اور طوفان ابر و باراں برپا ہے۔ اس قسم کا ایک حادثہ مریخ میں ۹ مئی سنہ ۱۹۲۰ء کو پلکاف کی رصدگاہ میں دیکھا گیا تھا۔ اس کے متعلق پروفیسر کا مشکاف کا بیان ہے کہ یہ چادر ابر اسقدر وسیع تھی کہ سطح مریخ پر جو نشانات عموماً نظر آیا کرتے ہیں وہ سب پوشیدہ ہو گئے تھے۔

ایڈگر لوسین لارکن کو یقین نہیں ہے کہ کرۂ مریخ پر کوئی "سلسلۂ انہار" ہے۔ مگر انھوں نے ۷ جون سنہ ۱۹۲۲ء کو سطح مریخ

پر بھورے رنگ کے جدید داغ دیکھے تھے۔ اور یہ امریکہ کے رقبہ کے برابر وسیع تھے۔ ان کو مریخ کا ریگستانی حصہ سمجھا گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ سطح مریخ پر سفید داغ عموماً اس زمانہ میں نمودار ہوتے ہیں جبکہ وہاں موسم گرما ہوتا ہے، یعنی جب قطبین کی برف پگھل کر بہت کم ہو جاتی ہے۔ اور ہوا میں رطوبت پیدا ہو جاتی ہے۔

جب شمالی نصف کرہ میں گرمی ہوتی ہے تو شمالی تودۂ برف غائب ہو جاتا ہے۔ اور جنوبی تودہ رفتہ رفتہ بڑھنے لگتا ہے۔ شمالی دھبہ ۱۲ ہزار میل قطر کے رقبہ سے موسم گرما میں کم ہو کر ۳۰۰ میل قطر کا رہ جاتا ہے۔ لیکن جنوبی داغ بعض اوقات بالکل محو ہو جاتا ہے۔ اور جاڑوں میں پھر پیدا ہو جاتا ہے۔

تقریباً نصف صدی قبل یہ کہا جاتا تھا کہ کرۂ مریخ میں کوئی طبقہ ہوا نہیں ہے اگر ہے بھی تو وہ بہت ہلکا ہے۔ اور اس میں بخارات آبی مطلق نہیں ہیں۔ اس لئے قطبین پر برف ہرگز جم نہیں سکتی۔ مگر جو واقعات ہم بیان کر چکے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مریخ کے متعلق کرۂ ہوائی ضرور ہے۔ اور اس میں رطوبت بھی کافی ہے جس سے برف اور باساں بن سکتے ہیں۔

بعض کا قول یہ بھی ہے کہ مریخ کے قطبین پر جو سفید داغ نظر آتے ہیں وہ منجمد شدہ کاربن ڈائکسائڈ ہے۔ مگر پروفیسر پکرنگ کہتے ہیں:۔ جب قطبین پر تودے بنتے ہیں تو وہ گرد و نواح کی سطح سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ یہ بھی صحیح طور پر معلوم ہے کہ یہ داغ کب محو ہونے لگتے ہیں۔ اور چند ہفتہ بعد ایک سیاہ خط نصف النہار سے شروع ہو کر مغربی افق کے سرے تک زیادہ نمایاں ہونے لگتا ہے۔ اور پھر چند ہفتہ بعد وہ خط وسیع ہوتے ہوتے افق مشرق تک پہونچ جاتا ہے اور اس طرح وہ اس قطبی تودہ کو کرہ کے دوسرے حصوں سے قطعی علیحدہ کر دیتا ہے۔ بعد ازاں وہ خط کئی سو میل چوڑا ہو جاتا ہے۔ اور جوں جوں برفانی داغ محو ہوتا جاتا ہے۔ یہ خط بھی پیچھے ہٹ کر اس سے ملتا جاتا ہے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سطح میں سیاہ خلیجیں بننے لگتی ہیں جن میں سے زرد رنگ کے بادل اٹھتے دکھائی دیتے ہیں، اور جب وہ تودہ گھلنے لگتا ہے تو اس کے حدود میں ایک سیاہ رقبہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سیاہ رقبہ برف کے گھلنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ جس طرح چار ملی میٹر سے کم دباؤ میں پانی قائم نہیں رہتا۔ اسی طرح کاربن ڈائکسائڈ بھی پانچ ملی میٹر سے کم دباؤ میں قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے یہ سفید تودے کاربن ڈائکسائڈ کے نہیں بلکہ برف کے ہیں۔ علاوہ ازیں مسٹر اسلیفر کا بیان ہے کہ مریخ کے سحابی رقبے بھی اسی مادہ کے بنے ہوئے ہیں جس کے ہماری زمین کے بادل بنتے ہیں۔

الغرض شہادتیں اسقدر ضرورت سے زیادہ ہیں کہ ہم کو مجبوراً یہ ماننا پڑتا ہے کہ مریخ میں بخارات آبی ضرور موجود ہیں۔ اور جن ارصادات طیفی سے یہ ثابت ہوا کہ مریخ پر بخارات آبی کا وجود ہے انھیں سے یہ بھی ثابت ہوا۔ کہ وہاں آکسیجن بھی ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ کہ اگست ۱۹۲۲ء میں لاک انجلیز سے سو میل کے فاصلہ پر ایک برفانی دریا کی سطح پر مٹی کی تہ پائی گئی تھی جس پر کچھ سبزے اُگی ہوئی تھی۔ اور اس کے نیچے برف تھی۔ اسی طرح جب مریخ میں قطبین کی برف

پھیلتی ہے تو وہ دھاریاں جنھیں "نہریں" کہتے ہیں نمودار ہونے لگتی ہیں اور رفتہ رفتہ سیاہ خطوط کا ایک جال پیدا ہو جاتا ہے یہ خطوط چھوٹے چھوٹے سیاہ داغوں سے جا کر ملتے ہیں جنھیں "نخلستان" کہتے ہیں۔ یہ نخلستان وسعت میں بڑے چھوٹے ہوتے ہیں جنکا اوسط قطر ۱۲۰ میل ہوتا ہے۔ ان میں بہت ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے جھیلیں اور اُن سے نہریں چاروں طرف اس طرح نکلتی ہیں جیسے پہیہ کے وسط میں سے آرے۔ اگر کوئی داغ بڑا ہوتا ہے تو اس میں سے سات نہریں نکلتی ہیں۔ ان میں ایک دھبہ بہت بڑا ہے جسے "سورج کی جھیل" کہتے ہیں۔ اس کا قطر ۳۰۰ میل ہے۔ اور طول ۵۴۰ میل۔ اس میں سے دوہری نہریں نکلتی ہیں۔ جنکا طول اوسطاً کم ہے۔ سب سے بڑی نہر ان میں ۳۵۰۰ میل ہے۔ ان نہروں کی اوسط چوڑائی ۳۰ میل ہے۔ اب تک ۲۰۰ نہروں سے زیادہ دیکھی جا چکی ہیں۔ جن کے نقشے کھینچ کر نام بھی رکھدیئے گئے ہیں۔

مشاہدات دوربینی اور فوٹوگرافی دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہریں ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک باقاعدہ جاتی ہیں۔ ہر زاویہ پر ان نہروں کا پورا تقاطع ہوتا ہے۔ اور کئی نہریں ایک ہی مرکز پر آ کر مل جاتی ہیں کسی جگہ دو نہریں ایک دوسرے کو قطع کر کے سیدھی چلی جاتی ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ جس مقام پر پہلے ایک نہر دکھائی دیتی تھی رات بھر میں اسی مقام پر دوسری نہر نمودار ہو گئی۔ اور یہ دونوں نہریں متوازی بہتی رہیں۔ ان توام نہروں کا درمیانی فاصلہ عموماً ۱۵۰ یا ۲۰۰ میل ہوتا ہے۔ بعض توام نہروں کے فوٹو بھی لئے جا چکے ہیں۔

ان نہروں اور نخلستانوں کی تشریح پروفیسر پکرنگ اور لوویل نے اس طرح کی ہے کہ چونکہ مریخ میں پانی کم ہے اس لئے قطبین کی پگھلنے والی برف سے مخرج کا کام لیا جاتا ہے۔ اور وہاں سے پانی پیدا ہو کر تنگ نہروں کے ذریعہ سے چاروں طرف تقسیم کیا جاتا ہے۔ ماہرین فلکیات کو جو خطوط نظر آتے ہیں وہ نہریں نہیں بلکہ نباتاتی منطقے ہیں جو بہار کی آمد پر نمایاں ہو جاتے ہیں اور موسم سرما میں غائب ہو جاتے ہیں۔

یہی توجیہ نخلستانوں کی کی گئی ہے۔" اس واقعہ سے مندرجہ بالا دلیل کو اور بھی زیادہ تقویت ہوتی ہے کہ نخلستان صرف نہروں کے سنگم پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس نظریہ کا تسلیم کر لینا یہ معنی رکھتا ہے کہ کرۂ مریخ میں قرنہا قرن سے ایسی مخلوق آباد ہے جو نہایت عقیل و فہیم ہے اور پانی کی قدرتی کمی کو انھوں نے آبپاشی کے وسیع کاموں سے پورا کیا ہے

مگر بعض دیگر ہیئت دانوں کا خیال یہ ہے کہ جب مریخ میں موسم گرما ہوتا ہے تو وہاں رات کے وقت بارش ہوتی ہے جس کے باعث سبزہ نمودار ہو جاتا ہے پہلے ان سیاہ رقبوں کو سمندر خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اب امر یقینی یہ ہے کہ یہ طبقات موسم کیساتھ اپنا رنگ بدلتے ہیں۔ موسم سرما میں رنگ غائب ہو جاتا ہے اور بہار میں پھر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ موسمی تغیر نہروں کی وجہ سے نہیں بلکہ رات کے وقت بارش کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ وسیع رقبے جو زرد سے سیاہی مائل بھورے ہو جاتے ہیں۔ وہ دلدلیں ہیں۔ جن کے رنگ میں پانی کے عمق کی وجہ سے فرق پڑتا ہے۔

ایک انگریز محقق ریجنالڈ اس بات کا یقین نہیں کرتا کہ سطح مریخ پر جو نظام انہار ہے وہ مصنوعی نہیں یعنی انجینیروں کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ممکن ہے بمقابلہ زمین کے مریخ میں تبخیر کم ہوتی ہو، اس لئے وہاں بڑے بڑے تالاب ہوں گے جن میں برف پگھلنے کے بعد پانی بھر جاتا ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ مریخ کی نہریں مسقف ہوں تاکہ پانی سوکھ نہ جائے۔

مسٹر مارکونی نے حال ہی میں جو لاسلکی امواج کے منتقل کرنے کا آلہ ایجاد کیا ہے۔ اس سے ممکن ہے کہ کسی وقت ہم لاسلکی پیام مریخ یا زہرہ تک براہ راست پہونچانے میں کامیاب ہوجائیں۔ چنانچہ مارکونی کا بیان ہے کہ وہ یقیناً دوسری دنیاؤں سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے بشرطیکہ وہاں ایسے لوگ آباد ہوں جو ہمارا پیغام سمجھ سکیں۔ اگر وہ ہمارا پیغام سن سکیں گے تو یقیناً وہ جواب بھی دے سکیں گے "

مشہور موجد اڈیسن کی یہ رائے ہے کہ غالباً اور سیاروں کے باشندے اب بھی اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم سے بات چیت کریں ان کی پیشین گوئی ہے کہ آیندہ چند سال کے عرصہ میں مختلف سیاروں کے درمیان لاسلکی طریقۂ پیغام رسانی قائم ہوجائے گا۔ امریکن سائنسداں میک آئی کہتا ہے کہ مجھے کامل یقین ہے کہ مریخ میں آبادی ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ اسے بہت جلد ثابت کیا جاسکے گا۔

نیاز

کاجل سرمہ چورن منجن

(اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے) **دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو:۔** سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا۔ ایک شیشی اور بھیجدیجئے

(سید رضا، زیر سو بنیتھ۔ یوت محل)

کاجل۔ آشوب، سرخی، ضعف بصارت کے لئے ازبس مفید ہے ایک ڈبیہ کی قیمت ایک روپیہ عہ (علاوہ محصول)

سرمہ۔ یہ بیش بہا سرمہ ۴۰ دن میں جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے۔ جالا۔ دھند۔ موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیا (عہ) علاوہ محصول

چورن۔ یہ وہ اکسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے پیٹ کا درد۔ قبض۔ نفخ ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم دستوں کا آنا۔ یک لخت اسکے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبیہ ۸ تولہ (عہ) علاوہ محصول

منجن۔ اس کی ادنے خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ ۸ تولہ (عہ) علاوہ محصول

نوٹ:۔ سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

م بیگم۔ ذریعۂ دفتر نگار لکھنو

روح کا انتقال مکان

۳۸ پائنیر ریجمنٹ کے تین کمیشن یافتہ ہندوستانی مسلمان چائے کے بعد آپس میں بیٹھے ہوئے مولانا نیاز کے اجتہادی مضامین پر گفتگو کر رہے تھے کہ کیپٹن قدوائی کہنے لگے۔ "ناجی و ناری کی بحث تو مولانا عبدالماجد عرف سیح الملت و مولانا سلیمان ندوی عرف معارف الملت کے لئے چھوڑیئے، آج ایک نیا دلچسپ قصہ سنیئے۔ میں بہت متحیر ہوں کہ یہ کیا معاملہ ہے اگر روحانیت ایسی ہی مکمل چیز ہے تو غالباً وہ دن دور نہیں۔ جب کسی اور قوت کی ضرورت ہی دنیا کو باقی نہ رہے گی کیونکہ انسان کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں روحانیین کا کوئی شاہکار موجود نہ ہو!

کیپٹن فاروقی۔ وہ قصہ کیا ہے اور کہاں سنا؟

قدوائی۔ سنا کہاں آج میں جب میس سے نکل رہا تھا دیکھا کوئی وسیط آیا ہوا ہے جو لوگوں کے مردہ اعزہ کے حالات سناتا ہے مجکو بھی فطرتاً اشتیاق ہوا میں نے ملازم سے کہا کہ تم اس بازیگر سے کہنا کہ وہ میرے کمرہ میں آوے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مجکو اوس کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے اندر بلا لیا۔ ایک خوبصورت لڑکی اور ایک ضعیف العمر پٹھان کمرے میں داخل ہوئے اور بہت سے صداقت نامے اپنے کمال کے ثبوت میں پیش کئے میں نے کہا۔ خانصاحب۔ مجکو بھی کچھ حالات سنائیے۔

خانصاحب کے چہرے پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور کچھ نقاہت بھی محسوس ہو رہی تھی میں نے برف منگایا۔ اور دونوں کو پلایا کچھ پھل وغیرہ میں نے اوس خوبصورت لڑکی مریم کو دئے لیکن معلوم ہوا کہ وسیط کوئی چیز کھا نہیں سکتی میں خاموش ہو گیا۔

خاں صاحب نے میرے ملازم اسمٰعیل کو بُلایا۔ اور حکم دیا کہ تم اس لڑکی کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لو۔ اوس کے بعد چراغ جلایا۔ اور ایک خاص موثر نغمہ بلند کیا جسے میں مطلقاً نہ سمجھ سکا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے معلوم ہونے لگا کہ گویا میرا کمرہ متحرک ہے۔ اور کھونٹیوں سے میرے کپڑے گرنا شروع ہو گئے۔ دروازہ کے کواڑ خود بخود بند ہو گئے کمرے میں کسی حد تک تاریکی چھا گئی میرا قلمدان جو میز پر رکھا تھا وہ بلند ہوا۔ اور معلق ہو گیا۔ مجکو یہ ڈر تھا کہ کہیں میرے کپڑے روشنائی سے خراب نہ ہو جائیں۔ میں ہٹنا چاہتا تھا لیکن خاں صاحب نے اشارہ سے مجکو منع کیا۔ میں خدا معلوم کیوں سہم گیا۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہونے لگا کہ ایک رنگین روشنی بالکل ایسی جو شعاعوں سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہوئی اور رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگی میں نے

یہ سمجھ کر کہ شاید میری نظر کو دھوکہ ہو رہا ہے۔ اسمٰعیل سے دریافت کیا۔ "تم کیا دیکھتے ہو"۔
جواب دیا۔ "سرکار روشنی ناچ رہی ہے"

میں خاموش ہو گیا۔ اوس کے بعد میں نے دیکھا ایک روح اسی شکل میں نمودار ہوئی جس کو میں نے شط العرب کے معرکہ میں دیکھا تھا۔ میں اوس ترکی کپتان کو دیکھ کر سہم گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ " میں بہت مصیبت میں مبتلا ہوں تم میرے دوست تھے تم نے باوجود دشمن ہونے کے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ میری اولاد اس وقت انقرہ میں بہت پریشان حال ہے تم اوس کی کسی طرح امداد اگر کر سکتے ہو تو انکار نہ کرو۔ ورنہ وہ عنقریب عیسائی یا یہودی ہو جائیں گے۔ ایک انگریز میری بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ آیندہ موسم بہار میں غالباً یہ شادی یافہ میں ہو جائے گی۔ مجکو شادی سے اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اپنی اولاد کو عیسائی دیکھنا پسند نہیں کرتا ہوں۔ تم اگر لفٹننٹ مصطفےٰ آفندی کو لکھو گے تو یہ معاملہ آسانی سے طے ہو جائے گا"۔

یہ کہکر وہ شکل محو ہو گئی۔ اس کے بعد میرے والد مرحوم کی شکل نظر آئی ....

" میں آج کل بہت پریشان ہوں تم نے آج تک باوجود صاحب ثروت ہونے کے میری خدمت نہ کی۔ میں نے جو قرض لیا تھا وہ آجتک ادا نہ ہوا۔ تم دریافت کرکے یہ رقم ادا کردو"

یہ شکل بھی محو ہو گئی اب دیکھتا ہوں کہ میری میز پر بصرہ کی بنی ہوئی خوبصورت ہاتھی دانت کی مچھلی رکھی ہوئی تھی۔ یہ میرے ایک خانگی معاملہ کی یادگار تھی، میں نے بصرہ میں ایک ایرانی خاندان میں شادی کی تھی، آہ آج سلمہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ سلمہ نے یہ مچھلی مجکو قصر شیریں سے لاکر تحفتاً پیش کی تھی۔ میں اسی احترام و خلوص کی قدر کرتے ہوئے۔ اس مچھلی کو ہمیشہ اپنی میز پر رکھتا ہوں۔ اور خود اپنے ہاتھ سے اوس کو صاف کرتا ہوں۔ اور ایک بڑی حد تک اپنی مرحوم رفیقۂ حیات کی یاد کو تازہ کر لیا کرتا ہوں۔ قصۂ مختصر دیکھتا ہوں کہ وہ مچھلی بلند ہونا شروع ہوئی۔ اور حقیقتاً ہوا میں پرواز کرنے لگی۔ اور دفعتاً مجکو معلوم ہوا کہ میرے قلمدان کے پاس جو ہوا میں معلق تھا۔ ... .. جا کر رکی اور ایک پنسل نہ معلوم کس طرح میز پر آکر پاس رکھے ہوئے کاغذ پر لکھنے لگی۔ تھوڑی دیر میں خاں صاحب نے کہا کہ اسمٰعیل ہاتھ چھوڑ دو۔ جب اُس نے ہاتھ چھوڑ دئے تو مریم اپنے حواسوں میں واپس آنے لگی۔ دوبارہ میرے کمرہ کے نظام میں تزلزل شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ سکون ہونا شروع ہوا۔ اب جو میں نے مچھلی کو دیکھا وہ بالکل ساکت رکھی ہوئی تھی۔ قلمدان اپنی جگہ پر تھا۔ کپڑے کھونٹیوں پر تھے۔ اور دروازوں کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی میں کاغذ اُٹھایا دیکھا لکھا ہوا تھا۔

" ..... میرا نام رام ناتھ ہے، پیشہ ملازمت قوم کورمی ساکن شاہ آباد آرہ کا ہوں میں بہت خوبصورت تھا۔ ایک جوگی سے میرا تعلق ہو گیا۔ اوس سے میں نے یہ سیکھ لیا کہ کس طرح ایک قالب سے دوسرے قالب میں جا سکتے ہیں۔ اور کس طرح اپنے اصلی قالب میں واپس آسکتے ہیں۔ جب یہ فن مجکو آگیا تو میں نے ایک دن یہ تماشا کیا کہ میرے کٹی کے سامنے ایک سوار جا رہا تھا۔ میں نے خیال کیا۔ اس کے قالب میں داخل ہونا چاہیے۔ میں بھی جنگل میں اوس کے تعاقب میں چلا۔ وہ

تھوڑی دور جاکر چشمہ کے کنارہ سبزہ پر لیٹ کر سوگیا۔ میں نے فوراً اپنے عمل سے اوس کو سُلا دیا۔ اور اپنے قالب سے نکل کر اوس کے قالب میں داخل ہوگیا۔ اور اپنے جسم کو حفاظت سے وہیں چھوڑ دیا۔ میں گھوڑے پر بیٹھ کر آبادی کی طرف واپس چلا کہ دفعتاً پولس کے ایک مسلح دستے نے مجکو حراست میں لے لیا۔ معلوم ہوا کہ میں نے کسی ٹھاکر کو اوس کی حسین لڑکی کے خاطر جان سے مار ڈالا ہے۔ مجکو تشویش ہوئی کہ ناحق میں نے ایسے مجرم کے قالب میں اپنی روح ڈالی۔ اب کیا کر سکتا تھا۔ فوراً حراست میں لے لیا گیا۔ میں واقعات سے واقف نہیں تھا۔ حوالات میں بند کر دیا گیا مقدمہ شروع ہوا معلوم ہوا میرے اعزہ بہت سے پیدا ہوگئے ہیں یعنی اوس (چھتری کے اعزہ) مقدمہ کی پیروی شروع ہوئی خوب خوب روپیہ خرچ ہوا۔ ایک دن اتفاق سے ایک لاش معائنہ کے لئے آئی۔ میں نے فوراً اوس کے قالب میں جاکر مخلصی حاصل کی۔ اب معلوم ہوا کہ وہ مجرم خودکشی کرکے مرگیا۔ میں نے توبہ کی کہ آیندہ کسی شخص کے قالب میں داخل نہ ہوں گا۔ یہ جدید شخص بھی ایک مجرم تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ پیر اب میرے اختیار میں تھے۔ میں نے اپنی کٹی میں کیا دیکھا بابا سکھدیو رام مرگئے میں فوراً اوس کے جسم میں جو ابھی خراب نہ ہوا تھا داخل ہوگیا۔ اب میری بھی اتنی قدر ہونے لگی جس طرح حقیقتاً بابا کی ہوتی تھی۔ میں ایک دن اس چشمہ کے قریب اپنے جسم کو دیکھنے کے لئے گیا۔ معلوم ہوا کہ اوس لاش کو پولس اٹھا لے گئی۔ اور سرگرم تفتیش تھی۔ بالآخر اوس کا کریا کرم کر دیا۔ میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے عہد کیا اب مرد کے بھیس میں نہ آؤں گا —— چنانچہ ایک خوبصورت عورت کو میں نے دیکھا کہ وہ سو رہی ہے۔ میں فوراً اوس کے جسم میں داخل ہوکر ایک جانب چلا۔ دور سے ایک فوجی افسر آرہا تھا۔ اوس نے مجکو دیکھا اور کچھ اس طرح مجکو دیکھ کر اوس نے دل دے دیا کہ میں بھی مجبور ہوگیا وہ لڑائی پر جانے والا تھا۔ خدا معلوم کس طرح وہ مجکو بھی اپنی بیوی بناکر ساتھ لے گیا۔ اوس زمانہ میں عراق میں لڑائی ہو رہی تھی۔ اوس افسر نے مجکو قصر شیریں کے قریب ایک مکان میں رکھا۔ اور خود وہ فوج میں چلا گیا معلوم نہیں اوس کا کیا حشر ہوا؟ میں عرصہ تک اوس مکان میں رہی کہ ایک دن ایک ایرانی خاندان تجارت پیشہ آیا۔ اور اُن کی ایک خوبصورت لڑکی سلمہ مجکو بہت پسند آئی۔ وہ اتفاق سے ہیضہ میں مبتلا ہوئی۔ اور جب اوس کا وقت قریب ہوا۔ میں نے اپنا عمل کیا اور اوس کی روح میں داخل ہوکر وہاں سے فرار ہوگئی قصر شیریں میں یہ مشہور ہوگیا کہ فوجی افسر کی نوجوان خوبصورت بیوی دفعتاً ہیضہ میں مبتلا ہوکر مرگئی۔ اور تاجر صاحب کی لڑکی سلمہ دفعتاً جو علیل تھی غائب ہوگئی مختلف افسانے بیان کئے جاتے ہیں —— میں شط العرب چلی گئی۔ وہاں کیپٹن قدوائی سے شادی کی لیکن کچھ دنوں کے بعد میں عورت کے بھیس سے عاجز آگئی تھی۔ ایک دن میں نے اس مچھلی کے قالب میں ایک سوراخ پایا اوس میں میں چلا گیا۔ یہ مچھلی سلمہ نے قدوائی کو دی تھی (یعنی میں نے ہی پیش کی تھی) مشہور ہوگئی کہ سلمہ مرگئی۔ اور وہ دفن بھی کر دی گئی۔ میں مچھلی کے قالب میں عرصہ تک میز پر رہا۔ اکثر اشیاء میں نے چرائیں لیکن ایک دن موقعہ مل گیا۔ میں اس مچھلی کے قالب سے بھی نکل گیا۔ اور ایک جوگی کے قالب میں داخل ہوا۔ لیکن ایک جماعت نے مجکو مار ڈالا۔ اور میری روح کو دوسرے قالب میں داخل نہ ہونے دیا —— اب بہت

پریشان ہوں ——— اب وجود اینٹری قبول کر چکا ہوں"

میں نے یہ قصہ پڑھا مجکو کچھ ہنسی آئی اور کچھ غصہ ان خاں صاحب کو تو انعام اکرام دے کر رخصت کیا - اور اب لوگوں سے یہ واقعہ بیان کرتا ہوں -

کیپٹن صدیقی - کیا کسی ترک سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی ؟

فاروقی - میرے سامنے کا واقعہ ہے انھوں نے اس ترک کو کھانا کھلایا تھا - چائے پلائی تھی -

قدوائی - غالباً وہی ہوگا - ٹھیک ہے تمہارا خیال صحیح ہے -

صدیقی - اچھا اگر ایسا ہے تو تار دے کر اس واقعہ کی اصلیت دریافت کی جائے -

فاروقی - اور تمہارے والد والا واقعہ بھی تفتیش طلب ہے !

یہ گفتگو ہوئی رہی تھی کہ دفعتاً آفیسر کمانڈنگ کا تار ملا کہ ۲۸ پانیر رجمنٹ کو برما کی بغاوت فرو کرنے کے لئے تراو فوراً دوسری گاڑی سے چلا جانا چاہیئے - اور اسی وقت یہ حکم سنا دیا گیا - اور کیپٹن قدوائی روحانیوں کو گالیاں دیتے ہوئے اپنا اسباب درست کرنے میں مصروف ہوگئے -

ناظر بی - اے (کاکوروی)

فلسفۂ مذہب | اردو زبان میں بالکل پہلی کتاب جو ایک شخص کو مذہب کی حقیقی اہمیت اور اسلام کے صحیح مفہوم سے آگاہ کرتی ہے - ان مضامین کے سلسلے نے ملک میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا تھا -

اس کتاب کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں قیمت معہ محصول ۱۲؎

تذکرہ خندہ گل | چار روپیہ کی کتاب معہ محصول دو روپیہ میں

دونوں ساتھ دیکھئے

فراست الید ——— **فراست التحریر**

عہ علاوہ محصول عہ

(دونوں معہ محصول عہ میں)

حضرت نیاز کی ڈائری

ادبی جواہر پاروں کا گنجینہ روانہ ہو رہی ہے معہ محصول ایک روپیہ ایک آنہ میں

مینجر نگار

فن اشتہار

(تاریخی، فنی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے)

انگلستان کے ملک الشعراء شیکسپیر نے کسی زمانہ میں لکھا تھا کہ:- "نام میں کیا رکھا ہے!" لیکن اگر آج شیکسپیر زندہ ہوتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ "نام نکو" حقیقتاً بڑی قیمتی چیز ہے۔ تبلیغ و اشاعت، پروپیگنڈا، ایک طاقت ہے جس کے ذریعہ سے بڑے بڑے کام نکلے ہیں اور ہمیشہ نکلیں گے، مگر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہر طاقت میں خیر و شر دونوں پنہاں ہوتے ہیں، اور اب یہ ہمارا سلیقہ ہے کہ ہم اس سے اچھا کام لیں یا برا، جس طرح پروپیگنڈا کے ذریعہ سے کسی قوم کے اخلاق کی تعمیر بھی ہو سکتی ہے اور تخریب بھی اسی طرح تجارتی دنیا میں اشتہار کے ذریعہ سے، بشرطیکہ وہ سچا ہو، ناظرین کو اشیاء کی نوعیت اور خصوصیت سے آگاہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ کب اور کہاں مل سکتی ہیں۔

اشتہار ذریعہ شہرت ہے، اور شہرت کے ذریعہ سے انسان کا معیار زندگی بلند ہو جاتا ہے۔ جس طرح عقلمند آدمی گمنام خطوط کی طرف توجہ نہیں کرتے، اسی طرح عموماً ان مصنوعات کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتے جن کے کارخانہ کا نام معلوم نہ ہو۔ اشتہار دینے سے اشیاء کی طلب میں اضافہ ہوتا ہے اور جب کسی چیز کی طلب زیادہ ہوتی ہے تو اس کی پیداوار یا رسد میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی جس قدر عمدگی اور سرگرمی کے ساتھ کسی چیز کا اشتہار دیا جائیگا اسیقدر وہ زیادہ خرچ ہوگی، اور جس قدر مقدار زیادہ خرچ ہوگی اسی قدر اس کی برآورد میں بھی اضافہ ہوگا۔ اور جس قدر برآورد کی مقدار زیادہ ہوگی اسیقدر اس کی لاگت میں کمی ہوگی۔

یہ بات کہ اشتہار دینے سے مشتہر کو کس قدر نفع حاصل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ "قومی انجمن خوردہ فروشان" (National Retailer's Association) کی اس رپورٹ سے ہو سکتا ہے جو حال ہی میں اس نے شائع کی ہے اور ظاہر کیا ہے کہ مشتہرہ اشیاء میں سے کم از کم ۷۰ فیصدی کی نکاسی ہوتی ہے۔ اور اگر مشتہرہ چیز کی قیمت غیر مشتہرہ چیز کی قیمت سے کسی قدر زیادہ ہو تو بھی مشتہرہ چیزیں ساٹھ فیصدی خریدی جاتی ہیں۔

تاریخ | فن اشتہار بہت قدیم ہے۔ مصر میں ایک قدیم نوشتہ برآمد ہوا ہے جو تین ہزار سال کا پرانا ہے۔ یہ کتبہ فی الحقیقت ایک اشتہار ہے جو ایک دولت مند شخص کی طرف سے دیا گیا تھا، اور جس میں اعلان کیا گیا تھا

کہ اگر کوئی شخص ایک مفرور غلام کا پتہ بتائیگا یا اُسے واپس لاکر حوالہ کریگا تو اسے اس قدر رقم بطور انعام دیجائیگی۔

بائبل کے عہد نامۂ عتیق میں بھی اشتہار کا ذکر آتا ہے۔ صحیفہ روتھ میں بوآز کہتا ہے :- میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اشتہار دوں اور باشندوں کے سامنے کہوں کہ "اُسے خرید لو"۔

قدیم زمانہ میں سکہ کا وجود نہ تھا بلکہ تبادلۂ اشیاء کے ذریعہ سے خرید و فروخت ہوتی تھی۔ پھر چونکہ تبادلۂ اشیاء کرنے والوں کا حلقہ بہت محدود ہوتا تھا۔ اس لئے ہر خریدار مطلوبہ شے کے بنانیوالے سے واقف ہوتا تھا اور اشتہار کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تھی - رفتہ رفتہ جب اجنبیت کم ہوتی گئی اور ایک مقام کے آدمیوں کا دوسرے مقام کے آدمیوں سے میل جول بڑھا تو تجارت میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی اور ایک مقام کا مال دوسرے مقام تک پہونچنے لگا اور اس کے بعد جب منڈیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور مختلف مقامات پر میلے اور بازار لگنے لگے تو ایک مقام کے تاجر دوسرے مقامات میں جاکر مال فروخت کرنے لگے - ہر شخص زبانی صداؤں یا منادی کے ذریعہ سے اپنے اپنے مال کا اشتہار دینے لگا چنانچہ اَب بھی اکثر پھیری والے بازاروں، گلیوں کوچوں میں دلفریب صدائیں لگا کر خریداروں کی توجہ اپنے مال کی طرف منعطف کرتے ہیں۔ جب پندرہویں صدی میں فن طباعت کی ایجاد یورپ میں ہوئی تو سب سے پہلا اشتہار انگریزی میں اپریل سنہ ۱۶۴۷ء میں شائع ہوا جو حسب ذیل تھا:۔

"ایک کتاب حکومت کلیسا کا آسمانی حق" جس کی انگلستان کے پادریوں نے بیحد تعریف کی ہے، اور جسے لندن کے بہت سے ممتاز علماء دین نے تالیف کیا ہے۔ جس کی بہت سے مقامات میں تصحیح ہوئی ہے اور بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔ علماء دین انگلستان کے خلاف بعض سوالات کے جوابات بھی دے گئے ہیں۔ حسب فرمائش جوزف ہنسکاٹ اور جارج کالورٹ شائع ہوئی ہے جو اسٹیشنرس ہال اور گولڈن فلیس میں فروخت ہوتی ہے۔

اس زمانہ میں ہفتہ وار اخباروں کو "مرکریز" (Mercuries) کہا کرتے تھے۔ چنانچہ مرکیوریس ایلینکٹیکس (Mercurius Elancticus) کے نمبرہ ۴۴ مورخہ ۴ اکتوبر سنہ ۱۶۴۸ء میں حسب ذیل اشتہار شایع ہوا:۔

ناظرین کرام سے التماس ہے کہ وہ ایک وعظ "آئینۂ اشتراکین" کا مطالعہ فرمائیں جو مسٹر پال نیل ایم۔ اے نے بروز اتوار مورخہ ۲۴ ستمبر سنہ ۱۶۴۸ء کو بمقام سینٹ پیٹرز ارشاد فرمایا تھا۔ ایک دوسری کتاب قابل ملاحظہ اور ہے۔ جس کا نام ہے "ہمارے مصلحین کا عکس مع دعا برائے پارلیمنٹ"

اسی طرح "مرکیوریس پولیٹکیس" (Mercurius Politicus) مورخہ جنوری سنہ ۱۶۵۲ء میں ایک نظم کے متعلق اشتہار نکلا جو دراصل ایک شجاع جنرل کی شان میں قصیدہ تھا۔

"دی کنگڈمس ویکلی ریکارڈس" مورخہ سنہ ۱۶۵۹ء میں اشتہار بازی کے متعلق حسب ذیل مشورہ دیا گیا تھا:۔

"بہت مناسب ہوگا کہ ہر موضع یا قصبہ میں کوئی مشہور اور نمایاں مقام مقرر کیا جائے مثلاً گرجا کا دروازہ، سراے یا لوہار کی دکان وغیرہ جہاں اس قسم کے اشتہارات چسپاں کئے جایا کریں، مثلاً فلاں کھیت لگان پر دیا جائیگا، فلاں شخص کو ملازم کی یا ملازم کو نوکری کی ضرورت ہے۔ وغیرہ وغیرہ"

رفتہ رفتہ اخباروں میں اشتہارات کی اس قدر بھرمار ہونے لگی کہ لندن گزٹ کو اپنے نمبر ۶۲ مورخہ جون ۱۶۶۶ء میں ایک اشتہاری ضمیمہ شائع کرنے کے بارہ میں حسب ذیل نوٹس شائع کرنا پڑا:۔

اشتہار:۔ چونکہ روزمرہ کتابوں، ادویہ، اور دیگر چیزوں کے اشتہارات کی ضرورت سے زیادہ کثرت ہوتی جاتی ہے، جن کا شائع کرنا ایک خبر رساں اخبار کے فرائض سے باہر ہے، اس لئے خاص و عام کو ہمیشہ کے لئے مطلع کیا جاتا ہے کہ ہم اپنے گزٹ کو اشتہاروں سے ہرگز نہ بھریں گے، تاوقتیکہ ان اشتہارات کا تعلق امور سلطنت سے نہو البتہ اشتہاروں کا ایک پرچہ علٰحدہ شائع کرکے پبلک میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری نوٹسوں کے علاوہ اُس زمانہ میں جس قدر اشتہارات شائع ہوتے تھے اُن کا تعلق زیادہ تر کتابوں اور دواؤں سے ہوتا تھا۔ البتہ "مرکیوریس پولی ٹیکس" نمبر ۴۳۵ مورخہ ستمبر ۱۶۵۸ء میں سب سے پہلا اشتہار ایسا شائع ہوا جس کا تعلق ان چیزوں سے نہیں تھا وہ اشتہار یہ تھا:۔

"ایک نہایت نفیس چینی مشروب جسکی اطبا تعریف کرتے ہیں، اور جسے اہل چین "Tcha" (چائے) اور دیگر اقوام "تائے" (Tay) یا "ٹی" (Tee) کہتے ہیں، قہوہ خانہ سوٹننگ رینٹ میں فروخت کی جاتی ہے بیچنے والے لندن کے رائل اکسچینج والے ہیں"

اس سے ہر شخص واقف ہے کہ برطانیہ اور امریکہ میں بہت سے کاروبار والے ایسے ہیں جو اپنے اشتہاروں پر ہزاروں پونڈ سالانہ صرف کرتے ہیں، چنانچہ پیٹنٹ دوا کی ایک کمپنی برطانیہ اور امریکہ میں ایسی ہے، جس نے ایک سال کے اندر اشتہاروں پر دو لاکھ پونڈ خرچ کئے اور کوکو بنانے والے ایک کارخانہ نے صرف برطانیہ کے اندر ڈیڑھ لاکھ پونڈ محض اشتہاروں پر صرف کئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کارخانوں کو اشتہار کے ذریعہ سے کسقدر آمدنی ہوتی ہے کہ وہ اس قدر عظیم الشان مصارف اشتہارات کے برداشت کر سکتے ہیں۔ الغرض تجارت کے میدان میں اشتہار نے ایک مستقل اہمیت حاصل کر لی ہے۔

اشتہار کی مختلف صورتیں بیسویں صدی کی ابتدا میں جس قسم کے اشتہارات دئے جاتے تھے، اُن کو ہم مندرجہ ذیل اقسام میں منقسم کر سکتے ہیں:۔

(۱) گذشتہ ربع صدی کے اندر کتابوں، رسالوں اور اخباروں میں اشتہار دینے کا کام اس قدر وسعت اختیار

کرگیا ہے کہ اشتہار نویس اور مصوروں کی بہت بڑی تعداد پیدا ہوگئی ہے، مگر جہاں تک اشتہار نویسی میں جدت کا تعلق ہے، اس کا سہرا اہل امریکہ کے سر ہے۔ جسقدر ترقی اور وسعت اہل امریکہ نے فن اشتہار بازی کو دی ہے، اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری قوم نہیں کرسکتی۔ ابتدا میں انگلستان کے مشتہرین اخبار کا صرف ایک کالم استعمال کیا کرتے تھے۔ انکا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ اپنا اور اپنے کارخانہ کا نام ناظرین کے سامنے بار بار پیش کریں۔ اور ان کے اشتہاروں میں نہ کوئی دلفریبی ہوتی تھی نہ دلچسپی۔ ایک عیب اُن کے اشتہاروں میں یہ بھی ہوتا تھا کہ تمام اشتہار شروع سے آخر تک نہایت باریک ٹائپ میں چھاپا جاتا تھا۔ لیکن اب اشتہار ہر قسم کے ٹائپ اور نمایاں جگہ میں مع تصاویر کے شائع کئے جاتے ہیں

(۲) بڑے بڑے کاغذ کے تختوں پر نمایاں سرخیوں اور دیدہ زیب تصاویر کے ذریعہ سے بھی اشتہار دئے جاتے ہیں۔ پوسٹروں کا خط عموماً جلی اور سرخیاں عموماً دلچسپ ہوتی ہیں۔ مضمون اگرچہ کم ہوتا ہے۔ مگر دلچسپ اور موثر زیادہ ہوتا ہے۔ پوسٹر عموماً شارع عام پر چسپاں کر دئے جاتے ہیں۔ مگر اب یہ طریقہ غیر موثر ہوگیا ہے، کیونکہ لوگ شارع عام پر کھڑے ہوکر اب کسی اشتہار کا پڑھنا اچھا نہیں سمجھتے۔

(۳) اشتہارات اور لٹریچر بذریعہ ڈاک لوگوں کے پاس روانہ کرنا۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے

جس طرح ہر مشتہر کو اپنے مفاد کا خیال ہوتا ہے، اسی طرح ہر خریدار کو اپنے نفع کی فکر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ عموماً وہ اشتہارات زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو براہ راست اور خوشگوار طریقہ سے ناظرین کے مفاد اور ان کی خواہشات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک اشتہار میں حسب ذیل الفاظ درج ہیں۔

" یہاں آپ کو ہر قسم کی چیزیں ملیں گی۔ اور جس قیمت اور خوبی کی چیز آپ پسند فرمائیں گے وہ آپ کے سامنے پیش کی جائیں گی"

مندرجہ بالا عبارت کی طرف زیادہ خریدار متوجہ ہوں گے بمقابلہ مندرجہ ذیل تحریر کے:۔

" ہمارے یہاں سامان کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ ہمارا مال اعلیٰ قسم کا ہے۔ ہمارے یہاں قیمتیں کم ہیں "

ہمیشہ اس قسم کا اشتہار کاروبار کے لئے مفید ہوگا جس میں خریدار کو دوستدارانہ مشورہ دیا جائے کیونکہ اس طرح اشتہار اشتہار نہیں رہتا بلکہ وہ ایک دلچسپ پیام اور نوید خوشخبری ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے اشتہار کے لئے ضروری ہے کہ دوکاندار اپنے گاہکوں یا متوقع خریداروں سے بخوبی واقف ہو، ان کے رجحانات اور طبائع کا پوری طرح علم حاصل ہو ورنہ نتیجہ مفید نہیں نکل سکتا۔ مثلاً فرض کیجئے۔ شمس النہار اور بدرالنسا، دو بہنیں ہیں، ایک کی شادی کسی تعلقدار سے ہوئی ہے اور دوسری ایک سوداگر کے عقد میں آئی ہے۔ دونوں کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق لباس اور دیگر ضروریات کی تلاش ہے۔ اس لئے ایک ہی اشتہار کے ذریعہ سے آپ دونوں بہنوں کو اپنا خریدار نہیں بنا سکتے۔ آپ کو دونوں کے سامنے مختلف مضمون کے اشتہارات پیش کرنا ہوں گے۔

ایک ہوشیار اور دانشمند مشتہر اپنے اشتہار کو اس خوش اسلوبی سے پیش کرے گا کہ دیکھنے والوں کے احساسات فوراً متاثر ہوں۔ مثلاً ایک مشتہر اپنے کارخانہ کی بنی ہوئی چائے فروخت کرنا چاہتا ہے؛ اپنے اشتہار میں وہ ایک ایسی تصویر دیتا ہے جس میں ایک شخص چائے پیتا نظر آتا ہے اور اس کا چہرہ مسرور ہے۔ اس تصویر کے ذریعہ سے گویا مشتہر نے شائقین چائے کی نہ صرف حس باصرہ سے اپیل کی ہے بلکہ چہرہ کو شگفتہ دکھا کر لوگوں کی حس ذائقہ سے بھی اپیل کی گئی ہے، اور اگر تصویر میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ پیالی سے بھاپ اٹھکر پینے والے کی ناک تک پہونچ رہی ہے اور وہ مسکرا رہا ہے تو یہ تصویر قوت شامہ کو بھی متاثر کریگی۔ الغرض تصویری اشتہاروں کے ذریعہ سے حواس انسانی پر اثر ڈال سکتے ہیں۔

انسان کی خاص خاص خواہشات حسب ذیل ہیں :-

بھوک۔ تعلقات جنسی۔ مادری یا پدری تعلق، اشتیاق، خوف۔ جنگجوئی۔ مدنیت، جذبۂ تفوق، عجز و انکسار۔ اور اس لئے جو مشتہرین زیادہ تجربہ کار ہوتے ہیں وہ اپنے اشتہارات میں حسب ضرورت انھیں احساسات کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور چونکہ حسن نسوانی کا فطرتاً انسان کے دل پر بہت اثر پڑتا ہے اس لئے سوئی سے لیکر موٹر تک کے اشتہارات میں حسین وجمیل عورتوں کی تصویروں سے کام لیا جاتا ہے۔ خصوصاً منجن کا تو کوئی اشتہار کسی خوبصورت خاتون کی تصویر سے خالی نہیں ہوتا یہی حال عطریات کا ہے۔

اس کا بڑا لحاظ رکھنا چاہئے کہ لوگوں کے حافظہ میں کیونکر کسی چیز کے خیال کو مرتسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کارخانے نے سگار کا اشتہار دینا شروع کیا اور اس کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اس کی ترقی کا راز صرف یہ تھا کہ سگار کے بکس پر جو کاغذ لپیٹا جاتا تھا اس پر اس ملک کے ایک دلفریب منظر کی تصویر بنائی گئی تھی جہاں اس سگار کا تمبا کو پیدا ہوتا تھا آپ نے موٹر ٹائر کا ایک اشتہار انگریزی اخباروں اور رسالوں میں دیکھا ہوگا جس میں ایک آدمی کی پوری تصویر ٹائروں کے ذریعہ سے بنا دی جاتی ہے۔ اس کا نام جدت ہے اور اشتہار میں اس سے بہت کامیابی ہوتی ہے۔ ایک موٹر کے اشتہار میں موٹر چلانے کی جگہ پر بندر بٹھا دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس موٹر کا چلانا اس قدر آسان ہے کہ اسے ایک جانور یا بچہ تک چلا سکتا ہے۔ اس اشتہار کو دیکھتے ہی عوام کی قوت تخئیل پر اثر پڑتا ہے۔ اشتہار کے لئے بہترین چیز مشتہر کا ذاتی تجربہ ہوا کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص اشتہار دیکر دولت کمانا چاہتا ہے تو اس کے لئے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ وہ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سب کے خصوصیات اور رجحان طبع سے بخوبی واقف ہو۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگوں کی توجہ اپنے مال کی طرف منعطف کرکے اُن کو اپنا خریدار بنائیں تو آپ کو چاہئے کہ خود کو اپنے آپ خریدار کی جگہ تصور کریں اور سوچیں کہ آپ کے خیالات کیا ہیں ——— اور یہ کہ آپ نے جو اشتہار اپنے مال کا دیا ہے اس کا اثر آپ کی طبیعت پر پڑتا ہے۔ موثر اشتہار کے لئے ضروری

ہے کہ جو کچھ بذریعہ اشتہار آپ فروخت کرنا چاہتے ہیں اس کی نسبت سب کچھ صاف صاف اور سچ سچ کہدیجئے اگر آپ بذریعہ اشتہار کوئی ایسی چیز فروخت کرنا چاہتے ہیں جو واقعی اچھی نہیں ہے تو اشتہار دینے کی ضرورت نہیں اور نہ اس میں کامیابی ہوسکتی ہے۔

اشتہار کی عبارت ایسی ہونی چاہئے کہ لوگ یہ سمجھ سکیں کہ آپ کو شئے مشتہرہ کے تمام حالات سے پوری آگاہی حاصل ہے اسی لئے اگر وہ چیز مختلف صورتوں میں استعمال ہوسکتی ہے تو آپ کو اشتہار میں صاف صاف لکھنا چاہئے کہ۔ اس چیز کے اتنے فوائد ہیں " یہ نہ لکھیں کہ "اس چیز کے بیشمار فوائد ہیں"

خریدار کی طبیعت پر اثر ڈالنے کے لئے اشتہار کے الفاظ ایسے ہونے چاہئیں کہ ان کے سچے ہونے کا یقین آجائے شئے مشتہرہ کی تمام خصوصیات بلاکم وکاست بیان کر دینا چاہئے اور مبالغہ سے بالکل کام نہ لینا چاہئے۔ اشتہار میں طویل فقروں سے ہمیشہ محترز رہنا چاہئے، کوئی فقرہ تیس پینتیس لفظوں سے زیادہ نہ ہو، اور جس اشتہار میں عوام الناس کو مخاطب کیا جائے اس میں دس پندرہ لفظوں سے زائد کا کوئی فقرہ استعمال کرنا چاہئے کیونکہ عوام کی تعلیم ناقص ہوتی ہے۔ عبارت نہایت صاف صاف ہونا چاہئے اور الجھن سے بالکل صاف۔ فعل و فاعل اور خبر و جزا کو قریب ہی قریب رکھو۔ تعقید ہرگز نہ پیدا ہونے دو، ہر فقرہ اپنے معنی و مطلب کے لحاظ سے مکمل ہو تاکہ پڑھنے والا پڑھنے کے ساتھ سمجھتا چلا جائے اور کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ الفاظ کی ترتیب اور جملوں کی ترکیب میں ہمیشہ صرف ونحو کا خیال رکھو۔ "یہ" "وہ"۔ "اِس"۔ "اُس"۔ اور "کب" "جُب" "کہاں" وغیرہ کے اشارے صاف اور صحیح ہوں غیر مانوس، ثقیل، اور بازاری الفاظ سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہئے یہ یاد رہے کہ اگر اردو زبان میں اشتہار دے رہے ہیں تو ترکی، عربی، فارسی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال قطعی نامناسب ہے۔ اسی طرح سنسکرت یا ہندی الفاظ کی بھرمار بھی مناسب نہیں الغرض اشتہار کے الفاظ لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رہے کہ سمجھنے کے لئے پڑھنے والے کو دماغ پر زور دینا نہ پڑے۔ اشتہار کی جان لوگوں میں حالت منتظرہ پیدا کرنا ہے۔ یعنی اشتہارات کی ترکیب اس طرح ہونی چاہئے کہ پہلے اپنے مال کی صفت بیان کرتے ہوے اس کے نام معلوم کرنے کا شوق لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا جاے اور پھر رفتہ رفتہ آخر میں مشتہر چیز کا نام بتایا جاے اس سے اشتہار میں ایک قسم کی قوت پیدا ہوجاتی ہے۔

فی زمانا زندگی کی جد وجہد اس قدر سخت ہوگئی ہے کہ لوگوں کو بڑی بڑی تحریریں پڑھنے کی فرصت نہیں۔ اسلئے اشتہار دیتے وقت ہمیشہ اختصار کا خیال رکھنا چاہئے۔ اشتہار میں ہمیشہ کم سے کم الفاظ استعمال کرو۔ لیکن یہ الفاظ ایسے ہوتے چاہئے کہ چیز کی تصویر سامنے آجائے۔

اشتہار کو دیدہ زیب بھی ہونا چاہئے۔ کیونکہ ہمارے اسّی فیصدی تاثرات حسِ باصرہ کے ذریعہ سے پیدا ہوتے

ہیں۔ اشتہار میں جسقدر الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی جائیں وہ معروف افعال صیغوں کی صورت میں ہوں، مجہول نہ ہوں مثلاً آپ یہ لکھئے کہ :۔

"فلاں چیز استعمال کرکے اپنی مدد کیجئے، اپنا وقت بچائیے۔ اور اپنی پریشانی رفع کیجئے"

یہ نہ لکھئے کہ :۔

"اگر آپ فلاں چیز استعمال کریں گے تو آپ کو مدد ہوجائیگی، آپ کی دقتیں رفع ہوجائینگی اور آپ کا وقت بچ جائیگا"

زوردار الفاظ ہمیشہ اس جگہ استعمال کیجئے جہاں زور دینے کی ضرورت ہو اور کوئی دعویٰ بغیر دلیل اور ثبوت کے پیش نہ کیجئے۔ اشتہار ہمیشہ اثباتی و ایجابی الفاظ میں ہونا چاہئے اور منفی الفاظ سے احتراز کرنا چاہئے۔

مثلاً اگر چاقو کا اشتہار دینا ہے تو یہ لکھو کہ :۔ "اپنی دہار ہمیشہ قائم رکھتا ہے" یہ نہ لکھو کہ جلد کند نہ ہوگا"

آج کل جو اشتہارات رائج ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک جذباتیہ، یعنی ایسے اشتہار جن کے ذریعہ سے ہم انسان کے جذبات سے اپیل کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر تصاویر سے کام لیا جاتا ہے، دوسرے تعلیلیہ۔ یعنی وہ اشتہار جن میں بذریعہ دلائل شے مشتہرہ کی خوبی ثابت کی جاتی ہے۔ اور اگر ہم کسی اشتہار میں یہ دونوں باتیں پیدا کرسکیں تو کامیابی کی زیادہ توقع ہے۔

آج کل جو نمائشی اشتہارات نظر آتے ہیں وہ صنعت و تجارت دونوں کے امتزاج کا نتیجہ ہیں۔ جب سے دنیا میں موٹروں کی کثرت ہوگئی ہے، پوسٹروں کے ذریعہ سے اشتہار دینے کا طریقہ بہت وسعت اختیار کرگیا ہے۔ سڑکوں کے دونوں طرف مناسب مقامات پر خوبصورت اور موثر اشتہارات چسپاں نظر آتے ہیں۔ جن کے جلی حروف اور دلچسپ سرخیوں پر اہل نظر کی توجہ ضرور منعطف ہوتی ہے۔ ایک خوبصورت اور دلآویز تصویر اور چند دلچسپ الفاظ کا اشتہار خریدار مہیا کرنے میں سحر کا کام دیتا ہے۔ بعض پوسٹر جو اپنے عقبی منظر سے ہم آہنگی پیدا کرلیتے ہیں وہ نہ صرف منظر کو چار چاند لگا دیتے ہیں بلکہ خریداروں کی توجہ فوراً جذب کرلیتے ہیں۔ بجلی کے ذریعہ سے اشتہار دینے کا طریقہ بھی بالکل حال کی چیز ہے۔ بازاروں میں جہاں برقی روشنی ہوتی ہے اکثر نمایاں مقامات پر کسی چیز کا نام یا پتہ تحریر کردیا جاتا ہے جس پر طاقتور برقی قمقموں کی روشنی پڑتی ہے اور پھر چند لمحہ بعد خود بخود غائب ہوجاتی ہے تو اس کا اثر شے مشتہرہ کی شہرت پر بہت پڑتا ہے۔ اگر روشنی رنگین اور تیز ہوتی ہے تو وہ اور بھی زیادہ جاذب توجہ ہوتی ہے برقی قمقموں کو اس طرح قائم کیا جائے کہ روشنی دور تک پھیلے۔

یہ یاد رکھئے کہ آپ کی دکان ایک اسٹیج ہے۔ اور فروخت کرنے والا ایک ایکٹر۔ لہذا آپ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیں کہ فروخت کرنے والے کا لباس عمدہ اور صاف ہو، اور وہ ایک ایکٹر کی طرح وقت اور موقعہ دیکھکر خریداروں سے گفتگو کرے، اسی طرح دکان کو بھی ہمیشہ صاف اور آراستہ رکھنا چاہئے۔ اگر آپ کے یہاں ہر قسم کا مال موجود ہے

اور دکان میں قرینہ اور سلیقہ کے ساتھ سجا ہوا نہیں ہے تو آپ کی دکان کی طرف بہت کم خریدار متوجہ ہوں گے۔

اشتہار بذریعہ ڈاک اشتہار دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہر شہر و قصبہ کے مشہور اور صاحب حیثیت اشخاص کی فہرست مرتب کرلی جاتی ہے اور پھر ان کے پاس، خطوط، نمونے، فہرستیں، جنتریاں رسالے وغیرہ بھیجے جاتے ہیں مگر یاد رکھئے کہ آپ کا لیٹریچر آپ کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس لئے آپ کے اشتہاری خطوط کی نوعیت ہمیشہ ایسی ہونی چاہئے کہ اگر ان کے مضمون کو بآواز بلند پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہو گویا خریدار کے سامنے آپ خود کلام کر رہے ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ اشتہاری خطوط میں اگر تصاویر اور رنگین حروف سے کام لیا جائیگا تو ان کا اثر اور زیادہ ہوگا۔ اشتہاری خطوط کی کتابت وطباعت نہایت پاکیزہ ہونا چاہئے اور کاغذ بہت نفیس، ایک انسان اگر ایک مرتبہ یا دو مرتبہ پڑھنے سے نہیں بولتا تو تیسری مرتبہ ضرور بولیگا۔ اسی طرح اگر آپ کسی صاحب کی خدمت میں اپنا اشتہاری خط ایک مرتبہ یا دو مرتبہ ارسال کریں تو ممکن ہے کہ وہ بے اثر رہے مگر تیسری مرتبہ آپ کے خط کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ اس لئے مایوس نہ ہونا چاہئے اور بار بار اپنا اشتہار بھیجنا چاہئے۔

ڈاک کے اشتہاروں کو عموماً کسی دلچسپ خبر، حیرت انگیز بیان، اور بعض اوقات کسی دلچسپ لطیفہ سے شروع کرتے ہیں، بشرطیکہ یہ باتیں نفس مطلب سے غیر متعلق نہ ہوں بلکہ چسپاں ہوں۔ اشتہاری خط کا پہلا پیراگراف ہمیشہ ایسا ہونا چاہئے جسے پڑھتے ہی انسان متوجہ ہوجائے۔ اس کے بعد وہ فوائد بتائے جو شئے مشتہرہ سے حاصل ہوسکتے ہیں پھر اس کی قیمت اور شرائط خریداری سے آگاہ کیجئے۔ خط کے آخری حصہ میں آپ پر زور الفاظ کے ذریعہ سے ایسا اثر ڈالئے کہ خریدار فوراً آمادۂ عمل ہوجائے۔ مثلاً لکھئے کہ:—

کارڈ ملفوفہ پر دستخط کرکے ابھی بواپسی ڈاک ارسال فرمادیجئے۔ یا اگر ہماری دکان کی طرف سے گذر ہو تو آج ہی تکلیف کرکے خود ملاحظہ فرمالیجئے۔ یا یہ کہ فلاں رعایت فلاں تاریخ کو ختم ہوجائیگی۔

فہرستوں میں تصاویر سے کام لینا اشتہار دینے کا نہایت موثر طریقہ ہے۔ اشتہار کی تصویر گویا آپ کے مال کی نقیب یا خطیب ہوتی ہے۔ حروف اور تصاویر کے رنگوں کا بھی خریداروں پر بہت اثر پڑتا ہے۔ مثلاً شکاگو کی ایک دکان نے اپنی ایک فہرست سیاہ و سفید اور دوسری رنگین شائع کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاہ و سفید کے مقابلہ میں رنگین فہرست کے ذریعہ سے بہت زیادہ فرمائشیں موصول ہوئیں۔ گمنام چیزوں کی طرف بہت کم لوگ متوجہ ہوتے ہیں، اس لئے آپ اپنی ہر چیز حتیٰ کہ فہرست تک کا بھی کچھ نہ کچھ نام رکھئے۔ مثلاً گھڑی ہے تو لکھئے "۲۱-۱۰" دوا ہے تو لکھئے "اکسیر ۵" فہرست ہے تو لکھئے "ہماری فہرست ۳" طلب فرمائیے۔ وغیرہ

اشتہار کی ترتیب لوگ آپ کا اشتہار پڑھنے کی زحمت اسی وقت گوارا کریں گے جب آپ اُن کو کسی طرح

اپنی طرف متوجہ کر لیں گے۔ اور توجہ حاصل کرنے کا اولیں ذریعہ اشتہار کی سُرخی ہے۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہوگئے تو سمجھیئے کہ لوگ اشتہار کے مضمون کو بھی پڑھیں گے جسے اپنی طرزِ ادا، استعمال تصاویر وغیرہ کے لحاظ سے اتنا ہی دلکش و موثر ہونا چاہیئے۔ جس طرح اشیا مختلف ہوتی ہیں، اسی طرح ان کے اشتہار میں بھی اختلاف و فرق ہونا چاہیئے۔

مثلاً اگر کسی باربرداری کے موٹر کا اشتہار دینا منظور ہے تو آپ کو اشتہار میں اس کے پرزوں کی مضبوطی اور زمین کی دشوار گذاری دکھانا پڑے گی، اور اگر کسی زنانہ تفریحی موٹر کا اشتہار دینا ہے تو اس میں آپ گاڑی کی خوبصورتی و نزاکت دکھلائیں گے۔ پہلے اشتہار کے منظر میں سختی و کرختگی اور دوسرے اشتہار کے منظر میں نفاست اور دلفریبی پیدا کرنا پڑے گی۔

اپنے ہر اشتہار میں آپ کو اپنا تجارتی نشان یا اپنے مخصوص دستخط ضرور دینا چاہیئے۔ جب ان پر لوگوں کی نظریں تواتر کے ساتھ پڑیں گی تو اس سے نہ صرف آپ کے مال کی شہرت بڑھ جائیگی بلکہ ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اشتہار پڑھنے والے کو آپ کی دیگر مصنوعات بھی یاد آجائیں گی۔ مثلاً کانپور کے ایک مشہور کارخانہ کا تجارتی نشان "لال املی" ہے۔ اس کارخانہ کا یہ نشان جب کسی اشتہار یا چیز پر نظر پڑیگا تو اس کی بنائی ہوئی اور چیزیں بھی خیال میں آجائینگی۔ اشتہار میں سرخی اور مضمون کے ساتھ ہی اگر رنگ آمیزیوں اور تصویروں سے بھی کام لیا جائے تو اشتہار میں خاص کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن نقوش و تصاویر کو شئے مشتہرہ کے لحاظ سے انتخاب کرنا چاہیئے۔ مثلاً اگر آپ عطر کی شیشیاں فروخت کرنا چاہتے ہیں تو آپ اپنے اشتہار میں خوشنما پھولوں، رنگیں حاشیوں، یا کسی جمیل عورت کی تصویر سے کام لے سکتے ہیں۔ لیکن بندوقوں اور کارتوسوں کے اشتہار میں ایسی چیزیں بالکل مہمل معلوم ہوں گی۔ اس کے لئے جنگلی جانوروں اور صحرائی مناظر کی تصویریں مناسب ہیں۔ اشتہار کی کتابت میں خفی و جلی مختلف قلموں سے کام لینا چاہیئے، کیونکہ اختلاف سے دیدہ زیبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آپ اپنے اشتہار میں کوئی ایسی تصویر شائع کریں جس میں انگلی سے اشارہ کیا گیا ہے، تو دیکھنے والے کی توجہ فوراً اشارہ کردہ مقام کی طرف مبذول ہو جائیگی یہی اثر سگریٹ کے دھوئیں کے خمدار نشان کا ہوا کرتا ہے۔

اگر کسی موٹر کے اشتہار میں کسی جمیل عورت کی تصویر دی جائے تو وہ ضرور توجہ کو مائل کرے گی، لیکن اگر عورت کو اس طرح سے دکھایا جائے کہ وہ موٹر میں بیٹھی ہوئی سیر کر رہی ہے تو اس کا اثر اور زیادہ اچھا ہوگا تصاویر کے بارہ میں دو باتیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے ایک یہ کہ تصویر میں شئے مشتہرہ کو استعمال کرتے ہوئے دکھانا چاہیئے اور دوسرے یہ کہ تصویر کے ذریعہ سے شئے مشتہرہ کی عمدگی ساخت کو دلفریب ماحول کے ساتھ پیش کرنا چاہیئے۔

تصویریں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کے دیکھنے سے کوئی واقعہ نظروں کے سامنے پھر جائے اور دوسری وہ جو محض جذب نظر کے لئے استعمال کیجاتی ہے۔ مشتہر کے لئے لازم ہے کہ وہ دونوں قسم کی تصاویر کا صحیح استعمال سیکھے

یاد رکھنے کے قابل باتیں مشتہر کو لازم ہے کہ وہ اشاعت اشتہارات سے پہلے ہی پورا خاکہ مرتب کرے اور اچھی طرح سوچ لے کہ مشتہر کردہ شے کے خریدار کون لوگ ہوں گے اور یہ کہ اُس کو فروخت کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہوگا۔

سب سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ جس چیز کا آپ اشتہار دینا چاہتے ہیں وہ ضروریات میں داخل ہے یا سامان تعیش میں، نیز یہ کہ وہ کوئی پُرانی چیز ہے یا نئی۔ کیونکہ وہ چیزیں جو ضروریات زندگی میں داخل ہیں۔ ان کے اشتہارات ان چیزوں کے اشتہارات سے مختلف ہونے چاہئیں جو جدید ہیں یا سامان تعیش میں داخل ہیں۔ اول الذکر قسم کی اشیاء میں قیمت کا خیال سب سے بڑی چیز ہے، اور دیگر قسم کی اشیاء میں وضع قطع، صورت شکل کی دیدہ زیبی کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اگر شے مشتہرہ بالکل جدید چیز ہے تو اُس کے استعمال کے متعلق خریداروں کو تعلیم دینا پڑے گی، اور اگر شے مشتہرہ کوئی مانوس چیز ہے تو خریدار کو اطمینان دلانا پڑے گا کہ آپ کی چیز دوسری چیزوں سے کیوں بہتر ہے۔

اگر آپ کی مشتہر کردہ چیز میں کچھ خصوصیات خاص ہیں تو دوسری اشیاء کے مقابلہ میں ان کو ظاہر کیجئے۔ یہ بھی دیکھئے کہ آپ کی چیز کسی خاص موسم میں زیادہ فروخت ہوتی ہے یا ہمیشہ فروخت ہوتی رہتی ہے، اگر آپ کی چیز فصلی ہے تو اس کے اشتہار کو اسی زمانہ میں وسعت دیجئے جس زمانہ میں وہ زیادہ فروخت ہوتی ہے، اگر آپ کی چیز جاڑوں میں زیادہ فروخت ہوتی ہے تو گرمیوں کے زمانہ میں اس کا اشتہار ان ممالک میں دیجئے جو خط استوا سے زیادہ جانب جنوب واقع ہیں۔

یہ بھی خیال رکھئے کہ آپ کی چیز کو خریدنے والے کون لوگ ہیں۔ یعنی سامان خورد و نوش کی طرح اسے ہر شخص خریدتا ہے یا وہ ایسی چیز ہے جس کا خریدار کوئی خاص طبقہ ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ آپ کی چیز کا خریدار مردوں کا طبقہ ہے یا عورتوں کا۔ اگر آپ کی چیز کے خریدار سب لوگ ہیں تو آپ اپنا اشتہار اس طریقہ سے دیجئے کہ وہ سب کو اپیل کرے، لیکن اگر اسکی خریدار کوئی خاص جنس ہے تو اشتہار دیتے وقت اس خاص جنس کا خیال رکھئے۔

اگر آپ کی چیز کے خریدار کسی خاص طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً مدرسین، یا مزارعین، یا اہل سیف، وغیرہ وغیرہ تو آپ اپنے اشتہار کی ترکیب و ترتیب ایسی رکھئے کہ وہ اس خاص طبقہ کے لوگوں پر اثر انداز ہو۔ مگر یہ یاد رہے کہ ہر شخص کسی ایک چیز کو ایک ہی مصرف کے لئے نہیں خریدتا۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ ہر خریدار کے مزاج سے پوری واقفیت حاصل کریں۔ اور یہ بھی خیال رکھئے کہ آپ کے خریدار قیمت کا زیادہ خیال رکھتے ہیں، یا مال کی خوبی اور اس کے فوائد کا۔

گلابی اردو - (ملا رموزی) قیمت صرف ۸ر بحر تبسم (شوکت تھانوی) قیمت ۱۲ر مینیجر نگار لکھنؤ

تاریخ کا ایک پوشیدہ ورق

حسن تائب

خادمہ، ملکہ تیودورا کے حضور میں آئی، جھک کر آداب بجالائی اور آگے بڑھکر ملکہ کے کان میں آہستہ سے کہا کہ ــ

"میکائیل" ـــــــ

تیودورا نے اپنا سر اُٹھایا اور پوچھا "بڑا یا چھوٹا؟"

خادمہ نے جواب دیا "اے ملکہ عالم، بڑا"

ملکہ نے کہا "بہتر ہے بلاؤ" ـــــــ خادمہ چلی گئی

ملکہ نے اپنی جگہ سے اُٹھکر، چیتے کو جو اس کے قدموں پر پڑا سو رہا تھا، قریب کے پنجرہ میں لیجا کر بند کر دیا، اور واپس آکر اس کمرہ میں جس کا دریچہ سمندر کی طرف کھلتا تھا، مخمل و حریر کے گدوں اور تکیوں پر جاکر لیٹ رہی۔

اسی وقت ایک کشیدہ قامت نوجوان اندر داخل ہوا، جس کی آنکھیں نیلگوں تھیں اور بال بھورے ــ میکائیل دوراں ہوا، ملکہ نے اپنا خوبصورت ہاتھ آگے بڑھایا اور اس نے اپنے لبوں سے لگا لیا۔ ہنوز یہ رسم ختم نہ ہوئی تھی کہ ملکہ نے اپنی آغوش کھولدی اور آخرکار وہ اظہار شیفتگی جس کی ابتدا ملکہ کے ہاتھوں سے ہوئی تھی اس کے سینہ و گردن، شانہ و رخسار تک پہونچنے سے قبل ختم نہ ہوسکا۔

میکائیل نے انتہائی حزن و ملال کے ساتھ کہا "کیا یہ صحیح ہے کہ ملکہ عالم اب میری حاضری کو پسند نہیں فرماتیں اور قصر کے اندر میرا آنا شاق گزرتا ہے۔ اگر یہ غلط نہیں ہے تو کیا میں اس کا سبب معلوم کرسکتا ہوں، کیا مجھے بتایا جاسکتا ہے کہ عنایات شاہانہ میں یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا"

تیودورا نے میکائیل کا سر اپنے ہاتھوں پر سنبھال کر کہا۔ "اے میکائیل، میرے دل میں تیری محبت بدستور قائم ہے، لیکن بعض دفعہ واقعات و حالات کچھ ایسے پیدا ہوجاتے ہیں کہ اُنکا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے۔

تجھے معلوم ہے کہ اس قصر میں داخل ہونے سے قبل، سلطنت بازنطینی کی ملکہ بننے سے پہلے ہی میں تجھ سے

محبت کرتی تھی، اور ملکہ ہونے کے بعد بھی کوشش کرکے میں نے ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ تو آزادی کے ساتھ مجھ سے ملتا رہے، لیکن اب ایک حادثہ ایسا ہوا ہے کہ میں اپنے اور تیرے دونوں کے انجام سے ڈرنے لگی ہوں"

میکائیل- وہ کیا حادثہ ہے۔

ملکہ —— "چند دن ہوئے تیرا بھائی آیا اور مجھ سے ملنے کی درخواست کی۔ چونکہ اس کا نام بھی میکائیل ہے، اسلئے میں نے یہ سمجھکر کہ یہ تو ہی ہے اجازت دیدی"

میکائیل- (گھبراکر) پھر کیا ہوا-

ملکہ —— "اس نے مجھ سے اظہار محبت کیا"

میکائیل —— "پھر"

ملکہ —— "میں نے اس سے کہا کہ فوراً یہاں سے نکل جاؤ، لیکن اس نے جاتے ہوئے غضبناک ہوکر دھمکی دی اور کہا کہ میرے اور تیرے تعلق کو وہ تمام شہر میں مشتہر کریگا اور بادشاہ سے بھی جاکر کہیگا" اس لئے اس واقعہ کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تو اس وقت تک قصر میں آمد ورفت بند کردے، جب تک ....

میکائیل "جب تک؟"

ملکہ —— "ہاں، جب تک کہ تیرا بھائی اس ارادہ سے باز نہ آجائے یا راستہ بالکل صاف نہ کردیا جائے، میکائیل نے یہ سنا اور انتہائی غیظ کے عالم میں دیوانہ وار وہاں سے نکل کھڑا ہوا"

تیودورا کا باپ جانوروں کا ڈاکٹر تھا اور اس کی ماں کا نام کسی کو کبھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ وہ کون تھی اور کیا تھی جب اس کا باپ مرگیا تو وہ بہت کمسن تھی، دنیا اُس پر تنگ ہوئی تو حصول معاش کے لئے اس نے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جو ایک خانماں برباد حسین عورت اختیار کرسکتی ہے، وہ تماشہ گاہوں میں ناچتی تھی، ہوٹلوں میں جاکر گاتی تھی، سڑکوں پر، گلیوں میں اپنے پُرشباب اعضا کی نمائش سے لوگوں کو لبھایا کرتی تھی— اسی زمانہ میں اسکے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور اس کے انجام سے ڈر کر اس نے اپنی آوارہ زندگی کو ترک کرکے ایک دکان قائم کرلی جہاں وہ عورتوں کے کپڑے وغیرہ سیا کرتی تھی- رفتہ رفتہ لوگوں نے اس کے ماضی کو بھلا دیا اور طبقۂ امرا کی عورتیں بھی اس کی دکان پر آنے جانے لگیں- اتفاق سے اسی دوران میں سلطنت کے ولی عہد (یوستی نیانوس) نے اسے دیکھ لیا اور بیتابی کے ساتھ مائل ہوگیا-

ولی عہد کی نسبت کسی اور جگہ ہوچکی تھی اور اپنے مرتبہ کے لحاظ سے بھی وہ تیودورا سے شادی نہ کرسکتا تھا جس کا ماضی اس قدر بدنام اور حال نہایت ادنیٰ درجہ کا تھا- لیکن ایک تو ولی عہد خود فطرتاً بہت آزاد طبع واقع

ہوا تھا، دوسرے اسی زمانہ میں جدید قانون کے رو سے شاہی خاندان کے افراد کو شادی کے مسئلہ میں پوری آزادی دیدیگئی اس لئے تخت نشین ہوتے ہی اس نے تیو دورا سے نکاح کر لیا اور اسے بازنطینی سلطنت کا ملکہ بنا دیا ——

کچھ عرصہ تک تو جاہ و ثروت سلطنت و حکومت کے نشہ نے تیو دورا کو مدہوش رکھا، لیکن جب وہ تھک گئی تو اسکو پھر اپنا وہی دور آزادی یاد آنے لگا اور تمام وہ جذبات جوانی جن کو واقعات نے افسردہ کر دیا تھا، پھر از سر نو تازہ ہوگئے چنانچہ اُس نے اپنے تمام قدیم عشاق کو آہستہ آہستہ بلانا شروع کیا اور چند دن میں قصر حکومت اچھا خاصہ معصیت گاہ بن گیا اُنھیں عشاق میں دو بھائی میکائیل کبیر، و میکائیل صغیر بھی تھے، جو پوشیدہ طور پر ملکہ سے آکر ملا کرتے تھے، لیکن ایک کو دوسرے کی آمد کی اطلاع نہ ہوتی تھی۔ ایک دن چھوٹے میکائیل کو کسی طرح معلوم ہوگیا کہ ملکہ اس کے بڑے بھائی سے بھی ملتی ہے اور زیادہ التفات سے ملتی ہے۔ اس لئے وہ نہایت برہمی کے عالم میں ملکہ کے پاس گیا اور کہا کہ اگر میرے بھائی کی آمد و رفت یہاں بند نہ کی گئی تو میں یہ تمام راز دنیا پر افشاء کر دونگا"

یہ سنکر ملکہ اس وقت تو خاموش ہوگئی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح اس کانٹے کو راستہ سے دور کرنا ہے۔

ملکہ اپنے مخصوص کمرہ میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی ہے کہ خادمہ جو اس کے تمام رازوں سے آگاہ ہے، حاضر ہوتی ہے اور میکائیل کے آنے کی اطلاع دیتی ہے۔

ملکہ چونک کر پوچھتی ہے "بڑا؟" اور پھر ملکہ کے چہرے سے جواب کو پڑھکر مسکراتی ہوئی کہتی ہے "ہاں بلالاؤ میں تو اس کا انتظار ہی کر رہی تھی"

میکائیل آیا اور ملکہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر کہا کہ "جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اس وقت تک مچھلیاں اس کے جسم کو کھا چکی ہونگی"

ملکہ نے گھبرا کر پوچھا "کیا واقعی تو نے اُسے قتل کر دیا"

میکائیل —— "ہاں قتل کر دیا، اور اس کے جسم کو دریا میں ڈالدیا"

"یہ سنکر ملکہ نے اپنی آغوش کھولدی اور دونوں کے لب ایک دوسرے سے مل گئے اس حال میں کہ اُنسے مشتعل آگ کی سی حرارت پیدا ہو رہی تھی"

اس وقت کہ دونوں ریشم کے نرم نرم گدوں پر لیٹے ہوئے ہیجان نفس کی انتہائی کیفیات میں ڈوبے ہوئے تھے، ملکہ کی نگاہ میکائیل کی ہتیلی پر پہونچگئی، اور اُس نے خیال کیا کہ اسپر خوں کا دھبہ موجود ہے۔ اس کے بعد اس نے میکائیل کی دوسری ہتیلی کو دیکھا، چہرہ کو دیکھا، گردن کو دیکھا اور ہر جگہ اُسے خون کے بڑے بڑے دھبے

نظر آنے لگے۔

اس وقت تک تیودورا خدا معلوم کتنے جرائم کی مرتکب ہو چکی تھی، لیکن یہ اس کی زندگی کا پہلا موقعہ تھا کہ اس کے ضمیر نے اس کے جرم کو اس طرح پیش کیا ہو۔ گزشتہ زندگی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آرہے تھے اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی آواز اس کو ملامت کر رہی ہے اور اس کا دل کانپا جا رہا ہے۔

کامل چھ ماہ گزر گئے ہیں کہ ہزاروں معمار باسفورس کے ساحل پر ایک عظیم الشان عمارت کی تکمیل میں رات دن مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ عمارت ملکہ تیودورا کے حکم سے تعمیر ہو رہی ہے جس میں ۵۰۰ آدمیوں کے قیام کا انتظام کیا گیا ہے۔ جس وقت یہ تعمیر مکمل ہو گئی تو ملکہ نے تمام ملک میں اعلان کیا کہ جو عورتیں گناہوں سے تائب ہو کر عصمت و عفت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں وہ آئیں اور اس عمارت میں قیام کریں۔ چنانچہ اس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی عورتیں اس مکان میں جمع کرنا شروع کیں اور کوشش کر کے اُن کی شادیاں شرفائے شہر اور امرائے دربار سے کر دیں۔

اس عمارت کا نام اس نے "دار التوبہ" رکھا تھا اور اس کی نگرانی میکائیل کے سپرد تھی جو خود بھی تائب ہو کر مرتاضی زندگی بسر کرنے لگا تھا۔

بادشاہ یوستی نیانوس بازنطینی تخت حکومت پر ۵۲۷ء سے ۵۶۵ء تک متمکن رہا لیکن اس ۳۸ سال کی مدت میں وہ اس راز سے بالکل ناواقف رہا کہ ملکہ نے دار التوبہ کیوں قائم کیا تھا۔

کیا آپ یہ کتابیں ملاحظہ فرما چکے ہیں؟

خواب و خیال ۔ جناب مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کا مجموعہ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مثنوی زہرِ عشق ۔ مرتبہ مجنوں گورکھپوری۔ جس میں ملک کے چار بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ایک تصویر رنگین ہے سنہری جلد قیمت عہ (علاوہ محصول)

شوپنہار ۔ مجنوں گورکھپوری کی معرکتہ الآرا تصنیف فلسفۂ شوپنہار کے متعلق مع تصویر شوپنہار قیمت عمہ (علاوہ محصول)

تینوں کتابیں ایک ساتھ مع محصول چار روپیہ میں

منیجر نگار لکھنؤ

کیا سرد بازاری کا انسداد ممکن ہے؟

موجودہ سرد بازاری کی وجہ سے جو عالمگیر اضطراب رونما ہے اُس سے لوگ عاجز آگئے ہیں اور ہر شخص کو اس بات کی تمنا ہے کہ کسی طرح ہیئت اجتماعی کے اس وبائی مرض سے نجات مل سکے۔ سرد بازاری کے سخت ترین نتائج بے روزگاری کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور ان سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں پر اثر پڑتا ہے انفرادی طور پر بے روزگاری اکثر المناک واقعات کا سبب بن جاتی ہے۔ اس سے افراد کی نشوونما رک جاتی ہے، اُن کے ہاتھ سے ترقی کے اچھے مواقع نکل جاتے ہیں۔ ناکامی اور مایوسی کے تلخ احساس سے غم و غصہ پیدا ہوتا ہے جس کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں اس کی وجہ سے فسادات رونما ہوتے ہیں جو اخلاقی اور مادی دونوں قسم کے کثیر نقصانات کا سبب ہوتے ہیں۔ ان امور کو سامنے رکھتے ہوئے، حکماء اور مدبرین اس تلاش میں مصروف ہیں کہ ایسا طریقہ دریافت کیا جائے جس سے ترقی کی رفتار میں یکسانیت پیدا کی جا سکے۔ اب تک جس رفتار پر دنیا چلتی رہی وہ عجب بے ڈھنگی وضع کی رہی ہے۔ اگر دنیا نے ایک وقت اچک کر تین قدم آگے بڑھائے ہیں تو اس کے فوراً بعد اُسے مجبوراً دو ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اگر ایک وقت "طلب" کی فراوانی ہے تو اس کے فوراً بعد "طلب" عنقا ہو جاتی ہے۔ لوگ مزدوروں کو علحدہ کر دیتے ہیں، مشینیں بیکار پڑی رہتی ہیں، کارخانے اور دوکانیں بند ہو جاتے ہیں۔ غرضکہ ہر طرف ابتری ہو جاتی ہے۔ "طلب" کا انحصار کل آبادی کی ضروریات پر ہے اور انھیں زیادہ تر مستقل حیثیت حاصل ہونا چاہئے۔ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک وقت کم آبادی کی ضروریات، زیادہ آبادی کی ضروریات کے مقابلہ میں کثیر نظر آتی ہیں اور دوسرے وقت معاملہ بالکل برعکس ہو جاتا ہے۔ دنیا کی کل آبادی معلوم کرنے کے بعد، اس کا اندازہ کرنا سہل ہے کہ دنیا کے رہنے والوں کو کس قدر غذا، کپڑوں، مکانوں اور دیگر ضروری اور غیر ضروری اشیاء کی طلب ہوگی۔ اس اندازہ میں تھوڑی بہت غلطی کی گنجائش ہے جس کی اصلاح بڑی حد تک، صورت حال کے نازک ہو جانے سے پیشتر کی جا سکتی ہے مگر بصورت مجموعی اس اندازہ پر کامیابی کے ساتھ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اگر مقصد محض فراہمی ضروریات ہو جائے تو مستقل "طلب" کے تعین کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ نہیں رہتا۔

رہا سوال ترقی علوم وفنون اور اضافہ اہلیت پیداوار کا جس سے "رسد" میں ترقی ہوتی ہے تو اگر اس اضافہ رسد کی غائت، نئی ضروریات پیدا کرنا اور پرانی ضروریات کو تکمیل کے ساتھ پورا کرنا ہے تو یہ بھی کچھ ایسا اہم سوال نہیں رہتا کیونکہ انسانی ضرورتوں کی وہ خصوصیت جسے "لچک" سے تعبیر کرتے ہیں، آسانی سے کثیر ترین پیداوار کو جذب کرنے کی قدرت رکھتی ہے، لہذا جہاں تک خالص ابتدائی نظریوں کا تعلق ہے "طلب" اور "رسد" کا توازن ایک نہایت آسان کام معلوم ہوتا ہے۔ اور دنیا کا ان کے عدم توازن کی وجہ سے سرگرداں نظر آنا ایک عالمگیر دماغی فتور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن صنعت کی موجودہ سرمایہ دارانہ تنظیم کی وجہ سے اس میں سخت عملی دشواریاں اور پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کا سرسری بیان ہم ذیل کے صفحات میں کریں گے۔

یہ تو وہاں بھی جہاں بڑے پیمانہ پر کام نہیں ہوتا اور کاریگر اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنے گھر بیٹھے کام کرتے ہیں دیکھا گیا ہے کہ کبھی فرمائشوں کی بھرمار ہو جاتی ہے اور رات کے بارہ بارہ بجے تک کام کرنے کے بعد بھی کام ختم ہونے میں نہیں آتا اور لوگ اُجرت اور قیمت بڑھا بڑھا کر کام کراتے ہیں اور کبھی ایک فرمائش بھی نام کو نہیں آتی۔ اور کاریگر یا دوکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے اور کوئی اُسے نہیں پوچھتا۔ مگر یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کو زیادہ تر انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس کا اندازہ کرنا کہ آبادی کا کس قدر حصہ اس قسم کی سرد بازاری سے متاثر ہوتا ہے۔ آسان نہیں ہے۔ مگر جب اس کا مقابلہ اس صورت حال سے کیا جاتا ہے جو موجودہ تنظیم صنعت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے تو ہمیں فوراً بین فرق نظر آتا ہے۔

آج کل کاریگر اور اشیاء کے استعمال کرنے والوں میں براہ راست کوئی معاملہ طے نہیں پاتا۔ جو کاریگر بوٹ بنانے میں مصروف ہوتا ہے وہ صرف اس قدر جانتا ہے کہ وہ فیکٹری کا ملازم ہے۔ اُسے اس قدر اجرت پر ہر روز اس قدر گھنٹے کام کرنا ہے۔ وہ پورا بوٹ نہیں بناتا بلکہ بوٹ کے ایک جزو کو بناتا رہتا ہے۔ بوٹ کا وہ جزو جسے وہ بناتا ہے اُس کے پاس سے دوسرے کاریگر کے پاس چلا جاتا ہے جو اپنا کام کرکے اسیطرح کسی دوسرے شخص کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے کام میں مہارت ہے اور اسی سے سروکار ہے۔ پوری بوٹ سے مزدور کو کوئی مطلب نہیں۔ فیکٹری سے ہر ہفتہ ہزاروں بوٹ کے جوڑے بن کر نکلتے ہیں۔ یہ کبھی اندرون ملک فروخت ہوتے ہیں۔ کبھی بیرون ملک۔ مگر مزدور کو اس سے کوئی واسطہ نہیں اسے ہر روز کام اور اجرت چاہئے۔ لیکن چند باتیں ایسی ہیں جن سے مزدور متاثر ہوتا ہے، اور جن کے اسباب سمجھنے کی وہ کوشش کرتا ہے مگر اس میں ناکام رہتا ہے مثلاً ایک دن اس سے کہا جاتا ہے کہ تمہیں اورٹائم (Over time) کام کرنا ہوگا۔ وہ نئے مزدوروں کو بھرتی ہوتے دیکھتا ہے، مشینوں کی تعداد میں بھی اُسے اضافہ نظر آتا ہے۔ فیکٹری کو بھی وسعت

دی جاتی ہے ۔ اُسے خیال ہوتا ہے کہ آج کل خوب نفع ہے اور اپنی اُجرت کے نرخ میں اضافہ کے لئے درخواست دیتا ہے جو منظور کر لی جاتی ہے ۔ کچھ عرصہ تک یہی ہوتا رہتا ہے ۔

اس کے بعد اور ٹائم بند کر دیا جاتا ہے ۔ کچھ مزدور برطرف کر دیئے جاتے ہیں مشینیں بیکار پڑی رہتی ہیں ۔ اور زیادہ آدمی علیٰحدہ کئے جاتے ہیں ۔ آجر مزدوروں سے کم شرح اُجرت قبول کرنے کے لئے کہتا ہے اور مزدور کبھی جھگڑا کرنے کے بعد اور کبھی ویسے ہی راضی ہو جاتے ہیں ۔ لیکن پھر بھی مزدوروں کی تعداد میں تخفیف جاری رکھی جاتی ہے ۔ انھیں شارٹ ٹائم (Short Time) کے لئے مجبور کیا جاتا ہے ۔ قدرتی طور پر مزدور تمام الزام آجر کے سر رکھتے ہیں اور اُس تمام منافع کو یاد کرتے ہیں جو کارخانہ کو حاصل ہوا ۔ وہ دل میں کہتے ہیں کہ اگر ہم نے گذشتہ چند مہینوں میں اتنا سخت کام نہ کیا ہوتا تو آج بھی ہمارے کرنے کے لئے کام ہوتا ۔ لیکن یہ بات وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ قصور چاہے کسی کا رہا ہو لیکن اس کا علاج ان کی قدرت سے باہر ہے اُن کی حیثیت پیداوار کی بڑی مشین میں محض شطرنج کے ایک مہرہ کی سی ہے ۔ یہ سچ ہے کہ اسٹرائک کر کے وہ اس مشین کو روک سکتے ہیں مگر اس کا چلانا ان کے بس کی بات نہیں ہے ۔

اب آیئے ذرا آجر کے نقطۂ نگاہ سے معاملات کی صورت حال پر غور کریں ۔ ایک روز تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ فرمائشیں اس قدر تیزی سے آ رہی ہیں کہ ان کی تعمیل کرنے سے وہ معذور ہے ۔ وہ اپنی قیمتیں بڑھا دیتا ہے ۔ اپنی فیکٹری سے جو انتہائی پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے حاصل کرتا ہے ۔ اُجرتیں بڑھاتا ہے اور پھر بھی خوب منافع کماتا ہے جسے وہ اپنے حصہ داروں میں تقسیم کر دیتا ہے ۔ پھر وہ اپنے کارخانہ کو وسعت دینا چاہتا ہے ۔ اپنے بنک کاروں (Bankers ۔) کو راضی دیکھ کر وہ نئی مشینری بنانے کے لئے فرمائش روانہ کر دیتا ہے

پھر اتفاقیہ طور پر قبل اس کے کہ وہ محسوس کر سکے کہ کیا ہو رہا ہے نقشہ بدل جاتا ہے ۔ نئی فرمائشیں آنا بند ہو جاتی ہیں، پُرانی فرمائشیں مسترد کر دی جاتی ہیں اور سارا مال بھرا رہتا ہے ۔ تھوڑے عرصہ کے لئے وہ اپنا کاروبار حسب معمول جاری رکھتا ہے ۔ اور مال بھرتا شروع کرتا ہے ۔ لیکن فوراً اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اُسکا روپیہ پھنستا جا رہا ہے اور نکاسی اتنی نہیں ہو رہی ہے جس سے اُجرت اور دیگر ضروری اخراجات پورے کئے جا سکیں ۔ وہ اپنے بنک کاروں کے پاس جاتا ہے ۔ ابتدا میں غالباً وہ اس کی امداد کرتے ہیں لیکن تھوڑے دنوں کے بعد اُس سے صاف صاف کہہ دیا جاتا ہے کہ اب اور زیادہ روپیہ فراہم کرنا ممکن نہیں ہے ۔ اسلئے اب وہ اپنی قیمتیں کسی قدر گراتا ہے ۔ اس اُمید میں کہ اس طرح وہ زائد مال کو فروخت کر سکیگا ۔ لیکن اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ کام بہت دیر میں شروع کیا ، کیونکہ اُس کے دوسرے حریف بھی یہی کر رہے ہیں اور قیمتیں تیزی کے ساتھ گر رہی ہیں ۔ وہ اس قدر تیزی سے اپنی اشیاء فروخت نہیں کر سکتا کہ جس سے اپنی ضروریات کے لئے وہ نقد حاصل

کرسکے۔ اور جب وہ اس میں ناکامیاب ہوتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اشیاء نقصان کے ساتھ بنائی ہیں۔ اور وہ فوراً اپنا عملہ کم کرتا ہے اور تنخواہیں گھٹاتا ہے اس کے باوجود وہ اپنی مشکلات کو کم نہیں کر سکتا اور اپنے بنک کاروں پر سارا الزام رکھ دیتا ہے اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر بری الذمہ قرار دیتا ہے کہ واقعات اور حالات کا جال کچھ اس طرح بچھا ہوا ہے کہ میرا ان کا مقابلہ کرنا بالکل بے سود ہے اور میں چاہے کسی قدر کوشش کیوں نہ کروں میرا کامیاب ہونا ناممکنات سے ہے۔

اب اخیر میں بنک کاروں کی بپتا سنئے۔ جب تجارت کو فروغ ہوتا ہے وہ آجروں کو نئی مشینری خریدنے کیلئے روپیہ قرض دینے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس روپیہ کی ضمانت میں سرمایہ غیر منقولہ موجود ہے اور دوسرے انھیں اس کی ادائیگی کا کامل یقین ہوتا ہے۔ اوور ڈرافٹ (Over draft) کے غیر معین اضافہ سے وہ اس وجہ سے انکار کر دیتے ہیں کہ انھیں اس بات کا بھی کامل یقین ہوتا ہے کہ قیمتوں کی بڑھتی ہوئی رفتار میں جلد یا بہ دیر زوال شروع ہوگا اور اس وقت یہ قرضہ ناقابل وصول ہو جائیگا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک بنک کار ایک وقت خاص میں اپنے پالیسی کے تعین میں تلون مزاجی سے کام لے اور اس کی وجہ سے اپنی پالیسی میں تبدیلی بلا کسی معقول سبب کے محض اپنے تخیل کی وہم پرستی کی بنا پر کر دے۔ لیکن ایسے بنک کار جو احتیاط سے کام نہیں لیتے ان کا انجام عموماً عبرتناک ہوتا ہے۔

تمام اشیار کی قیمتوں کی عام سطح میں جو تبدیلی ہوتی ہے وہ اکثر اوقات تجارت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کا سبب اس کے علاوہ کچھ ہو تو تجارت کی کمی بیشی خود اس کا نتیجہ ہوجاتی ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ جنوری میں ایک کارخانہ دار اندازہ کرتا ہے کہ سوتی اشیار خام دس ہزار روپیہ کے معاوضہ میں خریدی جاسکتی ہیں اور یہ کہ آٹھ ہزار روپیہ مزید کے سرمایہ اور مزدوری کے استعمال سے یعنی کل اٹھارہ ہزار روپیہ کے صرف کے بعد وہ چھ مہینہ میں پچاس من تیار شدہ مال بنا سکتا ہے، جس کی قیمت جنوری کی رائج الوقت شرح اشیار کے مطابق بیس ہزار روپیہ ہوتی ہے۔

ملہ ان ممالک میں جہاں بنکوں کے بنک ہوتے ہیں (جیسے انگلستان میں بنک آف انگلینڈ اور امریکہ میں فیڈرل رزرو بورڈ) پالیسی کی تبدیلی کا آغاز سنٹرل بنکوں سے ہوتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ بنک ریٹ (Bank Rate) بڑھا دیا جائے یعنی اُس نرخ سود میں اضافہ کر دیا جائے جس پر بنک عمدہ ضمانت کے اطمینان پر بھروسہ پر روپیہ قرض دیتے ہیں اور یہ اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ اولاً سنٹرل بنک کے پاس جو سونے کا ذخیرہ ہے وہ کم نہ ہونے پائے اور ثانیاً اس لئے تاکہ بنک کرنسی کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے مجبور نہ ہوجائے

اب اگر جنوری اور جولائی کے درمیان قیمتوں میں کوئی تبدیلی نہ ہو تو اس کو منافع دو ہزار روپیہ کا ہوگا اگر ان میں سے دس فیصدی کا اضافہ ہوجائے تو اُسے ۲۲ ہزار روپیہ ملیں گے۔ جس میں اس کا نفع ۴ ہزار روپیہ یعنی دوگنا ہوجائیگا۔ اگر قیمتیں دس فیصدی گرجائیں تو وہ صرف ۱۸ ہزار روپیہ میں اپنی اشیاء فروخت کرسکیگا۔ اور اسے منافع کچھ بھی حاصل نہ ہوسکے گا۔ اگر ان چھ مہینوں میں قیمتیں دس فیصدی سے زیادہ گرجائیں گی تو اُسے خسارہ رہیگا۔ اس خسارہ کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ اپنے مزدوروں کو کارخانہ دار کو ایک مقررہ نرخ سے اُجرت ادا کرنا پڑتی ہے۔ تمام اخراجات ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ اس کا نفع ہوتا ہے۔ اسی لئے آجر قیمتوں کی تبدیلی کا بہت جلد اثر قبول کرتے ہیں۔ اور اگر اُنھیں اس کا خیال ہوجائے کہ قیمتیں گرنے والی ہیں تو وہ اپنی پیداوار کم کردیتے ہیں۔

واقعات کا یہ تسلسل جو اوپر بیان کیا گیا ابتدا میں ہوسکتا ہے کہ صرف ایک صنعت تک محدود رہے لیکن اکثر ایک ملک کی متعدد صنعتوں میں یہ بیک وقت کام کرتا ہے۔ جب تجارت کو فروغ ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ آج کل گرم بازاری (Boom) ہے اور جب اس کو زوال ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ آج کل سرد بازاری (Slump) ہے۔ اور گرم بازاری کی علامات یہ ہوتی ہیں کہ "طلب" "رسد" سے زیادہ ہوتی ہے۔ تیار شدہ مال کے ذخیرہ کم ہوتے ہیں۔ قیمتیں چڑھتی ہوتی ہیں۔ پیداوار شد و مد سے جاری رہتی ہے۔ اجرتیں بڑھتی رہتی ہیں۔ منافع کثیر ہوتا ہے۔

سرد بازاری کے علامات یہ ہوتی ہیں کہ "رسد" "طلب" سے زیادہ ہوتی ہے۔ تیار شدہ مال کے انبار لگے ہوتے ہیں۔ قیمتیں گرتی ہوتی ہیں بے روزگاری ہوتی ہے۔ اُجرتوں میں تخفیف کی جاتی ہے منافع میں کمی ہوتی ہے بلکہ اکثر نقصانات ہوتے ہیں۔ ان سب حالات کا آپس میں ایک دوسرے پر بھی اثر ہوتا رہتا ہے اور سب مل کر صورت حال کو بہتر یا بدتر بناتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح تجارت کی گرم بازاری کے ایام میں اجرت اور منافع دونوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جس سے لوگوں کی جیبیں روپیوں سے بھرجاتی ہیں اور وہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں جس سے تجارت کو اور زیادہ فروغ ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے سرد بازاری کے دنوں میں نفع اور اُجرت میں کمی ہوتی ہے بے روزگاری میں اضافہ ہوتا ہے خرچ کرنے کے لئے روپیہ کم ہوتا ہے اور ان کی وجہ سے تجارت میں اور زیادہ ابتری اور بے روزگاری میں اور زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے۔

مخصوص آفات مثلاً جنگ یا قحط سے قطع نظر کرکے جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہو کہ بے روزگاری کا سب سے بڑا سبب ترقی تجارت کی بے ترتیبی ہے جس کی بنا پر گرم بازاری اور سرد بازاری یکے بعد دیگرے ظاہر

ہوتی رہتی ہیں۔

اگرچہ بے روزگاری کے پیدا ہوجانے کے بعد یہ ضروری ہے کہ اُس کے ازالہ کی صورتیں دریافت کی جائیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ اہم سوال اجتماعی نقطۂ نگاہ سے یہ ہے کہ اس مسئلہ پر غور کیا جائے کہ آیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے پیدا ہونے کے اسباب کو ایسی بلند تر اور دوررس تدبیروں سے فنا کردیا جائے جن کی بنیاد پر صنعت وتجارت کی مشین یکساں رفتار کے ساتھ گردش کرسکے۔

اس کے متعلق جو تجویزیں ہیں اُن کو چار خاص عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) اعتباری قرض کی عناں گیری۔

(۲) سرکاری کاروبار میں ضرورت کے مطابق اضافہ اور کمی۔

(۳) قیمتوں کا تعین۔

(۴) موجودہ طریقہ تنظیم صنعت میں انقلاب۔

(۱) ۔موجودہ زمانہ کا کاروبار زیادہ تر اعتباری قرض کی بنیاد پر قائم ہے جس کی وجہ سے ایک آجر اور تاجر اپنے ذاتی سرمایہ سے کہیں زیادہ کا لین دین کرسکتا ہے۔ اس اعتباری قرض کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جس بنک سے کسی آجر یا دوکاندار کا لین دین ہوتا ہے وہ اُسے اس کے ساکھ کی بنیاد پر اپنے جمع شدہ نقد روپیہ سے زیادہ کے چیک ایک معین شرح سود کے ساتھ جاری کرنے کی اجازت دیتا ہے جس کے لئے اصطلاحی نام اوورڈرافٹ (Over Draft) ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے "گرم بازاری" کے اختتام اور "سرد بازاری" کی ابتدا کا فوری سبب یہ ہوتا ہے کہ بنک کار اوورڈرافٹ کی اجازت دینا بند کردیتے ہیں۔

قدرتی طور پر بنک کاروں پر تمام الزام رکھا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اگر بنک کار اپنی پالیسی بدل دیں تو خوشحالی اور گرم بازاری میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ لیکن ان کی طرف سے جواب یہ دیا جاتا ہے کہ بنک کار ہوا کا رُخ دیکھ کر اوورڈرافٹ سے انکار کرتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنے فرض کو انجام دینے میں کوتاہی کریں تو اُس سے بھی زیادہ سخت بحرانی دور سے ہیئت اجتماعی کو گزرنا پڑے

ایک مثال سے یہ حقیقت واضح ہوجائیگی۔ جنگ کے بعد، امریکہ میں آجروں نے اس قدر تیزی سے اشیاء بنانا شروع کیں کہ اشیاء کی اُن قیمتوں پر جو ان کے معاوضہ میں طلب کی جاتی تھیں، کھپت اندرونی اور بیرونی دونوں منڈیوں میں غیر ممکن نظر آنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اشیاء مصنوعہ کے انبار لگانا شروع کردیئے حتیٰ کہ ۱۹۱۹ء کے آخری دنوں میں، بحر اٹلانٹک کے آس پاس سیکڑوں میل تک کوئی گودام، ایسا باقی نہ رہا جسے اشیاء سے لبالب نہ بھر دیا گیا ہو۔ اس تمام عرصہ میں ان اشیاء مصنوعہ کی ساکھ پر بنک،

اعتباری قرضہ دیتے رہے اور اس اعتباری قرضہ کی طفیل میں صناعوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ آخر یہ ہوا کہ بنکوں نے مزید قرضہ دینے سے انکار کردیا[له]۔ اور اعتبار کا قصر عالی شان مسمار ہونا شروع ہوگیا۔ قیمتیں نہایت تیزی سے یکقلم گرگئیں اور تجارت میں عام کساد بازاری رونما ہوگئی اور ہیبت ناک بے روزگاری نظر آنے لگی۔ اگر بنکوں نے اس کام کو کچھ عرصہ اور جاری رکھا ہوتا تو فرق صرف اس قدر ہوتا کہ اس مسماری میں تھوڑا توقف ہوجاتا۔ لیکن اسکے بُرے نتائج میں اضافہ ہوجاتا۔ کیونکہ ایسی اشیاء کے بنانے کا کام جن کی بازار میں ایک خاص قیمت کے ساتھ کھپت نہیں ہوسکتی ایک غیر معین مدت تک جاری نہیں رکھا جاسکتا تھا۔

اسی طرح مسلسل توسیع اعتبار کے جو اور دیگر تجویزیں ہیں ان کا بھی اسی قسم کی دلیلوں سے جواب دیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی ایک تجویز خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ جس قدر اشیاء بازار میں فروخت کے لئے پیش کی جاتی ہیں ان کے مقابلہ میں اہلیت خرید یعنی آمدنی بصورت نقد لوگوں کے پاس نہیں ہوتی کیونکہ اگر یہ ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمام اشیاء کیوں نہ فروخت ہوجائیں اس لئے تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ ایک سرکاری بنک نئے اعتباری قرض کی مسلسل توسیع کے ذریعہ سے لوگوں کی قابل خرچ آمدنیوں میں اضافہ کرتا رہے۔ مگر اس کی مخالفت میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر اس تجویز پر عمل کیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سکوں کی تعداد برابر بڑھتی جائے گی جس کی وجہ سے قیمتوں میں ایک عام اور مسلسل اضافہ ہوتا رہیگا اور سکہ کی قوت خرید برابر گھٹتی رہیگی اور آجر و مزدور میں واقعی اجرت کو قائم رکھنے کے لئے مستقل جنگ جاری رہیگی۔ تجویز کی تائید میں جواب کے طور پر میجر ڈگلس (Major Douglas.) جو اس اسکیم کے مصنف ہیں جواب دیتے ہیں کہ قیمتوں کو قانونی طور پر بڑھنے سے روکا جائیگا۔ اور انھیں مساوی سطح پر رکھا جائیگا۔ اس کے جواب الجواب میں معترضین کہتے ہیں کہ اس قسم کے قوانین کام نہ دے سکیں گے۔ کیونکہ اقتصادی قوانین، سیاسی قوانین کے مقابلہ میں ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔

ایک دوسری تجویز یہ ہے کہ میونسپلٹیوں کو نوٹ جاری کرنے کا حق دے دیا جائے (یہ وائی گن کی تجویز "Wigam proposal" کے نام سے موسوم ہے) اور وہ ان نوٹوں کے ذریعہ سے کاروبار شروع کرے، اس تجویز کی مخالفت میں کہا جاتا ہے کہ اگر ان نوٹوں کو تمام ملک کا قانونی سکہ قرار نہیں دیا گیا تو یہ بیکار ثابت ہوں گے اور اگر انہیں قانونی سکہ بنا دیا گیا تو ملک کے سکوں میں اضافہ ہوکر وہی تمام حالات رونما ہوں گے جن کی

[له] اس کا سبب یہ ہوا کہ فیڈرل رزرو بورڈ نے اپنی شرح سود گراں کردی جو گویا اس بات کی تنبیہ تھی کہ صورت حال قابل اطمینان نہیں ہے اور ہوشیاری اور احتیاط کی ضرورت ہے

زویدمیں اوپر دلیلیں پیش کی جاچکی ہیں۔

تیسری تجویز یہ ہے کہ تجارت میں ترتیب و یکسانی پیدا کرنے کا یہ طریقہ ہونا چاہئے کہ اعتباری قرضہ اُسی وقت بند کردیا جائے جیسے ہی تیار شدہ اشیاء کے ذخیروں میں ذرا بھی اضافہ نظر آئے۔ موجودہ صورت حال میں اور اس میں فرق صرف اتنا ہوگا کہ اس وقت غیر ضروری مدت تک اس بات کا انتظار کرکے کہ ذخیرے واقعی بہت کثیر ہوگئے ہیں معاملات کو نازک کردیا جاتا ہے اور اُس صورت میں ایسا نہ کیا جائیگا۔ اسی طرح ذخیروں کی کمی کی صورت میں فوراً پیداوار میں اضافہ شروع کردیا جائیگا۔ اس طرح "گرم بازاری" کے انتہائی عروج اور "سرد بازاری" کے انتہائی زوال دونوں سے نجات ملے گی۔ اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ ہرچند یہ اسکیم جہاں تک نظریہ کا تعلق ہے موجودہ نظام کے حامیوں کے لئے بہت بڑی حد تک قابل قبول ہوگی مگر اس میں عملی دشواریاں جس قدر ہیں ان سے عہدہ برآں ہونا بہت مشکل ہے۔ اول تو بنکوں کے ذاتی اغراض و منافع سے اس تجویز کا تصادم یقینی ہے۔ مگر ان سب سے زیادہ اہم جو سوال ہے وہ یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ کس وقت اصلاحی کارروائی شروع کرنے کی ضرورت ہے ایک ایسی غیر معمولی قوت فیصلہ کی ضرورت ہے جو آج کل کے انسانوں میں نظر نہیں آتی۔

اس میں شک نہیں کہ اس کام میں کسی قدر سہولت پیدا ہوسکتی ہے۔ اگر حکومتیں مقررہ میعاد کے بعد متعلقہ فریقین سے پیداوار، فروخت، تیار شدہ اور نصف تیار شدہ اشیاء کے ذخیرے اندرونی اور بیرونی موجودہ فرمائیشوں اور دیگر متعلقہ معاملات کی بابت نقشے طلب کرنے شروع کردیں اور بنک ان اطلاعات کی بنیاد پر اپنی پالیسی کا تعین کرنے لگیں اور اسی کے مطابق اعتباری قرضے کو گھٹاتے بڑھاتے رہیں۔ اس سے خود صناعوں کو بھی بڑا فایدہ ہوگا، کیونکہ اس کے ذریعہ سے وہ آسانی سے یہ فیصلہ کرسکیں گے کہ کب انھیں قیمتیں گھٹانے اور پیداوار کم کرنا چاہئے۔ اور آج کل کی طرح بے کار انتظار کرکے قیمتی وقت ضائع نہ کریں گے۔

(۲) اعتباری قرضہ کی عنان گیری کی تجاویز کے بعد اب ہم دوسری تجویز یعنی سرکاری کاروبار میں ضرورت کے مطابق اضافہ اور کمی سے بحث کرتے ہیں۔ اس تجویز کی اہمیت اور ضرورت سرد بازاری کے پیدا ہوجانے کے بعد بالکل مسلم ہوجاتی ہے۔ لیکن سرد بازاری کے مستقل ازالہ کے لئے اس علاج کو تسلیم کرنے میں بہت سے لوگوں کو تامل ہوگا۔ بہرحال تجویز کی نوعیت یہ ہے کہ خوشحالی کے ایام میں بہت سے سرکاری کاروبار کو مثلاً عمارت سازی وغیرہ وغیرہ کو سرد بازاری کے خیال سے ملتوی رکھنا چاہئے۔ لیکن جیسے ہی روزگار میں کمی نظر آئے ان کاموں کو شروع کردینا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ سرد بازاری کی تکالیف اور بے روزگاری کی مصیبتوں کے کم کرنے میں یہ طریقہ کار بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے لیکن اس سے زیادہ اس تجویز کو اہمیت دینا جائز

نہیں ہو سکتا۔

(۳) تیسری تجویز قیمتوں کے تعین سے متعلق ہے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں قیمتوں کی عام سطح کی تبدیلی بھی اکثر "گرم بازاری" اور "سرد بازاری" کا سبب بن جاتی ہیں۔ اس لئے اگر قیمتوں کا تعین کسی طرح ممکن ہو تو صناعوں کی ایک بہت بڑے اندیشہ کا ازالہ ہو جائے۔ اور پھر نہ تو ایک وقت پر اندھے پن سے پیداوار کی بھر مار کی جائے اور نہ دوسرے وقت پیداوار قریب قریب بالکل بند کی جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کا مستقل تعین ممکن ہے۔

پہلی نظر میں اس سے زیادہ آسان کام کوئی دوسرا معلوم ہی نہیں ہوتا۔ پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس کر دیجئے یا ایک آرڈیننس جاری کر دیجئے کہ گیہوں، گوشت، گھی، ایندھن کی قیمت ہمیشہ کے لئے اس قدر فی سیر مقرر کر دی گئی ہے اور معاملہ ختم ہو جائیگا۔ لیکن اقتصادی قوانین کی گرفت حکومت کے قوانین سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ اور انھیں بغاوت کا الزام لگا کر شہر بدر نہیں کیا جا سکتا۔ اور اقتصادی قوانین سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "طلب" اور "رسد" اشیاء کی قیمتوں اور ان مقداروں کا تعین کرتی ہیں جو بازار میں فروخت کی جا سکتی ہیں۔ اگر قیمتیں من مانی طریقہ پر مقرر کر دی گئیں تو پھر اشیاء کی "طلب" اور "رسد" میں توازن باقی نہیں رہیگا۔ چنانچہ جنگ کے ابتدائی سالوں میں یہی صورت حال نمودار ہوئی۔ سیاسیین نے جنھیں اقتصادیات کے اصول سے پوری واقفیت نہ تھی قیمتوں کے مقرر کر دینے کی کوشش کی۔ بعض ممالک میں قوانین کی گرفت سے بچنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن انگلستان میں عام طور پر قوانین کی پابندی کی گئی۔ لیکن گورنمنٹ کو اشیاء کی تقسیم کے لئے ڈپو ([illegible]) بنانے پڑے کیونکہ جس قدر اشیاء فروخت کے لئے پیش کی جاتی تھیں ان سے زیادہ کی طلب ہوتی تھی۔ یہ سب اس وجہ سے تھا کہ اشیاء کی قیمتیں اقتصادی نرخ سے کم تھیں۔ اگر وہ اس نرخ سے زیادہ ہوتیں تو اس صورت میں "رسد" کی اس قدر کثرت ہوتی کہ منڈی میں تمام انبار لگ جاتے۔

اپنی پالیسی کے اس نتیجہ کو دیکھ کر مدبرین نے یہ کوشش کی کہ راشن کی پالیسی (Rationing) یعنی اشیاء کی ایک مقررہ مقدار مہیا کرنے کا اصول اختیار کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے تاجروں اور جہازوں کے مالکوں کے نام فرمائشیں روانہ کر دیں۔ اس طرح ایک حد تک انھیں قیمتوں کے مقرر کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ زمانہ جنگ کا تھا لیکن امن کے زمانہ میں بھی اصول کا جہاں تک تعلق ہے اس پالیسی پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بڑے پیمانے پر راشن کے طریقہ پر عمل کرنے سے انفرادی آزادی پر اس قدر پابندیاں عائد کرنا پڑتی ہیں کہ جنھیں ایک آزاد قوم الا اس صورت کے کہ اس کے علاوہ کوئی

چارہ کار ہی نظر نہ آئے اختیار کرنے پر رضامند نہیں ہوسکتی۔

انفرادی طور پر ہر شے کی قیمت کے تعین کا اور دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ قیمتوں کی عام سطح کو خالص مالیاتی (   ) ذرائع سے یکساں رکھا جائے۔ جنگ سے پہلے انگلش ساورن ایک مقررہ وزن کا سونے کا سکہ ہوتا تھا۔ پانچ پونڈ کا نوٹ ایک کاغذ کا پرزہ ہوتا تھا جسکے معاوضہ میں بنک اس مقررہ وزن کا پانچ گنا سونا دیا کرتا تھا۔ آج کل عام طور پر ایک پاؤنڈ کے نوٹ کو بنک جاکر سونے میں منتقل نہیں کرسکتے ہیں۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ایسا ہونا ممکن ہے اسوقت یہ سوال درپیش ہوسکتا ہے کہ آیا اس ایک پاؤنڈ کے نوٹ کے معاوضہ میں ایک مقررہ وزن کا سونا دیا جائے یا اس قدر سونا دیا جائے جس کا وزن ماہ بماہ اتنا ہو جس سے چند مفید اشیاء کی مقررہ مقداریں خریدی جاسکیں۔ مثال سے اس بات کی وضاحت ہوجائیگی۔ یعنی ایک پاؤنڈ کے نوٹ کے معاوضہ میں اس قدر سونا دیا جائے جس سے ایک پونڈ چائے بیس پونڈ ڈبل روٹی، چار پونڈ شکر، نصف پونڈ مکھن اور کچھ کپڑا خریدا جاسکے۔ اس کا تعین بظاہر بہت پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ماہر اقتصادیات جانتے ہیں کہ اگر قیمتوں کے انڈکس (Index Number) کا استعمال کیا جائے تو اس اسکیم میں کوئی بڑی اصولی یا عملی دشواری پیش نہیں آئیگی۔ اس اسکیم کی تصنیف کا شرف ہل یونیورسٹی (Yal University) کے پروفیسر ارونگ فشر (Irving Fisher) کو حاصل ہے اور اسی کا نام (The Compensated Dollar) ہے اسی مسئلہ کی موافقت اور مخالفت میں بہت سے دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں جن کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا جاسکے تو اس کی وجہ سے "گرم بازاری" اور "سرد بازاری" کے ایک بڑے سبب کا سدباب ہوجائے۔

(۴) سب سے آخر میں ہم ان لوگوں کا تذکرہ کرتے ہیں جن کا یہ عقیدہ ہے کہ بے روزگاری کے دوروں کا مکمل ازالہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ موجودہ صنعتی نظام کو بالکل بدل دیا جائے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب تک پیداوار کی غایت چند افراد کی ذاتی منفعت رہیگی اس وقت تک اس قسم کا عروج وزوال صنعت وتجارت میں برابر نمایاں رہیگا۔ اور بعض اوقات آجروں کی دولتمندی کا بھی سبب ہوگا۔ خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے کہ بے روزگاری کی مصیبتوں سے ہر حال میں وہ اکثر وبیشتر محفوظ رہتا ہے۔ لیکن اگر اس کے مقابلہ میں پیداوار کا کام جماعت، اپنی مجموعی منفعت کو پیش نظر رکھ کر اختیار کرے گی تو ایسی کوئی صورت حال کے پیدا ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہے گا جس میں منڈیاں زائد سامان سے لبریز نظر آئیں گی۔ کیونکہ ہر چیز اسی قدر تیزی سے جس قدر تیزی سے کہ وہ طیار کی جائے گی تقسیم کردی جائے گی۔ اور مرضی یا بلامرضی کی بے روزگاری

کا خاتمہ ہوجائے گا کیونکہ ہر شخص قومی پیداوار کے اضافہ میں مصروف نظر آئے گا تاکہ اپنے اور اپنے رفقاء کے حصۂ رسد میں بیشی پیدا کرسکے۔

اس طریقہ استدلال کے مخالفین تین اعتراضات پیش کرتے ہیں اولاً ان کا کہنا یہ ہے کہ اس قسم کی قوم کو بھی برآمد اور درآمد کی ضرورت ہوگی اور اس لئے برآمد کی تجارت کو کچھ بھی منفعت کے اصول پر چلانے کی ضرورت باقی رہیگی - دوسرے ان کا یہ کہنا ہے کہ بہت سے مرد اور عورتوں کو کام کرنے کے لئے اُبھارنے کے واسطے ذاتی اغراض کا لالچ دینا ضروری ہوتا ہے۔ تیسرے اُن کا یہ کہنا ہے کہ صنعت و تجارت اُس بندش سے آزاد ہوجائیں گے جس کی وجہ سے آج وہ صرف انھیں راہوں پہ گامزن نظر آتے ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ منفعت کی توقع کی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام تجاویز، اسی مسئلہ کے حل کی انتہائی شکلوں کو پیش کرتی ہیں جن کے متعلق شدید سیاسی مباحثے اور مناظرے ہوتے رہتے ہیں، لیکن ان کے علاوہ دیگر اور لاتعداد تجاویز ہیں جن میں انتہا پسندی سے کام نہیں لیا گیا ہے - اور زاویہ ہائے نگاہ کے مختلف مدارج میں مصالحت کی کوشش کی گئی ہے۔ صنعت و تجارت کی تنظیم آج کل کثیر التعداد طریقوں سے ہوتی ہے، کہیں پرانی وضع کا دستی کاریگر دنیا سے الگ تھلگ اشیا بناتا نظر آتا ہے - کہیں سالقبت و مقابلہ کی وہ نہائی صورتیں نظر آتی ہیں جن سے فریقین تباہ و برباد ہوجاتے ہیں کہیں مکمل و غیر مکمل اجارے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں امداد باہمی کے اصول پہ تنظیم کی جاتی ہے - کہیں تجارت وصنعت کے نظم و انتظام کی ذمہ داری میونسپلیٹی پہ عائد کی جاتی ہے تو کہیں کل قوم پر- اور بعض صورتوں میں یہ تنظیم بین الاقوامی شکل بھی اختیار کرلیتی ہے - یہ تمام مختلف النوع طریقے بیک وقت پائے جاتے ہیں اور انکا مطالعہ اور مقابلہ ہم ہر وقت کرسکتے ہیں -

ترقی و تہذیب کے امکانات کی آزمائش ہورہی ہے - اگر ایک طریقہ انسانی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر رہا تو دوسرے طریقہ کا امتحان کیا جائے گا - تاکہ اگر وہ کامیاب ہو تو اُسے ہی اختیار کیا جائے

اب تک ہم نے اس مسئلہ پر، زیادہ تر قومی نقطۂ نگاہ سے بحث کی - لیکن موجودہ سرد بازاری کی ہمہ گیری اور وسعت کو دیکھتے ہوئے اَب غالباً اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آج کل اسی مسئلہ کو زیادہ تر بین الاقوامی اہمیت حاصل ہوگئی ہے - مگر پھر بھی قوم پرست سیاسیین ابھی تک اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ایک قوم چند ایسی اقوام کے درمیان رہ کر جو مفلس اور مقروض ہوگئی ہیں خوشحال رہ سکتی ہے - یورپ ابھی تک گذشتہ جنگ عظیم کے مصائب سے گلو خلاصی حاصل نہیں کرسکا ہے ملک عام بے امنی اور بے اعتباری کی کیفیت میں الاقوامی تعلقات

میں نظر آتی ہے - کوئی ملک اپنے مالیہ کے توازن قائم رکھنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا ہے، مشرقی یورپ کی نئی اقوام، آسٹریا اور جرمنی، سب دیوالیہ سے قریب تر نظر آتی ہیں - انگلینڈ کے مالیاتی نظام کی بنیادیں کئی بار ہل چکی ہیں - تاوان اور قرضہ ہائے جنگ کے مسئلہ کا کوئی حل نظر ہی نہیں آتا۔

صورت حال، امتناعی محاصل کی وجہ سے اور زیادہ نازک ہو گئی ہے - ہر قوم کی یہ خواہش معلوم ہوتی ہے کہ برآمد کو ترقی دی جائے - اور درآمد کو روکا جائے اور اس بدیہی حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ برآمد کی ادائیگی کے لئے بہر حال درآمد ضروری ہے - محض محاصل کی وجہ سے اس قدر ابتری پیدا نہیں ہوتی جتنی کہ محاصل کی مستقل ردو بدل سے - کیونکہ اس کی وجہ سے کبھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل میں بازار کا کیا رنگ ہونے والا ہے اور آجر، صناع برآمد کی تجارت کے لئے نہ اشیاء پیدا کر سکتے ہیں اور نہ وہ اخراجات برداشت کر سکتے ہیں جو اس کام کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

علاج اس کا بظاہر سہل نظر آتا ہے مگر ایسی حالت میں جب کہ ہر قوم اس بات کی تو ضرور متمنی ہے کہ کسی طرح اس کے ہمسایہ اپنے امتناعی محاصل کو کم کر دیں مگر خود اپنے محاصل کو کم کرنے سے اس یقین کی بناء پر گریز کرتی ہے کہ اُسے ان سے بہت فوائد حاصل ہیں اس علاج کا امکان ذرا مشکل نظر آتا ہے - سیکڑوں بین الاقوامی کانفرنسیں اور مشاورتی جلسے ان مسائل کے حل کے لئے منعقد کئے جا چکے ہیں - جن میں بین الاقوامی قرضوں بین الاقوامی امتناعی محاصل اور قوموں کے فوجی اخراجات کے متعلق خوب خوب گفت و شنید کی جا چکی ہے - مگر نتیجہ کے لحاظ سے سب بے سود رہے -

مسٹر لائڈ جارج نے حال ہی میں صحافیوں کی ایک مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے دنیا کی موجودہ صورت حال اور مدبرین کی افسوسناک ناکامی کا ماتم کیا اور دس سال سے برابر جو مختلف کانفرنسیں اور جلسے ہو رہے ہیں اور جن نیک تمناؤں آرزوؤں اور تجاویز کا اظہار کیا جا رہا ہے اُن کی بے بسی اور بے اثری کا پوری طرح خاکہ اڑایا - واقعہ یہ ہے کہ ہر قوم یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ دنیا کی موجودہ مشکلات کے حل کا کیا طریقہ ہے - لیکن اس طریقہ پر عمل کرنے کے لئے جس ایثار کی ضرورت ہے اُسکا نہ اسے حوصلہ ہے اور نہ ہمت - معاملات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں اور صورت حال روز بروز نازک ہو رہی ہے لیکن خود غرضی اور ذاتی منفعت کے مہلک جذبات انھیں اجتماعی منفعت کے طریقوں پر عمل کرنے سے باز رکھتے ہیں - بنی نوع انسان کے بہی خواہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے افراد اور اقوام میں جو بہیمیت اور درندہ صفتی کے آثار باقی ہیں انھیں فنا کریں کیونکہ بغیر اس کے کسی معقول تجویز کی کامیابی کا امکان پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

محمد عاقل ایم - اے (علیگ)

افیونی

افیون تو ایک ایسی چیز ہے جس کو اپنے اثرات کے اعتبار سے ایک بنگالی اور ایک پٹھانی، ایک پنجابی اور ایک آسامی کے لئے یکساں ہونا چاہئے لیکن اس سلسلہ میں لکھنؤ نے جو شہرت حاصل کی ہے وہ شاید دنیا کے کسی حصہ کو نصیب نہیں ہوئی، بظاہر یہ خصوصیت عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن وہ لوگ جو افیونیوں کو بھی دیکھ چکے ہیں اور اہل لکھنؤ سے بھی ملے ہیں اس خصوصیت کی وجہ جانتے ہوں گے کہ "لکھنویت" اور "افیونیت" دونوں اس حد تک متصل ہیں کہ ایک اجنبی کو ایک پر دوسرے کا شبہ ہو سکتا ہے۔ افیونیوں میں خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ کے رہنے والے ہوں قدرتی طور پر بہت سی ادائیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو اہل لکھنؤ کے لئے مخصوص ہیں اور لکھنؤ کے اس باشندے میں بھی افیونی کی سی شان ہوتی ہے جس بیچارے نے کبھی افیون کی صورت بھی نہ دیکھی ہو خدا جانے اس مماثلت کی کیا وجہ ہے لیکن آپ کو چاہئے کہ ہمارے بیان کی تصدیق کرنے کے لئے کسی ایسے لکھنوی سے ملئے جو افیونی نہ ہو اور پھر اس کا مطالعہ اس نظر سے کیجئے کہ اس میں "افیونیت" ہے یا نہیں تو آپ کو ہمارے بیان کی تائید کرنا پڑے گی اسی طرح آپ کسی فرنگی افیونی کو دیکھئے تو وہ باوجود اپنی ملکی وحشت کے آپ کو اپنی خاص کیفیت میں بہت بڑی حد تک لکھنوی نظر آئے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افیون کے استعمال کے بعد انسان اس حد تک شائستہ ہو جاتا ہے کہ اس پر لکھنوی ہونے کا شبہ کیا جائے ورنہ اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ اہل لکھنؤ نے شائستگی افیونیوں سے لی ہے بہرحال جو کچھ بھی ہو یہ کچھ "حساب دوستاں در دل" والا قصہ معلوم ہوتا ہے۔

لکھنؤ کے افیونیوں کے متعلق ہم نے اس قدر روایتیں سنیں کہ آخر ہم کو کسی لکھنوی افیونی سے ملنے کا شوق پیدا ہوا لیکن جب اس شوق کی تکمیل نہ ہوئی تو اس نے رفتہ رفتہ آرزو کی صورت اختیار کر لی، ہمارا یہ شوق غالباً بیجا بھی نہ تھا ذرا تصور تو فرمائے کہ ایک تو افیونی اور پھر لکھنوی یہ دونوں خصوصیات اپنی اپنی جگہ پر تاریخی حیثیت رکھتی ہیں لیکن جب وہ ایک ہی ہستی میں جمع ہو جائیں تو وہ ہستی ہوگی یا قیامت؟ ایک تو کریلا اور پھر نیب چڑھا۔ مختصر یہ کہ ہم خدا کی اس عجیب و غریب صنعت کو دیکھنے کے لئے بیچین تھے لیکن اب نہ تو وہ لکھنؤ رہ گیا ہے اور نہ اس کی وہ روایتی خصوصیات باقی ہیں لیکن خداوند کریم تو بڑا مسبب الاسباب ہے اس نے ہماری جستجو کو ناکام نہ رہنے دیا اور ہم کو بہت جلد میر صاحب سے شرف نیاز حاصل ہو گیا۔

میر صاحب اپنے کو شاہی خاندان سے متعلق بتاتے تھے اور اس کا ثبوت پندرہ روپیہ ماہوار کا وثیقہ تھا جو ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو بغیر کسی وقت کے برابر مل رہا تھا آپ نہ صرف خالص لکھنوی تھے بلکہ نجیب الطرفین افیونی بھی تھے اور اپنی جماعت میں اس خصوصیت کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے گھر کے اکیلے تھے بیوی بچے تو خیر ایک سرے سے تھے ہی نہیں لیکن ان کے علاوہ نزدیک یا دور کے کسی عزیز کا پتہ نہ چلتا تھا ان کو بیوی بچوں اور عزیزوں کا لطف اپنی افیون ہی سے حاصل تھا اور وہ اپنے کو افیون کے لئے مٹائے ہوئے تھے۔ اس وقت انکی عمر تقریباً پچاس بلکہ اس سے بھی کم ہوگی لیکن افیون نے ان کو قبل از وقت بیماری کا انکور بنا دیا تھا اس کے علاوہ انکی عام صحت کا یہ حال تھا کہ اگر وہ افیون کے عادی نہ ہوتے تو ان کی موت یقیناً تپ دق سے واقع ہوتی مگر اب بھی وہ غریب کھانسی، دمہ اور قبض وغیرہ سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ توانائی کا یہ حال تھا کہ اگر میڈیکل کالج کے طلباء ان کو دیکھ پاتے تو اس زندہ انسانی ڈھانچے کو کبھی نہ چھوڑتے اور اپنے کالج کے میوزیم میں مطالعہ کرنے کے لئے یقیناً بند کر دیتے۔ شکل وصورت کا تو ذکر ہی کیا ضعیفی میں انسان خوبصورت تو نہیں البتہ خوبصورتوں کو ہنسانیوالی ایک چیز بنجاتا ہے۔ لیکن میر صاحب پر تو معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بوڑھا پا پھٹ پڑا ہے کمر بھی اونگھتے اونگھتے جھک گئی تھی۔ تمام جسم کی کھال لٹک پڑی تھی چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ سر کے الجھے ہوئے پٹے بھی بے مرمت پڑے تھے اور کھچڑی داڑھی بھی آزادی کے ساتھ جدھر چاہتی تھی پھیل رہی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ انگلیوں کے ناخن بھی قطع وبرید سے معاف کر دئے گئے تھے۔ لباس کے معاملہ میں وہ بہت ہی سادہ دل واقع ہوئے تھے یہ غور کرنے کی بات ہے کہ خاندان شاہی کا یہ چراغ نہایت سادہ وضع میں زندگی بسر کر رہا تھا، اُن کے گھر میں کپڑوں کے لئے کوئی بکس کوئی صندوق یا کوئی صندوقچی نہ تھی اور نہ اس کی کوئی ضرورت تھی میر صاحب کے پاس جس قدر کپڑے تھے وہ سب ان کے جسم پر رہتے تھے ہم نے تو کبھی بھی ان کے کپڑوں کو دھوبی کے یہاں جاتے یا دھوبی کے یہاں سے ان کے کپڑے آتے ہوئے نہیں دیکھے۔ بس جو کپڑے وہ جسم پر پہنے ہوئے تھے وہ گویا ان کی کھال ہو کر رہ گئے تھے اب اگر آپ ہم سے یہ پوچھیں کہ ان کپڑوں کا کیا رنگ تھا تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصلی رنگ کا تو خیر حال معلوم نہیں لیکن کثرت استعمال سے وہ کپڑے رنگ بدلتے بدلتے اب جس ایک رنگ پر قائم ہوگئے تھے اس کو اصطلاح عام میں صافی کا رنگ کہتے ہیں اسی طرح اگر آپ یہ دریافت کریں کہ ان کا لباس کس کپڑے کا ہوتا تھا یعنی تنزیب یا نین سکھ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ ہمنے میر صاحب کو ہمیشہ موم جامہ زیب تن کئے ہوئے دیکھا ہے جس پر مکھیوں کی نشست سے ہر وقت مختلف قسم کے نقش ونگار بنتے اور مٹتے رہتے تھے۔ البتہ ان کے کپڑوں کی خوشبو یا بدبو کے متعلق ہم کچھ بھی عرض نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہ علم حاصل کرنے کی ہم کو کبھی جرارت نہیں ہوئی۔

میر صاحب کا دولت کدہ ایک بہت ہی ویران محلہ میں تھا جس کا بیشتر حصہ لکھوری اینٹ اور گارے کی شکل

میں مکان کے صحن میں نظر آتا تھا اور جو باقی رہ گیا تھا وہ بھی کوئی تاریخی کھنڈر معلوم ہوتا تھا لیکن میر صاحب کی ضروریات کے لئے ایک مختصر سی کوٹھری کافی تھی جس میں وہ اپنی تمام گرہستی کے ساتھ رہتے تھے اور باقی تمام مکان فی سبیل اللہ چھوڑ رکھا تھا۔ میر صاحب کی مختصر سی کوٹھری میں ایک تو تھی وہ چارپائی جو شاہی زمانہ کے کھٹ بنوں نے اپنی ہاتھ سے بنی تھی حالانکہ اب وہ اپنی بوسیدگی کے اعتبار سے ٹوٹی ہوئی قبر معلوم ہوتی تھی لیکن میر صاحب اس حالت کو غنیمت سمجھتے تھے بہ نسبت اس کے کہ آج کل کے بدتمیز کھٹ بُنے اس تاریخی چارپائی میں ہاتھ لگائیں۔ اُس چارپائی پر کچھ بستر تھا تو ضرور لیکن صحت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا تھا۔ اور کن کن چیزوں پر مشتمل تھا۔ چارپائی کے علاوہ اس کوٹھری میں جس چیز کو نمایاں حیثیت حاصل تھی وہ حقہ تھا اس حقہ کے متعلق یہی بیان کیا جاتا ہے کہ میر صاحب کے دادا جان مرحوم و مغفور کو غدر کے زمانہ میں کسی شاہی محل میں پڑا ہوا ملا تھا اور وہ اب تک نہایت حفاظت کے ساتھ سینہ بسینہ چلا آ رہا تھا میر صاحب نے تو بنظر احتیاط اس کو کبھی پانی سے تازہ تک نہیں کیا تھا اور نہ اس کا پانی سال بھر پہلے بدلتے تھے البتہ ان کی چلمیں جب سے اب تک چار پانچ مرتبہ ضرور بدلی گئی تھیں اور اس میں بھی میر صاحب کی احتیاطی کو دخل نہ تھا۔ بلکہ یہ ہوتا تھا کہ جہاں میر صاحب کی آنکھ جھپکی اور حقہ الٹ کر زمین پر آ رہا بس اسی میں چلمیں ٹوٹ گئیں چارپائی اور حقہ کے بعد تین کے سماور کا نمبر تھا جو ہر وقت گرم رہتا تھا اور جس میں ہر وقت چائے موجود ہوتی تھی ان چیزوں کے علاوہ چائے کی پیالی کوئیلوں کی ٹوکری، کچھ کلھڑ، کچھ دونے، گلکسو کا ڈبہ جس میں خمیرہ تمباکو رکھا جاتا تھا، ایک اسٹول جس پر گول چینی کی پیالی، کاتبوں کی دوات کی طرح رکھی تھی، ایک آگ دھونکنے والی دھونکنی، کچھ آگ سلگانے کے لئے گودڑ، ایک آبخورہ، ایک گھڑا، ایک تانبے کا ڈونگا اور ایک دیاسلائی کی ڈبیا بھی تھی ان ہی تمام چیزوں کی میر صاحب کو ضرورت تھی اور ان ہی سے وہ اپنی ضروریات پوری کرتے تھے لیکن زیادہ تر توجہ اسٹول پر رکھی ہوئی پیالی کی جانب رہتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زندگی اسی پیالی میں بند ہے۔

میر صاحب کا زیادہ تر وقت اسی گوشۂ عافیت میں گذرتا تھا لیکن ہر روز کم سے کم ایک مرتبہ آپ اپنے ایک دوست کے مکان پر ضرور جاتے تھے جہاں آپ کے تمام ہم مشرب یکجا ہو کر تھوڑا سا وقت دلچسپی کے ساتھ گذارتے تھے۔ اس اجتماع میں بڑے بڑے ملکی اور قومی، سیاسی اور معاشرتی، ادبی اور تمدنی، اخلاقی اور علمی مسائل پر بحث ہوتی تھی، واقعات حاضرہ پر رائے زنی کی جاتی تھی اور دنیا کے اہم سے اہم معاملات نہایت غور و فکر کے بعد طے پاتے تھے اور اس انجمن میں میر صاحب کو وہی درجہ حاصل تھا جو کسی ذمہ دار کانفرنس کے صدر کو حاصل ہوتا ہے ان کی رائے قطعی اور فیصلہ کن سمجھی جاتی تھی۔ اور ان کے تبحر، تدبر اور تجربہ کاری کا تمام ہمعصروں پر بڑا اثر تھا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اپنے یاران میکدہ میں میر صاحب سب سے زیادہ کہنہ مشق اور سب سے پرانے افیونی تھے۔ ان باتوں کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ ہمارے میر صاحب کس پایہ کے افیونی تھے۔

میر صاحب کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے ہم نے ان کے ساتھ بہتر سے بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ ان کی افیون کے اخراجات کا ٹھیکہ لے لیا جس کے بعد میر صاحب کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ ابھی تک دنیا باوفا دوستوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ میر صاحب پر اس طرح قابو حاصل کر لینے کے بعد ہم نے ان کی خاص سوسائٹی میں بھی داخل ہونا شروع کر دیا اور نہایت خاموشی کے ساتھ اس نئی دنیا کی سیر کرتے رہے۔ میر صاحب کا معمول تھا کہ اپنے دوستوں کے مجمع میں جاتے ضرور تھے لہٰذا ہم نے بھی ان کے ہمراہ جانا شروع کر دیا اور وہاں جا کر صحیح معنوں میں ایک نئی دنیا دیکھی جس کمرہ میں اس کانفرنس کے اجلاس ہوتے تھے اس کے وسط میں ایک بڑا سا پتیلہ چولھے پر چڑھا رہتا تھا جس میں چار دم ہوئی تھی اور اس پتیلے کے چاروں طرف میر صاحب کے تمام دوست حلقہ باندھ کر بیٹھتے تھے اور سب کے سامنے کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور تھا کسی کے سامنے چار کی پیالی ہوتی تھی تو کوئی کلھڑ لئے بیٹھا ہوتا تھا کسی کے آگے حقہ ہوتا تھا تو کوئی اپنی عزیز از جان پیالی میں چٹکی ڈالے بیٹھا ہوتا تھا کسی کے ہاتھ میں طلسم ہوشربا کی کوئی جلد ہوتی تھی تو کوئی کھٹیوں سے شغل کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر ایک کسی نہ کسی کام میں مصروف ضرور ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ اہم ترین معاملات پر تبادلۂ خیال کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ کسی نے کہا:———— (ہر جگہ نون غنہ بڑھا کر پڑھیے)

"اماں بھائی۔ غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں"

دوسرے بولے۔ ارے یار پھر کہاں ہم اور کہاں یہ صحبتیں مر کر چلے جائیں گے پھر ہم ہوں گے اور قبر کا کونا"

تیسرے نے کہا۔ سچ ہے بھائی اللہ بس باقی ہوس۔

چوتھے نے فرمایا " خدا معلوم کیا حشر ہو بڑے گناہ کئے ہیں"

پانچویں بولے۔ واللہ ہم سا روسیاہ بھی دنیا میں کوئی نہ ہوگا نہ نماز کے نہ روزے کے آخر خدا کو کیا منہ دکھائنگے بھائی اور چاہے جو کچھ کرو نماز ضرور پڑھ لیا کرو بڑی برکت ہوتی ہے اور سارے گناہ معاف ہو جائیں گے یہ نماز نہ پڑھنا تو جہنم کی سیر کرائے گا۔

میر صاحب نے فرمایا " اماں لاحول ولا قوۃ کیسی باتیں کرتے ہو، خداوند کریم بڑا رحیم ہے، اماں وہ ہم کو نہ بخشے گا تو کیا فرنگیوں کو بخشے گا، بھائی ہم کلمہ تو پڑھتے ہیں ان گنہگاروں کو دیکھو جو دنیا کے گناہ کرتے ہیں اور پھر بھی بادشاہت کرتے ہیں مگر وہاں جا کر پتہ چلے گا۔

ایک اور صاحب کہنے لگے۔ کیا بات کہی ہے واللہ مگر میر صاحب یہ انگریزوں کی شاہی بھی گاندھی نے کرکری کر دی سنا ہے کہ اب تو لڑائی ہونے والی ہے"

میر صاحب " اماں جاؤ بھی گاندھی بیچارہ کیا کرتا وہ تو کہو کہ سرکار نے ڈھیل چھوڑ رکھی ہے نہیں تو توپ کے منہ پہ باندھ کر اڑا دیتی سرکار سے کوئی کیا لڑے گا۔ ہزاروں بندوقیں توپیں، تیر و کمان، تلوار سب ہی تو اس کے پاس ہیں سر سے کر دے

جوکوئی سر بھی اُٹھائے، اماں آج چاہے تو پَل بھر میں بارود بھر کر سارے شہر کو اڑا دے۔ ہوائی جہاز سے آگ برسادے ریلوں کو لڑادے موٹروں سے کچل دے اماں ایک ہوائی جہاز ایسا ہے کہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ایک صاحب نے فوراً آنکھیں کھول کر فرمایا اسے ہاں بھائی میر صاحب خوب یاد دلایا، یار اِن ہوائی جہازوں سے تو بڑی بے پردگی ہوتی ہے۔ سب پردہ دار عورتوں کو یہ لوگ دیکھتے ہوں گے۔"

دوسرے صاحب کہنے لگے۔ "ہاں بھائی کل ہی کا ذکر ہے کہ ایک ہوائی جہاز میرے مکاں پر نکلا اگر بہت نیچا تھا ہیں نے بھی لڑکے کا لنگڑ لیکر جو اسپر مارا تو قسم ہے آپ کے سر عزیز کی کہ بس ذرا سا بچ گیا نہیں تو زمیں پر ہوتا اور ہڈی پسلی سرمہ ہوگئی ہوتیں میر صاحب نے تجویز پیش کی۔ بھائی تو اَب کیا کیا جائے عورتوں کو انگنائی میں نہ نکلنے دیا کرو یا ایک شامیانہ لیکر لگا دو۔

اس کے بعد پردہ کا مسئلہ چھڑ گیا اور پھر یورپ کی آزادی پر تبصرہ ہونے لگا، انگریزوں کی دولت کا ذکر ہوا اُنکی تندرستی اُن کی غذا ان کے لباس اُن کی معاشرت ان کی گندگی ان کے کتوں ان کی میموں ان کے بچوں کا تذکرہ ہوا بیکاری اور فارغ البالی کے موضوع پر دھواں دھار تقریریں ہوئیں ہندوستان کے افلاس پر اظہار افسوس کیا گیا ہند و مسلم کشیدگی پر دیر تک بحث ہوتی رہی۔ سوراج کے امکانات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ جنگ کے آثار کا اندیشہ ظاہر کیا گیا، جنگ کے ہولناک نتائج بیان کئے گئے اور پھر قرب قیامت کے وعظ کے بعد ایک صاحب نے تجویز پیش کی ہم سب نماز شروع کردیں اور اب کی رمضان میں روزے ضرور رکھیں انطاری کی فہرست مرتب ہوئی اور یہ دلچسپ کارروائی ایک صاحب کے چارکی طرف متوجہ ہونے سے ادھوری رہ گئی۔ جس کے بعد سب نے چا نوشی شروع کردی اور پھر دوسرا دور شروع ہوا جس کے ساتھ ساتھ کوئی تو اپنی خاندانی فیاضی کے فسانے سناتا رہا کوئی اپنے والد مرحوم کے کارنامے بیان کرتا رہا کسی نے اپنی جوانی کی رنگین داستاں چھیڑ دی اور میر صاحب نے اپنے خاص انداز بیان میں واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے محلات کا ذکر شروع کیا جو نہیں معلوم کہاں کہاں ہوتا ہوا الہ آباد کی نمائش پر آکر ختم ہوا۔ ایک صاحب جو دیر سے اپنے دونوں گھٹنوں میں سر دئے ہوئے بیٹھے تھے ذرا سا اُبھرے اور سب کو داستان امیر حمزہ کی طرف متوجہ کیا جسکی سب نے تائید کی اور ایک صاحب نے شروع کردیا۔ داستان کا پڑھنا اور سب آنکھیں بند کرکے سننے لگے وہ حضرت داستان پڑھ رہے تھے داستان کے ایک ایک فقرے پر ایکٹنگ بھی فرماتے جاتے تھے لیکن سامعین کا یہ حال تھا کہ رفتہ رفتہ سب کے سر گھٹنوں میں گھستے جاتے تھے صرف داستاں گو کی آواز کمرہ میں گونج رہی تھی باقی سب پر ایک سکوت بلکہ موت کی سی کیفیت طاری تھی۔

شوکت تھانوی

باب الاستفسار

(جناب محمد عظمت علی خاں صاحب۔ رنگون)

براہ کرم حسب ذیل دو سوالات کا جواب مرحمت فرمائیے

(۱) مشہور شعر ہے :-

پس از سی سال این معنی محقق شد بہ خاقانی
کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی

کیا یہ شعر واقعی خاقانی کا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے؟

(۲) شاہجہاں کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ شطرنج میں ایک رئیس کے مقابلہ میں اُن کو مات ہو رہی تھی کہ ان کی کسی بیگم نے یہ نقشہ بتایا براہ کرم اس واقعہ کی تفصیل سے آگاہ فرمائیے نیز یہ کہ شطرنج کا وہ نقشہ کیا تھا میں نے ہر ایک شخص کی زبانی یہی سنا ہے کہ اس نقشہ میں فرزیں پٹ رہا تھا اور اس کو دو رُخ دیکر کھیلنے کا مشورہ بیگم نے دیا تھا۔ گویا دلارام یہاں فرزیں کے معنے میں آیا ہے۔

(نگار) آپ نے جو شعر لکھا ہے اس کا پہلا مصرعہ تو یقیناً خاقانی کا ہے، لیکن دوسرا نہیں ہے۔ خاقانی کا اصل شعر یہ ہے:-

پس از سی سال این معنی محقق شد بخاقانی
کہ سلطانی ست درویشی و درویشی ست سلطانی

لیکن اس شعر کا دوسرا مصرعہ بدلکر ابو اسحاق نے وہ رکھدیا جو آپ کے لکھے ہوئے شعر میں پایا جاتا ہے۔

ابو اسحاق ایک شاعر تھا جو کھانے کا بڑا شائق تھا اور اس کی شاعری کی خصوصیت یہی تھی کہ وہ سوائے کھانے کی چیزوں کے اور کوئی ذکر ہی نہ کرتا تھا۔ اس نے سعدی، حافظ وغیرہ کے بہت سے اشعار میں اس طرح کا تصرف کر کے اپنے ذوق کا اظہار کیا ہے۔

چنانچہ حافظ کے بعض اشعار معہ تصرفات ابو اسحاق کے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

اشعار حافظ	تصرفات ابو اسحاق
آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند	کیپا پزاں سحر کہ سر کلّہ وا کنند آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند
ترک عاشق کش ما مست برون رفت امروز تا دگرا خونِ دل از دیدہ رواں خواہد بود	مطبخی باز پیاز از جہت قیمہ خرید تا دگر آب ز چشم کہ رواں خواہد بود
گوشہ گیری و سلامت ہوسم بود ولے فتنۂ می کند آں نرگس فتاں کہ مپرس	روزہ داری و قناعت ہوسم ہست ولے چشمکے می زند آں برۂ بریاں کہ مپرس
کس بہ اُمید وفا ترک دل و دیں نکناد کہ چنانم من ازیں کردہ پشیماں کہ مپرس	کس بہ بالائے مزعفر نکناد آش ترش کہ چنانم من ازیں کردہ پشیماں کہ مپرس

سعدی کا مشہور شعر ہے:۔

تواضع زگردن فرازان نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

ابو اسحاق نے اس میں یہ تصرف کیا:۔

شکم پر ز حلوا و بریاں نکوست
عدس گر شکم پر کند خوئے اوست

الغرض اس نے اپنی ساری عمر اسی طرح کی شاعری میں بسر کی۔ اور اُسی نے خاقانی کے اس شعر کو جس کا آپ نے ذکر کیا ہے "با دنجان دبورانی" کے اضافہ سے اپنا کر لیا اور اس قدر مشہور ہو گیا کہ آج خاقانی کا اصل شعر شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ ابو اسحاق کا شعر جو تصرف کے بعد اس نے لکھا تھا یہ ہے:۔

پس از سی سال بو اسحاق شد تحقیق ایں معنی
کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی

لیکن عام طور پر لوگ اس طرح پیش کرتے ہیں جس طرح آپ نے لکھا ہے'

۲ــــ شاہجہاں اور نقشۂ شطرنج کے متعلق جو قصہ آپ نے بیان کیا ہے وہ تفصیل کے ساتھ یوں بتایا جاتا ہے کہ ایک بار شاہجہاں کسی ایرانی شاہزادہ کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مصروف ہوا اور شرط یہ قرار پائی کہ جو جیت جائے وہ حرم کی کوئی بیگم فریق ثانی کو نذر کرے۔ اتفاق سے چالیں ایسی پڑیں کہ شاہجہاں کو مات ہونے لگی اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا توڑ کیا ہو۔ شاہجہاں بازی کو اسی طرح چھوڑ کر اندر گیا تاکہ کسی بیگم کا انتخاب کرے۔ ایک بیگم نے جس کا نام جہاں بیگم تھا بادشاہ کا ارادہ معلوم کرکے کہا کہ :-

تو بادشاہ جہانی، جہاں ز دست مدہ
کہ بادشاہ جہاں را، جہاں بکار آید

بادشاہ ایک دوسری بیگم (حیات بیگم) کی طرف مخاطب ہوا تو اس نے عذر کیا کہ :-

جہاں خوش ست ولیکن حیات می باید
اگر حیات نباشد جہاں چہ کار آید

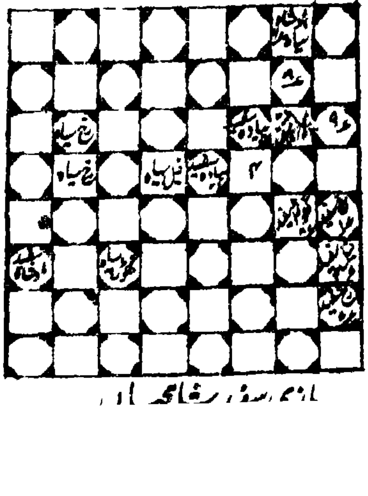
یہ سنکر بادشاہ تیسری بیگم کی طرف مخاطب ہوا جس کا نام فنا بیگم تھا اُس نے کہا کہ :-

جہان و حیات وہمہ بے وفاست
طلب کن فنا را کہ آخر فناست

اس کے بعد بادشاہ اپنی نہایت ہی محبوب و عزیز بیگم دلارام کے پاس گیا۔ اُس نے کہا مجھے شطرنج کا نقشہ تو ایک بار دیکھ لینے دیجئے۔ چنانچہ بادشاہ اس کو لے گیا اور اس نے بساط کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا کہ :-

شاہا دو رُخ بدہ و دلارام را مدہ
پیل و پیادہ پیش کن و اسپ کشت مات

اس شعر میں دلارام کے معنی فرزین کے نہیں ہیں، بلکہ خود اسی کی ذات مراد ہے، شطرنج کا نقشہ جس میں دلارام کی بتائی ہوئی چالوں سے فریق مخالف کو مات ہوتی ہے حسب ذیل ہے :- بازی سیاہ شاہزادہ ایران



بازی سفید شاہجہاں

آپ بساط پر باقاعدہ مہروں کو رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ شاہجہاں کے سفید شاہ کو صرف ایک چال میں مات ہو سکتی ہے اور اس کا کوئی علاج نظر نہیں آتا، لیکن دلارام کی بتائی ہوئی چالوں سے خود سیاہ بازی کو مات ہو جاتی ہے۔ وہ چالیں دلارام نے اپنے شعر میں اس طرح ظاہر کی ہیں کہ "دو رُخ کٹوا دے جائیں پھر پیل کی شہ دی جائے، اس کے بعد پیادہ کی اور پھر گھوڑے کی" ان چالوں سے مات ہو جائے گی۔

رخ سفید خانہ نمبر ا سے نمبر ۲ میں رکھا جائے، سیاہ بادشاہ کو کوئی چارہ سوائے مار لینے کے نہ ہوگا، اس کے بعد فیل سفید کو خانہ نمبر ۳ سے اٹھا کر نمبر ۴ میں رکھ دیا جائے اور رخ خانہ نمبر ۵ سے اٹھتی ہوئی کشت دیجائے۔ (واضح رہے کہ اُس وقت پیل کی چال صرف تین گھر ترچھی ہوا کرتی تھی اور بیچ میں اگر کوئی اور مہرہ ہوتا تھا تو اس کو پھاند کر بھی چل دیتے تھے) رُخ کی اس اُٹھتی ہوئی کشت سے سیاہ بادشاہ کو پھر اصلی گھر خانہ نمبر ۶ میں واپس جانا پڑے گا۔ اس کے بعد رُخ سفید خانہ نمبر ۵ سے پھر خانہ نمبر ۲ میں رکھ کر کشت دیجائے، بادشاہ سیاہ پھر اس کو مار یگا اور خانہ نمبر ۲ میں بیٹھ جائے گا۔ اس کے بعد پیادہ سفید خانہ نمبر ۷ سے خانہ نمبر ۸ میں بڑھا کر کشت دی جائے، بادشاہ مجبوراً پھر خانہ نمبر ۶ میں آئے گا۔ اس کے بعد سفید گھوڑا خانہ نمبر ۸ سے خانہ نمبر ۹ میں رکھ کر کشت مات دی جائے اس واقعہ کو کوئی تاریخی اہمیت حاصل نہیں ہے بلکہ صرف ایک لطیفہ کی صورت سے مشہور ہے۔

شرق اردن کی حکومت

(جناب محمد عباس علی صاحب۔ اجین)

عرب میں اس وقت اردن کی حکومت سے کیا مراد ہے، یہ حکومت کب قائم ہوئی اور کس حصۂ زمین پر ہے۔ اگر کچھ اور حالات آبادی و آمدنی وغیرہ کے بھی معلوم ہو سکیں تو بہتر ہے۔ میرا ایک بھائی وہاں جاکر تجارت کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کا ایک دوست اتفاق سے بہ وساطت ملک فیصل وہاں پہونچ گیا ہے اور اسے بلاتا ہے

(نگار) جب جنگ عظیم ختم ہوگئی تو انگلستان اور فرانس میں باہم طے پاگیا کہ سواحل سوریا کی نیابت فرانس کی طرف سے ہوگی اور فلسطین کی طرف سے انگلستان نیابت کریگا لیکن بلاد عربی جو حلب سے لیکر معان تک وسیع ہیں خالص عربی حکومت ہوگی۔ اس معاہدہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوریا کا علاقہ فرانس کے زیر اثر آگیا اور فلسطین کا انگلستان کی سیادت میں۔ اب رہگیا حلب سے لیکر معان تک کا حصہ سو اس میں ایک جدید عربی حکومت قائم کرکے امیر فیصل کو اسکا فرمانروا اقرار دیا گیا اور امیر نے دمشق کو پایۂ تخت قرار دیکر ابنائے عرب کی خالص عربی حکومت کی طرح وہاں ڈالی۔

چند دن بعد امیر فیصل اور حکومت فرانس میں اختلاف پیدا ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی فوجیں جولائی ۱۹۲۰ء میں دمشق کے اندر داخل ہوگئیں اور امیر فیصل کو معزول کرکے اہل فرانس نے سوریا پر قبضہ کر لیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ فلسطین کے جوار میں جو بلاد معان، اسلط، کرک وعمان واقع ہیں وہاں کیا انتظام کیا جائے کیونکہ یہ مقامات بھی امیر فیصل کی حکومت میں تھے، اور فرانس سیادت انگلستان کی وجہ سے یہاں کچھ نہ کر سکتا تھا، اس لئے انگلستان نے خود تو وہاں قابض ہونا مناسب نہیں سمجھا اور امیر فیصل کی جگہ اُسکے بھائی امیر عبداللہ کو بہ حیثیت نائب ہونے کے حکومت تفویض کردی۔ یہی حصہ شرق اردن کی حکومت کہلاتا ہے۔

کچھ دن تو یہی صورت قائم رہی لیکن بعد کو انگلستان نے فیصلہ کیا کہ بلاد شرق اردن میں علیحدہ ایک مستقل حکومت قائم کردی جائے اور اس طرح اپریل ۱۹۲۱ء میں امیر عبداللہ کو امتحاناً وہاں کا فرمانروا بنا دیا گیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ برطانیہ کی نیابت فلسطین کی طرح یہاں بھی کام کریگی۔

۱۹۲۳ء میں حکومت برطانیہ نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ وہ حکومت اردن کو امیر عبداللہ کے سیادت میں ایک مستقل حکومت تسلیم کرنے کے لئے طیار ہے بشرطیکہ وہاں حکومت دستوری قائم کی جائے۔ چنانچہ ۲۰ فروری ۱۹۲۸ء کو برطانیہ اور حکومت شرق اردن کے درمیان معاہدہ ہوگیا اور اس کے رو سے وہاں ایک مجلس تشریعی قائم کی گئی

چنانچہ اب امیر عبداللہ وہاں کے فرمانروا ہیں اور ان کے بڑے بیٹے کو برطانیہ نے ولی عہد بھی تسلیم کر لیا ہے لیکن یہ حکومت و فرمانروائی بالکل ویسی ہی ہے جیسے ہندوستان کی ریاستوں میں نظر آتی ہے کہ بلا استمزاج حکومت برطانیہ کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

ریاست اردن کی آبادی دو لاکھ ساڑھے ہزار سے زیادہ نہیں ہے جس میں سے ۲ لاکھ ۲ ہزار مسلمان ہیں اور ۱۲ ہزار عیسائی، دس ہزار کے قریب چرکس قوم کے آدمی بھی پائے جاتے ہیں۔

پولیس وجندرمہ میں بھی تقریباً ایک ہزار آدمی ملازم ہیں اور مدارس وغیرہ بھی قائم کئے گئے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں یہاں کی آمدنی کا اندازہ ۳۵۹۴۴۵ گنی کیا گیا تھا۔

امیر عبداللہ ملک حسین والی حجاز کے دوسرے بیٹے ہیں، ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اور اب پچاس سال کی عمر رکھتے ہیں۔ آدمی معقول ہیں۔

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن وعشق کی تمام نشہ کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں قیمت صرف دس آنے (۱۰) علاوہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

اعتبارات

رات تھی اور تاریک، سکون تھا اور مطلق —— تاریکی و سکون کی شدت کے ساتھ میری قوت مشاہدہ وبصیرت بہت غائر و عمیق ہوجایا کرتی ہے —— دو بج چکے تھے، دنیا غافل ہورہی تھی اور میں تنہا گاؤں کے ایک جھونپڑے میں، گہرے سکون کی اس خاص آواز کو جسے کان نہیں صرف دماغ سن سکتا ہے، پوری طرح محسوس کررہا تھا۔

فضا کے وسیع بسط میں ستارے اس طرح منتشر تھے گویا کہ وہ روشنی کے بیشمار قطرے ہیں جو سطح پر گرگر پھیل گئے ہیں، میں خاموش لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ کیا خدا کی ابدیت اسی احاطہ نہ ہوسکنے والی کائنات کا مفہوم ہے، کیا خدا کا وجود اسی لانہایت سے عبارت ہے اور کیا ازلیت اسی کا دوسرا نام ہے —— دفعتہً ایک ستارہ ٹوٹا اور پہلے ایک سیدھا، پھر منحنی خط بناتا ہوا تیز روشنی میں تبدیل ہوکر فنا ہوگیا —— فوراً اس مذہبی معلم کی طرف خیال منتقل ہوا جس نے از روئے حدیث نبوی کسی وقت یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ جنھیں شہاب ثاقب کہتے ہیں۔ وہ اس گرز کی چنگاریاں ہیں جسے فرشتے شیطانوں کے سروں پہ مارتے ہیں —— اس کے بعد ہی یورپ کے ایک گمراہ فلسفی کا مقولہ یاد آگیا کہ "دنیا عبارت ہے،، خدا اور شیطان کے درمیان سمجھوتے"، سے ——

میں ان دونوں خیالوں کے تضاد و اختلاف پر دیر تک دل ہی دل میں ہنستا رہا اور پھر سوچنے لگا کہ کیا انسان کی سرکشی ہمیشہ جہل ہی کے ردعمل کا نتیجہ ہوا کرتی ہے —— اتفاق سے اسی وقت گاؤں کے اس مجذوب کی آواز کان میں آئی جس کی بات مشکل ہی سے کسی کے سمجھ میں آتی تھی۔ وہ مندر کے ایک ایک بت کو باہر نکال کر پھینکتا جاتا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ "عقل سے کام لیکر خدا کا انکار، اس سے بہتر ہے کہ بے عقلی سے اس کا اقرار کیا جائے"۔ میں نے پاس جاکر اس سے پوچھا کہ "اگر بے عقلی سے بجائے اقرار کے انکار کیا جائے تو؟" اس نے مجھے دیکھا اور کہا کہ "یہ اپنی قسم کی بالکل پہلی بے عقلی ہوگی" اور پھر اپنے کام میں لگ گیا

مطبوعات موصولہ

انتخاب دیوان شمس تبریز | مغرب کے مشہور مستشرق ڈاکٹر رنالڈ نکلسن کا دیوان شمس تبریز بہت مشہور چیز ہے جسکے مقدمہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے نہ صرف شمس تبریز بلکہ جلال الدین رومی اور ان کے ہمعصر اکابر رجال کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور صوفیانہ شاعری پر بحث کرتے ہوئے فلسفۂ تصوف پر بھی مورخانہ و ناقدانہ گفتگو کی ہے۔

اسی کتاب کو اب نگار کے مشہور فاضل مقالہ نگار مولوی عبدالمالک صاحب آروی نے اردو میں منتقل کیا ہے اور حقیقت سے انکار ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اس کی ترتیب میں ڈاکٹر نکلسن سے کم محنت کی ہے۔ یہ کتاب حقیقتاً ترجمہ نہیں ہے بلکہ خود نکلسن کی تصنیف پر ایک فاضلانہ تبصرہ ہے، جس میں بہت کچھ مفید اضافہ کے ساتھ نکلسن کے "تسامحات" کو بھی ظاہر کر دیا گیا ہے۔

ملک کو ممنون ہونا چاہئے ایوان اشاعت گورکھپور کا جس نے اس کتاب کو نہایت نفیس طباعت وکتابت کے ساتھ شائع کیا اور حوصلہ افزائی کرنا چاہئے اس کے فاضل مرتب کی جس نے انتہائی عرق ریزی و خوش سلیقگی سے ایک ایسی چیز اردو میں پیش کی جس کی مثال ہمارے یہاں کے انتقادی لٹریچر میں مشکل ہی سے کوئی دوسری مل سکتی ہے۔ آخر میں غزلوں کا انتخاب بھی دیدیا گیا ہے۔ اس کی قیمت عہ/ رکھی گئی ہے اور ایوان اشاعت گورکھپور سے مل سکتی ہے۔

یوروپ میں دکھنی مخطوطات | یہ تالیف جناب مولوی نصیر الدین ہاشمی کی ہے جس میں انھوں نے تمام ان دکھنی مخطوطات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جو یوروپ کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب موصوف نے خود یوروپ جاکر وہاں کے کتب خانوں کی چھان بین کی اور ان مخطوطات کے متعلق جو غلطیاں وہاں کی فہرستوں میں پائی جاتی تھیں ان کی اصلاح کی اور اپنے ساتھ ایک بیش بہا ذخیرہ معلومات کا لائے۔

اس کتاب میں ایک مختصر سا مقدمہ ہمارے فراموش کار دوست ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی، ایچ، ڈی (لندن) کا بھی شامل ہے جس میں انھوں نے اس تالیف کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے فاضل مولف کی محنت و کاوش کی پوری داد دی ہے۔

کے اس رسالہ میں جناب ماہر نے مختلف اشیاء کے جوہر، نمک اور ست بنانے کے ایسے آسان طریقے بتائے ہیں کہ ہر شخص ان کو بنا کر کام لے سکتا ہے۔ ان کا طریق استعمال بھی بتایا گیا ہے اور یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ کن کن امراض کے لئے مفید ہیں۔ چونکہ جوہر نمک وغیرہ بہت جلد اپنا اثر کرتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص کتاب کی ہدایت کے مطابق چند ضروری چیزیں بنا کر اپنے پاس محفوظ رکھے تو معمولی معمولی امراض میں اسے اطباء کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔

ترقی یافتہ ممالک میں تو ہر شخص کسی نہ کسی حد تک فن معالجہ سے واقف ہوتا ہے اور معمولی امراض کا علاج خود ہی کر لیتا ہے۔ لیکن ہندوستان ایسے جاہل ملک میں جہاں نزلہ و زکام کے فرق کو بھی لوگ محسوس نہیں کر سکتے، اس فن سے لوگوں کو سخت بیگانگی ہے۔ اس لئے جناب ماہر کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے یہ رسالہ لکھکر عوام کے معمولی امراض کا علاج ان کے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ لیکن بعض بعض جگہ فرو گزاشت بھی ہو گئی ہے، مثلاً جوہر اڑانے کی ترکیبوں میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ آنچ کتنی لکڑی کی دی جائے یا اگر اسپرٹ وغیرہ سے جوہر اڑانا ہو تو کتنی گرمی پہونچانا چاہئے۔ دوسرے اڈیشن میں اس کمی کو دور کر دینا چاہئے۔ اس کتاب کی قیمت ۶ر ہے اور خود جناب مصنف سے فراش خانہ دہلی کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

عصمتی کشیدہ ملک کے مشہور نسوانی رسالہ عصمت دہلی میں جو مختلف نمونے سوزنکاری کے شائع ہو چکے ہیں ان کو یکجا طور پر عصمتی کشیدہ کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں تقریباً ۵۰ نمونوں کے نقشے دئے گئے ہیں اور سب کے سب اچھے ہیں۔ بنانے کی ترکیب بھی نہایت صاف و آسان زبان میں بتادی گئی ہے۔ منیجر رسالہ عصمت دہلی سے یہ کتاب ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔

عصمتی کروشیا یہ بھی رسالہ عصمت دہلی کی طرف شائع ہوئی ہے اور اس میں کروشیا کے کام کے ۵۷ نمونے مع ہدایات وغیرہ درج کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب عہ میں رسالہ عصمت دہلی کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

موتیوں کا کام اسی سلسلہ کی یہ تیسری کتاب ہے جو حال ہی میں رسالہ عصمت نے شائع کی ہے آج کل موتیوں کا کام عورتوں میں بہت مقبول ہوتا جا رہا ہے اس لئے اس کتاب کی اشاعت بہت بڑی ہوئی ہے۔ اس میں مختلف چیزوں کے دو سو سے زیادہ نمونے دئے گئے ہیں، جو واقعی بہت خوشنما ہیں، ہر چیز کے بنانے کی ترکیب بھی بتادی گئی ہے۔ اس کی قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ وہی رسالہ عصمت دہلی ہے۔

صبغۃ اللہ یہ کتاب ہے جناب شیخ غلام محمد احمد صاحب ایم۔ اے کی، جنھوں نے اس میں صوفیا و کرام کے "فلسفۂ ریاضات و کمالات" سے بحث کی ہے اس وقت تک تصوف پر اتنی کتابیں اردو میں لکھی جا چکی ہیں کہ شاید ہی کسی اور موضوع پر لکھی گئی ہوں، لیکن ان میں زیادہ تر وہی ہیں جو "خوارق عادات"

کو تنہا ذریعہ اظہار عظمت سمجھکر تصنیف ہوئی ہیں، اور جن میں اخلاق وسیرت کو معمولی بات سمجھکر نظر انداز کردیا ہے یا بہت کم اس طرف اعتنا کیا گیا ہے۔

لیکن اب دور حاضر میں مستشرقین کی دیکھا دیکھی لوگوں کو توجہ رہی ہے کہ وہ فلسفہ وتاریخ کے نقطۂ نظر سے اس پر بحث کریں اور صرف اسی پر اکتفا نہ کریں کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے وہ داخل تصوف کردی جائے۔

یہ کتاب بھی اسی نوع کی کوشش کا نتیجہ ہے لیکن ناقص ونا تمام کیونکہ اس وقت ضرورت اصطلاحات تصوف سے بحث کرنے کی نہیں ہے اور نہ اُن اقوال وآثار کے نقل کرنے کی جن کا زیادہ حصہ موضوع وغیر صحیح ہے، بلکہ ضرورت ہے۔ اس پیام امن وسکون کی تبلیغ کی، جو تصوف کا مقصد وحید ہے۔ آپ وحدت وجودی ذکر وفکر، فنافی اللہ لاہوت وناسوت وغیرہ کی اصطلا میں سمجھا کر کوئی تبدیلی اخلاق انسانی میں پیدا نہیں کرسکتے اور نہ تصوف نام ان مصلحات کا ہے جو یقیناً اختلاط تصوف کے دور کی چیزیں ہیں، بلکہ تصوف عبارت ہے اس "جلوہ محبت" سے جو سب سے پہلے تفریق نسل وقوم کو مٹاتا ہے اور پھر اخیر میں اختلاف مذاہب محو کرکے انسان کو اس فضا میں پہونچا دیتا ہے جہاں انفرادی حیثیت مٹ کر صرف "انسان کلی" کا مفہوم باقی رہجاتا ہے۔

اس لئے میری رائے میں تصوف کی کتابیں لکھنا اس قدر مفید نہیں ہے جتنا خود اپنے اخلاق واعمال سے اس کی غایت کو واضح کرنا۔ تصوف اور "درس محبت" ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، اس لئے درس محبت بیکار ہے اگر خود اپنے دل میں "محبت" کا وجود نہیں اور نہ محبت کا کوئی خاص دستور وآئین ہے جسے آپ اصطلاحوں کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

میرا عقیدہ ہمیشہ سے یہی ہے کہ نوع انسانی کی نجات اور دنیا کا امن وسکون صرف تصوف ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے، لیکن وہ تصوف ایک انسان کے قلب ونگاہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے، کتاب اور دفتر مصطلحات سے نہیں۔

اس کتاب کو میں اس لحاظ سے ضرور غنیمت سمجھتا ہوں کہ اس میں خوارق عادات وغیرہ سے بحث نہیں کیگئی ورنہ اس سے آگے وہ کچھ نہیں ہے، کیونکہ جس وقت ہم اپنے یہاں کے اس نوع کی تصانیف کے مقابلہ میں ہندو متصوفین کے ارشادات دیکھتے ہیں تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ مسلمان جو اپنے آپ کو بہت بڑا علمبردار اس چیز کا سمجھتے ہیں، ان کے یہاں سوائے لایعنی اصطلاحات اور چند دقیق ومشکل الفاظ کے کچھ نظر نہیں آتا اور سوامی رام کا ہر ہر لفظ ایک ایسا پیغام محبت ہے جس کے آگے سر جھکا دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔

یہ کتاب ۱۲؍ میں مصنف سے جموں توی، جموں کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

نغمۂ دل | دیوان ہے جناب حکیم ضمیر حسن خان صاحب دل شاہجہاں پوری کا جو نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

حضرت دل اس وقت ہندوستان کے مشہور شعراء میں سے ہیں اور ناظرین نگار کے طبقہ میں تو یوں بھی تعارف کی ضرورت نہیں کیونکہ اُنکا کلام اکثر نگار میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ وہ لوگ جو شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں اور سنجیدہ رنگ تغزل کے شائق ہیں اُن کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

ابتداء میں میرا ایک بسیط مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے اور حضرت عزیز لکھنوی کا تبصرہ بھی۔ مصنف کی دو تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ ایک عنفوان شباب کی اور دوسری اس وقت کی۔ آپ کا رنگ کلام ذیل کے بعض اشعار سے معلوم ہو سکتا ہے:۔

سر طور ایک برق حسن لہراتی نظر آئی ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے دامن کو

نگاہ مست سے اُدھر کے دیکھنے والے تجھے تو ہے، مجھے اپنی خبر نہیں نہ سہی

نگاہ شوق رہی ہمزبان دل لیکن کسی طرح نہ بنا شرح آرزو کرتے

حُسنِ چمن تھے قطرۂ شبنم بہار میں بلٹی ہوا تو اشک گل تر کے ہو گئے

کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے

روز آ آکر تسلی دل کو دیجاتا ہے کون کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ سمجھاتا ہے کون

پردہ اٹھا دیا یہ عجب اُس نے چال کی دیکھا تو ہم میں تاب نہ تھی عرض حال کی

یہ بھیگی رات، یہ ٹھنڈا اسماں، یہ کیف بہار یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانے کا

یہ دیوان علاوہ محصول عیہ میں منیجر نگار یا خود حضرت مصنف سے محلہ ہاتھی تھان شاہجہانپور کے پتہ سے مل سکتا ہے

بقیہ ملاحظات بسلسلہ صفحہ نمبر آٹھ

اب رہا یہ امر کہ والدین کے کہنے سے طلاق دینا ضروری ہوجاتاہے میں عمومیت کے ساتھ اس کا قائل نہیں ہوں اور عہد نبوی کے جو بعض واقعات ایسے بتائے جاتے ہیں اگر ان کی تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ صورتیں ایسی تھیں کہ اگر والدین مجبور نہ کرتے تو بھی طلاق دیدینا ضروری ہوجاتا اور ان کا مجبور کرنا بھی صرف انھیں اسباب کی بنا پر ہوگا جو بہرصورت طلاق کو لازم کردینے والے ہیں بلا کسی اور مصلحت یا سبب خاص کے محض والدین کے کہنے پر طلاق دینا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ لیکن عبدالماجد تو یہ وجہ بھی پیش نہیں کرسکتے، کیونکہ جو شخص والدہ اور تمام اعزہ کی مخالفت کے باوجود شادی کرلے اس کو یہ حق کب حاصل ہوسکتاہے کہ وہ بعد کو طلاق دینے کی وجہ اس مخالفت کو قرار دے۔

اس قدر لکھنے کے بعد میں اس بحث کو ختم کرتاہوں اور آئندہ نگار میں اس موضوع پر قلم نہ اٹھاؤنگا۔ اگر عبدالماجد نے اپنی تحریروں سے مجھے مجبور نہ کردیا

ٹھیک اس وقت جبکہ آرڈنینس کا دور اپنی انتہائی منزل پر آرہا تھا اور ہندوستان کا کھویا ہوا امن وسکون مقتضی تھا کہ اس تاریک عہد کے بعد صلح وعافیت کا آفتاب طلوع کرے دفعتہً ۲۷ جون کو لندن اور شملہ کے ایوان حکومت سے وہ اعلان شایع ہوتاہے جو آج کل سیاسی حلقوں میں انتہائی سرگرم گفتگو کا موضوع بنا ہواہے۔

دنیا سمجھ رہی تھی کہ اب غالباً آرڈنینس کے ذریعہ سے حکومت کی پالیسی ترک کردی جائے گی، لیکن دنیا کی یہ نافہمی دور کردی گئی اور اسی کے ساتھ جس صورت سے ہندوستان کی قسمت کا آئندہ فیصلہ کیا جانے والا ہے اس کا بھی اعلان کرکے ایکبار اور ہمیشہ کے لئے ذہن نشین کرادیا گیا کہ بھیک دینے کا طریقہ وہی خوب جانتاہے جس سے بھیک مانگی جاتی ہے۔ یعنی اگر ایک طرف مستقبل کے آئین حکومت کو پیش کیا گیا تو دوسری طرف یہ بھی بتادیا گیا کہ اس وقت تک جس چیز کو راونڈ ٹیبل کانفرنس کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا وہ محض خواب وخیال تھا کیونکہ ہندوستان کے باشندے ہنوز اس کی اہلیت نہیں رکھتے کہ وہ اپنے ملک کے کسی معاملہ میں کوئی اہم رائے قائم کرسکیں اور برطانیہ اپنے اس حصہ کو بھی ترک نہیں کرسکتا جو ایک "شیر کا حصہ" ہونے کی حیثیت سے ایک چیز کے کل پر حاوی ہوسکتاہے۔

اگر آپ اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں تو تیرہ سال قبل سے اس داستان کو شروع کیجئے۔ جب سنہ ۱۹۱۹ء میں اصلاحات کی اسکیم منظور ہوئی۔ تو ہندوستان کے قوم پرست اور آزادی پسند طبقوں نے اسکو ناکافی سمجھکر ترک موالات کے سلسلہ کو برابر جاری رکھا۔ سوراج پارٹی مرکزی اور صوبوں کی قانون ساز

جماعتوں میں داخل ہوگئی اور اس نے ایک گول میز کانفرنس کا مطالبہ کیا جس میں ہندوستانی نمائندے، برطانوی نمائندوں کے ساتھ مساوی مرتبہ رکھتے ہوئے ہندوستان کے آئندہ آئین کی تشکیل کر سکیں لیکن اس مطالبہ کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور وقت گذرتا رہا۔ جب دس سال کی میعاد ختم ہوئی جس کے بعد آئینی اصلاحات کے قانون پر نظر ثانی کرنا پارلیمنٹ منظور کرچکی تھی تو سائمن کمیشن مقرر کیا گیا، لیکن چونکہ اسکے تمام اراکین انگریز تھے اور ہندوستانیوں کو صرف مشورہ اور شہادت دینے کی اجازت تھی اس لئے اُسکے خلاف سخت شورش و ہنگامہ برپا ہوا اور اعتدال پسند، انتہا پسند سب نے مل کر اس کا مقاطعہ کیا۔ بائیکاٹ کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ سائمن کمیشن کا تقرر کرکے گویا برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو ان کے اس حق سے محروم کردیا تھا کہ وہ اپنے ملک کے لئے کسی قسم کا آئین مقرر کریں۔ پارلیمنٹ نے مشاورتی کمیٹیاں وغیرہ بنا کر اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور آخر کار گورنمنٹ نے ایک گول میز کانفرنس کے منعقد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن چونکہ انتہا پسند جماعت کے اس مطالبہ کا کہ گول میز کانفرنس ہندوستان کے لئے ڈومنین طرز کی حکومت کا آئین بنانے کے لئے منعقد کی جائے کوئی معقول جواب نہیں دیا گیا اس لئے مجبور ہو کر کانگریس نے آزادی کامل کا اعلان کردیا اور تحریک سول نافرمانی منظور ہوگئی۔ سائمن کمیشن رپورٹ نے صوبوں میں خود مختاری اور مرکزی حکومت میں فیڈریشن کے اصول کو تجویز کیا تھا۔ لیکن اس کے خیال میں فیڈریشن کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نہ تھا۔ جب گول میز کانفرنس کے موقعہ پر شہزادگان معہد نے فیڈریشن میں شامل ہونے کیلئے اپنی غیر متوقع رضامندی کا اظہار کرکے اس مسئلہ کے حل کو سہل کردیا تو فیڈریشن کا مسئلہ بھی گول میز کانفرنس کے پروگرام میں داخل ہوگیا۔ لیکن چونکہ کانگریس ابھی تک گول میز کانفرنس کے بحث و مباحثہ سے بالکل علیحدہ رہی تھی اس لئے حکومت کے نتائج فکر زیادہ اہم نہ ٹھہر سکے اور لارڈ ارون نے گاندھی جی سے مفاہمت کرکے اس بات کی سعی کی کہ کانگریس کی معیت بھی حاصل کرلی جائے۔ چنانچہ دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے لندن پہنچے۔ لیکن وہاں کی سیاسی فضا کا نقشہ بدل چکا تھا۔ پارلیمنٹ کے نئے انتخابات میں، قدامت پسند جماعت کو غلبہ حاصل ہوگیا تھا، جسے گول میز کانفرنس اور مفاہمت کے طریقوں پر زیادہ اعتماد نہ تھا۔ اس لئے ہر چند اہم مسائل پر غور و فکر اور بحث و مباحثہ جاری رکھا گیا، مگر ہندوستانی قوم پرست جماعت کے اس مطالبہ پر کہ برطانوی حکومت اپنی تجاویز اصلاحات کے متعلق پیش کرے کوئی اعتنا نہیں کیا گیا اور اسی وجہ سے نہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا کوئی حل ہوسکا۔ اور نہ تحفظات کے مسئلہ کا تصفیہ ممکن ہوا۔ آخر کار حکومت نے معاملات کو ملتوی کرنے کے لئے ایک طرف کمیٹیوں کا تقرر کردیا تاکہ وہ ہندوستان کا دورہ کرکے رپورٹ مرتب کریں، اور دوسری طرف انتہا پسند جماعت کی سرکوبی پر گورنمنٹ آمادہ ہوگئی کیونکہ حکومت کو یقین تھا کہ

انتہا پسند جماعت کی تعداد محدود ہے اور اس کی قوت کو آسانی کے ساتھ فنا کیا جا سکتا ہے اس لئے آرڈیننس جاری ہوئے کانگریس کی مختلف انجمنیں غیر قانونی قرار دی گئیں اور قومی زندگی میں ایک انتشار اور ہنگامہ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ گورنمنٹ نے ساتھ ہی ساتھ اسی بات کی کوشش کی کہ ایک ایسی جماعت کانگریس کے مقابلہ میں پیدا کرے جو پبلک کے اعتماد کو قائم رکھتے ہوئے گورنمنٹ سے سوالات کر سکے اور اصلاح کے متعلق جو قانون حکومت نافذ کرنا مناسب تصور کرے اُن کو عملی جامہ پہنا سکے۔ یہ دونوں کوششیں یعنی کانگریس کے قلع قمع کرنے کی کوشش اور ایک تعاون کرنے والی آئینی جماعت کے پیدا کرنے کی کوشش ابھی تک جاری ہے۔

سیاسی ماحول کی اس قدر مختصر تاریخ معلوم کرنے کے بعد ضروری ہے کہ مختلف سیاسی جماعتوں کی موجودہ حالت پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ کانگریس والے صاف طور پر کہہ چکے ہیں کہ کوئی آئینی اصلاح قابل قبول نہ ہوگی اگر اس میں کانگریس کو قوم کا نمائندہ سمجھکر اُس کے مطالبات کو نہ سنا گیا اور خود مختاری کامل کے اصول کو نظر انداز کر دیا گیا اور اعتدال پسند جماعت بھی ان اصول کو اتنا ہی اہم سمجھتی ہے لیکن وہ کانگریس کو قوم کا واحد نمائندہ سمجھنے سے انکار کرتی ہے اور صوبہ کی حکومت میں مکمل خود مختاری اور مرکزی حکومت میں ڈومنین طرز کی حکومت چاہتی ہے۔ اس کے مطالبات کانگریس کے مطالبات کے تقریباً برابر ہیں لیکن وہ مفاہمت کے لئے کانگریس سے زیادہ آمادہ ہے۔ مسلمان جماعت کے کچھ نمائندے جداگانہ حلقۂ انتخاب کے حامی ہیں اور بعض مشترک کے، بعض نشستوں کا تحفظ تمام صوبوں میں چاہتے ہیں، ان کی اکثریت ہو یا اقلیت بعض محض اقلیت والے صوبوں میں نشستوں کا تحفظ چاہتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں انکی اکثریت قائم رکھی جائے اور جہاں ان کی اقلیت ہے وہاں ان کی اقلیت کے تحفظ کا انتظام کیا جائے اور مرکزی جماعتوں میں انھیں ایک تہائی نشستیں دی جائیں، سرکاری دفاتر جماعت عاملہ وغیرہ وغیرہ میں اُن کی نمائندگی محفوظ کر دی جائے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کی فرقہ وارانہ جماعتیں، اقلیتوں کو کم سے کم حقوق دینا چاہتی ہیں۔ اور یہ مسئلہ ابھی تک باہمی مشاورت اور بحث و مباحثہ سے طے نہیں ہو سکا ہے۔

اب ۲۷ جون کو سکریٹری آف اسٹیٹ نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان کے تین پہلو ہیں۔ اولاً یہ کہ ہندوستان کے صوبوں کو خود مختاری فوراً دیدیجائیگی لیکن چونکہ فیڈریشن کے قیام میں ابھی اس وجہ سے عرصہ لگے گا کہ فیڈریشن کے اجزا ابھی مکمل طور پر اس میں شریک ہونے کے لئے طیار نہیں ہیں اسی لئے مرکزی حکومت میں فوراً کوئی تبدیلی نہ ہو سکیگی۔ دوم یہ کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لئے گورنمنٹ اپنی تجاویز گرمی کے اختتام تک پیش کر دیگی۔ سوم یہ کہ گول میز کانفرنس کو ختم کر دیا جائیگا اور اس کی جگہ ایک مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کا تقرر کیا جائیگا۔ جس کے ساتھ مشورہ کرنے کے لئے گورنمنٹ جن نمائندوں کو مناسب سمجھے گی نامزد کر دیگی

فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق گورنمنٹ سے تجاویز حاصل کرنے کے معاملہ میں تو تقریباً سب کو اتفاق ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا گورنمنٹ ایسی تجاویز پیش کرنے میں کامیاب بھی ہو سکتی ہے جو اچھوت ذاتوں، مسلمانوں ہندوؤں اور سکھوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے لئے قابل قبول ہوں بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے اس لئے گورنمنٹ کو اس باب میں زیادہ کامیابی کی توقع نہیں رکھنا چاہئے فیڈریشن کے ملتوی کرنے اور صوبوں میں حکومت خود اختیاری فوراً قائم کرنے .... کی مخالفت کے لئے انتہا پسند اور اعتدال پسند یکساں طور پر آمادہ ہیں اور اس بات کا صریح طور پر اعلان کر چکے ہیں کہ ہندوستان کے لئے کوئی اصلاحی قانون قابل قبول نہیں ہو سکتا جس میں مرکزی ذمہ داری، صوبہ جاتی خود مختاری کے پہلو بہ پہلو عطا نہ کی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ صوبہ جاتی خود مختاری مرکزی ذمہ داری کی عدم موجودگی میں محض دہوکہ ہے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کے اس اعلان سے کہ مرکزی ذمہ داری اور فیڈریشن فی الحال ممکن نہیں ہے۔ انتہا پسند اور اعتدال پسند دونوں غیر مطمئن رہیں گے۔ اب رہا سوال طریق عمل کا سو انتہا پسند اور اعتدال پسند کبھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کی حیثیت محض مشورہ اور گواہی دینے والوں کی سی ہو۔ جس طرح سائمن کمیشن کا بائی کاٹ ہوا اور وہ ناکام رہا، اسی طرح یہ صورت بھی ناکام رہیگی۔ کیونکہ ہندوستان کا خود دار طبقہ محض گول میز کانفرنس کے طریقہ ہی پر اشتراک عمل کیلئے طیار ہو سکتا ہے۔

اب سوال کانگریس کے قلع قمع کا رہ جاتا ہے، سکریٹری آف اسٹیٹ نے اسی کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ آرڈیننس برابر جاری رہیں گے اور جب تک کانگریس اس بات کا دعویٰ کرتی رہیگی کہ وہ تمام قوم کی نمائندہ ہے اس وقت تک کوئی مصالحت کانگریس سے نہیں کی جا سکتی۔

اس لئے بہ حالات موجودہ ہمارے نزدیک سکریٹری آف اسٹیٹ کا یہ اعلان ملک میں امن و سکون پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ حکومت نے گول میز کانفرنس کو محو کر کے اس جماعت کو بھی نکتہ چینی کا موقعہ دیدیا ہے جو بڑی حد تک حکومت کے ساتھ اشتراک عمل پر آمادہ تھی

وزیر ہند کے اس اعلان پر جو اعتراضات کئے جا رہے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم ایک تو یہ ہے کہ جب گول میز کانفرنس کی وساطت بغیر یہ سب کچھ کرنا تھا تو پہلے ہی کیوں اس کا قیام کر کے خواہ مخواہ لوگوں کو اس میں شرکت کی زحمت دی گئی اور فضول بہت سا روپیہ ہندوستان کا ضائع کیا گیا اور دوسرے یہ کہ آئندہ اصول نظام کی تعین میں چونکہ ہندوستانیوں کو ملک کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے پوری آزادی کے ساتھ اشتراک عمل کا موقعہ نہیں ملیگا اس لئے ملک کبھی اس کے قبول کرنے کے لئے طیار نہیں۔

نیاز

فریبِ اُمید

قیدی! رنجور، دل شکستہ　　غمگیں، مضطر، ذلیل، خستہ
زنداں کی مصیبتیں اُٹھائے　　بیٹھا تھا غریب سر جھکائے
کتنی بیتاب خامشی تھی　　رگ رگ گویا تڑپ رہی تھی
آئینۂ زرد یاس چہرہ　　آنکھیں سونی، اداس چہرہ
اشکوں کے حجاب میں نگاہیں　　تھم تھم کے لبوں پہ سرد آہیں
ڈوبی ہوئی نبضِ شادمانی　　پیری سے ضعیف تر جوانی
ناخن لانبے، بڑھے ہوئے بال　　بیحس، مغموم، زرد بیحال
ہر سانس تھی، اک فسانۂ غم　　کھوئی ہوئی زندگی کا ماتم!
ہستی اک بد دعا تھی اُسکو　　گیتی دامِ بلا تھی اُسکو
اب اس کیلئے تھی اک کہانی　　پچھلی آزاد زندگانی
بے روح بہار، ابر تاریک　　دنیا مانند قبر تاریک
بے یار و دیار، زار و تنہا　　مدت سے غریب قید میں تھا

آنکھوں میں، مگر بایں الم تھی　　ہلکی سی اُمید کی تجلّی
شاید کوئی راستہ نکل آئے　　زندانِ بلا کا قفل کھل جائے
ہو غیب سے کوئی شکل پیدا　　ممکن ہے کہ رحم کھائے دنیا
شاید نالوں میں کچھ اثر ہو　　اس شامِ ملال کی سحر ہو

یہ آس جلائے جا رہی تھی
بگڑی کو بنائے جا رہی تھی

لیکن کچھ دن کے بعد دیکھا　　پیشِ زنداں ہجوم سا تھا
حدِ غم سے گزر گیا وہ　　پوچھا تو کھلا کہ مر گیا وہ
کل تک کیا کیا نہ جستجو تھی　　دل میں صد رنگ آرزو تھی!
اللہ رے فریب آرزو کا　　کتنا سادہ عجیب گھرا!!

علی اختر (حیدرآباد دکن)

ہوشیار

اک مشن اسکول کی لیڈی بصد انداز و ناز
دختران ہند سے ہے دیکھ سرگرم نیاز

پھر رہی ہے لڑکیوں کی صف میں بل کھاتی ہوئی
ہاتھ میں شانہ لئے زلفوں کو سلجھاتی ہوئی

اس خم گیسو میں ہیں پوشیدہ کتنی گیر و دار
کچھ خبر بھی ہے تجھے ناواقفِ لیل و نہار

اک سیاسی لہر ہے اس کاکلِ شبگیر میں
پیچ ڈالے جا رہے ہیں ہند کی تقدیر میں

قوم کو ڈسنے کی خاطر پے بہ پے بل کھائیں گی
کل انھیں زلفوں میں کالی ناگنیں لہرائیں گی

اسکے شانے سے نہ ہو جائیں کہیں سینے فگار
اس مشن اسکول کی عورت سے یارو ہوشیار

بادِ طوفانی ہوائے سرد بنکر آئی ہے
پیرزن فرہاد کی ہمدرد بنکر آئی ہے

جوشؔ (ملیح آبادی)

کیفیات

ہے تصور میں بھی بہتی آغوش — روح بیتاب، دل اذیت کوش
ہو چکا ختم دورِ جوش و خروش — شعلۂ دل ہے اب تو شمع خموش
اب میسر کہاں وہ لطفِ شباب — وہ طرب وہ نشاطِ دیدہ و گوش
مطربِ عشوہ ساز نغمہ طراز — ساقیِ مہر چہرہ زلف بدوش
پیکرِ حسن —— جانِ رعنائی — عشرتِ روح —— جنت آغوش
اب وہ کیفِ نگاہِ مہر کہاں — وقفِ رنجِ خمار ہیں مے نوش
دل پریشان —— روح افسردہ — کیا قیامت ہے شیونِ خاموش

ہوشیار اے فریب خوردۂ زیست — ہے صدائے نفس نوائے سروش
نقدِ امروز پر نگاہ نہیں — فکرِ فردا ہے اور ماتمِ دوش

کون ہوتا حریفِ برقِ جمال — تھا وہ خود کیفِ حسن سے مدہوش
ایک اشارے میں ایسی مدہوشی — مرحبا اے نگاہِ بادہ فروش
تابِ نظارۂ جمال کسے — کہ تجلی بھی ہے تجلی پوش

شیشۂ دل میں ہے مئے کوثر
کوکبِ تشنہ لب بنوش بنوش

کوکب (شاہجہاں پوری)

پرچم

اڑ رہا ہے یہ فضا میں کون لہراتا ہوا
تو بہ تو نغمے عروج قوم کے گاتا ہوا
اپنے قد برتر د بالا سے شرماتا ہوا
اور جھونکے نوجوانوں کی طرح کھاتا ہوا

عظمتِ اقوام اے رنگین نشانِ حریت
اے بیانِ حریت ای ترجمانِ حریت
آیۂ رحمت ہے تو مے خانۂ اقوام میں
صبح میں تیری تجلی نور تیرا شام میں

اوج ہستی تیرے دم سے تجھ سے معراج حیات
تجھ میں لہریں لے رہی ہے حریت کی کائنات
ہندیوں کی عظمتِ احساس کے آئینہ دار
یعنی غیرت مندیوں کی غیر فانی یادگار

تیرے رنگوں میں اصول زندگی کا راز ہے
زندگی کا راز ہے تابندگی کا راز ہے
تیری جنبش سے ہے لرزش گردشِ ایام میں
انقلاب ہند پوشیدہ ہے تیرے نام میں

رات دن ہے ہمت تحریک بیداری تجھے
دیجیے تابی ہے قوموں کی نگوں ساری تجھے

اے مری روحِ وطن جانِ وطن شانِ وطن
تیری ہر اک موج سے راسخ ہے ایمانِ وطن
تو وہ روحانیتِ محسوس ہے اقوام کی
جس کو سجدے کر رہی ہے زندگی میں بیخودی

وہ جو اک گنبد ہے جنت میں طلائی رنگ کا
جس سے اک نکلا ہے چشمہ نقرئی آہنگ کا
اُسکی اوج نور پر پروردہ یہ لہراتا ہے تو
کیف میں اسکے کلس کو جوم جوم آتا ہے تو

رفعتِ طوبیٰ ازل ہی سے ودیعت ہے تجھے
بے تکلف عرش بوسی کی اجازت ہے تجھے
عرش کے پردوں کو بھی اکثر اٹھا آتا ہے تو
لامکاں کی سرحدِ آخر سے ٹکراتا ہے تو

عرش و کرسی تیری موج ہست کا گہوارہ ہیں
بوسہ دینے کے لئے قدسی بہت آوارہ ہیں
تیری قدموں میں ہے زنجیر غلامی پاش پاش
ظلم کے دل میں تری منظر سے ہے گہری خراش

مستقل آواز ہے تو اک مکمل احتجاج
ظلم سے تو ہی طلب کرتا ہے نیکی کا خراج

تیری بنیادیں وطن میں اب ہلا سکتا ہے کون؟
تجھکو اوج کامیابی سے گرا سکتا ہے کون؟

خیمہ زن ہے دیر سے اہل وطن کے دل میں تو
جلوہ گر ہے آج شیخ و برہمن کے دل میں تو
اے کہ تو ہے ضامن آزادیٔ ہندوستاں
اے کہ تو ہے باعثِ آبادیٔ ہندوستان

اے نشانِ زندگی اے گلہ بانِ زندگی — ناقۂ ہند وستاں کی ساربانِ زندگی

خونِ شہیدوں کا ہے تجھ میں رنگ افروزِ حیات — تجھ میں پوشیدہ ہے اک سازِ وفا سوزِ حیات

تیرے پیچھے خاک و درخوں تک میں لٹا جائینگے ہم — تیری عزت کیلئے میدان میں کٹ جائینگے ہم

اپنی لاشوں پر تجھے قائم کریں گے ایکبار — تیرے دامن کو بنا دینگے فضائے لالہ زار

"نغمۂ غم" کے علاوہ نغمۂ شادی بھی ہو — سایہ میں تیرے کبھی اعلان آزادی بھی ہو

نغمۂ قومی ہو اور سرور اقوامِ وطن — بادۂ تازہ سے ہو لبریز ہر جامِ وطن

ثبت ہو جائے دلِ عالم پہ تیری برتری — خوف سے لرزہ میں آجائے شکوہِ سروری

اعترافِ سربلندی میں سر اپنے خم کریں

جی میں آتا ہے کہ تجھکو سجدۂ پیہم کریں

ساغر (نظامی)

عشق کا دیوتا

ذہنِ فطرت میں یہ خیال آیا — غیر فانی کوئی وجود بنائے

زیست میں جس سے شان پیدا ہو — موت جسکے جلال سے تھرائے

دامنِ صبح میں سے بہت سے نجوم — گرمیٔ آفتاب سے پگھلائے

نورِ مہتاب کی جبیں سے لیا — شام کی سرخیوں سے رنگ چرائے

توڑ کر آفتاب کی کرنیں — سیکڑوں محتشم حجاب بنائے

اور ان میں کمالِ حکمت سے — بے بہا سرمدی جمال بسائے

آخر اس باثبات پیکر میں — دوش پر نکہتوں کا بار اُٹھائے

ہلکا ہلکا سا سانس جاری ہوا — جس کی گرمی سے موت کملا جائے

عشق کا دیوتا تھا نام اس کا — دیکھکر جس کو روح گرما جائے

رزمِ ہستی میں اس طرح آیا — ہاتھ میں زندگی کی تیغ اٹھائے

چشمِ میگوں میں خون اترا ہوا — ہر قدم پر نگاہ بپھری جائے

وجد میں آکے زندگی جو ہنسی

موت کے دل پہ گر گئی بجلی

باقی صدیقی (سہام)

غزلیات :-

عابد شاہجہانپوری

دلِ گم گشتۂ منزل نہیں منزل سے بیگانہ
میں حاصل آشنا تھا جب ہوا حاصل سے بیگانہ

تجلی کا یہ عالم ہے کہ نظریں تک نہیں اٹھتیں
دلِ ناکام تھا اس پردۂ حائل سے بیگانہ

میں ڈرتا ہوں کہ احساسِ تمنا بھی نہ مٹ جائے
رہیگا کوئی کب تک سرگذشتِ دل سے بیگانہ

دلِ مضطر اٹھا جاتا ہے یہ احساس بھی اب تو
کہ منزل آشنا نظریں ہیں یا منزل سے بیگانہ

لئے ہے ذرہ ذرہ عالمِ ہنگامۂ محشر
مگر وہ چشمِ بے پروا ہے خاکِ دل سے بیگانہ

کھنچی ہے شکل نظروں میں مآلِ سعیِ پیہم کی
سرِ منزل دلِ وارفتہ ہے منزل سے بیگانہ

نگاہیں آشنائے جادۂ منزل ہوئیں شاید
کہ اب ہر گام پر میں ہوں سکونِ دل سے بیگانہ

نگاہِ شوق میں عابد رہا احساس جلووں کا
کہ بیگانہ بھی ہو کر میں نہ تھا منزل سے بیگانہ

کوکب شاہجہانپوری

اے سراپا ناز اے ناز آفریں اے محوِ ناز
نقشِ حسرت ہے دلِ وارفتۂ جوشِ نیاز

اب تو عرضِ حال سے بھی ہو گئے ہم بے نیاز
ہر سرشکِ غم ہے اک افسانۂ سوز و گداز

سلب کر لی طاقتِ دیدار فرطِ شوق نے
قسمتِ اہلِ نظر ہے جلوۂ حیرت طراز

رفتہ رفتہ درد خود بن جائے گا اپنی دوا
چھوڑ دے بیمار کو بیمار پر اے چارہ ساز

کہہ رہا ہوں وارداتِ دل زبانِ حال سے
ہے کوئی رمز آشنائے خلوتِ راز و نیاز

ہوش میں تھا کون اے کوکب محیطِ بزم تھی
شوخیِ رنگِ تبسم مستیِ صہبائے ناز

ناطق گلاوٹھوی

راہ گم کردہ وجودِ تفرقہ پرداز سے
ہم ہیں محوِ جستجو کھوئے ہوئے ہمراز کے

ہچکیوں پر ہو رہا ہے زندگی کا راگ ختم
جھٹکے دیکر تار توڑے جا رہے ہیں ساز کے

نالۂ پیہم ہے اندازِ سکوتِ اہلِ درد
ہیں کہاں پہچاننے والے مری آواز کے

لے گیا کوئی بہارِ زندگی کو لوٹ کر
اب نہ وہ ہم ہیں نہ وہ چرچے نیاز و ناز کے

لے چلے ہیں لوگ ناطق ہم کو بزمِ ساز میں
واسطے دیکر ہماری خاطرِ ناساز کے

معلومات

ماورائے مریخ تک

حال ہی میں، ایک ایسی نلکی ایجاد ہوئی ہے جس سے ایک ریڈیو شعاع لاکھوں میل تک پہنچائی جاسکیگی یہ شعاع کرۂ مریخ سے بھی گذر جائے گی جو زمین سے ۳ کروڑ پچاس لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

یہ شعاع تمام گذشتہ شعاعوں سے بیس گنا زیادہ طاقتور ہے اور وہ آلہ جس کے ذریعہ سے یہ شعاع منتقل کی جائے گی اپنی ساخت کے لحاظ سے بہت سادہ و مختصر ہے۔ یعنی اس کی لمبائی ۱۳ انچ سے بھی کم ہے اور ہر شخص نہایت آسانی کے ساتھ اس سے کام لے سکتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس کی تکمیل کے بعد تمام وہ فائدے جو اس وقت کرۂ زمین پر ریڈیو کے ذریعہ سے حاصل کئے جاتے ہیں وسیع فضا کے اور دوسرے کروں سے بھی حاصل ہوسکیں گے۔ یعنی اگر آج ہم ایک شخص کی آواز اور تصویر ہندوستان سے لندن تک چند لمحوں کے اندر منتقل کرسکتے ہیں تو کل اس جدید آلہ کی وساطت سے ہم دوسرے کروں کے باشندوں تک بھی اپنا پیام اور کرہ زمین کے مناظر کی تصاویر پہنچا کر وہاں کی آواز اور تصویر حاصل کرسکیں گے۔

ہرچند ابھی تک یہ اُمید خیال آرائی کی حد سے آگے نہیں بڑھی لیکن چونکہ یہ دور "شعاعوں کا دور" کہلاتا ہے اور ہنوز ترقی کے وہ تمام امکانات جو شعاعوں سے وابستہ ہیں ابھی تک عملی طور سے بروئے کار نہیں آسکے ہیں۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس جدید آلہ کے مستقبل کے ساتھ انسان کے کتنے غیر معلوم انکشافات وابستہ ہیں۔

لکھنو میں رباعیات خیام کا ایک بے بہا نسخہ

حال کی "ایشیاٹک سوسائٹی بنگال" کے ایک جلسہ میں پروفیسر محفوظ الحق نے بیان کیا کہ رباعیات خیام کا قدیم ترین نسخہ اس وقت لکھنو میں ہے اور جس کی طرف اس وقت تک کسی کو توجہ نہیں ہوئی۔ یہ نسخہ اتفاق سے مسٹر گوری پرشاد سکسینہ (لکھنو) کی نگاہ سے گذرا جو قدیم مخطوطات کے فراہم کرنے کے بڑے شائق ہیں اور انھوں نے اس نسخہ کو حاصل کرلیا

اس لئے اس وقت ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ خیام کے دو نہایت ہی قدیم بے بہا نسخوں کا مالک ہے۔ گذشتہ ایک صدی کے اندر، اکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری (Boldein Library) کا مشہور نسخہ جو آؤسلے (Ouseley) کے نام سے موسوم ہے اور جس پر ۱۴۶۰ء کی تاریخ درج ہے۔ دنیا کا قدیم ترین نسخہ خیال کیا جاتا تھا اور تمام دنیا کے علما ان رباعیوں کے متعلق جو خیام سے منسوب کی جاتی تھیں اسی کو دیکھا کرتے تھے۔ لیکن اس جدید نسخہ کی دریافت سے جس پر ۱۴۲۳ء کی تاریخ درج ہے اور اس لحاظ سے وہ بوڈلین نسخہ کے مقابلہ میں چالیس سال زیادہ قدیم ہے تمام دنیا کی توجہ ہندوستان کی طرف مبذول ہو جائے گی اور عمر خیام کے شائقین اس کی اشاعت کا نہایت دلچسپی سے انتظار کریں گے۔ پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے معلوم کیا ہے کہ کل ۲۰۶ رباعیات میں ۵۵ ایسی رباعیات ہیں جو موجودہ تمام دیگر نسخوں اور ایڈیشنوں میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۵۰ سے زیادہ بالکل نئی رباعیات دنیا کے سامنے آگئی ہیں۔ ہرچند ان تمام رباعیوں کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب خیام کی ہی ہیں لیکن اس بات کے تسلیم کرنے کے لئے کافی وجوہ ہیں کہ ان میں سے کچھ رباعیاں ضرور خیام ہی نے تصنیف کی ہیں اس لئے اکتشاف سے جو تحقیق و کاوش علمی کے لئے ایک وسیع میدان پیدا ہو گیا ہے اُس سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سمندر کے نیچے سے گھنٹوں کی آواز

جزائر ویسٹ انڈیز کے قریب سے گذرنے والے بحری مسافروں کو 'پراسرار گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ آوازیں سمندر کی گہرائیوں میں سے پیدا ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مقامی آدمیوں کو انھیں سنکر کوئی حیرت نہیں ہوتی کیونکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ یہ بندرگاہ رایل کے گرجے کی گھنٹیاں ہیں جو اُن بد اطوار آدمیوں کی روحوں کے لئے بجتی رہتی ہیں جو یہاں ڈوب کر مر چکے ہیں۔

ایک زمانہ میں بندرگاہ رایل کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ امریکہ کے سخت ترین پُرمعصیت شہروں میں سے ہے۔ وہاں کے زاہد اور پاکباز لوگوں کا عقیدہ ہے کہ دوسو چالیس سال قبل یہ شہر خدا کے حکم سے سمندر میں غرق ہو گیا کیونکہ یہاں جرم و معصیت انتہا کو پہنچ چکی تھیں اور سمندر کے رہزن و قزاق یہاں لوٹ کا مال لاتے تھے اور اسے بے دردی سے اُن عورتوں کے ساتھ تعیشات اور رنگ رلیوں میں صرف کرتے تھے جو اُنھیں کی طرح بے شرم اور گناہ گار تھیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس غرق شدہ شہر کی بہت سی عمارتیں ابھی تک جوں کی توں پانی کے نیچے قائم ہیں

اور پُرانے گرجا کی کھڑکیوں اور دروازوں سے جب مچھلیاں گذرتی ہیں تو گھنٹہ جنبش میں آجاتا ہے اور اس سے آواز پیدا ہونے لگتی ہے۔

اس غرق شدہ شہر کے مکانوں کی چھتیں جب سمندر پر سکون ہوتا ہے، اب بھی نظر آتی رہتی ہیں۔

مصنوعی دل

ایک برطانوی ماہر سائنس نے ایک مصنوعی دل بنایا ہے جو جانوروں میں دوران خون کو اس وقت بھی جاری رکھتا ہے جب کہ ان کا دل ان کے جسم سے علٰحدہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ دل پیتل کا بنا ہوا ہے۔ اور گبس ([illegible]) اس کا موجد ہے۔ بیہوش کرنے والی دواؤں کے زیر اثر اصلی دل نکال لینے کے بعد کتّے بلیاں، خرگوش اور دوسرے بڑے جانور اس مصنوعی دل کی مدد سے کئی گھنٹہ تک زندہ رہتے ہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ اطبار اور طلبہ جانور کے جسم میں جو دوران خون ہوتا ہے اُسے طبعی حالت میں دیکھ سکتے ہیں اور نیز ان دواؤں اور رنگوں کے اثرات کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو خون میں بیرونی ذرائع سے داخل کئے جاتے ہیں۔ اگر اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگئی تو غالباً انسان پر بھی اس کا تجربہ کیا جائیگا۔ اور اس کا نتیجہ کوئی مفید نکلے لیکن ڈاکٹروں کے ہاتھ ایک مشغلہ اچھا ہاتھ آجائیگا۔ اور شعرا کا دعوائے بے دلی خطرہ میں پڑ جائیگا۔

آگ لگنے سے محفوظ رکھنے والا کاغذ

جرمنی میں ایک نئی شے دریافت ہوئی ہے جو چھت بنانے اور دیواروں پر لپیٹے جانے کے لئے خصوصیت کیساتھ موزوں ہے وہاں کے مکانات کی تعمیر میں اس کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے اور ڈاکٹر ڈی۔ آئی گین گرو ٹن نے اس کے متعلق جو تجربات کئے ہیں اُن سے نتائج تشفی بخش پیدا ہوئے ہیں اس کے استعمال سے مکان آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا دانہ دار کھردرا کاغذ ہوتا ہے اور جب آگ اس کے قریب آتی ہے تو بجھ جاتی ہے اور اس میں سے دھواں اور گیسیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں جو شعلوں کو بالکل دبا دیتی ہیں۔

"تھرماس" کے طرز کی عمارت

حال میں، امریکہ میں ایک معمل "تھرماس" کے اصول پر طیار کیا گیا ہے اس کے اندر نہ باہر کی گرمی آسکتی ہے نہ اندر کی گرمی باہر جا سکتی ہے، ایسے تجربات یہاں آسانی کے ساتھ کئے جا سکتے ہیں جن کے لئے ایک خاص درجہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں کوئی کھڑکی نہیں ہے باہر کی جانب ہر طرف کارک کا موٹا خول چڑھایا گیا ہے اور پھر ایک تہ اینٹوں کی دی گئی ہے اگر کمرے کے اندرونی حصہ کو ایک مرتبہ ۷۰ ڈگری تک گرم کر دیا جائے اور بعد کو بالکل گرم نہ کیا جائے تو بھی سخت ترین سردی میں ایک ماہ کی مدت میں اس کی حرارت صرف ایک ڈگری کم ہوگی۔ معمل کا مقصد یہ ہے کہ دریافت کیا جائے کہ مختلف درجہ ہائے حرارت پر دقائق سے کس قسم کی روشنیاں نکلتی ہیں۔

جگرؔ[لہ] و رفیق فتحپوری

جگرؔ۔ اللہ اللہ رے وارفتگیِ عشق مری   اس جگہ ہوں کہ جہاں حسن بھی دیوانہ ہے

اعتراض ۔ شعر کا دوسرا مصرعہ بے ربط ہے۔ کیونکہ عشق کی وارفتگی اور حسن کی دیوانگی سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ دوسرے حسن کا دیوانہ ہونا بھی عجیب معمہ ہے۔ اگر حضرت جگرؔ کا یہ مطلب ہے کہ وارفتگیِ عشق سے کچھ تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ جس جگہ میں ہوں وہاں حسن بھی دیوانہ ہے۔ تو یہ مطلب سوائے حضرت جگرؔ کے دوسرے کی سمجھ میں نہیں آسکتا اگر جناب جگرؔ نے شعر میں یہ خیال نظم فرمایا ہے کہ اللہ اللہ رے وارفتگیِ عشق کہ جہاں جاتا ہوں حسن بھی

لہ جگرؔ صاحب کا نام علی سکندر ہے۔ مراد آباد کے رہنے والے ہیں۔ مگر عرصہ ہوا ترک وطن کر چکے۔ اب شائد بھول ہی کر کبھی وہاں جاتے ہوں۔ سنا ہے کہ پہلے اثنا عشری تھے اب مذہب اہل تسنن اختیار کر لیا ہے۔ نہایت آزاد مزاج اور سیدھے سادے آدمی ہیں۔ آپ کے کلام میں ایک کیف وجدانی ہے۔ جس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ازلی ذوق رکھتے ہیں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ راقم سے نیم کرم سے ملاقات ہے اور بے تکلفانہ ملاقات ہے۔ آپ حضرت داغ کے شاگرد ہیں۔ مشاعروں میں نہایت عمدہ طریقہ سے پڑھتے ہیں اور اسی اثر سے ہر مشاعرہ میں قریب قریب اپنی غزل کو کامیاب بنا لیتے ہیں۔ الفاظ میں جدت ضرور ہے۔ مگر ایک لفظی دائرہ ہے جس سے غالباً کوئی شعر باہر نہیں ہوتا پھر بھی قبول خاطر و لطف سخن خداداد ست والا مضمون ہے۔ اب آپ ملک کے مشہور شعراء میں سے ہیں۔ داغ جگرؔ آپ کا ایک مختصر دیوان طبع ہو چکا ہے جس پر مرزا احسان احمد بی اے۔ ایل ایل بی نے ایک مقدمہ لکھا ہے۔ میں نے بھی ایک مرتبہ یہ دیوان دیکھا تھا۔ اس میں لکھنؤ کے بعض مشاہیر مثلاً عزیز و صفی وغیرہم سے شاید جگرؔ کے کلام کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ تو ضرور ہے کہ جگرؔ کا رنگ بہت بہتر ہے۔ مگر پھر بھی اس کلیہ سے انکار کرنا دشوار ہے کہ ہر گلے را رنگ دیگر بوئے ہست اس میں مرزا صاحب نے انہیں فصیح الملک داغ مرحوم سے بھی آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر داغ نے جو زمانہ پایا تھا اُس کے لحاظ سے اُن کا رنگ بہت ہی بہتر تھا۔ اب زمانہ بدل گیا۔ خیالات میں ایک تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اگر داغ ہوتے تو شاید ان کے خیالات بھی بدل جاتے اور وہ بھی اسیطرف جلتے جدھر سب جا رہے ہیں۔ اسی سے متاثر ہو کر جناب رفیق فتحپوری نے ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ آئینہ ماہ جولائی سنہ ۲۳ء میں چھپا تھا۔ میں جناب رفیق سے واقف نہیں نہ ان کے حالات پیش نظر ہیں۔ لہذا صرف اعتراضات پر اکتفا کرتا ہوں۔ وہ باتیں بھی چھوڑے دیتا ہوں جو جناب رفیق کے لئے موجودہ تنقید و تنقیص نگاروں کی حیثیت سے ضروری ہیں گو میرے نزدیک غیر ضروری ہیں۔ بہرحال اعتراضات و کلام جگرؔ ملاحظہ ہو۔

دیوانہ ہوجاتا ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ اگر عاشق کی وارفتگی بقول جگر حسن کی دیوانہ کرنے والی ہوتی تو جتنے حسین ہیں سب کا حسن دیوانہ ہوکر کسی صحرائے لق ودق میں خاک اڑاتا اور کوئی حسین اپنے حواس میں نظر نہ آتا۔ اس شعر میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حسن ذی روح نہیں ہے۔ اور نہ حسن جسم رکھتا ہے۔ دیوانہ ہونے کے لئے جسم وجان کی ضرورت ہے۔ ہاں اگر مرزا صاحب روشنی شمع یا نور سحر وغیرہ اپنی منطقی دلیل سے ثابت کردیں تو بیشک میرے قائل ہوجانے میں کسی طرح کا شک وشبہ نہ ہوگا۔

(مولف) شعر اپنے ظاہری معنے میں صاف ہے۔ کہ میرے عشق کی وارفتگی مجھے وہاں لے پہنچی ہے جہاں خود حسن بھی دیوانہ ہے۔ رفیق صاحب کا یہ فرمانا کہ حسن کا دیوانہ ہونا بھی عجیب معمہ ہے۔ بے معنی بات ہے یہ سب مفروضہ باتیں ہیں۔ ورنہ نہ اصل میں عشق دیوانہ ہے نہ حسن۔ عشق ایک مرض ہے جو مریض کی نظر میں معشوق کو حسین کرکے دکھا دیتا ہے۔ اور اس کے اثرات اس کے دماغ میں گونج جاتے ہیں۔ ہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر حسن بھی دیوانہ ہے تو پھر عشق کا وجود کیوں باقی ہے۔ کیونکہ عشق ہمیشہ حسن کے کمال اور شائستگی سے پیدا ہوتا ہے جب حسن میں ایک نقصان موجود ہے تو پھر عشق کا وجود وہاں کیوں ہے۔ یا حسن نے جب عشق کی صفت قبول کرلی ہے تو اس کو حسن کے نام سے کیوں موسوم کیا جاتا ہے۔ نہ حضرت رفیق کا یہ فرمانا مصنف کے قول کی رہبری کرتا ہے کہ وارفتگی عشق سے تعجب نہ ہونا چاہیے۔ کہ جس جگہ میں ہوں وہاں حسن بھی دیوانہ ہے۔ اس واسطے کہ اللہ اللہ ہمیشہ محل تعجب میں استعمال ہوتا ہے نہ سلب تعجب پر۔ یا جہاں جاتا ہوں حسن بھی دیوانہ ہوجاتا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ اسی طرح دوسرے سوالات بھی بے معنی ہیں مگر صرف دو باتیں ذرا غور طلب ہیں کہ حسن دیوانہ ہے تو پھر عشق کیوں ہے اور اس کو عشق ہی کیوں نہ سمجھا جائے۔ دوسرے یہ کہ حسن کی دیوانگی کا سبب کیا ہے رہا یہ کہ عشق کو یا حسن کو شخص کیوں کیا گیا کیونکہ دیوانگی وجود کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کا جواب وہی ہے کہ یہ مفروضات ہیں۔ اور ایسے ایسے ہزاروں شعر ملیں گے مولانا روم فرماتے ہیں۔

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علت ہائے ما

لکھنے والا اگر یہ کہے کہ عشق کوئی مجسم چیز نہیں ہے اس کے عقل نہیں دماغ نہیں تو وہ طبیب کیونکر ہوا اس حالت میں معترض کی کوتاہی عقل تسلیم کی جائے گی۔ پھر بھی یہ شعر بالکل الجھا ہوا اور قریب قریب بے معنی ہے۔ اس کے الفاظ اور حسن بندش جس قدر چاہیں دھوکہ دے لیں باقی ہمہ ہیچ

جگر۔ منزل عشق میں اللہ رے یہ عالم شوق   ہر قدم پر مرا انداز جداگانہ ہو

اعتراض - جناب جگر جو یہ فرماتے ہیں کہ منزل عشق میں اللہ رے شوق کا عالم کہ ہر قدم پر انداز جداگانہ ہے کیا معنی رکھتا ہے - اگر منزل عشق میں کسی کی حسرت دیدار میں شوق کا یہ عالم ہے کہ ہر قدم پر انداز جداگانہ ہو رہا ہے تو شعر المعنی فی بطن الشاعر کا مصداق ہوا جاتا ہے اور اگر منزل عشق میں حضرت جگر کا یہ عالم شوق شراب دو آتشہ کے حوض میں غوطے لگا رہا ہے جس کے سبب سے ہر قدم پر انداز جداگانہ ہو گیا ہے تو دوسری بات ہے۔

(مولف) حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض معترض کی عدم معلومات پر مبنی ہے - اصل میں وہ اس مصرع کی تشریح چاہتے ہیں کہ ہر قدم پر مرا انداز جداگانہ ہے - حالانکہ اس کو اگر اجمال وکنایہ کے طریق پر سمجھا جائے تو بہت ہی بہتر ہو گا - اس سے جو تنوع معنی پیدا ہوتا ہے وہ شعر کی خوبی پر دال ہے - دنیا خاقانی کے اس شعر کو محض اسی وجہ سے پسند کرتی ہے کہ اس میں ایک اجمال ہے -

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت　　　خاقانی را دگر شب آمد

اب خیال فرمائے کہ " خاقانی را دگر شب آمد" کے کتنے معنے پیدا ہوتے ہیں - اگر خاقانی یہ کہتا کہ خاقانی کا نالہ سنکر ہمسائے نے کہا کہ اس غریب کو روتے روتے دوسری رات آگئی - تو وہ ہرگز اتنے لطیف نہ ہوتے جس قدر کہ ابر اجمال سے ہو گئے - اور جس قدر اس سے مختلف معنی پیدا ہو گئے -

غالب کا یہ شعر ؎　ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات ایک مجمل فقرہ ہے جس سے بیسوں معنی پیدا ہوتے ہیں اگر وہ کہدیتے کہ میں اپنے معشوق کے خوف سے چپ ہوں تو ہرگز لطف باقی نہ رہتا۔

جگر - ہر سو دکھائی دیتے ہیں وہ جلوہ گر مجھے　　　کیا کیا فریب دیتی ہے میری نظر مجھے

اعتراض - حضرت جگر کا یہ مطلع کسی قدر ضرور بہتر ہوتا - لیکن چند عیوب کی وجہ سے بندش کی خوبی بھی چھپ گئی - اگر یقین نہ ہو تو مرزا صاحب (احسان احمد) خود مطلع کی نثر کر کے ملاحظہ فرمالیں میرے خیال میں یہی نثر ہو سکتی ہے - کہ وہ مجھے ہر سو جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں، میری نظر مجھے کیا کیا فریب دیتی ہے - اب اس شعر کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دونوں مصرعوں میں مجھے مجھے کا نظم کرنا کس قدر ناموزوں ہے جناب جگر نے مطلع بنانے کی غرض سے دونوں مصرعوں میں مجھے نظم کیا ہے - حالانکہ مجھے کی بے ضرورت تکرار نے فصاحت کی خوبی کا خون کر ڈالا - اگر اسی مضمون کو بجائے مطلع کے شعر میں نظم کیا جاتا تو بیشک شعر سطحی نظر سے دیکھنے میں کچھ اچھا نظر آتا - مطلع کے مصرع ثانی میں "کیا کیا" نے اور بھی معنے پست کر دیئے - در اصل جناب جگر نے یہ مضمون نظم کرنا چاہا تھا کہ میری نظر مجھے کیا فریب دے رہی ہے کہ وہ مجھے چاروں طرف نظر آرہے ہیں - کیا کیا اس موقع

ہلانا چاہئے تھا۔ جبکہ مطلع میں یہ مضمون ہوتا کہ کبھی وہ بے نقاب سامنے آجاتے ہیں۔ اور کبھی پردہ شب تار میں پوشیدہ ہوکر دھوکے سے بھی وہم وگمان میں نہیں آتے۔ اگر اس خیال کے ساتھ "کیا کیا" کے الفاظ مطلع کے اندر بند ش میں لائے جاتے تو البتہ کسی کو اعتراض کا موقع نہ ہاتھ آتا یعنی ایک کیا کا اشارہ بے نقاب سامنے آجانے کی طرف ہوتا اور دوسرے کیا کی عنان پردہ شب تار میں پوشیدہ ہوجانے کی طرف آسانی سے مڑ جاتی۔ بلکہ اگر حضرت جگر اس مطلع کا مصرع اولیٰ تبدیل کرنے کے بعد مصرع ثانی میں بجائے مکرر کیا کے یوں تحریر فرماتے ؎

اف کیا فریب دیتی ہے میری نظر مجھے

تو سوائے ایک مجھے کی ردیف زاید ہونے کے کوئی عیب نہ رہتا۔ اب مرزا صاحب انصاف کی نگاہوں سے ملاحظہ فرمائیں کہ کیا کی جگہ اُف کا لفظ بڑھا دینے سے کیا حسن پیدا ہوگیا۔ ابھی حضرت جگر کو کسی کامل فن سے برسوں اصلاح لینے کی ضرورت ہے

(مولف) اس اعتراض کو دو حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ردیف مجھے میں ایک ردیف بیکار رہے۔ دوسرے کیا کیا بیکار ہے۔ میرے نزدیک یہ غلط ہے اس واسطے کہ نظم کی غلطی نکالنے کا معترض نے یہ اصول قائم کیا ہے کہ نثر کرکے دیکھی جائے اگر لفظ کی ضرورت ثابت ہو تو وہ شعر میں درست ہے ورنہ زاید ہے۔ اسی اصول کی بنا پر معترض نے نثر کی اور اتنی سی عبارت میں دو جگہ نثر کی۔ مگر لطف یہ کہ دونوں جگہ دو دو مرتبہ مجھے لائے اور اسکے بغیر کام نہیں چلا۔ لہذا اسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ معترض کا خیال غلط ہے۔ رہا کیا کی تکرار وہ بھی مخل فصاحت نہیں۔ داغ کہتے ہیں ؎

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
انکی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

ایک نہایت مشہور شعر ہے

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو:—

کونسی کی نہ دوا کونسی مانگی نہ دعا
ہم نے کیا کیا نہ کیا اپنے سنبھلنے کے لئے

حاکم[1] لاہوری وخان آرزو

---

[1] حاکم تخلص اور حکیم بیگ خاں نام تھا۔ لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد شادماں خاں توم اورنگ کے نہایت مشہور معروف آدمیوں میں سے تھے۔ ان کی دادی قاضی میر یوسف کی صاحبزادی تھیں جو ہرات کے سادات میں سے تھے اور بلخ میں عہدہ قضا پر مامور تھے۔ شادماں خاں عالمگیر کے زمانہ میں ولایت سے آئے اور نہایت (ملاحظہ ہو فٹ نوٹ بقیہ صفحہ ۸۵ پر)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸۴) عزت و احترام کی زندگی بسر کرتے رہے یہاں تک کہ عہد محمد فرخ سیر میں منصب سہ ہزاری پر اور بعدہ منصب پنجہزاری و نوبت و علم و نقارہ سے سرفراز ہوئے اور لاہور میں رہنے لگے چنانچہ حکیم بیگ خاں یہیں پیدا ہوئے۔ اور یہیں منصب جلیلہ پر ممتاز ہو کر خطاب خانی پایا۔ آخر عمر میں دنیا کے سب جھگڑے چھوڑ کر فقیر ہو گئے دلی۔ کشمیر کی سیر کی اور نواب آصف کی معیت میں ۱۱۶۴ھ میں حیدرآباد گئے۔ یہیں سے دونوں بندر سورت کی طرف بارادہ حج روانہ ہوئے مگر واقف بیمار ہو گئے اس واسطے جا نہ سکے اور حاکم سمندر کا سفر کر کے حرمین شریفین پہونچے حج کرنے کے بعد ۱۱۶۵ھ میں واپس آئے اور اورنگ آباد پہونچے اور چند روز قیام کیا یہیں شعرا کا ایک تذکرہ لکھا۔ جو اب نایاب ہے اس میں وہ لوگ تھے جن کو مصنف نے دیکھا تھا۔ تحفۃ المجالس اس کا نام تھا۔ مگر مولانا غلام علی نے ایک بہترین نام تجویز کیا تھا۔ اس وجہ سے اصلی نام چھوڑ کر حسب الارشاد آزاد "مردم دیدہ" اس کا نام رکھا گیا تھا۔ تذکرہ تمام کرنے کے بعد حیدرآباد سیر و سیاحت کے لئے گئے تھے اور اس کے بعد پھر اورنگ آباد آئے۔ اور چند سے قیام کر کے انیسویں صفر ۱۱۶۵ھ وطن کے ارادے سے چل دئے۔ چونکہ مالوہ اور برہانپور کا راستہ خطرے سے خالی نہ تھا اس خیال سے برار اور چیتر پور کا راستہ اختیار کیا۔ مگر اتفاق کا کیا علاج ہے۔ جو صورت اس راستہ سے خطرہ کی صورت میں تھی اور ہر واقعہ کی صورت میں پیش آگئی۔ ڈاکوؤں اور لٹیروں نے تمام مال و متاع اور اسباب ضروری چھین لیا۔ اور یہ دونوں یونہی رہ گئے۔ اتنا غنیمت تھا کہ دونوں پر قاتلانہ حملہ نہیں ہوا اور جان کا نقصان نہیں ہوا۔ ان دونوں نے مولانا غلام علی آزاد کو خط لکھ کر کچھ منگایا اور چل دئے۔ مگر چونکہ دور دراز کا راستہ تھا۔ اس لئے روپیہ کافی نہ ہوا۔ سبب یہ دونوں کولاپور پہونچے تو یہاں سے پھر ایک قاصد پہونچا۔ مولوی غلام علی آزاد نے پھر کچھ روپیہ بھیجا آخر کار دوسری شوال ۱۱۶۵ھ کو یہ لوگ اپنے وطن کے قریب پہونچ گئے۔

حاکم نے جب اپنا دیوان مرتب کر لیا۔ تو سراج الدین علی خان آرزو کے پاس لے گئے اور کہا کہ آپ ایک مرتبہ اس پر نظر ڈال لیجئے اور جو کچھ فروگزاشت ہو اس کو پورا کر دیجئے۔ خان آرزو نے پہلے تو بہت انکار کیا آخر جب حاکم نے بہت اصرار کیا۔ تو انہوں نے دیوان رکھ لیا۔ اور دو مہینے کے بعد نظر ثانی کر کے واپس کر دیا۔ سرمیان میں جو جو اعتراضات اور باتیں سمجھ میں آئیں وہ سب حواشی پر لکھتے گئے۔ حاکم نے دیوان لے کر رکھ لیا۔ مدت کے بعد جب دہلی سے یہ لاہور گئے تو ان کے دوست وارستہ سیالکوٹی ان سے ملنے کے لئے پہونچے جب یہ تو دیکھنے کے لئے حاکم کا دیوان مانگا۔ انھوں نے دیوان دیدیا۔ اب جو وارستہ دیکھتے ہیں تو ہر جگہ اعتراضات اور ایرادات کا بے پایاں انبار لگا ہوا تھا۔ کچھ اعتراض ایسے تھے جو حاکم کی نظر میں غلط تھے۔ کچھ اعتراضات واقعی تھے۔ ان کو بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ یہ خان آرزو کے بڑے معتقد تھے۔ یہاں معاملہ برعکس دیکھا۔ اس پر حاکم نے ان سے کہا کہ بھئی کسی طرح ان اعتراضات کا جواب دو انھوں نے پہلے از راہ انکسار انکار کیا۔ آخر یہ سمجھ کر کہ خان آرزو نے میرے ایک دوست کی زبردستی تذلیل کی ہے اسواسطے کہا بہت اچھا جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے لکھتا ہوں اور اسی کے ساتھ ان اعتراضات کا بھی جواب دیا جو خان آرزو نے منیر پر کئے تھے مولانا غلام علی آزاد کہتے ہیں کہ اس رسالہ کا نام جواب شافی رکھا تھا۔ مگر میرے پاس وہ رسالہ قلمی موجود ہے اس پر محاکمات

حاکم۔ بسکہ وارد صرفہ ساز ناگرد جولان ادا   سیر واز دست تمکیں چیدہ دامان ادا

اعتراض خان آرزو۔ معلوم نہیں کہ صرفہ یہاں کس معنی میں استعمال کیا گیا

جواب وارستہ۔ یہاں صرفہ بمعنی احتیاط لایا گیا ہے۔ غالباً اس معنی میں خان آرزو کو تردد ہے۔ لہذا اسی معنی میں اساتذہ کے اشعار ہیں ملاحظہ ہوں۔

ظہوری۔ صبر کے راہ شوق می گیرد   صرفۂ جنگ در گریز مرا

شاہ محمود کی تعریف کرتے ہوئے صلہ نہ ملنے کے بارہ میں کہتا ہے۔

شہ غزنوی گرچہ تقصیر کرد   تلافی خدیو جہانگیر کرد
ازیں صرفہ کاری شد ایں سوٗاو   کہ مذموم شد نام محمود او

طالب آملی۔ مکن صرفۂ مے بإسراف کوش   خم از دست چند انکہ خواہی بنوش

محسن تاثیر۔ نقد ہستی برہش گرہمہ ایثار کنم   صرفہ از ہمت سر زلف تو یک مونہ دہد

(مولف) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم ثبوت میں پیش کئے ہوئے تینوں شعروں کے معنے لکھدیں نمبر اول کے شعر سے نزدیک احتیاط کے معنے نہیں نکلتے بلکہ فائدہ کے معنے ہیں یعنی۔ صبر راہ شوق کب پسند کرتا ہے۔ لڑائی میں میرا فائدہ یہی ہے کہ میں بھاگ جاؤں۔ دوسری جگہ بھی صرفہ کے معنی احتیاط کے نہیں نکلتے۔ بلکہ مکر و حیلہ کے معنی ہیں۔ یعنی۔ بادشاہ محمود نے اگرچہ خطا کی۔ مگر میرے شاہ جہانگیر نے اس کی تلافی کردی۔ اس صرفہ کاری یعنی مکر و حیلہ سے محمود کا یہ فائدہ ہوا۔ کہ اس کا نام جو محمود تھا وہ مذموم ہوگیا۔

البتہ طالب آملی کے شعر سے احتیاط کے معنی نکلتے ہیں۔ یعنی شراب کے بارہ میں احتیاط مکر خوب فضول خرچی سے کام لے خم تیرا ہی ہے جتنی چاہے پی۔

محسن تاثیر کے شعر میں فائدہ کے معنے ہیں۔ یعنی۔ اگر میں اپنا تمام نقد ہستی اس کی راہ میں خرچ کردوں تب بھی تیری زلف اپنا ایک سرمو فائدہ نہ چھوڑے گی۔ بہرصورت محسن تاثیر کا شعر حاکم کی توثیق کے واسطے کافی ہے اس شعر سے بھی صرفہ بمعنی احتیاط ثابت ہوتا ہے ؎

وارشیفتۂ بادہ شوی صرفہ نگہدار   کایں عربدہ جو سخت تنک ظرف و غیور است

یعنی اگر تو شراب پیتا ہے تو احتیاط کرتا رہ۔ کیونکہ یہ عربدہ جو نہایت تنک ظرف اور غیور ہے لغات میں احتیاط کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸۵) : وارستہ نام لکھا ہوا ہے۔ مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ خان آرزو کے بعض اعتراضات کا جواب وارستہ سے دیا گیا ہے۔ اور بعض کا نہیں دیا گیا۔ چنانچہ نمونتاً بعض اعتراضات اور جوابات لکھے جاتے ہیں۔

معنی بھی ملتے ہیں۔ لہذا آرزو کے اعتراض کو سوائے فضول اعتراض کے اور کیا کہا جا سکتا ہے ۔

حاکم چو لالہ داغ بدل سوختم کہ ساغر مے — بدست داد پس از خوں شدن بہار مرا

اعتراض آرزو۔ خوں شدن بیدل - ناصر علی - اور ان کے متبعین کے کلام میں پایا جاتا ہے مگر میرے نزدیک درست نہیں ہے ۔

جواب وارستہ ۔ باوجودیکہ اساتذۂ قدیم کے کلام میں خون ہونا درست ہے پھر کیا سبب ہے کہ خان آرزو اس کو نہیں مانتے ۔ نظامی کا یہ شعر دیکھئے ؎

دل زجانان داشتم تا گشتہ ام نظارگی — یا زغم سیر آمدم یا خوں شدم یکبارگی

حیاتی گیلانی ۔ آورم نزد تو شعر و از خجالت خوں شوم — ہمچناں دانم کہ پر جبریل قرآں می برم

(مولف) خان آرزو کے اعتراضات کی نوعیت سمجھ میں نہیں آتی ۔ کہ آخر خوں شدن پر اعتراض کیوں کیا ہے بعض محققین کا خیال ہے کہ خوں شدن کا اطلاق غیر شخص پر مسلم ہے شخص درست نہیں جیسے کہ اس شعر میں نگاہ پر اطلاق کیا گیا ہے ۔

طاہر وحید ۔ خوں شد نگہ از حسرت روی تو بچشم — چوں مرغ گرفتار کہ در دام بمیرد

مرزا بیدل کے یہاں اکثر جگہ خوں شدن لایا گیا ہے اور وہاں شخص اور غیر شخص کی قید نہیں لگائی گئی ۔ ملاحظہ ہو ؎

حیف ساز تے کہ نفس پردۂ آہنگ شدم — چہ قدر ناز تو خوں گشت کہ من رنگ شدم

چہ خواہد کرد تا با صافی آئینہ دلہا — گرفتم آہ من خوں گشت و پیدا کرد تاثیرے

مژدہ ات بیدل کہ شب از تغافلہائے یار — آرزو ہا باز خوں میگردد و دل می شود

حاکم ۔ اے وائے من کہ یار چو آمد بخاک من — افشاند جائے گل بسر گور پشت دست

اعتراض خان آرزو ۔ پشت دست افشاندن اگر کہیں دیکھا ہو تو محفوظ رکھئے سند میں پیش کرنا ہوگا ۔

جواب وارستہ ۔ غریب حاکم نے بغیر دیکھے بھالے نہیں لکھا ہے ۔ ضرور دو چار جگہ دیکھا ہے آپ بھی دیکھیے ۔

صائب ۔ ہر کس فشاندہ بر من پرشور پشت دست — از جہل زد بخانۂ زنبور پشت دست

مخلص کاشی ۔ از شرح ساعدت ید بیضاست نامہ ام — گل گل فشاند بر شجر طور پشت دست

(مولف) پشت دست افشاندن ۔ اور پشت دست زدن دونوں محاورے ہیں ۔ جن کے معنی رد کرنے کے ہیں چنانچہ مخلص کاشی کا اسی غزل کا دوسرا شعر ہے ؎

کے روئے دست دولت دنیا خوریم کے　　نقرہ زدہ بحشمت فغفور پشت دست

حاکم بہ لعلِ خویش مدائے فاسق از ترس است　　چو شیشہ دل کہ ہم از دہا گرفت وگزشت

اعتراض۔ مجھے شیشۂ دل کی اصطلاح معلوم نہیں کیا معنے ہیں۔

وارستہ۔ شیشہ دل ۔ شیشہ جان شیشہ خاطر اساتذہ کے کلام میں بہت ہے۔ رعایتاً ایک شعر لکھا جاتا ہے

صائب۔ ہر شیشہ دلے حوصلۂ شور ندارد　　عریاں جگرے خانۂ زنبور ندارد

(مولف) شیشہ دل سخت جان کے معنی میں اساتذہ کے کلام میں اکثر پایا جاتا ہے

صائب　　از دیدن رویت دل آئینہ فرو ریخت　　ہر شیشہ دلے طاقت دیدار ندارد

"　　تو شیشہ دل نہ ہی تن بسختیٔ ایام　　وگرنہ لعل ز کوہ و کمر شود پیدا

"　　من شیشہ دلم حوصلۂ سنگ ندارم　　دارم سر صلح دجگر جنگ ندارم

نظامی　　بر آں شیشہ دلاں از ترک تازی　　فلک را پیشہ گشتہ شیشہ بازی

شیشہ جان کی مثال ہے

صائب ۔　　سنگم از سنگلاخ تن یکبار　　با ہمہ شیشہ جانی آمدہ آم

گر میرے نزدیک یہاں پر خان آرزو کا اعتراض صحیح ہے۔ کیونکہ حاکم کے شعر میں شیشہ دل سے سخت جان کے معنی پیدا نہیں ہوتے۔

حاکم۔ ز دست جامۂ تلخ فلک دلم تنگ است　　دہانِ ما ازیں بہ گر آستین تنگ است

اعتراض۔ نہ معلوم جامۂ تلخ کیا بلا ہے۔

جواب وارستہ۔ جامہ تلخ ماتمی سیاہ کپڑے کو کہتے ہیں مرزا صائب نے کئی جگہ لکھا ہے ؎

گر ندارد ماتمِ ایمان ایں دل مردگاں　　از چہ دارد جامۂ خود کعبہ اسلام تلخ

خود میں نے بھی یہہ محاورہ باندھا ہے۔

وارستہ۔ نیست ور دہر زباں بازی اگر مایہ درد　　از چہ رو جامۂ تلخ است بیر سوسن را

حاکم۔ غلط ساز ندمردم بعد ازیں با روزن گلخن　　چنیں گر بے توام از چشم حیراں دودمی خیزد

اعتراض۔ "روزن گلخن" سے اگر "در گلخن" مراد ہے۔ تو گلخن میں ایک چھوٹا سا دروازہ ہوتا ہے اسکو روزن نہ

کہنا چاہئے - اور اگر اس وزن سے وہ روزن مراد ہو جسے ہندوستان میں ڈودکش کہتے ہیں اور دھواں نکلنے کے لئے بنا دیتے ہیں تو وہ اس معنی میں مستعمل نہیں ہے۔

جواب وارستہ - ملا طاہر وحید "روزن گلخن" کہتے ہیں۔

چو لالہ روزن گلخن بود دگر با غم　　　از یں چہ سود کہ در باغ کشتہ اندمرا

ڈودکش کو اہل ہند کا محاورہ کہنا زباندانی کی جان پر ستم کرنا ہے ۔ اس لئے کہ یہ لفظ فارسی کا ہے طاہر نصیر آبادی کبھی ہندوستان میں نہیں آیا مگر اپنی نثر مسمیٰ بہ خواب وخیال میں لکھتا ہے (فقرہ) آنکہ از دود عود پریشاں میشد در دودکش حمام مقامش دادم - اسیطرح مصنف ابراہیم شاہی کہتا ہے " دودکش روزن مطبخ وگرما بہ و دیگدان"

حاکم -　　　چوں بکویت میرسم ای رشک حور از راہ دور　　　میرسد آواز در گوشم کہ دور از راہ دور

اعتراض - پہلے مصرع میں راہ میں اضافت توصیفی کا استعمال کیا ہے - اور دوسرے مصرع میں دور از راہ میں اضافت نہیں ہے اس لئے قافیہ صحیح نہیں ہو سکتا۔

جواب وارستہ - فقیر اللہ آفریں کے شعر میں بھی ایسا ہی ہے -

ہست گویا زاں دہاں رنگیں نشان غنچہ را　　　چوں لب پاں خوردہ مو بوسم دہان غنچہ را

اس میں دیکھئے کہ اگر پہلے مصرع کا قافیہ بغیر یائے تنکیر کے لکھتے ہیں تو معنے پیدا نہیں ہوتے - اور اگر مصرع ثانی میں بھی یائے تنکیر لاتے ہیں تو بھی کوئی معنی نہیں رہتے سچ ہے -

اگر شعر بزرگاں دیدہ باشم　　　بہ شعر خویش کم خندیدہ باشم

(مولف) میرے نزدیک یہ عیب قافیہ کا نہیں بلکہ ردیف کا عیب ہے جس پر خان آرزو نے اعتراض کیا ہے اور جو سند وارستہ نے پیش کی ہے اس میں قافیہ کی غلطی ہے -

---

حاکم -　　　سبز بختی عاقبت حاکم مرا رسوا نمود　　　بر زمرد کندہ حکاک قضا نام مرا

اعتراض - اس میں رسوا کرنا جو کہا گیا یہ غلط ہے اس واسطے کہ مہر پر نام کندہ ہونا سبب شہرت ہے نہ کہ سبب رسوائی۔

جواب وارستہ - شہرت دو جہتیں ہے جو نیکنامی او بدنامی دونوں پر مشتمل ہے - اسی سبب سے لفظ انگشت نما کا بھی دونوں پر اطلاق ہوتا ہے وہ بدنامی ہو یا نیک نامی - چنانچہ سالک یزدی کا یہ شعر ہے جو حاکم کے خیال کی تائید و توثیق کرتا ہے -

بگذر از نام کہ تاگل نکند رسوائی　　خاتم انگشت نماگشت کہ نامے دارد

اس میں بھی خاتم کے ساتھ رسوائی کا ذکر کیا گیا ہے۔
(مولف) شہرت میں بدنامی اور نیکنامی دونوں ممکن ہیں جیسے کہ مومن کہتے ہیں ؎
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

حاکم۔ دل بخون غلطد ز ابرو و نگاہ چشم یار　　ہمچو آں صیدیکہ حاکم میخورد بسیار تیغ

اعتراض۔ تیغ خوردن ہم نے کلام ثقات میں نہیں دیکھا۔

جواب وارستہ۔ دیکھئے دیوان طالب آملی سے نکال کر یہ سند دی جاتی ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

بہ شرب آبحیات آں کساں کہ مے نازند　　بخوردہ اند ہمانا زدست جاناں تیغ

چنانکہ گرسنہ معدہ قلم بذوق خورد　　تواں زدست تو خوردن بہ اشتہا شمشیر

جیسے شمشیر خوردن۔ یا تیغ خوردن ہے اسی طرح خنجر خوردن بھی مستعمل ہے۔ چنانچہ خود جناب ہی نے سراج اللغۃ میں سند آیہ شعر لکھا ہے ؎

ما تندخو چو شعلۂ شوقیم بے ضرر　　کس خنجر کشیدۂ ما را نمی خورد

اور لطف یہ ہے کہ اسی شعر پر اُلجھے بھی ہیں اور فرماتے ہیں کہ (ما) جمع ہے اور (تندخو) مفرد ہے اس طریقے ہم نے کلام اساتذہ میں نہیں دیکھا۔ یہ غرابت سے خالی نہیں ہے مگر بندہ وارستہ عرض کرتا ہے کہ کچھ بھی غرابت نہیں ہے، دیکھئے فیضی کا یہ شعر دیکھئے ؎

از کنہ کمال او چہ نالیم　　ما ہیچمداں آفرینش

اگر آپ کا خیال صحیح ہوتا تو ما ہیچمداناں لکھا جاتا۔

(مولف) اس کی مثالیں کلام اساتذہ میں بہت سی ملتی ہیں۔ معلوم نہیں کہ سراج المحققین خان آرزو نے کس بنا پر یہ لکھا بلکہ فارسی میں تو شاید ہی کسی کا کلام ہو جس کے یہاں یہ شتر گربگی نہ پائی جائے سعدی ؎

کریما بہ بخشائے بر حال ما　　کہ ہستم اسیر کمند ہوا

حاکم۔ لعل نوشین مسی مال تو ہا آمد بیاد　　شربت نیلوفری شد آب حسرت در دہن

اعتراض۔ اگرچہ مرزا مظہر جان جاناں نے بھی باندھا ہے مگر کچھ اچھا نہیں باندھا۔

جواب وارستہ۔ اس کے تو معترض صاحب خود قایل ہیں کہ یہ تشبیہ پہلے ہی کلام شعرا میں داخل ہو چکی ہے

اب سمجھنا یہ ہے کہ پھر موجب اعتراض کیا ہے - شاید یہ اعتراض ہوگا کہ نیلوفر میں صرف ضمہ پر اکتفا نہیں کی گئی ہے اور واؤ کو ساقط کر دیا ہے - یہ اعتراض اکثر لوگ کرتے ہیں - مگر ناواقفیت پر مبنی ہے - اسیوجہ سے حاکم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا - نیلوفر بغیر واؤ کے صرف ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے چنانچہ حسین ثنائی کہتا ہے ؎

ہوائے سیلِ حلم تو گر برد بوزد　　　کبود رنگ شود ہمچو نیلوفر آتش

نوعی کہتا ہے ؎ زبسکہ بر تن خود تخم نیلوفر کارم　　　فضائے سینہ باطرافِ آسمان ماند

میر عضد الدولہ انجو نے بھی سراج الدین سنگری کے شعر کو جس میں نیلوفر کا ذکر ہے صحیح کہا تھا - پھر معلوم نہیں کہ خان آرزو نے کسوجہ سے اس شعر کو مشکوک سمجھا ہے -

(مولف) نیلوفر کے مرادف - نیلفر - نیل پر - نیلو پرک - نیلوپل بھی ہیں جو اہل زبان کے کلام میں بغیر واؤ کے بھی پائے جاتے ہیں - اور واو کے ساتھ بھی آتے ہیں مثال کے لئے یہ شعر دیکھئے

صائب - مرا افگندہ در دریائے غم نیلوفری چشمے　　　کہ چوں خورشید عالم سوز زرین آمد گانش

" شمع نیلوفر ماتم زدہ از شعلہ بسر　　　ظلمت اندوخت قسم بسکہ زہجران کسے

سراج سکری - رزم تو نو بہار شد زانکہ در او برآورد　　　نیل فری حسام تو از تن خصم ارغوان

حاکم - درعشق پر روئے دل کردہ باز　　　چو خضر عمر مژگان شوخش دراز

اعتراض - اس میں عین تقطیع سے گر کر شعر کو ناموزوں کرتا ہے - اگرچہ بعض محققین نے وصل دیگر حروف کا مثل الف کے جائز رکھا ہے - مگر میرے نزدیک جائز نہیں - اس واسطے کہ عروضیوں نے اس صورت کو جائز نہیں رکھا - یہ وصل واجب التفصیل ہے یہی وجہ ہے کہ منیر لاہوری نے ظہوری کے اس شعر پر بھی اعتراض کیا ہے -

بدہ ساقی آں آب یاقوت را　　　کہ سازد علاج عقل فرتوت را

ہرچند کہ مصرعہ ثانی یوں ہے ؎

کہ ساز و جواں عقل فرتوت را

وارستہ - رئیس المحققین مجد الدین علی توسی نے رسالہ سراج منیر میں ظہوری کے اسی شعر پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے - کہ استادوں کے کلام میں کہیں کہیں حرف ساکن واقع ہوتا ہے - جس کو تقطیع میں حذف کر دیا جاتا ہے - اور شعر کو ناموزونیت سے بچا لیا جاتا ہے - حکیم فردوسی کا یہ شعر اسی قسم کا ہے

فردوسی ؎ ہمہ خاک دارند بالین و خشت　　　ندانم بدوزخ روند یا بہشت

بس بالکل ایسی ہی صورت حاکم کے شعر کی ہے - حالانکہ خان آرزو لکھتے ہیں کہ کسی عروضی نے اس کے متعلق کوئی

کلمہ لکھا ہی نہیں۔ مگر مجد الدین توسی کے قول سے اس قول کی تکذیب ہوتی ہے۔
(مولف) اس میں شک نہیں کہ فردوسی۔ شیخ فرید الدین عطار۔ حکیم ثنائی وغیرہ شعرائے قدیم نے ایسے سقوط حرف کو جائز رکھا ہے۔ مگر متاخرین اس سے سخت محترز رہے ہیں۔
ابتدائے دور میں اکثر شعرائے اردو کا یہی مسلک تھا کہ وہ ہر حرف وصل کو الف کی طرح گرا دیتے تھے۔
چنانچہ مثال کے طور پر ہم چند اشعار لکھتے ہیں ؎

سودا۔	اک عالم اُن کے گرداگرد ہو جمع	ہو پروانوں کی جوں کثرت سر شمع
ظفر بہادر شاہ	ظفر خار کیوں گل کے پہلو میں ہوتے	جو اچھے نصیب عندلیبوں کے ہوتے
"	کہا غیر کو نہ بلائیو کہا شوق سے میں بلاؤنگا	تمہیں شک ہو تو یہ آ کہو یہ کہا اور اسکو اٹھا دیا
مرزا دبیر	یثرب میں کئی سال سے رہتی تھی میں دکھیا	چھوڑ کے ہوئی یثرب کو اک عرصہ مجھے گزرا
"	ہم دیکھیں گے آج عالم ہستی کے طبق کو	کہتے ہیں نبی آج وصی نائب حق کو
شاہ حاتم	یہاں طالعوں سے ملتا ہے پیارا	عبث دیکھے ہے زاہد استخارا
نظیر اکبر آبادی	نمانا کبھی دل سے کہنا ہمارا	نہایت ہم عاجز ہوئے بکتے بکتے
سودا	سودا مجھے کہتا ہوں نہ خوباں سے مل اتنا	تو اپنا سر ہے عاجز و دل بیچنے والا
"	محبوب اور نسبت و لطافت تھے اک طرف	یک سو تھا میر سید علی مستعد کار
میر۔	داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر	ہو نجات اسکو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا
انیس	تصویر سی بستر پہ کشیدہ تھی تن زار	باہیں جو گلے میں تھیں تو نبید دیدہ خونبار

الغرض تمام حروف کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مگر فی زمانا کسی حرف کا سوائے الف وصل کے گرانا جائز نہیں۔

حاکم گل کرد تا ز مشرق دل مطلع دگر ۔ خورشید شد ز شرم برنگ سہا گرہ

اعتراض ۔ خورشید کو گرہ کہنا نامانوس اور غریب ہے۔

جواب وارستہ۔ جب مرزا صائب نے اس شعر میں طوفان کو گرہ کہا ہے تو نامانوس کیوں ہے ؎

طوفاں گرہ شدہ است مرا در دل تنور ۔ تا مہر شرم بر لب اظہار ماندہ است

محسن تاثیر نے اس شعر میں گرہ کشا کو گرہ کہا ہے۔ پھر ستارہ کو گرہ کہنا جو خود بصورت گرہ ہے بُرا کیوں ہے اور اس کے نامانوس ہونے کا کیا سبب ہے ؎

نمی شود دلم از زلف یار بکشاید ۔ گرہ کشا چو گرہ شد چہ کار بکشاید

مولانا غلام علی آزاد تذکرہ خزانہ عامرہ میں اس جواب کے متعلق لکھتے ہیں کہ مجیب نے دو شاہد پیش کئے۔ مگر دونوں کماحقہ ادائے شہادت نہیں کرتے۔ اور اس لئے یہ جواب ناکافی ہے۔ حقیقی اور صحیح جواب یہ ہے۔

صائب — آہ سردے از لب ہر کس کہ می گردد بلند — آفتابے در تہ دل چوں سحر دارد گرہ

(مولف) مولانا آزاد کا جواب صحیح ہے اس لئے کہ اس میں آفتاب کا گرہ ہونا ثابت کیا گیا ہے

حاکم — نیست بر یکجا قرارے داغدار عشق را — روز بر گردوں چو خورشیدیم شبہا بر زمیں

اعتراض — آفتاب شب کو زمین کے اوپر نہیں ہوتا بلکہ زیر زمین ہوتا ہے۔

جواب وارستہ — مرزا صائب نے قارون کے مال کو جو زیر زمین ہے بر زمین کہا ہے۔ دیکھئے

صائب — ہر کہ کم خوردہ خود خرج درویشاں نکرد — میگزارد ہمچو قاروں حلہ یکجا بر زمیں

یہ بھی ظاہر ہے کہ لفظ خورشید کا اطلاق جرم مضی پر کیا جاتا ہے بخلاف لفظ آفتاب کے جس کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ باوجود ان تاویلات کے بھی جواب صحیح نہیں ہے۔

حاکم — بگو بزاہد ما کیں نشست و خاست چراست — ز حرص و آز گزشتن ہمیں دوگانۂ ماست

اعتراض — حرص آز ہی کا ترجمہ ہے۔ اس لئے دوگانہ ثابت نہیں ہوتا۔

وارستہ — اگر دونوں لفظوں کو مرادف مانا جائے تو دوگانہ ثابت ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ثابت نہیں ہوتا

مولانا آزاد بلگرامی۔ ابو طالب کلیم کا اسی قسم کا شعر ہے ؎

گرچہ خود گشتہ زن حرص و طمع میگوید — مفتی شہر کہ یک زن بدو شوہر ندہند

یعنی خود تو حرص و طمع کی جورو بن گیا ہے۔ پھر بھی یہ حکم لگاتا ہے کہ ایک عورت کے دو شوہر ہونے چاہئیں اب دیکھئے کہ حرص و طمع ایک ہی چیز ہے یہاں سے دوئی ثابت نہیں ہوتی۔ اگر وہ شعر غلط ہے تو یہ بھی غلط ہے۔

حزیں[۵۱] و خان آرزو

---

[۵۱] حزیں تخلص اور نام محمد علی تھا۔ تمام علوم عقلی و نقلی میں کامل تھے۔ اصل وطن اصفہان تھا۔ ربیع الاول ۱۱۰۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اور اوائل شباب میں بلاد عراق اور فارس کی سیاحت کی اور مختلف اساتذہ سے ملکر تحصیل علوم کرتے رہے اسی زمانہ میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ تو محمد مسیح فسائی شاگرد آقائے حسین خوانساری کے (بقیہ نوٹ ملاحظہ ہو صفحہ ۹۴ پر)

شیخ علی حزیں دل ہے تو چو شیشۂ شکستہ ‏ در گریۂ ہائے ہاست مارا

اعتراض - ہائے ہا - ہائے کی جمع نہیں ہے اگر ہائے ہائے کہا ہے تو پھر بغیر - یا کیوں کہا گیا یہ مسموع نہیں لہذا سند کی ضرورت ہے -

---

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹۳) شاگرد ہوئے - اور شعرائے معاصرین سے صحبتیں رہیں۔ آخر ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین کی زیارت کے لئے گئے - واپسی میں قصبۂ لار میں وارد ہوئے یہاں اس زمانہ میں نادر شاہ کی وجہ سے بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اس واسطے باوجود ارادے کے بھی قیام نہ کر سکے - مجبوراً پھر فارس کے شہروں میں پھرتے رہے - اور کرمان میں پہونچے - اتفاقاً اسی زمانہ میں علی قلی خاں والہ داغستانی بھی ہندوستان کے ارادے سے کرمان میں آئے تھے کہ ان سے ملاقات ہوگئی دونوں ملکر بندر عباس پر آئے اور اسمٰعیل مرزا کے یہاں ٹھہرے جو وہاں کے حاکم تھے اور اسی راستہ سے بندر ٹھٹہ میں وارد ہوئے - یہاں سے دلی آئے - مگر کچھ ایسے اسباب تھے کہ دلی میں چندے قیام کرنے کے بعد پھر لاہور چلے گئے - چند ہی روز میں نادر شاہ کی آمد آمد کی خبر سنی ور شیخ کو مجبوراً پھر دلی آنا پڑا - جب نادر شاہ نے دلی کو مرکز نزول کیا تو شیخ اپنی حفاظت کے لئے ڈر کر علی قلی خاں والہ کے مکان میں چھپ گئے - نادر شاہ کے چلے جانے کے بعد پھر لاہور کی طرف چلے - ناظم لاہور مسمی ذکریا خاں سے کچھ دشمنی تھی اس نے ان کو کوئی تکلیف دینا چاہی - اتفاقاً حسن قلی خاں کاشی جو محمد شاہ کی طرف سے سفارت پر گئے تھے - لاہور میں آگئے اور انھوں نے شیخ کو بچا کر محفوظ دہلی پہونچا دیا - یہاں آکر میر خاں انجام کے ساتھ رہنے لگے اور انھوں نے پیشگاہ شاہی سے کچھ درماہہ مدد معاش کے طور پر مقرر کرا دیا - اور ان کی زندگی آسودہ حالی سے بسر ہونے لگی -

اتفاق سے انھوں نے ایک قصیدہ کہا جس میں اہل ہند کی برائی کیگئی تھی - اسی قصیدہ کا ایک یہ شعر ہے ؎

نسناس سیرتی است تمنائے مردمی ‏ از دیولاخ ہند کہ آدم نداشتہ است

اسیر دلی کے حلقۂ شعراء میں بڑا غوغا مچا یہاں تک کہ شیخ کا رہنا محال ہوگیا - مجبوراً یہ بلاد بنگالہ کی طرف چلے - راستہ میں بنارس میں ٹھہرے - پھر پٹنہ عظیم آباد وغیرہ گئے مگر ہیں سے پلٹ آئے اور پھر عمر بھر کے لئے بنارس میں قیام کیا ایک جگہ کہتے ہیں ؎

بہ بندگشتہ زمیں گیر ناتوانئ ما ‏ بہ شب رسید مگر روز زندگانئ ما

نہ معلوم سراج الدین علی خان آرزو سے کس وجہ سے مخاصمت ہوئی کہ شیخ کے کلام پر اعتراض کر کے ایک رسالہ تنبیہ الغافلین کے نام سے لکھا - اسی رسالہ کے جواب میں مولانا صہبائی نے ۱۲۶۰ھ میں ایک رسالہ قول فیصل کے نام سے لکھا اور شیخ کی طرف سے خان آرزو کے اعتراضات کے جوابات دیئے -

مولانا صہبائی دہلی کے مشہور شاعر اور عالم تھے آرزوہ - غالب - مومن - ذوق کے معاصر تھے - قول فیصل ابھی تک ملتا ہے -

صہبائی - معترض کو پہلے تو فارسی کے قاعدہ پر نظر ڈالنی چاہیئے - قاعدہ یہ ہے کہ کبھی اُن کلمات میں جنکے آخر میں الف ہے - ی - کا اضافہ کردیتے ہیں - جیسے خدا سے خدائے اور آشنا سے آشنائے - جیسے سعدی کہتے ہیں ؎

ہمائے بر سر مرغاں آزاں شرف دارد   کہ استخواں خورد و طایرے نیازارد

اور برعکس اس کے کبھی یائے اصلی کو جو الف کے بعد آتی ہے گرادیتے ہیں - جیسے کہ جائے اور نائے کو جا - اور - نا - استعمال کرتے ہیں - تنگنا - اس کی بہترین مثال ہے - اس صورت میں سند کی ضرورت نہیں کہ ہائے ہا کی سند لائی جائے اور اگر خان آرزو کو سندہی کی ضرورت ہے تو مومن استرآبادی کا یہ شعر موجود ہے ؎

ہائے وہوئے میرسد امشب بگوش ہوش باز   ہمنشیں از گریۂ پُر ہائے ہا معذور دار

سنجر کاشی حضرت علی کی منقبت میں کہتا ہے اس قصیدہ کی روی الف مقصورہ ہے ؎

در موج خیز دامن من کش کنارہ نیست   ہمچوں حباب کشتی نوح ست بے بقا

سلماں بدست ارزل اگر دیدیم چنیں   بگریستے بحالتم آنگہ بہائے ہا

اصل یہ ہے کہ اس لفظ میں کلمہ ہائے کی تکرار ہے اور اس کا استعمال یا کے ساتھ - اور بغیر یا کے دونوں طرح جائز ہے ؎   ہر کجا شورے بہا ہوے دل است   تا نفس بر میکشی بوی دل است

جب ذات الیار کی تکرار کریں گے تو ہائے ہائے کہیں گے - اور جب محذوف الیار کی تکرار کریں گے تو ہا ہا ہو جائیگا - اور جب دو مختلف صورتوں کو جمع کریں گے تو ہائے ہا ہو جائے گا - اب یہ تین صورتیں ہوئیں جن میں سے پہلی صورت کے خود خان آرزو بھی قایل ہیں - دوسری صورت کی مثال یہ ہے - نعمت خاں عالی

گشت او مشغول بہ ہا ہائے خود   ما حضر نیز آنچناں بر جائے خود

حزیں -   تو کز ابر کف آبے تشنہ کاماں را نہ بخشائی   چرا چوں باد دامن میزنی آتش بجاناں را

اعتراض - اس شعر میں معشوق کی تعریف ممدوح کی طرح کی گئی ہے - علاوہ ازیں بخشائش اور بخشائیدن محل ترحم میں مستعمل ہے - عطا اور بخشش کے لئے سند کی ضرورت ہے -

جواب صہبائی - معشوق کی ممدوحانہ اور ممدوح کی معشوقانہ رنگ میں تعریف کرنا ہر چند کہ بہت نامناسب ہے مگر کیا جائے - متقدمین نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے - چنانچہ انوری کہتا ہے ؎

گفتا گرت ز گفتۂ خود قطعۂ دہم   مانند گفتہ ہائے تو مطبوع و آبدار

گفتم کہ ایں عجب ز خداوندی تو نیست   اے انوریت بندہ و چوں انوری ہزار

رہا دوسرا اعتراض کہ بخشائیدن اور بخشائش محل ترحم میں استعمال ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ بیشتر اسی معنی میں مستعمل ہے۔ مگر اکثر لوگوں نے بخشش کے معنی میں بھی لکھا ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی ؎ لکھتے ہیں

خور و پوش و بخشائے و راحت رساں　　نگہ می چہ داری ز بہر کساں

اسی طرح خسرو علیہ الرحمہ بھی اسی معنی میں استعمال کر گئے ہیں ؎

جدا گانی از ہر معانی طراز　　اگر دم زنم قصّہ گردد دراز

نہ من زاں فگندم دریں کوچہ رخش　　کہ یابم ز بخشائش شاہ بخش

حزیں - دریں فکرم کہ تعلیم جبیں سازم سجودش را　　بداغ دل دہم من یا عذار مشکسودش را

اعتراض - عذار مشکسود کے کیا معنے ہیں کاکل مشکیں اور مشک سود فصحا کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ عذار مشک سود میں صحت کی خوشبو ناپید ہے۔

جواب صہبائی - اہل انصاف جانتے ہیں کہ مشک سود صحیح ہے۔ مگر جن لوگوں کے دماغ کو حسد کے زکام نے خراب کر دیا ہے انھیں خوشبو نہیں آسکتی آصفی کا شعر ہے ؎

تو ئی کہ نیست عذار تو مشکسود ہنوز　　منم کہ ز آتش حسنت ندیدہ دود ہنوز

یہاں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید عذار کو باعتبار خط کے مشک سود کہا گیا ہے۔ مگر بابا فغانی کے شعر میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے اس کو کوئی کیا کرے گا۔

اے خطت ریحان و خالت لالہ و رخسار مشک　　نرگست آہوی چیں غمزۂ خونخوار مشک

اور عجیب بات یہ ہے کہ غمزہ اور خال کو مشک کی تشبیہ سے آلودہ کر دیا ہے ؎

موئے تو مشک ماند و زلف بہ خوں　　میگویم و می آیم ازیں عہدہ بروں

مشک ہست و لے ہنوز ماند ناف است　　خون ہست و لے آمدہ از نافہ بروں

مگر حق یہ ہے کہ یہ ایک قسم کی تشبیہ مغالطہ ہے۔ اور تشبیہ مغالطہ اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو کسی ایسی چیز سے تشبیہ دیں کہ عرف عام میں اس کے برعکس ہو پھر اس کا تدارک رفع مغالطہ کے لئے کیا جائے ظاہر ہے کہ مشک نافہ خون میں ہے اور وہ خون جو ناف سے باہر نکل آیا ہو مشک ہے۔

حزیں - جہاں یکسر خراب از وضع ایں مشکل نشیناں شد　　مثلث بود خاصیت ہا نا ایں مربع را

اعتراض - مثلث ایک خط ہے مربع کی مانند نہ کہ خاصیت۔ اگر یہ کہا جاتا کہ اس مربع کی خاصیت مثلث کو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

NATIONAL MUSLIM UNIV
جامعہ ملیہ اسلامیہ

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ۔ ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۲	فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۳۲ء	شمارہ ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۲۲	اگست ۱۹۳۲ء	شمار ۲

ملاحظات

لکھنؤ اپنی شیعہ آبادی کی کثرت اور اُس کی مذہبی مرکزیت کی وجہ سے ہندوستان میں وہی حیثیت رکھتا ہے، جو دنیا میں سرزمین ایران کو حاصل ہے اور اگر یہاں کے مراسم عزاداری اور شیون وبکا کی شدت و وسعت کو سامنے رکھا جائے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان سے زیادہ بلند اخلاق کی جماعت دنیا میں کوئی اور ہو سکتی ہے اگر ان تمام ظاہرداریوں کے ساتھ سو میں ایک حصہ بھی سیرت حسین کی کیفیتوں کا وہ حقیقتاً اپنے اوپر طاری کریں ——

—— یوں تو میرا تعلق کسی خاص مسلک و مشرب سے نہیں ہے لیکن چونکہ میرا خاندان ہمیشہ سے حنفی المذہب رہا ہے اس لئے ممکن ہے مجھے مذہبی حیثیت سے مستحق نہ سمجھا جائے کہ حضرات شیعہ کے کسی دینی اعتقاد یا رسم و رواج کے متعلق کوئی تنقید پیش کروں —— تاہم اُس حیثیت سے جو ایک شخص ثالث کو حاصل ہوتی ہے، غالباً مجھے اس آزادی سے محروم نہیں کیا جا سکتا جو صرف اظہار رائے کی حد تک بلاقید مسلک و ملت ہر شخص کو ملنی چاہئے، علی الخصوص اس وقت جبکہ لکھنؤ کی موجودہ فضا میں یہ تفریق تمدنی امن وسکون کو خطرہ میں ڈالنے کی حد تک پیچیدگی اختیار کر چکی ہو —— بہرحال میرا اس وقت اس مسئلہ پر قلم اٹھانا نہ اس لحاظ سے ہے کہ میں ان دونوں فریق میں سے کسی ایک فریق کا فرد ہوں اور نہ اس حیثیت سے کہ میں اس سلسلہ میں کسی مناظرۂ مذہبی کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہوں

بلکہ میری یہ عبارت صرف اس خیال کے ماتحت ہے کہ میں بھی اسی قطعۂ زمین میں سانس لے رہا ہوں جہاں یہ لوگ آباد ہیں اور وہاں کا ایک ادنیٰ باشندہ ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی رائے دینے کا حق حاصل ہے خواہ وہ کیسی ہی ادنیٰ و ناقابل لحاظ کیوں نہ ہو ـــ ہاں، تو جیسا میں نے اولین سطور میں ظاہر کیا، لکھنؤ کو اپنی شیعہ آبادی کے لحاظ سے جو خصوصیت حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں۔ لیکن چونکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے اکثریت سنیوں ہی کی ہے۔ اور فرنگی محل کے وجود نے ان کی مذہبی مرکزیت بھی بڑی حد تک یہاں قائم کر رکھی ہے اس لئے باوجود کثرت آبادی کے شیعہ جماعت کو یہاں بھی اپنے سے زیادہ بڑی جماعت سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور چونکہ یہاں ہر دو فریق کے علماء اپنے کام میں برابر لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے دونوں جماعتوں کے افراد میں ہر وقت ایک قسم کی گرمی پائی جاتی ہے علی الخصوص محرم کے زمانہ میں کہ جب دونوں جانب کے مبلغین و واعظین اپنے اپنے ترکش کا ایک ایک تیر صرف کرنے میں اپنی انتہائی قوت سے کام لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور انھیں مطلق اندیشہ نہیں ہوتا کہ کہیں اُن کے "دست و بازو" کو نظر نہ لگ جائے۔

میرے نزدیک اس سے زیادہ لعنت ایک انسان کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ مذہب کے لئے لڑے اور مذہب کی خاطر "جامعہ بشری" میں تفریق کا باعث ہو۔ میں حیران ہوں کہ اگر تمام دنیا میں "انسان" ایک ہے تو پھر اس کا مذہب کیوں نہ ایک ہو جبکہ یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب سب کو ایک کرنے والا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسکو دیکھکر ایک شخص یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دنیا کی خونریزیوں و خون آشامیوں کا ذمہ دار صرف مذہب ہے، اور جب تک اس کا خیال لوگوں کے دلوں سے محو نہ ہو جائے گا عالم انسانی ہمیشہ یونہی مجروح و داغدار رہیگا ـــ آپ کسی مذہب کی تعلیمات اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اس سے زیادہ امن و سکون کا خواہشمند کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا، لیکن جب آپ اس کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس سے زیادہ وحشت و درندگی کا ثبوت شاید ہی کسی اور مذہب نے دیا ہو یا عیسوی مذہب کو لیجئے جو اپنی تعلیمات کے لحاظ سے کیسا گوشہ نشین کتنا خلوت پسند کس درجہ امن خواہ اور صابر و ضابط مذہب ہے لیکن جب آپ اس کی تاریخ پڑھیں گے تو حیران رہجائیں گے کہ انسانی خون بہانے میں شاید ہی کوئی دوسرا مذہب اس سے سبقت لے گیا ہو۔ اسی طرح آپ اسلامی تعلیمات پر غور کیجئے کیا ان کے مطالعہ کے بعد کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ سارے عالم کا مذہب نہیں ہو سکتا؟ اور اس سے زیادہ عافیت طلبی کی خواہش کسی اور طریق تعلیم میں پائی جا سکتی ہے، لیکن تاریخ پر نگاہ ڈالیں گے تو آپ کو حیرت ہو گی کہ اس عافیت طلب جماعت، اسی امن پسند گروہ اور "رحمۃ للعالمین" کی اسی محبت پرست امت نے کیا کیا خونریزیاں نہیں کیں ٹھیک اسی وقت جبکہ ان کی زبانوں پر لا تفسدوا فی الارض کا وعظ جاری تھا، یہ زمین کے امن و امان کو تباہ و برباد کر رہے تھے اور اسی لمحہ میں جب یہ غیروں کے ساتھ بھی اپنوں کا سا سلوک کرنے کی تلقین فرما رہے تھے خود اپنوں سے غیروں کا سلوک کر رہے تھے۔ گوشت سے ناخن جدا ہو رہا تھا اور انھیں پرواہ نہ تھی، بھائی بھائی کو ذبح کر رہا تھا اور یہ مسرور تھے

اس ماہ کے رسالہ میں آپ کو ہمارے ایک عزیز و فاضل دوست مولانا ہوش بلگرامی کا ایک مقالہ نظر آئے گا جس میں انھوں نے اپنے بلیغ خطیبانہ انداز میں یہ سوال کیا ہے کہ اسلام کہاں ہے؟ اور پھر خود ہی جواب دیا ہے کہ "کہیں نہیں ہے"۔ جناب ہوش

عملاً تو غالباً نہیں لیکن نسلاً امامیہ مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن جو بے لاگ تنقید انھوں نے کی ہے اور اپنے درد کو ظاہر کرتے ہوئے جس آزادی سے انھوں نے ہر جماعت اسلامی سے خطاب کیا ہے، وہ اس امر کا شاہد ہے کہ اب دنیا میں عقول انسانی مذہب کے خیال سے کس قدر مضطرب ہیں اور مذاہب عالم نے "عملی رجعت" کی جو صورتیں اختیار کر لی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے چارۂ کار سوائے اس کے کوئی نظر ہی نہیں آتا کہ اب مذہب ہی سے پناہ مانگی جائے، اور مذہب کے خیال کو دلوں سے مٹا دیا جائے۔ دنیا میں کوئی تعلیم محض تعلیم ہونے کے لحاظ سے بے معنی چیز ہے اگر عملی زندگی میں اس سے کوئی تغیر نہ پیدا ہو۔ پھر تعلیمات مذاہب کو عملی زندگی کے لحاظ سے اگر کسوٹی پر کسا جا سکتا ہے تو وہ صرف صفحات تاریخ ہیں، سو وہ جس طرح خون سے رنگین نظر آتے ہیں کسی سے مخفی نہیں۔ یقیناً یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب کا خیال دنیا میں ایک جو معیار تھا کیا دنیا نے عمل کے لحاظ سے مذاہب عالم ناکام ثابت ہوئے، کیا اخلاق انسانی پر ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہوا۔ اس کا جواب مجھ سا آزاد خیال انسان تو کچھ اور دیگا، لیکن ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو مذہب کا پابند کہتا ہے اور مذہب کی ضرورت کا قائل ہے آپ کے سامنے بہت سی مثالیں ایسی پیش کر دیگا جن سے مذہب کے برکات آپ پر ثابت ہو جائیں۔ پھر آپ اس سے یہ پوچھئے کہ اگر یہ صحیح ہے تو اب وہ برکات کیا ہوئے اور اب وہ تعلیمات کیوں بے اثر ثابت ہو رہی ہیں۔ تو وہ اس کا جواب یہی دیگا کہ ان تعلیمات پر عمل کرنا ترک ہو گیا ہے۔ اسکے بعد آپ یہ سوال کیجئے کہ جب ہر مذہبی انسان اس بات کو محسوس کر رہا ہے کہ وہ تعلیمات مذہب پر عامل نہ ہونے سے تباہ ہو رہا ہے تو کیوں نہیں عمل کرتا، جان بوجھ کر کیوں اپنے کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے تو وہ اس کے جواب میں صرف اپنی "بدنصیبی" اور کم بختی کا شکوہ پیش کر دیگا، مگر وہ لوگ جو کسی بات کی تہ تک پہونچنے کے شائق ہیں وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ دنیا میں اب مذہبیت کی عمر ہی ختم ہو گئی ہو اور خدا اب کاروبار عالم چلانے کے لئے بالکل جدید راہیں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حقیقت یہی ہو لیکن میرے نزدیک اس کا ایک سبب اور بھی ہو سکتا ہے جس کا تعلق نہ بدنصیبی سے ہے نہ عدم ضرورت مذہب سے اور وہ یہ کہ کہیں ایسا تو نہیں جس کو آپ مذہب سمجھا جا رہا ہے وہی سرے سے بدلا ہوا ہو اور جن باتوں کو ہم تعلیمات مذہب قرار دے رہے ہیں وہ حقیقتاً مذہب سے کوئی واسطہ نہ رکھتی ہوں۔ دنیا نام جذبات دجذبات پرستی کا نہیں ہے، اگر آپ محبت کو اچھی چیز سمجھتے ہیں اور محبت نہیں کرتے تو آپ کے درس محبت کو کون سنے گا، آپکی جو حالت آنکھوں کے سامنے ہے اسی کو دیکھکر آپ کے خیال و اعتقاد پر حکم لگایا جائیگا۔ زمانہ کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ آپ کی دینی و اخلاقی گتھیاں بیٹھکر سلجھایا کرے، اور آپ کی مذہبی تعلیمات پر تنقید کرے، وہ تو صرف آپ کو اور آپکی زندگی کو دیکھے گا اور آپ کی ساری قوم اور اپکی تمام تعلیمات مذہب پر اسی کے مطابق حکم لگا کر صحیح و غیر صحیح ہونے کا فیصلہ کر لیگا۔۔۔

پھر آئیے تھوڑی دیر کے لئے ہم خود بھی غور کریں کہ ہماری حالت کیا ہے؟

اسوقت گفتگو نہ سیاسی اہمیت سے ہے نہ ترقی علم و دولت سے بلکہ ہیئت اجتماعیہ کے اس اساسی و ابتدائی مسئلہ سے جس کو خدائے پاک نے "حبل اللہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ پھر یقیناً خدا کی یہ رسی کوئی لوہے کی رسی نہیں ہے، فولاد کی زنجیر نہیں ہے، بلکہ اس رشتہ اخوت کی زنجیر ہے جس سے تمام نوع انسانی کو وابستہ کیا گیا ہے اور جسے فولاد و آہن سے کہیں زیادہ مستحکم ہونا چاہئے۔ مگر نوع انسانی کا تو خیر کیا ذکر ہے، یہاں تو اس جماعت کے افراد بھی اس سے وابستہ نہیں جن میں جماعت کا مفہوم ہی اس "حبل اللہ" کے اعتقاد نے پیدا کیا تھا۔ پھر کوئی بتلائے کہ کیا شیعہ سنیوں کا افتراق اسی ایک جماعت کے افراد کا افتراق نہیں ہے۔

میں نے ان دونوں جماعتوں کے اختلات ونزاع پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا ہے، کبھی اپنے آپ کو سنی سمجھکر حالات کا مطالعہ کیا، کبھی شیعہ بنکر واقعات پر نگاہ ڈالی، کسی وقت ایک شخص ثالث کی حیثیت سے اس کو سمجھنا چاہا، لیکن آپ باور کیجئے کہ ان کے اختلات کا حقیقی سبب سوائے ان کی حماقتوں کے اور کچھ نظر نہ آیا ـــــ سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو دونوں فریق کے نزدیک "استخوان جنگ" بنا ہوا ہے بعض خلفا و صحابہ سے متعلق ہے۔ لیکن میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ اس کا تعلق دین اسلام سے کیا ہے اور اسپر جنگ وخونریزی ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی کے باپ کے پاس مختلف حضرات آتے ہیں اور وہ ان سب سے دوستی کا سا برتاؤ کرتا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کے دو بیٹوں میں یہ بحث آن پڑتی ہے کہ باپ کے پاس آنے والوں میں سے کون شخص سچا دوست تھا اور کون نہیں، ایک کہتا ہے سب وفادار دوست تھے، دوسرا کہتا ہے نہیں بعض مخلص تھے اور بعض غیر مخلص۔ وہ بھی اپنے دلائل پیش کرتا ہے اور یہ بھی یہاں تک تو خیر کوئی حرج نہیں لیکن اگر اختلات نگاہ وحجت، ایسی صورت اختیار کرے کہ دونوں بھائیوں میں سے ہر ایک دوسرے کے خون کا پیاسہ ہوجائے تو اسکو سوائے حماقت کے اور کیا کہیں گے۔ اول تو یہ پوچھئے کہ اس وقت جبکہ نہ باپ زندہ ہے نہ اس کے پاس کے بیٹھنے والے احباب، اس بحث کی ضرورت ہوئی اور اگر ضرورت مان لیجائے تو بھی اس گفتگو کا اس حد تک بڑھ جانا کہ دو بھائی ایک دوسرے پر تلوار کھینچکر جان لینے کے لئے آمادہ ہوجائیں، سوائے حماقت کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ اعتقاد کے لحاظ سے اسلام نام ہے صرف خدا کی وحدانیت اور رسالت رسول کے اقرار کا، سو اس میں شیعہ سنی دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اگر حضرات شیعہ بعض خلفا و صحابہ کو اچھا نہیں سمجھتے تو ظاہر ہے کہ اسکے کچھ اسباب و دلائل بھی ان کے پاس ہونگے، اس لئے اس مسئلہ کا تعلق صرف تاریخ وتحقیق تاریخی سے ہونا چاہئے نہ کہ مذہب سے یعنی ہمکو تاریخ کے صفحات میں جستجو کرنا چاہئے کہ وہ اسباب جو بیان کئے جاتے ہیں واقعی صحیح ہیں یا نہیں، اگر کسی کے نزدیک صحیح ہیں تو اسکو ایک تاریخی حقیقت کی صورت سے پیش کرکے خاموش ہوجانا چاہئے، برا بھلا کہنے یا گالیاں دینے سے کوئی فائدہ نہیں اور اگر کسی کے نزدیک غلط ہیں تو ان پر تنقید کرکے علحدہ ہوجانا چاہئے اور اس جستجو میں نہ پڑنا چاہئے کہ کوئی اپنے گھر میں کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

آج میں پوچھتا ہوں کہ کیا تمام شیعہ حضرات اپنی تاریخی کتب کو متفقہ طور پر صحیح تسلیم کرتے ہیں، یا اہل تسنن بغیر کسی اختلات باہمی کے تمام روایات کو منقح و درست باور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کرنا بالکل خلاف واقعہ ہے، شیعہ سنیوں کی تاریخی کتابوں میں ہم کثرت سے اختلات پاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح خود شیعہ علماء ومورخین بہت سے تاریخی واقعات پر مختلف رائیں رکھتے ہیں اسی طرح سنی علماء بھی باہمدگر متفق نہیں۔ پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جب اور تاریخی واقعات پر اختلات ہونے کی وجہ سے آپس میں نزاع نہیں ہوتی تو خاص صحابہ کے مسئلہ پر کیوں یہ جنگ کیجاتی ہے اور کیوں ایک دوسرے سے اس قدر علحدہ ہوجاتے ہیں کہ ایک کا مذہب ہی امامیہ یا شیعہ کہلانے لگتا ہے اور دوسرے کا حنفی یا سنی۔ اسپر جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلات کا سبب محض اختلات تاریخی نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے جس کی بنیاد آج نہیں بلکہ اسی وقت پڑچکی تھی جب رسول اللہ بقید حیات تھے اور اسلام ایک جیتا جاگتا مذہب تھا۔

جب کوئی پیغمبر رونما ہوتا ہے تو وہ ایک خاص خیال کے ماتحت اصول اصلاح و تبلیغ کو متعین کر لیتا ہے جو نتیجہ ہوا کرتے ہیں وقت ماحول کا اور ان خاص خاص واقعات کا جو اس زمانہ میں رونما ہوئے۔ اسی کو ایک مذہب کی سائیکالوجی کہتے ہیں اور یہیں سے اس کے مستقبل پر حکم لگایا جا سکتا ہے، مثلاً آپ ہندو مذہب کو لے لیجئے اور اسکی سائکالوجی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ مزارعین و فلاحین کا مذہب ہے اور اسی لئے اب تک اس کے متبعین کے معاشرت و زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ایک خاص قسم کی نباتیت پائی جاتی ہے۔ عیسوی مذہب کی ابتدا ایک مظلومانہ صبر و استقلال سے ہوئی اور اس کیفیت کے بعد جو عزم راسخ ایک قوم میں پیدا ہو جاتا ہے وہ سعوت بھی عیسوی جماعت میں پوری طرح نظر آتا ہے۔ دین موسوی دنیوی برکات کے لئے برسر پیکار ہو کر نمودار ہوا اور آخر کار اس کے مقلدین میں وہ رذل پیدا ہوا جو دنیا پرست لوگوں میں قدرتاً پیدا ہو جانا چاہئے۔ اسلام "انتم الاعلون" کا آوازہ بلند کرتا ہوا نمودار ہوا اور اس نے پاکیزگی اخلاق کے ساتھ دنیاوی سربلندی کو بھی پیش نظر رکھا، پھر چونکہ فطرت انسانی تعیش پسند و جاہ طلب واقع ہوئی ہے اس لئے عہد سعادت کے بعد ہی دونوں کا توازن مفقود ہونے لگا اور خلافت راشدہ ہی میں دو مخالف فریق پیدا ہو کر طلب جاہ و حکومت کی کشمکش کے مناظر سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک فریق کامیاب ہو گیا جسے آج کل کی اصطلاح میں سنی کہتے ہیں اور دوسرا ناکام رہا جسے شیعہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علویین کی جماعت اول اول صرف جذبۂ محبت کے ماتحت وجود میں آئی، کیونکہ وہ شخص جو رسول اللہ سے محبت کریگا، اُس کا آل رسول و اہلبیت سے محبت کرنا ناگزیر ہے، اور یہ فطرت انسانی ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے اسی کو برسر عروج و اقتدار دیکھنے کی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے، لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ رحلت نبوی کے بعد خلافت کا مسئلہ جن لوگوں نے جس طرح طے کیا اس میں محبت کی رعایت تو یقیناً نہیں تھی، لیکن مصلحت و ضرورت کی رعایت ضرور تھی، لیکن اب یہ فیصلہ کرنا کہ خلافت کا مسئلہ بربنائے اصول محبت طے ہونا چاہئے تھا یا بربنائے مصلحت ازبس دشوار ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو رسول اللہ و آل رسول سے محبت کرنے والے تھے بعد کو انکی اولاد کے سامنے بھی سوال محبت کا نہیں رہا بلکہ وہی جاہ و ثروت کا رہ گیا تھا اور جنھوں نے اول دن مصلحت و ضرورت کو سامنے رکھکر خلافت کے مسئلہ کو طے کیا تھا انکی نسل میں تو خیر کوئی رعایت محبت و الفت کی ہو ہی نہ سکتی تھی مگر "مصلحت و ضرورت" کی اہمیت بھی اُن کے سامنے باقی نہ رہی۔ اختلافات بڑھتے گئے، مناقشات سنگین ہوتے گئے، دل کی کدورتیں زبانوں پر آنے لگیں، طبیعتوں کی برہمی نے تیغوں کو بے نیام کرنا شروع کیا اور "محبت و مصلحت" کی نزاع آخر کار صرف دنیاوی، ملکی اور سیاسی نزاع ہو کر رہ گئی۔ نہ رسول اور آل رسول سے محبت کرنے والے رہ گئے، نہ دیانت و امانت کے ساتھ مصلحت پر غور کرنے والے باقی رہے اور کھلم کھلا سلطنت و دولت اور جاہ و ثروت کے لئے دونوں جماعتیں میدان میں اتر آئیں۔ پھر دیکھو کہ اس کے بعد کیا ہوا، تاریخ کے صفحات ہر شخص کے سامنے کھلے ہوئے ہیں اور معمولی فہم کا انسان بھی آسانی سے ان کو پڑھکر سمجھ سکتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جو زمانہ امیر معاویہ کی حکومت سے شروع ہوتا ہے کیا اس کو کسی طرح رسول و آل رسول کی محبت سے متعلق کر سکتے ہیں اور کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ اس میں سوائے کسب دولت و ثروت اور حصول جاہ و مرتبت کے کوئی اور اسلامی مصلحت یا ضرورت

جذبہ کام کر رہا تھا۔ اگر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد روح معہ اپنے احساسات کے قائم رہتی ہے، اگر اہل اسلام کا یہ ایمان ہے
کہ رسول اللہ عالم روحانی میں اب بھی رسول اللہ ہیں تو خدا کے لئے بتاؤ قاتل حسین سے ان کی رضامندی کی صورت کیا
ہو سکتی ہے اور وہ کیونکر امیر معاویہ کو معاف کر سکتے ہیں کہ انھوں نے حسین کے ہوتے ہوئے جان بوجھ کر اپنے فاسق و بادہ خوار بیٹے یزید کو
خلیفہ مقرر کیا اور نہ صرف خلیفہ مقرر کیا بلکہ اس کی خلافت کی تکمیل میں ہر اس ترکیب و تدبیر سے کام لیا جو ہماری سلطنت کے استحکام
کے لئے سیاسیات کی دنیا میں اختیار کی جا سکتی ہو۔ آج سنیوں کو شکایت ہے کہ حضرات شیعہ صحابہ و خلفاء کو بُرا کہتے ہیں، لیکن کیا کبھی اُن
خلفائے بنی اُمیہ و بنی عباس کے کارناموں پر بھی غور کیا ہے جنھوں نے علی الاعلان مسجدوں کے محراب و منبر پر علی کو گالیاں دیں اور دلوائیں
یقیناً میں نہایت کراہت کے ساتھ دیکھتا ہوں کہ حضرات شیعہ صحابہ میں سے کسی کو بُرا کہیں لیکن بالکل اسی طرح جس طرح میں "سب علی" کو
بُرا سمجھتا ہوں۔ پھر اگر یہ نزاعات و اختلافات محض تاریخی حیثیت رکھتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا، کیونکہ اسلامی حکومت و خلافت
کے ساتھ یہ قصہ بھی ختم ہو جاتا، لیکن مصیبت یہ آ پڑی کہ بجائے تاریخی اختلاف کے یہ مذہبی اختلاف ہو گیا اور اگر ایک طرف حضرات شیعہ نے
"سب صحابہ" ایسے مکروہ و لایعنی فعل کو داخل مذہب کر لیا تو دوسری طرف سنیوں نے اس قدر عصبیت سے کام لیا کہ "لعن یزید" کو بھی
جائز قرار دیکر فقہ و اصول فقہ میں شامل کرنے سے احتراز نہ کیا۔ حالانکہ کوئی اُن سے پوچھے کہ اس مسئلہ کا فقہ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے
اور دوسرے یہ کہ اگر "لعن یزید" اس دلیل کی بنا پر ناجائز قرار دیا جاتا ہے کہ ممکن ہے خدا نے اسے بخش دیا ہو تو کیا کسی شخص کا
یزید پر لعن کرنا "قتل حسین" سے زیادہ شدید معصیت ہے جس کو خدا معاف نہیں کر سکتا ـــــ الغرض آپ سنی شیعہ کے تمام ان اختلافات
پر غور دیکھئے جن کو داخل مذہب کر لیا گیا ہے اور پھر انصاف کیجئے کہ انکا تعلق مذہب اسلام سے کتنا ہے میں دعوے کے ساتھ کہہ
سکتا ہوں کہ ایک اختلاف بھی ایسا نہیں نکلے گا جو اصول سے واسطہ رکھتا ہو بلکہ سب کے سب تاریخ سے متعلق ہوں گے جو سیاسی
مصالح کی بناء پر کسی وقت قصداً پیدا کئے گئے تھے اور اب ہم لوگوں کی حماقت سے وہ داخل دین و مذہب سمجھے جانے لگے ہیں

یقیناً تعزیہ داری اور مجالس عزا میں ایسی روایات کا پڑھنا جو اہل بیت کی سیرت کو بجائے بلند دکھانے کے پست ثابت کرنے والی
ہیں کسی کے نزدیک اچھا فعل نہیں قرار دیا جا سکتا، لیکن اسی کے ساتھ سنی جماعت اپنی قبر پرستی اور ان کتب مواعظ کی کیونکر پردہ
پوشی کر سکتی ہے جن میں خود رسول کی ذات گرامی کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے دونوں جماعتیں یکساں طور پر قابل ملامت ہیں لیکن سب سے زیادہ قابل ملامت ان جماعتوں کے
وہ قاید و رہنما ہیں جو ان کے جاہلانہ عقاید اور وحشیانہ اعتقادات کو بجائے دل سے نکالنے کے اور زیادہ مستحکم کرتے رہتے ہیں۔ کیا میں
حضرات شیعہ کے علماء و مجتہدین سے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ کبھی انھوں نے اپنی مجالس میں یہ تلقین بھی کی ہے کہ حسین کی محبت
کا اقتضاء ان کی سی صداقت پرستی اختیار کرنا ہے اور سوائے رونے رُلانے والی حکایات و روایات کے جن میں بہت
کم حصہ راستی و صداقت کا ہوتا ہے کبھی اُنھوں نے کسی ایسی تنظیم کی عملی کوشش کی ہے جو براہ راست لوگوں کے اخلاق کو
متاثر کرنے والی ہو۔ اسی طرح کیا میں سنی علماء و واعظین سے یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ اُنھوں نے ایام محرم میں کبھی

برادران شیعہ کے مذہبی جذبات کا احترام کرکے اُن کی سوگواریوں یا مجالس عزا میں شرکت گوارا کی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں کے علما ہی آپس میں نہیں ملنا چاہتے اور چاہ بھی کیونکر سکتے ہیں جبکہ ان کے تمام دنیاوی جاہ و جلال، عظمت و وقار کی بنیاد ہی تفرقہ پردازی اور جاہلوں کو ہمیشہ جاہل و متعصب بنائے رکھنے کے اصول پر قائم ہوتی ہے —— معاشرت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب تک دو فریق باہم رواداری سے کام نہ لیں گے کبھی ان کے اختلافات نہیں مٹ سکتے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے ہمارے یہاں کے علما کو بیر ہے۔ وہ مناظرہ کے لئے ہر وقت طیار ہیں مذہبی مجادلہ کے لئے اپنی جماعتوں کو مشتعل کرنے کے لئے ہمیشہ آمادہ ہیں، لیکن اگر ان سے کہئے کہ قبلہ کوئی صورت باہم مل کر بیٹھ جانے کی بھی ہے یا نہیں تو وہ کہدیں گے کہ اس کا تو امکان نہیں کیونکہ ایک کے نزدیک صحابہ کو بُرا سمجھنا قرآن و خدا کو بُرا سمجھنا ہے اور دوسرے کے نزدیک صحابہ کو اچھا کہنا رسول و آل رسول کی توہین —— اس وقت ہندوستان جس نازک دور سے گزر رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور سیاسیات نے جیسی پیچیدگیاں اختیار کرلی ہیں وہ بھی سب کو معلوم ہیں پھر کیا اب بھی ہم ماضی کی روایات پارینہ پر برابر لڑتے رہیں گے اور کیا ہم کو اس وقت تک ہوش نہ آئے گا جب تک دوسری قومیں ہمارے مستقبل پر مہر لگا کر ہماری موجودہ غلامانہ ذہنیت پر ہم کو مستقلاً قائم نہ کردیں۔ سو گھبرائیے نہیں، وہ دن قریب ہے جب یہ بھی ہو کر رہیگا۔ اور آپ کے یہ لغو و دور از کار مذہبی توہمات آپ کو ایک ایک ٹکڑے کا محتاج بنا کر رکھدیں گے۔ اس وقت مولوی عبدالشکور کو معلوم ہوگا کہ ان کے زہریلے مواعظ نے دنیا میں کیا کیا اور "قبلہ و کعبہ" جونلیں گے کہ ان کی ماتمداریوں و عزاداریوں کا نتیجہ کیا نکلا۔ فہل من مدکر!

امسال شمالی ہند میں گرمی کا وہ عالم رہا کہ آخرکار مجھے بھی چند دن کے لئے اُسے خیرباد کہنا ہی پڑا۔ میں ۲۰ جولائی سے حیدرآباد میں مقیم ہوں اور ایسا محسوس کرتا ہوں کہ شمال سے دکن نہیں، بلکہ جہنم سے دفعتہً فردوس چلا آیا ہوں۔ یہاں کا موسم اس زمانہ میں پہاڑوں سے بھی بہتر ہوتا ہے اور ابر آلود فضا میں ہر وقت سرد ہوا اُس کا چلتے رہنا غالب کا یہ شعر زبان پر لے آتا ہے کہ:—

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

یہ رسالہ میری غیر حاضری میں چھپ رہا ہے اور میری واپسی سے قبل ہی شائع ہوگا، اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ وقت کی پابندی قائم رہ سکے گی یا نہیں، بہرحال جہاں تک ہدایت و تنبیہ کا تعلق ہے اس میں کمی نہیں کرونگا، ماننا نہ ماننا دفتر والوں کا کام ہے جن سے میں اس وقت سیکڑوں میل دور ہوں اور جن کو قدرتاً "سیلی استاد" سے بے خوف رہنا چاہئے۔

نیاز

ہندوستان کا فن نقاشی

(افادات پرسی براون)

تمہید اب سے نصف صدی قبل متفقہ طور پر تمام اہل مغرب نے یہ رائے قائم کرلی تھی کہ ہندوستان میں کبھی کوئی ایسا فن رونما نہیں ہوا جسے صحیح معنے میں نقاشی کہا جاسکے۔ ہندوستانی فنون پر جو چند کتابیں اس سے قبل شائع ہو چکی تھیں ان کے مصنفین نے تو صاف طور پر لکھدیا تھا کہ ہندوستان کا فن مصوری اس قدر پست ہے کہ اس پر لحاظ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستان سے جو نقوش مغرب کے عجائب خانوں میں پہونچے وہ حقیقتاً نہایت ہی معمولی تھے اور انھیں کو دیکھ کر ہندوستانی نقاشی پر رائے قائم کی گئی، درانحالیکہ ان معمولی نقوش کو یہاں کے فن نقاشی سے کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ وہ بازار کی نہایت ہی معمولی چیزیں تھیں جن کو فن سے کوئی واسطہ نہ ہوسکتا تھا، پھر یہی نہیں ہوا بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ستم ظریفی کی گئی کہ اکثر ہندوستانی نقوش کو چینی نقوش سمجھا گیا اور اگر کوئی تصویر قابل اعتنا نظر آئی بھی تو اس کا امتیاز چین کو دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل مغرب کے نزدیک وہی چیز فن سے متعلق سمجھی جاتی ہے جو مغربی نقطۂ نظر کے معیار پر پوری اترے، اگر کوئی تصویر یا مجسمہ ان کے اصول کے مطابق نظر آیا تو خیر ورنہ اسے تو نوادر شرقیہ میں شمار کرکے فن سے بالکل علحدہ کردیا سب سے پہلے اس خیال میں تبدیلی اُس وقت پیدا ہوئی جب اہل مغرب نے جاپانی فن کو جمالیاتی لحاظ سے پسند کیا اور اس کے بعد فنون لطیفہ کے متعلق جو علمی اصول قائم کئے گئے تھے ان میں بتدریج ترمیم ہونے لگی یہاں تک کہ فنون لطیفہ میں مشرق کو بھی ایک ممتاز درجہ دیا گیا اور اس طرح ہندوستانی نقوش کو بھی مخصوص نگاہ سے دیکھا جانے لگا اس سے قبل یورپ کے نزدیک وہی تصویر تصویر کہی جاسکتی تھی جو کاغذ کے بجائے کرپچ پر ہو اور اس کا فریم طلائی ہو مگر یہ قید رفتہ رفتہ دور ہوگئی اور اس کے دور ہوتے ہی ہندوستان میں عہد بودھ کے نقش و نگار، اور عہد مغلیہ کے ہاتھی دانت وغیرہ پر چھوٹے چھوٹے نقوش بھی فن نقاشی کے کارنامے شمار کئے جانے لگے۔

اگرچہ مشرق و مغرب کے ذوق میں بڑا فرق پایا جاتا ہے اور دونوں کبھی کسی ایک مرکز پر جمع نہیں ہوسکتے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جمالیاتی دنیا میں دونوں بڑی حد تک متفق ہوتے جاتے ہیں اور اگر اب کوئی فرق باقی رہگیا ہے تو صرف یہ کہ دونوں کی آنکھوں پر عینکیں مختلف ہیں اور دونوں کی ذہنیت مطالعہ جدا جدا ہے۔ مشرقی آدمی پہلے فلسفی اور اس کے بعد آرٹسٹ ہوتا ہے، لیکن مغرب والا پہلے آرٹسٹ اور اس کے بعد فلسفی ہوتا ہے اصولی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو مشرق و

مغرب کے فنون میں کوئی صحیح تقابل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ دونوں کی ابتدا مختلف اصول سے ہوتی ہے اور دونوں کی منزل مقصود بھی جداگانہ ہے

مغربی نقاش کے نقش میں "سطحی" اثر زیادہ ہوتا ہے اور وہ ایک شکل کو دوسری شکل سے ملا کر دونوں کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے ذریعہ سے فوراً دل پر اثر کرتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ مغربی نقاشی میں حدبندی کے خطوط کا فقدان ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک مشرقی نقاش صاف اور واضح خطوط کے ذریعہ سے اعضاء تصویر کی حدبندی کرتا ہے اس لئے خطوط کی صفائی اور تناسب کے لحاظ سے مشرق کے نقاش کو زبردست فوقیت حاصل ہے۔

مغربی موسیقی کی طرح مغربی فن نقاشی میں بھی اجتماعیت زیادہ ہے۔ یعنی مغربی نقاش اپنی تصویر اس مقصد سے بناتا ہے کہ اسے دیکھ کر آدمیوں کی بڑی تعداد لطف حاصل کرے۔ برعکس اس کے ہندوستان کی نقاشی میں (بدھ مت والوں کے نقوش دیوار کو چھوڑ کر) انفرادیت غالب ہے۔ جس کا لطف صرف ایک یا دو شخص حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے فن موسیقی میں بھی یہی "انفرادی" کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔ ہندوستانی نقاشی کی تقسیم حقیقتاً یہاں کے ان تین بڑے بڑے مذاہب سے تعلق ہے جنھیں بدھ مت، ہندویت اور اسلام کہتے ہیں۔ ہندو مذہب والوں کی نقاشی کو عموماً "راجپوت قلم" کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کا تعلق زیادہ تر راجپوتانہ اور پنجاب کے پہاڑی راجپوتوں سے رہا ہے۔ فن اسلامی درحقیقت مغلوں کا فن نقاشی ہے، کیونکہ سلاطین مغلیہ نے بھی اس فن کی حوصلہ افزائی کر کے اس کو ترقی دی اور انھیں کے عہد کے ساتھ یہ فن بھی ختم ہو گیا۔ بودھی اور راجپوت نقاشی درحقیقت علامات و رموز پر مبنی تھا اور اسکے ذریعہ سے ہندوستان کی روحانی زندگی کا کنایتہً اظہار کیا جاتا تھا۔ ان دونوں قسم کی نقاشیوں کا انداز بالکل مذہبی تھا۔ اور ان کی نمایاں خصوصیت فلسفہ دینیات سے متاثر ہوتا تھا برعکس اس کے عہد مغلیہ کا فن نقاشی خالص دنیوی رنگ میں رنگا ہوا تھا اور اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ مبنی بر واقعات ہوتا تھا۔

بودھی نقاشی کا مقصد یہ تھا کہ تعلیمات مذہبی کا اظہار بذریعہ حکایات و روایات کیا جائے۔ راجپوت قلم کا مطمح نظر بھی اسی قدر بلند تھا بلکہ اس کا میدان عمل اور زیادہ وسعت رکھتا تھا یعنی —— مذہبی ڈراموں کے پر اثر اور دلچسپ مناظر دکھانے کے علاوہ عوام کی اہلی یا خانگی زندگی کی طرف بھی متوجہ ہوتا تھا اور ان کے عقائد و رسوم نہایت واضح طور پر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ چھوٹی چھوٹی تصاویر بنانے کا فن وجود میں آ گیا۔ اور یہی فن ہندوستان کی نمایاں خصوصیات میں داخل ہے۔

عہد مغلیہ کی نقاشی میں اگرچہ خصوصیات فن وہی ہیں جو راجپوت قلم میں پائی جاتی ہیں لیکن دونوں کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے۔ مغلیہ کے نقاشی مقاصد میں کوئی مذہبی یا روحانی پہلو نہیں پایا جاتا۔ بلکہ صرف وہ واقعات کو پیش نظر

کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی لئے صورت کشی میں اس کو کمال حاصل تھا۔ اور کبھی کبھی کوئی ماہر فن واقعات سطحی سے تجاوز کر کے غیر شعوری طور پر جذبات وحسیات تک بھی پہونچ جاتا تھا۔ انفرادی طور پر نقاشانِ ہند کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ لیکن بُدھ مت رکھنے والے ماہرینِ فن کے بارہ میں یہ رائے قائم کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ وہ ایک ہی وقت میں پجاری اور نقاش دونوں ہوتے تھے۔ اور جب کوئی بت یا مذہبی عمارت طیار کی جاتی تھی تو اس کی نقاشی یا سنگتراشی کے لئے مشہور ادارت مذہبی سے ماہرینِ فن طلب کر لئے جاتے تھے اور جب تک کام ختم نہیں ہوتا تھا یہ لوگ خانقاہ کے اندر پوجاریوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ سنگتراش اور نقاش دونوں ایک ہی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور بعض اوقات دونوں کا ماہر ایک ہی شخص ہوتا تھا۔ ایک کام ختم ہونے کے بعد یا تو یہ لوگ اپنی مرکزی خانقاہ کو واپس چلے جاتے تھے یا کسی دوسری عمارت میں پہونچکر وہی خدمت انجام دینے لگتے تھے۔

برعکس اس کے راجپوتی قلم کا نقاش جمہور کا ممبر ہوتا تھا، اور اس کا تعلق نقاشوں یا مصوروں کی برادری سے ہوتا تھا۔ یعنی دیگر اہل فن یا کاریگروں کی طرح وہ بھی ذات پات کی زنجیروں سے بندھا ہوتا تھا یعنی جس طرح ایک گاؤں میں لوہار، بڑھئی، سنگتراش یا جلاہے اپنی اپنی برادری یا جماعتوں میں رہتے ہیں اسی طرح نقاشوں کی ایک برادری تھی اور یہ لوگ گاؤں والوں کے مکانات یا مقامی راجہ کے محلات کی تزئین کیا کرتے تھے۔ جب وہ کسی ایسے کام کی انجام دہی میں مصروف نہیں ہوتے تھے تو وہ ایسی تصاویر اور مناظر تیار کرتے تھے جو قدیم مذہبی روایات پر مبنی ہوتے تھے۔ اور یہی خصوصیت راجپوتی نقاشی کا طرۂ امتیاز تھا۔

نقاشانِ مغلیہ کی زندگی اس سے مختلف فضا میں بسر ہوتی تھی۔ مغلئی نقاش کسی بادشاہ یا رئیس کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوتا تھا اور ایک طرح درباری کا درجہ رکھتا تھا۔ اگرچہ ایسے نقاشوں کی کوئی تنخواہ نہیں ہوتی تھی لیکن جب کبھی وہ کوئی عمدہ اور قابلِ تعریف کام تیار کرتا تھا تو اسے معقول انعام واکرام سے سرفراز کیا جاتا تھا۔

مغرب کی طرح ہندوستانی تصاویر پر نقاش کے دستخط نہیں ہوتے تھے۔ خصوصاً بودھی اور راجپوتی فن کی تصاویر پر تو کوئی مصور کا نام نہ ہوتا تھا۔ مغلئی فن کی بھی بہت کم تصویریں ایسی ہیں جن پر ماہر فن کے دستخط پائے جاتے ہوں۔ اس لئے ہم تک صرف چند نقاشوں کے نام پہونچے ہیں۔ "آئین اکبری" میں بیشک بعض نقاشوں کے مختصر حالات درج ہیں ورنہ دیگر ماہرینِ فن کا حال بہت ہی کم ہم کو معلوم ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ پہلا ہندوستانی نقاش جس کا نام کتابوں میں پایا گیا ہے وہ ایک عورت ہے۔ کتاب دوارکالیلا میں جو کئی صدی قبل مسیح کی تصنیف ہے ایک عورت چترالیکھا نامی کا ذکر پایا جاتا ہے جو فن نقاشی کی بڑی ماہر تھی۔ اس کے بعد سترہویں صدی تک کسی ماہر فن کا نام کسی کتاب میں نہیں دیکھا گیا۔ سترہویں صدی میں تارا ناتھ مورخ نے بیشک نقاشوں کی ایک چھوٹی سی جماعت

کا ذکر کیا ہے جو خاص طور پر بدھ مت کی نقاشی سے تعلق رکھتی تھی۔ مورخ مذکور کے درج کردہ حالات سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مختلف فنوں کے ماہر تھے۔ اور سنگتراشی و نقاشی دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ ملک چین کی تحریروں میں بعض بودھی نقاشوں کے نام پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ قدیم لوگ تھے جو ہندوستان سے ترک وطن کر گئے تھے۔ ان لوگوں کے کاموں کا بھی کچھ حال لکھا ہے لیکن اس کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر چینی فن کا رنگ غالب ہو گیا تھا۔ اس لئے ہم ان کو نقاشان ہند میں داخل نہیں سمجھتے

باستثنا ء چند ماہرین فن کے جو پنجاب کی پہاڑی ریاستوں سے تعلق رکھتے تھے راجپوتی فن کے ماہرین بھی گمنام ہیں۔ کتاب آئین اکبری میں بیشک مغلئی ماہرین فن کا نہایت ہی مختصر حال لکھا ہے جن سے اس عہد کے نقاشوں پر فرداً فرداً کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب شہنشاہ اکبر اعظم کے زمانہ کی لکھی ہوئی ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ماہرین فن کو نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا خواہ وہ کسی طبقہ سے متعلق ہوں چنانچہ دربار اکبری کے مشہور نقاش دسونت اور کیشو توم کے کہار تھے

ماہرین فن نے ہندی نقاشی کی تقسیم جغرافی حدود اور کسی قدر خصوصیات فن کے لحاظ سے کی ہے اور اصطلاح میں مختلف شاخوں کے لئے لفظ "قلم" استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ سب قلم آپس میں اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ ان میں تفریق بہت دشوار ہے۔ فن راجپوتی کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ جے پور قلم اور کانگڑہ قلم۔ مگر مغلئی قلم کی اقسام متعدد ہیں۔ مثلاً دہلوی قلم، لکھنوی قلم۔ دکھنی قلم۔ ایرانی قلم۔ کشمیری قلم۔ پٹنوی قلم۔

فن ہندی قبل مسیح

ہندوستانی نقاشی کے متعلق زمانۂ قبل تاریخ کی شہادتیں بہت کم دستیاب ہوئی ہیں لیکن جو معدودے چند باقیات الصالحات اس سلسلہ میں دستیاب ہوئے ہیں وہ قدرتاً نہایت دلچسپ ہیں۔ مثلاً متوسط ہند کے کوہستان کیمور میں بعض پہاڑی غار ایسے ہیں جہاں زمانۂ قبل تاریخ کے استادان فن نے موٹے موٹے اور بھدے نقوش کے ذریعہ سے دیواروں پر شکارگاہ کے مناظر کھینچے ہیں اور عہد حجری کے بھی بعض آثار تصویری کوہستان بندھیاچل میں دستیاب ہوئے ہیں۔ ممالک متوسط کی ریاست رائے گڈھ کی پہاڑیوں میں موضع سنگھن پور کے قریب دریائے مانڈ سے جانب مشرق تھوڑے فاصلہ پر سے بھی اہم آثار دریافت ہوئے ہیں ان پہاڑیوں میں غاروں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے جن کے سامنے ریتلی چٹان کی سطح پر بہت ہی بھدی تصویریں سرخ رنگ کی کھینچی ہوئی ہیں۔ ان تصاویر سے شکارگاہ کا منظر دکھایا گیا ہے جس میں چند آدمی ایک عظیم الجثہ بھینسے کو شکار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چند آدمیوں کو بھینسے نے سینگوں پر اٹھا کر معلق پھینک دیا ہے اور بعض سینگوں کی ضرب سے لہولہان ہو گئے ہیں۔ اسی دیوار پر ایک اور منظر شکارگاہ ہے جس میں ایک بھینسا بھالوں سے زخمی دم توڑتے دکھایا گیا ہے اور اس کے چاروں طرف شکاری کھڑے ہوئے خوش ہو رہے ہیں' ان چٹانوں کے پاس زمین سے

بعض ایسے اوزار برآمد ہوئے ہیں جن کے دیکھنے سے ان نقوش کی عمر اور قدامت کا پتہ چلتا ہے ضلع مرزا پور کے کوہستانی غاروں میں بھی بہت سے دلچسپ نقوش پائے جاتے ہیں جنہیں نسکار کا منظر نہایت تکمیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہسپانیہ کے مقام قومل میں جو کئی ہزار سال پیشتر کے نقوش پائے جاتے ہیں ان سے یہ مرزا پوری نقوش بیحد مشابہ ہیں۔ اسی طرح کے قدیم اور تاریخی آثار تصویری جو ہندوستان میں دستیاب ہو چکے ہیں وہ ہیں جو ممالک متوسط کی ایک دور افتادہ چھوٹی سی ریاست سرگوجہ کے کوہستان رام گڈھ میں جوگی مارا غار کی دیواروں پر نظر آتے ہیں۔ یہ تصویریں غالباً پہلی صدی مسیح سے قبل کی ہیں۔

سرسری نظر سے دیکھنے پر یہ تصویریں سرخ وسیاہ رنگ کے بے ربط نقوش معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب ان نقوش کو غور سے دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقوش اولیں نہیں ہیں۔ بلکہ نقوش ثانی ہیں جو رنگوں کے ذریعہ سے مٹ جانے کے بعد روشن کئے گئے ہیں۔ ان تصاویر میں مختلف مناظر پائے جاتے ہیں۔ کہیں جانوروں کی تصویریں ہیں تو کسی جگہ آدمیوں اور عمارتوں کی حوضوں کی جدول مچھلیوں اور دیگر جانوران آبی کی زنجیروں سے بنائی گئی ہے۔ لیکن ابھی تک وہ پورا قصہ نہیں معلوم ہو سکا جس کے اظہار کے لئے یہ نقوش بنائے گئے تھے۔

گمان غالب ہے کہ قدیم بودھی زمانہ کی سنگین عمارتوں کی تزئین بھی اسی طرح نقوش کے ذریعہ سے کی جاتی ہوگی مگر ہندوستان کی تباہ کن آب وہوا نے ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے۔ اسی طرح عہد قدیم کی خام اور چوبیں عمارتیں بھی مٹ گئی ہیں اور اسی لئے اس زمانہ کے آثار زیادہ تعداد میں دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

بہرحال عہد قدیم کے ان نقوش کو دیکھنے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ فن نقاشی نے اس زمانہ میں چنداں ترقی نہیں کی تھی۔ لیکن ان کے علاوہ بعض ایسی مستند تحریریں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سن عیسوی سے صدیوں پیشتر یہاں کا فن نقاشی جمالیاتی لحاظ سے بہت ترقی یافتہ تھا۔

ہندوستان میں فن نقاشی کی ابتدا کا ذکر ایک بہت دلچسپ قدیم روایت میں کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک برہمن کا لڑکا مر گیا تھا، برہمن نے راجہ کے دربار میں جاکر فریاد کی راجہ نے جمراج یعنی پاتال کے راجہ سے لڑکے کو زندہ کر دینے کی درخواست کی جو منظور نہ ہوئی۔ راجہ نے مجبور ہو کر برہما سے رجوع کیا۔ برہماجی نے خوش ہو کر راجہ سے کہا کہ وہ اس لڑکے کی ایک تصویر بنائے اور ایک خاص منتر پڑھ کر اس تصویر پر دم کرے تو وہ تصویر زندہ ہو جائیگی۔

واضح ہو کہ مشرقی مورخین کی خصوصیات میں یہ امر داخل ہے کہ وہ چیزوں اور واقعات کی ابتدا راجاؤں اور دیوتاؤں کے ناموں سے کرتے ہیں۔ لیکن اس روایت میں بہت ممکن ہے کہ برہما کے بجائے تصویر کو زندہ کرنے والا دیوتا علوم وفنون کا دیوتا وشواکرم ہو۔ علاوہ اس روایت کے اور بھی تحریری ثبوت اس امر کے موجود ہیں کہ ہندوستان

میں فن نقاشی بہت قدیم زمانہ میں موجود تھا، اور راجگان ہند بھی اس سے دلچسپی لیتے تھے۔

اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ اور بھی ہے۔ مگر یہ قصہ بھی ہندوستان کے عہد رامائن و مہابھارت سے تعلق رکھتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ:۔

راج کماری اوشا نے خواب میں ایک حسین وجمیل نوجوان کو دیکھا جو عالم خواب میں اس کے ساتھ مصروف گلگشت تھا۔ یہ خواب شہزادی نے اپنی ایک خواص یا سہیلی چترا لیکھا سے بیان کیا جسے فن نقاشی میں کمال حاصل تھا۔ اس نے اپنی شہزادی کی فکر دور کرنے کے لئے تمام دیوتاؤں اور اس عہد کے تمام راجاؤں کی تصاویر تیار کیں تاکہ جو شخص خواب میں نظر آیا تھا وہ پہچان لیا جائے۔ جب یہ تصویریں شہزادی کے سامنے پیش ہوئیں تو اس نے فرداً فرداً ہر تصویر پر نظر ڈالی۔ حتیٰ کہ جب اس کی نگاہ سری کرشن جی مہاراج کے پوتے انی رودھ پر پڑی تو اس نے فوراً پہچان لیا کہ اس نے جس نوجوان کو خواب میں دیکھا تھا وہ یہی ہے۔ اس دلچسپ واقعہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کی شادی ہوگئی۔ اسی طرح خیال کے ذریعہ سے کسی شخص کی تصویر بنانے کی روایت تاریخ عہد قدیم میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

ہندوستان کے قدیم لٹریچر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں نقاشی کی ابتدا شاہی درباروں سے ہوئی تھی اور یہاں کے نقاشوں کو در و دیوار پر تصویریں بنانے میں کمال حاصل تھا لیکن جب بعد کو بودھ مذہب ظہور میں آیا تو نقاشوں کی ذہنیت پر مذہبی خیال غالب آگیا، اور نقاشی سے مذہبی روایات وخیالات کی تبلیغ کا کام لیا جانے لگا۔

مسیح سے تین چار صدی پیشتر کی لکھی ہوئی ایک کتاب پالی زبان میں ہے جس کا مصنف بدھ مت سے تعلق رکھتا ہے اس کتاب کا نام ونایا پٹھک ہے اس میں شاہی عیش خانوں کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ جن کے در و دیوار کی تزئین نقوش وتصاویر کے ذریعہ سے کی جاتی تھی۔ تصویر خانوں یا مصور ایوانوں کا ذکر رامائن میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ قدیم نگارخانے گویا ان تصاویر کے ادنیٰ نمونے تھے جو اجنٹا کے غاروں انکھور (ملک سیام) کے آثار میں پائے جاتے ہیں۔ اسی وضع کی ابھری ہوئی سنگین تصویریں بورو بیدور (جاوا) میں بھی پائی جاتی ہیں الغرض ہندوستانی نقاشی کی قدامت کے متعلق پرانی کتابوں سے بہت سے حوالے دئے جاسکتے ہیں

تبت میں ایک مورخ تارا ناتھ سترہویں صدی میں گذرا ہے جس نے قدیم عہد سے لیکر اپنے زمانہ تک عہد بودھ کی نقاشی کے حالات درج کئے ہیں۔ اور بتایا ہے کہ یہ فن ہندوستان میں بودھ کی وفات (۴۸۰ قبل مسیح) سے بھی پہلے موجود تھا۔ اور ان نقوش کی اس مورخ نے اس قدر تعریف کی ہے کہ انھیں دیوتاؤں کے ہاتھ کا کارنامہ بتایا ... دیوتاؤں کے بعد، بقول مصنف مذکور، اس فن میں "یاکش" لوگوں نے کمال حاصل کیا۔ یہ لوگ مہاراجہ اشوک

(۲۵۰ ق۔م) میں کام کرتے تھے اور انھیں دیوتاؤں کی طرف سے الہام ہوتا تھا۔ یاکشون کے بعد قدیم دیوتا لوگ "ناگاؤں" نے نگرجن کی سرپرستی میں یہ کام اختیار کیا (سنہ ۲ء)۔ غالباً یہی سبب ہے کہ بعض اعلیٰ درجہ کے نقاشان ہند اپنے فن کو "دیوتائی" یعنی الہامی فن خیال کرتے ہیں۔ اور اس کی ابتدا فنون لطیفہ کے دیوتا وشواکرم سے سمجھتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ہندوستانی نقاشی کا "سدانگ" (خصوصیات ششگانہ) بودھ سے قبل ایجاد ہو چکے تھے۔ پنڈت بھٹ سیائن نے جو تیسری صدی عیسوی میں گذرا ہے اپنی مشہور کتاب "کام سوترا" میں ان اصول ششگانہ کا ذکر کیا ہے۔

بدھ مت والوں نے ہمیشہ ان اصول ششگانہ پر خاص توجہ کی اور مبادیات فن سمجھکر اُن کی پابندی کرتے رہے۔ ان اصول میں پہلی چیز روپ بھید ہے۔ جس میں اشکال وصور کا علم، مناظر قدرت کا مطالعہ اور فن تعمیرات داخل ہیں۔ دوسرے اصول کا نام پرنایام ہے اس میں عضویات اور تناسب اعضا کا علم شامل ہے۔ (اجنٹا کے نقوش میں اس اصول کی پابندی پوری طرح کی گئی ہے) تیسرا اصول بھاؤ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ انسانی ہیئت پر جذبات کا اثر کیا تغیر پیدا کر دیتا ہے۔ اس فن میں عہد بودھ کے نقاشوں کو بڑی مہارت حاصل تھی چوتھے اصول کا نام لاون یوجام ہے۔ یعنی جسے آپ جمالیات سے تعبیر کر سکتے ہیں پانچویں کا نام سدرسیانم ہے یعنی حقیقت اشیاء کا علم اور چھٹے کو ورنیکا بھنگ کہتے ہیں جس کا تعلق آلات نقاشی اور رنگ سے ہے۔

قدیم زمانہ میں چین کے نقاش بھی انھیں اصول ششگانہ کی پابندی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ چھٹی صدی عیسوی میں سیہہ ہو چینی مصنف نے ان اصول کا ذکر کیا ہے لیکن چونکہ چینی اصول بہت بعد کے مرتب کردہ ہیں اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان ہی کے اصول سے لیے گئے تھے۔

ایک اور پرانی کتاب عہد بودھ سے پہلے کی ہے اس کا نام چترالکشن ہے اس میں تصویر کے لوازم وخصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور مذہبی نقطۂ نظر سے فن نقاشی کو دیکھا گیا ہے۔ اس کے اصول کے مطابق عام آدمیوں کی تصویریں بلحاظ قد وقامت دیوتاؤں اور بادشاہوں سے کم ہونا چاہئیں۔ دیوتاؤں کا چہرہ "چوکور" ہونا چاہئے بیضاوی یا گول ہرگز نہ ہونا چاہئے اسی طرح راجاؤں اور دیوتاؤں کے سر کے بال باریک گھونگروالے آسمانی یا نیلگوں ہونے چاہئیں۔

عہد بودھ سنہ ۵۰ء لغایت سنہ [illegible]ء

سن عیسوی کے آغاز سے ہندوستانی نقاشی کی ابتدا ہوتی ہے یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں بودھ مذہب کا عروج تھا۔ اور یہ ملک تمام ایشیا میں روحانیات کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ شہر کوشل بودھ مت کا سرچشمہ تھا اور بودھ کی تعلیمات یہیں سے ہر ملک میں جاتی تھی۔

دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ مذہب کے زیر اثر فنون لطیفہ کو ترقی ہوئی، لیکن جس قدر زبردست اثر مشرق کے فنون لطیفہ پر بودھ مذہب نے ڈالا اس کی نظیر کوئی نہیں ملتی۔ لنکا، جاوا، سیام، برھما، نیپال، ختن، تبت، جاپان اور چین جہاں چاہئے چلے جائیے، وہاں کے آثار قدیمہ سے آپ کو اس کا ثبوت ہر جگہ نظر آئے گا۔ سترہویں صدی کے مورخ تارانا تھ نے لکھا ہے کہ جہاں جہاں بودھ مذہب کا گزر ہوا، فنون لطیفہ کے ماہرین پیدا ہوتے چلے گئے۔

اس وقت ہندوستان میں نقاشی کا رواج پانا ایک قدرتی امر تھا، کیونکہ بدھ مت کی روایات قدیمہ کا اظہار زیادہ تر نقاشی سے کیا جاتا تھا اور مذہبی معلومات کا مطالبہ جس قدر بڑھتا جاتا تھا اسی قدر فن نقاشی کو ترقی ہوتی جاتی تھی۔ چنانچہ جب کے علمار مختلف ممالک میں بھیجے جاتے تو یہ لوگ وہاں تصاویر ہی کے ذریعہ سے تبلیغ کرتے تھے جب چین میں یہ مذہب مقبول ہوا تو ۶۰ء میں ایک عالم دین جس کا نام کشیپ ما دونگا تھا شہنشاہ چین منگ ٹی کی درخواست پر مشرق اقصیٰ کی طرف روانہ ہوا اور اپنے ساتھ نقاشی کے بہت سے نمونے لے گیا۔ اس کے بعد ساتویں صدی تک ہندوستانی استادان فن کا ملک چین کی طرف برابر تانتا لگا رہا اور انہیں لوگوں کے ذریعہ سے چین اور تبت وغیرہ میں بدھ مت کا رواج ہوا۔ اس امر کا بھی تحریری ثبوت موجود ہے کہ اس سلسلہ میں بعض ہندوستانی اہل فن چین ہی میں رہ گئے اور یہیں سے یہ جاپان میں پہونچے چنانچہ وہاں ساتویں صدی کے بعض آثار ہندوستانی نقاشی کے اب بھی پائے جاتے ہیں۔ اور یہ تصویریں ان نقوش سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں جو اجنٹا کے غاروں میں نظر آتے ہیں اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ساتویں صدی میں جاپان اور ہندوستان کے ماہرین اہل فن کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ چنانچہ جاپان کے پرانے "توسا اسکول" نقاشی کے کارناموں میں (پندرہویں صدی) ہندی فن کا اثر بالکل صاف نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر یہ فن حاصل کرنے کے لئے دور دور سے شائقین آتے تھے۔ چنانچہ پانچویں صدی میں فاہیان کا اور ساتویں صدی میں ہیونٔ تسانگ کا ملک چین سے ہندوستان آنا مشہور بات ہے۔ پھر چونکہ بدھ مت کا گہوارہ ہندوستان تھا اس لئے یہ قدرتی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی نقاشی کا بھی گہوارہ یہی ملک رہا ہوگا۔ اجنٹا کے نقوش میں اس فن کے مختلف مدارج ارتقا نظر آتے ہیں، سگریا واقع جزیرۂ لنکا کے آثار سے بھی نمایاں ہے کہ اس زمانہ میں فن ہندی معراج کمال کو پہونچ گیا تھا۔ اور مقام باگھ کے نقوش سے اگرچہ وہ اب بہت کچھ مٹ گئے ہیں اس کا کافی ثبوت ہیں کہ ہندوستان میں یہ فن کس قدر کثرت کے ساتھ رائج تھا۔

غارہائے اجنٹا موضع فردا پور (ریاست حیدرآباد کے) جنوب مغرب میں تقریباً چار میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ اور جی، آئی، پی ریلوے کے جلگاؤں اسٹیشن سے ۳۵ میل پر پائے جاتے ہیں۔ ان غاروں کی تعداد انتیس

ہے۔ یہاں تک پہونچنے کا راستہ صاف اور باقاعدہ نہیں ہے گنجان اور دشوار جنگل میں ہوکر ایک ناہموار راستہ گزرتا ہے اور اسی کے ذریعہ سے ان غاروں تک پہونچتے ہیں۔ ان غاروں کے اندر پتھر تراش کر جو عمارتیں بنائی گئی ہیں ان میں بعض بعض نہایت شاندار ہیں۔ غاروں کا سلسلہ ایک کامل نیم دائرہ کی صورت میں دور تک چلا گیا ہے اور اس چشمہ کی سطح سے جو اس گھاٹی میں بہتا ہے یہ غار تقریباً سو فٹ بلندی پر ہیں۔ غاروں کا ماحول قدرتی مناظر کے لحاظ سے نہایت خوبصورت اور دلفریب ہے۔ یہ غار صدیوں سے ناقابل عبور جنگل میں پوشیدہ تھے۔ عمارتوں میں چمگادڑوں اور جنگلی جانوروں نے گھر بنا رکھا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۱۹ء میں اس کا علم ہوا۔ منجملہ انتیس غاروں کے جانچ کے بعد صرف سولہ غار ایسے پائے گئے جن میں کم و بیش آثار تصاویری موجود تھے۔ لیکن زمانہ نے ان کو بھی نہ چھوڑا اور اب ۱۹۱۰ء میں جو تحقیقات کی گئی تو صرف چھ غاروں کے در و دیوار پر نقوش و تصاویر باقی رہ گئے تھے۔ یہ چھ غار ع۱ و ع۲ و ع۹ و ع۱۰ و ع۱۶ اور ع۱۷ ہیں۔ تمام در و دیوار، ستونوں اور چھتوں کی آرائش و تزئین بذریعہ نقوش و تصاویر کی گئی ہے۔ ان غاروں کے بعض بعض ایوان طول و عرض میں ساٹھ فٹ مربع ہیں۔ اسی بات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان میں تصاویر کی تعداد کتنی ہوگی۔ علاوہ ازیں تصاویر و نقوش کی نوعیت دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب شاہکار ایک ہی زمانہ کے نہیں ہیں بلکہ ان کی تکمیل مختلف زمانوں میں ہوئی ہوگی۔ ماہرین فن اور محققین نے ان زمانوں کی تقسیم حسب ذیل کی ہے:۔

(۱) غارہائے ع۹ و ع۱۰ سنہ ۱۰۰ء

(۲) ستون غار ع۱۰ سنہ ۳۵۰ء

(۳) غارہائے ع۱۶ و ع۱۷ سنہ ۵۰۰ء

(۴) غارہائے ع۱ و ع۲ سنہ ۶۲۶-۶۲۸ء

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غارہائے اجنٹا کے نقوش و تصاویر کا سلسلہ تقریباً چھ صدی تک چلا گیا تھا۔ سترہویں صدی کے مورخ تارا ناتھ نے لکھا ہے کہ راجہ ناگرجن کے عہد میں جو غالباً دوسری صدی میں گذرا ہے، ان غاروں میں بہت سا کام ناگ بنسی قوم کے کاریگروں نے تیار کیا تھا۔ بعد ازاں راجہ بدھ پکش کے عہد میں جو غالباً پانچویں یا چھٹی صدی میں گذرا ہے، مشہور استاد فن بمباسار نے مادھیا دیش نامی اسکول نقاشی کا قائم کیا۔ یہ شخص اتنا زبردست ماہر فن تھا کہ اس کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزیں دیوتاؤں کے کارنامے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فن نقاشی کو کچھ عرصہ کے لئے زوال ہوگیا لیکن بعد ازاں پھر نقاشانِ ہند کا ایک نیا اسکول پیدا ہوا جس نے اس فن کو از سر نو زندہ کیا۔ اور اجنٹا کے غاروں کو نقوش و تصاویر سے آراستہ کیا۔

تارا ناتھ مورخ نے ہندوستان کے عہد بودھ کی نقاشی پر بہت کافی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بدھ مت والوں کا فن تین قسم کا تھا۔ (۱) دیو۔ (۲) یکش۔ (۳) ناگ۔ اول الذکر یعنی دیو طرز کا فن مگدھ میں رائج تھا۔ یعنی چھٹی صدی قبل مسیح سے تیسری صدی قبل مسیح تک۔ مورخ مذکور لکھتا ہے کہ "زمانہ سابق میں استادان فن کو معجزاتی قوتیں حاصل ہوتی تھیں جن کے باعث وہ محیر العقول کام کیا کرتے تھے۔ ونایا اگم اور دیگر کتب میں صاف لکھا ہے کہ اس زمانہ کے استادان فن جو تصویریں دیوار پر کھینچتے تھے ان پر اصل کا دہوکا ہوتا تھا۔

تارا ناتھ لکھتا ہے کہ "یکش" طرز کی نقاشی مہاراجہ اشوک کے زمانہ میں رائج تھی۔ یعنی تیسری صدی قبل از مسیح میں۔ یکش لوگ دیوتا سروپ یا نیم دیوتا آدمی ہوتے تھے۔ "ناگ" طرز کے فن نقاشی کا رواج ناگرجن رشی کے زمانہ میں تھا۔ (تیسری صدی عیسوی) اس طرز کے آثار ہندوستان میں کشمیر سے لیکر مدراس تک پائے جاتے ہیں۔ امراوتی کا ستوپہ انھی کاریگروں کی قلمکاری کا علمبردار رہے۔ تارا ناتھ لکھتا ہے کہ "دیووں یکشوں، اور ناگوں کے کام اصل سے اس قدر مشابہ ہوتے تھے کہ لوگ برسوں دہوکا کھاتے رہے۔" بہرحال دیو۔ یکش اور ناگ" لوگ خواہ کوئی ہوں لیکن تارا ناتھ کے بیان سے فن ہندی کی قدامت کا ثبوت ملتا ہے۔

یہی مورخ آگے چلکر لکھتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی کے بعد فن نقاشی کو اس قدر زوال ہوا گویا وہ دنیا سے اُٹھ ہی گیا تھا۔ لیکن بعد کو بدھ مت والوں نے اس فن کو پھر زندہ کر دیا۔ اس زمانہ میں نقاشی کے تین اسکول تھے (۱) شرقی۔ (۲) وسطی۔ (۳) مغربی۔ جغرافیائی لحاظ سے وسطی اسکول آج کل کے صوبۂ متحدہ میں رائج تھا۔ اس کا بانی مبانی ایک زبردست نقاش اور سنگتراش بمبا سار نامی تھا۔ جو ملک مگدھ میں بعہد راجہ بدھ پکش (پانچویں چھٹی صدی عیسوی) پیدا ہوا تھا۔ اس اسکول میں بڑے بڑے نامی استادان فن پیدا ہوے جن کا کام "دیووں" کے کام سے ملتا جلتا ہوتا تھا۔ یہ سمجھنا چاہئے گویا لمبا سار نے ہندوستان کے قدیم فن نقاشی کا احیاء ثانیہ کر دیا تھا جو تقریباً دس صدی پیشتر موجود تھا۔

مغربی اسکول کا وجود راجپوتانہ میں ہوا۔ اس کا سب سے بڑا استاد سرنگدھرا تھا جو مارواڑ میں بعہد راجہ سیلا پیدا ہوا تھا۔ اس اسکول کا کام "یکشوں" کے کام سے ملتا جلتا ہوتا تھا۔

مشرقی اسکول کا وجود ورندرا (بنگال) میں بعہد راجہ دھرمپال اور راجہ دیو پال ہوا تھا۔ یہ راجگان نویں صدی میں گذرے ہیں اس اسکول کا کام "ناگوں" کے کام سے مشابہ ہوتا تھا۔ شرقی اسکول کے مشہور ترین استاد دھیمن اور اس کا لڑکا بتپالو ہوئے ہیں اور یہ دونوں نقاشی سنگتراشی اور دھات (فلزات) کاموں میں بڑے ماہر تھے۔

اگرچہ چھٹی اور دسویں صدی کے درمیان کشمیر، نیپال، برھما اور جنوبی ہند میں دیگر اسکول بھی وجود میں آئے لیکن بقول تاراناتھ ان سب پر انھیں تین بڑے اسکولوں کا اثر تھا۔

قرون وسطیٰ سنہ ۷۰۰ء لغایۃ سنہ ۱۶۰۰ء

ساتویں صدی عیسوی میں جب ہندوستان میں بدھ مت کا زوال ہوا تو اس کے ساتھ فن نقاشی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ البتہ جین مت کی مذہبی کتب میں بعض تصویریں ضرور ایسی ہیں جو پندرہویں صدی کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں مگر قرون وسطیٰ کی ہم کو ایک بھی تصویر ایسی نہیں ملتی جس کی بنا پر ہم کوئی رائے قائم کرسکیں۔ سنہ ۶۵۰ء سے لیکر اکبر اعظم کے زمانہ تک ہندی فن نقاشی کی تاریخ کے صفحات کورے ہیں۔

ممکن ہے کہ ہندوستان کے اس "غیر تصویری" عہد کا باعث ہندوستان کی غیر مطمئن سیاسی صورت حال رہی ہو، لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی زمانہ میں نقاشی کے علاوہ دیگر فنون کو (مثلاً سنگتراشی اور تعمیرات) خوب ترقی ہوئی تو مندرجۂ بالا وجہ ساقط الاعتبار رہو جاتی ہے

ہندوستان خصوصاً شمالی ہند میں سنہ ۸۰۰ء سے سنہ ۱۲۰۰ء تک کا زمانہ "عہد ظلمت" کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں یہاں کوئی بڑا راجہ ہوا نہ کسی بڑی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ نہ فنون لطیفہ کا کوئی قابل ذکر نمونہ وجود میں آیا اور نہ علوم وفنون یا ادبیات کی دنیا میں کوئی قابل ذکر نام سننے میں آیا۔ الغرض اس دور کی تاریخ پر ایک گہرا سیاہ پردہ پڑا ہوا ہے۔

اس زمانہ کے آخری حصہ میں ہندوستان پر مسلمانوں نے حملہ کرنا شروع کردیا تھا۔ بڑے بڑے سیاسی انقلاب رونما ہورہے تھے۔ جن کے باعث فنون میں ترقی ہونا محال تھا۔ روحانی لحاظ سے بھی ہندوستان میں انقلاب عظیم رونما ہورہا تھا۔ یعنی ایک طرف تو بودھیت زوال پذیر تھی، دوسری طرف ہندویت کا ستارہ چمک رہا تھا اور تیسری طرف افق مغرب سے ایک ستارہ یعنی اسلام جلوہ نما ہوگیا تھا۔ الغرض ایسی حالت میں ہندوستان کے اندر علوم وفنون کی ترقی مشکل تھی۔ تاہم سنگتراشی میں کافی ترقی ہوئی جس کا ثبوت جزیرہ ایلیفنٹا (Elephanta) ایلورہ اور جاوا میں بورو بدر کے نقوش سنگین سے ملتا ہے۔ البتہ نقاشی کا کوئی نمونہ اس زمانہ کا نظر نہیں آتا۔

بہت ممکن ہے کہ اس دور کی نقاشی کے نمونے زمانہ کی دستبرد کے نذر ہوگئے ہوں یا انھیں حریف مذاہب والوں نے تباہ کردیا ہو۔ لیکن ہم ایک اور زاویۂ نظر سے اس مسئلہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ یعنی اگر اس دور کا کوئی قابل قدر نمونہ ہندوستان کے اندر نہیں ملتا تو معاصرانہ نقاشی کے ان نمونوں کو دیکھا جائے جو ہندوستان کے ہمسایہ ممالک میں ملتے ہیں۔ یہ ممالک مشرقی ترکستان اور تبت ہیں۔

واضح ہو کہ ملک ختن کئی مرتبہ مہاراجگان ہند کے ماتحت رہ چکا ہے - اور اس امر کا بہت کافی ثبوت موجود ہے کہ ملک ختن میں یونانی، ایرانی، ہندوستانی اور مسیحی تہذیب و تمدن کا تصادم ہوا کرتا تھا - چنانچہ اس قدیم ملک میں محققین اور مستشرقین نے بہت سا مسالہ ایسا بہم پہونچایا ہے جن میں اس زمانہ کی نقاشی کے عمدہ نمونے موجود ہیں -

مستشرقین مذکورہ نے مقام چیوتز و میں آٹھویں صدی کے بنے ہوئے چند مذہبی جھنڈے ایسے برآمد کئے ہیں کہ ان کے دیکھنے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے بنے ہوئے ہیں - ہمارے اس قول کی تائید گیارہویں صدی کے چینی نقاد ٹنگچون کے قول سے بھی ہوتی ہے جس نے لکھا ہے کہ مقام نالندہ (بنگال) کی خانقاہ میں جو بھکشو اور پجاری رہتے ہیں وہ مغرب کے بنے ہوئے کتان پر بدھ اور بودھستو کی تصویریں رنگوں سے کھینچتے ہیں -

عہد مغلیہ ۱۵۵۰ء تا ۱۸۰۰ء

عہد مغلیہ کے فن نقاشی کی عمر اتنی ہی تھی جتنی سلطنت مغلیہ کی سولھویں صدی کے آخر میں بعہد اکبر اعظم اس فن کا ستارہ چمکا، جہانگیر کے زمانہ میں اُسے چار چاند لگے - شاہجہاں کے دور میں زوال شروع ہوا اور نگ زیب کے عہد میں عالم سکرات طاری ہوا - شاہان اودھ کے زمانہ میں کچھ کچھ سنبھالا لیا اور انگریزی راج میں اس کا جنازہ نکل گیا -

مغلیہ نقاشی کے مولد درحقیقت سمرقند و ہرات تھے جہاں پندرہویں صدی کے اندر ایرانی نقاشی اوج کمال پر تھی یہ فن درحقیقت مغلئی نہیں بلکہ ہندی ایرانی یا زیادہ صحیح طور پر ہندی تیموری ہے - تیمور کا عہد اگرچہ اپنی خصوصیات میں تعمیری نہیں تخریبی عہد ہے کیونکہ جہاں جہاں اس کی تاتاری فوجیں جاتی تھیں وہاں اگر نقش قائم ہوتا تھا تو صرف آگ اور خون کا لیکن اس میں شک نہیں کہ تیمور کی اولاد نے پوری تلافی کی اور نقاشی کی سرپرستی کر کے اس کو پھر زندہ کر دیا - پندرہویں صدی کے آخر میں جب سلطان حسین والی خراسان تھا اپنے زمانہ کا سب سے بڑا استاد بہزاد موجود تھا، یہ وہ کامل الفن استاد تھا کہ اہل مغرب نے بھی اس کو "رافیل مشرق" کا خطاب دیا شہنشاہ بابر نے اپنے تزک میں بہزاد کی نسبت لکھا ہے کہ "وہ ممتاز ترین نقاش ہے" الغرض خاندان بہزاد کے نقاش اور شہنشاہ اکبر اعظم جیسے سرپرست جب دونوں مل گئے تو مغلیہ اسکول نقاشی وجود میں آیا -

شاہان مغلیہ کی خصوصیات فطرت میں ان کی نفاست پسندی بہت ممتاز نظر آتی ہے اگرچہ ان کی تلوار ہر وقت توسیع سلطنت میں مصروف رہتی تھی - لیکن وہ اسی کے ساتھ علوم و فنون کی بھی سرپرستی کیا کرتے تھے - ہرچند بابر کو تو انقلابات زمانہ نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے ذوق کو پورا کر سکتا لیکن

اس کے پوتے اکبر نے اچھا زمانہ پایا کیونکہ اُس وقت سلطنت کی بنیادیں استوار ہوکر علوم و فنون کی طرف توجہ کرنے کا زمانہ آگیا تھا - اور اکبر خود بھی فطرتاً نقاشی و فنون لطیفہ کا بڑا شائق تھا - چنانچہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں شہنشاہ کے شوق مصوری کا خود ذکر کیا ہے - اور لکھا ہے کہ خاقان خود نقاشوں اور نقاشی کی سرپرستی کرتا تھا - اکبر اعظم کی مربیانہ اور سرپرستانہ نظر کرم کا بالآخر یہ نتیجہ ہوا کہ دیگر ممالک کے مشہور و معروف استادان فن ہندوستان آئے اور بادشاہ نے ان کی سرپرستی فرمائی - ابوالفضل نے عہد اکبری کے نقاشوں اور مصوروں کی جو فہرست دی ہے جن میں فرخ قلماق - عبدالصمد شیرازی اور میر سید علی تبریزی کے نام بھی موجود ہیں - ان ناموں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عہد مغلیہ کے فن نقاشی کو کس قدر جغرافیائی وسعت حاصل تھی - اس کے علاوہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ در اصل مغلیہ فن ہماری فن نہیں تھا بلکہ اپنے سرپرستوں کی طرح باہر سے آیا تھا - لیکن چونکہ خاندان مغلیہ رفتہ رفتہ خود ہندوستان میں جذب ہوکر ہندوستانی بن گیا تھا - اسی طرح ان کا فن بھی ہندوستانی ہی سمجھا جائے گا کیونکہ دربار مغلیہ میں غیر ملکی استادان فن کے دوش بدوش ہندوستانی کاملین فن بھی کام کیا کرتے تھے - دربار اکبری کے نقاشوں میں بساون، دسونت، اور کیسوداس جیسے مشہور ہندو مصوروں کے نام بھی آتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فن نقاشی کو کس روادارانہ نظر سے دیکھا جاتا تھا - اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نظامی اور دیگر فارسی شعرا کی کتب کو مصور کرنے کا کام بھی انھی ہندو نقاشوں کے سپرد کیا گیا تھا - حالانکہ وہ مصنفین ہندوستانی نہیں تھے - الغرض ادھر تو اکبر اعظم کے حُسنِ ذوق نے اصلاح کی اور اس طرف استادان فن نے کمال کے جوہر دکھائے دونوں باتوں نے مل کر ایک تیسری بات پیدا کر دی جو مغلیہ نقاشی کی صورت میں ظاہر ہوئی

عہد مغلیہ کی نقاشی کا تعلق دربار سے تھا - اور تصویریں مذہبی روایات پر مبنی نہیں ہوتی تھیں علاوہ ازیں تصویر کا موضوع بادشاہ کی نظر انتخاب پر منحصر ہوتا تھا - گویا بادشاہ اپنی طبیعت خوش کرنے کے لئے تصاویر بنواتا تھا - اس لئے ابتداء میں اس فن نے قصر شاہی سے باہر قدم نہیں رکھا، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا فن نقاشی بھی عمومیت حاصل کرتا گیا - اور جب زوال شروع ہوا تو ادنیٰ طبقوں میں آگیا -

فن مغلیہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تصویریں ابر (شیڈ) سے نہیں بلکہ خطوط (لائن) کے ذریعہ سے بنائی جاتی ہیں - اصل اور نقل میں فرق نہیں ہوتا اور تصاویر عموماً درباری واقعات سے متعلق ہوتی ہیں - بلحاظ طول و عرض، مغلیہ تصویر چھوٹی ہوتی ہے - یعنی بودھی تصاویر کے طول و عرض سے اُسے کوئی مناسبت نہیں ہوتی - عہد اکبری میں تقریباً چالیس مشہور استادان فن گزرے ہیں جن میں سے بہت

ایسے تھے جن کا تعلق دربار شاہی سے تھا۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ فن مغلیہ نے عہد اکبری میں جنم لیا تھا لیکن اس کی نشو و نما اور پوری پرورش عہد جہانگیری میں ہوئی۔ جہانگیر کا یہ شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہ اپنے درباری نقاشوں اور مصوروں پر فخر کیا کرتا تھا۔ اس زمانہ کی نقاشی زیادہ تر صورت کشی یا شکارگاہ کے مناظر سے متعلق تھی جب کبھی شہنشاہ کی نظر کسی غیر معمولی جانور یا پھول پر پڑتی تھی تو نقاش کو تصویر کھینچنے کا حکم ملتا تھا۔ بعض نہایت صحیح تصویریں اس زمانہ کی اب تک موجود ہیں۔

اس عہد میں چونکہ یوروپینوں کی آمد و رفت بھی ہندوستان میں شروع ہو گئی تھی اس لئے مغربی تصاویر کی درآمد کا آغاز ہو چلا تھا۔ ان تصاویر کی نقل کا بھی حکم دربار شاہی سے ملتا تھا۔ الغرض عہد جہانگیری میں مصوری کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔

جہانگیر کے بعد جب شاہجہاں تخت نشین ہوا تو مغلیہ نقاشی میں زوال کے آثار نمودار ہونے لگے عہد جہانگیری کی تصویروں میں جو قوت عمل پائی جاتی تھی اس میں کمی آ گئی اگرچہ تصاویر کی ترکیب اور رنگ آمیزی میں کسی قدر اضافہ ہوا۔ مگر مصور کے ہاتھ میں فن کی کمزوری دکھائی دیتی ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ شاہجہاں کو نقاشی سے اس قدر دلچسپی نہ تھی جس قدر فن تعمیرات سے اور یہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جب کسی فن سے دربار کی سرپرستی ختم ہو جاتی ہے تو وہ زوال پذیر ہونے لگتا ہے۔

عہد شاہجہانی میں تصاویر بنتی تھیں ضرور بکثرت مگر اُن کی نوعیت بدل گئی تھی اور چونکہ فن نقاشی کا تعلق دربار سے تھا اور دربار اس زمانہ میں دہلی میں تھا اس لئے ایک جدید طرز نقاشی کا پیدا ہوا جسے عرف عام میں "دہلوی قلم" کہتے ہیں اور یہ ادنیٰ و مبتذل حالت میں اب تک چلا جاتا ہے۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد اس فن کو اور بھی سخت ٹھوکر لگی کیونکہ اب دربار نے سرپرستی ترک کر دی تھی اور ہر چند امراء و رؤسا ابھی تک اس فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن حکومت کی بے توجہی سے جو نقصان اس فن کو پہونچ رہا تھا اس کی تلافی مشکل تھی۔

چونکہ اورنگ زیب کی عسکری سرگرمیوں کا بڑا زمانہ جنوبی ہند میں بسر ہوا تھا اس لئے دہلی کے بہت سے ماہرین فن فوج اور دربار کے ساتھ دکن پہونچ گئے۔ وہاں فن نقاشی نے نیا چولا بدلا جسے عام طور سے "دکنی قلم" کہتے ہیں۔ آخری دور میں نقاشوں کے بعض خاندان پٹنہ میں جا بسے اور وہاں یہ فن کچھ دنوں زندہ رہا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد بھی یہ فن ٹوٹے حالوں زندہ رہا۔ اٹھارہویں صدی میں جب یہ فن لکھنؤ پہونچا تو اس میں کسی قدر جان آئی لیکن بلحاظ فن متبذل رہا۔ انیسویں صدی میں اس فن کا جو کچھ باقی رہ گیا

تھا وہ یوروپین اثر میں آگیا۔ یعنی سرکار کمپنی کے بعض ملازم فرمائش کرتے تھے کہ ان کی اور ان کے خاندان کی چھوٹی تصویریں مغربی طرز میں بنائی جائیں۔ لہٰذا بعض خاندانی نقاشوں نے یہی طرز اختیار کر لیا۔ بہت سی تصویریں نیم مغربی وضع میں بنتی ہیں۔ اور اس طرح گویا مغلیہ فن نقاشی کا قطعی خاتمہ ہوگیا۔

عہد راجپوتی ۱۵۵۰ء لغایتہ ۱۹۰۰ء

پبلک نگارخانوں (پکچر گیلریز) اور لوگوں کے ذاتی مرقعوں میں بہت سی چھوٹی پیمانہ کی تصویریں موجود ہیں جنھیں عام طور سے مغلئی قلم کی تصویریں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نقاد نگاہیں ایک ہی نظر میں پہچان سکتی ہیں کہ ان میں اکثر تصاویر بلحاظ فن دوسری تصویروں سے مختلف ہیں۔ اس قسم کی نقاشی کا گھر شمالی ہند کے دو مقامات ہیں یعنی راجپوتانہ اور کوہستان کانگڑہ۔ اس طرز نقاشی کو راجپوتی فن کہتے ہیں۔ بہت سی باتیں اس فن میں ایسی ہیں جن سے نمایاں ہوتا ہے کہ یہ اصلی فن ہندی ہے اور اجنٹا کی قدیم نقاشی سے تعلق رکھتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں جب بودھی فن نقاشی کا خاتمہ ہوگیا تو اس فن کی تاریخ پر پردے پڑگئے۔ ملک میں عرصہ دراز تک سیاسی اضطراب رونما رہا حتی کہ نویں صدی میں راجپوتوں کو عروج ہوا۔ اور قدیم راجگان گجرات کی یہ نسل عرصہ دراز تک شمالی ہند کے بڑے حصہ پر حکمراں رہی لیکن کچھ عرصہ بعد ان لوگوں میں نااتفاقیاں پیدا ہوگئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے حملہ کر کے ان کی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا۔ مگر ان کی تہذیب اور شخصیت کے آثار ہنوز باقی ہیں۔

راجپوتانہ کے مشہور شہروں (جے پور۔ بیکانیر۔ جودھپور اور اودے پور) میں قرون وسطیٰ کے جو قصور و شاہی پائے جاتے ہیں ان کے در و دیوار پر راجپوتی نقاشی کے اعلیٰ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان قدیم نمونوں میں بہت کچھ انفرادیت پائی جاتی ہے۔ مگر یہ محض تزئینی یا آرائشی تصویریں ہیں اور ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے ایرانی وچینی اثرات کا اظہار ہوتا ہے۔

ہندویت کے دور نہضت کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے دین بودھ کا تو جنازہ اُٹھ گیا اور اس کی جگہ ہندو مذہب نے لے لی جو اپنے ساتھ نئے عقائد اور نئی مذہبی رسمیں لیکر آیا جدید مذہب کی دیومالا قدیم روایات اور عبادتی رسموں کے باعث جمہور کے ذوق میں تغیر پیدا ہوا اور عام رجحان نقاشی کے بجائے سنگتراشی اور تعمیرات کی طرف ہوگیا۔ تصویرکشی اور دھیان گیان کی جگہ بت تراشی اور مورتی پوجا نے لے لی پہلے اگر بدھ مت والوں کی سادہ مذہبی رسمیں صرف سطحی تصاویر کے ذریعہ سے ادا ہو جاتی تھیں تو اب دیوتاؤں اور دیویوں کے بتوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور اس طرح آخر کار سنگتراشی اور بت سازی کو عروج اور مصوری و نقاشی کو زوال ہوگیا۔

عہد اکبری سے بیشتر کا بنا ہوا راجپوتی قلم کا کوئی نمونہ ہم تک نہیں پہونچا۔ جین مت کے مخطوطات میں بعض کتابی وضع کی تصویریں ضرور موجود ہیں مگر ان سے اس فن کی تاریخ ماضی پر کافی روشنی نہیں پڑتی۔ اس واقعہ کے متعلق تاریخی حوالجات ضرور پائے جاتے ہیں کہ عہد مغلیہ سے پہلے بھی راجپوتی نقاشی موجود تھی۔ مثلاً آٹھویں صدی کے ابتدا میں جب محمد بن قاسم نے ملک سندھ پر حملہ کیا تو اس زمانہ کا ایک مورخ بیان کرتا ہے کہ اس فاتح عرب کی خدمت میں ہندوؤں کا ایک وفد حاضر ہوکر ملتجی ہوا کہ وہ امیر اور اس کے بعض افسران کی تصاویر بنانا چاہتے ہیں۔

اس سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت نقاشی کا شوق موجود تھا۔ زمانہ ما بعد میں جےپور فن راجپوتی کا مرکز بن گیا۔ اس راجستھانی طرز نقاشی کو عرف عام میں "جے پور قلم" کہتے ہیں اور وہ بعض انفرادی خصوصیات کا مالک ہے۔

جے پور اور راجپوتانہ کے نقاش رفتہ رفتہ دربار مغلیہ میں پہونچ گئے۔ سترہویں صدی میں دہلی، آگرہ اور لاہور تینوں جگہ خاص خاص قلم رائج تھے۔ جن میں زیادہ تر راجپوتی طرز نمایاں تھا۔ بعدازاں اس فن کے استاد لکھنؤ، حیدر آباد دکن اور پٹنہ میں جا پہونچے۔

راجپوتی قلم کی اہم ترین شاخ وہ تھی جو پنجاب کی کوہستانی ریاستوں میں پائی جاتی تھی۔ اس شاخ کو کانگڑہ قلم" کہتے ہیں۔ اگرچہ بعض بعض جگہ اس کا نام "پہاڑی قلم" بھی لیا جاتا ہے۔ ان نقاشوں کے وطن ریاست ہائے نورپور۔ بسوہلی۔ چنبہ اور جموں میں تھے۔ اور یہ لوگ بہت کام کرتے تھے۔ اب بھی ایسی تصویریں دستیاب ہوتی ہیں جو سترہویں صدی کے وسط میں بنائی گئی تھیں۔ اس سے قبل کا کوئی حال معلوم نہیں ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا اور بہت ممکن ہے کہ نقاشوں کے بعض خاندان ان ریاستوں کی سرپرستی میں جا پہونچے ہوں کانگڑہ قلم کو کٹوچ راجاؤں خصوصاً راجہ سنسار چند کی سرپرستی میں خاص عروج حاصل ہوا۔ یہ راجہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں گزرا ہے۔ کانگڑہ قلم کی خصوصیات میں خطوط کی باریکی، رنگوں کی چمک دمک اور پس منظر کی خوبصورتی اور دلفریبی داخل ہیں۔

واضح ہو کہ پہاڑی قلم کا کام مقامی راجاؤں کی سرپرستی میں اور انھیں کی فرمائش پر ہوتا تھا۔ ایک شخص کی شبیہ ہمیشہ پہلو کی طرف سے دکھاتے تھے۔ یعنی ان کی تصویریں ایک آنکھ ہوتی تھیں اور عموماً چھوٹے پیمانہ پر ہوتی تھیں؟

لاہور اور امرتسر میں جب سکھوں کی حکومت قائم ہوئی تو انھوں نے بھی پہاڑی قلم کی سرپرستی کی، چنانچہ ان کے گوروؤں اور امرا کی تصاویر ابھی تک ملتی ہیں۔ اور پنجاب کے اکثر امیر خاندانوں کے پاس

پہاڑی قلم کی تصویروں کے مرقعے موجود ہیں - انیسویں صدی کے آخر میں پہاڑی قلم کی نقاشی میں آثار زوال ظاہر ہوئے اس میں کچھ خشونت پیدا ہو گئی اور دلفریبی مفقود -

کانگڑہ قلم پر آخری اور کاری ضرب اس وقت لگی جب ۴ اپریل ۱۹۰۵ء میں دھرمسالہ کا ہولناک زلزلہ آیا اور اس نے شہر کانگڑہ کو کھنڈر کر دیا - اس حادثۂ عظیم میں بہت سے استادان فن نذر اجل ہوئے اور بالآخر راجپوتی فن کا جنازہ نکل گیا۔

دور جدید ۱۸۶۰ء لغایت ۱۹۱۵ء ۱۸۶۰ء سے سلطنت مغلیہ کو زوال شروع ہوا - اور اسی وقت ہندوستان میں فن نقاشی پر بھی عالم سکرات طاری ہونے لگا۔ دہلی اور لکھنؤ میں بعض نقاش ابھی تک اپنا کاروبار چلائے جاتے تھے مگر ان کا کام عموماً پرانے نمونوں کی ادنیٰ نقل ہوتا تھا - دہلی والوں نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا - یعنی چھوٹے پیمانہ پر تصویریں بنانے لگے جو آج کل بھی کسیقدر فروخت ہوتی ہیں - دہلی میں نقاشوں کے چند گھر ابھی باقی ہیں جو مغلیہ خاندان شاہی کی چھوٹی چھوٹی تصویریں بناتے ہیں - لیکن یہ تصویریں فرضی ہوتی ہیں اور ان کے اندر فنی خصوصیت بھی بہت کم ہوتی ہے - یہ لوگ پرانے مغلیہ نقاشوں کی اولاد ہیں اور ان میں فن کی پرانی روایات کسی حد تک باقی ہیں - کچھ عرصہ قبل تک ان کا تمام ساز و سامان دیسی ہوتا تھا - نصف صدی پیشتر ہاتھی دانت پر بنائی ہوئی تصویریں واقعی عمدہ ہوتی تھیں مگر آج کل جو نقاشی ہوتی ہے وہ خصوصیات فن سے معرا ہے -

اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں ایک خاص طرز نقاشی لکھنؤ میں بھی جاری تھا جس میں قدیم اسکول کی بعض دلفریب خصوصیات موجود تھیں - مگر افسوس ہے کہ اس طرز پر مغربی اثر زیادہ غالب تھا - اس کا تعلق زیادہ تر عمل صورت کشی سے تھا اور صورتیں اکثر صحیح بنائی جاتی تھیں لیکن پس منظر اور جدولوں وغیرہ میں نمائش کو زیادہ دخل تھا اور فن کے لحاظ سے مذاق صحیح کا فقدان تھا - اس دور میں راجپوتی فن بھی بر سر زوال تھا - لیکن پنجاب کی دور افتادہ پہاڑیوں میں جہاں ابھی تک قرون وسطیٰ کا طرز معاشرت جاری تھا، بعض بعض عمل نہایت اچھے ہوتے تھے - اور وہاں انیسویں صدی میں بھی یہی حالت رہی

لاہور اور امرتسر میں انیسویں صدی کے آخر تک بعض سکھ نقاشوں کے عمل نہایت اچھے ہوتے تھے - جن میں مشرقی اور مغربی رنگ ملا کر ایک نیا رنگ پیدا کیا گیا تھا - یہاں کے ایک نقاش کپور سنگھ نامی نے بہت سے کام تیار کئے تھے - جو اگرچہ بلحاظ پیمانہ چھوٹے چھوٹے تھے - لیکن بلحاظ فن بڑے تھے

اسی زمانہ میں بعض خاندانی نقاشوں نے پٹنہ میں توطن اختیار کیا جنھوں نے ایک خاص قلم کی بنیاد ڈالی ان کے عمل میں اگرچہ ایک قسم کی خشونت اور غیر دلکشی ہوتی تھی باینہمہ بلحاظ فن وہ قابل قدر تھا - کچھ عرصہ تک

یورپین سوداگر اور اینگلو انڈین ان لوگوں کی سرپرستی کرتے رہے اور وہ ان کے لئے نیم مشرقی و نیم مغربی وضع کی تصویریں بناتے رہے۔ ان میں سے بہت سی تصویریں ابھی تک موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدا میں نقاشی کی کیا حالت تھی۔

جنوبی ہند میں جو قلم اس زمانہ میں رائج تھا وہ شمالی طرز سے قطعی مختلف تھا۔ یعنی سولھویں صدی تک دکن میں ایرانی طرز کا قلم رائج تھا۔ جو وہاں ترکمان شاہان دکن کی زیر سرپرستی جاری ہوا تھا۔ اس قلم کے پرانے نمونوں سے تیموری رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن بعد کے عمل میں وہی بات پائی جاتی ہے جو عہد مغلیہ کے دہلوی قلم میں تھی اگرچہ دکنی قلم میں بعض خصوصیات امتیازی موجود تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی دکھنی مہموں کے زمانہ میں شمالی ہند کے بعض نقاش خاندان دکن میں جا بسے تھے جو وہیں کے ہوگئے۔ اٹھارہویں صدی میں اورنگ آباد اور دولت آباد میں جو عمل تیار ہوئے وہ بلحاظ پیمانہ شمالی عمل سے چھوٹے تھے خصوصاً عرض میں کم ہوتے تھے اور ان کا موضوع عموماً نیم تاریخی ہوتا تھا۔ اور واقعات ایسے منتخب کئے جاتے تھے جو مختلف سلاطین دکن کے سوانح حیات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان پرانے نقاشوں کی اولاد ابھی تک حیدرآباد میں پائی جاتی ہے۔

اور زیادہ جنوب میں فن نقاشی کے متعلق بعض ایسی معلومات پائی جاتی ہیں کہ ان سے ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کا فن ایک جداگانہ وجود رکھتا تھا اور دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بذریعہ روایات اس کا تعلق شمال سے تھا۔ تارا ناتھ مورخ نے جنوبی فن کا مختصراً ذکر کرکے تین مشہور نقاشوں کے نام درج کئے ہیں۔ یعنی جیا۔ پاروجیا۔ اور وجے۔ جن کے بہت سے شاگرد تھے۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ استاد کس زمانہ میں گزرے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد فن جنوبی کے دو قلم ہوگئے یعنی تنجوری قلم اور میسوری قلم۔

نقاشان تنجوری کی نسبت مقامی طور پر یہ روایت مشہور ہے کہ وہ اٹھارویں صدی کے آخر میں بعہد راجہ سارابھوجی ہندوستان سے آئے تھے۔ چونکہ یہ لوگ ہندو تھے اس لئے یقین ہوتا ہے کہ وہ راجپوتی قلم سے تعلق رکھتے تھے۔ جو زوال مغلیہ کے بعد پریشان ہوکر دربار تنجور کے زیر سایہ پناہ گزیں ہوگئے اور جب دربار کی طرف سے ان کی سرپرستی ہوئی تو انھوں نے ایک جداگانہ قلم ایجاد کرلیا۔ اگرچہ ابتدا میں ان نقاشوں کی تعداد کم تھی مگر رفتہ رفتہ تعداد بڑھ گئی چنانچہ تنجور کے راجہ سیواجی کے عہد میں (۱۸۳۳ء لغایۃ ۱۸۵۵ء) ان نقاشوں کے اٹھارہ خاندان تنجور میں موجود تھے جو ہاتھی دانت اور لکڑی پر نہایت اچھا کام بناتے تھے۔ ان نقاشوں نے بعض قد آدم تصویریں رنگوں سے بھی تیار کی تھیں جن میں سے بعض تنجور کے محل شاہی اور پڈوکوٹہ کے پرانے محل میں ابھی تک موجود ہیں۔

جب راجہ سیواجی کا انتقال ہوگیا اور دربار کی طرف سے بھی سرپرستی بند ہوگئی تو یہ خاندان بھی پریشان حال ہوکر منتشر ہوگئے۔ بعض نے دوسرے پیشے اختیار کرلئے۔ یعنی بعض نے سنار کا کام اختیار کیا اور بعض کچھ اور کام کرنے لگے۔ بعض خاندان ابھی تک موجود ہیں اور اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ لیکن عموماً "بازاری" قسم کی مذہبی تصویریں بناتے ہیں۔ یہ تصویریں فن کے لحاظ سے تو نہیں لیکن صناعی کے لحاظ سے واقعی نہایت عمدہ ہوتی ہیں۔

دوسرے جنوبی اسکول یعنی میسور قلم کو سب سے زیادہ عروج انیسوی صدی کے اول نصف حصہ میں بعہد راجہ کرشنا راجہ ڈویادھوا۔ کرشنا راجہ خود ان نقاشوں کی سرپرستی کیا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات کوئی موضوع خود منتخب کرکے چند نقاشوں کو عمل کا حکم دیتا تھا۔ تنجوری اسکول کی طرح میسوری اسکول بھی زیادہ تر ہاتھی دانت پر کام بناتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی تصویریں ابھی تک میسور کے محل شاہی میں موجود ہیں۔ ۱۸۶۸ء میں جب کرشنا راجہ کا انتقال ہوگیا تو اس اسکول کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

مندرجہ بالا واقعات سے یہ ظاہر ہوگیا ہوگا کہ انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے فن نقاشی کی کیا حالت تھی۔ لیکن گزشتہ صدی کے آخری عشرہ میں اس فن کے اندر نئی روح پیدا ہونے کے آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ یعنی بنگالی نقاشوں کی ایک مختصر مگر پرجوش جماعت اس نیت سے قائم ہوگئی ہے کہ اس فن کو دوبارہ زندہ کیا جائے اس جدید تحریک کے روح رواں بنگال کے ایک مشہور شخص ابا نندرا ناتھ ٹیگور ہیں۔ یہ جدید اسکول نقاشی چاہتا ہے کہ فی الحال جو مغربی عنصر یہاں کی نقاشی میں شامل ہوگیا ہے اس کو علٰحدہ کردیا جائے۔

ہرچند اس اسکول کی نقاشی میں ایک قسم کی طباعی پائی جاتی ہے پھر بھی اگر ہر تصویر کو فرداً فرداً دیکھا جائے تو بعض بعض خارجی اثرات ان میں نظر آتے ہیں۔ یعنی کسی تصویر میں جاپانی، کسی میں چینی اور کسی میں ایرانی اثر نظر آتا ہے۔ اس اسکول کے ممبر جو موضوع منتخب کرتے ہیں وہ عموماً دیدانت پر مبنی ہوتے ہیں بعض بعض مناظر کالیداس کے ڈراموں، رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، اور پرانوں وغیرہ سے بھی لئے ہیں۔ اور ہند قدیم کی تاریخ سے بھی بعض واقعات چنے ہیں۔ تصویریں عموماً مغلیہ قلم کی طرح چھوٹے پیمانہ پر ہوتی ہیں۔ لیکن یہ کوشش کیجاتی ہے کہ ــــ اُن کو فن قدیم کے مطابق ہونا چاہئے

شمیم کا دوسرا ایڈیشن عمدہ کاغذ پر دو ضخیم جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ رنگین تصاویر جو اسی ناول کے لئے صدہا روپیہ صرف کرکے تیار کی گئی ہیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں قیمت ہر دو حصہ للعہ علاوہ محصول ڈاک (فرمائش کے ساتھ ۱۱ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں)
ملنے کا پتہ: منیجر نگار لکھنؤ

نندی

نندی اور بدل کا معمول تھا کہ وہ روزانہ جنگل میں جاکر ڈھور چرایا کرتے تھے وہیں وہ کھیلتے کودتے اور آپس میں گپ شپ اڑاتے ان کے پاک و معصوم دل دنیا کے جھگڑوں سے آزاد تھے انھیں کسی بات کی فکر نہ تھی۔ نندی اور بدل کے گاؤں میں صرف ایک میل کا فرق تھا۔ صبح ہوتے ہی نندی اپنے گاؤں سے اور بدل اپنے گاؤں سے انگوچھے میں روٹی باندھ کر گائیں ہانکتے دیہاتی گیت گاتے جنگل کی طرف چل پڑتے جہاں وہ دن بھر ساتھ ساتھ مویشی چراتے اور شام ہوتے ہی اپنے اپنے گھر لوٹ جاتے یہی ان کا دستور تھا اور اسی میں ان کا لڑکپن گزر رہا تھا۔ شام کو دونوں میں بازی بدی جاتی کہ دیکھیں کل صبح کو کون سب سے پہلے جنگل میں پہنچتا ہے۔

نندی کا باپ اپنے گاؤں کا ایک مشہور چمار تھا۔ نندی اس کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی اس کی شادی کمسنی ہی میں ہوگئی تھی لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ بیوہ ہوگئی اب وہ چھ سال کی تھی اپنی بیوگی کا اُسے احساس بھی نہ تھا مویشی چرانا۔ ہنسنا کھیلنا اور اپنے والدین کا دل خوش کرنا بس یہی اس کا کام تھا۔ بدل اس کا لڑکپن کا ساتھی تھا وہ اس سے دو سال بڑا تھا اس کی زندگی بھی نندی سے ملتی جلتی تھی۔ بدل کا باپ نندی کے باپ کی برادری ہی کا تھا بدل کی شادی بھی لڑکپن میں ہو کر ختم ہوچکی تھی اور اب وہ اسی میں خوش تھا۔

کھیل کود ہی میں چار سال گزر گئے اب بدل بارہ سال اور نندی دس سال کی تھی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسی خوشی اپنی زندگی گزار رہے تھے اُن کو خواب میں بھی جدائی کا احتمال نہ تھا۔

دونوں سماجی ظلم وستم اور رسم ورواج کے شکار تھے۔

نندی کے گاؤں میں ایک چمار کے یہاں برات آئی نندی بھی اپنے والدین کے ساتھ شادی میں شریک ہوئی جس کی وجہ سے وہ دو دن تک مویشی چرانے جنگل میں نہ جاسکی انہیں دو دنوں میں بدل کا برا حال ہوگیا پہلے دن جب نندی نہ آئی تو اُس نے سوچا۔ ”کل نندی ضرور آئے گی“ اس اُمید میں اُس نے دوسرے دن بہت سویرے جنگل کی راہ لی لیکن اس دن بھی نندی نہ آئی۔ آج نندی پر بدل کو بہت غصہ آیا اُس نے سوچ لیا کہ جب نندی کا سامنا ہوگا تو وہ اُس سے ہرگز نہ بولے گا۔ اس کے بلانے پر بھی سیدھے منھ بات

نہ کرے گا۔

دوسرے دن بدل جب جنگل پہنچا تو دور ہی سے اسکو نندی دکھائی پڑی بدل کو شادی کی باتیں سنانے کے لئے وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھی لیکن بدل کا اداس چہرہ دیکھکر اُس نے پوچھا۔ بدل "تمھار جی کس ہے" (تمھارا جی کیسا ہے)

بدل نے تو سوچ رکھا تھا کہ وہ نندی سے بالکل نہ بولے گا لیکن اسکو دیکھتے ہی اپنا عہد بھول گیا اُس نے رکھائی سے جواب دیا۔ "ہمرے جیو سے کوؤ کا مطلب" (کسی کو ہمارے جی سے کیا مطلب؟)

نندی نے تعجب سے کہا۔ "بدل! آج مو سے ٹھیک سے کس نہیں بولت ہو؟ (مجھ سے اچھی طرح کیوں نہیں بولتے)

بدل نے جواب دیا۔ "کاکری! کا ہم ہی پہل کرا ہے۔ کا ہم ہی دو دن سے گھر بیٹھ رہن ہن" (کیا بتاؤں؟ کیا ہم نے ہی پہل کی ہے کیا ہم ہی دو دن تک گھر میں بیٹھے رہے ہیں)

بدل کی ناراضگی کا مطلب اب نندی سمجھ گئی اس نے ہنس کر کہا۔ "ارے! تو اِی کیں نہیں کہیت ہو کہ ہمری نہ آئے سے کھسیائے گئے ہو۔ سیتل دادا کی بٹیا کا بیاہ رہا وہی کارن نہیں آسکیوں۔ چمرخوا کا ناچ کھوب بھا۔ رام دے تمھاری بڑی یاد آوت رہی۔ کل رات کو برات لوٹ گئی تو مو کا فرصت مل گئی۔ تو رسیائے کاہے گیو؟

بدل بولا۔ کاکری نندی! تورے بنا مورجی نہیں لاگت رہا۔

تھوڑی دیر میں بدل پھر ہنس ہنس کر نندی سے باتیں کرنے لگا۔ دوپہر کی دھوپ میں دونوں نے پیڑ کے نیچے بیٹھکر ایک ساتھ کھانا کھایا پھر برہا گانے لگے۔

اس کے ایک مہینہ کے بعد کا ذکر ہے جنگل میں مویشی چرانے والے لڑکے اور لڑکیوں نے کوئی دیہاتی کھیل کھیلنے کا آپس میں مشورہ کیا۔ نندی اور بدل کو بھی اس میں شریک ہونے کے لئے کہا گیا لیکن بدل نے انکار کر دیا اور کہا "ہم دونوں جنے الگ کھیلب تم لوگن کے ساتھ نہ کھیلبے"۔ (ہم دونوں تمھاری ساتھ نہ کھیلیں گے) دوسرے لڑکوں کو اس کی یہ بات بہت بری معلوم ہوئی ایک لڑکے نے طعنہ مارا۔ "ہوں! الگ کھیلب! نندی کا سنگ بدل کبھوں نہیں چھوڑت یا تو دونوں دولھا دلھن ہی تو ہیں"

نندی پاس ہی کھڑی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ "دولھا دلہن" کا لفظ سنکر وہ کچھ پریشان سی ہوگئی اس کا دل دھڑکنے لگا اس سے پہلے بھی اس نے اس لفظ کو کئی بار سنا تھا لیکن کبھی اس کے دل پر کچھ اثر نہ ہوا تھا اسکے اور بدل کے درمیان ایسا رشتہ بھی ہو سکتا ہے اس کی طرف آج پہلی مرتبہ اس کا دھیان گیا وہ دن بھر نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی اور جب شام کو گھر لوٹی تو اس نے ماں سے پوچھا۔ "کا رے مائی! دولھا دلھن کو ہوت ہیں"

یہ پہلا موقع تھا کہ نندی نے اپنی ماں سے ایسا سوال کیا اس کی ماں کو سخت حیرت ہوئی مگر نندی کی معصومیت اور لڑکپن کا خیال کرکے اس نے جواب دیا۔ نندی! دلہن اوکا کہیت ہیں جون اپنے دولھا کے سنگ رہے اور اوکا روٹی پکا وے۔"

ادھر بدل کے دل میں بھی الجھن تھی اُس نے گھر پہنچکر اپنے پڑوسی ماتادین سے جو عمر میں اس سے بڑا تھا دولھا کی فلاسفی دریافت کی۔ ماتادین نے ہنسکر پوچھا "کا دولھا بننے کا من ہے؟"

"بھیا! ایسے ہی پوچھت ہوں"

ماتادین۔ دت پاگل! دولھا اوکا کہت ہیں جو اپنی دولھن کے سنگ رہے اور پیسہ کوڑی کمائے اور دولھن کا دے"

یہ تو بالکل معمولی بات ہے یہ سمجھکر بدل کی وحشت دور ہو گئی

دوسرے دن بدل اور نندی اسی جنگل میں پھر ملے۔ دونوں کے دلوں میں ایک عجیب قسم کے جذبات کا طوفان بپا تھا لیکن ان جذبات کو زبان پر لانے کی ہمت کسی کو نہ تھی۔ دونوں میں لڑکپن تھا کئی گھنٹے تک وہ چپ چاپ ڈھور چراتے رہے۔ آخر شہ یہ نندی سے نہ رہا گیا اور اُس نے کہا۔ کا سوچت ہو۔ آؤ ہم دنوں بجنے دولھا دلہن بن جائی"

نندی نے یہ بات بدل کے دل کی کہی تھی وہ بولا۔ ٹھیک تو ہے لیکن اس معاملہ میں اُسے کئی باتوں کا ڈر معلوم ہوا اس نے کہا۔ مدا دولھا دلہن تو ساتھ رہت ہیں۔ یہ کیسے ہوئی"

نادان نندی نے آنکھیں جھکا کر کہا۔ ای کا مشکل ہے۔ یہ سب ڈھور کا مر گئے ہیں کہ جنگل جر گوا ہے جیسے روج ساتھ ساتھ رہت ہیں تیسے رہیے۔

بدل نے کہا۔ "تو ٹھیک ہے"

شادی کی بات طے ہو جانے پر ان کو اور کئی باتوں کا خیال آیا۔ نندی نے ایک شرط پیش کی کہ بیاہ میں "گڑ سہاری" سب کو تقسیم ہوتا ہے اس نے سیتل داد کی لڑکی کے بیاہ میں گڑ سہاری کھایا تھا اس کے علاوہ بیاہ کی رسم ادا کرنے کے لئے ایک برہمن کی بھی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ کافی بحث کے بعد فیصلہ ہوا کہ "سہاری" کا انتظام نندی کرے گی اور گڑ بدل لائے گا۔ برہمن کے لئے زیادہ پریشانی نہ اٹھانی پڑی۔ بدل کے گاؤں کے پنڈت کا لڑکا بھی ان کے ساتھ گائیں چرانے آیا کرتا تھا۔ اُس نے صرف دو آنے پر بیاہ کرانے اور اس کو پوشیدہ رکھنے کا ذمہ لے لیا۔ اس نے اپنے پتا کے ساتھ اکثر شادیوں میں شرکت کی تھی۔ کچھ اوٹ پٹانگ منتر پڑھنا بھنور پھرانا اور بات میں ٹکے وصول کرنا بس یہی شادی ہے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ اور سن چکا تھا۔ اُسے کامل

یقین تھا کہ وہ بدل اور ننّدی کی شادی کو نہایت خوبی سے سرانجام دے گا۔

دوسرے دن صبح ہی ننّدی نے اپنی ماں سے رو دھو کر بڑی مشکل سے اُٹھ "ستھاری" بنوائیں اور انھیں ایک کپڑے میں باندھ کر مویشی ہانکتی ہوئی بَن کو چل پڑی۔ ادھر بدل نے بھی کچھ اناج بیچ کر بنئے سے دو آنے پیسے اور کچھ گڑ حاصل کر لیا اور خوش خوش جنگل میں پہنچا وہاں برہمن کا لڑکا پہلے ہی سے موجود تھا۔ بدل کو دیکھ کر ننّدی نے پوچھا "گڑ لائے؟" برہمن لڑکے نے بھی سوال کیا۔ "اور پیسے لائے؟"

بدل نے بڑے فخر سے گڑ اور پیسے دکھا دیئے اور طعنہ کے ساتھ کہا — تو اپنی کہہ۔ ستھاری لائی؟"

ننّدی نے چمک کر گال پھلا کر ستھاری کی پوٹلی کو اونچا کر کے کہا "یہ کا ہے؟ لے سونگھ لے" بیاہ کی پہلی کسوٹی پر دونوں کھرے نکلے۔

اب کس بات کی دیر تھی سنسان جنگل میں ایک سبز پیڑ کے نیچے آم کی ایک ٹہنی زمین میں گاڑ کر ننّدی اور بدل آمنے سامنے بیٹھ گئے پردہت جی کچھ منھ ہی منھ میں بڑبڑائے گویا وہ منتر یا کوئی اشلوک پڑھ رہے ہیں بھونر پھرا کر پردہت جی نے اپنی سمجھ میں بدل اور ننّدی کو دولھا دلھن بنا دیا اور اپنے دو آنے پیسے طلب کئے بدل نے بڑی ہوشیاری سے پنڈت جی کو چھ ہی پیسے پر ٹالا اور بچے ہوئے دو پیسے ننّدی کے ہاتھ پر رکھ کر وہ اپنے خیال میں شوہری فرض سے بھی ادا ہو گیا۔

ننّدی کے لئے وہ دو پیسے لاکھوں روپے کے برابر تھے آج اس کی خوشی کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ اپنی گانٹھ میں پیسوں کو باندھ کر اس نے بدل کے ساتھ "گڑ ستھاری" کا بھوج کیا اور قدرتی چشمہ کا ٹھنڈا پانی پیکر پھر دونوں مویشی چرانے لگے۔

بیاہ کے رسوم بڑی سادگی سے ختم ہو گئیں۔

چار برس اور گزر گئے۔ ننّدی کے باپ کو اپنی "بال ودھوا" کنیا کی دوبارہ شادی کی فکر ہوئی۔ بدل اور ننّدی کے اچھے تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے ننّدی کے باپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی لڑکی کی سگائی بدل ہی سے کرائے گا۔ بات چیت بھی پکی ہو گئی لیکن جب گاؤں کے مکھیا کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے ننّدی کے باپ کو منع کر دیا کہ وہ یہ رشتہ نہ کرے۔ کیوں؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ بدل کے گاؤں کے مکھیا اور ننّدی کے گاؤں کے مکھیا میں پٹی داری تھی ان میں اکثر فوجداری ہوتی رہتی تھی پھر بھلا ننّدی کے گاؤں کے مکھیا کو یہ کب گوارہ ہو سکتا تھا کہ اُن کے دشمن کا چمار ان کے گاؤں پر برات چڑھا کر لائے۔ مجبوراً ننّدی کے باپ کو کسی دوسرے گاؤں میں رشتہ کرنا پڑا یہ رسم و رواج کا کرشمہ نہ تھا بلکہ غریب اچھوتوں پر سرمایہ داری

کی لعنت تھی۔

نندی کو یہ سب باتیں معلوم ہوگئیں وہ بدستور جنگل میں مویشی چرانے جایا کرتی تھی لیکن شرم و لحاظ سے جس طرح پہلے وہ بدل کے ساتھ سگائی ہونے کی خبر بدل کو نہ سنا سکی تھی اسی طرح جب یہ نسبت ٹوٹ گئی تو بھی وہ خاموش ہی رہی۔ بدل کو اپنی قسمت کا یہ بننا بگڑنا بالکل معلوم ہی نہ ہوسکا۔

خلاف معمول ایک دن نندی جنگل میں نہ آئی بدل نے سوچا کسی خاص کام کی وجہ سے نہ آئی ہوگی لیکن جب تین دن گزرنے لگے اور نندی نہ آئی تب بدل سخت پریشان ہوا۔

ادھر نندی کی شادی کی تاریخ قریب آ گئی تھی اسی وجہ سے جنگل کا آنا جانا بند کردیا گیا تھا۔ بدل کی جدائی میں نندی کا دل بہت اداس رہتا تھا۔ گھر میں منگل گیت۔ بچوں کی اچھل کود اور مردوں اور عورتوں کی چہل پہل اسے کچھ نہ بھاتی تھی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھکر لوگ یہ سمجھتے کہ نندی کو گھر چھوٹنے کا غم ہے۔

برات آئی نندی کو وہ خوشی حاصل نہ ہوسکی جو چار سال پہلے اس سنسان جنگل میں پیڑ کے نیچے بدل کے ساتھ شادی ہونے سے ہوئی تھی۔ آج برات کے دن کھانے پینے میں نندی کو وہ لطف حاصل نہ ہوا جو چار برس پہلے پیڑ کے سایہ میں بیٹھکر بدل کے ساتھ گڑ "سہاری" کھانے میں ملتا تھا منڈپ کے نیچے بھونر گھومتے وقت نندی کے پاؤں میں وہ تیزی نہ تھی جیسے پہلے آم کی شاخ کے چاروں طرف بدل کے ساتھ گھومنے میں تھی۔ بڈھے پنڈت جی کے منتر اس کے کانوں کو اتنے اچھے نہ معلوم ہوئے جیسے چھ پیسے والے توتلے پنڈت کے لڑکے کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ۔ پہلی شادی اپنی مرضی سے کی تھی اور یہ شادی والدین اور زمیندار کے حکم سے ہو رہی تھی۔

بدل کو اس شادی کی کچھ خبر نہ تھی وہ مجبوراً جنگل میں آیا تو سہی لیکن اب اس کو کھیلنے کودنے میں کوئی دلچسپی نہ معلوم ہوتی وہ تنہائی میں بیٹھ کر نندی کی یاد میں آنسو بہاتا۔ جس دن نندی کا بیاہ تھا اس دن اسکا دل بہت بےچین تھا اس نے اب تک کسی کو اپنا ہمراز نہ بنایا تھا لیکن آج وہ اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکا اُس نے مجبوراً نندی کے گاؤں سے آنے والی ایک اہیرن کی لڑکی سے نندی کو کہلا بھیجا کہ آج شام کیوقت جس طرح سے بھی ہوسکے اس کو جنگل میں ملنا چاہئے۔ کہاں ؟ اسی پیڑ کے نیچے جہاں چار برس پہلے ان کی شادی ہوچکی تھی اور بدل کے دیئے ہوئے پیسے بطور یادگار آج بھی نندی کے گلے میں تعویذ بنے ہوئے تھے۔

وقت مقررہ پر نندی عروسی جوڑہ پہنے پاؤں میں مہاور اور مانگ میں سیندور لگائے بہت پوشیدہ طریقہ سے جنگل میں پہونچ گئی۔ بدل اس کا انتظار کر رہا تھا۔ عرصہ تک ایک دوسرے کو نہ دیکھنے سے وہ تڑپ رہے تھے۔ بدل نے نندی کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور آج پہلی مرتبہ اس نے نندی کو اپنے کلیجہ سے لگا یا۔

ننذی نے اپنا سر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بدل کے کندھے پر رکھدیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ ارمان وتمناؤں کے جذبات سے اس کا دل اچھل رہا تھا۔ شرم ولحاظ کی لہریں اس کے رگوں میں دوڑ کر اُسے کپکپا رہی تھیں ایک لمحہ کے لئے بدل بیخود سا ہوگیا لیکن فوراً ہی اس کو اپنا کندھا بھیگتا معلوم ہوا اور اس نے ننذی کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرہ کو بغور دیکھا اور پھر گویا اس پر بجلی گری ہجوم جذبات سے اس نے ننذی کو کلیجے سے لگا تو لیا تھا لیکن اس کو اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا اس نے اس کے عروسی جوڑے کی طرف کچھ دھیان ہی نہ دیا تھا۔ لیکن اب پاؤں میں مہاور اور مانگ میں سیندور دیکھکر چونک اُٹھا اور ننذی سے ہٹ کر دور جا کھڑا ہوا اس نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا۔ "ای کا ننذی! (یہ کیا ننذی!)

ننذی اس کے جواب میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی وہ خود کو قصوروار سمجھتی تھی۔

بدل نے کانپتی ہوئی آواز سے پھر دریافت کیا۔ "یہی پیڑ کے نیچے جون قرار کیتو رہا یاد ہے" (اس پیڑ کے نیچے جو قرار کیا تھا وہ یاد ہے)

ننذی نے سر ہلا کر تسلیم کیا۔

بدل - یاد ہے تو بتاؤ مور کہا منیہو (یاد ہے تو بتاؤ میرا کہنا مانوگی)

ننذی نے پھر سر ہلا دیا جس کا مطلب تھا کہ "ہاں مانوں گی"

بدل اب بچہ نہ تھا ننذی کی یہ محبت دیکھ کر جوشش مسرت سے اس کا دل ناچ اٹھا اس کے امیدوں کی خشک شاخ پھر ہری ہوگئی اس نے پھر ایک بار ننذی کو جو اس کے خیال سے اس کی آج سے چار برس پہلے ہو چکی تھی کھینچ کر چھاتی سے لگا کر مہر محبت ثبت کردی جس سے ننذی کا چہرہ لال ہوگیا

تاریکی بڑھنے لگی اور اسی تاریکی میں ننذی اور بدل آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے غائب ہوگئے

ننذی اور بدل کی گمشدگی سے تمام گاؤں میں ہلچل مچ گئی ادہر اُدہر بہت تلاش کی گئی لیکن دونوں کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آئی ہوئی برات بگڑ کر واپس چلی گئی۔

بدل اپنے گاؤں سے ننذی کو لیکر قریب کے ایک شہر میں پہونچا اور ایک وکیل صاحب کے اصطبل میں نوکر ہوگیا۔ والدین کے ڈر سے دونوں نے اپنی ذات چھپا رکھی تھی اتفاقاً ایک دن بدل کے گاؤں کا ایک اہیر اصطبل کی طرف سے نکلا اور اُس نے بدل کو پہچان لیا۔ بدل نے اپنے مالک سے کچھ دن کی چھٹی لی اور اہیر کو اپنا ہمراز بنا کر وطن کی طرف چلا۔ گاؤں کے قریب پہنچکر جنگل میں اسی پیڑ کے نیچے جہاں اُس کی شادی ہوئی تھی ننذی کو ٹھہرا کر گاؤں میں گھسا جب اس کے ضعیف باپ کو اس کے آنے کی خبر ملی تو وہ خوشی

کے آنسو بہاتا بدل کے پاس پہنچا۔ بات کی بات میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ بدل چوپال میں بیٹھ گیا تھا گاؤں والے اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔

دو ڈھائی سال کے بچھڑے ہوئے لڑکے کو اپنے سینے سے لگا کر بڈھے باپ نے کہا۔ "چلو! بیٹا! اب گھر چلو؟"

بدل نے شرماتے ہوئے سر جھکا کر کہا "دادا! مورے (میرے) ساتھ تمھار پتوہو (تمھاری بہو) ہے"

بڈھے کی خوشی دونی ہوگئی وہ بولا "کون؟ نندی! کہاں ہے؟"

بدل نے اور بھی شرما کر کہا — "اس کی گود میں ....." وہ اس کے آگے اور کچھ نہ کہہ سکا صرف جنگل کی طرف اشارہ کر دیا۔ سب اسی طرف دوڑ پڑے۔

بدل کو گھر سے نکلے ڈھائی سال ہو چکے تھے اب نندی کی گود میں ایک ہنس مکھ بچہ بھی تھا۔ جب نندی اپنی سسرال پہنچی۔ تو اس کے دوسرے دن بدل کے باپ نے نندی کے باپ کو بھی اس کی خبر بھیجدی جو دوڑے ہوئے آئے۔ اس طرح سے بچھڑے ہوئے آپس میں مل گئے لیکن اس سے برادری خوش نہ ہوئی اور بغیر بھوج کے وہ خوش بھی کس طرح ہو سکتی تھی ان کی نظروں میں تو بدل کا باپ کوئی معمولی باپ نہ تھا اسی وجہ سے برادری نے بدل کے گھر کا حقہ پانی بند کر دیا تھا جب بدل نے اُن کو اپنی کمائی سے بھوج دیا تب جا کر کہیں برادری کا غصہ رفع ہوا اور پھر بدل کا خاندان برادری میں شامل کر لیا گیا۔ اب برادری کی نظروں میں نندی اور بدل کی عزت بہت بڑھ گئی تھی۔ (ماخوذ)

اعظم کریوی

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کے امن و سکون کا راستہ معلوم کریں تو اسکو ملاحظہ فرمائیے

مادئین کا مذہب

(وجود باری کے ثبوت میں بے مثل مضمون ہے)

حرکت کے کرشمے

اگر آپ قدرت کے کرشموں کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے ملاحظہ فرمائیں تینوں ایک ہی جلد میں ضخامت ۲۰۰ صفحات علیحدہ علیحدہ نہیں مل سکتیں۔ قیمت معہ محصول عہ

منیجر نگار لکھنؤ

یورپ کی موسیقی پر عربوں کا اثر

پروفیسر ہاسکنس نے "انگلش ہسٹاریکل ریویو" میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ بارہویں صدی میں جب مغربی یورپ کے اندر علوم عربیہ کی اشاعت ہونے لگی تو انگلستان نے بھی اس میں نہایت اہم حصہ لیا چنانچہ اُس زمانہ میں باتھ کا رہنے والا ایک شخص ایڈیلارڈ تھا جس نے علوم عربیہ کو بہت زیادہ انہماک سے حاصل کیا اس کے معاصرین اور علما، ما بعد کی تحریر کردہ بہت سی کتابیں مع تاریخ تصنیف ایسی موجود ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات نہایت وضاحت اور صحت کے ساتھ تحقیق کی جاسکتی ہے کہ ان علوم جدیدہ (عربیہ) کی اشاعت ملک انگلستان میں کس طرح ہوئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ انگلستان کی علمی بیداری میں ان علوم عربیہ نے نہایت زبردست حصہ لیا تھا۔ اور عربوں کے ذریعہ سے علوم ریاضی خاص طور پر اس قدر معراج ترقی پر پہنچ گئے تھے کہ اس سے قبل مغربی یورپ کو کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا۔

عربوں میں لفظ "سائنس" کے اندر وہ جملہ علوم شامل تھے جو قرون وسطیٰ میں یورپ کے اندر ریاضیات میں داخل تھے یعنی علم الحساب - علم المساحت موسیقی اور فلکیات اور ان تمام علوم پر مستشرقین نے کافی توجہ کی ہے، مگر بدقسمتی سے علم موسیقی پر کسی نے توجہ نہ کی - یعنی اب تک یہ بات ظاہر کرنے کی کسی شخص نے بھی کوشش نہ کی کہ عربوں کے فن موسیقی نے مغربی یورپ پر کس قدر اثر ڈالا -

یورپ پر عربوں کے اثر کا یہ پہلو دو صورتوں میں تحقیق کیا جاتا ہے :-

(۱) عام موسیقی - جو آٹھویں صدی میں یورپ کے اندر بسلسلۂ تعلقات اشاعت پذیر ہوئی۔

(۲) فن موسیقی، جو دسویں اور گیارہویں صدیوں میں ادبی اور علمی تعلقات کے ساتھ ساتھ یورپ میں آیا۔

عربوں کی عام موسیقی، مغربی یورپ میں سفری قوالوں یا مغنیوں کے ذریعہ سے پھیلی - جو اپنے ساتھ اہل عرب کے ایجاد کردہ جدید ساز ہائے موسیقی لئے پھرتے تھے اور عربی ترکیبوں سے گاتے تھے - قرون وسطیٰ میں یورپ کے مغنی اور گشتی قوال جو گیت گاتے تھے یا جن طریقوں سے رقص کرتے تھے، ان میں سے اکثر راگنیاں اور اکثر رقص عربوں کے رہین منت تھے - لیکن یہ گشت کرنے والے یا سفری مغنی، عربی علم موسیقی سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے - کیونکہ یہ لوگ عموماً عطائی ہوتے تھے، جو عربی گویوں سے سن سنا کر چیزیں اڑا لیا کرتے تھے ——— لیکن جو عربی ساز ہائے موسیقی یہ لوگ اپنے ساتھ لئے پھرا کرتے تھے - وہ یورپ کے

نزدیک بالکل نئے اور انوکھے تھے۔ اور ان میں سے بعض ساز اس ترکیب سے وضع کئے گئے تھے کہ ان میں سروں کا ٹھاٹھ زیادہ تر علمی طریقہ پر قائم تھا جس سے۔ ۔ ۔ ۔ یوروپ بالکل ناواقف تھا۔

بعض سازاور اصطلاحات موسیقی اب ہم ذیل میں بعض عربی اور یوروپین سازوں کے نام درج کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ یوروپین سازوں کے نام عربی ناموں سے مشتق ہیں یا ان کی بگڑی ہوئی صورت ہیں۔

عربی نام		یوروپین
اَلعُوْدُ	= (Al - ud)	A Lute
قِطَارُ	= (qitar)	Guitar
رَبَاب	= (Rabab)	Rebec
نَقّارَہ	= (Naqqara)	Naker
صنوج (مجیرہ یا جھانجھ)	= (Sunuj)	Sonajas
اَلدّف (مربع)	= (Al - duff)	Adufe
بندیر (مدور)	= (Bandair)	Pandere

قَصْعَہ (ایک قسم کا عربی ڈھول) (qasa) = سولھویں صدی میں فرانسیسی queese ہوا اور اب فی زمانہ Caisse کہلاتا ہے

طَبْل	(Tabl)	Taber, tabor, tabel
النفیر (نفیری)	(Nafir)	Anafil
انفار	(Anfar)	Fanafone (بہت سی نفیریوں کا یکدم بجنا)
السرنائی	(Al-Surnay)	Dulcaya
قانُون	(qanoon)	Canon
الشقرہ	(Al - Shaqra)	Eschaqueel
زَمر	(Zamr)	Shawm

معلوم ہوتا ہے کہ یوروپ میں جلترنگ کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی سے نویں صدی تک کا زمانہ ادبیات یوروپ میں (جلترنگ) کے ذکر سے خالی ہے مگر نویں صدی سے بارہویں صدی تک تاریخ سے

ثابت ہوتا ہے کہ عربوں نے واقعی آبی اور ہوائی دونوں قسم کے ارغنون بنا لئے تھے۔ اور آبی ارگن سے مراد "جلترنگ ہے"

تان اور برہمپت عربوں کے ساتھ یوروپ کا تعلق پیدا ہونے کے بعد جو سب سے پہلے اثر پڑا وہ تزائین تھا یعنی کوئی چیز گاتے گاتے تان، یا مینڈ لگانا جسے انگریزی اصطلاح میں " gloss " (چمک) یا " Ornament " (راگنی کا زیور یا سنگھار) کہتے ہیں۔

عربی اثر پڑنے سے قبل یوروپین موسیقی بالکل سادہ ہوا کرتی تھی جسے "نغمۂ گریگوری" کہتے تھے۔ اس میں سروں کا کوئی اُتار چڑھاؤ نہیں ہوتا تھا۔ مگر عربی اثر پڑتے ہی تمام یوروپین موسیقی کا رنگ بدل گیا۔ اگر دو یا دو سے زیادہ مغنی گانے بیٹھتے تھے تو ان میں ایک آدمی سیدھی استائی گاتا تھا اور دوسرا درمیان میں گلے بازی کرتا جاتا تھا۔ اس تان اور مینڈ وغیرہ کو اصطلاح یوروپ میں " Oppoggiatura " کہتے تھے

سُر ملانا جس چیز کو انگریزی زبان میں " Harmony " (ہم آہنگی) کہتے ہیں وہ یوروپ میں دسویں صدی سے پیشتر بالکل مفقود تھی، لیکن پروفیسر ودلبریج لکھتے ہیں کہ دسویں صدی میں فن موسیقی کے اس اسلوب کا ذکر پایا جاتا ہے جسے " Organising " (ٹھاٹھ ملانا) کہتے ہیں۔ یہ فن سروں کے ملانے پر مشتمل تھا اور اس زمانہ میں اسکو " Organum " یا " Dia-phony " کہتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یوروپ میں یہ خیال کیونکر پیدا ہوا۔

بعض مورخین، مثلاً ایمیل نوماں (Emil Naumann) کا یہ قول ہے کہ دین عیسوی کی ترقی کے ساتھ یہ بات بھی پیدا ہوگئی تھی، مگر اس قول کی تردید پادری سرالیف۔ لے۔ گورا وسلے جیسے عالم و فاضل نے بخوبی کر دی ہے۔ حقیقت کا اظہار دراصل پروفیسر وولبریج نے کیا ہے جو تحریر فرماتے ہیں کہ "ارغنوم" (Organum) کا اصول اساسی قدیم یونانیوں کے اس طریقہ میں پایا جاتا ہے جسے " Magadizing " کہتے تھے۔ اس میں "اکٹیو" (Octave) کو اکٹیو سے ڈبل کیا جاتا تھا۔ اور " Organising " میں چوتھے یا پانچویں سر (مدھم اور پنچم) سے ڈبل کیا جاتا تھا۔ اور بقول ڈاکٹر ریمان (Riemann) اس کے بعد " Magadising " سے " Organising " کی طرف قدم اُٹھانا ایک قدرتی بات تھی۔ لیکن یہ پہلا قدم کس نے اُٹھایا؟ کیا عربوں نے؟

سب سے پہلا عرب مصنف جس کی کتابیں ہم تک پہونچی ہیں وہ الکندی (المتوفی ۸۷۴ء) ہے مگر جو اوراق پریشاں اس شخص کے ہم کو دستیاب ہوئے ہیں ان میں "ارغنوم" کا کوئی واضح ذکر نہیں ہے۔ اور نہ الفارابی

(المتوفی ۹۵۰ء) کی تصانیف میں اس کا کہیں اشارہ پایا جاتا ہے۔ لیکن بوعلی سینا (المتوفی ۱۰۳۷ء) کی کتاب "شفاء" میں دونوں باتوں یعنی "Organisme" اور "Magadisme" پر "تضعیف" اور "ترکیب" کے ناموں سے بحث کی گئی ہے[1] لیکن چونکہ یہ باتیں بوعلی سینا میں پائی جاتی ہیں اس لئے گمان غالب ہے کہ الفارابی نے بھی ضرور ان کا ذکر کیا ہوگا۔ اسی سلسلہ میں واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فن "ترکیب" (Organisme) دراصل عربی فن نہیں ہے، بلکہ یونانی ہے اور غالباً ارسطو سے لیا گیا تھا۔

ایک ہسپانوی مورخ ورجلیس قرطبائی کے تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس کے مدارس موسیقی میں فن "ترکیب" کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اہل یورپ عرصہ دراز تک یونانیوں کی تقلید میں یہ بات مانتے رہے کہ صرف آٹھویں، پانچویں اور چوتھے سروں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ تیسرا سُر کسی سے نہیں ملتا۔ مگر الفارابی (دسویں صدی) اور ابن سینا (گیارہویں صدی) نے سر نمبر ۳ و نمبر ۵ کو ملا کر "ثالث کبیر" (چڑھی گندھار)[2] اور سر نمبر ۵ و نمبر ۶ کو "ثالث صغیر" (اُتری گندھار)[3] تسلیم کر لیا تھا۔ اور ٹھیک اس وقت جبکہ یورپ بتقلید فیثا غورث تیسرے سر کو غیر آہنگ خیال کر رہا تھا، عربوں کا ساز "طنبورہ خراسانی" نہایت اچھی طرح سے "ثالث کبیر" کے سر پیدا کرتا تھا۔

الغرض رفتہ رفتہ یورپ نے نظریۂ فیثا غورث ترک کرکے عربوں کے ایجاد کردہ جدید طریقے اختیار کر لئے جن میں سے ایک تیسرے چوتھے، پانچویں اور آٹھویں سروں میں دوگن پیدا کرنا تھا اور جس کا ذکر ابن سینا نے کیا تھا۔

سرگم ٹھاٹھ اسی سلسلہ میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے اندر سازہائے موسیقی کا "ٹھاٹھ" قایم کرنا بھی عربوں ہی سے آیا تھا چنانچہ لوئی شانز دہم شاہ فرانس کے ترجمان السنۂ مشرقیہ موسیو، بیجن دی سینٹ بیٹرن" نے اس قول کی تائید میں ایک عربی مخطوطہ پیش کیا تھا۔ اور یہ بات تو زمانۂ

---

[1] ویقرب من ھذا الباب الترکیبات وھوان یحدث بنقرۃ داحلۃ تستمر علی وترین النغمۃ المطلوبۃ والتی معھا نسبۃ الذی بالاربعۃ او الذی بالخمسۃ وغیر ذالک کانھما یقعان فی زمان واحد والتضعیفات وقد علمتھا من جملۃ الترکیبات الا انھا فی الذی بالکل۔

[2] انگریزی میں اُسے (Major third) کہتے ہیں

[3] انگریزی میں اسے (Minor third) کہتے ہیں

دراز سے تسلیم کی جا چکی ہے کہ یوروپ میں سرگم کی تعلیم عربوں ہی نے جاری کی تھی۔ یوروپ کی اصطلاح میں سرگم کو " Solfeggio " اور گت یا ٹھاٹھ کو " Tablature " کہتے ہیں۔

اگر ہم عربی اور یوروپین سرگموں کے ناموں کا مقابلہ کریں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں کے نام اور حروف ایک ہی ہیں مثلاً :۔

عربی سرگم :۔ میم ، فا ، صاد ، لام ، سین ، دال ، را

یوروپین سرگم :۔ می ، فا ، سول ، لا ، سی ، دو یا ات ، ری

سب سے زیادہ دلچسپ عربی اثر وہ ہے جو یوروپ کے سازہائے موسیقی کے "ٹھاٹھ" یا "گتوں" پر پڑا۔ اور عربوں کے اس احسان کو یوروپ کے محققین عام طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ایک طریقہ تھا جس میں حرفوں، علامتوں کے ذریعہ سُئے گتیں" قائم کی جاتی تھیں یا پردوں اور سپتکوں کے اتار چڑھاؤ سے "ٹھاٹھ" بنایا جاتا تھا۔ یوروپ والوں کو اس سے قبل یہ فن قطعی معلوم نہ تھا۔ عربوں کے اس احسان کا کھلم کھلا اعتراف پندرہویں صدی کے ایک راہب مصنف جائے ویلانووا نے ایک مخطوطہ میں کیا ہے۔ مخطوطۂ مذکور کی ابتدا بایں الفاظ ہوتی ہے :۔

"یہ امر حیرت انگیز ہے کہ روح القدس کے فیوض و برکات کفار پر اس قدر نازل ہوں۔ میں یہ بات اس وجہ سے کہتا ہوں کہ سلطنت غرناطہ کے ایک عرب (مور) نے جس کی ماہرین فن ہسپانیہ بیحد تعریف کرتے ہیں، سازوں کے بجانے کا نہایت عمدہ فن ایجاد کیا تھا۔" اس کے بعد زاہد مذکور نے سروں کے متعین کرنے کا وہ طریقہ بیان کیا ہے جو یوروپ میں اٹھارہویں صدی تک رائج تھا۔ اور اس طریقہ کا نام اس نے "ٹبلیچر" (Tablature) رکھا ہے۔

معاشرتی علمی و ادبی تعلقات کا اثر

یہاں تک تو ہم نے یوروپ کے فن موسیقی پر عربوں کے اس اثر کا حال بیان کیا ہے، جو سیاسی تعلقات کے ذریعہ سے پڑا۔ اب ہم اس معاشرتی اثر کا کچھ حال بیان کرتے ہیں جو اس زمانہ سے بھی قبل یوروپ پر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ پروفیسر ہاسکر نے بیان کیا ہے کہ بارہویں صدی کے اوائل ہی میں رفتہ رفتہ بہت سی عربی اصطلاحیں اور الفاظ یوروپ میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے، مگر جب یوروپ سے عربوں کا علمی و ادبی تعلق بھی قائم ہو گیا تو یہ اثر بہت زیادہ ہو گیا۔ انگلستان پر اس تعلقات کا اثر بقول پروفیسر ہاسکن، والچر راہب مالورن (المتوفی ۱۱۳۵ء) کے ذریعہ سے ظاہر ہوا، جس نے "علوم عربیہ" ایک یہودی المذہب عرب مسمی پطرس انفوزی سے حاصل کئے تھے۔ یہ یہودی عرب اس زمانہ میں انگلستان آیا تھا۔ اور یہی وہ زمانہ تھا (۱۱۰۷ء لغایۃ ۱۱۱۲ عیسوی) جبکہ یوروپ میں عربوں کا جا

علم الہیئت پہونچا۔

اسی زمانہ میں عربوں کا فن موسیقی مغربی یورپ میں داخل ہوا جس کی اشاعت میں انگلستان نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا - آٹھویں اور گیارہویں صدی کے درمیان عربوں نے قدیم یونان کی ایسی بہت کتب موسیقی کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا تھا جن کا نام تک مغربی یورپ کو معلوم نہ تھا - ان میں سے مندرجہ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

موضوع کتاب	نام کتاب یونانی	نام مصنف یونانی	
سر اور تال	Harmonics and Rhythmics	ارسطاکزینوس	Aristoxenos
گیت۔	Problems	ارسطو	Aristotle
لحنیات و قانون	Harmonics and Canon	اقلیدس	Euclid
لحنیات	Harmonics	بطلیموس	Ptolemy
لحنیات	Harmonics	نیقوماخوس	Nichomachos

مندرجہ بالا کتب کے تراجم کے علاوہ اکثر عرب مصنفین کے قلم سے طبعزاد کتابیں نکلیں - ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر مصنفین تھے :-

(۱) الکندی - (۲) السرخسی - (۳) بنو موسیٰ - (۴) ثابت ابن قرہ - (۵) ذکریا الرازی - (۶) قسطہ ابن لوقا (۷) الفارابی - (۸) بو علی ابن سینا - (۹) ابن باجہ۔

مسٹر ہنری جارج فارمر - ایم - اے کا قول ہے کہ جب ہم اس عہد کی یوروپین کتب موسیقی کا مقابلہ عرب معاصرین سے کرتے ہیں تو ہم شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتے ہیں - اس زمانہ کی موسیقیات ایک صحرائے بے آب و گیاہ تھا جس میں الفارابی کی "کتاب الموسیقی" اور ابن سینا کی کتاب "الشفا" سرسبز و شاداب نخلستان دکھائی دیتے ہیں۔

الغرض یورپ نے بہت جلد عربوں کی علمی و دماغی فوقیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا شروع کر دیا - اور طلبار فرنگ اندلس کی یونیورسٹیوں اور ہسپانیہ کے مدرسوں میں عرب اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے لگے، جہاں نہ صرف یونانی موسیقیات کے عربی تراجم پڑھائے جاتے تھے - بلکہ خالص عربی کتب موسیقی میں بھی درس دیا جاتا تھا - ان یونیورسٹیوں اور مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر جو مشہور طلبار مغربی یورپ کو گئے وہ جربرٹ، ہرمان کانٹرکٹ، قسطنطین افریقی، جان سیوائلی، گندیسالوی، جیرارڈ قریمونوی - اور فلاطون طفالوی تھے - اسی قسم کے انگریز طلبار میں الفریڈ، ایڈیلارڈ ساکن باتھ، رابرٹ ساکن ریٹائن، راجر ساکن ہیرفورڈ، اور دانیال مورلے کے نام بھی شامل کئے جا سکتے ہیں - ایڈیلارڈ ساکن باتھ نے اپنی ایک کتاب میں تحریر کیا ہے کہ اس نے فن موسیقی کی تعلیم فرانس میں پائی تھی اور ملکہ فرانس کے حضور میں قطار (ستار) بھی بجایا تھا (غالباً ۱۰۹۰ء سے قبل) علاوہ ازیں اس شخص

کی تصنیف کردہ ایک دوسری کتاب بھی شہر میلان کی ایمبر وزین لائبریری میں موجود ہے، جس کا ایک حصہ علم موسیقی کے لئے مخصوص ہے۔ اسی کتاب میں مصنف مذکور نے ایک عرب ماہر فن کا حوالہ دیا ہے جس کا نام اس نے الخوارزمی (Alchoarismus) تحریر کیا ہے۔ یہ شخص مشہور و معروف "حکیم ابو عبد اللہ خوارزمی" تو ہو نہیں سکتا کیونکہ حکیم مذکور کی کسی کتاب موسیقی کا ذکر عرب مصنفین نے نہیں کیا ہے۔ مگر گمان غالب ہے کہ یہ محمد ابن احمد خوارزمی ہوگا جس کی کتاب "مفاتیح العلوم" میں ایک فصل موسیقی کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ بہر حال بارہویں صدی عیسوی میں جدید علم موسیقی یوروپ کے اندر داخل ہوا۔ اور یہ شعبۂ موسیقی "الیقاعات" (mensural music یعنی تال اور سم) تھا۔

قیاس یہ بھی کہتا ہے کہ جب سنہ ۱۱۴۸ء میں ہسپانیہ کے "موحدین" نے از راہ تعصب غیر مسلموں پر زیادتیاں کرنا شروع کیں تو وہاں سے بہت سے یہودی دیگر ممالک میں منتشر ہوگئے۔ انھی میں مشہور و معروف یہودی "ابرہام ابن عذیر" اور دیگر یہودی بھی تھے جو اپنے ہم مذہبوں سے ملنے انگلستان آئے تھے۔ ابرہام لندن میں سنہ ۵۸-۱۱۵۹ء میں تھا اور یہیں اس نے اپنی کتاب موسیقی کا کچھ حصہ قلمبند کیا اور اسی زمانہ میں اس کی کتاب ایک انگریزی یہودی نے نقل کی۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی میں جب کتاب "سعدیہ" لکھی گئی تو یہودیوں نے عربوں سے علم موسیقی حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اسٹین شینڈر نے اپنی کتاب "یہودی لٹریچر" صفحہ ۱۵۴ میں لکھا ہے کہ "یہودیوں کا علم و فن موسیقی، دیگر علوم کی طرح، عربوں سے حاصل کیا گیا تھا"۔ اسی زمانہ میں یہودی لوگ عربی کتب موسیقی کا ترجمہ اپنی عبرانی زبان میں کرتے تھے۔ یہودی انسائیکلوپیڈیا" جلد اول صفحہ ۱۰۸ پر لکھا ہے کہ "ابن عقنین نے جن کتابوں کے پڑھنے کی سفارش کی ہے۔ ان کی فہرست میں الفارابی کی "کتاب الموسیقی" کا بھی نام ہے۔ علاوہ ازیں الفارابی کی دوسری کتاب "احصاء العلوم" کا ترجمہ بھی عبرانی زبان میں موجود ہے۔ پاپائے اعظم کے کتبخانہ واقع قصر فاتیقان میں ایک عربی کتاب موسیقی کا عبرانی ترجمہ موجود ہے۔ جو ابرہام ابن حجہ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس شخص نے جو سنہ ۱۱۳۶ء میں فوت ہوا، عربی کتابوں کا لاطینی ترجمہ کرنے میں بجید مدد دی تھی۔ یہ ابرہام ابن عذیر کا بڑا دوست تھا اور اس کے ساتھ ملکر کام کیا کرتا تھا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور امر قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ عربوں کے بہت پرانے یوروپین شاگردوں میں ایک شخص مسمی "ہرمان کانٹریکٹ" (سنہ ۱۰۱۳ء لغایتہ سنہ ۱۰۵۴ء) گذرا ہے۔ اُس نے فن موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس رسالہ میں اس شخص نے سُروں کی تعین میں ایک عجیب و غریب طریقہ علامات یا حروف کا استعمال کیا ہے اس سے قبل یوروپ میں ایسا کوئی طریقہ موجود نہ تھا۔ مثلاً ہرمان کانٹریکٹ نے حسب ذیل طریقہ سے مختلف سروں کو ظاہر کیا ہے:۔

نام سُر		علامت
AEqual	(Unison - برابر کا سُر)	e
Tonus	(Tone - لحن)	t
Semitonium	(Half - tone - ادھر)	s
Tonus cum semitonio	(Minor Third - اتری گندھار)	ts

ہرمان کانٹریکٹ نے یہ طریقہ عربوں سے لیا ہے۔ اور جو الکندی (المتوفی سنہ ۸۷۳ء) کے زمانہ میں وہاں موجود تھا

تال و سم
mensural music

تال، سم کا فن عربوں کو بہت قدیم زمانہ سے معلوم تھا چنانچہ الخلیل (المتوفی سنہ ۷۹۱ء) کی تصنیف الموسوم "کتاب الایقاع" (Rhythmics) میں یہ فن موجود ہے۔ یہ فن الکندی (المتوفی سنہ ۸۷۳ء) کو بھی معلوم تھا جیسا کہ مخطوطات الکندی سے ثابت ہوتا ہے جو برٹش میوزیم اور برلن میوزیم میں محفوظ ہیں۔ الفارابی بھی اس فن سے بخوبی واقف تھا۔ اور اس پر اس نے اپنی تصنیف "کتاب الموسیقی" میں پوری بحث کی ہے۔ جو لیڈن، میڈرڈ اور میلان کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ الفارابی نے سنہ ۹۵۰ء میں وفات پائی تھی۔ اخوان الصفا کے رسائل میں بھی اس فن پر خوب بحث کی گئی ہے جو سنہ ۱۸۸۹ء میں بمقام بمبئی اور سنہ ۱۳۰۶ھ میں بمقام قاہرہ طبع ہو چکے ہیں۔ بوعلی سینا (المتوفی سنہ ۱۰۳۷ء) نے بھی اپنی کتاب "الشفا" اور "نجات" میں اس فن پر بحث کی ہے۔ پہلی کتاب انڈیا آفس اور بوڈلین لائبریری اور دوسری کتاب صرف بوڈلین لائبریری میں پائی جاتی ہے۔ اندلس کی یونیورسٹیوں نے فارابی اور ابن سینا دونوں کی کتابیں گیارہویں صدی میں اپنے یہاں جاری رکھی تھیں۔ (المقری جلد سوم)

اپنے زمانہ میں جامعہ قرطبہ کا مدرسۂ موسیقی تمام دنیا میں مشہور تھا۔ دور دراز سے طلبہ آکر اندلس کی یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے تھے۔ اور وہاں وہ الخوارزمی، ابن الہیثم، البطانی۔ الفارابی اور بوعلی سینا وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں کیا کرتے تھے یہ مسلم مصنفین اور ماہرین فن مغربی یورپ میں جن ناموں سے مشہور تھے وہ حسب ذیل ہیں:۔

عربی نام		یوروپین نام
الخوارزمی	Algaurizm	Alchoarisimus
الهیثم		Alhazen
البطانی		Albategnius
الفارابی		Alpharabius

بنا Avicenna

جہ Avempace

الفارابی کی کتاب " احصاء العلوم کا پہلا لاطینی ترجمہ ۱۱۳۰ء اور ۱۱۵۰ء کے درمیان ہوا اور اس کی
کتاب "کتاب الموسیقی" کا اصل نسخہ (جو ابن باجہ سے نقل کیا گیا ہے) کتب خانہ میڈرڈ میں محفوظ
لر لاطینی زبان میں اس کا کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ ابن سینا کی کتاب موسیقی کا بھی اس وقت کوئی لاطینی ترجمہ
نہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ اس کا ترجمہ لاطینی میں ضرور ہوا تھا۔ کیونکہ یوروپین مصنفین اس کی عبارتیں
ل کرتے چلے آتے ہیں۔ ابن سینا کی کتاب " نجات" کا لاطینی ترجمہ موجود ہے مگر اس ترجمہ میں یہ عجیب بات
س کی جو فصل موسیقی کے متعلق تھی وہی ندارد ہے

قدیم یوروپین ماہرین موسیقی کی کتابوں میں " تال سم " کا کہیں پتہ نہیں کیونکہ یہ فن وہ جانتے ہی نہ تھے سب
۔وپین ماہر موسیقی فرانکو ساکن کولون (۱۱۹۰ء) جس کی کتاب ہم تک پہونچی ہے، ایسا شخص ہے جس نے
" کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ مگر کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فن مغربی یوروپ کی ایجاد نہ تھا بلکہ
رجگہ سے لیا گیا تھا جہاں وہ پوری طرح ترقی پا چکا تھا اور یہ فن " ایقاعات " کے نام سے عربوں میں بہت
ے موجود تھا۔ الغرض یوروپ میں تال سم کا فن عربوں کے ذریعہ سے پہونچا۔ یوروپین اصطلاح میں "تال
Hoquetus " " Hoketus " یا " Ochetus " اور ماہرین علم الالسنہ
انتے ہیں کہ یہ لفظ لفظ "ایقاعات" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

برٹش میوزیم میں ایک نہایت اہم مخطوطہ موجود ہے جس کا نام " لامعلوم الاسم نمبر ۴ " (Anonymous) ہے اور اس کی تاریخ ۱۲۷۳ء ۱۳۰۰ء بتائی جاتی ہے۔ بلحاظ مضمون اس مخطوطہ کا نام (De mensuris et discantu) ہے۔ اس کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یوروپ
یقی عربی علم موسیقی کا زیر بار احسان ہے۔ مخطوطہ مذکور میں جو بزبان لاطینی ہے، سروں کے متعلق دو اصطلاحات
" Elmuarifa " اور " Elmuahym " استعمال کی گئی ہیں۔ جو
ئی عربی اصطلاحیں ہیں۔ گیارہویں صدی کی ایک لاطینی و عربی لغت ہے جس کا نام " Glossarium
Latino Arabicum " ہے۔ دو اصطلاحیں بیان کی گئی ہیں۔ جن کا تعلق علم موسیقی سے ہے۔
ن اصطلاحیں " Elmuarifa " اور " Elmuahym "
عربی اصطلاحات معلومہ و معروفہ کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔

فرانس میں ونسنٹ دی بووے (۱۱۹۰ء تا ۱۲۶۴ء) کی کتاب " Speculum

"Doctrinale" جلد اول فصل ۱۷ میں جگہ جگہ الفارابی سے استناد کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کے نظریۂ موسیقی پر عربوں کا کس قدر زبردست اثر پڑا تھا۔ راجر بیکن ایک مشہور انگریز ماہر موسیقی (۱۲۱۴ء لغایۃ ۱۲۹۴ء) گذرا ہے۔ یہ بھی اپنے فن میں عربوں کا زیر بار احسان تھا۔ اپنی کتاب موسیقی "Opus Tertium" میں اس نے بطلیموس اور اقلیدس کے ساتھ الفارابی کی عبارتیں نقل کی ہیں اور اس کی کتاب "احصار العلوم" سے بار بار حوالہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے اپنی کتاب میں ابن سینا کی یہ رائے بھی نقل کی ہے کہ راگ راگنیوں کے ذریعہ سے امراض کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ اور والٹر آڈنگٹن (۱۲۸۰ء) تو عرب اساتذۂ فن کا اس قدر معتقد تھا کہ اس نے ابن سینا کو فن موسیقی میں سینٹ گریگوری، سینٹ برنارڈ حتی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے برابر بٹھا دیا ہے۔ اسی طرح جیروم نے جو الفارابی کا نہایت ارادتمند ہے اپنی کتاب "De musica" میں الفارابی کے بہت سے اقوال درج کیے ہیں سائمن ٹنسٹڈ (۱۳۱۰ء لغایۃ ۱۳۶۹ء) جونس ڈی میورِیز (۱۳۲۵ء) اور ہان بوائز (۱۴۷۰ء) تک "فن ایقاعات" انگلستان کے ماہرین فن موسیقی کو بخوبی معلوم ہو چکا تھا ڈی ہینڈلو نے لکھا ہے کہ "صوات واد قاف کے اجتماع سے" ایقاعات" (Hocketus) پیدا ہوتے ہیں" اور آگے چل کر لکھا ہے کہ "جب کسی راگنی یا لحن (melody) میں تان توڑ دی جاتی ہے تو اُسے سم یا "Hocketus" کہتے ہیں۔ اور جونس دی میو ریز نے عنوان "Hocketus" کے ذیل میں عرب ماہرین موسیقی کے .... ایک دوسرے فن کا حال لکھا ہے جو اس کے زمانہ تک موجود تھا اور جسے "Alentrada" کہتے تھے۔ یہ اصطلاح بھی عربی اصطلاح "طَرد" سے نکلی ہے جس کے معنی ہیں "آواز کو کھینچنا"

خاتمہ پندرہویں صدی کے بعد مغربی یورپ کی موسیقی سے عربی اثر زائل ہوگیا۔ کیونکہ مسلمانان اندلس کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی ان کا علمی و دماغی انحطاط بھی شروع ہوگیا تھا۔ مگر با ایں ہمہ سولھویں صدی تک یورپ میں عربوں کی زبردست شہرت قائم رہی حتی کہ جارج ڈالا نے ۱۵۰۱ء میں اور جارج ریش نے ۱۵۱۲ء میں بھی جب علم موسیقی پر اپنی مشہور کتابیں لکھیں تو انھوں نے جگہ جگہ الفارابی کے حوالے دئے —— الفارابی اور ابن سینا کے بعد تیرہویں صدی میں صفی الدین عبدالمومن نے بھی فن موسیقی میں بےحد شہرت حاصل کی۔ اس زمانہ میں ایک جدید حلقۂ درس (School) قایم ہوگیا تھا جنھیں "اصولی" (Systematists) کہتے تھے۔ اس حلقۂ درس کا امام یہی شخص صفی الدین عبدالمومن تھا۔ سر ہیوبرٹ پیری نے ان اصولیئن کی سرگم (scale) کے متعلق اپنی کتاب فن موسیقی (Art of music) میں لکھا ہے کہ یہ سرگم سب سے زیادہ مکمل تھی۔ "ہیلمہولٹز کا بھی یہی خیال ہے کہ اصولیئن کا یورپ پر بہت اثر پڑا۔ اور یہ لوگ جو اپنے سرگم میں "تیرہویں آواز" (major 7th) کا استعمال کیا کرتے تھے، یہ گویا شاہراہ ترقی میں ایک خاص نشان تھا جہاں سے علم موسیقی نے آگے ترقی کی

تاریخ کا ایک ورق مجہول

زامورہ

(دنیا کا ایک انتہائی بدنصیب شہر)

یوں تو دنیا میں بہت سے دیار و امصار ایسے ہیں جن کے لئے انسانوں نے باہم جنگ و خونریزی سے کام لیا، لیکن اس باب میں زامورہ کو جو تاریخی خصوصیت حاصل ہے وہ شاید ہی دنیا کے کسی مقام کو حاصل ہوئی ہو۔

اس بدنصیب شہر کا محاصرہ کتنی دفعہ ہوا، کتنی مرتبہ اس کی گلیوں میں انسانی خون پانی کی طرح بہایا گیا اور کتنی بار اس کی فضا لاشوں کے ڈھیر سے متعفن کی گئی؟ اس سوال کا جواب دنیا مشکل ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ بیس مرتبہ تو اہل عرب نے حملہ کر کے "جلالقہ" کے قبضہ سے اُسے نکالا۔ اور بیس ہی مرتبہ "جلالقہ" نے عربوں سے اس کو چھینا، یہاں تک کہ آج تاریخ میں اس کا نام "آتش و آہن" کے حرفوں سے لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی مسماریاں و بربادیاں اب بھی ان واقعات کو دہرا رہی ہیں اور وہاں کے آثار اور ویران قلعے ان تمام دردناک داستانوں کی زندہ تصویریں ہیں۔

عرب یہاں فاتحانہ داخل ہوے، لیکن الونز و ہسپانوی نے پھر سنہ ۸۴۵ء میں اُسے چھین لیا۔ اس کے بعد سنہ ۸۱۳ء میں دوبارہ اہل عرب قابض ہوئے اور پھر یہ مقام ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ سنہ ۹۳۹ء میں عبدالرحمان ناصر نے پھر واپس لیا مگر اہل ہسپانیہ دوبارہ اس پر قابض ہوگئے۔ الغرض اسی طرح بارہا عرب کا قبضہ یہاں ہوا اور ہر بار سنہ ۹۶۳ء سنہ ۹۸۴ء اور سنہ ۹۸۶ء میں ان کو یہاں سے ہٹنا پڑا۔ یہاں تک کہ عہد فرڈینانڈ اول میں جو لقب "کبیر" سے یاد کیا جاتا ہے، یہ مقام مستقلاً حکومت اسپین میں داخل ہوگیا اور سنہ ۱۰۶۱ء میں اُس نے یہ شہر اپنی حسین و محبوب بیٹی ڈونیا اوراکا کو ہدیہ میں دیدیا۔

لیکن چونکہ اس بدنصیب شہر کی قسمت ہی میں بربادی و خونریزی لکھی ہوئی ہے اور اس سے قبل عرب و جلالقہ وغیرہ کے خدا معلوم کتنے بچے کتنے بوڑھے اور کتنی عورتیں یہاں ذبح کی جا چکی تھیں، اس لئے یہاں کے خونریز و خوں آشام دیوتا نے اس مرتبہ بھی وہی قربانی طلب کی اور جب سنہ ۱۰۶۵ء میں فرڈینانڈ مر گیا تو اوراکا کے بھائی نے اس شہر پر قابض ہونے کے لئے جنگ شروع کر دی یعنی اگر اس سے قبل عرب و اہل اسپین باہم دست و گریباں

ظر آتے تھے، تو اب خود اہل ہسپانیہ آپس ہی میں اس بدبخت شہر کے لئے خونریزی پر آمادہ ہوگئے۔
اس وقت زامورہ جلالقہ اور عرب کی ملی ہوئی آبادی پر مشتمل تھا اور ان دونوں کے تعلقات باہم اس قدر شدید ہوگئے تھے کہ کوئی امتیاز نسل و مذہب کا باقی نہ رہا تھا اور ان لوگوں میں زاموری ہونے کی نسبت اسقدر ہی ہوگئی تھی کہ وہ اس کے سامنے کسی اور فرق و امتیاز کو دیکھتے ہی نہ تھے۔ اسی لئے جب کوئی لشکر زامورہ پر حملہ آور ہوتا تھا تو تمام آبادی بلا تفریق مذہب و نسل متحد ہو جاتی تھی۔ اور کوشش کرتی تھی کہ قتل خونریزی تک نوبت نہ پہونچے۔
اس لئے جس وقت فرڈنیانڈو کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا تو اُس نے زامورہ کی طرف جو اس کی بہن کے قبضہ میں تھا فوجیں روانہ کیں اور حکم دیدیا کہ شہر کا محاصرہ اس وقت تک برابر جاری رکھا جائے، جب تک شہر کے دروازے نہ کھولدئے جائیں اور قلعہ پر قبضہ نہ ہو جائے۔ اہل زامورہ حاکم شہر کے پاس گئے اور اس سے التجا کی کہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے دروازے کھولدئے جائیں اور بھائی بہن کی جنگ میں غریب اہل شہر کو قتل و ذبح کی مصیبت میں نہ مبتلا کیا جائے۔ لیکن حاکم شہر نے ان کی التجاؤں پر توجہ نہیں کی اور پورے عزم کے ساتھ مقابلہ کا ارادہ کر لیا۔

فریقین کے لشکر کو میدان جنگ میں چھوڑیئے اور زامورہ کی فصیل و خندق کے گرد جو انسانی خون رہا ہے اس سے قطع نظر کرکے تھوڑی دیر کے لئے شہر کے اندر آئیے اور دیکھئے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔
ایک مکان سے جو گلی میں واقع ہے نہایت ہی دردناک آواز آرہی ہے لیکن اس طرح جیسے کوئی تکلیف برداشت کرتے کرتے مجبور ہو جانے پر بھی پوری آزادی سے فریاد نہ کر سکے۔ یہ مکان محمد بن عبداللہ اموی کا ہے یہ آواز اسی کے خاندان میں سے کسی فرد کی ہے۔
کسی وقت یہ خاندان بہت بڑا خاندان تھا اور محمد بن عبداللہ جب جنگ کے لئے باہر نکلتا تھا تو کم از کم ان کی تعداد میں اس کے بیٹے پوتے وغیرہ گھوڑوں پر سوار اس کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے، اور دس بارہ عورتیں بھی ہمرکاب ہوتی تھیں تاکہ زخمیوں کی تیمارداری کریں۔ آخرکار محمد بن عبداللہ ایک جنگ میں کام آگیا رفتہ رفتہ اس کے بیٹے پوتے بھی اسی طرح ختم ہوگئے۔ اب اس گھر میں ایک چہل سالہ عورت جو محمد بن عبداللہ کی نواسی ہے سکونت پذیر ہے۔ اس کی ایک لڑکی فاطمہ ہے جس کی عمر دس سال کی ہے۔ اور ایک لڑکا ہے جو اپنے آٹھویں سال میں ہے۔ فاطمہ کا باپ ایک بار جو شکار کے لئے باہر نکلا تو واپس نہیں آیا۔ غالباً ڈاکوؤں نے اسے مار ڈالا۔ اسی وقت سے اس خاندان کی تباہیاں شروع ہوئیں۔ خیر فقر و فاقہ کی مصیبت تو تھی ہی قدرت نے

صحت بھی ان کی چھین لی اور ماں بیٹے دونوں صاحبِ فراش ہوکر حرکت سے مجبور ہوگئے۔ فاطمہ ہنوز اُٹھ بیٹھ سکتی تھی اور حیران تھی کہ اس فقر و فاقہ کی بلا کیونکر دور کرے اور اپنی بیمار ماں اور دم توڑنے والے بھائی کیلئے کہاں سے کھانے کا انتظام کرے۔

ایک رات معصوم فاطمہ باہر نکلی اور شہر پناہ سے گزر کر محاصرہ کرنے والی فوج کے کمپ میں داخل ہوگئی، جب وہ سپہ سالار کے خیمہ کے قریب پہونچی تو سنتری نے اُسے روک کر پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ میں سپہ سالار سے ملنا چاہتی ہوں کیونکہ ایک نہایت ضروری بات مجھے اس سے کہنا ہے۔

یہ سپہ سالار ردڈرج بیوار تھا جو تاریخ اسپین میں غیر معمولی شہرت رکھتا ہے اور جو اپنی شجاعت و اقدام کی وجہ سے اہلِ عرب میں بھی سید کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ سنتری نے یہ سنکر اس کو جانے کی اجازت دیدی اور چند منٹ میں وہ ایک شخص کے سامنے پہونچگئی جس کے چہرہ پر سوائے داڑھی کے اور کوئی چیز نظر ہی نہ آتی تھی۔ اس نے لڑکی کو تھوڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ دیکھا اور پھر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد بھی دیر تک وہ فاطمہ کو دیکھتا رہا اور پھر پوچھا کہ "کیا چاہتی ہے"

فاطمہ نے کہا — "میں ایک عرب کی بیٹی اور ایک عرب کی پوتی ہوں اور شہر زامورہ ہی کی روشنی میں میں نے آنکھ کھولی اور یہیں پرورش پائی۔ میرا خاندان یہاں اس زمانہ سے مقیم ہے، جب عبد الرحمان ناصر نے یہاں فاتحانہ داخل ہوکر اسلامی جھنڈا نصب کیا تھا اور آج تک محمد بن عبد اللہ اموی اپنے مورث اول کے دین اور اسکی تعلیمات سے ہمارے خاندان کے کسی فرد نے انحراف نہیں کیا۔ اس خاندان کا ایک ایک فرد زامورہ کی حفاظت وحمایت میں ———— فنا ہوچکا ہے۔ اور اب سوائے میرے جسے آپ اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں یا ایک صاحبِ فراش ۴۰ سالہ عورت کے جو میری ماں ہے اور ایک آٹھ سال کے لڑکے کے جو میرا بھائی اور قریب الموت ہے۔ کوئی اور شخص خاندان میں باقی نہیں رہا۔ ہم لوگ اب ننگے ہیں بھوکے ہیں، بیمار و لاچار ہیں اور شاید صرف چند دن کے مہمان۔ لیکن اے سردار میں آپ سے روٹی طلب کرنے نہیں آئی، کپڑے کا سوال کرنے نہیں آئی کیونکہ دست سوال دراز کرنے سے بہتر یہ ہے کہ انسان مرجائے۔ بلکہ میں آپ سے ایک چیز طلب کرنے آئی ہوں اور وہ یہ کہ ہم لوگوں کو شہر سے نکل جانے کی اجازت دیجئے اور اہلِ لشکر کو ہدایت کردیجئے کہ وہ ہمارے مزاحم نہ ہوں۔ میں اس عنایت کے عوض میں آپ کو ایک زمرد کا ٹکڑا دونگی جو اب تنہا یادگار ہمارے خاندان کے زمانۂ ثروت کی باقی رہگیا ہے۔ آپ یہ زمرد قبول کیجئے اور اس کے عوض مجھے ایک گھوڑا دیجئے تاکہ اُسپر اپنی بیمار ماں اور صاحبِ فراش بھائی کو بٹھاکر لیجاؤں"

یہ سنکر سردار کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر ہاتھ بڑھاکر بولا کہ "لاؤ زمرد مجھے دو، تمھاری خواہش پوری

کر دی جائے گی۔" فاطمہ نے اپنی مٹھی کھول کر زمرد کا ٹکڑا سردار کو دیا اور بولی کہ۔ لو یہ تمھارے گھوڑے کی قیمت ہے، میں کسی ہسپانوی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتی۔"

فاطمہ اپنی ماں اور بھائی کو گھوڑے پر سوار کرکے خود بھی پیدل ساتھ چل رہی ہے اور تین سوار ہسپانوی لشکر کی حفاظت کے لئے ساتھ ہیں۔ جب لشکر کے حدود سے یہ مختصر سا قافلہ گزر گیا۔ اور مزاحمت کا اندیشہ باقی نہ رہا تو یہ لوگ ایک جگہ رُکے اور ان تین سواروں میں سے ایک سوار آگے بڑھکر فاطمہ سے مخاطب ہوا کہ" اے لڑکی تو نے ایک گھوڑا خرید کر اپنی ماں اور بھائی کو سوار کردیا اور باوجود ہمارے اصرار کے تو نے اپنے لئے کوئی سواری قبول نہ کی اور پیدل چلنا ہی گوارا کیا۔ اب کہ ہم تم جدا ہو رہے ہیں، میں ایک التجا تجھ سے کرتا ہوں، اُمید ہے کہ تو قبول کریگی۔"

یہ کہکر سوار نے اپنے چہرہ سے نقاب اٹھائی تو فاطمہ دیکھکر حیران رہگئی کہ یہ تو خود سپہ سالار ہے جس سے اُس نے گفتگو کی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے زمرد کا ٹکڑا فاطمہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ" اس کو اپنے ہی پاس رکھو کیونکہ یہ تمھارے خاندان کی عزیز یادگار ہے، اور میں بھی اس یادگار کا احترام کرتا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اہل عرب جو مجھے سید کے لقب سے یاد کرتے ہیں واقعی خود بھی سردار و سید ہیں اور ان کی یادگار کا احترام مجھ پر واجب ہے"

فاطمہ نے آنکھوں سے آنسو ٹپکاتے ہوئے، زمرد واپس لیا اور بولی کہ اے سردار واقعہ یہ ہے کہ جنھوں نے تجھے سید کا لقب دیا اُنھوں نے غلطی نہیں کی، تو واقعی اسی کا مستحق تھا"

یہ کہکر فاطمہ نے اپنا راستہ اختیار کیا اور زامورہ کو آگ اور خون سے کھیلنے کے لئے ہمیشہ کے واسطے اپنے پیچھے چھوڑ گئی ——

تذکرۂ خندۂ گل مولفہ عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات معہ ان کے لطائف وظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت معہ محصول دو روپئے آٹھ آنے (عہ)

مثنوی لالہ رُخ طامس مور کی معرکتہ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ ہے قیمت معہ محصول صرف عہ

مینیجر نگار لکھنؤ

فطرت اور انسان کی جنگ

انسانی آبادی کا عجیب و غریب معمہ

کہا جاتا ہے کہ دنیا کی رونق، تنوع اور تفریق سے قائم ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن جب اس قسم کا تفاوت ضرورت سے زیادہ ہوجاتا ہے تو سخت روحانی اذیت کا سبب بن جاتا ہے۔ خصوصاً نوعی، جنسی، نسلی، قومی اور اہلی نقطۂ نظر سے جب ہم ان اختلافات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس وقت ہمارے لئے یہ ناممکن ہوجاتا ہے کہ ہم فلسفیانہ سکون و اطمینان کو قائم رکھ سکیں۔ اور پھر ہم ایسے موقعوں پر اصلاح و انقلاب کے خواہشمند ہوتے ہیں تاکہ مساوات، ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا ہوسکے۔

ایک شخص تندرست ہے دوسرا مریض، ایک امیر ہے دوسرا فقیر، ایک عقلمند ہے دوسرا بیوقوف، ایک آزاد ہے دوسرا غلام، ایک عالم ہے دوسرا جاہل، ایک محنتی اور جفاکش ہے دوسرا کاہل آرام طلب، ایک میں اہلیت و استعداد لطف اندوزی کی ہے دوسرا اس سعادت سے محروم ہے ——— یہ تمام مختلف مظاہر، اگر معقول حدود کے اندر رہیں تو ضرور تنوع اور دلچسپی کا ذریعہ بن سکتے ہیں، لیکن جب یہ جائز حدود سے متجاوز ہوجاتے ہیں تو ان سے وہ دشوار اور تکلیف دہ مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں جن کا حل سوچنے کے لئے ہمیں انسانی ہمدردی و رافت مجبور کرتی ہے۔

انسان اور فطرت ——— ان دونوں کے باہمی تعلق و تفاعل عمل و رد عمل کا نام حیات اور ترقی و تہذیب ہے فلسفی و مصلح ہر عہد و زمانہ میں، ان کے باہمی تعلقات کی جستجو میں سرگرداں رہے ہیں۔ ان مسایل پر غور کرتے وقت سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کا انسان سے کیا رشتہ ہے آیا اس میں محبت و رافت، مہربانی و فیاضی، ہمدردی و دلجوئی شامل ہے یا دشمنی و عداوت، بخل و دنائت، بے دردی و ایذا رسانی۔ آیا موجودہ عہد کے جس قدر آلام و مصائب ہیں ان کی ذمہ داری، فطرت پر عائد ہوتی ہے یا خود انسان اور اس کے اداروں پر ــــ اگر فطرت اس کی ذمہ دار ہے تو کیا ہمیں انسان کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جانا چاہئے یا کم از کم کچھ زیادہ خوشگوار توقعات قائم نہ کرنا چاہییں اور اگر انسان خود ذمہ دار ہے تو کیا ہمیں انسانی ترقی و تکمیل کی امید رکھنا چاہئے۔ اور جن برائیوں کو اپنی غفلت ظلم اور نادانستگی میں اس نے اپنے اوپر مسلط کیا ہے کیا انھیں وہ اپنی پیش بینی، انصاف اور صبر و ضبط سے رفع کرسکتا ہے یا نہیں؟ ان سوالوں کے

جواب جو اہل فلسفہ کی طرف سے دیا جاتا ہے، اس کی دو بڑی قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ وہ لوگ جنھیں فطرت کی طرف سے خوش اعتقادی ہے اور جو انسان کی برائیوں کا الزام، انسان کی عارضی بدعنوانیوں کے سر رکھتے ہیں انھیں ہم متفاول فلسفی (Optimist) کہتے ہیں اور جو فطرت اور فطری و جبلی خواہشات کو نہانی مصائب کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں انھیں ہم متشائم فلسفی (Pessimist) کہتے ہیں۔

قدیم زمانہ کے فلسفی، مادی اور جسمانی دنیا سے زیادہ، روح اور مابعد حیات کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے تھے اور ہرچند ان کے زمانہ کے حکمرانوں اور امیروں کا طبقہ، لذائذ دنیوی سے بہرہ اندوز ہونے میں کمال رکھتا تھا، مگر عوام، اپنی نیکی کے ثمرہ کے لئے، اکثر و بیشتر عقبےٰ کے منتظر رہتے تھے اور جس طرح ہو سکتا تھا علمائے مذہب کی خواب آور لوریاں سن سن کر۔ آرام یا مصیبت سے، اپنی چند روزہ زندگی دنیا میں بسر کر دیتے تھے۔ مگر عہد جدید کے فلسفیوں کا کہنا یہ ہے کہ انسان کو اس کی تمام کوششوں کا صلہ یہیں آرام و راحت کی شکل میں ملنا چاہئے۔ اس لئے اگر ایک شخص نیکی کرتا ہے تو اس کا نتیجہ اُسے خود، یا اس کی اولاد کو، یا نسل انسان کو، اسی دنیا میں نظر آنا چاہئے۔ اور اگر بُرائی کرتا ہے تو اس کی سزا بھی اسے یہیں بھگتنا چاہئے، وہ مذہبی آدمیوں کی فردوس کو، مادی جامہ پہنا کر دنیا ہی میں تعبیر کرنا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لئے مختلف فلسفی مختلف نظریے پیش کرتے ہیں جن پر عمل کرنے سے ان کے قول کے مطابق، دنیا کے آدمی، دنیا میں رہ کر، فردوس کا لطف حاصل کر سکیں گے۔ ان متفاول فلسفیوں میں، ایک فلسفی روسو تھا، جس کی تصانیف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے فرانس میں ایک ایسا ذہنی انقلاب پیدا کر دیا جو بعد کو سیاسی و اجتماعی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ روسو کی کتاب "اجتماعی معاہدہ" (Social Contract) کی ابتدا اس جملہ سے ہوتی ہے کہ "انسان کو فطرت نے آزاد پیدا کیا تھا مگر اب وہ ہر جگہ پا بہ زنجیر ہے" اس کا انسان کی "طبعی حالت" کے متعلق یہ نظریہ ہے کہ وہ حالت مسرت، آزادی، فارغ البالی اور دیگر تمام برکات کا مخزن تھی، لیکن موجودہ اجتماعی تنظیم نے، انسان سے اس کے ابتدائی دور نشاط و کامرانی کو چھین لیا اور اب وہ آلام و مصائب کا شکار ہے۔ روسو، اس کا تمام تر الزام، اپنے عہد کے اداروں اور طریقۂ تنظیم پر رکھتا ہے اور اُن کے انقلاب کا خواہشمند ہے کیونکہ فطرت کی فیاضی اور بے دریغ بخشش پر اُسے پورا ایمان ہے۔ روسو کے علاوہ اس کے عہد کے دوسرے فلسفی بھی مثلاً ولیم گاڈون اسی قسم کا تفاول، فطرت اور انسانی ترقی کے متعلق رکھتے تھے اور انکی خوش عقیدگی اس معاملہ میں اس قدر حد سے تجاوز کر گئی کہ ان پر کھلے ہوئے حقائق کے نظر انداز کرنے کا الزام عاید کیا جانے لگا اور اُن کے خلاف ایک جماعت متشائم فلسفیوں کی پیدا ہو گئی جس کے قائد اعظم رکارڈو اور مالتھس تھے۔ رکارڈو نے واقعات اور حقائق سے فطرت کی فیاضیوں کی قلعی کھول دی اور مالتھس نے انسانیت

کی غیر محدود ترقی و تکمیل کے خواب سے لوگوں کو چونکا دیا۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ اشیا کی قلت دنیا کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ فطرت اور انسان کے معاملات و تعلقات میں ہر قدم پر ہمیں فطرت کے بخل، دنائت، شقاوت اور غداری سے سابقہ پڑتا ہے اور انسان ان سب کو لاچاری اور بے بسی کے عالم میں برداشت کرنے کے لئے مجبور ہے۔ محنت و سرمایہ کے ہر جدید اضافہ کے معاوضہ میں فطرت متناسب صلہ عطا نہیں کرتی بلکہ ان کا اثر گھٹتا جاتا ہے حتیٰ کہ نفع کی جگہ نقصان نظر آنے لگتا ہے۔ غذا کے طور پر جو اشیاء استعمال کی جاتی ہیں ان کی مقدار محدود ہے۔ ان میں اضافہ، آبادی کے اضافہ کے تناسب سے نہیں ہوتا۔ آبادی زیادہ بڑھتی رہتی ہے اور ذرائع حیات کم ترقی کرتے ہیں۔ فطرت ہر شے کو تشنہ رکھتی ہے اور مسرت و شادمانی کے ساتھ، خواہشات کے پورا ہونے میں مزاحم ہوتی ہے۔ فطرت ہر شخص کے گلے میں دق کے جراثیم جمع کرتی رہتی ہے جو اس کے زمانۂ کمزوری و خستگی کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور جب اس میں تاب مقاومت مضمحل ہو جاتی ہے تو پوری قوت کے ساتھ اس کی جان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ فطرت کے متعلق ان حقایق کے ظاہر ہونے سے واقعات بالکل نئی روشنی میں نظر آنے لگے اور عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کے اس عقیدے کی تائید میں کہ "انسان دنیا میں خدا کا ملعون اور مقہور بندہ ہو کر زندگی بسر کرتا ہے" ماہرین اقتصادیات و حیاتیات کے اقوال سے بھی شہادت دستیاب ہونے لگی۔

علمائے حیاتیات، دو ہم رتبہ قوتوں کو ارتقا کی علت قرار دیتے ہیں۔ ایک قوت وراثت کی ہے جو نسلی خصوصیات کو افراد میں منتقل کرتی ہے ——————

——————

——————

—————— اور دوسری تنوع و تبدیلی کی قوت ہے جس کی بنا پر افراد اپنے اندر وہ تبدیلی پیدا کرتے ہیں جس سے ان میں ماحول کے مطابق بن جانے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ارتقا کی محرک کیا چیز ہوتی ہے اور ماحول میں ایسی کونسی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے اور اس طرح اپنا وجود قائم رکھنے کے لئے ہر ذی حیات کو اپنے اندر بھی ایک تبدیلی پیدا کرنا پڑتی ہے۔ اس کا جواب ہمیں ذی حیات عضویات کی اس خصوصیت میں ملتا ہے کہ طبعی حالت میں ان میں سے ہر ایک اپنی نسل کو ذرائع حیات سے زیادہ توسیع دیتا رہتا ہے۔ اس لئے ہر نئی نسل کو زندہ رہنے کے لئے زیادہ سخت کشمکش کرنا پڑتی ہے۔ اور اسی سے ان میں نئی قوتیں، اہلیتیں اور نئے عضو پیدا ہو جاتے ہیں اور پرانے فنا ہو جاتے ہیں اور اسی کا نام ارتقا ہے۔ آبادی کا کثرت کی طرف جو میلان ہے اس کی طرف پوری توجہ، سب سے پہلے، مالتھس نے مبذول کرائی۔ اور ڈاروِن اور والیس نے اسی کے نظریۂ آبادی سے

استفادہ کرکے اپنے نظریۂ ارتقا کی بنیاد ڈالی۔

اب آیئے دیکھیں مالتھس کا نظریۂ آبادی کیا ہے؟ اس نظریۂ آبادی کو پیش کرنے کا سبب جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا گیا ہے ولیم گاڈون کا غیر ذمہ دارانہ متفاول فلسفہ تھا۔ جس کا اظہار اس نے اپنی تصنیف "محقق" (Enquirer) میں کیا تھا۔ اس کے علاوہ اپنی کتاب "سیاسی انصاف" (Political Justice) میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ یہ ممکن ہو کہ ایک وقت ایسا آئے کہ ہم زندگی سے اس قدر معمور ہو جائیں کہ ہمیں رات کو سونے اور آرام کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے اور موت ہمارے لئے غیر ضروری ہو جائے۔ شادی کی خواہش کی جگہ، ذہنی تربیت کا شوق ہم پر غالب ہو جائے اس وقت ہم فرشتوں کی مانند ہوں گے اور پھر ہمیں دوسری ایجادات کا متوقع رہنا چاہئے جو تندرستی اور طول عمر کے قدم بہ قدم چلتی رہینگی مثلاً جنگیں، جرائم، انتظام عدالت سب مفقود ہو جائیں گے اور حکومت کی کوئی ضرورت نہ رہیگی۔ اس کے علاوہ نہ کوئی مرض ہوگا نہ تکلیف نہ رنج و غم ہوگا نہ غیض و غضب۔ ہر فرد نہایت جوش و مستعدی کے ساتھ کل جماعت کی منفعت کو پیش نظر رکھے گا۔"

۱۷۹۸ء میں اس دلفریب اور خوشش آیند حباب کو ٹھیس لگانے کے لئے مالتھس نے اپنا پہلا مضمون "اصول آبادی" کے متعلق شائع کیا۔ اس سے ایک کھلبلی مچ گئی اور چاروں طرف سے اس پر لعنت اور ملامت ہونے لگی۔ لوگوں نے اس پر الزام رکھا کہ وہ چیچک، غلامی اور طفل کشی کا حامی ہے۔ خیرات اور غربا کی امداد کا مخالف ہے کم عمری میں شادی کو مصیبت بتلاتا ہے اور حکومتوں کے متعلق یہ رائے رکھتا ہے کہ جس قدر کوششیں یہ عام منفعت کے کاموں کے لئے کرتی ہیں ان سب کا نتیجہ فائدہ کی بجائے نقصان ہوتا ہے مختصر یہ کہ ان کے نزدیک مالتھس ایک سخت شقی القلب متشائم فلسفی تھا جو حیات کی تمام مسرتوں اور نیکیوں کو برباد کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ تمام الزامات سراسر بے بنیاد تھے۔ مالتھس کو انسانیت سے محبت تھی اور اسے روسو اور ولیم گاڈون کے خیالات سے پوری ہمدردی تھی مگر وہ حقایق سے انحراف کرنا نہیں چاہتا تھا اور اسی لئے اس نے احتجاج کے طور پر اپنا یہ مشہور و معروف مضمون سپرد قلم کیا تھا۔

اُسکے مضمون کی ابتدا دو مسلمات سے ہوتی ہے۔ اول یہ کہ غذا انسان کی زندگی کے لئے ضروری ہے دوم یہ کہ شہوانی خواہشات بھی انسانی حیات کا لازمی جزو ہیں اور ان کا اپنی موجودہ حالت پر قائم رہنا یقینی ہے اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ان مسلمات کو صحیح باور کرنے کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آبادی میں اضافہ کی قدرت زمین کی غذا پیدا کرنے کی استطاعت سے بہت زیادہ ہے۔ آبادی میں اضافہ، اگر کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو، اقلیدس کے تناسب (Geometrical Ratio) یعنی ۱ - ۲ - ۴ - ۸ - ۱۶ - ۳۲ - ۶۴-

۱۲۸ - ۲۵۶ وغیرہ جیسا ہوتا ہے۔ مگر غذا میں اضافہ حسابی تناسب (Arithmetical Ratio) یعنی ۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ - ۷ - ۸ - ۹ وغیرہ کی طرح ہوتا ہے۔ مثلاً اگر آبادی ۱۰۰ آدمی اور غذا ۱۰۰ ٹن گیہوں ایک سال میں ہے تو اگر آبادی کو روکنے کے لئے موانع نہ ہوں تو ۹ سال بعد آبادی ۲۵۶۰۰ ہوجائے گی اور غذا صرف ۹۰۰ ٹن گیہوں ہوگی۔ پہلے غذا کا تناسب اگر ایک ٹن یعنی تقریباً ۲۷ من فی کس تھا تو ۹ سال بعد یہ تناسب ایک من فی کس سے بھی کم ہوجائیگا۔

فطرت نے نباتات اور حیوانات میں زندگی کے تخم کو نہایت اسراف کے ساتھ منتشر کیا ہے مگر ان کے پرورش پانے کے لئے جس قدر غذا اور گنجائش کی ضرورت ہے اس کے مہیا کرنے میں اُس نے بخل سے کام لیا ہے ہمارے کرۂ زمین میں حیات کے جو جراثیم ہیں اگر اُنھیں کافی غذا اور کافی جگہ پھیلنے کیلئے ملے تو چند ہزار سال میں لکھوکھا دنیاؤں کو آباد کر سکتے ہیں۔ لیکن احتیاج و ضرورت کا بے درد اور عالمگیر فطرتی قانون اُنھیں حد سے متجاوز نہیں ہونے دیتا۔ نباتات اور حیوانات کی نسل اس امتناعی قانون کی زد میں آکر کم ہونے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے اور انسانی نسل بھی اپنی تمام عقل و حکمت کی کوششوں کے باوجود اس قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی نباتات اور حیوانات میں اس کے نتائج، تخم کے ضائع ہوجانے، بیماریوں کے پیدا ہونے اور قبل از وقت موت کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور انسانوں میں بدکاری افلاس اور مصیبت کی شکل میں غرضکہ زندگی ہمیشہ اور ہر جگہ اپنی جائز حدود سے متجاوز ہوجاتی ہے۔ اور نتیجہ عالمگیر تکلیف اور تباہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس قدر بیان کرنے کے بعد مالتھس یہ کہتا ہے کہ اگر آبادی ہمیشہ اور ہر جگہ اپنے جائز حدود سے متجاوز ہوجاتی ہے تو لازمی طور پر اس کے اضافہ کو روکنے کے لئے مستقل موانع ہونے چاہئیں۔ اور اس سلسلہ میں وہ بہت سے موانع کے نام گنا تا ہے۔ "آخری مانع" تو غذا کی قلت ہے لیکن عام طور پر اس کی نوبت ذرا کم آتی ہے اور فوری موانع سے کام چل جاتا ہے یہ بیماریوں اور نقصان رساں رسموں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ نتیجے ہوتے ہیں خوراک اور گنجائش کی قلت کا۔ "فوری موانع" کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ (۱) اجباری (Positive) اور (۲) اجتنابی (Preventive) اجباری موانع میں غیر تندرست پیشے، سخت ترین محنت، امراض، خراب پرورش، جنگ، وبائی امراض اور قحط شامل ہیں، اور اجتنابی موانع میں اخلاقی ضبط اور بدکاری شامل ہیں۔

جیمس بونر نے ایک کتاب "مالتھس اور اس کی تصنیف" کے عنوان سے لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام قسم کی برائیوں پر غلبہ پانے سے مایوس ہوکر مالتھس اپنے مطالعہ کو صرف ایک برائی تک محدود رکھتا ہے۔ وہ برائی ذی حیات اجسام کی یہ خصوصیت ہے کہ اُن کا میلان ہمیشہ اس طرف رہتا ہے کہ غذا کی جس قدر موجودہ رسد ہو

اس سے زیادہ اضافہ اپنی تعداد میں کریں۔ نباتات اور حیوانات عقل سے محروم ہوتے ہیں اس لئے وہ نئی زندگیوں
کے ہجوم دنیا میں پیدا کرتے رہتے ہیں جن کا انجام یہ ہوتا ہے کہ فاقہ کی وجہ سے فنا ہوجاتے ہیں۔ کشاکش، غذا اور
گنجائش کے لئے ہوتی ہے ایک فرد کی بقا کا راز صرف اس بات میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر اہلیت اپنے
ہمجنسوں کو گوشۂ گمنامی کے جم غفیر میں ڈھکیل دینے کی رکھتا ہے۔ لیکن انسان اُن سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کی
اہلیتیں اُن سے زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ افزائش نسل کی خواہش۔ اس میں بھی اتنی ہی زبردست ہوتی ہے مگر وہ اندھے
پن سے اس کو پورا نہیں کرتا ہے۔ وہ اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ دنیا میں ایسی
چیزوں کا اضافہ کر رہا ہے جن کی پرورش سے وہ قاصر رہیگا۔ مگر جب وہ عقل اور دور اندیشی کو ترک کر دیتا ہے تو
وہ اپنی تعداد، ذرائع حیات سے زیادہ بڑھانے کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور اس تعداد کو ذرائع حیات کے حدود میں
لانے کے لئے فطرت، فاقہ اور مرض کے ہتیار استعمال کرتی ہے۔ مالتھس یہ ثابت کرتا ہے کہ آبادی کا جہاں تک
تعلق ہے وہ از خود بڑھتی رہتی ہے مگر غذا ایک بیرونی عمل سے بڑھتی ہے یعنی ان انسانوں کی مساعی سے جو غذا کے
خواہشمند ہوتے ہیں اس کے علاوہ کھانے کی خواہش ایک فطری چیز ہے لیکن غذا کے حاصل کرنے کا کام ایک
اکتسابی فعل ہے۔ اس طرح مقابلہ دو مختلف قسم کے اضافوں میں ہوتا رہتا ہے۔ ایک اضافہ فطری اور جبلی
خواہش کی بنا پر ہوتا ہے اور دوسرا انسانی سعی و محنت کے سبب سے انسانی آبادی نہایت آسانی سے ہر پچیوں
سال دوگنی ہوسکتی ہے۔ مگر غذا میں اضافہ، زراعت کی تمام ترقی و توسیع کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور اس بات کو
بھی تسلیم کرنے کے بعد کہ گاڈون کی اجتماعیت (Communism) سے حالات بہت کچھ درست
ہوجائیں گے، انسانی سعی و محنت کے روز افزوں صرف کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ دولت کی ۱
غیر مساوی تقسیم سے وہ فوائد جو اضافۂ غذا سے حاصل ہونے چاہئیں وہ عام نہ ہوسکیں گے۔ مگر قابل التفات
بات یہی ہے کہ ہر جدید سعی سے جو پیداوار حاصل ہوگی وہ قدیم سعی کے مقابلہ میں برابر کم ہوتی رہیگی۔ اس سب کا
خلاصہ یہ ہوا کہ کرۂ ارض کے بہت بڑے حصہ میں آبادی کے واقعی اضافہ کی مقدار، اضافہ غذا کے قانون
کے ماتحت ہمیشہ اس اضافہ کی مقدار سے بہت مختلف رہیگی جو آبادی کو بلا روک ٹوک بڑھنے کا موقعہ دینے سے
حاصل ہوسکتی ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے، بائبل کے اس قول کی کہ "اپنی پیشانی کے پسینہ کے ساتھ، انسان کو دنیا میں روٹی کھانا
ہوگی" تصدیق ہوتی ہے اور اسی بات پر ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ مالتھس سے پہلے کیوں اُس کے سمجھنے سے لوگ قاصر ۲
رہے۔ اور اُنھوں نے حد سے زیادہ اضافہ آبادی اور افلاس و مصیبت میں جو رشتہ و تعلق ہے اس کو ایک
بدیہی حقیقت کی حیثیت سے کیوں نہ تسلیم کیا۔ اور کیوں حکمرانوں، مدبروں اور سیاسی رہنماؤں نے اضافہ

آبادی کو قوم کے لئے موجب برکت و رحمت سمجھا۔

ولیم سوم۔ لوئی چہار دہم، میریا تھیریسا برابر کثیر اولاد پیدا کرنے والے خاندانوں کے ساتھ خاص مراعات کرتے رہے۔ اور غیر شادی شدہ افراد پر ٹیکس عاید کرکے انھیں شادی کی طرف مائل کرتے رہے۔ جان گرانٹ، ولیم پیٹی، جان لاک، ٹامس من، سر جوشوآ چائلڈ سب اضافۂ آبادی کے حامی تھے۔ جان گرانٹ (John Grant) کہتا ہے:۔ "انسانی ہاتھ دولت و ثروت کے باپ ہیں، اور زمین اس کی ماں ہے۔ اس لئے بادشاہ اپنی رعایا کی کثرت اور قلت کے مطابق، دولتمند اور طاقتور ہوتے ہیں۔ بنابریں ہمیں اس بات پر بالکل تعجب نہ کرنا چاہئے کہ حکومتیں کیوں شادی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھاتی ہیں اور آزادانہ بے راہ روی کا انسداد کرتی ہیں کیونکہ اس طرح وہ نہ صرف اپنے اغراض و مقاصد کی حفاظت کرتی ہیں بلکہ خدا کے قوانین کی توہین اور خلاف ورزی سے لوگوں کو باز رکھتی ہیں"

سر ولیم پیٹی (Sir William Petty) کہتا ہے:۔ "آبادی کی قلت، حقیقی افلاس ہے۔ ایک قوم جس کی آبادی ۰۰ لاکھ ہے، دوسری قوم سے جس کی آبادی ۴۰ لاکھ ہے دو چند دولتمند ہوتی ہے۔" جان لاک (John Locke.) اُس کے اس قول کی تائید کرتا ہے۔ ٹامس من کہتا ہے کہ "جہاں آبادی کثیر ہوتی ہے اور صنعت و حرفت کی حالت اچھی ہوتی ہے وہاں آمد و رفت زیادہ ہوتی ہے اور ملک مرفہ الحال ہوتا ہے۔" سموئل فورٹری اور سر ولیم ٹیمپل کا بھی یہی خیال ہے۔ موخر الذکر کہتا ہے "قوموں کا اصلی اور قدرتی دولت کثرت آبادی ہے۔ مگر جس زمین پر وہ آباد ہوں اُسی سے انھیں تعلق ہونا چاہئے" سر جوشوآ چائلڈ (Sir Joshua Child.) کا یہ عقیدہ تھا کہ آبادی کے اضافہ سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور آبادی کی کمی افلاس کا پیش خیمہ ہے"

مگر مندرجہ بالا جتنے "تجاریین" کا ذکر کیا گیا اُن کی نظر حکومت اور جماعت کی دولت پر رہتی تھی، انھیں انفرادی خوشحالی اور ثروت کی طرف کوئی دھیان نہیں تھا۔ لیکن آدم اسمتھ (Adam Smith) کی تصانیف سے کثیر آبادی کی تائید اور مخالفت دونوں کے لئے مواد فراہم ہوسکتا ہے۔ ایک جگہ وہ اپنی کتاب (Wealth of Nations.) میں لکھتا ہے کہ ایک قوم کی مرفہ الحالی کا فیصلہ کن نشان اس کی آبادی کی کثرت ہے" مگر دوسری جگہ لکھتا ہے "ملکوں کو اس پیداوار کے تناسب کی بنا پر آباد نہیں کہا جا سکتا جس سے اُن کے کپڑے اور مکان بن سکتے ہیں بلکہ انھیں اُس پیداوار کی تناسب سے آباد کہا جا سکتا ہے۔ جو غذا فراہم کرنے کیلئے ضروری ہے" دوسری جگہ وہ بالکل وہی کہتا ہے جو بعد میں مالتھس نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ کہا یعنی یہ کہ "حیوانات کی ہر ایک قسم اپنی تعداد میں

قدرتی ذرائع حیات کے تناسب کے مطابق اضافہ کرتی ہے اور حیوانات کی کوئی قسم اس سے زیادہ نہیں بڑھ سکتی"۔ اس نظریہ سے ڈارون کو تو مدد نہیں ملسکتی تھی کیونکہ ڈارون کا نظریہ تو یہ ہے کہ حیوانات کی ہر ایک قسم اپنی نسل کی توسیع میں ذرائع حیات کی حدود سے متجاوز ہوجاتی ہے اور اس کی بنا پر تنازع للبقا ——— (Struggle for Existence) اور بقائے اصلح (Survival of the fittest) کے قوانین پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ مگر مالتھس سے قبل اس ضمن میں جو خیال ظاہر کئے گئے۔ ان میں آدم اسمتھ کا یہ بیان امتیازی درجہ رکھتا ہے۔

مالتھس سے قبل اضافۂ آبادی کے متعلق جو خیالات تھے ان کو مختصر طور پر بیان کرنے کے بعد اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ آیا واقعی مالتھس کے بیان میں کوئی ایسی نئی اور اہم بات تھی جس کے محسوس کرنے سے اس کے پیرو قاصر رہے۔ اس سوال کا جواب ہمیں مالتھس کے معترضین دے سکتے ہیں اور اب ہم مالتھس کے نظریئے پر جس قدر تنقید و جرح کی گئی ہے اور اس میں جو ترمیم و اضافے ہوئے ہیں ان سے بحث کریں گے۔

مالتھس کے زمانہ میں، ولیم گاڈون نے جو جواب دئے اور جو معترضین نے اعتراض کئے وہ زیادہ قابل اعتنا نہیں ہیں مگر ذرائع نقل و حرکت و خبر رسانی کی سہولتوں اور بیرونی تجارت کی ترقی سے جو نئے حالات پیدا ہوئے اور ان سے غذا کی فراہمی میں جو آسانیاں ہوئیں اور نئی ایجادات و اختراعات کے ذریعہ سے فطرت کے بخل پر فتح حاصل کرکے پیداوار میں جو اضافے کئے گئے اور جن کی بنیاد پر یورپ کی آبادی کے معیار حیات کو باوجود اضافۂ تعداد مائل بہ ترقی رکھا گیا۔ ان سے متاثر ہوکر جو اعتراض کئے گئے ہیں وہ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اور متفاولین ان کی بنا پر، انسانی ترقی و تکمیل کو زیادہ قابل عمل سمجھنے لگے ہیں۔ برخلاف اس کے متشائمین کی یاس و حسرت میں ان سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان کا خیال ہے کہ گو یہ سچ ہے کہ موافق حالات میں ہم معاملات کو نازک صورت اختیار کرنے سے محفوظ رکھ سکے ہیں۔ لیکن نہ تو موجودہ عہد کی ترقی قابل اطمینان کہی جاسکتی ہے اور نہ آئندہ کے لئے خوشگوار امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ "موانع" کے عمل کی بنا پر حالات رو بہ اصلاح رہے۔ لیکن "موانع" کے عمل میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو صورت حال کا بدتر ہوجانا یقینی ہے۔ (باقی آئندہ)

محمد عاقل۔ ایم۔ اے (علیگ)

نغمۂ دل

یعنی جناب حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دل شاہجہاں پوری کا مجموعۂ کلام معہ مقدمہ جناب نیاز فتحپوری، اور تبصرہ از حضرت عزیز لکھنوی بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ چھپ کر تیار ہے مصنف کی دو تصویریں بھی شامل ہیں۔ قیمت علاوہ محصول ۱۲/

مینیجر نگار لکھنؤ

اسلام کہاں ہے

یہ وہ صدائے بے اختیاری ہے جو کبھی کبھی اُن کی زبانوں سے نکل جاتی ہے جنھوں نے اسلام کا مطالعہ صفحات تاریخ میں نہیں بلکہ کتاب آسمانی میں کیا ہے ـــــ کیونکہ فی زمانناء مسلمان نما "حیوان ناطق" تو نظر آجاتے ہیں۔ مگر ان پر اسلام تو اسلام "انسانیت" کا بھی اطلاق نہیں ہوتا۔ ان حالات میں خیالات کی سراسیگی ادہر ادہر بھٹکاتی ہے تو حجاز کے ریگستانوں، عراق کے مرغزاروں، ایران کے سبزہ زاروں، کربلا کے خونیں میدانوں، اندلس کے کھنڈروں، افریقہ کے صحراؤں، مصر کے دریاؤں، افغانستان کے پہاڑوں اور ہندوستان کی خانقاہوں میں سر ٹپکتا ہوا پاتے ہیں۔ یورپ و امریکہ کی تثلیث پرست گلیوں میں چکر لگاتا ہوا پاتے ہیں۔ اور چین و جاپان میں بودھ کے نام لیواؤں کے رحم و کرم پر سانس لیتا ہوا پاتے ہیں۔

اسلام اور سر ٹپکے، اسلام اور تثلیث پرست گلیوں میں چکر لگائے۔ اسلام اور رحم و کرم پر سانس لے۔ اسکی علت کو دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب کہ سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ امتداد زمانہ نے، غیر جنس صحبتوں نے آمنہؑ کے اکلوتے کی خدائی تعلیم کو دماغوں سے محو کر دیا پیغام آلہی کو خوبصورت جزدانوں میں دفن کرا دیا اصلیت وحقیقت کو مسخ کرکے رکھ دیا۔ اُن پر عمل کرنے لگے جو انسانی دماغ کی تھکن ہے اور جس کا ثبوت مسلم دنیا کی زندگی کا عمل ہے۔ اگر فوری ذہن کا انتقال نہ ہوسکے تو سن لیجیے کہ جو توحید کے نعرے لگانے والے تھے وہ مٹی کے ڈھیروں میں اکسیر کی تلاش کرنے لگے۔ جو سنت پیغمبری پر چلنے والے تھے اُن کو طبلے کی تھاپوں میں غیبی آوازیں سنائی دینے لگیں جن کو تربت کو "صنم" بنانے کی ممانعت کی گئی تھی۔ وہ لنکا شائر کے "تانے بانے" میں حسین کی غیر فانی قربانی کا سوگوارانہ ماتم کرنے لگے جو صرف ایک خدا کے پجاری تھے وہ مادی چیزوں کے پرستار ہوگئے جن کے خدائی عقائد متکلمین عقلیات کی کسوٹی پر ستے تھے ان کی زندگیاں توہمات کا مجموعہ بن گئیں۔

تعجب اس لئے ہے کہ جس کی عالم کائنات میں ۴۲ کروڑ کی بھیڑ لگی ہو جو نبی نوع انسان پر شفقت کرنے کے لئے خلق ہوئی ہو اور جس کے پیش نظر عہد اولین کا نمونہ ہو وہ غیروں کے سامنے اس طرح سے اپنی اسلامی زندگی کو پیش کر رہی ہو اس کا مفلس حافظہ یہ یاد کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا کہ "غار حرا" کے "عبادت گذار" نے جب دنیائے آب وگل کو خدا حافظ کہا تھا تو اس نے اپنی مختصر سعی کا علمی اور قابل تقلید نتیجہ صفحہ کائنات پر ہمیشہ کے مطالعہ کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ جس سے گوسالہ پرست حیران تھے اور تثلیث پرست ششدر۔ یہ وہ سالہ کامیابی عبارت تھی مصیبتوں سے کھیلنے اور شکر کے سجدوں میں گر پڑنے کی موسمی تختیوں

سے لطف اٹھانے اور اپنے مقصد وحید کو نہ بھولنے کی۔ اپنی ذات کو اسلام کا عملی جامہ پہناتے اور تخیل سے دماغ کو خالی رکھنے کی۔ کیونکہ اسلام نام ہے حق و باطل میں تمیز کرنے کا۔ اسلام نام ہے مسالمت و رواداری کا۔ اسلام نام ہے حقیقت پرست زندگی کا۔ اسلام نام ہے عزم کی بلندی۔ استقلال کی پامردی اور صبر و تحمل کے پر سکون حربے کا۔

عہد اولین کے موحدوں نے چونکہ اسلام کی قرآنی تعلیم پائی تھی۔ وحی ترجمان کی خدائی زبان سے صحیح تلقین سنی تھی اس لئے مرتے دم تک وہ صرف وہی رہے اور صرف اسی ایک خدا کی عبادت کرتے رہے جس نے اولین انسان کو "جنت حقیقی" سے "جنت ارضی" پر پھینکا تھا مگر دنیائے اسلام کی بدنصیبی کا وہ پہلا دن ہے جب "روح اسلام" پرواز کر جاتی ہے اسی وقت بلا کسی وقفہ کے جو پہلی ضرب اسلام پر پڑتی ہے وہ تفرقہ کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔ اور جو تدریجی طور پر اسلام کے (۷۲) ٹکڑے مختلف بھیسوں اور مختلف ناموں سے کر ڈالتی ہے۔ مذاہب دماغوں کی کامیاب پیداوار ہو جاتے ہیں۔ اور اس شجر اسلام میں نئی نئی شاخیں نکالی جاتی ہیں۔ جس نے اپنی صرف ایک شاخ سے اپنی ارتقا و سرسبزی کی ضمانت کی تھی۔

مسلمانان سلف اس پر بجا طور سے فخر کرتے تھے کہ ہم صرف مسلم (موحد) ہیں۔ مگر خلف کے دماغی افکار آخر رنگ لائے اور کوئی سنی مسلمان ہو گیا اور کوئی شیعہ کوئی نجد کے مجنونانہ میدان میں لیلے کو پکارنے لگا۔ اور کوئی ہند میں "قالو بلا" کی گلی میں رقص کرنے لگا۔ اس پر کسی نے غور نہ کیا کہ "امین حجاز" کا خدائی پیغام بلا شرکت غیرے تھا۔ اس میں جدید ابواب و حواشی کا اضافہ چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق تھا۔ کیونکہ "پیغامبر" نے نماز پڑھی اور مقتدیوں کو رکوع و سجود اور قیام و قعود سب دکھلا دئے مگر آنکھیں بند ہوتے ہی اجتہادات کی کارفرمائی ہوئی۔ انسانی دماغ کی خشکی نے آخر وہاں چار مصلے بچھوا کر چھوڑے جہاں صرف ایک ہی مصلے "سر تسلیم" خم کرنے کے لئے بچھایا گیا تھا اور اس پر یہ بوالعجبی کہ ہر صاحب مصلے بزعم خود اس پر نازاں بھی ہے کہ ہمارا اجتہاد اسلامی قانون کا اجتہاد ہے۔ زمانہ کی ترقی پسند رفتار چار پر بھی قناعت نہ کر سکی۔ قادیانیوں نے اپنا پنجابی مصلے بچھا دیا اور مہدویوں نے اپنا جونپوری مصلے بچھا کر "شش جہت" پیدا ہی کر دی اور ابھی کیا معلوم کہ آئندہ دماغی اجتہادات کتنوں کا اضافہ کر کے رہیں گے۔

ہر انسان اس کا تو مدعی ہے کہ وہ صراط مستقیم کا جویا ہے مگر روز ازل سے انسانی طبائع کے اختلاف نے مسلم ہو یا غیر مسلم سب کو صراط مستقیم سے بھٹکایا ہے اس پر دماغی ضد کی مستقل مہر نے اور گمراہ کر دیا۔ انہیں گمراہیوں کو دور کرنے کیلئے ہر زمانہ نے ہادیوں کا خیر مقدم کیا ہے جنھوں نے اپنی مخلصانہ کوششوں کے نتائج بھی چھوڑے مگر نتائج کی بھی عمریں ہوا کرتی ہیں جو اپنی منزل تک پہنچکر ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم برقرار رہتی تو حضرت اسمٰعیلؑ "دین حنیف"

کی تجدید کیوں کرتے۔ اگر حضرت موسیٰ پیدا نہ ہوتے تو فرعون کا بیڑہ کون غرق کرتا۔ اگر حضرت عیسیٰ مصلوب ہوتے (عیسائی نقطہ نظر سے) تو عیسائی دنیا تثلیث پرست کیوں ہوتی۔ اگر جناب رسالت مآبؐ کو تبلیغ میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑتا اور اذیتوں کے برداشت کی قوت نہ ہوتی تو توحید کے میدان میں ایک لاکھ مجاہد فوج کیونکر نظر آتی اگر حسین نے حق کے لئے جان نہ دی ہوتی تو یزید کی باطل پرستی کی قلعی دنیا پر کیونکر کھلتی۔ دنیا میں یہ سلسلہ اس لئے باقی رکھا گیا کہ عیش پسند انسان کے حافظہ سے وہ سبق محو نہ ہونے پائے جس کو سنگلدیپ کے جنگل میدان میں ابوالبشر نے اپنی سریانی زبان میں پڑھا تھا۔ اور جس کی تجدید وقتاً فوقتاً خدا کی طرف سے کی جاتی رہی اور آخر کار قرآن نے تکمیل کر کے انسانیت کو معراج پر پہنچا دیا۔ باوجود اس جاننے کے کہ اسلام مختلف عقائد اور احکام کے مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ہی عقیدہ کی تصریح اور ایک ہی حکم کی تشریح و تفصیل ہے۔ مگر دور اولین کے بدلتے ہی عقیدہ کی جگہ عقائد نے لی اور حکم کی جگہ احکام نے۔ جب ایک عقیدہ اور ایک حکم دماغوں میں محفوظ نہ رہ سکا تو عقاید و احکام کو مرور ایام کی آب و ہوا کیونکر یاد رکھ سکتی تھی۔ عہد رسالت کا وہ واقعہ یاد ہوگا جب ایک غیر مسلم حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ اگر اسلام کی تعلیم صرف ایک لفظ میں دیجاتی ہے تو گروہ اسلام میں شرکت کیلئے تیار ہوں کیونکہ وہ بے شمار احکام جو اسلام کے تعلیمات کے ابتدائی درسیات ہیں میں یاد نہیں رکھ سکتا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ صرف "جھوٹ" سے احتراز کرو۔ علمائے اسلام غور فرمائیں کہ "امین عرب" نے صرف ایک لفظ میں تمام اسلامی تعلیم کو بھر دیا۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہو کہ "راستی" ہی انسانیت کے چہرہ کا وہ غازہ ہے جو انسانیت کے حسن کو غیر فانی بنا سکتا ہے کیا عہد حاضر کے مسلمان اپنی پنج وقتہ عبادتوں کے ساتھ "راستی" کو بھی ایمان کا جزو اولین سمجھتے ہیں؟ اور اس پر سختی سے کاربند ہیں اسی ایک لفظ کے احترام سے ہم مسلم کہلا سکتے ہیں اور انسانیت کے وقار کو باقی رکھ سکتے ہیں کیونکہ "راستی" ہی اسلام کی وہ "روح" ہے جس سے تمام دوسری عبادتوں کا ڈانڈا ملا ہوا ہے۔ دور متاخرین دور اولین کے دماغی کارناموں کے یاد رکھنے کا تو دعویٰ کرتا ہے اور اس کا دماغ دور اولین کے دماغی انکار کا حامل بھی ہے مگر یہ کوئی سمجھانے کیلئے اپنی جانیں نہیں دیدیتا کہ اسلامی عقائد و احکام میں یہ تفرقہ اندازیاں حقیقت کے موجود ہوتے ہوئے رسم و رواج کی یہ پابندیاں اور سعد و نحس میں کاہنوں کی یہ وہم پرستیاں کیا قرآنی تعلیم کے مخالف و مغائر نہیں ہیں؟ اسی لئے "مکمل ترین انسان" نے اپنی زندگی کو عملی حیثیت میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا اور اپنے عادات و اطوار، حرکات و سکنات، اور وعظ و پند سے سب کچھ ذہن نشین کر دیا تھا۔ مگر ریگستانی توحید کی قسمت میں یہ کہاں تھا کہ وہ ان قیمتی ذرات کو حافظہ میں جمع رکھ سکتا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم انسان نے اپنے انہیں کرتوتوں کے بدولت اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں خود بنا لیں۔ کیا یاد نہیں رہا کہ "محمد عربی" نے صرف ایک عبادت گاہ کی بنیاد اسلئے ڈالی تھی تاکہ وہ اس ایک مقام کے اسلام کا مرکز بن سکے اور کلمہ گو اسی ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے معبود واحد کی عبادت بھی کر سکیں اور آپس میں تبادلہ خیالات کر کے اپنے گروہ کی زندگی سے جی بھی سکیں مگر افسوس کہ ناقص دماغوں

کی پیدا دار نے نچلا بیٹھنے نہ دیا جس کے نتائج یہ برآمد ہوئے کہ ہر قریہ میں سنیوں کی مسجدیں الگ بن گئیں اور "الصلوٰۃ خیر من النوم" کی پکار ہونے لگی اور شیعوں کی مسجدوں میں "بلا فصل" کے نعرے دائمی جھگڑے کا باعث بن گئے۔ غیر قومیں یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں اور اس کے ساتھ یہ بھی محسوس کرنے لگی تھیں کہ جہاں ایک کمبل ہر موسم کے سرد و گرم کو پناہ دے سکتا تھا وہاں زربفت و کمخواب سے "عیب پوشی" کی جانے لگی۔ جہاں خشک کھجوروں سے پیٹ کی بے چینی کو دور کر لیا جاتا تھا وہاں کے دستر خوانوں پر "من وسلوے" کے خوان اترنے لگے۔ جہاں کھجوروں کے پتے نماز ستا آفتاب کو روک سکتے تھے وہاں فلک فرسا قصر و ایوان تعمیر ہونے لگے۔ جو "خلق عظیم" سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس کے نام لیوا بد اخلاقی کے پیکر بن گئے۔ جس کو "رحمت اللعالمین" بنا کر پیدا کیا گیا تھا۔ اسکے پیرو "زحمت عالمین" بن گئے جو فرائض اسلام کے ساتھ خلق خدا کی خدمت کو اولین عبادت سمجھتا تھا اُس کے مقتدیوں نے صرف رکوع وسجود میں جنت کو اپنی عبادت کا معاوضہ سمجھ لیا۔ حالانکہ جنت عبارت ہے عیش و راحت سے جسکو ہر انسان صرف اپنے اتقا سے حاصل کر سکتا ہے۔

جہلا کو ان معصیتوں میں مبتلا کرنے والے تو وہ ہوتے ہیں جو حافظ کے شاعرانہ الہامات پر سر دھنتے ہیں اور انیس ایسے خدائے سخن کے مرثیوں کی داد رو رو کر دیتے ہیں اور اس کو عین اسلام سمجھتے ہیں مگر جن کی عقلیں زمانہ جدید کی تربیت یافتہ ہیں ان کی اصلاح کس طرح کی جائے جبکہ تو سنجیدہ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ :—

"اسلام کہاں ہے"

ہوش بلگرامی (حیدرآباد دکن)

اندلسیات

(یعنی تاریخ اندلس و ہسپانیہ کا بیمثل سلسلہ)

اخبار الاندلس | تین ضخیم جلدوں میں۔ جلد اول میں مسلمانوں کی فتح و عروج، دوسری جلد میں زوال و انحطاط، اور تیسری جلد میں ان کی علمی و ادبی ترقیوں کی نہایت دلچسپ وبسیط تاریخ ضبط کی گئی ہے۔

قیمت علی الترتیب دس روپئے۔ آٹھ روپئے۔ سات روپئے۔ مکمل سٹ بیس روپئے (عنہ) علاوہ محصول

مولدین | ان مسلمانوں کی دردناک تاریخ جو اسپین میں زوال سلطنت اسلامی کے بعد باقی رہ گئے تھے۔ قیمت مع محصول تین روپئے۔

منیجر نگار لکھنؤ

اعتبارات

کلیسا کا مقدس راہب میرے پاس آیا اور صلیب کو بوسہ دیکر تسبیح جیب میں رکھتے ہوئے بولا —— نجات چاہتے ہو! تو دین مسیحی اختیار کر اور یسوع کو خدا کا بیٹا مان جس نے اپنے مقلدین کے لئے آسمانی بادشاہت کا وعدہ کیا ہے۔

میں نے کہا: "ہاں، تمہارا مذہب سچا معلوم ہوتا ہے، مجھے عیسائی بنا لو" —— اس نے خوش خوش مجھے اصطباغ دیا اور چلا گیا

ایک یہودی عالم آیا اور بولا۔ "دین موسوی سے بہتر کوئی دین نہیں، اٹھ اور وہ راستہ اختیار کر جو بنی اسرائیل کو نجات دلانے والے پیغمبر نے بتایا تھا"

میں نے کہا "بیشک تمہارا دین سچا ہے اور مجھے موسوی ہونے میں کوئی عذر نہیں"

ایک مجوسی موبد آیا اور بولا "کیا زردشت نبی کی صداقت سے تجھے انکار ہے؟ کیا اسکی تعلیمات نجات انسانی کی ضامن نہیں؟ اٹھ اور میرے ساتھ چل کر آتشکدۂ مقدس میں تجدید ایمان کر" ——

میں نے کہا بیشک تمہارا نبی سچا نبی تھا اور مجھے اسکی تعلیمات کی صداقت سے انکار نہیں۔

ایک پنڈت اپنی پیشانی پر صندل کا بڑا سا قشقہ کھینچے ہوئے آیا اور بولا کیا تجھے ویدوں کے الہامی صحائف ہونے سے انکار ہے، کیا تجھے فلسفۂ ویدانت کی صداقت سے انکار ہے؟ میں نے کہا "میں ویدوں کو صحائف آسمانی جانتا ہوں اور ویدانت کی حقانیت کا قائل۔"

بودھ مذہب کے مندر کا سب سے بڑا پجاری مجھ سے ملا اور بولا۔ کیا بودھ مذہب کی تعلیم سے زیادہ کوئی اور تعلیم امن و سکون کا راستہ بتلانے والی ہے؟ میں نے کہا بیشک بودھ کی تعلیمات میں بڑی کشش ہے اور میں بودھ کو خدا کا پیغمبر جانتا ہوں"

دین محمدی کا ایک عالم آیا اور بولا "کیا محمد کی رسالت اور قرآن کی الہامی کتاب ہونے سے تجھے انکار ہے؟ میں نے کہا "ہرگز نہیں"

چند دن بعد میں نے ان سب کو اپنے گھر بلایا اور ایک جگہ جمع کیا، لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ ایک کا منھ دوسرے کی طرف سے پھرا ہوا تھا اور سب کا دل غصہ سے لبریز۔

میں نے ان سے پوچھا۔ تم ایک دوسرے سے کیوں نہیں مل جاتے، کیا تم سب حق پر نہیں ہو"۔ ان میں سے ہر ایک نے برہم ہو کر کہا "نہیں میرے علاوہ سب غلط راستہ پر چل رہے ہیں اور گمراہ سے دوستی ناجائز ہے"

میں نے کہا "اگر میں کوئی ترکیب ایسی بتادوں جو تم سب کو ایک دوسرے کا بھائی بنادے، تو اسے مان لوگے"۔ انھوں نے کہا "ہاں، بتاؤ"

میں نے کہا "اچھا تو آؤ اور سب ملکر ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالو اور اس مذہب کا نام "محبت" رکھو، جو تمام مذاہب کے اصول کو اپنی جگہ برقرار رکھتے ہوئے "اخوت عامہ" کی تعلیم دے"

یہ سنکر ان میں سے ہر ایک دیر تک سوچتا رہا اور پھر وہ سب کے سب ایک آواز سے بولے کہ "یہ بات تو ٹھیک ہے، لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے، کیونکہ ہماری جماعت کے افراد ہم سے چھن جائیں گے اور ہماری معاش کی راہیں مسدود ہو جائیں گی"

وہ یہ کہکر چلے گئے اور میں نے دیکھا کہ ایک طرف شیطان کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا اور دوسری طرف "انسانیت" رو رہی تھی۔

باب الاستفسار

یاجوج و ماجوج

(جناب محمد ذکریا صاحب۔ بہار)

براہ کرم یاجوج ماجوج ذوالقرنین اور سد اسکندر کے متعلق اپنی تحقیق سے آگاہ کیجئے۔

(نگار) قرآن شریف کی جن آیات میں یاجوج و ماجوج کا ذکر آیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔ (سورۂ کہف آیۃ ۹۴) "قالوا یٰذالقرنین ان یاجوج وماجوج مفسدون فی الارض فھل نجعل لک خرجاً علیٰ ان تجعل بیننا وبینھم سداً" یعنی انھوں نے کہا کہ:۔ "اے ذوالقرنین یقیناً یاجوج و ماجوج زمین پر فساد برپا کرتے ہیں۔ تو کیا ہم تم کو خراج ادا کریں اس شرط سے کہ تم ہمارے اور ان کے درمیان ایک سد تعمیر کر دو"۔ دوسری آیۃ سورہ انبیاء کی آیۃ نمبر ۹۶ ہے:۔ حتیٰ اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون یعنی حتیٰ کہ یاجوج و ماجوج کو چھوڑ دیا جائے اور وہ تمام بلند مقامات پر سے پھیل جائیں"۔

آیات مندرجۂ بالا میں صرف یاجوج و ماجوج ہی کا ذکر نہیں آیا بلکہ دو باتیں اور بھی آئی ہیں یعنی "ذوالقرنین" اور "سد" لہٰذا ہم اس مضمون میں ان تینوں کے متعلق اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں:۔

(۱) یاجوج و ماجوج جن کتابوں کو عام طور پر "سماوی" یا "الہامی" سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سب سے پہلے جس کتاب میں "یاجوج و ماجوج" کے الفاظ آئے ہیں، وہ عہد نامۂ عتیق ہے، چنانچہ ہم سب سے پہلے اسی کو یہاں درج کرتے ہیں:

(۱) یافث (ابن نوح) کے بیٹے یہ ہیں:۔ جمر، ماجوج، مادی، یونان، توبل، مسک اور تیراس (کتاب پیدائش۔ باب ۱۰ آیۃ ۲)

(۲) بنی یافث، جمر، ماجوج، مادی، یونان، توبل، مسک اور تیراس ہیں۔ (تاریخ کی پہلی کتاب باب ۱۔ آیۃ ۵)

(۳) اے آدم زاد، تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے، اور روش، اور مسک، اور توبال کا بڑا سردار ہے اپنا منہ کر (حزقی ایل۔ باب ۳۸ آیۃ ۲)

(۴) اس لئے تو اے آدم زاد جوج کے برخلاف پیشین گوئی کر اور بول کہ خداوند یہوہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ میں تیرا مخالف ہوں، اے روش، مسک اور توبال کے سردار۔ اور میں تجھے پلٹ دونگا۔ اور تجھے لئے پھرونگا اور ایسا کرونگا کہ تو اتر کی طرف سے چڑھ آ۔ اور تجھے اسرائیل کے پہاڑوں پر لاؤنگا۔ اور تیری کمان جو تیرے ہاتھ میں ہے گرا دونگا اور ایسا کرونگا کہ تیر تیرے ہاتھ سے گر پڑیں گے۔ تو اسرائیل کے پہاڑوں پر گر جائیگا تو اور تیرا سارا لشکر اس گروہ سمیت جو تیرے ساتھ ہے۔ اور میں تجھے ہر قسم

شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کیلئے دونگا .... اور میں ماجوج پر جو جزیروں میں بے پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجونگا (حزقی ایل باب ۳۲ آیات ۱-۶) بائبل کی مندرجہ بالا آیات پر غور کرکے ہم مندرجہ ذیل نتائج تک پہونچتے ہیں۔
(۱) اور (۲) میں ماجوج کو یافث کا بیٹا اور نوح کا پوتا بیان کیا گیا ہے گویا ماجوج ایک شخص کا نام ہے۔ اور ممکن ہے اس کے بعد اس شخص کے قبیلہ یا قوم کا بھی نام ہوگیا ہو۔ اور اسی لحاظ سے اس ملک کا نام بھی ماجوج ہوگیا ہو جہاں یہ قوم بستی تھی۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک شخص کی اولاد ایک ہی ملک میں آباد ہوتی ہے مگر بعض اوقات جب تعداد آبادی بڑھ جاتی ہے تو ایک ہی نسل کے مختلف قبائل مالک متصلہ میں جاکر آباد ہوجاتے ہیں۔ یافث بن نوح کے لڑکوں کی ترتیب پر اگر خیال کیا جائے تو سب سے بڑا بیٹا جمر، دوسرا ماجوج اور تیسرا مادی تھا۔ مادی قوم اس ملک میں آباد تھی جسے قدیم زمانہ میں مادہ یا میڈیا (Media) کہتے تھے میڈیا کے مغرب میں آرمینیا اور اس کے مغرب میں قبادوسیہ کے ملک تھے۔ آرمینیا اور قبادوسیہ میں جو قوم آباد تھی وہ قوم سمر (Cimmerians) کہلاتی تھی۔ ماہرین السنہ جانتے ہیں کہ سمر اور جمر میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا جمر کی اولاد آرمینیا قبادوسیہ میں آباد ہوئی دوسری بھائی ماجوج کی اولاد نے کوہستان قفقاز کو عبور کرکے جانب شمال نقل و حرکت کی اور وہ بلاد روس و سائبیریا میں آباد ہوگئی
آیت نمبر (۳) میں یاجوج کو ماجوج کی سرزمین کا سردار بتایا گیا ہے اور یہی شخص روش، مسک اور توبال کا بھی سردار ہے۔ اور چونکہ روس، مسک (ماسکو) اور توبال (سائبیریا جس کا دارالحکومت توبولسک ہے) تمام ایسی اقوام ہیں جو کوہ قفقاز سے جانب شمال رہتی تھیں۔ اسی لئے آیہ (۴) میں ظاہر کیا گیا ہے کہ قوم یاجوج نے بنی اسرائیل پر شمال کی طرف سے حملہ کیا۔ کتاب پیدائش باب ۱۰ میں مختلف اقوام و ملل کی جو فہرست دی گئی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو جغرافیائی حدود اس باب میں بیان کیے گئے ہیں ان کی رو سے شمال مشرق، اور شمال میں جو مختلف نیم وحشی اور بربری (Barbarians) اقوام آباد تھیں ان سب کے لئے لفظ ماجوج استعمال کیا گیا ہے۔ صحیفۂ حزقی ایل باب ۳۸ آیۃ ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج ایک ملک کا نام ہے مگر اسی صحیفہ کے باب ۳۹ آیۃ ۶ میں تحریر ہے کہ ماجوج ایک شمالی قوم ہے جس کا سردار جوج یا یاجوج ہے بہرحال ان الفاظ سے کہ جوج اقوام روش، مسک اور توبال کا بڑا سردار ہے" یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لفظ ماجوج قفقاز کے شمال میں رہنے والی تمام روسی اقوام کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اور اس زمانہ میں (یعنی تقریباً ۵۸۷ قبل مسیح) جبکہ صحیفہ حزقی ایل لکھا گیا یا ۱۳۰۰ء میں جبکہ یوشع بن نون کے زمانہ میں بقول ہیرودوطوس، سائیتھین اقوام نے (جو قفقاز کے شمال میں ممالک روس میں رہتی تھیں) ایشیا پر حملہ کرکے تباہ کردیا تھا، ممکن ہے ان حملہ آور اقوام کا (جن کے لئے مجموعی لفظ "ماجوج" استعمال کیا ہے) سردار یاجوج ہو۔ مشہور یہودی مورخ یوسفس (Josephus.) نے جس کا اتباع جیروم (Jerome) نے بھی کیا ہے یہ لکھا ہے کہ بائبل میں لفظ ماجوج قوم سائیتھین کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور عام مورخین اور مفسرین بائبل کا بھی یہی خیال ہے۔ درحقیقت لفظ "ماجوج" بہت وسیع المعنی ہے اور اس کے اندر وہ تمام بیشمار اور مجہول الحال اقوام داخل سمجھی جاتی ہیں، جو کوہستان قفقاز کے شمال میں رہتی تھیں۔ اسی سلسلہ میں یہ عرض کردینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ بائبل میں توبال اور مسک ہمیشہ دونوں ساتھ آتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی اگر آپ ان ممالک کی سیر کریں جو قفقاز کے شمال میں واقع ہیں تو آپ کو مسکوا اور توبال نام کے دو دریا ملیں گے۔ ایک دریا وہ ہے جس کے کنارہ موجودہ بالشویک روس کا دارالحکومت ماسکو یا مسکو واقع ہے اور دوسرا دریا وہ ہے جو کوہستان یورال کے مشرق میں واقع ہے اور جس پر سائبیریا کا بڑا شہر توبولسک آباد ہے۔ ان دونوں دریاؤں کے کنارے یقیناً مسک

اور توبال کی اولاد آباد ہوتی "یہی لوگ بعد میں سائتھین اور ساکے کہلائے اور انھی جملہ قبائل کا مجموعی نام "یاجوج وماجوج" ہے۔ اور ان کا ملک بحیرہ اسود کے شمال اور شمال مشرق میں واقع تھا۔

بیروت کے ایک فاضل محمد جلیل بیہم لکھتے ہیں کہ تفسیر جلالین میں لکھا ہے کہ یاجوج وماجوج نام ہیں دو عجمی (Barbarian) قبائل کے۔ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ یاجوج وماجوج دو قبیلے تھے یافث بن نوح کی اولاد سے۔ ضحاک کا قول ہے کہ یاجوج نام تھا ایک ترکی قبیلہ کا اور بقول یہودی انسائیکلو پیڈیا "جیروم نے لکھا ہے کہ ملک ماجوج کوہستان تفقاز کے پار بحر خزر کے قریب واقع تھا۔

سرسید مرحوم کی تحقیق یہ ہے کہ یافث بن نوح کا ایک بیٹا ماغوغ تھا۔ اور یہ عجمی زبان کا لفظ ہے۔ عبرانی زبان میں آکر یہ لفظ ماگوگ بنگیا یعنی "غ" بدل کر "گ" ہوگیا۔ اور جو قوم اس "ماگوگ" سے نکلی اس کا نام "گوگ" ہوا۔ اور پھر اس ملک پر بھی جہاں وہ آباد تھی لفظ "گوگ" کا استعمال ہونے لگا۔ مگر استعمال میں یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ بولے جاتے تھے، جیسے "گوگ ماگوگ" یا گاگ میگاگ" اور ایک کا دوسرے پر بھی اطلاق ہوتا تھا۔ عربی زبان میں چونکہ "گ" نہیں ہے اس لئے وہاں آکر یہ "یاجوج وماجوج" بنگئے۔ دراصل یہ لوگ ترک وتاتار ہیں۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں بھی یہی لکھا ہے کہ "قیل انھما من الترك" الغرض یہ اقوام اس ملک میں آباد تھیں جس کو قدیم زمانہ میں سیتھیا (Scythia) کہتے تھے۔ اور ترک وتاتار انھی کی نسل سے ہیں۔

جملہ اندراجات مندرجہ بالا پر نظر ڈالنے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ لغوی لحاظ سے "یاجوج وماجوج" آشوری نام ہیں جنھوں نے عبرانی زبان میں بصورت "گوگ ماگوگ" یا گاگ میگاگ" راہ پائی اور وہاں سے عربی زبان میں آکر "یاجوج وماجوج" بنگئے۔ ہمارے نزدیک یہ قوم یا اقوام خواہ وہ یافث بن نوح کی اولاد ہوں یا نہ ہوں، وہ وحشی اور بربری قومیں تھیں جو ماورائے کوہستان تفقاز جانب شمال وشمال مشرق سواحل بحر خزر کے قریب آباد تھیں۔ انھی مختلف اقوام کا مجموعی نام بعد کو سیتھین (Scythians) ہوا جب یہ اقوام زیادہ زور پکڑ گئیں تو اپنے ایک بڑے سردار مسمی "جوج" کی زیر قیادت کوہستان تفقاز کے جنوب میں بلاد ایشیا پر حملہ آور ہوئیں اور چاروں طرف تاخت وتاراج کرنے لگیں۔ جب ایشیا کی امن پسند اقوام کا ان لوگوں کی دستبرد سے ناک میں دم ہوگیا تو انھوں نے "ذوالقرنین" بادشاہ سے ان کو روکنے اور تادیب کرنے کی درخواست کی جس نے اُن کو مار کر بھگا دیا۔ اور ان کی آئندہ روک تھام کے لئے ایک "سد" تعمیر کردی۔ ذوالقرنین کی بحث آگے آتی ہے۔

ذوالقرنین

قبل ازیں کہ ہم "ذوالقرنین" کی تحقیق کریں۔ ہم کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اس کے متعلق کتب سماوی میں کیا لکھا ہے۔ قرآن شریف کی سورۂ کہف میں آیات ۹۳/۸۳ ذوالقرنین کی نسبت حسب ذیل بیان کیا گیا ہے:۔

ویسئلونك عن ذی القرنین ط قل ساتلوا علیکم منه ذکرا ۝ انا مکنا له فی الارض وآتینه من کل شیء سببا ۝ فاتبع سببا ۝ حتی اذا بلغ مغرب الشمس وجدها تغرب فی عین حمئة ووجد عندها قوما ط قلنا یا ذا القرنین اما ان تعذب واما ان تتخذ فیهم حسنا ۝ قال اما من ظلم فسوف نعذبه ثم یرد الی ربه فیعذبه عذابا نکرا ۝ واما من آمن وعمل صالحا فله جزاء الحسنی ج وسنقول له من امرنا یسرا ۝ ثم اتبع سببا ۝ حتی اذا بلغ مطلع الشمس وجدها تطلع علی قوم لم نجعل لهم من دونها سترا ۝ کذلك ط وقد احطنا بما لدیه خبرا ۝ ثم اتبع سببا ۝ حتی اذا بلغ بین السدین وجد من دونهما قوما لا یکادون یفقهون قولا ۝ قالوا یا ذا القرنین ان یاجوج وماجوج مفسدون فی الارض فهل نجعل لك

وبینهم سدًّا ۰ قال ما مکنّی فیه ربی خیرٌ فاعینونی بقوۃٍ اجعل بینکم وبینهم ردماً ۰ آتونی زبر الحدید حتیٰ اذا ساوی بین الصدفین قال انفخوا حتیٰ اذا جعله ناراً قال آتونی افرغ علیه قطراً ۰ فما اسطاعوا ان یظهروہ وما استطاعوا له نقباً ۰ قال ھٰذا رحمۃٌ من ربی ج وکان وعد ربی حقاً ۰

یعنی اور پوچھتے ہیں تجھ سے ذوالقرنین کی بابت تو کہہ دے میں تمھیں اس کا کچھ حال جلد پڑھ کر سناؤنگا۔ بیشک ہم نے قائم کیا تھا اس کو زمین پر اور دیا تھا اس کو ہر قسم کا ساماں۔ پس وہ ایک راستہ کو (یا ایک سمت کو) روانہ ہوا حتیٰ کہ وہ ایک ایسے مقام پر پہونچا جہاں آفتاب ایک کالے یا گدلے چشمہ (یا سمندر) میں غروب ہوتا تھا۔ اور وہاں اس نے اسکے قریب ایک قوم کو پایا۔ ہم نے کہا کہ اے ذوالقرنین خواہ تو ان لوگوں کو سزا دے یا ان کے ساتھ بھلائی کر۔ اس نے (ذوالقرنین نے) کہا کہ جو شخص ظالم ہے اس کو سزا دیں گے۔ پھر وہ خدا کی طرف واپس جائیگا اور وہ (خدا) اسے عبرتناک سزا دیگا۔ لیکن جو ایمان لایا اور نیک کام کئے تو اسکے لئے ہو اچھا بدلا۔ اور ہم اس کو سہل العمل حکم دیں گے۔ پھر وہ ایک (دوسرے) راستہ پر (یا سمت کو) چلا یہاں تک کہ جب وہ پہونچا اس مقام کے قریب جہاں آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس نے آفتاب کو ایک ایسی قوم پر نکلتے دیکھا جسے ہم نے آفتاب سے پناہ نہیں دی تھی یہ تھا حال وہاں کا۔ اور جو کچھ اسس ذوالقرنین کے پاس تھا اس کا ہم کو کامل علم تھا۔ پھر اس نے ایک (تیسرا) راستہ اختیار کیا حتیٰ کہ وہ پہونچا ایک ایسے مقام پر جو دو پہاڑوں کے درمیان واقع تھا۔ اور اس نے اس مقام کے اس طرف ایک قوم دیکھی۔ جو اس کی زبان کا ایک لفظ تک نہ سمجھ سکتی تھی۔ انھوں نے (یعنی درہ کے اس طرف کے قبائل نے) کہا کہ اے ذوالقرنین، یاجوج وماجوج زمین پر فساد کرنے والے ہیں، تو کیا ہم تیرے لئے کوئی خراج مقرر کر دیں تاکہ تو ان کے اور ہمارے درمیان ایک "سد" بنا دے اس (ذوالقرنین) نے کہا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھے دے رکھا ہے وہی بہتر ہے۔ پس تم میری مدد قوت (یعنی لیبر مزدوروں) سے کرو تاکہ میں تمھارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط (قلعہ بند) دیوار تعمیر کردوں۔ لاؤ تم میرے پاس لوہے کے ٹکڑے حتیٰ کہ جب اُس نے دونوں پہاڑوں کے درمیاں (کا خلا) بھر دیا تو اس نے کہا کہ دھکاؤ (آگ اور گرم کرو لوہے کو) حتیٰ کہ جب اس کو کر دیا آگ (کے مانند سرخ) تو ذوالقرنین نے کہا کہ میرے پاس لاؤ پگھلی ہوئی دھات (پیتل یا برنج) تاکہ میں اسپر ڈال دوں تاکہ پھر وہ (یاجوج وماجوج) اس پر سے چڑھ کر آ سکیں نہ اس میں سوراخ کر سکیں۔ ذوالقرنین نے کہا کہ یہ میرے پروردگار کی طرف سے رحمت ہے۔ لیکن جب میرے پروردگار کا وعدہ پورا ہونیکا وقت آئیگا تو وہ اُسے زمین کے برابر کر دیگا۔ اور میرے پروردگار کا وعدہ سچا ہے۔ ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے کہ آیات مندرجہ بالا میں جس عظیم الشان بادشاہ کا لقب "ذوالقرنین" لکھا ہو اس کا اصلی نام کوئی پتہ نشان نہیں بتایا گیا۔ صرف چند واقعات اس کے متعلق بیان کئے ہیں جن کی بنا پر مفسرین ومحققین نے خیال آرائیوں سے کام لیا ہے۔ لفظ "ذوالقرنین" کے لغوی معنی ہیں "دو سینگوں والا" یا "دو صدیوں والا"۔ مسلمان مورخین نے "ذوالقرنین" کا لقب مندرجہ ذیل بادشاہوں کو دیا ہے۔

(۱) المنذر الاکبر بن ماء السماء جو نعمان بن المنذر کا دادا تھا۔ اس بادشاہ کو "ذوالقرنین" کا لقب اسوجہ سے دیا گیا تھا کہ اس کی پیشانی پر دو بڑی بڑی زلفیں لٹکتی تھیں۔ ابن درید کا قول ہے کہ امراء القیس کے مندرجہ ذیل شعر میں جس "ذوالقرنین" کا ذکر ہے وہ یہی بادشاہ تھا۔

اصد نشاص ذی القرنین حتیٰ   تولی عارض الملک الھمام

(۲) جنوبی عرب کا بادشاہ تبع الاقرآن یا ذی القرنین۔
ابوریحان بیرونی نے اپنی کتاب "آثار الباقیہ عن قرون الخالیہ" میں حمیری خاندان کے بادشاہوں میں سے ابوکرب شمس کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس کا ملک مشرق سے مغرب تک پہونچا تھا۔ ابوریحان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ "ذو" کا لفظ حمیری خاندان کے بادشاہوں کے نام کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے جیسے "ذونواس وغیرہ۔

(۳) کبھی کبھی حضرت علی بن ابی طالب کو بھی ذوالقرنین کہتے ہیں (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام صفحہ ۹۶۲)

(۴) سرسید نے فغفور چین شی وانگ ٹی کو ذوالقرنین مانا ہے۔ اور اس لقب کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اپنے عہد کے حصۂ اول میں اس نے سازوسامان اور اسباب قوت وسطوت جمع کیا اور دوسرے حصہ میں اس نے ملک گیری کی اسوجہ سے وہ ذوالقرنین ہوا لیکن یہ تاویل کسی طرح درست نہیں ہوسکتی کیونکہ اس بادشاہ کا انتقال سنہ ۲۱۰ ق م میں بتایا ہے اور اُس کی سلطنت کا زمانہ صرف ۳۷ سال قرار دیا ہے جو کسی طرح دو صدیوں کے اندر نہیں پڑتا۔ سینگ تو اس کے تھے ہی نہیں۔ الغرض ہمارے نزدیک اس بادشاہ کو "ذوالقرنین" ماننے کی کوئی وجہ نہیں علاوہ ازیں سرسید خود لکھتے ہیں کہ چین ایک ایسا ملک تھا کہ اگلے زمانہ میں بہت کم اس کی تاریخ معلوم تھی اور ظاہر ایہی سبب ہوا ہے کہ مورخوں اور مفسروں کو سد کا مقام بتانے اور اس کے بننے کے حالات بیان کرنے میں دھوکا ہوا ہے"۔ خود سید کے اس قول سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جس ذوالقرنین کی نسبت کفار نے محمد صلعم سے دریافت کیا تھا۔ اس کا حال کچھ نہ کچھ ان کو ضرور معلوم تھا اسلئے وہ ذوالقرنین عرب کے قریب ہی کسی ملک کا رہنے والا ہوگا۔ ایران کا ہو یا یونان کا مگر چین ایسے دور دراز ملک کا ہرگز نہیں ہوسکتا

(۵) مسلمان مورخین ومفسرین میں سب سے زیادہ رجحان اسکندر اعظم بن فیلقوس کی طرف ہوا ہے۔ اور وہ زیادہ تر اسی بادشاہ کو ذوالقرنین مانتے ہیں اور اس کی تاویل وہ اس طرح کرتے ہیں کہ (۱) اسکندر کی پیشانی پر ایک حصہ سینگوں کی طرح ابھرا ہوا تھا۔ (۲) اور اس کی پیشانی سے دو خوبصورت زلفیں لٹکتی تھیں (۳) وہ ماں و باپ دونوں کی طرف سے نجیب الطرفین تھا۔ (۴) دو پشتیں اسکے زمانہ میں گذریں۔ (۵) خدا نے اس کو اندرونی اور بیرونی دنیا کے حالات سے واقف کر دیا تھا۔ (۶) وہ طبقات نور وظلمت دونوں میں پہونچ گیا تھا۔

چونکہ قرآن شریف کی آیات میں "مطلع الشمس" اور "مغرب الشمس" کے الفاظ آئے ہیں اس لئے مسلمان مورخین ومفسرین نے سمجھا کہ ذوالقرنین اسی کو ہونا چاہئے۔ جس کی سلطنت مشرق سے لیکر مغرب تک رہی ہو۔ مسلمان علماء نے سکندر اعظم کے ذوالقرنین ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ سکندر نے ایک خواب میں دیکھا کہ وہ آسمان پر چڑھ گیا ہے اور آفتاب کے دونوں کنارے یا دونوں سینگ پکڑ کر لٹک گیا۔ اس لئے وہ ذوالقرنین ہوا۔ یہ روایت بھی غور طلب ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں ملک شام کے اندر پیدا ہوئی تھی۔ کہ اسکندر اعظم نے خدا سے کہا کہ: "میں جانتا ہوں کہ تو نے میرے سر پر سینگ اگا دئے ہیں تاکہ میں ان کے ذریعہ سے دنیا کی تمام سلطنتوں کو کچل ڈالوں (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) مگر اسکندر اعظم کو ذوالقرنین تسلیم کرنے میں ہمیں تامل ہے کیونکہ اول تو اس نے کوئی سد نہیں بنایا دوسرے یہ کہ سکندر مذہباً بت پرست تھا اور از روئے قرآن ذوالقرنین کو ہدایت یافتہ ہونا چاہئے۔ تیسرے یہ کہ یاجوج وماجوج سے اگر سکندر کا کہیں مقابلہ ہوا ہوگا تو باختر میں مگر وہاں کوئی سد موجود نہیں ہے۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ذوالقرنین سے مراد سکندر نہیں ہے تو کون ہے۔ اس کے لئے ہمیں سب سے پہلے بائبل کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

کتاب دانیال باب ۸ میں مرقوم ہے کہ :۔ تب میں نے اپنی آنکھیں اُٹھا کر نظر کی کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے آگے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ ایک سینگ دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے تھا۔ میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ پچھم اتر دکھن کی طرف سینگ مارتا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ ایک بکرا پچھم کی طرف سے آیا اور اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ ایک عجیب طرح کا سینگ تھا۔ وہ اُس نے دو سینگ والے مینڈھے کو مارا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا سامنا کرے۔ سو اس نے اس کو زمین پر ٹپک دیا اور وہ بکرا نہایت بزرگ ہوا۔ اور جب وہ پُر زور ہوا تو اس کا بڑا سینگ ٹوٹ گیا۔ اور اس کی جگہ چار سینگ آسمان کی چاروں ہواؤں کی طرف نکلے..... ...... جب مجھ دانیال نے یہ خواب دیکھا اور اس کی تعبیر تلاش کرنے لگا تو میں نے ایک آدمی کی آواز سنی جس نے پکار کر کہا کہ اے جبریئل اس شخص کو اس خواب کے معنی سمجھا۔ چنانچہ وہ میرے نزدیک آیا۔ اور اُس نے مجھ سے کہا کہ اے آدم زاد دو سینگ والے مینڈھے سے مراد میدیا اور فارس کے بادشاہ ہیں۔ اور وہ بکرا یونان کا بادشاہ ہے۔ وہ بڑا سینگ جو اس کی آنکھوں کے درمیان ہے اس کا پہلا بادشاہ ہے اور اس کے ٹوٹ جانے کے بعد جو چار سینگ اور نکلے اُن سے مطلب وہ چار سلطنتیں ہیں جو اس سے پیدا ہونگی لیکن ان کا اقتدار اتنا نہ ہوگا"

بائبل کے اقتباس مندرجہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سینگوں سے مراد میڈیا اور ایران ہیں۔ لہٰذا جو شخص پہلی مرتبہ ان دونوں ملکوں کا بادشاہ ہوا اس کو ذوالقرنین ہونا چاہیئے۔ اور وہ داریوش اول بن گشتاسپ تھا اسکی صحت کے جو اور دلایل پیش ہو سکتے ہیں، حسب ذیل ہیں :۔

(۲) چونکہ داریوش اول کا عہد سلطنت ۵۲۱ ق م سے ۴۸۵ ق م تک رہا۔ اس لئے اس کے زمانہ میں دو صدیاں پڑیں اور اس بنا پر بھی اُسے ذوالقرنین کہہ سکتے ہیں۔ (۳) چونکہ داریوش نے یہودیوں کو ہیکل مقدس دوبارہ تعمیر کرنیکی اجازت دیدی تھی۔ اسلئے اُس کا ذکر بائبل میں کئی مقام پر آیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف میں بھی ذوالقرنین سے وہی مراد ہو جو بائبل سے معلوم ہوتا ہے۔ (۴) جب داریوش اول تخت نشین ہوا تو شمال، جنوب اور مغرب کے علاقے باغی ہوگئے (یہ واقعہ ۵۲۰-۱۹ ق م کا ہے) لیکن اُس نے ان تمام بغاوتوں کو کچل ڈالا۔ اور تمام سلطنت ایران میں اپنی حکومت قائم کی یہ واقعات بائبل کے اس تشبیہی بیان سے بالکل ملتے جلتے ہیں، کہ اس دو سینگوں والے مینڈھے نے پچھم، اتر، دکن حملے کئے حتیٰ کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا (۵) قرآن شریف میں ذوالقرنین کے تین سفر بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا سفر وہ ہے جبکہ وہ مقام "مغرب الشمس" تک پہونچا اور وہاں اُس نے آفتاب کو "عین حمیۃ" (کالے پانی کے چشمہ) میں غروب ہوتے دیکھا۔ وہاں اس کو ایک قوم ملی۔ چنانچہ داریوش ہی وہ شخص تھا جس نے جانب مغرب سفر کیا اور آرمینا اور سواحل پونطوس (بحیرہ اسود) کی تمام وحشی قوموں کو مغلوب کیا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ "عین حمیۃ" (بحیرۂ اسود) کے کنارہ پر پہونچا ہوگا تو وہاں شام کے وقت اُسے ضرور آفتاب "کالے پانی کے چشمہ" میں غروب ہوتا ہوا نظر آیا ہوگا۔ (۶) بعض مورخین و مفسرین نے ذوالقرنین کو پیغمبر یا مرد صالح لکھا ہے۔ اور یہ بات تمام دنیا جانتی ہے کہ اسکندر اعظم بن فیلقوس ایک بت پرست شخص تھا جو پیغمبر نہیں ہو سکتا برعکس ازیں داریوش جس کی نسبت انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا "نے لکھا ہے" داریوش جیسا کہ مقام بہستون کے کتبوں سے پایا جاتا ہے دین زردشتی کا پرجوش پیرو تھا" اور مجوس اہل کتاب میں داخل ہیں۔ ملاحظہ ہو قرآن شریف کی سورہ حج آیتہ ۱۷ :۔

"ان الذین امنوا والذین ھادوا والصابین والنصریٰ والمجوس" جس کی رو سے یہودی، نصاریٰ، صابین اور مجوس اہل کتاب

میں داخل ہیں - اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ہجر (بحرین) کے مجوسیوں سے جزیہ لیکر ان کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا اس طرح گویا داریوش اگر پیغمبر نہیں تھا تو اہل کتاب ہونیکی حیثیت سے مرد صالح ضرور تھا - اور وہ اپنے دین کا داعی بھی تھا جیسا کہ اس آیتہ سے ثابت ہوتا ہے وسنقول لہ من امرنا یسرا ۞ یعنی اس نے سواحل بحیرہ آسود کی قوم کو دعوت مجوسیت دی ہوگی - (۷) دوسرا سفر ذوالقرنین کا جانب "مطلع الشمس" ہوتا ہے جہاں اس نے آفتاب کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جسے آفتاب سے پناہ نہیں دی گئی تھی - اس میں داریوش اعظم کے اس سفر کی طرف اشارہ ہے جو اُس نے اپنے ملک کے جانب مشرق خراسان کی طرف قبائل مرجو ([illegible]) کی بغاوت فرو کرنے اور تورانی قبائل کی سرکوبی کے لئے کیا تھا واضح ہو کہ یہاں مقام "مطلع الشمس" ایران کا وہ مشرقی علاقہ مراد ہے جسے "خراسان" یا "خور - آسان" کہتے ہیں - یہ در اصل "خور استھان" ہے جو مرکب ہے لفظ "خور" یعنی آفتاب اور "استھان" بمعنی مقام سے جس کے معنی ہوئے "سرزمین طلوع آفتاب" یا "مقام طلوع الشمس" انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں "خور اسان" کو مرکب بنایا ہے "خور" (بمعنی آفتاب) اور "آسان" (بمعنی طلوع) سے یعنی مقام "طلوع الشمس" (۸) ذوالقرنین کا تیسرا سفر وہ ہے جہاں وہ "بین السدین" یعنی دو پہاڑوں کے درمیان پہونچا اور وہاں اس نے ایک ایسی قوم دیکھی جو ذوالقرنین کی زبان نہیں سمجھتی تھی - اور یہیں ذوالقرنین سے ان اقوام نے جو اس کے ماتحت تھیں یاجوج و ماجوج کی شکایت کی "کہ وہ اس ملک میں آکر فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں، اگر آپ چاہیں تو خراج مقرر کر دیا جائے تاکہ آپ یاجوج اور ماجوج اور ہمارے درمیان ایک سد تعمیر کر دیں"، چنانچہ دو پہاڑوں کے درمیان "بین السدین" ایک دیوار مستحکم تعمیر کر دی گئی - یہ کام بھی سکندر اعظم بن فیلقوس نے نہیں کیا بلکہ اس سے قبل داریوش اعظم نے یہ دیوار آرمینیا - آذربائیجان اور تفقاز فتح کرنے کے بعد تعمیر کی تھی تاکہ اقوام سیتھین اقوام کے خلاف داریوش اعظم نے ۵۱۲ق م میں فوج کشی کی تھی (جس کا بیان آگے آتا ہے) (۹) قرآن شریف کی آیتہ انا مکنالہ فی الارض وآتینٰہ من کل شئی سببا ۞ یعنی تحقیق ہم نے اس کا تسلط زمین پر قائم کر دیا - اور ہم نے اسے ہر قسم کا سامان عطا فرمایا اس آیتہ سے عموماً مسلمان مورخین و مفسرین یہ استدلال کرتے ہیں کہ وہ بہت بڑا بادشاہ تھا - ہم بھی اس قول کی تائید کرتے ہیں کہ واقعی ذوالقرنین بہت بڑا بادشاہ تھا - مگر ہمارے نزدیک وہ سکندر اعظم بن فیلقوس نہیں تھا جس کے کارناموں کا حال ہم اوپر بیان کر چکے ہیں بلکہ درحقیقت وہ داریوش اول شاہ ایران و میڈیا تھا - جو سکندر اعظم سے بھی پیشتر گزر چکا تھا - اور اپنے قول کی تائید میں ہم بائبل کتاب دانیال باب ۸ کا وہ رویا پیش کرتے ہیں جو دانیال نے دیکھا تھا - اس میں دو سینگوں والا مینڈھا پہلے نظر آتا ہے - اور اس مینڈھے کے وہ دو سینگ میڈیا اور ایران تھے - اس کے بعد ایک سینگ والا بکرا نظر آتا ہے جو سکندر اعظم بن فیلقوس تھا جس نے دارائے اعظم کے جانشین دارائے سوم فرمانروائے میڈیا ایران کو شکست دی - یہ واقعہ ۳۳۱ ق م کا ہے بعد ازاں اس بکرے کا ایک سینگ (ایک سلطنت) ٹوٹ کر اس کی جگہ چار سینگ نکل آتے ہیں یعنی چار سلطنتیں قائم ہو جاتی ہیں اور یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ سکندر بن فیلقوش کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت اس کے چار جرنیلوں مسمیاں بطلیموس، اریداوش، انٹیوخوس سلوقس نے تقسیم کر لی تھی - ان واقعات اور رویائے دانیال سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سکندر "ذوالقرنین" نہیں تھا بلکہ "واحد القرن" تھا - اور اصلی ذوالقرنین شاہ ایران و میڈیا "داریوش اول" تھا - علاوہ ازیں "انا مکنالہ فی الارض وآتینٰہ من کل شئی سببا" کی صحیح تصویر آپ کو مندرجہ ذیل نوٹ سے نظر آجائیگی جس میں ہم داریوش اعظم کے مختصر حالات بیان کرتے ہیں - آپ اس حالات کا مقابلہ سکندر اعظم کے تاریخی واقعات سے کر کے دیکھ

سکتے ہیں کہ دونوں میں کون بادشاہ بڑا تھا۔ (۱۰) داریوش اعظم بن گستاسپ (Hystaspes) کی تاریخ اس کے کتبات مندرجہ کوہستون سے بخوبی معلوم ہوتی ہے۔ جب کامبے سیس شہنشاہ ایران ۵۲۱ق م میں خودکشی کرکے مرگیا تو اسوقت ایک شخص مسمی گوتم نے تمام سلطنت کو غصب کرلیا اور وہ بردیہ بن کائرس کے نام سے سلطنت کرتا رہا۔ کوئی شخص اس کے خلاف ایک لفظ بھی منھ سے نہ نکال سکتا تھا۔ لیکن داریوش نے جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس غاصب کے خلاف سازش کی اور چھ ایرانی امرار کی مدد سے اس نے گوتم کو قتل کیا جو اس وقت میڈیا کے ایک قلعہ میں تھا اور اس طرح وہ ایران اور میڈیا دونوں سلطنتوں کے تخت وتاج کا مالک ہوگیا۔ مگر اس انقلاب سیاسی کے ساتھ ہی صوبجات سوس، بابل میڈیا، صغرتیہ، مرغیہ، وغیرہ نے علم بغاوت بلند کردیا۔ لیکن داریوش نے ایرانی اور میڈیا کی فوجوں سے تمام بغاوتوں کو فرد کردیا اور تمام سلطنت پر اپنا تسلط قائم کرلیا کتبات بیستون سے ظاہر ہوتا ہے کہ داریوش اعظم زردشت کے دین کا نہایت پرجوش پیرو تھا۔ علاوہ ازیں وہ بڑا مدبر بادشاہ تھا۔ ملک کی تنظیم سے خوب واقف تھا۔ اُس نے کوہستان آرمینا اور سواحل بحیرہ اسود کی قوموں کو مغلوب کرلیا۔ اور سلطنت ایران کو کوہستان قفقاز تک وسعت دی۔ اور اسی غرض سے اس نے اقوام ساکا اور دیگر تورانی اقوام سے جنگ کی۔ ملک میں امن و امان قائم کرکے اس نے ملکی تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کی اور اسکائیلاکس کی ماتحتی میں ایک مہم روانہ کی جو دریائے کابل سے گزرتی ہوئی دریائے سندھ تک پہونچی اور پھر دہانہ دریائے سندھ سے لیکر سوئز تک تمام بحر عرب کی دیکھ بھال کی۔ داریوش نے دریائے نیل سے خلیج سوئز تک ایک نہر تعمیر کی جس میں ہوکر اس کے جہاز بحر احمر میں ہوتے ہوئے ایران آتے تھے۔ اس کے تعلقات ملک قرطاجنہ سے بھی تھے اور اُس نے جزیرہ صقلیہ اور ملک اطالیہ کے سواحل کی تفتیش و تحقیق کی تھی۔ اسی کے ساتھ اسکی پالیسی یہ بھی کہ اپنی تمام مفتوح اقوام کی تالیف قلوب کرے اور اس غرض سے اُس نے مفتوحہ اقوام کے معتقد ایان دین سے میل جول شروع کیا۔ اس نے یہودیوں کو بھی ہیکل مقدس تعمیر کرنے کی اجازت دیدی۔ اس نے ممفس، عیدفو اور نخلستان کبیر میں بڑے بڑے مندر تعمیر کرائے۔ جن کی دیواروں پر اس کا نام کندہ ہے اُس نے مصر کے کاہن اعظم کو اپنے دارالسلطنت میں طلب کیا اور اس کو حکم دیا کہ سائیس کے مندر سے متعلق جو بہت بڑا طبی کالج ہے اس کا انتظام کرے۔ قدیم مصری روایات میں داریوش اعظم کو بڑا چشمۂ فیض اور مقنن بیان کیا گیا ہے۔ ایسا ہی عمدہ سلوک اس نے یونانی اسکنیا مقدسہ کے ساتھ کیا۔ اور آپالو کے ہیکل کے متعلق جس قدر اوقاف تھے ان کا ٹیکس معاف کردیا۔ اور بیگار کے خلاف حکم امتناعی جاری کردیا۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ اور ایشیائے کوچک میں یونانیوں کے جتنے مذہبی مراکز تھے وہ سب داریوش اعظم کے حامی و مددگار تھے۔ اور جب داریوش اعظم نے مختلف اقوام و ملل کے ساتھ جنگ کی تو تمام یونانیوں کو تنبیہہ کردی گئی تھی کہ وہ داریوش کی مزاحمت نہ کریں۔

۵۱۲ق م کے قریب داریوش اعظم نے سیتھین قوم کے خلاف فوج کشی کی۔ ایران کی ایک زبردست فوج باسفورس کو عبور کرکے یوروپ میں داخل ہوئی۔ اور تھریس کو فتح کرتی ہوئی دریائے ڈانیوب سے پار ہوگئی۔ اس مہم کا مقصد محض یہ تھا کہ تورانی اقوام (یاجوج وماجوج) پر عقب کی طرف سے حملہ کیا جائے، اور اس طرح سلطنت ایران کی شمالی سرحدوں پر قیام امن کیا جائے۔ الغرض داریوش اعظم (بقول ہیرودوطوس) اقوام سیتھین کے پیچھے دریائے دونغا تک پہونچ گیا مگر مرکز سے دور ہونے کے باعث واپس آجانا پڑا۔ اس کے بعد مصر میں بغاوت ہوگئی۔ اور ابھی یہ بغاوت فرو بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ۴۸۵ق م میں داریوش اعظم مرگیا۔ اس نے ۳۶ برس سلطنت کی۔ الغرض ان تمام واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے

کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر نہیں بلکہ داریوش اعظم ہے جس کے حالات بالکل کلام مجید کے بتائے ہوئے حالات سے ملتے جلتے ہیں۔

سَدّ اس وقت دنیا میں دو بڑی اور عظیم الشان سدیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) دیوارِ چین۔ (۲) دیوارِ دربند یا باب الابواب سرسید کے نزدیک ذوالقرنین کی تعمیر کردہ سدِ چین کی دیوار ہے اور دیگر مورخین و مفسرین کے نزدیک وہ باب الابواب ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں پر علیحدہ بحث کی جائے۔ (۱) سرسید فرماتے ہیں کہ کچھ شبہ نہیں ہے کہ جس سد کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ وہی دیوار ہے جو چین اور تاتار یا سیتھیا کی سرحد پر بنائی گئی ہے اور جس کو چی وانگ ٹی فغفورِ چین نے درمیان سنہ ۲۳۵ ق م تعمیر کیا تھا۔ یہ دیوار ھانگھو دریا کے غربی موڑ سے جو ایک پہاڑ کے قریب ۷۳ درجہ ۱۵ دقیقہ، عرض البلد اور ۱۰۰ درجہ طول البلد پر واقع ہے بنانا شروع ہوئی اور پھر اس دریا کے دوسرے موڑ کو قریباً ۲۹ درجہ عرض البلد اور ۱۱۱ درجہ طول البلد پر کاٹ کر اور ختجان پہاڑوں کے جنوبی سلسلہ کے نیچے ہو کر خلیج لیوٹونگ کے کنارہ پر ٹھیک چالیس درجہ عرض البلد اور ایک سو بیس درجہ طول البلد پر ختم ہوئی ہے۔ طول اس دیوار کا ۱۲ سو سے پندرہ سو میل کا بیان ہوا ہے۔ اور وجہ اس کی تیاری کی یہ ہوئی کہ جب قوم تاتار نے اس طرف سے بار بار یورش کر کے خطائیوں کو سخت عاجز کیا اور کوئی تدابیر ان کو ضبط کرنے کی نہیں سوجھی تب اس دیوار کی بنا کی گئی اور فغفور چی وانگ ٹی نے دو سو چالیس برس قبل مسیح کے اسے شروع کیا اور عرصہ قلیل یعنی صرف پانچ برس میں یہ تمام ہوئی۔۔۔۔ یہ دیوار سمندر کے بیچ سے شروع اس طرح پر ہوئی ہے کہ صدہا جہاز پتھروں سے لدے ہوئے ڈبا دیئے گئے اور اس پر اس کی بنیاد قائم ہوئی ہے اور آٹھ سو کوس تک تیس گز اونچی اور اس قدر چوڑی ہے کہ چھ سوار پہلو بہ پہلو فراغت سے اس پر گھوڑا دوڑا سکتے ہیں اور سو سو قدم پر دو منزلہ اور سہ منزلہ برج بنے ہیں۔

ہم سرسید کی یہ بات ماننے کے لیے تو تیار ہیں کہ چین کی دیوار اعظم اقوام سیتھین (یاجوج ماجوج) کی روک تھام کیلئے تعمیر کی گئی تھی مگر ہم یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ اس دیوار کا تعمیر کرنیوالا قرآن کا ذوالقرنین تھا یا یہ وہی دیوار ہے جسکا ذکر لفظ سد سے قرآن شریف میں آیا ہے۔ اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

(ا) چین کی دیوار اعظم اس قدر دور دراز فاصلہ پر واقع ہے کہ عربوں کو جنھوں نے قرآن میں رسول اللہ سے ذوالقرنین کے بارہ میں سوال کیا تھا اس سے واقف نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار وہ ہونا چاہئے جو ملک عرب کے قریب اور ان میں زیادہ مشہور ہو۔

(ب) چین کی دیوار ۱۵ سو میل طویل، تیس گز بلند اور اس قدر چوڑی ہے کہ اس پر چھ سوار پہلو بہ پہلو فراغت سے گھوڑا دوڑا سکتے ہیں اور سو سو قدم پر دو منزلہ و سہ منزلہ برج بنے ہوئے ہیں اور باایں ہمہ بقول سرسید یہ دیوار فغفور چین نے پانچ سال کی قلیل مدت میں تعمیر کر لی تھی۔ اتنی عظیم الشان دیوار کا پانچ سال میں بدرجہ اتمام پہونچنا قرین قیاس نہیں ہے۔

(ج) سرسید نے تحریر فرمایا ہے کہ دیوار چین کا ایک سرا سمندر میں ہے اور دوسرا اس طرح شروع ہوا کہ ہزاروں جہاز پتھروں سے بھر کر ڈبو دیے گئے۔ ان پر دیوار کی تعمیر قائم کی گئی تھی۔ اس طرح یہ دیوار "بین الصدفین" نہ رہی اور قرآن شریف کی دیوار "بین الصدفین" ہے۔ یعنی دو پہاڑوں یا پہاڑیوں کے درمیان۔

(۲) ہمارے نزدیک ذوالقرنین کی تعمیر کردہ دیوار یا سد وہ ہے جو شہنشاہ داریوش اعظم نے اقوام سیتھین (یاجوج و ماجوج)

کو روکنے کے لئے بمقام دربند واقع داغستان تعمیر کی تھی۔ اس دیوار کا کچھ حال مراصد الاطلاع میں اور ابن الفقیہ نے بھی بیان کیا ہے۔ دربند ملک ایران کا ایک شہر ہے جو صوبہ داغستان میں واقع ہے اور بحر خزر کے مغربی ساحل پر پایا جاتا ہے۔ اور اس کے جنوب کی طرف دیوار قفقاز (۵۰ میل طویل) کا وہ سرا واقع ہے جو بحر خزر کی جانب چلا گیا ہے۔ یہ دیوار سد سکندری کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اور اس دیوار کے ذریعہ سے وہ گھاٹ بند کیا گیا ہے جسے "باب الحدید" (Iron Gate) یا "باب القزوین" (Caspian Gates) کہتے ہیں۔ جب یہ دیوار مکمل تھی تو اس کی بلندی ۲۹ فٹ اور موٹائی ۱۰ فٹ تھی اور اپنے "ابواب الحدید" اور بیشمار برجوں کے باعث وہ سلطنت ایران کی سرحد کا ایک گران قدر استحکام تھی۔ اس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی آیت میں جن "لوہے کے ٹکڑوں" کا ذکر کیا گیا ہے وہ "ابواب الحدید" بنانے میں کام آئے ہونگے۔ سکندر بن فیلقوس نے اقوام سیتھیا (یاجوج و ماجوج) پر کہیں حملہ نہیں کیا۔ وہ "باب القزوین" (Caspian Gates) تک ۳۳۱ق م میں صرف داریوش سوم کا تعاقب کرتا ہوا پہونچا تھا۔ ممکن ہے اسوقت اُس نے بھی اس دیوار کے استحکامات میں کچھ اضافہ کر دیا ہو۔ جس کی وجہ سے وہ "سد سکندری" مشہور ہو گئی۔ ورنہ یہ محض مسلم مورخین کی قیاس آرائی ہے۔ جو سکندر اعظم کو ذوالقرنین سمجھے ہوئے تھے۔ ورنہ سکندر کی عمر ہی اتنی کب ہوئی تھی جو وہ سد عظیم تعمیر کر سکتا۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں "دربند" کے متعلق لکھا ہے کہ اسے عرب لوگ "الباب" (Gate) باب الابواب یعنی (Gate of Gates) اور الباب والابواب (The Gate & Gates) کہتے ہیں۔ یہ شہر داغستان میں واقع ہے اور خاص طور پر اپنی عجیب و غریب دیواروں کی وجہ سے مشہور ہے جو پہاڑوں کے درمیان واقع ہیں۔ بعض جگہ یہ دیوار ½ ا میل چوڑی ہے ساسانیوں اور بعد ازاں مسلمانوں کے عہد میں یہ دیوار بلاد ایشیا کو جنوبی روس کی خانہ بدوش اقوام (یاجوج و ماجوج) کے حملوں سے محفوظ رکھتی تھی۔

الغرض ہماری تحقیق یہ ہے کہ یاجوج ماجوج وہ وحشی اقوام مراد ہیں جو قفقاز کے شمال میں رہتی تھیں اور ذوالقرنین عبارت ہے داریوش اعظم سے۔ اور سد سے مراد وہ دیوار ہے جو داریوش نے دربند میں تعمیر کرائی تھی۔

شرح کلام غالب باتصویر

تمام قدیم و جدید کلام کی شرح تقریباً ۳۰۰ صفحات پر ہوئی ہے لکھائی اور چھپائی عمدہ مجلد قیمت سے/

سولہ کہانیاں

سولہ فسانوں کا پیکٹ قیمت ۱۲/ علاوہ محصول ڈاک

منیجر نگار لکھنؤ

پیمان وفا

کتابِ عشق کی شیرازہ بندی کی تھی تیاری
کمالِ حسن پر تنہائی کی تھیں ساعتیں بھاری
پڑی لوحِ ازل تھی مدتوں سے تشنۂ انشا
قلم سیکھا نہ تھا اندازِ تحریرِ فسوں کاری
عدم کی ظلمتِ دیرینہ محرومِ تجلی تھی
نہ مہر و ماہ نے اسوقت تک کی تھی ضیاباری
زمیں کو بھی نہ آیا تھا میسر خلعتِ حنا کی
نہ باندھا تھا آسماں نے تھا ہنوز احرام زنگاری
لبِ قدرت ہوئے تھے مس نہ حرفِ آفرینش کو
کیا تھا ذات واجب نے نہ حکمِ "کن" ابھی جاری
یکایک اس سکوت و خامشی اور ہو کے عالم میں
محبت نے دکھائی اپنی صورت موہنی پیاری
شبستانِ عدم روشن ہوا انوارِ الفت سے
چمک اور جگمگا اٹھی نمودِ نوری و ناری

متاعِ حسن میں آئیں ادائیں خود فروشی کی
لیا جانے لگا اقرار و پیمانِ وفاداری
تو اس پر عالمِ عشق و محبت ہو گیا ساکت
کہ سمجھا تھا بہائے حسن آہ و نالہ و زاری
صفِ عشاق سے لیکن تڑپ کر اک جواں نکلا
سراپا غیرت و عشق و نیاز و ناز برداری
بکف سر اور بدل اخلاص و صدق و خود فراموشی
کمالِ شوق عینِ آرزو" محوِ خریداری
حقیقت آشنا عرفانِ سراپا والہ و شیدا
نقیبِ حق، قیادت مستحق شایانِ سالاری
چراغِ بزمِ ایماں آفتابِ عالمِ الفت
بہارِ گلشنِ امکاں امام و خاصۂ باری
غرض اس والہانہ شان نے چونکا دیا سب کو
عدم کے سونے والوں کو یہ تھا پیغامِ بیداری
ہوئیں بیدار روحیں عالمِ ایجاد گرمایا
فضائے لامکاں عہد و وفا سے گونج اٹھی ساری
لگائی مہر اپنے خوں سے یوں سرشارِ الفت نے
کہ عالمِ وجد کا خود حسن پر بھی ہو گیا طاری
ملک حیران و ششدر رہتے جگر داری پہ عاشق کی
کہ انجامِ محبت کی تھی تسلیم ان کو دشواری
پڑھا جو محضرِ الفت جلی حرفوں میں لکھا تھا
حسین ابن علیؑ سبطِ پیمبر عاشقِ باری

سنان و خنجر و تیغ و تبر سے کھیلنے والا
ہزاروں سختیاں، لاکھوں شدائد جھیلنے والا

بشر آیا جہاں میں اشرفِ کون و مکاں ہو کر
یہ اس گلزار میں پہنچا بہارِ بے خزاں ہو کر
یہ پتلا خاک کا اب ہم جسے انسان کہتے ہیں
تصور تو کرو تھا کیا؟ اور آیا کیا؟ یہاں ہو کر
مبارک باد اے انساں کہ اب خلقِ عظیم آیا
رہیگا روکشِ جنت یہ تیرہ خاکداں ہو کر
ملائک سے فزوں ہے مرتبہ انسانِ کامل کا
بتاتا ہے یہ نام مصطفےٰ جزوِ اذاں ہو کر

خلیل اللہ و اسماعیلؑ بیشک فخرِ آدم تھے   محمد آئے لیکن افتخارِ انس و جاں ہو کر
غذا نان جویں اور زیبِ دوش پاک ہو کمبل   کہیں الفقر فخری خسروِ دو جہاں ہو کر
ہے معراجِ محبت قاب قوسین کے پردہ میں   دکھایا ہے کسی نے یوں دو قالب یکجاں ہو کر
عرب کے ریگ زارِ وحشت افزا میں بہار آئی   پھلے پھولیگا اب یہ غیرتِ صد گلستاں ہو کر
جہالت دور ہو جائے مٹے تاریکیٔ عالم   کریگا مہر روشن دہر کو اب ضو فشاں ہو کر
عداوت ختم فتنے ہوں فرو تلوار رک جائے   کہ آئے رحمتِ حق خلق کے اب پاسباں ہو کر
پیامِ امن لایا ہے فقط اسلام دنیا میں   پناہِ بے پناہاں دستگیرِ بیکساں ہو کر
معلم نے دیا درسِ محبت ہر کہ و مہ کو   شفیقِ دشمناں ہو کر، رفیقِ دوستاں ہو کر
متاعِ عشق بخشی اس دلِ محرومِ الفت کو   کھائی منزلِ مقصود میرِ کارواں ہو کر
بنایا آدمی ان بادیہ گردانِ وحشت کو   بہائم کی طرح چلتے جو بے نام و نشاں ہو کر
کنیزی و غلامی سے کیا آزاد انساں کو   کہ صدیوں سے گلے کا ہار تھی طوقِ گراں ہو کر
ارادے، منتیں، دل بدلے اک جانِ دو عالم نے   بہت دشوار تھا عشقِ خدا عشقِ بتاں ہو کر
کبھی شعبِ ابوطالب کبھی غارِ حرا مامن ہے   کسی کا ذکر ہوتا تھا حریفوں سے نہاں ہو کر
کیا ہو جسنے دعویٰ بچپنے میں عشقِ کامل کا ہے   سمجھ لیجیے کہ کیا کچھ کر نہ گذریگا جواں ہو کر
ادھر مشرک ادھر کافر، منافق یاں وہاں دشمن   کیا اعلانِ حق بتیس دانتوں میں زباں ہو کر
وطن سے نکلے، بچھڑے اقربا سے اور حرم چھوٹا   ظفر آخر صداقت کو ہوئی بے خانماں ہو کر
رسالت ناز پروردوں کا غنچہ لیکے نکلی ہے   عدو کانپ اٹھا ہے مرعوبِ طرزِ امتحاں ہو کر
ہوا زینت دہ منشور حق طغرائے اکملتُ   رہا نامِ خدا اللہ اکبر …… کامراں ہو کر
• کہیں سے چاہنے والے کو تھی فرمائشِ بلغ   کہا من کنت لاکھوں میں کسی نے شادماں ہو کر

اجالا کر دیا کون و مکاں میں حق پرستوں نے
مے الفت زمانے کو پلا دی فاقہ مستوں نے

بحمد اللہ قائد ہے حکیم و فلسفی اپنا   ہے استاد و معلم خاص شاگردِ نبی اپنا
جھکیں سر ناطقے ہوں بند سقراط و ارسطو کی   سبق ان کو سنا دیں کچھ اگر ہم بھی کبھی اپنا
بلال و بوذر و سلماں پہ کیا تعلیم یہ وہ ہے   کہ بن جاتا ہے جس کے فیض سے ہر اجنبی اپنا
سپاہی - بادشہ، درویش، فاتح زاہد و عارف   یہ سب جوہر ہیں اس معصوم کے جو ہے ولی اپنا
الہیات، ادب، ہیئت، ریاضی و سیاست میں   علی منواتے ہیں بے مثل پایہ آج بھی اپنا
زبان فیض تر رہتی تھی ارشادِ سلونی سے   بھرا کرتے تھے دامانِ طلب شیخ و صبی اپنا
بشر پر تھا خفی اہرامِ مصری کب سے ہیں؟ کیا ہیں   کیا نفسِ نبی نے علمِ عالم پر جلی اپنا

نہ رستم کو جری سمجھے، نہ حاتم کو سخی مانے
دکھائیں ہم جو دنیا کو جری اپنا سخی اپنا

عدو زانو تلے، خنجر گلے پر، پھر بھی جاں بخشی
یہ ہے للٰہیت، رکھتے نہیں ثانی علیؑ اپنا

کبھی خندق کو پاٹ آئے، کبھی خیبر کو جا اُلٹا
رہا ہے کھیل صدیوں سے یونہیں مردانگی اپنا

فضائے دہر تھی مسموم شرک و بت پرستی سے
کوئی حق کو سمجھتا تھا نہ حضرت کو نبی اپنا

اُٹھا اک بچہ دہ سالہ تصدیق رسالت کو
مخالف کو بھی جس نے کر کے چھوڑا معتقد اپنا

عبادت میں وہ استغراق گویا جسم بیجاں ہے
عدالت یہ کہ کہتا خود ہی بس عدلِ علی اپنا

عبا دیکھو تو صد پارہ معیشت ہے تو مزدوری
نہ میر مومنین کو کر سکی شاہنشہی اپنا

یتیموں، بیکسوں، درماندوں، محتاجوں کی دلجوئی
سمجھتے تھے یداللہ نہتائے سروری اپنا

ابو طالب پدر، بنت اسد ماں اور خود عاشق
علی کرتے نہ کیوں سینہ سپر بہر نبی اپنا

وہ اسلام مجسم نام ہے جس شیر کا حیدر
سمجھتا تھا ہمیشہ فرض عین انساں گری اپنا

اُٹھ اے مسلم! کہ نقش پائے حیدر شمع منزل ہے
یہ اپنا تو زمیں اپنی ہے چرخ اخضری اپنا

ق

نکل باہر ہوا میں زندانِ یاس و نا اُمیدی سے
ہوائے حریت سے دست و بازو کر قوی اپنا

مٹا دے امتیازِ رنگ قوم و ملک و ملت کو
سمجھ زیر فلک ہر فرد انساں کو اخی اپنا

ق

اُٹھا کر آسماں سے سر ملا دے نوعِ انساں کا
کہ وہ بھی آدمی ہے اور لقب ہے آدمی اپنا

صدائے عشق پہنچا دے تمام آباد دنیا میں
ق　کہ روز آفرینش سے ہے مذہب عاشقی اپنا

بقا اپنی محبت ہے محبت ہے حیات اپنی
محبت سے بنالے ساری دنیا کائنات اپنی

تقاضا ہے یہ فطرت کا سراسر لطف یزداں ہے
جہاں میں لازم و ملزوم اسلام اور انساں ہے

نہ تاج و تخت سے دبتا نہ استبداد و سختی سے
جو حق پر جان دیدیتا ہے وہ عاشق مسلماں ہے

سراب بے حقیقت ہے اُسے تلوار کا پانی
کہ دل میں آتشِ عشق اور جس کو ہاتھ پر جاں ہے

دلِ بیتاب پر چشمِ کرم اے عشقِ غم پرور
جراحت لذتِ پرکیف تیر اور ماں ہے

اُٹھا ہے شام کی جانب سے اک طوفان بیدینی
غرض توہینِ اسلام اور استخفافِ ایماں ہے

بہی جاتی ہے دنیا کے عمل بے امتیاز اس میں
نشانِ کعبہ تک کے محو کر دینے کا ساماں ہے

ہے الناس علیٰ دین الملوک اب آرہا صادق
رعیت بھی اسی رُخ چلتی ہے جو راہِ سلطاں ہے

خدا کا نام تک سننا گراں ہے گوشِ ملحد پر
نبی پر افترائے کذب ہے قرآں پہ بہتاں ہے

ہوا اب یہ فرضِ قدرت کا کہ اس سیلاب کو روکے
کسی جانباز کو بھیجے کہ شرط ایقائے ایماں ہے

وہ غیرت جوش میں آئی وہ سرکارِ وفا نکلی
حوالیٔ مدینہ رو کشِ صحنِ گلستاں ہے

یہ ذوقِ سرفروشی ہے، کلیجہ دیکھو عاشق کا
بضاعت لیکے وہ نکلا ہے جس پر عشق نازاں ہے

نبی کی آنکھ سے اشکِ مسرت نکلے پڑتے ہیں   پدر کا سر ہے سجدہ میں بلائیں لے رہی ماں ہے
ارم والے کھڑے ہو کر بحیرت انکو تکتے ہیں   ملائک کو تعجب عرشیونکی چشم حیراں ہے
طواف ان کا دیانت کر رہی ہے شاد ہو ہو کر   رکاب اسلام اور تھامے ہوئے ایمان داماں ہے
بپا دنیائے صبر و شکر میں عیدِ تعارف ہے   الوالعزمی کھلی پڑتی ہے اور ایثار شاداں ہے
حیاتِ تازہ اخلاقِ کریمانہ کو ملتی ہے   کمالِ اوجِ روحانیت و معراجِ عرفاں ہے
روانہ ہو چکا ہے قافلہ یہ ارضِ یثرب سے   جلو میں شوق ہے اور گرمئ الفت حدی خواں ہے

ہوا ہے خیمہ زن فخرِ شجاعت آج جنگل میں
یقین ہے فیصلہ بیعت کا ہو جائیگا مقتل میں

نہ خوفِ تیغ ہے۔ ڈر ہے نہ کچھ اعدا کی کثرت سے   حسینؑ ابنِ علیؑ کو صاف ہے انکارِ بیعت سے
بڑھا شمعِ محبت کرنے گُل دیوانۂ ظلمت   لئے شمشیر و تیغ و نیزہ و خنجر عداوت سے
ہے عاشق سر بکف اب قتل گاہ ناز میں آیا   صدا آنے لگی تکبیر کی بزمِ حقیقت سے
نظر آتے ہیں تیغ و تیر و شمشیر ادا اس کو   سرورِ دائمی حاصل ہے اب زخموں کی لذت سے
زمینِ گرم و تفتیدہ ہے فرشِ گل سے نازک تر   نہیں ہے چھاؤں تلواروں کی کچھ کم ظلِ رحمت سے
نہ پروا ہے اُسے ناموس کی بے خانمانی کا نہ   نہ حق و صدق چھٹ سکتا ہے اس سے قتل و غارت سے
تھپیڑے لو کے اسکے عزم کو زک دے نہیں سکتے   نہ ہمت ہار سکتا ہے کسی آزار و زحمت سے
دھنسا جاتا ہے بس اس آگ کے دریا میں بے دھڑکے   گھسا پڑتا ہے وہ اس موت کے منہ میں متانت سے
ہٹا سکتے نہیں حق سے اُسے دنیا و ما فیہا   مجاز اس کو جدا اب کر نہیں سکتا حقیقت سے
شدائد اس کو استغراق سے چونکا نہیں سکتے   مظالم لا نہیں سکتے اُسے کثرت میں وحدت سے
گرا پڑتا ہے نیزوں پہ مئے الفت کا متوالا   جگر خنجر پہ رکھ دیتا ہے بڑھ کر خود مسرت سے
کبھی کرتا ہے عین بیخودی میں پیشکش بیٹا   ادا ہوتا ہے بھائی کی کبھی پیاری امانت سے
لٹاتا ہے بیازی سے ہے کہ ہمشیر کی دولت   برادر کو کبھی ہے پیش کرتا شوق و رغبت سے
کبھی احباب کو محبوب پر قربان کرتا ہے   عزیزوں کو کبھی ہے نذر کرتا فرطِ الفت سے
جو مر جاتا ہے اُس کو ہے حیاتِ سرمدی ملتی   جو زندہ ہے وہ مرنے جاتا ہے سعی و سماجت سے
بضاعت اس طرح جب صرف ہو جاتی ہے عاشق کی   تو پھر وہ ڈھونڈتا ہے اور کچھ چشمِ بصیرت سے
یکایک اک نیا ہدیہ جو اس کو یاد آتا ہے   اچھل پڑتا ہے اور جاتا ہے سوئے خیمہ سرعت سے
اور اب وہ چیز لاتا ہے کہ حق کو ناز ہو جس پر   جو بن آئی نہ صفوت سے نہ جو ممکن تھی خلت سے
لئے ہے نور کا اک تقمہ ننھا سا ہاتھوں پہ   نیازِ عشق ۔ نذرِ صدق و اخلاص و عقیدت سے
اُٹھائے ہاتھ سوئے آسماں ہے اور دعا لب پر   کہ تیرِ ظلم دیتا ہے خبر جس کی اجابت سے

یہ گر پڑتا ہے شکرِ حق کو بیخود ہو کے سجدے میں　　اور آتا ہے نظر نیزہ پہ سر شاہانہ شوکت سے
صدائے غیب آتی ہے کہ اے شبیرؑ! اے عاشق!　　وفا وہ کر دکھایا تھا گیا پیماں جو قدرت سے
تو خضرِ راہ ہے تو افتخارِ نسلِ آدم ہے　　کیا وہ کام باقی رہ گیا تھا جو رسالت سے
پدر کی ضرب بھی گر طاعتِ کونین سے افضل　　پسر کا آخری سجدہ بڑھا کل کی عبادت سے

تری خاکِ قدم اسلام کی آنکھوں کا سرمہ ہے
کہ تو نے اپنے خونِ گرم سے یہ باغ سینچا ہے

زمانہ ہو اگر دشمن بدل لے آنکھ یا دنیا　　سرِ عاشق کبھی فاسق کی آگے جھک نہیں سکتا
شہادت ہوتے ہی سرِ شہادت ہو گیا روشن　　پھنکی روح دیانت عالمِ اخلاق جی اُٹھا
شجاعت، حق پرستی، حریت میں اس سے جان آئی　　مٹا ہے خونِ عاشق کے اثر سے نام باطل کا
مجدد اور محی الدین تھے سب کربلا والے　　رہیگا تا قیامت جاری ان کے نام کا سکہ
اگر بوڑھا ہے تو بھاری ہے وہ جنگی جوانوں پر　　جواں جو ہے تو اس سے فوج کا ہے قلب تھراتا
جو بچہ ہے ہمک کر تیر کا منھ چوم لیتا ہے　　اگر بچی ہے استقبال کرتی ہے مصائب کا
جو صحت سے ہے وہ مشتاقِ تیر و نیزہ و خنجر　　اگر بیمار ہے تو وہ وقار و ضبط کا پتلا ہے
دلہن دیکھو تو شمعِ محفلِ ایثار و قربانی　　جو بیوہ ہے تو صدرِ بزمِ صبر و شکر و استغنا
بہن ایسی کہ نقشِ پا پہ بھائی کے ملے آنکھیں　　پسر ایسا کہ صدقہ میں پدر کے دے جگر اپنا
جو سوچو بھائی کو تو ہے فدا بھائی کے سائے پر　　وہ ہیں احباب جن سے بج گیا اخلاص کا ڈنکا ہے
جدھر ڈالو نظر اخلاقِ پاکیزہ کا منظر ہے　　جسے دیکھو خصائل کا ہے اس میں موجزن دریا
خودی بھولا ہوا ہے ہر کوئی اللہ والوں میں　　فنا ہے جذب ہے بحرِ حسینیت میں ہر قطرہ
نظر دیکھو تو غیرِ حق کسی پہ پڑ نہیں سکتی　　ٹٹولو دل تو اک عالم ہے وہ عشق و محبت کا
کرو گر غورِ مقتل پر اصول نمایاں ہے　　ہے اخلاقِ منظم کا فقط مدِ نظر احیا
غرض پیدائش شبیرؑ سے تجدیدِ خلقت تھی　　شہادت کر گئی بے شبہ پیدا اک نئی دنیا

تقاضا شاہ کارِ عشق کا تعمیرِ مسلم ہے
ہمیں ہر قطرۂ خونِ شہیداں اک معلم ہے

سمجھ اے مومنِ ظاہر نظر! یہ واقعہ کیا ہے؟　　کوئی جانباز مرتا مرتا تجھ سے کہہ گیا کیا ہے؟
محبت کی ہے کیا تاثیر اس کا مقتضا کیا ہے؟　　فنا کہتے ہیں کس کو اور مفہومِ بقا کیا ہے؟
یہ ظاہر بینیاں تا کے۔ یہ دل آزاریاں کب تک　　اُبھر کر دیکھ پستی سے بلندی کی فضا کیا ہے؟
نکل اس تنگنائے ذہنیت سے پھیل عالم میں　　جسے سمجھا ہے تو دنیا یہ تیرا دائرہ کیا ہے؟
ہو آزاد اور کاٹ اب بیڑیاں یہ قیدِ بیجا کی　　تصور کر کہ تیری زندگی کا منتہا کیا ہے؟

لگا دے آگ رسم کہنہ میں آتش بیانی سے — جلا دے دفتر پارینہ کو اب دیکھتا کیا ہے؟
کر اس خاکستر ملت میں پھر سوز شرر پیدا — نشیمن پھونک دینے کیلئے شعلہ نوا کیا ہے؟
تو سیل اشک سے پہلے شرار عشق پیدا کر — نہو جب درد ہی دل میں تو پھر آہ و بکا کیا ہے؟
اڑا لیجا ریاض لامکاں تک ہمسفیروں کو — تو عہد گل کا اے بلبل فقط نوحہ سرا کیا ہے؟
ترا کاشانہ مومن عرش اعلیٰ سے ہے بالاتر — تری ہمت کے آگے وسعت ارض و سما کیا ہے؟
ہے شرط کامیابی سختیوں میں مبتلا ہونا — نہ جو کامل عیار آتش پہ ثابت ہو طلا کیا ہے؟
گداز و سوز و بے تابی نہ ہو تو عشق ہی مہمل — لگے جب تک نہ دل میں آگ الفت کا مزہ کیا ہے؟
الٹ دے یہ زمیں اس آسماں کی دھجیاں کر دے — نیا آباد کر عالم کہ یہ کہنہ سرا کیا ہے؟
رہین منت خون شہیداں ہے بنا تیری — مٹا سکتی پھر اس تعمیر کو تیغ جفا کیا ہے؟
تری رگ رگ میں دریا ہے حمیت کا شجاعت کا — جو دنیا میں کیا تو نے نہ اک محشر بپا کیا ہے؟
تصور کر ذرا سعی حر گم کردہ منزل کا — کہ کیا تھا ہمت عالی سے لیکن بن گیا کیا ہے؟
حیات جاودانی مل گئی بوڑھے مجاہد کو — حبیب نوجواں ہمت ہو شہ پر فدا کیا ہے؟
دلھن سے منھ پھرا کر مر مٹا محبوب پر کلبی — تعالیٰ اللہ ام وہب نے صدقہ دیا کیا ہے؟
گراں ہے بکتر و خود و زرہ تک جسم عابس پر — نہتا تو جہ پہ جا پڑتا ہے یہ حوصلہ کیا ہے؟
حیات سرمدی ہے مسلک شبیر کا حاصل — میسر یہ جو آجائے تو پھر آب بقا کیا ہے؟
نظیریں ہیں ترے پیش نظر یہ کامیابوں کی — خدا کا نام لیکر اٹھ کھڑا ہو سوچتا کیا ہے؟

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

سید علمدار حسین واسطی (بنوڑ دی)

نگارستان

(دوسرا اڈیشن) حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت صرف دو روپیئے (عـــہ) علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

حیات جاوید

دلِ دردمند وفا چاہتا ہوں　　محبت کی شیریں جفا چاہتا ہوں
وہ گزرا ہوا عہدِ شوقِ فراواں　　پھر اُس عہد کی ابتدا چاہتا ہوں
سکونِ مسلسل سے اکتا گیا ہوں　　وہی دردِ صبر آزما چاہتا ہوں
مجھے لذتِ زندگی جس نے بخشی　　وہی تلخ جامِ فنا چاہتا ہوں
سنہری تھیں جس سے محبت کی راتیں　　وہی بادۂ جانفزا چاہتا ہوں
وہی جلوۂ ماہتاب و لبِ جو　　وہی شامِ کیف آشنا چاہتا ہوں
وہی بارشِ نور و جوشِ تبسم　　وہی صبحِ عشرت فزا چاہتا ہوں
وہی جامِ صہبا وہی دستِ سیمیں　　وہی روح پرور فضا چاہتا ہوں
وہی ابرِ سرخوش وہی عہدِ مستی　　وہی نرم موجِ صبا چاہتا ہوں
مری ہر رگِ دل کو تڑپانے والی　　وہی شوخ طرزِ حیا چاہتا ہوں
مجھے دولتِ عشق جس نے عطا کی　　وہی غمزۂ دلربا چاہتا ہوں
ہوئی جس سے تکمیل درسِ محبت　　وہی ناز پرور ادا چاہتا ہوں
غمِ دل کو جس نے کیا عیشِ سرمد　　وہی کاوشِ دلکشا چاہتا ہوں
وہی بے حجابانہ شکرِ محبت　　وہی شکوۂ برملا چاہتا ہوں
وہی یک بیک ناز و جور و تغافل　　وہی امتحانِ وفا چاہتا ہوں
وہی ناز سے بے سبب روٹھ جانا　　وہی تہمت افزا سزا چاہتا ہوں
جو ہر کامیابی سے بیگانہ کر دے　　وہ محرومیٔ مدعا چاہتا ہوں
وہی زہد دشمن، پرستارِ صہبا　　وہی پھر دلِ بے ریا چاہتا ہوں
شراب و نشاط و نگار و ترنم　　وہی رحمتیں اے خدا چاہتا ہوں
اگر ہو خریدار کوئی تو آئے　　کہ میں دین و دل بیچنا چاہتا ہوں

کہیں عہدِ ماضی پلٹتا ہے اختر
میں دیوانہ ہوں ہائے کیا چاہتا ہوں

علی اختر (حیدرآباد دکن)

قاصد کلیاں

بھیجی ہیں کسی نے بہر درماں
بیلے کی چمن فروز کلیاں
بیجا نہیں دل کا محو ہونا
کلیاں ہیں سفید، سبز دونا
ڈوبی ہوئی عطر کمسنی میں
دونے کی نہین کوری سینکیں
کلیوں سے مگر عیاں ہے زردی
یہ روح غم ان میں کس نے بھر دی

گویا ہیں زبانِ حال سے یوں
اے شاعرِ خوش نصیب و محزوں

بھیجا ہے چھپا کے ہم کو جس نے
جانے اُسے غم دیئے ہیں کس نے
یوں زرد و دو روے دلنشیں ہے
اک چھینٹ بھی خون کی نہیں ہے

ہم سے یہ کہا ہے جا کے کہنا
لازم نہیں اب خموش رہنا

مجھکو تری یاد نے ڈبویا
مرجھائی ہوئی کلی ہوں گویا
بھرتی ہوں چھپا کے شب کو آہیں
ہٹتی نہیں چاند سے نگاہیں
شاما جو سحر کو بولتی ہے
سینے میں کھٹکتی ہے کوئی شے
لب خشک ہیں منہ ہے اُترا اُترا
پنڈا کئی روز سے ہے پھیکا
چہرے سے عیاں ہے دل کی اُلجھن
ڈھیلے ہیں کلائیوں کے کنگن
اللہ یہ کیا ہوا ہے مجھکو
دیکھو جسے دیکھتا ہے مجھکو
اب حد سے فزوں ہے خستہ حالی
نزدیک ہے وقت پائمالی
گلچیں کی ہے اب تو آمد آمد
آراستہ ہو رہی ہے مسند
آتا ہے تو آ کہ دل ہے بیتاب
ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب

جلد آ کہ فروغ رنگ و بو ہو
قبل اس کے کہ خون آرزو ہو

جوش (ملیح آبادی)

ستاروں کی موت

یک بیک ظلمات کی فوجیں پریشاں ہوگئیں
نیند کی موجیں ستاروں سے لپٹ کر سوگئیں
چشم گیتی سے فسون خواب زائل ہوگیا
ذرہ ذرہ ذوق بیداری پہ مائل ہوگیا

پھوٹ نکلے آتشیں نغمے سحر کے ساز سے
جل اٹھیں تاروں کی روحیں گرمئ آواز سے
اُف ستارے نور کے شعلوں سے مرجھائے ہوئے
صبح کے انوار کی حدت سے گھبرائے ہوئے
دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے نہاں ہوگئے
سسکیاں لیتی ہوئی خواب گراں میں کھوگئی
بزم انجم شب کی بیداری سے تھک کر سوگئی
آسماں کی نیلگوں آغوش خالی ہوگئی

کیا ستاروں کا ترحم آفریں انجام ہے
صبح کا آغاز ان کو موت کا پیغام ہے

باقی صدیقی

غزل

گزرا ہے خودی کے جھگڑوں سے اب ہوش کہاں دیوانے کو
کیا جانے یہ سمجھا کیا اس بھیڑ میں گم ہوجانے کو
شمع کی لو ہے ناحق مجرم عشق جسے سب کہتے ہیں
در پردہ اس شعلہ نے مجبور کیا پروانے کو
آہ کروں یا نالے کھینچوں اشک بہیں یا آنکھوں سے
بزم وفا میں سوچ رہا ہوں چھیڑوں کس افسانے کو
کنج قفس کے صدمے سہنا ضبط کی حد میں پھر بھی رہنا
نکہت گل اے طائر بیکس آئی یہ سمجھانے کو
کیا ہے لذت زخم جگر میں اسکے دل سے کوئی پوچھے
سمجھے جو تسکین جگر اے اہل نظر تڑپانے کو
رُخ سے پردہ اُٹھنا کیا پیش نظر تھی برق درخشاں
بہر تسلی جب وہ آئے۔ آئے دل دھڑکانے کو
آنکھ ہوئی ہے مست تمنا جوش بڑھا اس حد تک دل کا
چھلک چھلک کر شیشہ نے لبریز کیا پیمانے کو
ترک مے و مینا ہے عصیاں بادہ کشوں کے مشرب میں
حضرت واعظ آئے ہیں ہم رندوں کو بہکانے کو

جور و جفا کی دنیا میں جو کچھ گزرا ہے دلؔ دل پر
کب تک سننے والوں سے ہم کہتے اس افسانے کو

دل (شاہجہاں پوری)

کی سی ہے تو صحیح تھا۔ اس حالت میں صحیح نہیں

جواب صہبائی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مثلث سے مراد اسکی خاصیت ہے۔ جیسا کہ شیخ نظامی گنجوی نے زہرہ کہکر زہرہ کی آواز مراد لی ہے۔ یا ناقوس سے مراد آواز ناقوس نظامی کا مصرعہ ہے

کہ از زہرہ خوشتر شد آواز او۔ یعنی آواز زہرہ

حزیں کا شعر یہ ہے ؎ سرکا فر شدن دارم کو بتخانہ عشقے۔ کہ ناقوسش بجائے نغمہ یاحیؔ شود مارا
مطلب یہ ہے کہ نغمۂ ناقوس بجائے نغمۂ یاحی ہوجائے۔ یہ سب علم بیان کے رموز ہیں۔

حزیں۔ گر دیدہ زرہ پوست براندام شہیداں مژگاں کسے دشنہ شکارست نہ بیند

اعتراض۔ یہ دشنہ شکار کیا بلا ہے۔

شیخ علی حزیں۔ صف مژگان تو گر سایہ بدریا فگند خار قلاب شود در بدنِ ماہی ما

اعتراض۔ پہلے مصرع میں صف زاید ہے اور اس سے کوئی کام نہیں نکلتا۔ اسی طرح دوسرے مصرع میں (ما) بالکل بیکار ہے۔ کیونکہ مطلب تو صرف اتنا ہے کہ اگر تیرے مژگاں دریا میں سایہ ڈالے تو اسکی کجی کے سبب سے مچھلی کے کانٹوں میں قلاب یعنی کانٹے کی صورت پیدا ہوجائے اس صورت میں (ما) کی کیا ضرورت رہتی ہے۔ بلکہ میرے خیال میں اصل مطلب کو بھی فوت کر رہا ہے

جواب صہبائی۔ ماہی میں اضافت بیانی ہے جس سے مراد خود متکلم کی ذات ہے۔ جیسے بلبل ما عندلیب ما پروانۂ ما۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شعرا اپنے آپ کو مرغ وغیرہ سے تشبیہ دیا ہی کرتے ہیں اور ان کے احکام کو اپنے اوپر منطبق کر لیتے ہیں۔ جیسے کہ اس شعر میں۔

گر زیر گلیمے قفسم راندنی نہی جائے بنہ کہ نالہ بگوش چمن رسد

اس صورت میں جب اپنے آپ کو ماہی کہا گیا۔ تو اپنے رہنے کو دریا تجویز کیا۔ ٹیک چند بہار نے بہار عجم میں لکھا ہے کہ ما کی زیادتی کلام فصحا میں دائر وسائر ہے۔ جیسا کہ بجوں تپیدۂ ما۔ اس شعر میں شیخ نے بھی اس قسم کی زیادتی کی ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر اس شعر میں ما نہ ہو تو بہت اچھا ہے تاکہ ماہی سے وہی ماہی مراد ہو۔ اور شعر میں ایک صریحی مفاد پیدا ہوجائے۔ صف مژگاں ہر چند کہ مناسبت سے خالی نہیں ہے مگر چونکہ مژگاں صورت صف میں ہوتی ہے۔ اور صف مژگاں کثیر الاستعمال ہے۔ اس واسطے اس کے شعر میں ہونے سے ہمارے نزدیک کوئی نقصان عاید نہیں ہوتا ہے اور ایسا کون سا شاعر ہے جسکے کلام میں حشو نہ ہو۔ دیکھئے جلال

اسیر کا یہ شعر دیکھئے۔

حیرت بے خبر آوردہ بہ نظارہ ہجوم　　صف مژگان سیاہ کہ بیا دم آمد

اسی صورت سے نظیری کے اس شعر کو دیکھئے ؎

زاہد خلوت نشیں را دل بہ صد جا می برد　　کس نیابد از فریب آں صف مژگاں خلاص

(مولف) مولانا صہبائی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اگر ماہی سے وہی ماہی اصلی مراد ہو تو بہتر ہے صورت موجودہ میں اس کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ مگر مناسب اور انسب صورت وہی ہے۔ ممکن ہے کہ شیخ علی حزیں کو یہ خیال ان شعروں سے پیدا ہوا ہو جس میں عکس رو کی مناسبت سے خار ماہی کو گل کہا گیا ہے

لاشیدا ؎　گر بصحرا موفشانی دشت پر سنبل شود　　در بدریا رو بشوئی خار ماہی گل شود

ملا کاتبی ؎　گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ　　خار ماہی را رود در قعر دریا پا بہ گل

حسن مروی[1] وملا عبدالقادر بدایونی

حسن مروی۔　خود را با چنانکہ بنودی نمودہ　　افسوس آنچناں کہ نمودی نبودہ

اعتراض۔ اس شعر کا ماخذ یہ رباعی ہے ؎

گوئیم نگر ز اہل وفایم نہ ایم　　واندر صفت صدق وصفا ایم نہ ایم

آراستہ ظاہریم باطن پنہاں　　افسوس کہ آنچہ مینمائیم نہ ایم

(مولف) یہ اعتراض کہ یہ رباعی اس شعر کا ماخذ ہے میرے نزدیک انصاف سے بعید ہے۔ اس واسطے کہ حسن شعر میں معشوق کی بدعہدی کا ذکر کرتا ہے کہ افسوس جیسا تو نے اپنے آپ کو مجھے ظاہر کیا تھا ویسا ثابت نہ ہوا۔ اور رباعی میں اپنی ریاکاری کا اظہار مقصود ہے بلکہ میرے نزدیک ان دونوں رباعیوں میں سے ایک دوسرے سے ماخوذ کہی جائے تو ممکن ہے ؎

شیخے بہ زن فاحشہ گفتا مستی　　کز نیک گسستی و بہ بد پیوستی

---

[1] حسن مروی حضرت شیخ رکن الدین سمنانی کی اولاد میں تھے۔ معقول میں مولانا حسام الدین اور ملا حنفی سے استفادہ کیا تھا۔ وفیات شیخ ابن حجر سے پڑھی تھیں۔ شیخ فیضی آپ ہی کے تربیت یافتہ تھے۔ حسن مروی نہایت زبردست فاضل اور کامل شخص تھے۔ ان کی غزلیں اور رباعیاں نہایت عمدہ ہوتی ہیں۔

زن گفت چنانکہ من تمام ہستم   تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

اسپر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ میرے ایک شاگرد محمد زماں خاں زماں ساکن مئو ائمہ نے کسی جگہ یہ شعر پڑھا۔

انقلابات کا ہر وقت ستم ہوتا ہے   لحظہ جو عمر میں بڑھتا ہے وہ کم ہوتا ہے

ایک صاحب نے اعتراضاً فرمایا کہ تمھارا یہ شعر اور تمھارے استاد کا یہ شعر۔

رفتہ رفتہ یہ زمانے کا ستم ہوتا ہے   ایکدن روز مری عمر سے کم ہوتا ہے

دونوں خواجہ میر درد کے اس شعر سے ماخوذ ہیں۔

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی   گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی

میں نے سنا تو کہا کہ یہ مال خواجہ صاحب کے گھر کا بھی نہیں ہے بلکہ شاکر ناجی کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

بلند آواز سے گھڑیال کہتی ہے کہ اے غافل   گھٹی یہ بھی گھڑی تجھ عمر سے اپنی کہیں جیتا

اور اگر کوئی کہے کہ یہ سلسلہ ناجی ہی پر منتہی ہو جاتا ہے تو یہ بھی سراسر غلط ہے ان کے یہاں یہ شعر اس رباعی کو دیکھکر کہا گیا ہے۔ حکیم زلالی خوانساری

رباعی ؎   گریال کہ نوحہ میکند گاہ گری   دانی غرضش چیست ازیں نوحہ گری

یعنی کہ گری گری شود عمر تو کم   پیمانۂ عمر پر شود تا نگری

دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ قرینہ کس قدر مقتضی ہے کہ اس شعر میں اُس شعر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ورنہ یوں تو شاعری ایک گورکھ دھندا ہے۔ جس شعر کو دیکھئے ویسا ہی ایک شعر اور بھی نظر آجائے گا۔

میر حسن[ل] و نقاد لکھنوی

ل میر حسن دہلوی مصنف سحر البیان کے متعلق کچھ لکھنا غالباً تحصیل حاصل ہے اس لئے کہ مجھے تو لکھنؤ۔ دلی کیا ہندوستان بھر میں کوئی ایسا شاعر نہیں معلوم ہوتا جس نے میر حسن کے کلام کو استخفاف اور استحقار کی نظر سے دیکھا ہو۔ مگر جب کوئی حریف پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اس کی نظر میں اہل ہنر کا ہنر عیب بنجایا کرتا ہے۔ اور تمام خوبیاں برائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہی میر حسن کے کلام کے ساتھ آخر زمانہ میں ہوا یعنی ۱۹۰۵ء میں پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی نے مثنوی گلزار نسیم کو نہایت تصحیح کے ساتھ چھاپا تھا اسی زمانہ میں ریویو کے لئے انھوں نے وہ مثنوی مولانا عبد الحلیم شرر مرحوم کے پاس بھیجی۔ مولانا کو نہ معلوم اس وقت کیا ترنگ آئی کہ زمانہ سازی سے کام نہیں لیا۔ اور مثنوی گلزار نسیم کی تعریف کے ساتھ اس کے عیوب بھی پبلک کے سامنے لے آئے۔ چکبست مرحوم کو یہ بات قدرتاً ناگوار ہونا چاہئے تھی اور ہوئی انھوں نے

اعتراض ۔ میرحسن نے اپنا قصہ اس طرح شروع کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے اولاد نہ ہوتی تھی آخر مایوس ہوکر تارک الدنیا ہونا چاہا ۔ اسے وزیروں نے تسلی دی کہ نجومیوں اور پنڈتوں کو بلاتے ہیں ۔ اس مقام پر بادشاہ اور وزرا کی گفتگو دائرہ تہذیب اور آداب سلطنت سے قطعاً خارج ہے ۔ مثلاً وزرا بادشاہ اور اپنے ولی نعمت سے کہتے ہیں ؎

عجب کیا کہ ہووے تمھارے خلف کرو تم نہ اوقات اپنی تلف

اس قسم کی بے تمیزانہ گفتگو کے بعد نجومی اور پنڈت بلائے گئے اور انھوں نے اپنے اپنے اصول کے موافق بتایا کہ بادشاہ کے اولاد ہوگی اور وہ بہت آسانی سے ہوگی ۔

اسی سال میں یہ تماشا سنو رہا حمل اک زوجۂ شاہ کو

نہیں معلوم اس میں تماشے کی کونسی بات ہے اور یہ کون ایسا عجیب وغریب واقعہ تھا جسے شاعر نے اس شد و مد کیساتھ بیان کیا ہے ۔ نجومیوں نے یہ بھی بتادیا تھا کہ اس مولود یا شاہزادہ کو بارہویں سال میں خطرہ ہے تاہم جس روز بارہواں سال ختم ہونے والا تھا اسی شب کو لوگ شاہزادے کی طرف سے اس قدر غافل ہوگئے کہ پری اُسے اڑا لے گئی ۔

(مولف) جو کچھ اعتراض ہے وہ صرف اس بات پر ہے کہ وزرا نے یہ کیوں صلاح دی کہ عجب کیا جو ہووے تمھارے خلف ۔ کرو تم نہ اوقات اپنی تلف ۔ اس میں میرے نزدیک اگر کوئی بدتمیزی کی بات ہے وہ یہی ہے کہ ان صلاح کاروں نے تم کے لفظ سے بادشاہ کو مخاطب کرکے یہ کہا کہ تم اپنی اوقات ضایع نکرو نقاد صاحب کا مقصد غالباً یہ تھا کہ سب بادشاہ سے یہ کہتے کہ نہیں حضور خدانخواستہ نصیب دشمناں کہیں ایسا خیال نہ فرمائے ۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ نجومیوں کو بلائیے ۔ میرے نزدیک یہ کوئی اعتراض نہیں ہے ۔ اس لئے کہ گو میرحسن نے وہ الفاظ استعمال نہیں کئے جو اُن کو یہاں پر کرنا چاہئے تھے ۔ مگر پھر بھی ایک بات سادگی سے کہنے پر ایک تجربہ کار کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اصل میں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا ۔ یہ اعتراض صرف تعصب پر مبنی ہوگا ۔

یہ اعتراض کہ اسی سال اگر حمل رہگیا تو اس میں تماشے کی کونسی بات تھی ۔ بالکل غلط ہے تعجب اور حیرت مصنف

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹۹) اسکی شکایت منشی سجاد حسین سے کی منشی سجاد حسین نے شرر کے اعتراضات کے جواب دیئے شرر صاحب نے اعتراض کرتے ہوئے کہیں یہ کہدیا تھا کہ آج تک اگر کوئی عمدہ مثنوی لکھی گئی ہے تو وہ بدرمنیر ہے اور باقی سب نقلی ہیں اس بنا پر متعصب لوگوں نے بدرمنیر کی خبر لینا شروع کی اور گلزارنسیم کے طرفداروں میں باقاعدہ یہ کوشش ہونے لگی کہ گلزارنسیم کے اعتراضات اٹھیں یا نہ اٹھیں مگر کم سے کم سحرالبیان کو تحت الثریٰ میں پہونچا دیا جائے اور اس ضمن میں جہاں تک ہوسکے میرحسن کی خبر لی جائے ۔ کچھ لوگوں نے نسیم کو بُرا کہکے جی خوش کیا اور کچھ نے میرحسن مرحوم کو گالیاں دیکر سعادت دارین حاصل کی پھر بھی اس غلط بحث میں بہت سی کام کی باتیں نکل آئیں ۔ نقاد لکھنوی کو میں جانتا ہوں ۔ منشی نوبت رائے ڈیٹر خدنگ نظر اس نام سے اکثر مضمون لکھا کرتے تھے ۔ اور غالباً یہ مضمون بھی انھیں کا ہے جس میں میرحسن پر جی بھر کے اعتراض کئے ہیں ۔ رسالۂ زمانہ ۱۹۰۵ء میں یہ مضمون نکلا تھا ۔

کو اسباب پر ہے کہ اسی سال تو یہ ذکر ہوا۔ اور اتفاق کی بات کہ اُسی سال حل رہ گیا۔
بارہویں سال میں شاہزادہ کو خطرہ بتایا تھا۔ اور وہ وہی دن تھا۔ مگر مصنف کو اسی بنا پر قصے میں ایک غرابت و استعجاب پیدا کرنا تھا۔ اس لئے اگر اس نے یہ کہا تو کیا بُرا کیا۔ یا اگر اسی روز سب کی آنکھ لگ گئی تو کیا ہو گیا۔ اصل یہ ہے کہ یہ سب باتیں نقاد نے سنی سنائی مولانا حالی کے مقدمہ سے دوسری مثنویوں پر تنقیدیں دیکھکر نقل کر دی ہیں۔ ورنہ کیا وہ یہ نہ سمجھتے ہوں گے کہ جو لوگ پہلے اس قسم کے قصے لکھتے تھے غرابت واقعات اور نفس شاعری کے سوا دوسری باتوں پر نظر نہ رکھتے تھے۔

میر حسن۔ عطارد کو آنے لگی اُس کی ریس ہو اسادہ لوحی میں وہ خوشنویس

اعتراض۔ ایک ایسے شاہزادہ کو جو تھوڑی دیر پہلے ذہین طباع ثابت کیا گیا ہے۔ محض خوشنویسی کی رعایت سے سادہ لوح (بیوقوف) کا خطاب دیدیا گیا۔ رعایت لفظی کی اس سے زیادہ بدنما مثال شاید امانت کے یہاں بھی نہ مل سکے گی۔

(مولف) بے شک یہ ایک غلطی ہے۔ مگر نقاد نے یہ نہیں خیال کیا کہ پہلے ہر شاعر کا یہی دستور تھا کہ ابہام کی صنعت پر جان دئے ہوئے تھا اس سے نہ میر کا دیوان خالی ہے اور نہ سودا کا۔ بڑے سے بڑے کامل اس جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔

میر حسن۔ ہوا جبکہ نوخط وہ شیریں رقم بڑھا کر لکھے سات سے نو قلم

اعتراض۔ نوخط سے سبزہ آغاز مراد ہے۔ گر بے نظیر تو اپنی عمر کے بارہویں سال میں مفقود الخبر ہو گیا تھا اس سن میں سبزہ آغاز ہونا کیا۔ خدا رعایت لفظی کا بھلا کرے جس نے شاعر کو خواہ مخواہ غلط بیانی پر مجبور کر دیا۔

(مولف) یہ شعر حقیقتاً مہمل ہے۔ اور رعایت لفظی کا بدترین نمونہ ہے۔

میر حسن۔ لیا ہاتھ جب خامۂ مشکبار لکھا نسخ و ریحان و خط غبار

اعتراض۔ لیا ہاتھ۔ یعنی ہاتھ میں لیا۔ یہ زبان کی ابتدائی خامیوں کا نمونہ ہے

(مولف) یقینی یہ زبان کی ابتدائی خامیوں کا نمونہ ہے۔ مگر بدتر نہیں ہے۔

حفیظ جالندہری اور ادبی نقاد

حفیظ۔ مسلمانوں پہ ہے مردہ دلی چھائی ہوئی ہر سو سکوت مرگ نچھا رہی پھیلائی ہوئی ہر سو

اعتراض - دوسرے مصرع کی نثر یہ ہے سکوت مرگ نے ہر سو چادر پھیلائی ہوئی ہو۔ ترکیب اردو کی نہیں ہے
چادر ہے پھیلائی ہوئی" یہ ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ معنوی حیثیت سے کچھ بھی نہیں -

(مولف) اعتراض بالکل صحیح ہے۔ سکوت مرگ نے چادر پھیلائی ہوئی ہے۔ یہ پنجابی زبان ہے۔ اور لاہور امرتسر وغیرہ کا محاورہ ہے یو پی۔ یا دلی میں یہ نہیں لکھتے۔ مگر کیا کیا جائے اس نقص سے حفیظ تو حفیظ پنجاب کے مشہور و معروف نثار مولوی محمد حسین آزاد بھی نہیں بچ سکے ان کے یہاں بھی آبحیات میں اس قسم کے فقرے جا بجا بے اختیارانہ قلم سے نکل گئے ہیں

حفیظ - فضاؤں پر مسلط لشکر جنات ہے ساقی قیامت خیز طوفاں ہو اندھیری رات ہو ساقی

اعتراض - "فضاؤں" بھی قابل غور ہے لشکر جنات نہیں معلوم کیا چیز ہے کیونکہ جن عربی لفظ ہے یہ خود بھی اسم جمع ہے اس کے علاوہ اس کی جمع اجنہ ہوگی۔ عربی لفظ کے تصرف کا حق اردو داں طبقے کو حاصل نہیں۔ جنات عام لوگ بولتے ضرور ہیں۔ اگر اردو میں اس کا استعمال صحیح بھی سمجھا جائے تو اضافت کیوں

(مولف) معترض کا پہلا اعتراض فضاؤں پر ہے۔ در اصل لفظ فضا بالفتح ہے۔ جو کشادگی اور فراخی زمین کے معنی میں عربی میں مستعمل تھا۔ مگر فی زمانا ـ جو ـ اور آکاس کے معنی میں اردو میں رواج پا گیا ہے۔ لہذا اگر فضا بالفتح بمعنی فراخی زمین اور کشادگی کے استعمال کیا ہے تو باوجود صحت میں تکلف ہونے کے بھی ہم قطعی طور سے اس کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ زمین ایک ہے مگر اس کی فضائیں مختلف مانی جائیں گی۔ یا کم از کم مانی جا سکتی ہیں دوسرا اعتراض لفظ جنات پر ہے۔ معترض کا خیال ہے کہ لفظ جن کی جمع جنات نہیں یہ بالکل صحیح ہے۔ مگر یہ خیال کہ جن کی جمع اجنہ ہے یہ بھی غلط ہے۔ جن اسم جنس ہے جس کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے اور جِنّہ بکسر جیم اس کی جمع ہے۔ جنات اردو میں اس قدر رائج ہو چکا ہے کہ اب اگر اس کو مسند کا درجہ دیا جائے تو غلط نہیں ہے؟
رہا یہ سوال کہ اس میں اضافت کیوں لائی گئی ہے بیشک اضافت غلط ہے۔

حفیظ - اٹھی ہے لعنتی تہذیب نو سیلاب کی صورت ہو جس کے حلقۂ ہر موج میں سیلاب کی صورت

اعتراض - دونوں مصرعوں میں قافیہ واحد ہے۔

(مولف) اس طرح قافیہ مکرر لانا ناجائز ہے۔ اور یہ ایطائے جلی کی بدترین مثال ہے

حفیظ - میں انسانوں کو اس طوفان ذلت سے بچاؤں گا میں ان سوئے ہوئے شیروں کو غفلت سے جگاؤں گا

حفیظ - وہی ضیغم جو تیرہ سو برس پہلے دہاڑے تھے / وہی بچے جو حق نے سینۂ باطل میں گاڑے تھے
" مجھے ان کو جگانا ہے مجھے اُن کو اٹھانا ہے / پرانی گونج سے غوغائے باطل کو مٹانا ہے

اعتراض پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں کہتے ہیں کہ - ع

میں ان سوتے ہوئے شیروں کو غفلت سے جگاؤں گا

اور دوسرے مصرع میں ان شیروں کی تعریف کرکے پھر کہتے ہیں ع مجھے ان کو جگانا ہے - اب ان شعروں میں قابل غور پہلو یہ ہے کہ یہ نظم مسلسل ہے جسکے لئے ایک نہایت ضروری امر یہ ہے کہ الفاظ و مطالب کی تکرار نہ ہونے پائے اور یہ ایک اعلیٰ نظم کے لئے عیب ہے - یعنی شاعر ہر مصرع میں ندرت پیدا نہیں کرسکتا عاجز ہے - کہ بار بار بیان کردہ مطالب کو دہرا کر شعر موزوں کرے - اس پہلو کو اگر نظر انداز کردیا جائے اور یہ کہا جائے کہ پہلے شعر کا ربط نیچے کے شعر سے ہے اور وہاں ایسا کرنا ضروری تھا - یعنی یہ کہا گیا ہے کہ - میں ان سوتے ہوئے شیروں کو غفلت سے جگاؤں گا - جو تیرہ سو برس پہلے دہاڑے تھے - تو پھر یہ دوسرا مصرع کارآمد نہیں - وہی بچے جو حق نے سینۂ باطل میں گاڑے تھے - "میں" "وہی بچے" "کیا ہیں وہی ضیغم" تو گویا ضیغم مجسم بچے بنکر سینۂ باطل میں گڑے - کیونکہ دونوں مصرعوں کی ترتیب (وہی ضیغم الخ) اور اوپر کے شعر کے ربط سے یہی مطلب ہوتا ہے - اب جگانے کے بعد تیسرا شعر اسی مطلب کی تکرار کرتا ہے - کہ جوان کو جگاتا ہے مجھے اُن کو اٹھانا ہے -

پہلا مصرع میں اُن سوئے ہوئے شیروں کی غیرت کو جگاؤں گا) اگر ہوا اور اس کا مفہوم بدل جائے تو باقی دونوں شعر مربوط ہو کر بہتر مفہوم نکلتا ہے -

(مولف) اگرچہ معترض کا اعتراض ایسی جگہ پر اس حیثیت سے قطعاً درست ہے کہ مسلسل نظم میں اداکردہ مطالب کو باربار دہرانا مستحسن نہیں ہے - مگر ہندوستان کی ہر مثنوی اور نظم کی کتاب میں سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ایسے ایسے سقم نکل آئیں گے -

---

حفیظ - دہانِ خامہ میں ٹپکا وہ بادہ اپنے ساغر سے / کہ جس کا قطرہ قطرہ تازیانے کی طرح برسے

اعتراض - دہانِ خامہ کی ترکیب بھی جدید اور نادر ہے - دوسرے مصرع کی ساخت انوکھی سی ہے - قطرے قطرے کا تازیانے کی طرح برسنا نرالی بات ہے - دونوں مصرعے ملکر جو مطلب نکلتا ہے وہ شاعرانہ اعتبار اور مخصوص جدت کے لحاظ سے چاہے قابل توصیف ہو لیکن حقیقت میں نہ اعلیٰ ہے نہ شاندار بلکہ غیر مناسب -

(مولف) دہانِ خامہ یقیناً ایک نئی ترکیب ہے جو کم از کم میری نظر سے کہیں نہیں گزری ہے - قطرہ قطرہ کا برسنا تازیانہ کے ساتھ مشابہ نہیں ہوسکتا اس میں وجہ شبہ صرف ایک یہی محاورہ ہے - کہ کوڑے برستے ہیں - اور قطرے بھی برستے ہیں

مگر یہ بھی ایک بھونڈی تشبیہ ہے جو مقبول طبع نہیں ہو سکتی۔

حیرتی و خان آرزو

حیرتی کے وطن کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے چنانچہ مولانا آزاد بلگرامی اپنے تذکرۂ خزانہ عامرہ میں لکھتے ہیں کہ مصنف تذکرۂ ہفت اقلیم نے حیرتی کو تون کا رہنے والا کہا ہے۔ اور خان آرزو کا بیان ہے کہ وہ ماوراءالنہر کا رہنے والا تھا۔ علاوہ ان کے بعض دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی تون ہی کا رہنے والا لکھا ہے۔ تذکروں میں ایک حیرتی کاشانی کا بھی ذکر پایا جاتا ہے جن کے متعلق صاف صاف یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ آیا وہ حیرتی اور یہ حیرتی ایک ہی ہیں۔ یا دونوں جدا جدا ہیں۔ مولانا غلام علی آزاد اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ دونوں جدا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ہستی ہے جس میں اختلاف پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل میں تون میں پیدا ہوا اور پھر کاشان میں توطن اختیار کیا۔ تقی اوحدی کا خیال ہے کہ وہ ماوراءالنہری تھا۔ اور غالباً اسی سے خان آرزو نے نقل کیا ہے بہرحال حیرتی ایک نہایت خوشگو اور عمدہ شاعر تھا پہلے اپنے وطن سے رخصت ہو کر عراق میں آیا۔ اور یہاں اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی یہیں اس نے یہ شعر کہا تھا ؎

ازحد امروز زاہد منع ما از بادہ کرد　　ورنہ کے آں نامسلماں رہ غم فردائے ماست

دوست دشمن تو ہر جگہ ہی لگے رہتے ہیں حاسدوں کو موقع مل گیا۔ اور انھوں نے یہ شعر شاہ طہماسپ صفوی کو پیش کر کے کان بھر دیے۔ حکم دیا کہ حیرتی کو پکڑ لاؤ۔ اس غریب کو جب خبر ہوئی فوراً عراق سے بھاگ کر گیلان چلا گیا۔ کچھ دن تک وہیں مقیم رہا۔ یہیں ایک قصیدہ منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں کہا جس کا مطلع یہ ہے۔

بہ ہیچ خانہ رہم نیست اے شہ دوسرا　　توئی چو شاہ ولایت ولایتے بہ نما

بادشاہ نے خطا معاف کر دی اور کچھ انعام و اکرام بھی دیا۔

خان آرزو اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ حیرتی کے اس شعر میں بعض لوگوں نے تصرف کر کے مجھے سنایا ؎

ہمچو پروانہ بہ شمعے سروکارست مرا　　کہ اگر پیش روم بال و پرم می سوزد

لوگوں نے مصرع ثانی کو یوں بدل دیا ہے ؎

میروم پیش اگر بال و پرم می سوزد

اس پر لوگوں کا اعتراض یہ تھا کہ شاعر جو یہ کہتا ہے کہ مجھے پروانہ کی طرح ایک ایسی شمع سے سروکار ہے کہ اگر میں آگے جاتا ہوں تو میرے بال و پر جلا دیتی ہے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے آخر شاعر کی مفروضہ شمع میں کونسی خصوصیت

ہوئی۔ یہ تو ہر شمع کا خاصہ ہے کہ اگر پروانہ اس کے سامنے جائے گا تو بال و پر جل جائیں گے۔
مولانا آزاد کہتے ہیں کہ اصل میں شعر پر اصلاح دینے والے نے اسی اعتراض کو دفع کیا ہے۔ جو دوسرے مصرع میں کان صفتی واقع ہونے سے پیدا ہوتا تھا۔

خان آرزو کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ شعر سعدی کے اس شعر سے مستفاد ہے ؎

اگر یک سر موئے برتر پرم　　　فروغ تجلی بسوزد پرم

مولانا آزاد نے جواب دیا ہے کہ سعدی کے شعر میں تشبیہ بہ شمع نہیں ہے اور اس شعر میں تشبیہ موجود ہے لہٰذا اعتراض دفع ہوتا ہے۔

(مولف) خان آرزو کا اعتراض اصل شعر پر درست ہو سکتا ہے۔ مگر اصلاحی شعر پر یہ اعتراض نہیں پڑتا اس لئے کہ معنے بالکل جدا ہو گئے ہیں۔ اور مولانا آزاد کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ اعتراض اصلاح کے بعد دفع ہو گیا کیونکہ پہلے یہ معنے تھے کہ اگر میں اس شمع کے سامنے جاتا ہوں، یا میں آگے بڑھتا ہوں تو میرے بال و پر جلے جاتے ہیں۔ لیکن اصلاح کے بعد شعر کے معنے یہ ہو گئے کہ مجھے ایسی شمع سے سروکار ہے کہ اگر وہ میرے بال و پر جلا دیتی ہے تو اور بھی میں آگے بڑھتا ہوں

خاکسار[۱] و میر تقی میر

خاکسار۔　خاکسار اسکی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو　　　مجھکو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

اعتراض میر۔ اہل فن جانتے ہیں کہ اس شعر میں بیمار کیا کے بجائے گرفتار کیا کہنا چاہئے تھا۔

جواب میر حسن۔ میر تقی کا یہ اعتراض کہ اگر بجائے بیمار کیا کے گرفتار کیا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ قابل قبول نہیں ہے شاعر اگر اپنی آنکھوں کے لئے کہتا تو یقینی گرفتار کیا مناسب تھا۔ مگر چونکہ یہاں معشوق کی آنکھوں کی طرف اشارہ ہے

---

[۱] اصل نام معلوم نہیں۔ مگر کلو عرف تھا۔ درگاہ قدم شریف دلی میں رہتے تھے۔ ریختہ کے ایک ممتاز شاعر تھے۔ مگر ذرا مغرور اور خوددار تھے۔ اپنے آپ کو سید الشعراء لکھتے تھے یہاں تک کہ اپنے زمانہ کی مشہور معروف شاعر استاد الکل میر تقی میر کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ میر تقی کو بھی ان سے کچھ دلی بغض و عناد اور مخاصمت معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اپنے تذکرۂ نکات الشعراء میں انھوں نے اُن کی خوب خبر لی ہے۔ انھوں نے بھی میر صاحب کی ضد پر ایک تذکرہ لکھا تھا جسے اپنے دوست محمد معشوق کنبوہ کے نام سے موسوم کیا تھا۔ اب وہ تذکرہ نایاب ہے۔

اس واسطے بیمار ہی صحیح اور مناسب ہے۔

(مولف) میرحسن کا جواب ایک حد تک صحیح ہے کیونکہ آنکھوں کو اکثر شعراء نے اپنی گرفتاری کا سبب قرار دیا ہے۔ مگر میرے نزدیک خاکسار کے اس جملہ نے کہ مجھکو ان خانہ خرابوں۔ الخ میر صاحب کو مغالطہ میں ڈالا ہے اس واسطے کہ خانہ خراب معشوقوں کی آنکھ کے لئے نہیں لکھا جاتا۔ ہاں اگر خانہ خراب اس لحاظ سے لکھا ہو کہ چشم معشوق عاشقوں کا گھر تباہ و برباد کرتی ہیں تو دوسری بات ہے مگر اس کے لئے سند کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اردو کی شاعری میں خانہ خراب اُس کے لئے لکھا جاتا ہے جس کا گھر برباد ہوگیا ہو۔ اور یہاں معشوق کی آنکھوں کے لئے لکھا گیا ہے۔

خواجوئے[1] کرمانی و آزاد بلگرامی

خواجو - خطے کہ مردم چشم نوشتہ است چو آب   محقق است کہ از ابن مقلہ ثانی است

اعتراض مولانا آزاد - پہلا مصرع میرے نزدیک اگر یوں ہوتا تو بہت اچھا تھا ؎

سرشک من کہ بلوح زمیں نوشت خطوط

(مولف) خواجو کے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ میرے مردم چشم نے جو خط پانی کی طرح روشن لکھا ہے اس کو دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ مردم چشم، ابن مقلہ ثانی ہے۔ ابن مقلہ ایک زبردست خوشنویس تھا۔ مولانا نے بہ لحاظ مناسبت

---

[1] خواجو کرمان کا رہنے والا تھا۔ اگرچہ خود بہت بڑا عالم و فاضل نہ تھا۔ مگر بہت سے علماء اور کاملین کی صحبت کا شرف اس کو نصیب ہوا۔ شیخ علاء الدولہ سمنانی کا مرید تھا۔ عرصہ تک بمقام صوفی آباد معتکف رہا شاہ محمد مظفر کے مداحین میں تھا مگر کچھ امور خلاف طبیعت دیکھ کر شاہ ابو اسحٰق والی شیراز کے دربار کے متوسلین میں داخل ہوگیا۔ اور اسی دربار میں انتقال ہوا۔ چنانچہ مورخین نے اس کے انتقال کے متعلق لکھا ہے کہ خواجو نے بادشاہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ بادشاہ نے خوش ہوکر انعام میں اشرفیوں کا بھرا ہوا ایک طبق پیش کیا خواجو نے جیسے ہی طبق دیکھا فوراً خوشی سے مرگیا۔ یہ واقعہ ۷۵۳ھ سات سو ترپن ہجری میں واقع ہوا۔

بہ لحاظ شاعری کے خواجو نہایت مشہور و معروف شخص تھا۔ خواجہ حافظ نے اُن کے کلام سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے اور اکثر غزلیات ایسی اُن کی دیوان میں موجود ہیں جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ خواجو کے کلام سے کافی استفادہ کیا گیا ہے اگرچہ مولانا آزاد بلگرامی کو خواجو کا کلام لطیف نہیں معلوم ہوا۔ پھر بھی اس کی مثنوی ہماد ہمایوں کے متعلق بہت اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اور خواجو کے ایک شعر پر اعتراض بھی کیا۔ اعتراض کی نوعیت کا اظہار نہیں کیا۔ مگر اصلاح دی ہے۔

شعر کو شعر کو بلند کرتا ہے مگر مردم چشم کا جواب نہیں مردم کا ابن مقلہ ثانی کہنا جو لطف پیدا کر رہا ہے وہ اس تمام تکلفات سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں مصرع کچھ زیادہ بلند اور دلچسپ نہیں لگ سکا۔

مرزا دبیرؒ و معترضین

مرزا دبیر۔ داد خواہم یا غیاث المستغیثین الغیاث — از کہ دل مانوس گردد بے سخنور بے انیس

اعتراض۔ مصرع ثانی میں بائے مصاحبت کی جگہ از کا استعمال لائق اعتراض ہے۔ مطلب یہ کہ مصرع ثانی یوں ہونا چاہئے تھا۔ با کہ دل مانوس گردد بے سخنور بے انیس۔

جواب۔ معترض نے کوئی سند اعتراض کی پیش نہیں کی علاوہ اس کے معترض کو وہ شعر مشہور یاد کرنا چاہئے جس کا ایک مصرع یہ ہے :۔

اگر قحطے پدید آید از ایشاں انس کم گیری

تیسرے یہ کہ مصنف کو اپنا افسوس اُس انس کے فوت ہونے پر ظاہر کرنا منظور تھا۔ جو بسبب ممدوح کے کمالات کے حاصل اور ممکن تھا۔ نہ اس انس کی نسبت جو بہ معیت اور مصاحبت حاصل ہو سکتا تھا۔ بس یہ موقع خاص استعمال از کا تھا نہ بائے مصاحبت کا کتب معتبرہ فن ملاحظہ ہوں (جو یہ تھے) انس جو ضد وحشت ہے اس کی حقیقت و نوعیت ایک راحت اور آرام کا پانا ہے۔ تو نظر معنی فہمی منصفانہ تصدیق کر سکتی ہے کہ آرام کسی دوست کو جو بوجہ انس دلی حاصل ہو سکتا ہے وہ غائب و حاضر دونوں طرح بسبب وجود دوست اور اس کے کمال حلاوت کے ہوتا ہے اور یہ امر معیت

---

۵۱ مرزا سلامت علی صاحب دبیر لکھنؤ کے ان نامی گرامی شعرا میں سے ہیں جن کی ذات والاصفات سے بجا طور پر اہل لکھنؤ کو ناز ہے۔ آپ کا اصلی وطن دلی تھا مگر سن شعور سے لکھنؤ ہی میں قیام رہا۔ اور مرثیہ گوئی کی مشق فرماتے رہے۔ لوگوں نے آپ کو اور میر انیس کو مد مقابل بنایا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں مختلف رنگ طبیعت کے مالک تھے۔ آپ کے تقابل میں جس قدر بدمذاقی کا ثبوت نقادوں نے دیا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ آپ کے کلام پر مختلف لوگوں نے اعتراضات کئے منجملہ ان کے مولوی عبدالغفور نساخ۔ مولانا شبلی وغیرہ کے اعتراضات بہت زیادہ ہیں۔ جنکا آگے چلکر ذکر کیا جائے گا سردست دبیر کے ایک قطعے کی بابت وہ اعتراضات سنائے ہیں جو مرزا صاحب نے میر انیس مرحوم کے انتقال کی تاریخ میں کہا تھا۔ سنا گیا ہے کہ یہ قطعہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے بہت زیادہ مشہور ہے۔ اسپر ۹ و ۲۳ فروری ۱۸۷۵ء کے اودھ اخبار لکھنؤ میں کسی غیر معلوم شخص نے اعتراضات کئے جنکے جوابات مولوی سید حسن علی صاحب شمس وکیل عدالت صدر اودھ نے دئے۔ اور جواب میں ایک رسالہ موسوم بہ جلوۂ نیرنگ شایع کیا

اور مصاحبت ہی پر منحصر نہیں ہوتا ہے پس دراصل یہ موقع حقیقی آز کا ہے جو اظہار سبب کے واسطے ہے گو بائے مصاحبت بھی لائق استعمال ہو سکے۔ (پانچویں) اگر موقع بائے مصاحبت ہی کا ہو تو یہاں جیسا کہ بعض احباب نے خیال کیا ہے از بہ معنی مع ہوگا جیسا غیاث اللغات میں ذکر کر کے یہ مصرع اس کی مثال میں لکھا ہے ؎

دل بستگی از سنبل گلپوشش تو دارد

(چھٹے) بالفرض اگر یہ حقیقی مورد استعمال بائے مصاحبت کا بھی تسلیم کر لیا جائے گا تو اس صورت میں بھی اس جگہ استعمال از کا اس قاعدہ کے بموجب صحیح ہوگا جس میں مقرر ہوا ہے کہ خاص خاص مواقع پر کسی مطلب خاص کی غرض سے استعمال از کا بجائے بائے مصاحبت کے ضرور جائز ہے۔ اور یہ غرض اس جگہ پر ظاہر ہے کہ مصنف کو افسوس اپنا اُس عام اُنس کے فوت پر ظاہر کرنا منظور تھا۔ جو بہ سبب معیت و مصاحبت و بلا مصاحبت و معیت متصور تھا نہ ایسے انس خاص کے فوت پر جو بہ معیت حاصل ہو سکتا تھا۔ (ساتویں) اگر بائے مصاحبت مستعمل ہوتی تو صرف ایک خاص انس کے فوت پر تاسف اس سے مراد ہو سکتا تھا اور برخلاف اس کے آز کے استعمال سے معنی نہایت بلند و عالی ہو گئے۔ اور اسکا پایۂ بلاغت نہایت ترقی پا گیا ہے جب عام انس مذکور پر تاسف مصنف کا اس سے مفہوم ہو رہا ہے (آٹھویں) ایک بڑا فائدہ مشحون بلاغت اس استعمال از میں یہ ہے کہ اس سے اس امر واقع پر بھی ایما ہو گیا ہے کہ انس مصنف کا بمعیت و مصاحبت ممدوح نہیں تھا۔ بلکہ بسبب محبت قلبی اور بذریعۂ تحصیل لذت کلام ممدوح کے اور اس طرح کے دوسرے اسباب سے تھا۔

(مولف) میرے خیال میں وکیل صاحب نے صرف قانونی جرحیں کی ہیں ورنہ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ محل استعمال آز کا نہیں ہے بلکہ یہاں بائے مصاحبت ہی کی ضرورت ہے۔ اول تو زبان فارسی کا محاورہ یہی ہے کہ جہاں کسی غیر طرح کو اپنا مصاحب قرار دیتے ہیں وہاں ضروری طور پر بائے مصاحبت لاتے ہیں۔ جیسے کہ اس شعر میں

نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم　　حدیث دل بکہ گویم عجب غمے دارم

یہاں از کہ گویم کہنا سراسر منافی مصاحبت ہے، رہے جوابات وہ بھی مستحکم نہیں ہیں۔ چنانچہ پہلا جواب کہ کوئی سند نہیں نقل کی بالکل خلاف آداب مناظرہ ہے اس لئے کہ معترض پر بار ثبوت نہیں ہوتا۔ بلکہ مدعی پر ہوتا ہے پہلے مجیب کو ثابت کرنا چاہئے تھا پھر وہ اُن دلائل کی تردید کرتے۔ دوسرا جواب بھی غلط ہے۔ مصرع اصل یہ ہے۔ اگر قحط الرجال افتد از یں سہ انس کم گیری۔ اول افغان دوم کمبو سوم بذات کشمیری تیسرا جواب اسواسطے قابل قبول نہیں کہ مصرع کے معنے یہاں یہ ہیں۔ کہ ایخدا فریاد ہے جب کوئی شاعر کوئی دوست نہیں رہا تو دل کس سے مانوس ہو۔ لہذا مفہوم یہ نکلا کہ اس کا انس کس ذات کے ساتھ وابستہ ہو پھر جب ذات کا ذکر آگیا تو انس کے فوت ہونے کا غم کیسا۔ چوتھا جواب بھی ایک زبردستی کا جواب ہے اس لئے کہ مصرع میں جب

سخنور، اور انیس کی ذات کا ذکر کر دیا تو پھر یہ کہنے کی کہاں گنجائش رہی جو کچھ کہا گیا ہے (دیکھئے اعتراض ع۲) اور لطف یہ کہ یہاں مجیب کو خود شبہ ہے کہ گو بآے مصاحبت بھی مجازاً استعمال ہو سکے۔ پانچواں یہ جواب کہ غیاث میں لکھا ہے کہ خاص خاص موقعوں پر از کا استعمال بجائے با کے جائز ہے اول تو اس کو کوئی خاص موقع نہیں کہہ سکتے۔ دوسرے غیاث اللغات میں کم از کم با کے بیان میں تو یہ نہیں ہے۔ خدا معلوم وکیل صاحب نے کس غیاث میں دیکھا ہے (چھٹا جواب) کہ اگر یوں ہوتا تو صرف ایک فائدہ تھا اور یوں ہوا تو بہت سے فائدے ہیں۔ اول تو جو فوائد بیاں کئے ہیں وہ صرف دفع الوقتی کے لئے ہیں۔ اور اگر ایسا ہو بھی تو بہت سے فوائد کے لئے قواعد کو نہیں توڑا جا سکتا۔ ساتویں شعر میں بھی وہی قواعد کے بھینٹ چڑھانے کے لئے کہا گیا ہے۔ علی ہذا آٹھواں جواب ہمارے نزدیک بائے مصاحبت کی ضرورت ہے اور اعتراض صحیح ہے

مرزا دبیر — دادر لغا عینی و دینی دو باز و یم شکست — بے نظیر اول شدم اسال آخر بے انیس

اعتراض — اول کے مقابل میں آخر بکسر خائے معجمہ ہے اور یہی فارسی میں مستعمل ہے اور اس صورت میں اختلاف توجیہ یعنی حرکت ماقبل روی جسکو اتو کہتے ہیں اور جو عیب قبیح قافیہ کا ہے لازم آئیگا۔ اور اگر بہ فتح خا بمعنی دیگر ہو تو معنے یہ ہوں گے بے نظیر اول ہوا میں اسال، اور بے انیس اور اس کی رکاکت وسخافت ظاہر ہے۔

جواب — یہاں لفظ آخر بہ فتح خا ہے پس اختلاف توجیہ جو ایک توجیہ غیر وجیہ کی بنا پر لازم آیا تھا وہ دفع ہو جائیگا۔ اور قافیہ صحیح ہو جائیگا۔ دوسرے یہ قول معترض کا بھی کہ لفظ آخر بکسر خائے فارسی میں مستعمل ہے جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے آخر بہ فتح خا فارسی میں مستعمل نہیں ہوا ہے صحیح نہیں ہے۔ اگر معترض اس کا مدعی ہوتا ہے تو اسکو ثابت کرنا چاہئے پس استعمال آخر بفتح خا کا لائق اعتراض نہیں ہو سکتا۔ تیسرے اگر آخر کا غیر مستعمل ہونا تسلیم بھی کر لیا جائے تاہم جب اصل لغت عربی کے رو سے وہ صحیح لفظ ہے تو اسی طرح فارسی میں صحیح الاستعمال ہو گا جس طرح ہر لغت عربی لائق استعمال زبان فارسی ہے (چوتھے) معترض کا یہ قول کہ آخر بالکسر بمقابلہ اول کے ہے جس سے ان کی مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ آخر بالفتح مقابل لفظ اول کے نہیں ہے اس وجہ سے صحیح نہیں ہے کہ بحسب وضع آخر بفتح خا جو بر وزن افعل اسم افعل التفضیل یا صفت مشبہ مثل لفظ اول کے ہے اور جس کا مونث آخری اور جمع آخرون اسی طرح آتی ہے جس طرح مونث اول کا اولی ہے اور جمع اس کی اولون ہے بہ نسبت آخر بکسر خا کے جو اسم فاعل ہے اور جس کا مونث آخرہ ہے زیادہ تر مقابلہ اول سے رکھتا ہے اور جب اول کے معنے پہلے کے اور آخر بفتح خا کے معنے دیگر یعنی دوسرے کے ہیں تو باعتبار معنی کے بھی آخر بفتح خا کو اسی طرح کا مقابلہ اول سے ہے جیسے پہلے اور دوسرے میں مقابلہ ہے (پانچویں) معترض نے کلام اہل لغت پر غور نہیں کیا ہے منتہی الادب میں آخر بالکسر ضد اول اور قاموس میں آخر بالکسر

مقابل اول لکھا ہے اس سے مطلب یہ ہے کہ اول سے مراد وہ شے یا وہ زمانہ ہوتا ہے جو ابتدا میں ہوا اور آخر بالکسر سے مراد وہ شے یا وہ زمانہ ہوتا ہے جو انتہا میں ہوتا ہے پس دونوں لفظوں کے معنی میں غایت بعد اور ایک قسم کا مقابلہ ہے مگر اس سے نہیں ۔۔ ہے کہ سوائے لفظ آخر بالکسر کے کوئی اور لفظ کسی طرح مقابلہ میں اول کے استعمالاً یا معنیً نہیں ہو کیونکہ علم لغت میں تقابل معنی با الفاظ کی بحث بہت کم۔ ممکن ہے اور علاوہ اس کے اگر یہی معنی اُن کتب کی عبارت کے ہوں تو ان کا کلام صریح غلط ہو جائے گا۔ جب یہ معلوم ہے کہ علی العموم لفظ آخر بالفتح بمقابلہ لفظ اول کے مستعمل ہو اور معنی کا تقابل تو حسب بیان بالا ظاہر ہو چکا ہے اور علاوہ ازیں اور بہت سے الفاظ ہیں جو باعتبار معنی اور استعمال کے مقابل لفظ اول کے ہیں۔ مثلاً اول وثانی نہایت کثیر الاستعمال ہے۔ (چھٹے) اس صورت میں جب لفظ آخر بفتح خا تسلیم کیا جائے نہایت صحیح اور درست ہیں کیونکہ معترض کو انکار نہیں ہے کہ آخر بالفتح بمعنی دیگر ہے تو اس کے معنے ہندی میں دوسرے کے ہوں گے۔ اور جس طرح دیگر کے معنے کبھی دوسری شے یا دوسرے واقعے یا دوسرے زمانے کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح آخر کے معنی یہاں دوسری شے یا دوسرے واقعے یا دوسرے زمانہ کے ہوں گے جیسا کہ ان فقرات میں اول زید شاعر است دیگر عمر اور اول فتح نمایاں نصیب ما شد۔ دیگر غنیمت بسیار یافتم اور دوسرے زمانہ کے معنے کی مثال یہ اشعار ہیں ؎

از انفعال لعل لبت لالہ در چمن — دیگر بدست خویش نگیرد پیالہ را
روے تو بینا و دگر دیدہ سعیدی — گر دیدہ بکس باز کند روی تو دیدہ

(ساتویں) معترض نے جو معنے لکھے ہیں وہ غلط ہیں معنے اس مصرع کے اس صورت میں یہ ہوں گے۔ کہ امسال اول واقعۂ فراق نظیر اور دوسرے حادثۂ فراق انیس مصنف کو نصیب ہوا یا یہ معنی ہوں گے کہ امسال اول بار فراق نظیر اور دوسری بار فراق انیس میں مصنف مبتلا ہوئے اور یہ معنے ہر نوع صحیح ہیں (آٹھویں) معترض کے ترجمے میں غلطیاں اس وجہ سے ہیں کہ اس نے دیگر کو بمعنی "اور" کے تو لینے میں غلطی نہیں کی تھی۔ مگر لفظ "اور" ایک تو معنی وصفی رکھتی ہے جو بمعنی دوسرے کے ہے اور دوسرے بمعنی واؤ عطف کے اور اس وجہ سے لفظ "اور" بمعنی دوسرے کے زیادہ تر صریح الدلالۃ نہیں ہے پس ایسے لفظ غیر صریح الدلالۃ کو استعمال کر کے اور اس میں یہ غلطی صریح کر کے کہ لفظ "اور" جو معنی میں دوسرے کے ہے اس کے قبل جب لفظ اول مذکور ہو کلمہ عطف جو لانا ضرور تھا ترک کر دیا اور جن لفظوں کے معنی کو مقدم و موخر کر دینا بغرض خوش اسلوبی ترجمہ ضرور تھا اس کا بھی خیال نہ کیا اور اس وجہ سے معنے غلط اور بے ربط ہو گئے۔ مگر یہ معترض کی خوبیاں ہیں نہ بیچارے مصرع کا قصور ہے (نویں) معنی کی صحت کی بحث تو تمام ہو گئی۔ اب اس کے لطف بلاغت اور شاعری کی خوبی بھی قابل ملاحظہ ہے۔ اس واسطے کہ مصنف نے ہر مصرع میں اس شعر کے دو مختلف غموں کے حال کو نظم کیا ہے جس میں سے ایک اپنے برادر علی مرزا نظیر مرحوم کے واقعے کا جانگزا حال ہے اور دوسرا سانحہ ہوشربائے وفات میر انیس صاحب مرحوم ہے اور اس میں

لف ونشر مرتب کی رعایت بھی موجود ہے۔ اور اس میں لفظ نظیر اس خوبی سے مستعمل ہوا ہے کہ جس سے اس امر کا بھی ایہام ہوتا ہے کہ شاید مصنف کو اپنے ایک مماثل ونظیر میر انیس صاحب مرحوم کی فوت ہی کا ذکر مد نظر ہے اور یہ ایک بڑی عمدہ صنعت متصور رہے۔

(مولف) فاضل مجیب نے نو صورتیں جواب کی قائم کی ہیں مگر افسوس ہے کہ قابل وثوق ایک بھی نہیں ہے پہلا جواب اس وجہ سے کہ جب لفظ آخر بفتح کو معترض اس جگہ پر صحیح نہیں مانتا تو اختلاف توجیہ کا عیب کیونکر دفع ہوگا۔ (دوسرے) اس میں پھر وہی منکر سے ثبوت چاہا ہے اور یہ غلط ہے جیسا کہ بیان ہو چکا (تیسرا) اگر عربی میں ایک لفظ صحیح ہے تو فارسی میں اس کا استعمال اسی جگہ ہوگا جہاں کہ وہ استعمال ہو سکتا ہے نہ یہ کہ ہر عربی کے لفظ کو موقع اور بے موقع صرف کر دیا جائے (چوتھے یہ جواب) کہ آخر بفتح خا زیادہ تر قابل استعمال اور زیادہ تر اول کا مقابل ہے اس واسطے غلط ہے کہ آخر بفتح خا اول کا مقابل نہیں ہے بلکہ مماثل ہے یعنی جیسا ایک۔ ایسا ہی دوسرا۔ ایسا ہی تیسرا۔ مقابل بکسر خا صحیح ہوگا۔ یہاں آخر کے معنے باز کے لئے گئے ہیں اور یہ غلط ہیں۔ پانچواں جواب اس واسطے غلط ہے کہ منتہی الارب قاموس کا ترجمہ ہے اور جب اصل میں آخر بکسر کو اول کا مقابل لکھا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اصل کو چھوڑ کر ترجمہ کو مستند مانا جائے۔ آخر بفتح خا مقابل میں نہیں آتا بلکہ تعداد اور مماثل کی صورت میں آتا ہے۔ چھٹے جواب میں آخر بفتح کے معنے جو دوسرے واقعہ یا دوسری شے کے بتائے ہیں اس کے لئے سند کی ضرورت تھی جس سے مجیب نے احتراز کیا۔ بلکہ فارسی کی ایک مثال پیش کی اول شاعر زید و دیگر عمر۔ کیا اس کو اگر یوں کہیں کہ اول شاعر زید و آخر بفتح عمر ست یہ جائز اور صحیح ہوگا۔ ہرگز نہیں جو شعر محمود نامہ کا پیش کیا ہے کہ ۔ دیگر بدست خویش الخ ۔ وہاں بھی دوبارہ اور باز کے معنی میں دیگر لایا گیا ہے۔ جیسا کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ ساتویں جواب میں زبردستی معنے پہنانے کی کوشش کی ہے معنی وہی نکلتے ہیں جو معترض نے لکھے ہیں۔ اسی طرح آٹھویں اور نویں جواب کی قباحتیں غور کرنے پر ظاہر ہیں جنھیں تطویل لاطایل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

مرزا دبیر۔ یادگار رفتگاں ہستیم و مہمان جہاں ‏ چند روزہ، چند ہفتہ بے برادر بے انیس

اعتراض۔ چند روزہ کی یا تعین مقدار کے لئے اور چند ہفتہ کی یا نسبت کے لئے ہے تو اول لفظ صفت اور دوسرے لفظ ظرف ہے اور معطوف و معطوف علیہ میں یہ اختلاف درست نہیں ہے۔ بلکہ دونوں کو ایک حالت اور حکم میں ہونا چاہیئے۔ اور اگر عطف نہ لیا جائے تو معنی درست نہوں گے۔ اور اعلان و اشباع حرکت ماقبل ہائے مختفی کا بھی غیر فصیح ہے

جواب - پہلا جواب یہ ہے کہ ہائے مختفی دونوں جگہ نسبت کی یا دونوں جگہ تعیین مقدار کی تسلیم ہوسکتی ہے پس کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ درحقیقت ہائی تعیین مقدار میں بھی وہی ہائی نسبت ہے۔ گو لڑکوں کی تعلیم کے لئے اسی طرح ہائے تعیین مقدار چند ہفت پر لانے سے وہی چند ہفتہ کی لفظ بن جائیگی۔ پس معطوف ومعطوف علیہ فرض کرنے پر بھی اعتراض وارد نہیں ہوتا؟ دوسرے اس ترکیب میں چند روزہ چند ہفتہ صفت بد صفت اس طرح واقعہ ہے جیسے اس شعر بدر چاچ میں ویسی ترکیب موجود ہے ؎

بو المجاہد ظل حق، سلطان محمد کز جلال دو دھمع بزم او شمع رواق خضر ست

پس باوجود عدم ذکر عاطف کے معطوف ومعطوف علیہ فرض کرنا ضرور نہیں ہے (تیسرے) اگر ترکیب صفت اور ظرف کی تسلیم ہو تو ہائے مختفی کا اختلاف بھی کچھ مُضر نہو گا۔ اور معنی درست ہوں گے یعنی مہمان چند روزہ۔ چند ہفتہ کے واسطے۔ چوتھے اعلان اور اشباع حرکت ماقبل ہائے مختفی کا فصحا کے کلام میں اور علی الخصوص نظم میں بکثرت موجود ہے۔

مولانا روم - کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

" - سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق تا بگویم شرح درد اشتیاق

نظامی - میگیزد فتنہ میفرورکیں خرابی میا در بہ ایراں زمیں

" زدہ بر سر چتر پر چشم کلاہ چو بر تارک کوہ ابر سیاہ

زلیخای فردوسی - بے فرخ او چوں گرفتن سزد ستودہ از دنیست نزد خرد

سعدی - چراغے کہ بیوہ زنے برفروخت بسے دیدہ باشی کہ شہرے بسوخت

" بردبرد ل از جور غم بارہا کہ ناآزمودہ کند کارہا

غالب - فتادہ شورش اندر قالب آب زماہی صد دلش در سینہ بیتاب

پس اگر اس وجہ سے ارکان سلطنت کمال استادان سابقین میں تزلزل ممکن ہو تو مصنف کی شاخہائے نظم اور سخن کی بنیادوں میں بھی رخنہ البتہ ممکن ہوگا۔ (پانچویں) معنے لطیف اس شعر کے نہایت صحیح اور عمدہ یہ ہیں کہ ہمارے حالت ایک سراپا یاس وحسرت کی حالت ہے کہ ہم یادگار رفتگاں اور چند روزہ اور چند ہفتہ مہمان جہاں مبتلائے فراق برادر و اسیر محبت و الم جدائی میر انیس صاحب ممدوح ہیں۔

(چھٹے) یہ خوبی اس کلام کی بہی لائق لحاظ ہے کہ اس شعر میں بھی دو غموں کی جانب اشارہ کیا گیا اور اس کی موافق تقسیم الفاظ کی ایسی موجود ہے جس سے کمال لطف پیدا ہوا ہے پہلے مصرع میں دو حالتیں یادگار رفتگاں اور مہمان جہاں ہونے کی مذکور ہیں اور پھر دوسرے مصرع میں اول دو حالتیں چند روزہ اور چند ہفتہ ہونے کی اور کا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

NATIONAL ... UNIVERSITY

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا۔

سالانہ قیمت پانچ روپیہ — ششماہی تین روپیہ

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۲　　فہرست مضامین ستمبر ۱۹۳۲ء　　شمارہ ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۲۲	ستمبر ۱۹۳۲ء	شمار ۳

ملاحظات

تقریباً ایک ماہ قیام کرنے کے بعد ۲۰؍اگست کو میں پھر لکھنؤ آگیا اور آفتاب کو قہر وجلال کے جس صبر آزما عالم میں چھوڑ کر گیا تھا واپس آکر پھر اُسی جانگداز کیفیت غیظ وغضب میں پایا۔ سنا ہے کہ میری غیبت میں یہاں بارش بھی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں بھی چلیں، لیکن — "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"— مجھے کیا جب تک یہاں رہا آفتاب کی گرم نگاہی کا شکوہ طراز بنا رہا، حیدرآباد پہونچا تو وہاں کی سرد فضا میں بہت سی دل دکھانے والی تمناؤں کا حسرت گزار —— الغرض وہ شخص جس کے لئے "غمزۂ ناہید" بھی "قہر مریخ" کے برابر ہو، اس کو شکوہ وشکایت کا کیا موقعہ؟

میں جس زمانہ میں حیدرآباد پہونچا وہ زمانہ تھا، اربعین محرم کے بعد کا، میلاد نبوی کا اور گیارہویں کا (جسے یہاں یازدہم شریف کہتے ہیں) کہیں مجالس عزا برپا ہو رہی تھیں، تو کسی جگہ ولادت نبوی کی تقریب میں محافل وعظ کا

اہتمام ہو رہا تھا، کسی کے دولت کدہ پر اگر ڈھولک کی تھاپ بزم حال وقال میں گرمیاں پیدا کر رہی تھی، تو کسی طریقت خانہ میں "کرامات غوثیہ" کے اذکار سے لوگوں کے جسموں پر "تشعریرہ" طاری کیا جا رہا تھا۔ الغرض جدھر دیکھئے ایک ہنگامہ تھا نمایش مذہبی کا، گرایش عقیدت کا، پرستش خیال کا، فنا دگی عقل و روح کا اور شیفتگی احساس و اعتقاد کا ——— تمام اکناف ہند سے علماء و مشائخ، فقراء و صوفیہ، واعظین و مرشدین مختلف وضع ولباس مختلف سج دھج، اور مختلف اہتمامات فنی سے مسلح و آراستہ کھنچ کھنچ کر یہاں آ رہے تھے۔ اور سلسلۂ وعظ و تبلیغ رشد و ہدایت پوری گرمی اور گہما گہمی کے ساتھ جاری تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر چودھویں صدی ہجری کا کوئی قطعۂ زمین حشر کے دن صرف اعلاء کلمۃ الحق کی منطقی حجت کی بناء پر سند مغفرت پانے والا ہے تو شاید ہی سرزمین دکن کے مقابلہ میں کسی اور قطعۂ ارض کو اولیت کا فخر حاصل ہو ——— پھر یہی نہیں کہ ان اکابر علم و فضل اور ان اعاظم شریعت و طریقت کا وقت بالکلیہ خدمت دین و مذہب ہی میں "خاشعانہ وخاضعانہ" طور پر بسر ہوتا ہو، بلکہ وہ بفحوائے "ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ" مادی و تمدنی زندگی کی فلاح کے لئے بھی، اسی "فدویانہ وسائلانہ" انداز سے منہمک نظر آتے ہیں جو غالباً دولت کی طرف سے اولین خراج کے طور پر ہر شخص سے وصول کیا جاتا ہے ———

صبح کی نماز اور اوراد و اشغال کے بلند بانگ پروپاگنڈا کے بعد موٹروں میں بیٹھ کر (جن کے متعلق انھیں مطلق خبر نہیں کہ ان کا پٹرول کہاں سے اور کتنا آتا ہے) امراء کے دولتکدوں پر پہونچنا، ان کی فقیر دوستی و تصوف نوازی کی تعریف میں پہلے ایک قصیدۂ منثور پڑھنا اور پھر لاہوت و جبروت، ابدیت و ازلیت عبدیت و معبودیت کے عجیب و غریب نکات بیان کرکے، اشارتاً و کنایتہً اپنی ہستی کو مبدء فیاض کے تمام برکات و فیوض کا مرکز حقیقی اور مہبط انوار الٰہی" قرار دینا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کوئی آسان بات ہے؟ نہ انکی زبان تھکتی ہے نہ دماغ۔ بیٹھے بیٹھے نہ اُن کے اعضاء میں خستگی و تعطل کی کیفیت پیدا ہوتی ہے نہ معدہ میں "تکاثف ریاح" کی ۔ صاحب خانہ پہلو پر پہلو بدل رہا ہے لیکن ان کی "مربع نشینی" میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا، وہ کسی نہ کسی بہانہ سے زنانخانہ کے اندر چلا جاتا ہے، لیکن یہ مذہبی "قرق امین" اسی تیور سے ہر ہر چیز کا جائزہ لیتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ پھر باہر آتا ہے اور اپنے آپ کو پھر اس انداز سے اُن کے سپرد کر دیتا ہے۔ گویا کہ غریب پر کوئی عمل جراحی ہونے والا ہے ———

دوسرے اہل دنیا و اہل غرض بیٹھے ہوئے منھ تک رہے ہیں، موقع کے منتظر ہیں، لیکن ان بے غرض حضرات اہل دین کی گرفت ایسی معمولی نہیں ہوتی کہ کوئی آسانی سے چھوٹ جائے۔ آخر سب لوگ سلام کرکے رخصت ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو تھکا کر خود کبھی نہ تھکنے والا اللہ کا خاص بندہ اپنے آپ کو "قطب وقت"

ثابت کرنے کے لئے بدستور ڈٹا رہتا ہے۔ خواہ مغرب کی نماز قضا ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے —— داستان امیر حمزہ میں "تسمہ پا" مخلوق کے واقعات دیکھ کر یقین نہ آتا تھا لیکن حیدر آباد میں اس کا مشاہدہ روزانہ ہو سکتا ہے۔ آپ جس امیر کے دربار میں چلے جائیے کوئی نہ کوئی تسمہ پا وہاں ضرور موجود ہوگا۔ اور اس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ جب وہ آئے گا تو مصافحہ ضرور کریگا اور قریب ترین نشست پر قابض ہو جائیگا مزاج پرسی کے بعد یہا گزشتہ ۲۴ گھنٹوں کے اندر اپنے مواعظ و انہماکات مذہبی کی داستاں چھیڑ دیگا اور پھر جو کرامات اولیا و خوارق عادات کا ذکر شروع کریگا تو اس وقت تک دم نہ لیگا جب تک سارے مجمع کو فرط حیرت سے "صنمکدہ" نہ بنا دے ——

ان حضرات کے مواعظ کیا اور کس قسم کے ہوتے ہیں؟ اب اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔ کیونکہ تیسرے درجہ کا تمام وہ "لیٹریچر" جسے "صحت تاریخی" سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ "متشہاد قرآنی" سے ان کے نوک زبان ہوتا ہے اور شاید "روما و یونان" کے "صنمیات" میں بھی وہ حکایات نہ پائی جاتی ہوں جنھیں یہ علمبرداران مذہب، تاریخ اسلام و مذہب اسلام سے منسوب کرتے رہتے ہیں۔

ایک صاحب نے جو بڑے پایہ کے محقق و مورخ مانے جاتے ہیں، نمرود اور جناب ابراہیم کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب نمرود نے ان کو آگ میں ڈالنا چاہا تو سلطنت کے طول و عرض میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ ہر شخص کا سالانہ خراج معاف ہے بشرطیکہ وہ ایک گٹھا لکڑی کا لاکر جمع کر دے۔ میں سن رہا تھا اور حیران تھا کہ ایک شخص کے جلانے کے لئے لکڑی کے اتنے انبار کی کیا ضرورت تھی اور جب تمام ملک کے آدمیوں نے اس کی فراہمی میں حصہ لیا ہوگا تو یہ انبار زمین کے کتنے حصہ کو محیط ہوا ہوگا اور نمرود کو کتنا انتظار کرنا پڑا ہوگا پھر یہ کہ وہ کتنا بڑا میدان رہا ہوگا جہاں اتنی لکڑی جمع کی گئی ہوگی، اور جب اتنے بڑے انبار میں آگ دی گئی ہوگی تو اس کی لپٹ سے صحرا کے کتنے جانور جل کر راکھ ہوگئے ہونگے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا خالص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں وعظ فرما رہے تھے انداز بیان میں خاص دلکشی رکھتے تھے، آیات قرآنی کو پوری قرأت کے ساتھ پڑھتے تھے، آواز کے نشیب و فراز میں ایک ملہمانہ کیفیت پیدا کرنے پر پوری طرح قادر تھے، لیکن جو کچھ وہ فرما رہے تھے اسے اسلام سے کیا تعلق تھا، تاریخ سے کتنا لگاؤ تھا، اس کا اندازہ اس نمرود والی حکایت سے ہو سکتا ہے۔ میں نے چاہا کہ ان کی قیام گاہ پر جا کر کسی وقت دریافت کروں کہ "مولانا، قرآن پاک میں تو نمرود کا نام کہیں نہیں آیا، پھر یہ نام آپ نے کہاں سے لیا اور جن روایات کی بنا پر یہ نام لیا جاتا ہے ان کی صحت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، جبکہ جناب ابراہیم کا حمورابی کے عہد میں ہونا پایا جاتا ہے اور نمرود کے زمانہ کو اس عہد سے کوئی واسطہ نہیں" ——

یہ بھی دریافت کرنے کو جی چاہا کہ "اسلام میں جو روایات جناب ابراہیم کے متعلق پائی جاتی ہیں وہ کس حدتک توریت کے بیان سے علیحدہ ہیں اور صحف موسیٰ (pentateuch.) اور یہودیوں کی کتاب مِرداش رِبا میں جو حالات جناب ابراہیم کے دیئے ہیں، کلام مجید کس حدتک ان کا مصدق و منکر ہے۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ اس گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا، خاموش رہا اور ہندوستان کے جہل کو دعا دینے لگا جسکے بدولت اتنے لوگوں کا پیٹ چل رہا ہے۔

اس سے قبل فقر و درویشی اور علم و فضل پر ایک ایسا دور آچکا ہے جب وہ دنیاوی جاہ و ثروت کو کمال بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیتا تھا اور بڑے بڑے امرار و سلاطین کو بھی ان کی بوریا نشینی تک باریاب ہونے کا موقع نہ ملتا تھا۔ لیکن اگر آپ کو اس تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنا ہو تو حیدرآباد چلے جایئے اور دیکھئے کہ کیسا کیسا مدعی فضل و کمال، کیسا کیسا صوفی "و مشائخ" امرا، کے دربار میں سائلانہ انداز سے پہونچتا ہے اور کس کس طرح تملق و چاپلوسی سے کام لیکر دین و مذہب کا سودا کرتا ہے —— وہی عالم و صوفی، وہی رہبر مذہب و طریقت جن سے اگر آپ اس کے مدرسہ و خانقاہ میں ملنے جائیں تو یہ ظاہر ہو کہ شاید یہ کوئی دوسرا خدا ہے جو انتہائی کبر و نخوت کے ساتھ تخت خدائی پر متمکن ہے۔ ہاں وہی عالم و صوفی، آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد کے کسی امیر کی محفل میں پہونچ کر کیا چیز ہو جاتا ہے ——

یہ خدا یہاں پہونچکر ایسا ذلیل بندہ بنجاتا ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ کوئی "کمینہ چاکر" دنیا میں پایا جائے اور یہ فرعون یہاں درباریوں کی صف میں پہونچکر اس درجہ بجوج، اس قدر "خاکسار و فدوی" نظر آتا ہے گویا کہ وہ غلامان زورق[1] (Galley Slaves) میں سے کوئی مصیبت زدہ غلام ہے۔ غالباً اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ ان حضرات کی یہ ایکٹنگ (تمثیل) کس مدعا کو لئے ہوئے ہوتی ہے —— اگر آپ کاغذات سرکاری دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ کتنے ماہانہ وظائف و سالانہ عطیات ان حضرات کو ملتے ہیں اور یہ اپنے اعزہ و متوسلین کے لئے ملازمتیں حاصل کرنے میں کس قدر کامیاب ہوتے ہیں ——

---

[1] یوروپ میں سولھویں اور سترھویں صدی کے اندر رواج تھا کہ اسیران جنگ یا اور دوسرے غلاموں سے کشتی رانی کا کام لیتے تھے۔ یہ غلام زنجیروں سے بندھے بندھے کشتیاں چلاتے تھے اور نہایت سخت تکالیف میں مبتلا کئے جاتے تھے "Galley." اس کشتی کا نام تھا جہاں وہ کام کرتے تھے۔ اس لئے اس کا ترجمہ "غلامان زورق" کیا گیا۔ (زورق بہ معنی کشتی)۔

میرا قیام بدستور مولانا ہوش بلگرامی کے بنگلہ پر رہا اُن کے خلوص و کرم کی داستان چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ وہاں تو جو کچھ ہے میرا ہے - لیکن اس مرتبہ ان کی وساطت سے ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ مجھے ملی کہ اس کا ذکر نہ کرنا غالباً کفرانِ نعمت ہوگا - یوں تو ہر بار سفر حیدرآباد کے سلسلہ میں کسی نہ کسی قابلِ ذکر ہستی سے ملاقات ہو جاتی ہے، لیکن اس مرتبہ ایسی ذات گرامی سے اُنھوں نے تعارف کرایا کہ آخر کار میں ان تمام تکلیف دہ مناظر کو جن کا ذکر ابھی ابھی کر چکا ہوں، بھلا دینے پر مجبور ہو ہی گیا - یعنی —— راجہ نارائن پرشاد صاحب بہادر -

آپ صدر اعظم بہادر کے حقیقی بھانجے ہیں اور بیگم پیٹ میں جو بلدۂ حیدرآباد سے دور چھاؤنی سکندرآباد کے علاقہ میں واقع ہے، نہایت ہی خاموش و پُر لطف زندگی بسر کرتے ہیں - میں حیران ہوں کہ وہ شخص جس نے ثروت کی آغوش میں آنکھ کھولی ہو، جاہ و دولت کے گہوارہ میں پرورش پائی ہو، غلامانِ زریں کمر و کنیزانِ سمن بر کے حلقہ میں جس کا نشو و نما ہوا ہو، جس کو "جور استا" کے مقابلہ میں "مہر یار" سے زیادہ واسطہ پڑا ہو اور جسے ایک محدود جماعت و مختصر سرزمین میں مدارجِ حیات بسر کرنے کی وجہ سے بہت کم موقع حیاتِ انسانی کے مطالعہ کا ملا ہو - وہ کیونکر ایسا بہتر انسان بن سکتا ہے - سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یہ نتیجہ ہے اُن کے خالِ محترم (سر مہاراجہ بہادر) کی صحیح تربیت کا اور خود راجہ صاحب کی فطری اہلیت کا جو "مجبورِ اکتساب" طبقہ کے لوگوں میں بھی بہت کم نظر آتی ہے، چہ جائیکہ طبقۂ امراء میں —— سچ ہے - "این سعادت بزورِ بازو نیست" ——

راجہ صاحب کا پاکیزہ ذوقِ ادب، فنونِ لطیفہ میں انکی بالغ نظری، وسعتِ مطالعہ کے ساتھ اُن کی نگاہ نقاد! ان حقیقتوں کا تھوڑا سا علم تو مجھے اول ہی دن اُن کی گفتگو سے ہو گیا تھا اور پھر اس کی تصدیق ان کی لائبریری کو دیکھ کر ہوئی جو ہر فن کی بہترین کتابوں سے آراستہ ہے، لیکن حق الیقین کا مرتبہ تو اس خنک چاندنی رات میں ہوا جب ان کی فطرتِ جمیل بالکل عریاں تھی —— اور عُریاں بھی بالکل اُس طرح جس کو کسی شاعر نے ایک خاص کیفیت کے ماتحت ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ :-

به بزمِ باده گریباں کشود نتش نگرید
خوشا بہانۂ مستی، خوشا رعایتِ شوق

درختوں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی، سرد ہواؤں کے ہلکے ہلکے جھونکے، دکن کی بھیگی ہوئی رات کا وہ لطیف نم (جیسے کوئی نہانے کے بعد کچھ خشک اور کچھ بھیگے ہوئے بال لئے ہوئے بازو پر سر رکھ کر لیٹ جائے) آبادی سے بہت دور، خاموش و پُر سکون فضائیں، تین یک رنگ دلوں کا یکجا جمع ہو جانا —— اور شعر و ادب یا کسی ملکۂ شعر و ادب کا موضوعِ گفتگو قرار پانا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اب اس رات کی

صبح کبھی نہ ہوگی اور اگر ہوگی تو غالباً میر کی اس کیفیت کو لئے ہوئے کہ

القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

راجہ صاحب نے جیسے جیسے لطیف اشعار فارسی اردو کے اس صحبت میں سنائے وہ قیام دکن کے زمانہ میں غالباً میرے اور ہوش دونوں کے لئے بالکل نئی چیز تھے ——— لے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی — بہرحال سرزمین دکن میں میرے لئے یہ ایک اور نئی وجہ کشش پیدا ہوگئی ہے اور منتظر ہوں کہ دیکھئے یہ لطیف صحبت پھر کب نصیب ہوتی ہے

——— - - - - - ———

غالباً ناشکری ہوگی اگر اس سلسلہ میں مولوی محمد میر خاں صاحب غربت' ام - اے کا ذکر نہ کروں جنھوں نے ایک شام مجھے مدعو کر کے لذت روحانی سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیا - غربت صاحب سے یوں تو میرے غائبانہ مراسم ایک زمانہ سے ہیں لیکن "مشاہدۂ ذات" کا موقع اسی مرتبہ ملا - آپ حیدرآباد میں اسٹنٹ اکاونٹنٹ جنرل کے عہدہ پر ممتاز ہیں اور نہایت اچھا ذوق شعر و ادب کا رکھتے ہیں - آپ ہی کے وساطت سے ایک اور گرانمایہ ہستی ڈاکٹر طاہر صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا آپ نظام کالج میں لاطینی اور فارسی زبان کے پروفیسر ہیں اور یوروپ سے اتنی زبانیں سیکھ کر آئے ہیں کہ اگر آپ کو بُرج بابل (Tower of Babel) کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا - نہایت آزاد خیال - روشن فکر انسان ہیں اور موسیقی کا بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں - آپ نے متعدد بار میرے پاس آنے کی زحمت گوارا فرمائی، لیکن مجھ بدنصیب کو ایک بار بھی "بازدید" کا موقعہ نہ ملا خدا معلوم کیا کیا باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا - بہرحال "اگر فقیر دل کا پھیرا پھر کبھی ہوا تو غربت کے دولت کدہ پر پہونچکر یہ حسرت بھی پوری کرونگا -

۱۸ کی صبح کو جب ریل میں آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میں نے اخبار کی جستجو کی تاکہ ۱۷ کا وہ اعلان حکومت دیکھوں جس میں فرقہ وارانہ نیابت کا فیصلہ کیا گیا ہے - کانپور پہونچکر اخبار لیا اور نہایت بیتابی سے اس نقشہ کو دیکھنے لگا جس میں اقلیت و اکثریت کی نیابت کے اعداد و شمار دیئے گئے تھے - یہ تو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ حکومت سوائے جداگانہ انتخاب کے کسی اور طریق کار کو پسند کر ہی نہیں سکتی، لیکن اس کا علم نہ تھا کہ یہ فیصلہ ہندو مسلمان دونوں کے لئے اس درجہ ناقابل اطمینان ثابت ہوگا ——— اعلان میرے سامنے تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا ایک دل کے اس سے زیادہ ٹکڑے کرنا ممکن ہیں —

پنجاب کے سکھ اور ہندو نالاں ہیں کہ مسلمانوں کو بہت زیادہ حق نیابت دیا گیا، مسلمان کہہ رہے ہیں کہ ہماری کثرت آبادی کا بھی کافی لحاظ نہیں کیا گیا، یہی حال بنگال اور سرحدی صوبہ کا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے کہ حق نیابت کے فیصلہ سے نہ وہ خوش ہیں نہ ہندو - جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں مسلمانوں کو وہی شکایتیں ہیں جو نیابت وغیرہ میں ہندوؤں کو ہیں، الغرض حیرت کا مقام ہے کہ یہ فیصلہ مسلمانوں میں نہ صرف حافظ ہدایت حسین صاحب

اور مولوی شفیع داؤدی کے لئے ناقابل اطمینان ثابت ہوا بلکہ حد یہ ہے کہ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں اور بیگم شاہنواز بھی زیادہ مطمئن نہیں۔ حکومت کو معلوم تھا اور وہ اس سے قبل اپنا خیال ظاہر کر چکی تھی کہ اس فیصلہ سے سب کو خوش کرنا ممکن نہیں، لیکن واقعی یہ ایک جدید انکشاف ہے کہ وہ کسی ایک کو بھی خوش نہ کر سکی۔ تاہم اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کی ذمہ دار حکومت ہند ہے۔ کیا قابل الزام برٹش راج ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ جو کچھ خطا ہے وہ صرف ہماری ہے کہ ہم خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکے اور مخلوط انتخاب کی امن پسند صورت کو چھوڑ کر جداگانہ انتخاب کا مطالبہ اختیار کیا جو کسی طرح کسی کو مطمئن نہیں کر سکتا ــــــ ظاہر ہے کہ حکومت نے بالکل مجبور ہو کر یہ ذمہ داری اُس وقت اپنے سر لی جب تمام جماعتوں نے متفقہ طور پر کہدیا کہ وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ اس لئے اب شکوہ و شکایت بیکار ہے اور ہم کو یہ عذاب برداشت کرنا پڑیگا جس کو خود ہم نے مول لیا ہے۔ اعلان میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اب بھی یہ فیصلہ حکومت کا منسوخ ہو سکتا ہے اگر اہل ہند کوئی متفقہ مطالبہ پیش کریں، لیکن ہمیں معلوم ہے کہ حکومت کی یہ انصاف پسندی اور حرارت اخلاق کس وثوق کی بناء پر ہے۔ جس طرح مہاتما گاندھی نے سادہ کاغذ پر دستخط کر کے مسلمانوں سے کہدیا تھا کہ تم جس متفقہ فیصلہ کو پیش کروگے میں کانگرس کی طرف سے منظور کر لونگا، بالکل اسی طرح حکومت کا یہ کہنا ہے۔ کیونکہ مہاتما گاندھی خوب واقف تھے کہ مسلمان ایسے معمولی احمق نہیں ہیں جو آپس کے اختلافات کو محو کر کے کسی ایک فیصلہ پر متفق ہو جائیں گے اور حکومت بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ ملک میں اب ہندو مسلمانوں کا کسی ایک امر پر اتفاق کر لینا آسان بات نہیں۔ بہرحال فیصلہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا اور انتخاب جداگانہ کی جو بلا ہندوستان پر نازل ہونے والی تھی کم از کم مزید دس سال کے لئے مسلط ہو ہی گئی۔ اس وقت تو نہیں لیکن مستقبل بتائیگا کہ اس سے ملک کے امن و سکون کو کس قدر آزار پہونچا اور کس کس طرح گوشت سے ناخن جدا کیا گیا۔ ہندو مسلمانوں کے موجودہ ناخوشگوار تعلقات کا علم لوگوں کو ہو ہی چکا ہے، اب سکھوں نے اپنا محاذ علحدہ قائم کر لیا ہے اور کچھ زمانہ گزرتا ہے کہ آپ باہمی کشاکش کے خطرناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور شیر کو جو اس کا "حصہ" (Lion's Share) ملنا چاہئے ملکر رہیگا۔ پائندہ باد حکومت برطانیہ۔

مسٹر راحت حسین صاحب علوی (سول لائن۔ بریلی) کی ایک نہایت دردانگیز تحریر اس مضمون کی موصول ہوئی کہ اُن کے ایک نہایت ہی عزیز دوست شفقت علی بی اے جولائی ۳۲ء کے نگار میں "مجنوں گورکھپوری کے فسانۂ سمن پوش" پڑھ کر دفعتہً قلب کی حرکت بند ہو جانے سے رحلت کر گئے۔ مراسلہ نگار کا بیان ہے کہ مرحوم نہایت حساس طبیعت رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "یہ افسانہ میری جان لیکر چھوڑے گا" اور آخر کار وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مرحوم نے موت سے کچھ دیر قبل افسانہ کے آخر میں سُرخ روشنائی سے بقید وقت و تاریخ یہ شعر لکھا تھا:-

نہ خوں سینہ سے بہتا نہ یاد گل آتی[1]
عجیب چیز تھی تیر جفا کی دلدوزی

میں نے مراسلہ نگار سے اس "شہید ادب" کے مفصل حالات زندگی طلب کئے ہیں اور اگر مل گئے تو وہ بھی ناظرین نگار کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں گے

نیاز

---

[1] یہ شعر میری ایک قومی نظم کا ہے جو عرصہ ہوا کسی رسالہ میں شائع ہوئی تھی (نیاز)

فطرت اور انسان کی جنگ

انسانی آبادی کا عجیب و غریب معمہ

مسلسل

ہم معترضین کو ان زمانوں کے لحاظ سے جن میں انھوں نے اعتراض کئے، تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔

(۱) مالتھس کے ہم عصر اور ڈارون سے پہلے کے معترضین۔

(۲) ڈارون کے بعد اور جنگ عظیم سے قبل کے معترضین۔

(۳) جنگ عظیم کے بعد کے معترضین۔

مالتھس کے ہم عصر اور ڈارون سے پہلے کے معترضین

مالتھس کے ابتدائی معترضین میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ ان میں ماہر اقتصادیات بھی تھے اور کلیسا کے پادری بھی۔ مدبران سلطنت بھی تھے اور "طنزیات" کے لکھنے والے بھی فلسفی بھی تھے اور شاعر بھی۔ ایمپسن نے ۱۸۳۷ء کے "اڈنبرا ریویو" میں، ان سب کو چند گروہوں میں جمع کر دیا ہے۔ سب سے اول تو وہ لوگ آتے ہیں جنھیں وہ خالص حمقا کے نام سے موسوم کرتا ہے اور جن میں امتیازی مرتبہ جمیس گرہم کو دیتا ہے۔ ان لوگوں نے مالتھس کے نظریہ کو غلط سمجھ کر اس پر مہمل اعتراضات کر ڈالے۔ گرہم کے خیال میں مالتھس کا عقیدہ، قحط کے متعلق یہ تھا کہ یہ قلت غذا کے مستقل مرض کا فطرت کی طرف سے نہایت پرمحبت علاج ہے۔ دوسرا عقیدہ، مالتھس کا، اس کے نزدیک یہ تھا کہ فطرت انسان کو سکھلاتی ہے کہ وہ امراض کو ایجاد کرے تاکہ آبادی حدود کے اندر رہے۔ اس کے علاوہ، اس نے معلوم کیا کہ مالتھس، بدکاری اور مصیبت کو، زاید از ضرورت آبادی کا مصلح سمجھتا ہے اور اُن کو روکنے کی جگہ ترقی دینا چاہتا ہے۔ ان معترضین کو جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ بقول غالب:۔

یارب، نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زبان اور

دوسرا گروہ، ان معترضین کا ہے جن کے جذبات اور معتقدات کو مالتھس کے نظریۂ آبادی سے صدمہ پہنچا۔ ایمپسن

سے تھے کالرج، بشپ ہننگ فورڈ اور سرجان لیزلی۔ شامل ہیں۔ سرجان لیزلی نے یہ بات قرار واقعی طور پر ثابت کر دی کہ مالتھس، ملحد اور مرتد تھا۔ اس کے بعد، کسی مزید بحث و مباحثہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی جیسے آج کل، جس مخالف پر بس نہ چل سکے اُسے بالشوک کہہ دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح گویا، تمام قضیہ ختم کر دیا جاتا ہے
تیسرا گروہ، ان لوگوں کا ہے جنھوں نے کہا کہ مالتھس نے کوئی نئی بات پیش نہیں کی۔ ایک بدیہی اور ناقابل انکار حقیقت کے بیان کرنے میں، بے کار، اپنا اور دوسروں کا وقت ضایع کیا۔ اس گروہ کے ممتاز معترضین، کالرج اور ہیزلٹ تھے۔ کالرج کہتا ہے کہ " ایک فلسفیانہ تصنیف کا سوائے اس کے کوئی مقصد نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے نظریہ کی تائید میں ثبوت، دلائل اور نظائر فراہم کرے۔ اس کتاب میں بھی یہی کیا گیا ہے مگر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہاں ایک مسلمہ، بدیہی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے ۳۵۰ صفحے سیاہ کئے گئے ہیں! اسے کہتے ہیں کتاب بنانا!

مگر اس قسم کے تمام اعتراضوں کا نہایت آسانی سے، ایک دوسرے سوال کی شکل میں جواب دیا جا سکتا ہے۔ ان محققین سے ہمیں دریافت کرنا چاہیئے کہ آیا وہ کسی موجد، کسی ماہر سائنس، کسی فلسفی کی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں جس نے ایک بدیہی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانے سے زیادہ اہم بھی کوئی اور دوسرا کام انجام دیا ہو اسکی دریافت کے بعد اسکی دریافت کی ہوئی حقیقت، بدیہی اور مسلم الثبوت ہو ہی جاتی ہے جسے ایک اسکول کا مبتدی بھی اتنے ہی وثوق کے ساتھ پیش کرتا ہے جتنا کہ ایک علامہ بے بدل۔ لیکن دریافت کے لمحے سے پہلے، عام آدمیوں کے لئے وہ اسی قدر تاریک اور لامعلوم ہوتی ہے جیسے کہ خود ان کے جمجمہ کی اندرونی سطح۔

چوتھا گروہ، تجربئین" (Empiricists) یعنی ان لوگوں کا ہے جن کا عقیدہ تھا کہ اصول آبادی ہر زمانہ میں، اختلاف حالات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس میں گاڈون، پلیس اور مورٹ شامل ہیں قدرتی طور پر، گاڈون کو، جس کی کتاب "محقق"، مالتھس کے "نظریہ آبادی" کی محرک ہوئی، معترضین میں پیش پیش رہنا چاہیئے تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس کا اثر، مالتھس کی تصنیف پر اچھا پڑا، کیونکہ پہلے ایڈیشن میں جس انتہا پسندی سے کام لیا گیا تھا وہ دوسرے ایڈیشن میں باقی نہیں رہی۔ گاڈون نے اعتراض کرنے میں، نہایت متانت اور سنجیدگی سے کام لیا اور اس لحاظ سے اس نے مالتھس کی بھی بڑی تعریف کی کہ اس نے اپنے "نظریہ آبادی" میں ایک خالص متلاشی حقیقت کی طرح بحث و مباحثہ کیا ہے ولبرفورس کی طرح، ذاتیات پر حملہ کر کے گاڈون نے اپنے اعتراضات کو بیہودہ نہیں بنایا۔ ولبرفورس نے پہلے سے "ارتقا" کے متعلق بحث کے دوران میں دریافت کیا تھا کہ "حضرت کا سلسلہ نسب اگر بقول خود، بندر سے ملتا ہے تو کیا جناب یہ بیان فرمانے کی زحمت فرمائیں گے کہ جناب کے دادا صاحب قبلہ بندر تھے یا دادی صاحبہ محترمہ!"

گاڈون کے اعتراضات کا مرکز، اضافہ آبادی کے "موانع" تھے لیکن یہ "موانع" وہی تھے جو صرف پہلے

ایڈیشن میں شایع ہوئے تھے اور بعد کے ایڈیشنوں سے خارج کردیئے گئے تھے۔ گاڈون کی نظر ہمیشہ، نوع انسان کی ترقی و تکمیل کی طرف رہتی تھی۔ اسی لئے مالتھس سے اس نے سوال کیا کہ کیا نوع انسان کی اصلاح کی جتنی تجویزیں ہیں، سب کا انجام، ناکامی، روز ازل سے مقدر ہوچکا ہے؟ کیا حکومتیں، کثرت آبادی کی برائیوں کا علاج، جنگ میں شریک ہونے کے علاوہ، اور کچھ نہیں کرسکتیں؟ اور کیا ہمیں، بدکاری، مصیبت اور قبل از وقت موت کو صبر و سکون سے گوارا کرتے رہنا چاہئے؟ اس کے بعد گاڈون، اصلاح کے طور پر، انھیں "امتناعی موانع" کو پیش کرتا ہے جن پر اپنی تصنیف کے بعد کے ایڈیشنوں میں مالتھس نے بہت زور دیا ہے۔ گاڈون کہتا ہے کہ اصلاح کی عالمگیر حکومت کے زمانہ میں، عاقبت اندیشی اور عزت نفس کے تخیل، اس قدر ترقی پاجائیں گے کہ وہ قبل از وقت شادی اور ضرورت سے زیادہ اولاد کو روک دیں گے۔ مالتھس نے ان سب اعتراضات کا جواب دیا۔ لیکن ان جوابات سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ اپنی تصانیف کے آئندہ ایڈیشنوں میں، اس نے ان اعتراضات سے بہت فائدے حاصل کئے اور عاقبت اندیشی کو جو اہمیت اس کے بعد کے ایڈیشنوں میں حاصل ہے وہ، سراسر انھیں اعتراضوں کا نتیجہ ہے۔

شیلے، اپنی تصنیف "بغاوت اسلام" (Revolt of Islam.) کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ عوام کی امیدوں کے احیاء کے لئے "یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ مالتھس نے اپنے بعد کے ایڈیشنوں میں اخلاقی ضبط کی غیر محدود حکومت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کی اس رعایت سے، انسانی ترقی کے متعلق، ان غیر موافق نتائج کا ازالہ ہوگیا ہے جو اس کے "نظریہ آبادی" سے پیدا ہوتے تھے اور اب اس کی تصنیف "گاڈون کے سیاسی انصاف" کیلئے ایک شرح و تفسیر کا مرتبہ رکھتی ہے۔"

جس طرح گاڈون کے اعتراضوں کا اثر مالتھس پر اچھا ثابت ہوا، اسی طرح، مالتھس کے اعتراضوں کا اثر گاڈون پر بھی ہوا۔ پہلے گاڈون، آبادی کی ضرورت سے زیادہ توسیع کو، ایک خیالی اور وہمی چیز سمجھتا تھا۔ لیکن بعد کو جیسا کہ اس کی تحریروں (مثلاً تخیلات) سے ثابت ہوتا ہے وہ مالتھس کے بعد کے خیالات کا بڑی حد تک ہمنوا ہوگیا تھا۔

پانچواں گروہ معترضین کا وہ تھا جنھوں نے، اضافہ آبادی کے متعلق اپنے نظریہ خود بنائے مثلاً انڈرسن، اوون، اور پاؤلٹ اسکروپ۔ اسی ذیل میں۔ ایم۔ ٹی۔ سیڈلر، ممبر پارلیمنٹ، آرچی بالڈ ایلیسن اور ٹامس ڈبل ڈے بھی آتے ہیں۔ ایم۔ ٹی سیڈلر نے، مالتھس کے خیالات کے متعلق، یہ کہنے کے بعد کہ وہ اس قدر "ہولناک" ہیں کہ انکی نظیر، دنیا کے کسی اخلاقی ادب میں چاہے وہ متبرک ہو یا غیر متبرک نہیں ملتی۔" اپنے نئے قانون آبادی کی اس طرح توضیح کی کہ "انسانوں کی (اگر وہ تمام دیگر اعتبارات سے ایک دوسرے سے مشابہ ہوں) اولاد پیدا کرنے کی اہلیت میں تبدیلی، ان کی تعداد کے بالکل برعکس ہوتی رہتی ہے" یعنی اگر اولاد کثیر ہے تو اولاد پیدا کرنے کی اہلیت کم ہوگی اور اگر اولاد کم ہے تو یہ اہلیت زیادہ ہوگی۔ اس کے دس سال بعد، آرچی بالڈ ایلیسن نے اپنا نظریہ پیش کیا اور اس کیلئے

دو جلدیں وقف کیں۔ نظریہ یہ تھا کہ "آبادی میں اضافہ کی مقدار، اُس کے حجم کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔" اس کے دس سال بعد، تھامس ڈبل ڈے نے اپنا نظریہ پیش کیا کہ آبادی میں اضافہ، خوراک کی رسد کے بالکل مطابق ہوتا ہے"

پچھلے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جنھیں ایلیسن غیر معمولی حد تک ضدی اور کج بحث قرار دیتا ہے اور جن کے متعلق کہتا ہے کہ انھوں نے مالتھس کے مقدمات اور نتائج دونوں سے انکار کیا۔ اور اس میں وہ ۔ دے لینڈ کو رکھتا ہے۔ وے لینڈ کہتا ہے کہ اُن تمام مدارج و منازل میں، جن سے ہیئت اجتماعی گذرتی ہے، آبادی کا فطری میلان یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حدود کے اندر رہے جو زمین کی اہلیت پیدا وار غذا مقرر کرتی ہے"۔ اسے دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ "ہر آدمی کا جو قید خانہ کی چار دیواری میں بند ہو، یہ فطری میلان ہوتا ہے کہ وہ قید خانہ کی حدود کے اندر رہے"

مالتھس نے اس کا جواب یہ دیا کہ اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو ہمیں اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ "ناروے کے گھنے جنگل میں، چیڑ کے درختوں کا میلان، اپنے تنے کے دونوں جانب شاخیں نکالنے کی طرف نہیں ہوتا لیکن یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ناروے کے چیڑ کا درخت جو ایک کھلی ہوئی جگہ پر کھڑا ہوتا ہے، اپنی پھنگل سے لیکر جڑ کے قریب تک خوب پھیلی ہوئی شاخیں نکالتا رہتا ہے۔"

اخیر میں ایلیسن، ان معترضین کا گروہ بناتا ہے جو اپنے آپ کو عملی آدمی کہتے ہیں اور اس میں وہ آرتھر ینگ کو شامل کرتا ہے اور اس کے اعتراض دیکھکر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جہاں عالم کو پہنچنے کی جسارت نہیں ہوتی۔ وہاں جاہل کو بے دھڑک کودنے سے کوئی شخص باز نہیں رکھ سکتا۔

یہاں تک تو ڈارون سے پہلے جو معترضین ہوئے اُن کا بیان کیا گیا۔ اب ہم ڈارون کے بعد کے معترضین کا ذکر کرتے ہیں۔

---

(۲) ڈارون کے بعد اور جنگ عظیم سے پہلے کے معترضین

ان میں سب سے اول جو لوگ قابل ذکر ہیں وہ "اشتراکیین" یا سوشلسٹ ہیں۔ سوشلسٹ جماعت میں جو لوگ زیادہ غور و فکر کرنے والے ہیں وہ مالتھس کی سرے سے تردید کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض میں اس قدر لچک ضرور ہے کہ وہ اپنی اسکیموں میں، اولاد کی پیدا وار کو محدود کرنے کے ان ذرائع کو جو جدید مالتھیسیوں (Neo-Malthusianism.) نے بتلائے ہیں، شامل کر لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سوشلزم اور مالتھس کے ابتدائی نظریہ میں، کوئی مغایرت نہیں ہو سکتی۔ اگر نوع انسان، تمام دیگر انواع حیوانات کی طرح حیات کے ناقابل عبور حدود سے برابر ٹکراتی رہتی ہے تو ان حدود کو سوشلزم یا کسی اور دوسری اصلاحی تجویز

کے ذریعہ سے، کھوڑا اسے آگے سرکا دینے یا ان میں تکیہ اور گدّا لگا دینے سے تاکہ چوٹ زیادہ سخت نہ آئے، کام نہیں چل سکتا۔ اور ان تدبیروں کا اثر، ان کی انتہائی کامیابی کی حالت میں بھی محض عارضی ہو سکتا ہے۔ ان تمام باتوں کو محسوس کرنے کے بعد مارکس اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔

نئی مشین، برابر مزدوروں کی جگہ لیتی جا رہی ہے اور اس کی کوئی تلافی، فوراً یا کچھ عرصہ کے بعد، طلب کا اضافہ کرکے نہیں کرتی ہے۔ مشینری کے مقابلہ میں، اس خزانہ میں، جس سے مزدوروں کی اُجرت ادا کی جاتی ہے، اضافہ، نسبتاً کم ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ایسی آبادی کی تعداد برابر بڑھتی جائے گی جو سرمایہ کی مقدار کے مقابلہ میں زائد از ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت سے زیادہ آبادی کے پیچیدہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ موجودہ تنظیم صنعت کی یہ ستم ظریفی دیدنی ہے کہ جو سبب ملک کی مجموعی پیداوار اور آمدنی میں اضافہ کرتا ہے وہی سبب بیک وقت، آبادی کو زائد از ضرورت قرار دیتا ہے اور مزدوروں کی حالت کو سقیم کر دیتا ہے۔ مگر سرمایہ دار اس زائد از ضرورت آبادی کے وجود پر تاسف نہیں کرتے، بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ اس طرح ہمارے مزدوروں کی فوج کا ایک محفوظ دستہ تیار ہو رہا ہے جو، کم اُجرت پر، ضرورت کے وقت ہمارا کام کرنے کے لئے آمادہ کیا جا سکے گا۔"

سوشلسٹ، اس فکر میں ہے کہ ایک طرف تو وہ مزدوروں کی مصیبت اور بے چارگی کو ثابت کرے اور دوسری طرف اس کا تمام الزام، سرمایہ داری کی مشین پر عائد کر دے ——————

—————— اس لئے آبادی کے زائد از ضرورت پھیلاؤ سے جتنی تشریحیں موجودہ مصیبت اور تباہی کی کی جاتی ہیں، ان سے وہ حتی الوسع، اجتناب اور اعراض کرنا چاہتا ہے۔

ہنری جارج نے، اپنی کتاب "ترقی اور افلاس" میں مالتھس پر بہت جھنجھلاتے ہوئے اعتراض کئے ہیں۔ مگر اسکے اعتراضوں میں کوئی جدت نہیں ہے۔ اُس سے بیشتر، گاڈون اور سیڈلر، اسی قسم کے اعتراضات کر چکے تھے۔ ہنری جارج کا یہ کہنا ہے کہ زائد از ضرورت تعداد، نطرت کی غلط حساب دانی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ انسانی خراب اداروں اور ناقص حکومت کا لایا ہوا عذاب ہے۔ ہنری جارج کی رائے میں، مالتھس، ایک دیوانہ وار بڑھتی ہوئی آبادی کے تخیل میں اس قدر کھویا جاتا ہے کہ آبادی میں جو فی الحقیقت اضافہ ہوا ہے اُسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہ اضافہ عام طور پر ان حدود کے مقابلہ میں جو فطرت نے مقرر کر دیئے ہیں، بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی ایسا قانون آبادی کا ہوتا جیسا کہ مالتھس نے پیش کیا ہے تو اسے مالتھس سے بہت عرصہ پہلے دنیا نے تسلیم کر لیا ہوتا۔ علاوہ ازیں، آبادی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ، غذا میں اضافہ کافی مقدار میں ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ اضافہ آبادی سے جو جدید تقسیم عمل پیدا ہوتی ہے اس کے سبب سے

آدمی اپنے معمولی خرچ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے لگتا ہے۔ اور مشاہدہ ہمیں بتلاتا ہے کہ جو ملک جس قدر زیادہ آباد ہے اسی قدر زیادہ دولتمند ہے۔ مگر جارج کے اس تمام بیان کو ہم اسی حد تک صحیح کہہ سکتے ہیں جس حد تک تقسیم عمل اور دوسری ایجادوں سے، دولت کی پیداوار میں تیزی کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس حقیقت سے جارج یا اس کا کوئی اور حمایتی، انکار نہیں کرسکتا کہ انسان کی اولاد پیدا کرنے کی اہلیت اور اس کے حرص و آز کا میلان ہمیشہ حدود سے متجاوز ہونے کی طرف رہتا ہے۔ آدمی دولت بھی پیدا کرتا ہے اور اپنی نسل بھی۔ مگر انسانوں اور ان کی احتیاجات میں اضافہ، دولت کی پیداوار کے مقابلہ میں زیادہ سرعت کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔

لیکن ہنری جارج کے ایک اعتراض کی تردید آسانی سے نہیں کی جاسکتی۔ وہ کہتا ہے کہ آبادی کی ترقی، معیار حیات کے بلند ہوجانے سے گھٹ جاتی ہے۔ مالتھس نے یہ نہیں سمجھا کہ اس کے "اجباری" اور "امتناعی" "موانع" کے علاوہ، آبادی کی ترقی روکنے کا ایک تیسرا سبب بھی ہوسکتا ہے، جو معیار راحت کے بلند ہوجانے سے پیدا ہوتا ہو۔ مگر اس جگہ ہنری جارج آبادی کے "موانع" کی ضرورت تسلیم کرکے، مالتھس کا طرفدار ہوجاتا ہے اس کے بعد، ہنری جارج، ایک پرانی انگریزی ضرب المثل کو اپنی کتاب میں درج کرتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ امراء کے لئے ان کی خوش قسمتی اور غرباء کے لئے ان کی اولاد۔ اور اس سلسلہ میں آدم اسمتھ کی وساطت سے اسکاٹ لینڈ کی ایسی عورتوں کا تذکرہ کرتا ہے جن کا وجود وہاں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں سمجھا جاتا، جو باوجود نیم گرسنگی ۲۳-۲۴ بیس چوبیس بچوں کی ماں ہوتی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ افلاس سے "اہلیت پیدا اوار اولاد" کم نہیں ہوتی۔ پھر وہ اس قانون کو پیش کرتا ہے جسے وہ اصلی قانون، اضافہ آبادی کا سمجھتا ہے:-

اضافہ کی طرف میلان، ہر جگہ یکساں ہونے کی بجائے، ان جگہوں پر زیادہ طاقتور ہوتا ہے جہاں ایک کثیر آبادی کے ذریعہ سے آرام کے زیادہ امکانات پیدا ہوجاتے ہیں اور جہاں نسل کے دوام کو، ناموافق حالات کی بنا پر، کثرت اموات کی وجہ سے، معدوم ہوجانے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ لیکن یہ میلان کم زور ہوتا جاتا ہے جب افراد کی اعلیٰ ترقی کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں اور نسل کا دوام یقینی ہوجاتا ہے۔"

راسخ العقیدہ ماہران اقتصادیات نے، رکارڈو سے لیکر جیونس تک برابر مالتھس کو حرف بہ حرف قبول کیا لیکن جو نظریے آبادی کے متعلق، بعد کے ماہران اقتصادیات نے پیش کئے وہ مالتھس کے خیالات سے مختلف تھے۔ علاوہ ازیں ان کے خیالات، اس قدر ایک دوسرے سے مشترک ہیں کہ ہم انھیں یکجائی طور پر "متضادین" کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں۔ ان لوگوں نے انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز کے زمانہ میں اپنی تصانیف مرتب کیں۔ اس لئے انھوں نے کہا کہ مالتھس کے نتائج اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق صحیح تھے مگر دولت کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے اس کے اصول کو اپنی تیز رو میں بہا ڈالا ہے۔ صنعت و تجارت کو ہر جگہ فتح حاصل

ہوگئی ہے۔ مشینری اور نئی صدی کے دوسرے کارناموں نے، انسانی زندگی کو بہتر بنانے کے اس قدر مواقع پیدا کر دیئے ہیں کہ اب کشمکش حیات کا بوجھ بالکل محسوس نہ ہونا چاہئے۔ ہم ان لوگوں کا تذکرہ فرداً فرداً کرتے ہیں۔

پنسلوانیا یونیورسٹی کے پروفیسر پیٹن (Patten) نے اپنی کتاب "تہذیب کی نئی بنیاد" میں اپنے عہد کی صنعتی زندگی کو دیکھکر، مستقبل کے لئے بہت خوشگوار پیشین گوئیاں کیں۔ امریکہ میں، نئی صدی کا خیر مقدم، جن متفاول جذبات کے ساتھ کیا گیا تھا اُس کا عکس پوری طرح اس کی تصنیف میں نظر آتا ہے۔

پھر یہ تفاول، امریکہ کے صرف ایک صوبہ تک ہی محدود نہ رہا۔ بلکہ اس کی صدائے بازگشت، کمی یا بیشی کے ساتھ انگلستان میں پروفیسر مارشل، سویڈن میں پروفیسر کیسل، ہالینڈ میں ڈاکٹر پیرسن، فرانس میں، پروفیسر لیوسیور اور اٹلی میں سینیر نٹی کی تصانیف میں سنائی دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ بیسویں صدی کے آغاز کے وقت، یہ صدا مہذب دنیا کے گوشہ گوشہ میں سنائی دیتی ہے۔ کیمبرج کے پروفیسر رائٹ کے الفاظ میں ہم اس وقت کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچ سکتے ہیں:۔

"معیار حیات، مائل بہ ترقی تھا۔ اسباب حیات کی قیمتیں، زوال پذیر تھیں۔ انسان کی فتح، فطرت پر، مکمل معلوم ہوتی تھی۔ اسوقت مغربی یورپ میں، باوجود مل اور جیونس کی انتباہی آوازوں کے، نسل انسان کی مادی اور روحانی تکمیل کے متعلق، عام طور پر سب لوگ کامل ایمان رکھتے تھے۔ مالتھس اور اُس کا "نظریۂ آبادی" رکارڈو اور اس کا "قانون تقلیل حاصل"۔ دونوں بدنام اور متروک ہو چکے تھے"

پروفیسر آر۔ ٹی۔ الائی کا خیال ہے کہ گو یہ صحیح ہے کہ آبادی جب کبھی اُسے موقع ملتا ہے بڑھ جاتی ہے مگر مالتھس کا نظریہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جس تیزی سے دولت میں اضافہ ہوا ہے آبادی میں اضافہ نہیں ہوا۔ سرمایہ داری اور جدید صنعت نے دنیا میں ایک مشین سے بنی ہوئی جنت کو پیدا کر دیا ہے۔ لیکن آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ آبادی میں اضافہ، دولت کے اضافہ کے مطابق اور معیار حیات کی ترقی کے برعکس ہوتا ہے یعنی دولت کے اضافہ کا تو یہ تقاضا ہوتا ہے کہ آبادی کو بڑھایا جائے مگر معیار حیات میں اگر ترقی ہو جائے تو آبادی کا بڑھنا لازمی نہیں ہے۔ اخیر میں وہ یہ کہتا ہے کہ "اگر گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں آبادی میں اضافہ نہ ہوا ہوتا تو مزدوروں کی اہلیت پیدا وار میں آج بہت اضافہ نظر آتا اور اسی نسبت سے ان کی اجرت بھی بڑھی ہوئی ہوتی"۔

پروفیسر ایف۔ ڈبلو۔ ٹاسگ، مالتھس کے اصول کو انتہائی شکل میں پیش کرنے کے بعد، اُسے مسترد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر فی الحقیقت وہ آگے چل کر، اپنے تمام دیگر ہم عصر اقتصادئین کے مقابلہ میں، مالتھس کے اصول کے بہت نزدیک پہنچ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اولاد کے روکنے کی کوششوں سے، جو سب سے پہلے مہذب جماعتوں میں اپنا عمل شروع کرتی ہیں اور اولاد کی کمی اور نسل کی کمزوری کا سبب ہوتی ہیں وہ ضرور خائف معلوم ہوتا ہے

لیکن اُس کا خیال ہے کہ اگر "عنان گیری ولادت" (Birth Control.) کا اصول رفتہ رفتہ پھیلا یا جائے تو اس سے آبادی پر اس درجہ قدرت حاصل ہوجائیگی کہ افلاس، مصیبت اور بدکاری مائل بہ فنا ہوجائیں گے۔

پیٹن، الائی، ٹاسگ، سلیگمین اور دوسرے امریکن اقتصادیین سب اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ تہذیب کی مشین نے، انسان کو اس بلند سطح پر پہنچا دیا ہے جہاں آبادی میں تبدیلیاں، مالتھس کے اصول کے مطابق نہیں ہوتیں۔

برطانوی اقتصادیین کا سردار، پروفیسر مارشل کہتا ہے کہ "جدید مشنیری نے، انسان کے کاندھے سے، مالتھس کے اصول کا بوجھل جوا، اتار کر پھینک دیا ہے۔ انیسویں صدی کے شروع نصف میں، انگلستان کے اقتصادیین کا اضافۂ آبادی کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ اس کا میلان ہمیشہ ذرائع حیات سے متجاوز ہوجانے کی طرف رہتا ہے ان کا یہ بیان مبالغہ سے پُر تھا۔ لیکن اس کے لئے، ہمیں مالتھس کو معذور سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ اگروہ خشکی اور سمندر کے دُخانی ذرایع آمد و رفت کی اُن ترقیوں کو، جن کی وجہ سے موجودہ نسل کے انگریز، دنیا کے زرخیز ترین ممالک کی پیداوار کو، نہایت کم صرف کے ساتھ اپنے ملک میں حاصل کر سکتے ہیں، سمجھنے سے قاصر رہا۔ تو یہ اس کا قصور نہ تھا۔ یہاں تک تو مارشل ابتدائی بیسویں صدی میں جو تفاول کی لہر جاری تھی اس سے پوری طرح متاثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ ٹاسگ کی طرح، اپنے بیان میں تھوڑی ترمیم کرتا ہے۔ ٹاسگ کا تو یہ خیال تھا کہ مالتھس کا اصول صرف ان لوگوں کی حالت پر منطبق کیا جا سکتا ہے جو گرسنگی کی سطح پر ہوتے ہیں مگر ان لوگوں میں جو زیادہ خوش قسمت ہوتے ہیں، اس کا عمل محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مارشل کا یہ خیال ہے کہ اس اصول کا اطلاق، صرف غیر مہذب قوموں پر ہو سکتا ہے اور مغربی مہذب اقوام، اس کے عمل سے محفوظ ہیں۔ جیسے جیسے مادی راحت و آرام کے مغربی معیار اقتصادی حیثیت سے پست اقوام میں پھیلیں گے، ان اقوام کی آبادیوں کی تعداد گھٹتی رہیگی اور اگر اُن کی آبادیاں برابر بڑھتی رہیں تو وہ کبھی مغربی معیار حیات تک نہ پہنچ سکیں گی۔

ایم۔ سیواسیر، فرانسیسی متفاول اقتصادیین میں سے ہے مشینری اور بجلی کی قوت کی سحر کاریوں سے متاثر ہوکر، وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ رکارڈو کے "نظریہ تقلیل حاصل" پر، موجودہ حالات کی روشنی میں، نظر ثانی کی ضرورت ہوگئی ہے۔ بلکہ مشین اور بجلی نے اُس کو بالکل متروک کر دیا ہے۔ سائنس اور اس کے نئے علم الکیمیا، المونیم اور دریا کے مدوجزر سے فوائد حاصل کرنے کے امکانات نے، نسل انسان کے لئے، ایک غیر محدود مدت کے لئے اچھی زندگی کے امکانات کو بالکل یقینی کر دیا ہے۔ اُس کی تصنیف میں امریکہ کی متفاول

فلسفہ کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

اسٹاک ہوم یونیورسٹی کے پروفیسر کیسل نے اپنی پوری کتاب "سوشل اکانمی" میں، ایک لفظ بھی مسئلہ آبادی اور مالتھس کے متعلق نہیں لکھا ہے۔ مگر پروفیسر کیسل قدیم تجارتیین (Mercantilists) کا ہم خیال معلوم ہوتا ہے اور کثرت آبادی کو اضافہ دولت پر منحصر نہیں سمجھتا بلکہ اضافہ دولت کو خود کثرت آبادی کا نتیجہ باور کرتا ہے۔ لیکن بعد میں، رکارڈو کے "نظریہ لگان" اور اجرت کے آہنی قانون" کا تذکرہ کرتے ہوئے مالتھس کی تجویز سے پوری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

اٹلی کے ماہر اقتصادیات مدبر، الیف۔ ایس نٹی کے تفاول میں، اعتدال نظر آتا ہے۔ مختصر الفاظ میں، اُس کا نظریہ یہ ہے کہ انسانوں میں اضافہ آبادی، بالکل ذرائع حیات کے مطابق ہوتا ہے۔ نٹی کا عقیدہ ہے کہ آبادی کا دباؤ، اسباب حیات پر تقسیم دولت سے عوام کے مستفید ہونے، منڈیوں کے بین الاقوامی ہوجانے اور انسانوں کی اولاد پیدا کرنے کی قوت میں فطری طور پر کمی پیدا ہوجانے سے، بہت کم ہوگیا ہے۔

پروفیسر جیڈ کا بھی نٹی اور اسپنسر کی طرح یہ خیال ہے کہ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ، انسان کی اولاد پیدا کرنے کی اہمیت میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ ایک حقیقی حیاتیاتی تبدیلی انسانی اعضا میں، رونما ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے اولاد کی تعداد محدود ہوجاتی ہے اور مالتھس کے نظریہ اضافہ آبادی کی تردید ہوجاتی ہے۔ یورپین اور امریکن اقتصادئین میں یہی چیز مابہ الامتیاز ہے۔ یورپین اقتصادئین، حیاتیاتی تبدیلی پر زور دیتے ہیں اور امریکن محض اقتصادی امور کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ لیکن دونوں اپنے نتایج میں تفاول سے کام لیتے ہیں۔

ہالینڈ کا ڈاکٹر پیرسن، ایک دوسرے ماہر اقتصادیات لراے بولیو کی طرح، نیو مالتھیوزم یعنی طریقہ ہائے مانع اولاد کا حامی معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جنسی جذبات کو ضبط کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسلئے مانع اولاد ذرائع کا استعمال کرنا چاہئے۔ اس کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ اگر مزدور پیشہ لوگ، متمول لوگوں کی سطح پر، کسی تدبیر سے لے آئے جائیں تو ان میں صغرسنی کی شادیوں اور اولاد کی کثرت کا تدارک ہوجائے۔ مگر چونکہ کمسنی کی شادی اور کثرت اولاد کے تدارک سے ہی ان کی حالت بہتر بنائی جاسکتی ہے اس لئے جس نتیجہ کو ہم حاصل کرنا چاہ رہے ہیں اُسے سبب کیسے بناسکتے ہیں۔ اور معیار حیات کی بلندی کا مانع، مزدور پیشہ جماعت کی موجودہ حالت میں کس طرح قابل عمل ہوسکتا ہے۔ جو چیز اس وقت موثر ثابت ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اخلاقی ضبط اور مانع اولاد طریقوں کو مزدور پیشہ جماعت میں عام طور پر پھیلایا جائے اخلاقی ضبط، تجرد کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن جو قوت، دو مختلف جنسوں کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہے وہ عام طور پر، (ذلیل خواہشات اور جذبات سے قطع نظر کرکے) اس قدر شدید ہوتی ہے کہ کسی قسم کا وعظ و پند، اس کے دبانے میں کامیاب

نہیں ہوسکتا۔ شادی کی لذتوں سے صرف اس لئے کنارہ کش ہوجانا کہ اس میں اندیشہ اولاد کی کثرت کا ہے جس کی وجہ سے معیار حیات کو پست کرنا پڑے گا، مہذب اور شائستہ لوگوں کے ہی امکان میں ہے مگر عام لوگوں کے لئے زیادہ تر نیو مالتھیوزم کے اصول ہی مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ یہ تجرد کی تعلیم نہیں دیتے اور نہ ضبط نفس کے لئے لوگوں کو بہت زیادہ مجبور کرتے ہیں۔ اسی کے فوائد جاہل ترین آدمی سمجھ سکتا ہے کیونکہ اس سے خاندان کی تعداد میں وہ اضافہ رک جاتا ہے جس سے شادی کے چند دن بعد سے ہی میاں بیوی دونوں کی زندگی کی مسرتیں ضائع ہونے لگتی ہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے کے اقتصادیین کے اعتراضات اور نظریے ہم یہاں ختم کرتے ہیں اور اب جنگ عظیم کے بعد کے اقتصادیین کے نظریے پیش کرتے ہیں۔

جنگ عظیم کے بعد کے اقتصادیین کے اعتراضات و نظریے

جنگ عظیم کے بعد جن لوگوں نے اعتراضات اور نظریے پیش کئے اُن میں متفاول فلسفی کم اور متشائم زیادہ ہیں متشائم فلسفیوں میں سب سے زیادہ اہمیت، پروفیسر ای۔ ایم۔ ایسٹ کو حاصل ہے۔ یہ مالتھس کا مکمل پیرو معلوم ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بعض باتوں میں بڑھا ہوا ہے۔ غذا کی مقدار کو "ایسٹ" اضافۂ آبادی کے لئے نہ صرف آخری مانع باور کرتا ہے بلکہ اُسے ابتدائی اور فوری مانع کا مرتبہ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک زمین کی تمام خالی جگہیں پُر ہوتی جارہی ہیں اور قابل کاشت زمین سے انتہائی پیداوار حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ علاوہ ازیں اس کا یہ خیال ہے کہ انسانی فطرت میں اس وقت بھی کوئی تبدیلی پیدا ہونے کی اُمید نہیں ہے جب دنیا کی تمام زمینوں سے انتہائی پیداوار حاصل کی جانے لگے گی۔ زندہ اور باقی رہنے کی کشاکش، یہ ہوسکتا ہے کہ ایک حد تک اعلیٰ اور ارفع شکل اختیار کرلے مگر ہر چیز کی قربانی کرکے، زندہ رہنے کی جو تمنا ہے وہ انسان کی ابتدائی خصوصیت ہے اور جوں جوں مشکلات کا زیادہ مقابلہ کرنا پڑے گا اسی قدر یہ تمنا تیز تر ہوتی جائیگی۔ بدترین شکلوں میں، اس کی وجہ سے گذشتہ جنگ عظیم جیسی کوئی ہولناک مصیبت دنیا پر نازل ہوگی ورنہ یہ اقتصادی کشاکش کی صورت میں برابر دنیا پر مسلط رہیگی اور نتائج کے اعتبار سے اتنی ہی مہلک ہوگی جتنی کہ گذشتہ جنگ عظیم

اس قدر بیان کرنے کے بعد، پروفیسر ایسٹ اس مرض کا علاج تجویز کرتا ہے لیکن علاج تجویز کرنے میں وہ مالتھس سے اختلاف کرتا ہے۔ وہ مکمل طور پر ولادت کی عناں گیری" کا حامی ہے۔ اور کہتا ہے کہ زائد از ضرورت آبادی سے نجات اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ ہم غذا کے حدود تک پہنچنے سے پیشتر ہی آبادی

کے اضافہ کو روک دیں۔ اور اس کا طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ قصداً اور ارادۃً "اہلیت پیدا وار اولاد" کو قابو میں رکھا جائے۔ غذا میں اضافہ کی کوششوں سے محض عارضی نفع حاصل ہوسکتا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اس کو فوراً ضائع کر دیتی ہے۔ اخیر میں 'دنیا' صرف ایک محدود تعداد کی کفیل ہوسکتی ہے۔ برتن میں ربڑ کی طرح پھیلنے کی اہلیت ہے لیکن پھر بھی یہ بند منھ کا برتن ہے۔ اور ایک مقررہ مقدار سے زیادہ اس میں چیزیں نہیں سما سکتیں۔ پیش بینی، کفایت شعاری اور اہلیت کارکردگی میں ترقی، صرف اس صورت میں' جب کہ تعداد قائم رہے' اضافۂ مسرت کا سبب ہوسکتے ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر ایسٹ متنبہ کرتا ہے کہ زائد از ضرورت آبادی اور اس کی وجہ سے تباہی و غارتگری سے ہم روز بروز نزدیک ہوتے جا رہے ہیں اور علاج کے طور پر وہ "ولادت کی عناں گیری" کی طرف سب کو مائل کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی طرف سے بھی اُسے مایوسی ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ دنیا اس علاج کا استعمال' وقت نکل جانے کے بعد کرے گی اور تباہی و مصیبت سے اُسے نجات نہ مل سکے گی۔ اس غرض کے حصول کے لئے وہ چاہتا ہے کہ حکومت کی طرف سے "ولادت کی عناں گیری" کے لئے ایک قانون بنا دیا جائے اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے۔ پروفیسر ایسٹ کے نزدیک' افزائش نسل کا "بالقوۃ نرخ" (Potential rate of Increase.) کم از کم ۶۰ فی ہزار سالانہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر یورپ کے کسی ملک میں حتیٰ کہ روس کے بعید ترین صوبوں کے کسانوں میں بھی یہ نرخ' کہیں چالیس فی صدی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "ولادت کی عنان گیری" پر عمل ہو رہا ہے اور اس لحاظ سے ایسٹ کے اندیشے بے بنیاد ہیں۔

ایسٹ کے علاوہ پرل نے بھی نظریہ آبادی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مگر اس کے طریقہ بیان میں' حساب و اقلیدس کی اصطلاحیں بہت ہیں جس کی وجہ سے یہاں اُس کے نظریے کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر اس کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اضافہ آبادی کو' آبادی کی کثرت سے ایک منفی نسبت حاصل ہے یعنی اگر آبادی میں کثرت ہوجائے تو اضافہ کی مقدار میں خود بخود کمی ہوجائیگی۔ اس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اضافہ کی مقدار میں خود بخود کمی قدرتی اسباب کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ اس کا سبب غذا' ہوا' روشنی کی قلت اور نقل و حرکت کی مشکلات وغیرہ ہوتی ہیں۔

لورپول کے پروفیسر اے۔ ایم۔ کار سانڈرس نے بھی مسئلہ آبادی کے متعلق ایک جامع و مانع حل پیش کیا ہے وہ آبادی کی کیفیت اور کمیت دونوں سے بحث کرتے ہیں۔ انھوں نے (Optimum number) "متوازن تعداد آبادی" کے تخیل کو پیش کرکے' مسئلہ کے ایک اچھوتے پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ہرچند اس قسم کا تخیل افلاطون کی "جمہوریت" میں بھی ملتا ہے جہاں اُس نے ایک شہری حکومت کی مناسب تعداد پانچ ہزار چالیس

افراد بتلائے ہیں۔ اور یہ خیال اس کے بعد بھی لوگوں کے ذہن میں رہا ہے۔ مگر مکمل نظریہ کی شکل میں پیش کرنے کا سہرا سانڈرس کے ہی سر ہے۔ "متوازن تعداد" سے اُس کی مراد، اس قدر آبادی ہے جس کے ذریعہ سے رائج الوقت طریقۂ تنظیم صنعت میں زیادہ سے زیادہ دولت فی کس پیدا کی جاسکے۔ یہ تعداد ہمیشہ کے لئے مقرر نہیں کی جاسکتی بلکہ مختلف حالات کے ماتحت بدلتی رہتی ہے۔ آبادی کی کیفیت کا اس "متوازن تعداد" کے معیار سے تعین کیا جاسکتا ہے اور "کمیت" کو مندرجہ بالا "کیفیت" کے مطابق بنانے کے لئے وہ ولادت کی عناں گیری کی تجویز پیش کرتا ہے۔

مسٹر بے۔ سوئنبرن نے بھی آبادی کے متعلق اپنے فلسفہ کا اظہار اپنی کتاب "آبادی اور مسئلہ اجتماعی" میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ لوگ دنیا کی پریشانیوں کے اصلی سبب یعنی زائد از ضرورت آبادی کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوتے۔ جب تک اس کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جائے گی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ حکومتوں میں تبدیلی، محض بے کار ہے۔ سرمایہ اور مزدور کے تعلقات میں انقلاب پیدا کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ صنعت کی ترقی بے سود ہے۔ اس قسم کی جس قدر تبدیلیاں ہوتی ہیں اور جنھیں ترقی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ان کی وجہ سے، کچھ زیادہ آبادی کے لئے، نسبتاً بہتر مواقع، آرام پانے اور مصیبت سے بچنے کے پیدا ہوجاتے ہیں۔ مگر انسانی مصیبتوں میں، بصورت مجموعی، ان کی وجہ سے کوئی تخفیف نہیں ہوتی۔ مگر اب اُمید کی روشنی نظر آرہی ہے اور مسئلہ کا حل پیدا ہونے والا ہے۔ چار ہزار سال یا اس سے زیادہ کے بعد، صرف گذشتہ ایک صدی کے عرصہ میں یہ تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ تقریباً ۷۰ سال سے خاندانوں کو محدود رکھنے کی تحریک پر عمل کیا جارہا ہے۔ اس کی ابتدا، متوسط طبقہ سے ہوئی اور اب یہ امیروں اور غریبوں دونوں میں پھیلتا جارہا ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ اس قدر پھیل جائے گا کہ سوسائٹی کے موجودہ تعلقات میں انقلاب رونما ہوجائیگا۔ انسان نے جس قدر انکشافات کئے ہیں، اُن میں سب سے زیادہ اہم اول تو یہ انکشاف ہے کہ اولاد کی تعداد محدود رہنا چاہئے اور دوسرا انکشاف اس مقصد کے حصول کے ذرائع و طریقے ہیں۔

پروفیسر کینس کو، جنگ کے بعد کے اقتصادئین میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ پروفیسر کینس جہانتک مستقبل قریب کا تعلق ہے، امریکہ کے متفاولی اقتصادئین کے ہم خیال ہیں مگر مستقبل بعید کے متعلق وہ خائف ہیں اُن کا خیال ہے کہ "قانون تقلیل حاصل" اب متروک ہوگیا ہے۔ کیونکہ اب صنعت و زراعت دونوں سے، محنت و سرمایہ کے ہر اضافہ کے بعد زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے مگر مطلع پر بادلوں کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ جنگ سے قبل ہی یہ خطرناک حد تک بڑھنا شروع ہوگئی تھی اور آج یورپ کے ہر ملک میں آبادی بہت کثیر نظر آتی ہے۔ یہ آبادی نسبتاً ایک بلند معیار پر زندگی بسر کرنے کی عادی ہے اور اس حالت

میں بھی آبادی کے بعض طبقات "تنزل کی جگہ ترقی کی توقع رکھتے ہیں۔ کینس، معیار حیات کی بلندی کو، کثرت آبادی کا ایک موثر مانع خیال کرتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ آبادیوں میں تبدیلی، معیار حیات کی تبدیلی کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس کے بعد، کینس، تشائم خیالات کا اظہار کرتا ہے: وہ کہتا ہے کہ زائد از ضرورت آبادیوں کے لئے اب یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ہجرت کر کے کسی ایسے دوسرے ملک میں چلی جائیں جو اُن کا خیر مقدم کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ اس لئے ہمارے سامنے معیار حیات کی پستی کا خطرہ ہمیشہ موجود ہے۔ جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ اگر آبادی کے اضافہ کو نہ روکا گیا تو لوگوں کی مالی حالت ضرور پست ہو جائیگی۔

پروفیسر کینس کے ہم عصر، مسٹر ہیرلڈ رائٹ کا بھی قریب قریب وہی خیال ہے جو پروفیسر کینس کا ہے۔ لیکن انھوں نے اس مسئلہ کی زیادہ وضاحت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر چند یہ صحیح ہے کہ عارضی طور پر انیسویں صدی کی سرمایہ دارانہ تنظیم صنعت نے، مالتھس کے نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ مگر پھر بھی ہمیں اس کی صداقت کا آخر میں، ضرور اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ انسان ہمیشہ مالتھس کے نظریہ سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اُس کی تمام مساعی کبھی بھی اس بات میں کامیاب نہیں ہوئیں کہ جس قدر اولاد پیدا ہوتی ہے اُس کے ایک حقیر حصہ کی پرورش سے زیادہ زمین سے غذا حاصل کر سکیں۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ کچھوا، خرگوش سے کبھی بازی نہیں جیت سکتا، ابتدائی انسان نے اس بات کی انتہائی کوشش شروع کر دی کہ کسی نہ کسی طرح، خرگوش کو سو جانے کے لئے راضی کرلے اس کا ثبوت ہمیں اس بات میں ملتا ہے کہ ابتدائی انسان ہر جگہ اسقاط حمل، طفل کشی، یا مباشرت سے طویل اجتناب کے موثر موانع میں سے ایک نہ ایک پر عمل کرتا ہوا پایا گیا ہے۔ مسئلہ آبادی کے دو ہی حل ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ پیداوار میں اضافہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اولاد کی پیدائش کو کم کیا جائے۔ دنیا کی زندگی کو قابل برداشت بنانے کے لئے دونوں طریقوں کا استعمال ضروری ہے۔

اب ہم مسئلہ آبادی کے متعلق جس قدر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے اُسے ختم کرتے ہیں اور ابھی مسئلہ کے متعلق اپنے نتائج پیش کرتے ہیں۔ سب سے اول ہم اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ آبادی کی غیر محدود وسعت انسانی ترقی کی راہ میں سخت ترین رکاوٹ ہے جس کے روکنے کے لئے "ولادت کی عناں گیری" نہایت ضروری ہے بغیر اس کے کسی مستقبل ترقی کا امکان پیدا نہیں ہو سکتا۔ جہاں اخلاقی ضبط ممکن ہو، وہاں اخلاقی ضبط سے ورنہ دیگر موانع اولاد سے، آبادی کی کمی کے مقصد کو حاصل کرنا چاہئے۔ معیار حیات کی ترقی سے بھی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کو ترقی دینا بھی ہمارا مطمح نظر ہونا چاہئے مگر "ولادت کی عناں گیری کے متعلق اس قدر

کہنے کے بعد، میں یہ ماننے کے لئے کبھی طیار نہیں ہوں کہ دنیا کی تمام موجودہ اقتصادی مشکلات و مصائب کا واحد سبب کثرت آبادی ہے۔ مالتھس اور اس کے رفقا نے، کثرت آبادی کو مبالغہ آمیز حد تک اہمیت دے دی ہے۔ کثرت آبادی موجودہ مصائب کا ایک سبب ضرور ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اور اسباب ہیں جن کے رفع کرنے سے، دنیا کے بے شمار مصائب کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک سبب موجودہ نظام سرمایہ داری اور غیر مساوی تقسیم دولت ہے کہ جن کی وجہ سے محنت کرنے والوں اور بے کار رہنے والوں کی دو جماعتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بے کار رہنے والے، سرمایہ اور زمیں پر اجارہ رکھتے ہیں اور کام کرنے والے، کٹ پتلی کی طرح اُن کے اشارہ چشم و ابرو پر ناچتے رہتے ہیں۔ اس اجارہ کی وجہ سے، محنت کرنے والوں سے وہ نہ صرف اپنے گذر اوقات کے ضروری سامان حاصل کرتے ہیں بلکہ انھیں مجبور کرتے ہیں کہ اُن کے ذاتی تعیشات اور وقتی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وہ، اپنا کثیر وقت ضائع کرتے رہیں۔ جس قدر سرمایہ اور ذہانت، بے دردی سے، اس طرح، چند افراد کی خاطر ضائع ہوتا ہے، اُس سے، محض موجودہ آلات صنعت اور سائنس کی ترقیوں کے ساتھ، سیکڑوں خانماں برباد خاندانوں کے لئے، ابتدائی ضرورت اور عام منفعت کی اشیاء بنائی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ، بین الاقوامی حرص آز، رشک و حسد، ہوس ملک گیری، اور جذبۂ شہنشاہیت ایسے اسباب ہیں، جنھوں نے تمام دنیا کی صنعت و تجارت کے توازن کو برباد کر دیا ہے۔ وسائل آمد و رفت و خبر رسانی کی ترقی کے ساتھ، قدرتی سرحدیں بیکار ہو گئی ہیں۔ مگر ان کی جگہ لینے کے لئے، زبردستی نئے موانع، امتناعی محاصل اور انتقال آبادی کے خلاف قوانین بنا کر پیدا کئے جاتے ہیں۔ قومیت کے سرد جذبات میں ہیجان برپا کیا جاتا ہے۔ خوف و عناد بھڑکایا جاتا ہے۔ سامان حرب کی تیاری اور فنون جنگ کی ترقی میں، قومی محنت، ذہانت اور سرمایہ ضائع کیا جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعمیر تہذیب کے وسائل کو ترقی دینے کی جگہ، ماہرین سائنس اور مدبرین سلطنت، اسباب تاخت و تاراج بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اب اگر جنگ کے امکانات، دنیا سے فنا ہو جائیں، اور قومی اور بین الاقوامی معاملات میں، انصاف، مساوات اور حریت کے اصول پر عمل ہونے لگے تو دنیا کے بہت سے مصائب کا ازالہ ہو جائے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اگر "تولید و تناسل کی عناں گیری" کا مطمح نظر بھی سامنے رہے تو اصلاح و تہذیب کی ترقی ایک مستقل شکل اختیار کر لے۔

محمد عاقل، ایم۔ اے (علیگ)

فتح

(افسانہ)

اس کا نام شاہزادی اجیتا تھا اور راجہ نارائن کے دربار کے شاعر نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن جب وہ کوئی نئی نظم راجہ کو سناتا تو اتنی بلند آواز سے گاتا کہ اس کے نغمے بالاخانہ کی چلمنوں کے پیچھے نادیدہ سامعین کے کانوں تک بھی پہونچ جاتے۔ وہ اپنے نغموں کو وہاں تک پہونچانا چاہتا تھا جہاں وہ خود نہ پہونچ سکتا تھا، یعنی اس تاروں بھری دنیا میں، جہاں اس کی قسمت کا تارہ حد نظر سے دور ایک حلقۂ نور کے اندر جگمگایا کرتا تھا۔

کبھی کبھی پردوں کے پیچھے اسے کوئی سایہ سا حرکت کرتا نظر آتا اور وہ اس سایہ کی رعنائی کو دیکھکر گھنٹوں محو حیرت رہتا کبھی دور سے چھم چھم کی آواز اس کے کانوں میں پہونچتی اور وہ ان خوبصورت ایڑیوں کا خواب دیکھنے لگتا جنپر پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے سنہرے گھونگھروؤں سے ہر ہر قدم پر بارش نغمہ ہوا کرتی ——— آہ وہ گلابی نازک پاؤں! شاعر نے انھیں اپنے دل کے مندر میں بسا لیا تھا جہاں اس کی روح ہر وقت دوزانو رہا کرتی تھی۔ لیکن باینہمہ وہ کبھی یہ نہ سمجھ سکا کہ پردوں کے پیچھے کس کا سایہ نظر آتا ہے اور وہ نازک ایڑیاں کس کی ہیں جن کے گھونگھروؤں کی صدا اس کے دل کی حرکت کو اپنا ہم آہنگ بنالیتی ہے۔

شاہزادی کی ایک کنیز جس کا نام منجری تھا، جب روز انہ دریا جاتے ہوئے شاعر کے گھر کے پاس سے گزرتی تو ایک آدھ بات شاعر سے بھی ضرور کر لیا کرتی اور جب سڑک سنسان ہوجاتی، شام کا دھندلکا زمین پر چھا جاتا، تو وہ چپکے سے اس کے مکان میں داخل ہوجاتی اور فرش کے ایک کونہ پر بیٹھ جایا کرتی تھی ——— بالوں میں عجیب انداز سے گندھے ہوئے پھول اور ہلکے رنگ کا نقاب جسپر افشاں کے ذرے چمکا کرتے، منجری کی وہ خصوصیت تھی جو کسی اور کنیز کو حاصل نہ تھی۔ لوگ اس پر مسکراتے اور سرگوشیاں کیا کرتے کیونکہ شاعر نے (جس کا نام شیکھر تھا) کبھی اس بات کے چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ یہ ملاقاتیں اس کے لئے بڑی مسرت کا باعث ہوا کرتی ہیں۔

منجری کے معنے "پھول کی ٹہنی" کے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ عام آدمیوں کے لئے اس نام میں یوں بھی کافی دلکشی پائی جاتی ہے، لیکن شاعر کچھ اضافہ کے ساتھ اسے "بہار کے پھولوں کی ٹہنی" کہا کرتا۔ لوگ سنتے اور کہتے "ہائے افسوس"!

شاعر، بہاریہ نظموں میں اس "بہار کے پھولوں کی ٹہنی" کا ذکر ضرور کرتا اور جب راجہ سنتا تو مسکراتا، اور

شاعر بھی جواباً مسکرا دیا کرتا۔

بادشاہ اس سے پوچھتا "کیا شہد کی مکھی کا صرف یہی کام ہے کہ بہار کے حضور میں بھنبھناتی رہے؟"
شاعر کہتا "نہیں، بلکہ بہار کے پھولوں کی ٹہنی کا شہد حاصل کرنا بھی اس کا کام ہے" اس پر راجہ کے درباری ہنس پڑتے۔ اور سنا گیا ہے کہ شاہزادی اجتیا بھی ہنسا کرتی کہ اس کی خادمہ اپنے نام کے ساتھ شاعر کا نام وابستہ ہو جانے پر خوش ہے۔

اسی طرح دنیا میں جھوٹ اور سچ مل جل جاتے ہیں اور خدا جو کچھ بناتا ہے آدمی اس میں اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کر دیتا ہے۔

شاعر کے نغموں میں صداقت تھی۔ اس کی نظموں کا موضوع "کرشن" اور اُن کی محبوبہ "رادھا" ازلی ابدی مرد و عورت تھے، یعنی وہ درد جو ابتدا سے ہے اور وہ خوشی جس کی انتہا نہیں۔ اس کے نغموں کی صداقت کا ہر شخص معترف تھا اور شاہ سے لیکر گدا تک اس کی عزت کرتا تھا۔ شاعر کی نظمیں زبان زد عام تھیں۔ چاند کی روشنی میں، بہار کی خوشگوار ہواؤں میں، کھڑکیوں سے، کشتیوں سے، عام گزرگاہوں پر، درختوں کے سایوں میں الغرض ہر جگہ اس کی نظمیں گائی جاتی تھیں۔

اسی طرح دن خوشی خوشی گزرتے گئے۔ شاعر اشعار گاتا، راجہ سنتا، لوگ واہ واہ کرتے، شاعر، بالاخانے کی چلمنوں کے پیچھے سایہ حرکت کرتا دیکھتا اور دور سے ننھے ننھے طلائی گھنگھروؤں کی آواز سنا کرتا......

اسی زمانہ میں ایک اور شاعر جنوب کی طرف سے راہ انمواوہ قلمرو امرپور میں راجہ نارائن کے دربار میں حاضر ہوا تخت کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے راجہ کی تعریف میں ایک شعر پڑھا۔ اور پنڈارک (یہی شاعر کا نام تھا) نے مغرورانہ انداز میں جواب دیا "مہاراج میں دربار کے شاعر سے مقابلہ چاہتا ہوں!"

راجہ کے دربار کا شاعر "شیکھر" نہ جانتا تھا کہ مقابلہ کس طرح ہوگا۔ رات بھر اسے نیند نہ آئی۔ مشہور و معروف "پنڈارک" کا بھاری بھر کم ڈیل ڈول اس کی کٹار کی سی مڑی ہوئی ناک اور اس کا بڑا اسر، رات کی تاریکی میں، اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا۔

کانپتے ہوئے دل کے ساتھ شیکھر دربار میں داخل ہوا چاروں طرف کرسیاں لوگوں سے پُر تھیں۔ شاعر نے اپنے حریف کا خیر مقدم سر جھکا کر ایک تبسم سے کیا۔ پنڈارک نے بھی اس کا جواب سر کے ایک ہلکی سی جنبش سے دیا اور ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنا چہرہ اپنے مداحوں کی طرف پھیر لیا۔

شیکھر نے اوپر بالاخانہ کی چلمنوں کی طرف نظر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا "اگر آج کے مقابلہ میں کامیاب

رہا تو اے میری ملکہ! تیرے ارجمند نام کی عظمت اور بڑھ جائے گی"

نوبت بجنے لگی۔ ہجوم "مہاراج کی جے" کا نعرہ لگاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ راجہ سفید لباس پہنے خزاں کے تیرتے ہوئے ابر کی طرح آہستہ آہستہ کمرہ میں داخل ہوا اور تخت پر بیٹھ گیا۔

پنڈارک کھڑا ہوا اور وسیع کمرہ میں بالکل خاموشی طاری ہو گئی۔ سر کو اوپر اُٹھاکر، سینہ پھیلاکر اپنی گرجتی ہوئی آواز میں اس نے راجہ نارائن کے مدح میں اشعار پڑھنا شروع کئے۔ اس کے الفاظ کمرہ کی دیواروں سے اس طرح ٹکراتے تھے جیسے سمندر کی لہریں ساحل کی چٹانوں سے، اور معلوم ہوتا تھا کہ سامعین کی پسلیوں سے انکا تصادم ہو کر کھڑ کھڑاہٹ پیدا ہو رہی ہے! جس ہشیاری سے اس نے نارائن کے نام کے مختلف معانی بیان کئے اور ہر ہر حرف کو جس انداز سے اس نے اپنے اشعار میں باندھا اس کو سنکر لوگ متعجب اور دم بخود ہو گئے۔

اس کے بیٹھ جانے کے کچھ دیر بعد تک بھی اس کی آواز ہزاروں خاموش دلوں اور دربار کے بے شمار ستونوں کے درمیان گونجتی رہی۔ فاضل پنڈت جو دور دراز ملکوں سے آئے تھے اپنے داہنے ہاتھ اٹھاکر چلائے "واہ واہ"!

راجہ نے شیکھر کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی اور شیکھر نے جواب میں اپنی دردمند آنکھیں ایک لمحہ کے لئے اپنے آقا کی طرف اُٹھائیں اور اس کے بعد زخمی ہرن کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور اس پر عورتوں کی سی شرم طاری تھی۔ اس کا لاغر، نازک بدن ایک ایسے ستار کے مانند تھا جس کے تار ضرورت سے زیادہ تنے ہوں اور صرف چھیڑنے کی دیر ہو۔

ابتدا میں اس کی آواز دھیمی تھی اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پہلے چند اشعار تو قریب قریب ناسموع تھے لیکن اس نے اپنا سر آہستہ آہستہ اُٹھایا اور اس کی صاف شیریں آواز لرزتے ہوئے شعلہ کی طرح آسمان کی طرف اُٹھنے لگی۔ اس نے شاہی خاندان کی ان پرانی روایات سے جو ماضی کی دھندلی فضا میں کھو گئے تھے ابتدا کی اور اپنے آقا کے آباؤ اجداد کی بہادری اور بے نظیر سخاوت کے کارناموں کا سلسلہ موجودہ عہد سے ملا دیا۔ اس نے راجہ کے چہرہ پر اپنی نگاہیں جما دیں اور شاہی خاندان کی محبت خوشبو کی طرح اس کے نغمہ سے نکلی اور تخت کے چاروں طرف پھیل گئی! جب وہ کانپتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھا تو یہی الفاظ اس کی زبان پر تھے "میرے آقا" میں الفاظ کے ہیر پھیر میں شکست کھا سکتا ہوں لیکن تیری محبت میں نہیں ہار سکتا!"

سامعین کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور سنگین دیواریں "فتح" کے نعروں سے گونج اُٹھیں!!

سر کی ایک پر شکوہ جنبش اور حقارت آمیز تبسم کے ساتھ عام جذبات کے جوش کی تضحیک کرتے ہوئے پنڈارک کھڑا ہو گیا اور مجمع کے سامنے اس نے یہ سوال پیش کیا کہ "الفاظ سے برتر دنیا میں کیا چیز ہے؟" اور یکایک کمرہ میں پھر سناٹا چھا گیا۔

شاعر بھی جواباً مسکرا دیا کرتا۔

بادشاہ اس سے پوچھتا "کیا شہد کی مکھی کا صرف یہی کام ہے کہ بہار کے حضور میں بھنبھناتی رہے؟"
شاعر کہتا "نہیں، بلکہ بہار کے پھولوں کی ٹہنی کا شہد حاصل کرنا بھی اس کا کام ہے" اس پر راجہ کے درباری ہنس پڑتے۔ اور سنا گیا ہے کہ شاہزادی اجنتا بھی ہنسا کرتی کہ اس کی خادمہ اپنے نام کے ساتھ شاعر کا نام وابستہ ہو جانے پر خوش ہے۔

اسی طرح دنیا میں جھوٹ اور سچ مل جل جاتے ہیں اور خدا جو کچھ بناتا ہے آدمی اس میں اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کر دیتا ہے۔

شاعر کے نغموں میں صداقت تھی۔ اس کی نظموں کا موضوع "کرشن" اور اُن کی محبوبہ "رادھا" ۔۔ ازلی ابدی مرد و عورت "۔ تھے، یعنی وہ درد جو ابتدا سے ہے اور وہ خوشی جس کی انتہا نہیں۔ اس کے نغموں کی صداقت کا ہر شخص معترف تھا اور شاہ سے لیکر گدا تک اس کی عزت کرتا تھا۔ شاعر کی نظمیں زبان زد عام تھیں۔ چاند کی روشنیوں میں، بہار کی خوشگوار ہواؤں میں، کھڑکیوں سے، کشتیوں سے، عام گزرگاہوں پر، درختوں کے سایوں میں الغرض ہر جگہ اس کی نظمیں گائی جاتی تھیں۔

اسی طرح دن خوشی خوشی گزرتے گئے۔ شاعر اشعار گاتا، راجہ سنتا، لوگ واہ واہ کرتے، شاعر بالاخانے کی چلمنوں کے پیچھے سایہ حرکت کرتا دیکھتا اور دور سے ننھے ننھے طلائی گھنگھروؤں کی آواز سنا کرتا ۔۔۔۔۔۔۔

اسی زمانہ میں ایک اور شاعر جنوب کی طرف سے روانہ ہوا وہ قلمرو امر پور میں راجہ نارائن کے دربار میں حاضر ہوا تخت کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے راجہ کی تعریف میں ایک شعر پڑھا۔ اور پنڈارک (یہی شاعر کا نام تھا) نے مغرورانہ انداز میں جواب دیا "مہاراج میں دربار کے شاعر سے مقابلہ چاہتا ہوں!"

راجہ کے دربار کا شاعر "شیکھر" نہ جانتا تھا کہ مقابلہ کس طرح ہوگا۔ رات بھر اسے نیند نہ آئی مشہور و معروف "پنڈارک" کا بھاری بھرکم ڈیل ڈول اس کی کٹار کی سی مڑی ہوئی ناک اور اس کا بڑا اسر، رات کی تاریکی میں، اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا۔

کانپتے ہوئے دل کے ساتھ شیکھر دربار میں داخل ہوا چاروں طرف کرسیاں لوگوں سے پُر تھیں، شاعر نے اپنے حریف کا خیر مقدم سر جھکا کر ایک تبسم سے کیا۔ پنڈارک نے بھی اس کا جواب سر کے ایک ہلکی سی جنبش سے دیا اور ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنا چہرہ اپنے مداحوں کی طرف پھیر لیا۔

شیکھر نے اوپر بالاخانہ کی چلمنوں کی طرف نظر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا "اگر آج کے مقابلہ میں کامیاب

رہا تو اے میری ملکہ! تیرے ارجمند نام کی عظمت اور بڑھ جائے گی"

نوبت بجنے لگی۔ ہجوم "مہاراج کی جے" کا نعرہ لگاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ راجہ سفید لباس پہنے خزاں کے تیرتے ہوئے ابر کی طرح آہستہ آہستہ کمرہ میں داخل ہوا اور تخت پر بیٹھ گیا۔

پنڈارک کھڑا ہوا اور وسیع کمرہ میں بالکل خاموشی طاری ہو گئی۔ سر کو اوپر اُٹھا کر، سینہ پھیلا کر اپنی گرجتی ہوئی آواز میں اس نے راجہ نارائن کے مدح میں اشعار پڑھنا شروع کئے۔ اس کے الفاظ کمرہ کی دیواروں سے اس طرح ٹکراتے تھے جیسے سمندر کی لہریں ساحل کی چٹانوں سے، اور معلوم ہوتا تھا کہ سامعین کی پسلیوں سے انکا تصادم ہو کر کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو رہی ہے! جس ہشیاری سے اس نے نارائن کے نام کے مختلف معانی بیان کئے اور ہر ہر حرف کو جس انداز سے اس نے اپنے اشعار میں باندھا اس کو سنکر لوگ متعجب اور دم بخود ہو گئے۔

اس کے بیٹھ جانے کے کچھ دیر بعد تک بھی اس کی آواز ہزاروں خاموش دلوں اور دربار کے بے شمار ستونوں کی درمیان گونجتی رہی۔ فاضل پنڈت جو دور دراز ملکوں سے آئے تھے اپنے داہنے ہاتھ اٹھا کر چلائے "واہ واہ"!

راجہ نے شیکھر کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی اور شیکھر نے جواب میں اپنی دردمند آنکھیں ایک لمحہ کے لئے اپنے آقا کی طرف اُٹھائیں اور اس کے بعد زخمی ہرن کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور اس پر عورتوں کی سی شرم طاری تھی۔ اس کا لاغر، نازک بدن، ایک ایسے ستار کے مانند تھا جس کے تار ضرورت سے زیادہ تنے ہوں اور صرف چھیڑنے کی دیر ہو۔

ابتدا میں اس کی آواز دھیمی تھی اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پہلے چند اشعار تو قریب قریب نامسموع تھے لیکن اس نے اپنا سر آہستہ آہستہ اُٹھایا اور اس کی صاف شیریں آواز لرزتے ہوئے شعلہ کی طرح آسمان کی طرف اُٹھنے لگی۔ اس نے شاہی خاندان کی ان پرانی روایات سے جو ماضی کی دھندلی فضا میں کھو گئے تھے ابتدا کی اور اپنے آقا کے آبا و اجداد کی بہادری اور بے نظیر سخاوت کے کارناموں کا سلسلہ موجودہ عہد سے ملا دیا۔ اس نے راجہ کے چہرہ پر اپنی نگاہیں جما دیں اور شاہی خاندان کی محبت خوشبو کی طرح اس کے نغمہ سے نکلی اور تخت کے چاروں طرف پھیل گئی! جب وہ کانپتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھا تو یہی الفاظ اس کی زبان پر تھے "میرے آقا" میں الفاظ کے ہیر پھیر میں شکست کھا سکتا ہوں لیکن تیری محبت میں نہیں ہار سکتا!"

سامعین کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور سنگین دیواریں "فتح" کے نعروں سے گونج اُٹھیں!!

سر کی ایک پر شکوہ جنبش اور حقارت آمیز تبسم کے ساتھ عام جذبات کے جوش کی تضحیک کرتے ہوئے پنڈارک کھڑا ہو گیا اور مجمع کے سامنے اس نے یہ سوال پیش کیا کہ "الفاظ سے بر تر دنیا میں کیا چیز ہے؟" اور یکایک کمرہ میں پھر سناٹا چھا گیا۔

اس کے بعد اپنی قابلیت کا معجزانہ اظہار کرتے ہوئے اس نے ثابت کر دیا کہ لفظ ہی ہر چیز کی ابتدا ہے، اُسنے شاستروں، اور دوسری مقدس کتابوں کے حوالوں اور اقتباسات کا ڈھیر لگا دیا اور اس طرح لفظ کو زمین و آسمان کی تمام چیزوں سے بلند ثابت کر دیا! ..... اور اپنی بلند آواز میں یہ سوال پھر دہرایا کہ لفظ سے برتر دنیا میں کیا چیز ہے؟ اس نے اپنے اردگرد متکبرانہ انداز سے دیکھا۔ کسی کو اس کے مقابل ہونے کی جرأت نہ ہوئی اور ایک ایسے شیر کے مانند جو اپنے شکار سے شکم سیر ہو چکا ہو بہ آہستگی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پنڈت پھر واہ واہ چلائے۔ راجہ حیرت سے خاموش تھا اور شیکھر شاعر اپنے آپ کو اس علم و فضل کے سامنے بالکل بے حقیقت محسوس کر رہا تھا مجلس دوسرے روز کے لئے برخاست ہوئی۔

دوسرے روز شیکھر نے اپنے نغمہ سے ابتدا کی جو اس واقعہ سے متعلق تھا جب پریم کی بانسری کے شیریں ترانے "بندرابن" کی خاموش فضا میں پہلے پہل لہرائے تھے اور عورتوں کو نہ معلوم تھا کہ بانسری کون بجا رہا ہے اور یہ راگ کہاں سے آ رہے ہیں۔ کبھی انھیں ایسا معلوم ہوتا کہ نغمے بادِ جنوب کے دوش پر سوار ان تک پہونچ رہے ہیں اور کبھی وہ یہ سمجھتیں کہ نغموں کا یہ چشمہ پہاڑ کی چوٹیوں پر تیرتے ہوئے ابر سے ابل پڑا ہے۔ یہ مشرق کے عاشقوں کے لئے پیام محبت لاتیں اور آہیں بنکر مغرب میں جا گرتیں! معلوم ہوتا تھا کہ راگ یکایک چاروں طرف سے ابل پڑا ہے میدانوں اور چمنوں میں، تاریک گلیوں اور ویران سڑکوں میں آسمان کی پھیلتی ہوئی نیلاہٹ میں جھلکدار سبز گھاس اور وسیع مرغزاروں میں راگ ہی راگ تھا.......... وہ نہ تو اس کے معنی سمجھتیں اور نہ انھیں اپنی دلی خواہشات کے اظہار کے لئے الفاظ ملتے! ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور انکی "زندگی" موت کی خواہشمند معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ اس درد و کرب اور خلش روحی سے نجات پا سکتی تھیں!......... شیکھر سامعین کو بھول چکا تھا۔ اسے اپنے حریف سے مقابلہ کا بھی کچھ خیال نہ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالات کے ہجوم میں "بانسری کے راگ" کا نغمہ گائے جا رہا تھا۔ اسوقت اس کے دماغ میں ایک ایسی مورت کا خیال تھا جو ایک سایہ سے صورت پذیر ہوئی تھی اور ان گھنگھروؤں کی آواز کا جو اُس کے دل و دماغ میں ہر وقت بسے رہتے تھے..........!!

وہ بیٹھ گیا سننے والے ایک ناقابل بیان مبہم مسرت کی کیفیت سے تھرتھرا رہے تھے اور وہ نعرۂ تحسین و آفریں بلند کرنا بھی بھول گئے۔ جب جذبات کا یہ تلاطم کچھ کم ہوا تو پنڈارک تخت کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے حریف سے کہا کہ وہ اس عاشق کی تعریف کرے اور بتلائے کہ وہ معشوقہ کون تھی اس نے اپنے چاروں طرف ایک پُرغرور نگاہ ڈالی، اپنے مداحوں کی طرف دیکھکر مسکرایا اور پھر دوبارہ سوال کیا "کرشن عاشق اور رادھا

مجبوبہ کون ہیں ؟"

تب اس نے خود ہی اُن ناموں کے مادہ کی تشریح کرنی شروع کی اور ان کے کئی کئی معنے بیان کئے۔ اُس نے اپنے متحیر سامعین کے سامنے کامل ہنرمندی کے ساتھ روحِ انسانی اور علم موجودات کے معموں کو بیان کیا پھر اُس نے ان ناموں کے ایک ایک حرف کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کیا اور اپنی بے پناہ منطق سے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے بالکل بے معنی کر دیا اور اس نے دوبارہ اس لفظ کو پیدا کرکے اس کا ایک ایسا نیا مفہوم بتایا جو کسی بڑے سے بڑے فاضل کے تصور میں بھی نہ آیا تھا۔

پنڈت وجد کے عالم میں تھے - وہ تحسین و آفریں کی صدا زور و شور سے بلند کر رہے تھے - اور مجمع بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کہ آج وہ اپنی آنکھوں سے سچائی کی آخری دھجیاں علم کی عجیب طاقت کے سامنے تار تار ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ہاں میں ہاں ملا رہے تھے - اس کے اس عقل فرسا کارنامے کو دیکھکر وہ اتنے خوش ہوئے کہ وہ یہ خیال کرنا بھی بھول گئے کہ آخر ان باتوں میں کچھ حقیقت بھی ہے ؟

راجہ دریائے حیرت میں غرق تھا - فضا موسیقی سے بالکل خالی ہو چکی تھی اردگرد کی خیالی تازگی اور سبزے کی جگہ پتھروں نے لے لی تھی - لوگوں کو اس دیو کے سامنے جو دنیائے الفاظ و خیالات میں ہر قدم پر مشکلات کو روندتا چلا جاتا تھا اپنا شاعر بالکل طفل مکتب معلوم ہونے لگا - انھیں اب پہلی مرتبہ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ شیکھر بالکل سیدھی سادھی نظمیں کہتا تھا۔

راجہ نے معنی خیز نگاہوں سے اپنے شاعر کو دیکھا اور اُسے آخری کوشش کے لئے آمادہ کرنا چاہا لیکن شیکھر نے کچھ خیال نہ کیا اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

راجہ ناراض ہو کر تخت سے نیچے آیا اور اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر پنڈت کے گلے میں ڈال دیا کمرہ مسرت کے نعروں سے گونج اٹھا - بالاخانہ سے کپڑوں کی سرسراہٹ اور سنہرے گھنگھروؤں کی ہلکی سی آواز آئی شیکھر اپنی جگہ سے اُٹھا ...... اور کمرہ سے باہر نکل گیا ....!

چاند زوال پر تھا، رات اندھیری تھی - شیکھر نے اپنی نظموں کے مسودے الماریوں سے نکال نکال کر زمین پر ڈھیر لگا دیئے ان میں سے بعض اس کی ابتدائی نظمیں تھیں جنھیں وہ تقریباً بھول چکا تھا - وہ اوراق الٹ رہا تھا اور کہیں کہیں بعض بعض نظمیں پڑھتا جا رہا تھا - اب یہ اسے بالکل بیکار معلوم ہوئیں - محض الفاظ اور طفلانہ خیالات کا مجموعہ !

اس نے ایک ایک کرکے اپنی کتابیں اور مسودے پرزے پرزے کر دیئے اور ان الفاظ کے ساتھ نہیں

نذرِ آتش کر دیا کہ "مجھ پر اور صرف مجھ پر اے حُسن! میں اپنا سب کچھ قربان کرتا ہوں! تیری آگ میرے سینہ میں بیکار سالوں تک بھڑکتی رہی۔ اگر میری زندگی سونا ہوتی تو اس آزمائش سے کندن بنکر نکلتی لیکن یہ روندی ہوئی گھاس ہے اور سوائے ایک مٹھی راکھ کے اب اس کی کوئی یادگار باقی نہیں رہی!"..........

رات بھیگتی گئی۔ شیکھر نے اپنے مکان کی کھڑکیاں کھولدیں۔ اس نے اپنے بستر پر ان سفید پھولوں کو جنھیں وہ پسند کرتا تھا بچھا دیا اور جس قدر چراغ اس کے پاس تھے ان کو لاکر اپنے کمرہ میں روشن کر دیا۔ اس کے بعد کسی زہریلی بوٹی کا عرق شہد میں ملاکر پی گیا..........اور بستر پر لیٹ گیا!..........

دروازے کے باہر سڑک پر سنہرے گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی ہوا کا ایک معطر جھونکا کمرے میں آیا۔

شاعر نے آنکھیں بند کئے ہوئے کہا "میری ملکہ، اپنے غلام پر ترس کھا کر اس سے آخری وقت ملنے آہی گئیں؟"

جواب ایک شیریں آواز میں سنائی دیا "ہاں میرے شاعر میں آگئی ہوں"

شاعر نے آنکھیں کھولدیں اور اپنے بستر کے قریب ایک لڑکی کو دیکھا۔ اس کی بینائی دھندھلی ہوگئی تھی اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مورت جس کی حقیقت صرف خیال پر مبنی تھی اور جواب سے قبل اس کے دل کے مندر میں پوشیدہ طور پر متمکن تھی اب اس کے آخری ساعت میں اس کو دیکھنے کے لئے باہر کی دنیا میں آگئی ہے ——

لڑکی نے کہا "میں شاہزادی اجیتا ہوں"

شاعر انتہائی کوشش کے بعد اپنے بستر پر اُٹھ بیٹھا۔

شاہزادی نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا "مہاراج نے تمھارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میرے شاعر مقابلہ میں تم ہی کامیاب رہے اور میں تمھارے سر "فتح" کا سہرا باندھنے آئی ہوں!"

اس نے پھولوں کا ہار اپنے گلے سے اتار کر اس کے سر پر رکھدیا۔ شاعر بستر پر گر پڑا اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی!.......... (ماخوذ)

ایم - زبیر احمد

شمیم کا دوسرا ایڈیشن عمدہ کاغذ پر دو ضخیم جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ رنگین تصاویر جو اسی ناول کے لئے صدہا روپیہ صرف کرکے تیار کی گئی ہیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ قیمت ہر دو حصہ للعہ علاوہ محصول ڈاک (فرمائش کے ساتھ ۱ار کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں)

ملنے کا پتہ: مینجر نگار لکھنؤ

فارسی زبان کی پیدائش پر ایک مؤرخانہ نظر

جس طرح امتزاج عناصر سے دنیا میں نئی نئی چیزیں پیدا ہو کر نشو و نما پاتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں اسی طرح دنیا میں قومیں بھی نشو و نما پا کر اوج اقبال پر پہونچتی ہیں اور مردہ ہو جاتی ہیں - پھر کچھ زمانہ بعد اُن کے عروج و زوال اور نکبت و اقبال کی تاریخ اساطیر الاولین بنجاتی ہے، ان کے باقیات آثار کہلانے لگتے ہیں - یہی حال مصریوں آشوریوں - فینیقیوں، کلدانیوں، اور بابل والوں کا ہوا - یہی کیفیت ایران کے اشکانیوں اور ساسانیوں پر گذری یہی حشر سندھ کے سامریوں اور باختر کے یونانیوں کا ہوا - اور یہی حادثہ ہندوستان اور افغانستان کے بدھ مت والوں پر گذرا -

اگر آج مصر میں وادی الملوک کے مقبرے - غزہ کے اہرام اور دار الشمس (ہیلیو پولیس) کے کھنڈر آل فرعون کے ماتمدار ہیں، تو قصر شیریں - رام ہرمزو - کرمانشاہ، خرابۂ شاپور وغیرہ کے آثار قدیمہ بھی تمدن ایران کی مرثیہ خوانی کر رہے ہیں، اور اگر طیسیفون - اور بابل کے خرابے آشوریوں اور بابلیوں کے نوحہ خواں ہیں، تو تکشاشیلا (ٹیکسلا) بامیاں (افغانستان) رومنجو دارو[1] (ہندوستان) اور پٹنہ وغیرہ کے آثار زمانۂ بوذیت کے ہند و تمدن کی عبرت خیز داستانیں بنے ہوئے ہیں - پُرانے کھنڈر کھودنے یا قدیم تعمیرات کے دیکھنے یا مندروں اور مقبروں سے جو کتبے برآمد ہوتے ہیں ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مردہ اقوام کا تمدن کس قدر اوج پر پہونچگیا تھا اور انھیں کتبوں اور نقوش سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ کیا بولتے تھے اور کس طرح لکھتے پڑھتے تھے - الغرض ہر قوم کی زبان کی تاریخ اس قوم کے عروج و زوال کی تاریخ سے وابستہ ہے - اس لئے آیئے آج کی صحبت میں اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے فارسی زبان کی پیدائش پر غور کریں لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مختصراً قدیم تاریخ ایران پر ایک نگاہ ڈال لی جائے -

وجہ تسمیہ ایران | علما کے نزدیک دنیا کی تمام نسلیں چار اقسام اور ان کی شاخوں پر مشتمل ہیں - (۱) آریا - (۲) سامی - (۳) منغول - (۴) حبشی -

---

[1] یہ ہندوستان میں سامری تمدن کا ایک مدفون خزانہ ہے - "رومن - جو - دارو" کے معنی "رومیوں کا گھر" ہیں - لفظ "جو" کے معنی سندھی زبان میں "کا" کے ہیں -

عرب، فلسطین، مصر اور شمالی افریقہ کی تمام قومیں سام بن نوح کی نسل سے متعلق ہونے کے باعث سامی کہلاتی ہیں - چین و ماچین - جاپان - تبت - منگولیا - منچوریا - کوریا کی قومیں مغلی نسل سے ہیں - افریقہ اور جزائر بحر جنوبی وغیرہ کی ژولیدہ مو اور سیاہ فام قومیں حبشی النسل ہیں مغربی یوروپ ایران اور شمالی ہندوستان کی قومیں آریا نسل سے ہیں - دنیا کی باقی قومیں انھیں چار نسلوں کے اختلاط باہمی سے پیدا ہوئی ہیں -

ایران والے آریا نسل سے ہیں اور اسی قوم آریا کی وجہ سے سرزمین رستم و اسفندیار کا نام "ایریان" یا "ایران" ہوا -

اس امر کے متعلق کہ قوم آریا کا اصلی گہوارہ کہاں تھا - کوئی قول فیصل[۵۱] نہیں ہے - بعض کا قول یہ ہے کہ آریا لوگ یا کم از کم وہ قوم جس نے ماقبل تاریخ ملک ایران پر متسلط ہو کر اس کو ایران کے نام سے موسوم کیا مصر سے آئی تھی - اور ایران سے اس قوم کی ایک شاخ بڑھتے بڑھتے ہندوستان پہونچی اور مصری تمدن اور مصری عقائد (گئو پوجا وغیرہ) اپنے ساتھ لیتی آئی - چنانچہ اب تک ہندوؤں کی ایک قوم نہایت فخر کے ساتھ خود کو "مصر یا مصرا" کہتی ہے اور اکثر برہمنوں کو "مصر جی" کے لقب سے پکارا جاتا ہے - علاوہ ازیں قدیم مصر اور ہندوستان کے اکثر نام بھی یکساں ہیں - مثلاً "رعمسیس" (یا رام آسیس) فرعون مصر - اور "رام" (رامائن کا مشہور ہیرو) دونوں میں "رام" موجود ہے - علاوہ ازیں "سیتی" فرعون مصر اور "سیتا" زوجہ رام دونوں کے ناموں کا مادہ ایک[۵۲] ہی ہے -

---

[۵۱] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کی تحقیق یہ ہے کہ قدیم ایرانی قوم مشرق سے آکر ایران میں آباد ہوئی - جس کا کافی ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ان کا ہندوستانیوں سے بہت گہرا تعلق تھا - اور دونوں ملکر ایک "واحد قوم" تھے جس کا نام "آریہ" تھا اس قوم کا اصلی وطن بحیرہ اسود اور بحیرہ خزر کے شمالی سواحلی میدان یعنی جنوب مشرقی روس تھا - وہاں سے وہ دشت قپچاق میں آئے اور پھر ترکستان ہوتے ہوئے دریائے جیحون و سیحون پار کرکے ایران پہونچے -

[۵۲] خط میخی یا پیکانی کی جو تحریریں مصر کے مقام تل العمرنہ (۱۴۰۰ ق م) برآمد ہوئی ہیں ان سے ملک شام اور فلسطین کے بعض حکمرانوں کے نام معلوم ہوئے ہیں، مثلاً ارتامانیا - ارزادیہ - شودروت - اور وادی فرات کے بعض راجاؤں کے نام بھی ارتاتما - ششترین - ارناشمرا - اور دشرت ہیں - واضح ہو کہ دشرتھ - دسرتھ یا جسرتھ سری رام چندجی کے والد کا بھی نام تھا -

لیکن زیادہ مقبول روایت یہی ہے کہ قوم آریا کا گہوارہ دراصل شمالی ایشیا تھا ۔ یہی قول تلک مہاراج کا انکی مشہور تصنیف "اوریون" میں درج ہے ۔ وسطی ایشیا سے نکلکر یہ قوم دو طرف چلی گئی ۔ ایک شاخ نے جانب مغرب خروج کیا اور مغربی یوروپ کی مورث اعلیٰ بنی ۔ اور دوسری شاخ جنوب مشرق کی طرف راہی ہوئی اور اس نے بحیرۂ عرب اور خلیج فارس کے شمالی سواحل کے ملک پر متسلط ہوکر اس کو اپنے نام سے "ایران" موسوم کیا ۔ اسی ایرانی شاخ نے بڑھتے بڑھتے جانب مغرب پیش قدمی کی اور دریائے[۵۱] "سندھو" کو عبور کرکے شمالی ہند پر قابض ہوگئی اور اس جدید مفتوحہ ملک کا نام اپنے نام پر "آریا ورت" رکھا ۔

قدیم حکمراں خاندان آریا قوم کا نظام تمدن ابطریقی قسم کا تھا ۔ یعنی یہ قوم مختلف قبائل پر مشتمل تھی ۔ ہر قبیلہ کا سردار یا بادشاہ اس قبیلہ کا سب سے بڑا بزرگ ہوا کرتا تھا ۔ اور گویا تمام قبیلہ ایک ہی دادا کی اولاد ہوتا تھا ۔ قبائل میں جو قبیلہ سب سے زیادہ صاحب حیثیت اور طاقتور ہوتا اوسی قبیلہ کا سردار جملہ قبائل کا شہنشاہ ہوتا تھا ۔ اور تمام قبیلے اسی کے جھنڈے تلے جمع ہوتے تھے ۔ روایات وقصص قدیم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایران میں پہلا حکمراں خاندان جو آریا نسل سے تھا وہ مہ آبادی کہلاتا تھا ۔ دوسرا خاندان پیشدادیوں کا ہوا اسکے بعد کیانیوں یا اشکانیوں کو عروج ہوا اور پھر ساسانیوں کو ۔ مہ آبادیوں کی تاریخ کا تو کوئی پتہ نہیں چلتا ۔ مگر پیشدادیوں کا کچھ کچھ حال پرانی کتابوں میں ملتا ہے ۔

گیامرت ہر قوم اپنے مورث اعلیٰ کا کچھ نہ کچھ نام بیان کرتی ہے ۔ زرتشتیوں کی مذہبی کتب میں ایران کے آدم اولین کا نام گیامرت بیان کیا گیا ہے ۔ یہی وہ شخص ہے جس کو عربی زبان میں "گیومرث" کہتے ہیں ۔ یہ شخص پیشدادیوں کا سب سے پہلا بادشاہ[۵۲] تھا ۔ اس زمانہ میں لوگ عام طور پر گنجان جنگلوں اور پہاڑوں کے غاروں میں رہا کرتے تھے شکار کردہ جانوروں کے گوشت پر بسر اوقات ہوتی تھی جانوروں کی کھالوں سے ستر پوشی کیجاتی تھی امرا اور بادشاہ شیر یا چیتے کی کھال پہنتے تھے مویشی پالنا اسی زمانہ سے شروع ہوا ۔ آریا قوم جو نئی نئی ایران میں آئی تھی اس ملک کے قدیم وحشی باشندوں سے جنگ

---

[۵۱] ایران کے لوگ خصوصاً پیروان زردشت سنسکرت کے حرف "س" کو ہمیشہ حرف "ہ" سے ادا کرتے تھے ۔ اس طرح لفظ "سندھو" (دریا) فارسی زبان میں "ہندو" بنگیا ۔ اور یونانیوں نے حرف "ہ" گرا کر اچھا خاصہ "ہند" کردیا ۔

[۵۲] شاہنامہ فردوسی کی روایت یہ ہے کہ قرنہا قرن گذرے اس کوہستانی علاقہ میں جو کوہ جودی کی برفپوش چوٹیوں کے گرد واقع ہے زمانہ قدیم میں سام بن نوح کی نسل سے ایک قوم رہتی تھی جس کا مستقر سرزمین "مادہ" تھا (انگریزی میڈیا Media) یعنی زمانہ حال کا ملک آذربائیجان ۔ یہ لوگ بہت جلد تنزل پذیر ہوکر وحشی وجاہل ہوگئے تھے ۔

کرتی رہتی تھی اور ان وحشی باشندوں کو آریہ قوم "دیو" کہتی تھی

ہوشنگ کیومرث کا بیٹا سیامک اس کا ولیعہد تھا - اس کا نام غالباً شیام مکھ ہوگا اور سانولا سلونا رنگ ہونے کی وجہ سے یہ نام ماں باپ نے پیار میں رکھدیا ہوگا - اسی قسم کے نام ہندؤں میں ابتک موجود ہیں - مثلاً شیام سروپ - شیام سندر وغیرہ - سیامک کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ دیوؤں کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا - غمزدہ باپ نے ۳۰ سال اور حکومت کی - اس کے بعد اس کا پوتا ہوشنگ تخت نشین ہوا - یہی وہ شخص ہے جسکو اہل عرب اوشنج کہتے ہیں - پتھر سے پتھر ٹکرا کر آگ جلانا اسی بادشاہ کے زمانہ میں معلوم ہوا تھا - جس روز آگ کا نکالنا معلوم ہوا اسی تاریخ سے جشن سدہ کی بنیاد پڑی اور اسی وقت سے آتش پرستی کی ابتدا ہوئی - اس نے ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام "جاودان خرد" ہے

تہمورس ہوشنگ کے بعد اس کا بیٹا تہمورس تخت نشین ہوا - اسی کو اہل عرب طہمورث کہتے ہیں - اس بادشاہ کے عہد کا بہت بڑا حصہ جنگ وجدال میں گذرا - دیوؤں سے لڑکر ان کو مغلوب کیا - اور طہمورث دیوبند کا لقب پایا - باغی اقوام کی جان بخشی اس علم دوست اور رحمدل بادشاہ نے اس شرط پر کردی کہ وہ لوگ اس کو مختلف زبانیں اور خط وکتابت کا فن سکھا دیں - بیان کیا جاتا ہے کہ یہ بادشاہ تیس زبانیں جانتا تھا - اسوقت تک ایران میں آریا قوم کی اصلی زبان یا سنسکرت بولی جاتی تھی - یہیں سے اختلاط زبان شروع ہوکر اردو کی طرح ایک جدید زبان پیدا ہوئی اور یہی وہ زبان ہے جو ایران کی لنگوا فرینکا یا ملکی زبان قرار پائی -

جمشید طہمورث دیوبند کے بعد اس کا لائق بیٹا جمشید تخت نشین ہوا - جس کی شوکت وحشمت اور عظمت

۵۱ کیومرث عوام میں "پیشداد" (عادل ومنصف) کے نام سے مشہور تھا - اسی لئے جو خاندان شاہی اس نے قائم کیا اسے "پیشدادیان" کہتے ہیں - اس بادشاہ نے لوگوں کو وحشت و بربریت سے نکالا، ان کو مل جل کر رہنا سکھایا - عدالت گاہیں قائم کیں چنانچہ اطراف و جوانب کی قومیں بھی اس کے راج کی برکتیں سنکر اس کی مطیع ہوگئیں - اُس نے مشرق کی جانب اپنے بھائی کو روانہ کیا اور کچھ دنوں بعد خود اس سے ملنے گیا - دونوں بھائیوں کی ملاقات ایک زرخیز وادی میں ہوئی جہاں اس تقریب کی خوشی میں شہر بلخ بسایا گیا -

۵۲ گویا ایران کی کتب معلومہ میں سب سے پہلی کتاب یہی ہے - اور اسی سے فن انشاء وادب کی ابتدا ہوتی ہے -

۵۳ اس وقت کے ایران میں بقول ہیرودوطوس ومطابق کتبہ داریوس جو کوہ بیستون پر پایا جاتا ہے - حسب ذیل بڑی بڑی قومیں آباد تھیں -

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۳)

دجلال کے افسانے اتبک مشہور ہیں - اس بادشاہ نے اپنے نام سے ایک نیا شہر بسایا اور اس کو دارالسلطنت بناکر اس کا نام اپنے نام پر تخت جمشید رکھا - اسی کا نام بعد میں استخر ہوا کہتے ہیں کہ اس کی حکومت بحر و بر ہر جگہ تھی - اس کا تخت دنیا بھر میں اڑا اڑا پھرتا تھا - غالباً اصل واقعہ یہ ہوگا کہ شاہی دورہ کے وقت اس کے ساتھ بکثرت خدم حشم ہوتا ہوگا - اور لوگ دیکھ دیکھ کر کہتے ہوں گے کہ تمام "تخت جمشید (یعنی پایہ تخت) اُٹھ آیا - آئندہ چلکر افسانہ پسند طبائع نے جمشید کا تخت ہی اڑا دیا - یہ بھی ممکن ہے کہ اس بادشاہ کے زمانہ میں راماین کے پشپک بانؑ کی طرح کوئی "اڑن کھٹولا" یا طیارہ تیار ہوگیا ہو - اس بادشاہ نے بقول فردوسی سات سو برس سلطنت کی - آلات حرب و ضرب - عمدہ عمدہ کھانے اسباب آرائش و آسائش لباس، شراب اور آلات موسیقی وغیرہ ایجاد کئے - اسی کے زمانہ میں فن تعمیر کی ابتدا ہوئی اور ملک میں عمدہ عمدہ عمارتیں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۲ کا سلسلہ)

نام قوم بزبان ایرانی	نام بزبان انگریزی	مقام بود و باش
۱- مادہ	Medes.	شمال مغربی ایران
۲- پرسا	Persians.	جنوبی ایران
۳- درکانا و داریوس) وہرکانا (ژند)	Hyrcanians.	علاقہ استرآباد
۴- پارتھوا	parthians.	خوراسان
۵- ہراوہ یا ہیروی	Arians.	وادی دریائے ہری (علاقہ ہرات)
۶- ژرنگا	Darangians.	شمال مغربی افغانستان
۷- ہراوتی	Aracholians	نواح قندھار
۸- باختری	Bactrians.	بلخ
۹- صغدی	Sogdians.	ماوراءالنہر
۱۰- خوارزمی	Chorasmians.	خوارزم
۱۱- مرغو	Margians.	وادی دریائے مرغاب
۱۲- ساگرتا	Sagartians.	خانہ بدوش
۱۳- داہا	Dahans.	ترکستان

ان قوموں کی مختلف شاخیں ملاکر تیس سے بھی زیادہ ہوتی ہیں - ہر قوم کی زبان مختلف تھی جیسا کہ ہندوستان میں ہے -

[۴] یہ شہر موجودہ شیراز سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر واقع تھا اسی کو اہل یونان پرسی پولس "Persepolis" کہتے تھے [۵] اسی بادشاہ نے سن شمسی ایجاد کیا جس میں ۱۲۰ سال بعد ایک ماہ کا اضافہ کردیا جاتا ہے - سال کا پہلا دن نوروز کہلاتا ہے جو بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے -

بننے لگیں ملکی نظم و نسق کو اُس نے تین صیغوں (مذہبی - حربی - مالی) میں تقسیم کر دیا تھا - زر و جواہر اور زیور کا استعمال بھی اسی بادشاہ کے زمانہ میں شروع ہوا -

ادبیات فارسی میں اس کے نام سے چند الفاظ آتے ہیں جنکا ذکر لطف سے خالی نہ ہوگا -

جام جم - یہ ایک کروی گیند تھا جس میں اجرام سماوی اور اقالیم ارضی کی تقسیم بذریعہ خطوط و نقوش کی گئی تھی - اسی کرہ کے ذریعہ سے یہ بادشاہ آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کیا کرتا تھا -

جشن نوروز - جس روز آفتاب عالمتاب برج حمل میں آتا ہے - اس روز فصل بہار کا پہلا دن ہوتا ہے - ایران کی تمام سرزمین کثرت گل و ریاحین سے ارژنگ چین بنجاتی ہے - اسی خوشی میں یہ جشن نوروز منایا جاتا ہے - یہی دن تقویم شمسی کے اعتبار سے ایرانی سال کا پہلا دن ہوتا ہے یہ بھی گویا انجم پرستی کا ایک پر لطف ڈھنگ ہے جسکو اکبر اعظم نے ہندوستان میں بھی زندہ کرنا چاہا تھا -

جمشید کی سطوت و جلالت کی جب یہ نوبت پہونچی تو غرور و نخوت نے دماغ خراب کر دیا خدائی کا دعوی کر بیٹھا - بالآخر جمشید ضحاک کے ہاتھ سے قتل ہوا اور آناً فاناً اس کے دم کے ساتھ اس کی خدائی بھی مٹ گئی -

اژدھاک جمشید کو قتل کر کے تاج و تخت ایران کا مالک ضحاک بن بیٹھا - مگر اس نے یہ غلطی بہت بڑی کی کہ رعایا کی تالیف قلوب سے کام نہ لیا - بلکہ ملک پر فوجی حکومت شروع کر دی - جس نے ذرا سر اٹھایا فوراً کچل دیا نسل کیانی کا بچہ بچہ ڈھونڈھ کر اس نے قتل کیا اور آخر اس ظلم و ستم کی وجہ سے اس کا لقب "ضحاک ماراں" ہوا بقصہ کہانیوں میں لکھا ہے کہ اس بادشاہ کے شانوں پر دو سانپ تھے جنکی خوراک دو آدمیوں کا بھیجہ تھی - یعنی بادشاہ کم از کم دو آدمیوں کو روز قتل کر ڈالتا تھا -

آخر ضحاک کا ظلم رنگ لایا - فرعون کے لئے قدرت نے ایک موسیٰ کا سامان پیدا کر دیا - جب اس نے کیانیوں کا قتل عام کرنا شروع کیا، تو لوگوں میں بےچینی پیدا ہونے لگی - کیانی خاندان کی ایک خاتون جو حاملہ تھی ضحاک کے ہاتھوں بچکر بھاگی اور کوہستان میں جا کر پناہ گزیں ہوئی - وہاں اس کے پیٹ سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام فریدوں رکھا گیا - فاقوں کی ماری ماں کی چھاتیوں میں دودھ کہاں تھا - بچہ کو ایک گائے کے دودھ پر لگا دیا جس کا نام فارسی علم ادب میں مایہ - مایون - برمایہ آتا ہے - جو لوگ ضحاک کے ظلم و ستم سے نالاں تھے وہ فریدوں کو خاندان کیانی کا چشم و چراغ سمجھ کر جمع ہونے لگے - کاوہ آہنگر جس کے دو بیٹے ضحاک کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے اس گروہ کا سرغنہ تھا - اور اسی کے ذریعہ سے سامان حرب و ضرب مہیا ہوتا تھا - جب یہ جماعت بڑھتے بڑھتے طاقتور ہو گئی - تو سلطنت کو ان کی طرف سے اندیشہ پیدا ہونے لگا - ضحاک نے فریدوں کے خلاف فوجکشی کی - فریدوں کی ماں اور فریدوں تو بھاگ کر روپوش ہو گئے برمایہ گائے رہ گئی چونکہ فریدوں اسی کے دودھ سے پرورش ہوا تھا اس لئے ضحاک نے اس گائے کو قتل کر دیا - جس

گاؤکشی نے سحر سامری کا کام کیا - گوسالہ پرستوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگی - کاوہ آہنگر نے ایسی چال کھیلی کہ لوگ دیوانے ہوگئے - یعنی اُس نے مقتول گائے کی کھال لیکر اس کا جھنڈا بنایا اور فریدوں کے سر پر بلند کردیا خوب جوش پھیلا ضحاک سے جنگ ہوئی - فریدوں کو فتح ہوئی اور ضحاک مارا گیا کہتے ہیں کہ ضحاک نے ایک ہزار برس سلطنت کی تھی -

فریدوں کی اس فتح سے گائے کی عظمت ملک میں بڑھ گئی - اور وہی جذبہ آج تک ہندوستان میں موجود ہے "درفش کادیانی" وہی جھنڈا تھا جو کاوہ آہنگر نے بر مایہ گائے کے چمڑے سے بنایا تھا - اس واقعہ کے بعد یہ درفش کاویانی خزانہ شاہی میں رکھا گیا - جو بادشاہ تخت نشین ہوتا تھا وہ اس کے جواہرات میں اضافہ کردیتا تھا - یہ جھنڈا بجز سپہ سالار کے اور کوئی نہیں اٹھاتا تھا - اور بوقت جہاد نکالا جاتا تھا - بالآخر یہ درفش عربوں کے ہاتھ آیا - اور اس کے ساتھ ہی قدیم سلاطین ایران کا چراغ گل ہوگیا - کہتے ہیں کہ اس علم پر کروڑوں روپیہ کے جواہرات نصب تھے - جنھیں عربوں نے آپس میں تقسیم کرلیا اور یہ عجیب وغریب شے دنیا سے ناپدید ہوگئی -

الغرض جنگ فریدوں وضحاک کے بعد گائے کی اس قدر عظمت بڑھی کہ بادشاہوں کا نام بھی گاؤ یار رکھا جانے لگا گائے کے نام اور صورت کی بہت سی چیزیں ایجاد ہوئیں اور شگئیں چنانچہ فارسی کی کتابوں میں گرز گاؤسر کا نام ابتک چلا آتا ہے -

فریدوں ضحاک کو قتل کرنے کے بعد فریدوں بادشاہ ہوا اور عرصہ تک داد جہانبانی دیتا رہا فریدوں کے تین بیٹے تھے سلم - تور - ایرج - چھوٹے بیٹے ایرج سے فریدوں کو زیادہ محبت تھی - جب بڑھاپا آیا تو اس خیال سے کہ کہیں اس کے بعد بھائیوں میں خانہ جنگی نہ ہو تمام سلطنت تینوں بیٹوں میں حسب طریقہ ذیل تقسیم کردی گئی :-

۱- ماوراءالنہر اور وسطی ایشیا	تور کو	اسی وجہ سے اس ملک کا نام توران ہوا
۲- چین وماچین	سلم کو	....
۳- ہندوستان اور ایران	ایرج کو	بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایرج کے نام پر اس ملک کا نام ایران ہوا

باپ کی یہ تقسیم دونوں بڑے بھائیوں کو پسند نہ آئی - دونوں نے ملکر سازش کی - اور توجلکٹی کرکے ایرج کو مار ڈالا غضب یہ کیا کہ ایرج کی لاش باپ یعنی فریدوں کے پاس بھجوادی - جس کے صدمہ سے بیچارے بوڑھے باپ کی کمر ٹوٹ گئی

منوچہر ایرج کے بعد اس کا بیٹا منوچہر بادشاہ ہوا اور فوراً لشکر جمع کرکے تور وسلم کی طرف بڑھا چچا بھتیجہ میں جنگ ہوئی - منوچہر کو فتح ہوئی اور اس نے تور وسلم دونوں کے سر کاٹکر اپنے دادا فریدوں کے پاس بھجوادئے - اس وقت سے ایران اور توران کے درمیان جنگ وجدال کی ابتدا ہوئی -

منوچہر کے بعد کیقباد - کیکاؤس اور کیخسرو ہوے اور ان سب کی عمریں توران سے لڑتے گذریں - اسی زمانہ

میں نریمان - سام - زال - رستم - افراسیاب - ہوئے اور افراسیاب کی موت سے ایران و توران کی خانہ جنگی کا خاتمہ ہوگیا۔

قتل افراسیاب کے بعد کیخسرو تارک الدنیا ہوکر گوشہ نشین ہوگیا۔ اور اس کا داماد لہراسپ بادشاہ ہوا۔ اسکے بعد گشتاسپ ہوا اور اسی زمانہ میں زرتشت کا ظہور ہوا اور اسی زمانہ میں رستم کے ہاتھ سے ولیعہد ایران اسفندیار اور اپنے سوتیلے بھائی شغاد کے ہاتھ سے رستم قتل ہوا۔

ہفتخوان رستم و اسفندیار - نوشدارو پس از مرگ سہراب - چاہ بیژن منیزہ - خون سیاوش - پرسیاوشاں سیمرغ - کوہ قاف - وغیرہ کی اصطلاحیں ادبیات ایران میں اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

گشتاسپ کے بعد بہمن دراز دست - پھر داراب پھر اس کا بیٹا دارا بادشاہ ہوئے۔

دارا اس نے عرصہ تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کی۔ اس وقت ایران اور یونان میں سخت رقابت تھی اور دولت مندی اور آرام طلبی نے ایرانیوں کی طاقت کو گھن لگا دیا تھا سکندر یونانی نے فوجکشی کی دارا قتل ہوا اور اسی کے ساتھ سطوت کیانی بھی ختم ہوگئی۔ مگر ادبیات فارسی کی بدولت صولت اسکندریہ دبدبہ سکندری - حشمت دارائی اصطلاحیں دنیا میں باقی رہ گئیں۔

اردشیر بابکاں قتل دارا کے بعد ایران و توران پر یونانیوں کا تسلط ہوگیا۔ مگر سکندر کی وفات کے بعد ملک میں طوائف الملوکی قایم ہوگئی۔ اسی زمانہ میں ملک بارتھیا کے لوگوں نے جن کو اشکانی کہتے ہیں خروج کیا اور تاج و تخت ایران کے مالک بن بیٹھے۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ اردوان تھا جو اردشیر بابکاں کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ چونکہ اردشیر ایک شخص ساسان کی نسل سے تھا۔ اس لئے اس جدید خاندان سلاطین کا نام ساسانی ہوا۔ یہی وہ سلاطین عجم ہیں جن کو اہل عرب "اکاسرۂ عجم" کہتے ہیں کاخ کسریٰ کی اصطلاح اسی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے

شاپور اردشیر کے بعد اس کا بیٹا شاپور ہوا۔ اس نام کے سیکڑوں پارسی اس وقت بھی ہندوستان میں موجود ہیں یہ بادشاہ بہت جلیل القدر تھا۔ اُس نے ایک جنگ میں قیصر روم کو شکست دی جس کی یادگار نقش رستم اور خرابۂ شاپور[۵۱] کے کتبے ابتک موجود ہیں۔ اسی زمانہ سے ساسانی بادشاہ خود کو "ظل اللہ" اور "خلیفۃ اللہ فی الارض" کہنے لگے تھے مگر بادشاہ خود تو مٹ گئے لیکن ان کی ایجاد کردہ اصطلاحیں ابتک باقی ہیں۔

---

۵۱ نیشاپور، مرکب ہے نے اور شاپور سے۔ نے بمعنی کلک یا بانس اور شاپور بادشاہ کا نام۔ چونکہ عہد شاپور سے قبل یہاں بڑا نیستاں تھا اور شاپور نے یہاں آبادی قایم کی اس لئے اس کا نام نیشاپور ہوگیا۔

اسی شاپور کے زمانہ میں مانی نے دعویٰ نبوت کیا۔ اس کا خط نہایت اچھا تھا۔ تصویرکشی اس کا معجزہ قرار پایا مانی و بہزاد کی اصطلاحیں زبان میں اب تک موجود ہیں۔

ہرمزد شاپور کے بعد اس کا بیٹا ہرمزد تخت نشین ہوا۔ رام ہرمزد اسی کی یادگار ہے۔ اس کے بعد بہرام ہوا یہ خاندان عرصہ تک حکمرانی کرتا رہا حتیٰ کہ کواد یا قباد کا زمانہ آیا اور مزدک کا ظہور ہوا سوشلزم یا اشتراکیت کا موجد یہی ہے۔

قباد کے بعد اس کا بیٹا نوشیرواں تخت نشین ہوا جس نے تمام مزدکیوں اور عیسائیوں کو تہ تیغ کیا۔ قیاصرہ روم سے بھی اس کی لڑائیاں ہوئیں۔ عدل داد کی وجہ سے ادبیات میں اس کا نام اتابک نوشیرواں عادل مشہور ہے۔ اسی کے زمانہ میں پیغمبر اسلام کی ولادت ہوئی۔

نوشیرواں کے بعد انوشہ زاد تخت نشین۔ پھر ہرمزد چہارم ہوا۔ جس کے ظلم وستم سے ساسانیوں کی سلطنت کو بےحد ضعف پہونچا۔

اس کے بعد خسرو پرویز کی باری آئی۔ شیریں۔ خسرو۔ فرہاد، کوہ بےستون۔ جوئے شیر۔ تیشۂ فرہاد۔ کوہکن وغیرہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کردیا اسی زمانہ میں ایران کو طاعون نے تباہ وبرباد کیا۔ اس کے بعد ایک ہفت سالہ لڑکا بنام اردشیر تخت نشین ہوا جس کو ہرازنے قتل کردیا۔ پھر پرویز کی بیٹی پوران دخت تخت پر بیٹھی۔ اس کے بعد پیروز ہوا۔ اس کے بعد اس کی بہن آزرم دخت تخت نشین ہوئی ساسانیوں کا آخری بادشاہ یزدجرد سوم ہوا جو مسلمانوں کے ہاتھوں غریب الدیار ہوکر ہلاک ہوا۔

ایران قدیم کی زبانیں صفحات ماقبل میں عرض کیا جاچکا ہے کہ سرزمین رستم واسفندیار کا اصلی نام زمانۂ قبل تاریخ میں کچھ اور تھا۔ مگر جب "آریا" نامی ایک زبردست اور طاقتور قوم باہر سے آکر ملک پر تسلط ہوگئی تو اس نے ملک کا نام اپنے نام پر "آریان" رکھا۔ یونان کی قدیم کتب میں اس ملک کا نام "پرسیس" (Persis) پایا جاتا ہے۔ جو درحقیقت "فارس" اور ایران کا ایک مشہور صوبہ ہے۔ الغرض آریا قوم نے ملک کے اصلی باشندوں کو جن کا نام معلوم کیا ہوگا۔ مگر جن کو آریا لوگ "دیو" کہتے تھے، گنجان جنگلوں اور دشوارگذار پہاڑوں میں مار بھگایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے

ـلـہ ایرانیوں کے علاوہ ملک ایران میں بہت سی غیر آریہ قومیں بھی پائی جاتی تھیں جنھیں "اناریہ" (اناڑی غالباً اسی سے نکلا ہے) یعنی غیر آریہ اقوام کہا جاتا تھا۔ ان میں تاپوری۔ امردی۔ قزبی۔ گیلانی۔ ارمن اور قفقازی۔ زیادہ مشہور تھیں۔ جنوب میں کرمانی اور جنوب مغرب میں ایلامی رہتے تھے۔ علاوہ ازیں توران اور مشرقی ایران کے (ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۳۸ میں)

کہ ایران کی اصلی زبان جو کچھ بھی ہوگی وہ انہی "دیووں" کی زبان ہوگی۔

ایران میں قومی زبان کی ابتدا

توریت میں "مینار بابل" کا واقعہ خواہ اساطیر الاولین سمجھا جائے یا داستان پاستان۔ مگر اس سے ابتداء تمدن انسانی کے متعلق حسب ذیل باتیں ضرور معلوم ہوتی ہیں:-

۱- دنیا میں بہت سی متمدن قومیں موجود تھیں۔

۲- نظام ملوکیت کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اور جتنے آدمی مینار بابل کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے ان میں زیادہ تر مفتوح و مغلوب اقوام کے لوگ تھے جن کو غلام بنا لیا گیا تھا۔ اہرام مصری کی تعمیر بھی اسی طرح ہوئی تھی۔

۳- جس واقعہ کو توریت میں لفظ بیبل (Babel) سے بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ قہر خداوندی کی وجہ سے لوگوں کی زبانیں بدل گئی تھیں۔ اور وہ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ اس میں استعارۃً یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ تعمیر مینار بابل میں مختلف اقوام و ملل کے لوگ مصروف تھے جو اپنی اپنی مختلف زبانیں بولتے تھے ان مغلوب اقوام و ملل میں بیداری پیدا ہوئی۔ ملوکیت کے خلاف ہر طرف شورش پیدا ہوگئی۔ لوگ مختلف الخیال ہوگئے بالآخر ملوکیت کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا۔ اور مختلف قومیں مختلف سمتوں کی طرف چلی گئیں۔

۴- ایران بابلستان سے ملا ہوا ہے۔ لہذا جو قوم بابل سے چل کر ایران پر متسلط ہوئی وہ نہایت متمدن اور فن تعمیرات وغیرہ سے واقف تھی۔ اسی قوم کا سردار جو پیشدادیاں ایران کا پہلا تاجدار کہلاتا ہے۔ کیومرث تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ قدیم اقوام ایران جن کو کیومرث اور اس کے بعد طہمورث دیو بند نے مغلوب کیا۔ وہ جنگلوں اور پہاڑوں کے غاروں میں رہا کرتی تھیں۔ اور جانوروں کی کھالوں سے ان کی تن پوشی ہوتی تھی۔ ان اقوام کو مطیع بنانے کے بعد جب امن و امان ہوا تو طہمورث کے بیٹے جمشید نے ایران میں بابلی تمدن کی بنیاد ڈالی۔ شہر استخر بسا کر اپنا پایہ تخت قائم کیا اور اس کا نام اپنے نام پر تخت جمشید رکھا۔ ملک میں امن و امان قائم ہوتے ہی تمدن کی برکتیں نازل ہونا شروع ہوگئیں عمدہ عمدہ مکانات تعمیر ہونے لگے۔ نئے نئے آلات جنگ ایجاد ہوئے مکانات کی آرائش و زیبائش کے لئے عمدہ عمدہ فرنیچر تیار ہونے لگا۔ نفیس کھانے ایجاد ہوئے۔ سامان عیش و طرب مہیا ہوگیا۔ نظام سلطنت کے قوانین مدون ہوئے۔ تین محکمے مذہبیہ۔ حربیہ اور مالیہ قائم ہوئے۔ جسمانی آرائش و زیبائش کے لئے زر و جواہر کا استعمال شروع ہوگیا۔ اور وہ چیز بھی ایجاد ہوئی جس کو عرف عام میں شراب کہتے ہیں۔ اسی واقعہ کو غالب نے اس شعر میں یاد دلایا ہے

(ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۳۷) خانہ بدوش قبائل بھی تھے جو صلح پسند ایرانیوں پر حملے کیا کرتے تھے، اسی لئے ان لوگوں کو ایرانی "ڈہا" "ڈانا" "ڈاکو" (دشمن - ڈاکو) یا "دیو" کہا کرتے تھے۔

میراث جم کہ مے بود اینک بمن سپار　　زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

جمشید کے باپ طہمورث دیو بند نے قدیم ایران کی تمام اقوام وملل کو مغلوب کرکے بنیاد ڈالی ان کی جان بخشی کی شرط یہ قرار پائی کہ وہ آریا قوم کو اپنی اپنی مختلف زبانیں اور خط وکتابت کے طریقے سکھلا دیں۔ یہیں سے گویا ایران میں ایک قومی اور ملکی زبان کی بنیاد اسی طرح قائم ہوئی جیسے ہندوستان میں مفتوح اقوام کی بھاشا اور فاتح اقوام کی عربی وفارسی کے اختلاط سے اردو نے جنم لیا۔

مثل مشہور ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے" اس کی نہایت عمدہ مثال ایران اور ہندوستان کے ایک واقعہ سے ملتی ہے۔

ایران میں کیومرث نے شاہان پیشدادی کی بنیاد قائم کی تو ہندوستان میں ظہیر الدین بابر نے سلطنت چغتائیہ کا علم بلند کیا۔ ایران میں کیومرث کے بعد طہمورث دیو بند کی تمام عمر دیووں کو مغلوب کرنے میں گزری اور بالآخر اس کے عہد میں ایران پر آریا قوم کا پورا پورا تسلط قائم ہوگیا۔ اسی طرح ہندوستان میں نصیر الدین ہمایوں کی تمام عمر جنگ وجدال میں گذری اور بالآخر وہ بھی مغلیہ سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ ایران میں طہمورث دیو بند کے فرزند رشید جمشید نے بابلی تمدن کی بنیاد ڈالی جو رفتہ رفتہ قدیم ایرانی تمدن کے اختلاط سے ایران کا قومی تمدن بنگیا۔ اسی طرح ہندوستان میں ہمایوں کے فرزند جلال الدین محمد اکبر اعظم کے زمانہ میں ہندو اور چغتائی تمدن کے اختلاط سے ہندوستان میں ایک خاص قومی تمدن قائم ہوا جو آج تک نظر آرہا ہے۔ جس طرح جمشید کے زمانہ میں مختلف قسم کی ایجادیں ہوئیں اسی طرح ہندوستان میں بعہد اکبری مختلف اختراعات وجود میں آئیں ادھر تخت جمشید قائم ہوا تو ادھر اکبر آباد کی بنیاد پڑی۔

جس طرح جمشید کے زمانہ میں ایک قومی زبان قائم ہوگئی تھی اور مختلف الفاظ اور اصطلاحات وجود میں آگئی تھیں اسی طرح ہندوستان میں اکبر اعظم نے زبان اردو کو چار چاند لگائے۔ شراب کا نام۔ رام رنگی۔ پاخانہ کا نام صحت خانہ رکھا۔ رنگترہ۔ بالائی۔ جھروکہ درشن۔ اکاس دیا۔ وغیرہ سیکڑوں اصطلاحیں اس زمانہ میں وضع ہوئیں اور مرگئیں۔ اسی طرح جمشید کے زمانہ میں بھی ہزارہا اصطلاحیں اور الفاظ وجود میں آئے ہونگے مگر افسوس ان سب کا خاتمہ ہوگیا۔ اب اشار فارسی میں صرف دو اصطلاحیں جمشید کے زمانہ کی پائی جاتی ہیں۔

یعنی جام جم اور جشن نوروز۔ ان دونوں کی تشریح ہم باب، سبق میں کرچکے ہیں۔ مگر یہاں اس قدر لکھنا غالباً لطف سے خالی نہ ہوگا کہ اگرچہ جام جم بالکل دوسری چیز تھی۔ مگر شعرا نے اس کو ساغر شراب کے معنے میں لے لیا۔ شاید اس لئے کہ جس طرح جمشید۔ اپنے جام یا کروی گیند سے ساری دنیا کا حال معلوم کرلیتا تھا اسی طرح جام شراب پینے کے بعد حجابات عالم دور ہوجاتے ہیں۔

مذہب کا اثر زبان اور تمدن پر

دنیا جانتی ہے کہ مشرق کی زندگی کے ہر شعبہ کا انحصار مذہب ہے۔ اہل مشرق کی کوئی بات مذہب سے خالی نہیں ہوتی۔ اور مذہب کی بنیاد پر ان کے تمدن و تہذیب کا قصر تعمیر ہوتا ہے۔ اور مذہب کے ہی زیر اثر اقوام کی زبانوں اور ان کے علم ادب میں تغیر و تبدل ہوتا ہے۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ ایرانیوں اور ہندوؤں کے آبا و اجداد ایک ہی نسل سے تھے۔ قدیم ہندوؤں میں تمام آبادی چار ورن پر تقسیم ہوتی تھی۔ یعنی برہمن۔ کشتری۔ ویش۔ شودر۔ اسی طرح ایران کے مہ آبادیوں میں آبادی کے چار طبقات ہوتے تھے۔ یعنی کارتوزی یا مقتدایان دین وزاہدان گوشہ نشین نیاری یعنی افسران عسکری نسودی یعنی آرام طلب یا سختی نہ برداشت کرنیوالے لوگ۔ اہنوخوشی۔ جفاکش یا سختی برداشت کرنے والے مہ آبادیوں کے بعد جب ایران میں پیشدادیوں کا دور دورہ ہوا تو وہ چار برن یا طبقات آبادی تو بدستور قایم رہے مگر زبان کے لحاظ سے ان کے نام یہ ہوگئے:۔

آسورنی یعنی علمائے دین۔ آرتشتار یعنی سلاطین اور سپاہی پیشہ۔ استرہوش یعنی زراعت پیشہ۔ ہوتخش یعنی مزدور وغیرہ۔

ادبیات فارسی میں ان طبقات کے نام اب تک موجود ہیں چنانچہ قاآنی اپنے قصیدہ کے ایک شعر میں لکھتا ہے

نفس نای خود نسودی نیست بل اہنوخوشی ست
صفہا بیں تو زہر حرفت چساں می آورد

مورخین یونان کی کتابوں میں آرتازرکسیز۔ کارنانک ارتخشتر۔ اور اردشیر بابکاں کے نام میں وہی قدیم پیشدادی ورن آرتشتار کا مادہ موجود ہے۔ کارکنان قضا و قدر جن کو عربی زبان میں ملائکہ کہتے ہیں وہی قدیم ایرانی زبان میں فرشتہ کہلاتے تھے۔ مگر حیرت ہے کہ وہی دیو جس کو ایران میں برا سمجھا جاتا تھا، ہندوستان میں دیوتا بنا دیا گیا۔ چنانچہ لفظ مہادیو میں دیکھیے کہ وہی ایرانی دیو موجود ہے مگر افسوس ہے عرب کے "عفریت" پر کہ یہ کمبخت ہندوستان میں آکر بھی "پریت" ہی بنا رہا[1]

قدیم مصریوں اور بابلیوں کی طرح قدیم ایرانیوں میں بھی اجرام سماوی کی پرستش ہوتی تھی اور ان کی مورتیاں بنا کر جگہ جگہ مندر یا عبادت خانے تعمیر کئے گئے تھے۔ تاج و تخت کے ساتھ سلاطین ایران ماہ و مہر کی بھی قسم کھایا کرتے تھے چنانچہ فردوسی نے سہراب کے قصہ میں لکھا ہے سہ

---

[1] عربی کا "عفریت" بھی ایرانی زبان سے آیا ہے جو ہندوستان میں "پریت" کہلاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ قدیم ایرانی زبان میں اسے پلید کہتے ہوں جو عرب میں عفریت اور ہندوستان میں پریت بن گیا۔

بدو گفت سہراب کاے خوب چہر ٭ بہ تاج و بہ تخت و بماہ و بمہر

مذہب۔ زرتشت کے بعض علماء کا خیال ہے کہ ممالک عرب پر بھی پہلے ایرانیوں ہی کی حکومت تھی۔ چنانچہ مہ آبادیوں کے باقیات الصالحات میں ابھی تک عرب میں مکہ اور مدینہ کا وجود پایا جاتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک شہر مکہ مہ آبادی ایرانیوں کا آباد کردہ ہے۔ مہ آبادیوں نے وہاں ایک مندر تعمیر کیا جس میں چاند کی مورتی رکھی اور زحل کی یاد میں ایک سیاہ پتھر بھی نصب کیا۔ اس عبادت خانہ کا نام "مہ گہہ" یعنی چندرماں دیوتا کی جگہ رکھا۔ جو کثرت استعمال سے مکہ ہوگیا اور کیوان کا سیاہ پتھر حجر اسود ——— اسی طرح انھوں نے لفظ مدینہ کو مہ دینہ بنایا ہے جس کے معنی چاند کی بستی کے ہیں۔ اسی مدینہ سے لفظ مدائن نکلا ہے جو ایران کا پایہ تخت تھا۔ اور جہاں چاند کی مورتیوں کے بہت سے مندر تھے ان کا یہ بھی خیال ہے کہ عرب میں چاند کی دیبی کو منات کہتے تھے۔ ایران میں اسکا کچھ اور نام تھا مگر یہی منات ہندوستان آکر سومنات بن گئی۔

ایران کے مہ آبادیوں اور پیشدادیوں کی رسمیں قریب قریب وہی تھیں جو ہندوستان میں ہندووں کی ہیں۔ ہندوستان میں ہولی ہوتی ہے جگہ جگہ آگ جلا کر آتش پرستی کی جاتی ہے۔ اسی طرح ایران میں ایک تیوہار آتش سوز ہوتا تھا جس میں آتشکدے روشن کرکے اگنی دیوتا کی پرستش کی جاتی تھی۔

ہندوستان میں ہولی کے دنوں میں عبیر و گلال چھڑکا جاتا ہے۔ پچکاریوں سے لوگوں پر رنگ ڈالا جاتا ہے اسی طرح قدیم ایران میں رسم آب ریزاں ہوتی تھی جس میں لوگوں پر رنگ پاشی کی جاتی تھی۔

ہندوستان میں دیوالی کا تہوار ہوتا ہے۔ مکانات کی صفائی کرکے جگہ جگہ چراغاں کیا جاتا ہے، اسی طرح قدیم ایران میں ایک تہوار بنام چراغان روز اسفند ہوتا تھا۔ ادبیات فارسی میں اس کا ذکر اب تک آتا ہے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے کہ ؎

سیاہ روز شدم بہر عشرت دگراں ٭ دریں زمان چراغان روز اسفندم

ہندوستان میں جس طرح ایک تہوار بسنت منایا جاتا ہے اسی طرح قدیم ایران میں ایک تہوار ہوتا تھا جس میں زرد پھول توڑے جاتے تھے۔ اس کو جشن گل کوبی کہتے تھے۔ فارسی ادبیات میں یہ جشن ابھی تک موجود ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

خدائیگاں جمال و خلاصۂ خوبی ٭ بہ باغ حسن در آمد بہ رسم گل کوبی

مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندوستان کے راجاؤں مہاراجاؤں اور امراء میں ایک رسم تھی کہ جب لڑکی جوان ہوکر شادی بیاہ کے قابل ہوجاتی تھی تو اس کی شادی کے لئے ایک جشن برپا کیا جاتا تھا جس کو سوئمبر کہتے تھے۔ بعض اوقات کوئی شرط بھی رکھ دیجاتی تھی اور جو شخص اس رسم کو پورا کر دیتا تھا اُسی کے ساتھ اس لڑکی

کی شادی ہوجاتی تھی۔ اسی طریقہ سے ارجن کے ساتھ دروپدی اور رامچندر جی کے ساتھ سیتا جی کی شادی ہوئی تھی۔ اس مقصد کے لئے قدیم ایران میں بھی ایک جلسہ کیا جاتا تھا جس میں لڑکی کے لئے مناسب شوہر منتخب کیا جاتا تھا۔ اس جلسہ کو ایران میں مردگیران کہتے تھے۔

الغرض ان آبادیوں کے زمانہ میں ممکن ہے قدیم ایرانیوں کی زبان سنسکرت رہی ہو مگر سلاطین پیشدادیان میں جب طہمورث دیو بند اور جمشید کا زمانہ آیا تو قدیم وجدید زبانوں کے اختلاط سے ایک نئی قومی یا ملکی زبان بن گئی جو کسی قدر سنسکرت زبان سے ضرور مشابہ تھی۔ مگر جس طرح ہندوستان میں ہندی بھاشا اور عربی و فارسی زبانوں کے اختلاط سے ایک جدید زبان "اردو" پیدا ہوگئی اور اس کا رسم الخط نہ دیوناگری رہا نہ عربی بلکہ فارسی بن گیا۔ اسی طرح قدیم ایران میں جب ایک نئی زبان پیدا ہوئی تو اس کا رسم الخط بھی سنسکرت یا دیوناگری نہ رہا بلکہ وہ بن گیا جس کے کتبے اب تک ایران قدیم کے خرابوں میں نظر آتے ہیں۔ یعنی وہ خط جس کو اہل کی اصطلاح میں خط میخی یا پیکانی کہتے ہیں۔ اور غالباً شاپور بن اردشیر بابکان کے زمانہ تک ایران میں یہی رسم الخط جاری رہا۔ نقش رستم اور خرابہ شاپور کے کتبے اسی خط میں ہیں۔

شاپور کے زمانہ میں ایک شخص مانی کا ظہور ہوا جس نے نبوت کا دعوی کیا۔ پہلے شاپور کا بھائی پیروز اور پھر خود شاپور اس کے مذہب میں داخل ہوگئے۔ اب یہ جدید مذہب روزافزوں ترقی کرنے لگا۔ زرتشت کے مذہب نے توحید انیت قائم کرنے کے بعد خدا کی دو قدرتیں ظاہر کی تھیں ایک یزدان یعنی خالق خیر۔ دوسری آہرمنوش یا اہرمن یعنی خالق شر۔ مگر مانی کے مذہب نے نور کو خیر اور ظلمت کو شر قرار دیا اور انھیں دونوں قوتوں کے زیر اثر تمام دنیا کے کاروبار کو بتایا۔ انھی دونوں مذاہب کی وجہ سے ادبیات فارسی میں یزدان اہرمن سیہ روز۔ سیہ بخت سیہ گلیم۔ روشن روز۔ روشن رواں۔ روشن خرد اصطلاحات کا اضافہ ہوا۔

مانی کے مذہب میں پانچ درجے ہیں۔ معلمین (ابناء الرحم) مشمسین (ابناء العلم) قسیسین (ابناء العقل)۔ صدیقین (ابناء ذات غیر مرئی) سماعین (ابناء ذکاوت) ان پانچوں اصطلاحوں میں سے تین تو فنا ہوگئیں مگر ۲ و ۳ دونوں اصطلاحیں ہندوستان اور ایران میں ابھی تک زندہ ہیں۔ یعنی مانی کا صدیق تو بنی عباس کے عہد میں بگڑتے بگڑتے زندیق بنگیا اور مشمسین کے مشمس کو مصنف صاحب طلسم ہوشربا ہندوستان لے آئے اور اس کو اپنی کتاب میں ساحر مشمس کے نام سے زندہ کر دیا۔

مانی کی تصانیف میں سات کتابیں ہیں۔ چھ سریانی زبان میں اور ایک پہلوی میں جس کا نام شاپورقان ہے۔ مانی نے ایک خاص خط ایجاد کیا تھا۔ جو نہایت اہتمام سے لکھا جاتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے مانی کو مصور سمجھا اور تصویر کشی اس کا معجزہ قرار دیا گیا۔ شاپورقان نامی کتاب اسی جدید خط میں نہایت اہتمام کے ساتھ خوشنما لکھی گئی تھی فتوحات

اسلامیہ سے قبل جو رسم الخط ایران میں رائج تھا غالباً وہ یہی خط تھا - ناگپور میں ایک پہاڑی ہے اس کے شمالی مشرقی گوشہ پر پارسیوں کا قبرستان ہے - جہاں بہت سی قبریں انگریزی وضع کی بنی ہوئی ہیں ان میں سے اکثر پر تو انگریزی زبان میں کتبے درج ہیں مگر چند پر قدیم فارسی کتبے بھی ہیں - یہ خط داہنے سے بائیں کو عربی کی طرح لکھا جاتا ہے اور پرانے خط کوفی سے کسیقدر مشابہ ہے - ایک جگہ "ہوا مزدا" کا لفظ صاف سمجھ میں آتا ہے -

قدیم ایرانی زبان کے نمونے

فتح توران اور قتل افراسیاب کے بعد جب کیخسرو شہنشاہ ایران تاج وتخت سے دستبردار ہو کر یاد خدا میں مصروف ہوگیا تو اس کے بعد اس کا داماد لہراسپ تخت نشین ہوا اور اسی بادشاہ سے سلاطین کیانیاں کا دوسرا دور شروع ہوا -

لہراسپ کے بعد گشتاسپ تخت نشین ہوا - اسی کے زمانہ میں زرتشت کا ظہور ہوا اور ایران کا قومی مذہب رفتہ رفتہ قدیم آریا مذہب کے بجائے آتش پرستی ہوگیا -

مذہب کے پلٹتے ہی ایران کی دنیا پلٹ گئی - عجائب پرستی کی ظلمت کا تختہ الٹ گیا - ایران کا گوشہ گوشہ حقائق ومعارف کے نور سے منور ہوگیا - اعتقادات کے ساتھ ہی رسم ورواج - تہذیب وتمدن اور زبان وادبیات میں زبردست تغیر نمایاں ہوگیا - اجرام سماوی کی مورتیوں اور گئو پوجا کے بجائے یزداں پرستی ہونے لگی - مگر عقیدہ توحید کے ساتھ ہی ایک قسم کا شرک بھی جلی وخفی دونوں طرح سے موجود رہا - یعنی جب نور کو یزدان اور ظلمت کو اہرمن کا مظہر قرار دیا گیا تو دن کے وقت نیر اعظم اور رات کے وقت آگ کی پرستش ہونے لگی - اس طرح گویا انجم پرستی تو برقرار رہا مگر بت پرستی کی جگہ آتش پرستی نے اختیار کرلی -

زرتشت کی کتاب مقدس کا نام ژند ہے یعنی سنگ چقماق کا وہ جز جس سے آگ نکلتی ہے - مگر یہ کتاب بہت مشکل تھی - اس لئے علماء دین زرتشت نے اس کی ایک شرح یا تفسیر لکھی جس کا نام پا ژند رکھا گیا یعنی چقماق کا دوسرا جز جس سے ٹکرا کر آگ نکالی جاتی ہے - علماء نے ژند کی شرح تو شوق سے لکھی مگر مشکل یہ ہوئی کہ شرح متن سے بھی زیادہ مشکل ہوگئی - اس لئے مجبور ہو کر ایک تفسیر لکھنی پڑی جس کا نام اوستا یا اوستا رکھا گیا -

مگر بعض محققین کا قول ہے کہ زرتشت کی اصلی کتاب اوستا ہی تھی کیونکہ اس میں ارمنی - کلدانی - آشوری وغیرہ مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہیں - اس کے بعد ژند کے نام سے اسی کتاب کی شرح پہلوی زبان میں لکھی گئی - ژند کی تفسیر پاژند ہے - جس میں خالص پہلوی زبان کے الفاظ میں اور غیر زبانوں کے الفاظ شاذ ونادر پائے جاتے ہیں -

بہر حال جس طرح ہندوستان میں گوتم بدھ کے مذہب کو عہد شہنشاہ اشوک وغیرہ میں فروغ ہوا تھا اسی طرح گشتاسپ اور اسفندیار کے زمانہ میں مذہب زرتشت کو فروغ ہوا - اور جس طرح بعد میں ہندوستان کے اندر

برہمنوں کے مذہب نے کروٹ لی تھی اسی طرح قدیم مہ آبادیوں کے مذہب نے آل ساسان کے پانچویں تاجدار خسرو پرویز کے زمانہ میں کروٹ لی یعنی اس بادشاہ نے بعض قدیم کتب کا جن کا سلاطین پر نازل ہونا خیال کیا جاتا تھا اپنے عہد کی فصیح زبان میں ترجمہ کرایا اور ان کا نام دساتیر رکھا۔ مگر یہ کتابیں مذہب زرتشت کو ایران سے نہ نکال سکیں اور بالآخر مہ آبادی مذہب ایران میں ہمیشہ کے لئے فنا ہوگیا۔ انسوس ان کتابوں کا پتہ نہیں چلتا ورنہ بہت سے راز منکشف ہوتے۔

کتاب ژند پچیس ابواب پر مشتمل تھی۔ مگر افسوس ہے کہ ان میں سے صرف انیسواں[۱۹] باب جس کو ونندیداد کہتے ہیں قائم رہگیا ہے اور باقی تمام ابواب مفقود ہیں۔

زبان کی تدریجی ترقی اور عہد بعہد کے تغیرات دکھانے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی کتب قدیمہ کی عبارتوں کے نمونے دکھائے جائیں۔ اوستا کا فقرہ جو مع ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے یہ ظاہر کرتا ہے کہ زبان پر سنسکرت کا اثر کتنا غالب[۵] ہے

---

[۵] تمام ایرانی زبانوں کی وہ امتیازی خصوصیات جو انھیں زبان سنسکرت سے علٰحدہ کرتی ہیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سنسکرت کا "س" ایرانی میں "ہ" سے بدل جاتا ہے۔ مثلاً

سنسکرت	ژند	قدیم فارسی	جدید فارسی
سندھو۔ (دریا)	ہندو	ہندو	ہند
سَرو (سرب) تمام	ہَورو	ہورو	ہر
سَمَہ (تمام)	ہَمَہ	ہَمَہ	ہم

(۲) حروف مرکب یا مخلوط کی تبدیلی۔ مثلاً۔

سنسکرت	ژند	قدیم فارسی	جدید فارسی
بھومی (زمین)	بومی	بومی	بوم
دھیتا (انصاف)	داتا	داتا	داد
گھرم (گرمی حرارت)	گریما	گرما	گرم

(۳) حروف ک۔ پ۔ ت وغیرہ کی تبدیلی۔ مثلاً

سنسکرت	ژند	قدیم فارسی	جدید فارسی
پرتھما۔ (پہلا)	فرتیا	فرتما	نردم (پارسی)

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۵)

فقرۂ اوستا

اشم وہو وہیستم استی اُستا اہملے یداشاؤ دیتائی اشم

راستی نعمت کبریائی ہے۔ رحمت ہے اور فراواں ہے۔ اور تقدس سے خیر ترین اشیاء ہے۔ چاہتی ہے کرتی ہے ہوگی۔

عبارت خوردہ اوستا

(صحیفۂ نماز و ادعیۂ ماثورہ)

مس دوہ وفیروز گرباد عینوئے خورشید امرگ رایومند خرد ہمند

بزرگ وفیروز مند باد مینوے خورشید بے مرگ خالص نورمند خردمند

اروند اسپ ہمت وہیخت وہورشت۔

قوی اسپ بہ نیک نیت نیک گفتار و نیک کردار نماز براں

اس فقرہ کی عبارت کے سیاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی شخص کے جنازہ کی نماز ہے۔

نمونہ عبارت وساتیر

ہوزامیم فہمزدان ہزہزماس وزماس ہرشیور ہردیور

پناہیم بیزداں ازمنش وخوے بدوزشت گمراہ کنندہ دبراہ بدبرندہ

فہشید شمتاے ہرشندہ ہرشگر زمریاں فروہیدور

بنام ایزد بخشایندہ بخشائش گر مہرباں دادگر

(ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴)

سنسکرت	ژند	قدیم فارسی	جدید فارسی
کرتو (بصیت)	خُرَتو	خِرَدْ	خِرَد
اسٹرومیدہاس	آہوزدمزداؤ	اہورامزدا	ہرمزد
باہو (بازد)	بازد	•	بازو
ھستا (ہاتھ)	ستا	دستا	دست
جرپاس (سمندر)	ذرایو	دَرَیا	دریا

عجیب بات ہے کہ دساتیر کی یہ شعر نما یا مقفیٰ عبارت مسلمانوں کے مندرجہ ذیل کلمہ سے کس قدر ملتی جلتی ہے۔

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یورپ کی اکثر زبانوں میں ایران کی قدیم کتب مقدسہ کے ترجمے ہوئے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں الہٰیات۔ حقائق و معارف۔ حکمت و اخلاق، و رسیاست مدن وغیرہ کا مخزن ہیں اور یہی وہ سونا تھا جس کو عربوں نے تاؤ دیکر کندن بنا دیا

قدیم ایران کی بعض اصطلاحات علمیہ

فتح اسلام کے بعد عربوں کی زبان اور تمدن کا اثر ادبیات ایران پر اسقدر زبردست پڑا کہ فارسی کا باوا آدم ہی نرالا ہو گیا اور وہ گویا خاص مسلمانوں کی زبان بن گئی۔ مگر جو قدیم ایرانی کتب یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایرانی زبان منطق۔ فلسفہ۔ فقہ۔ ادب وغیرہ کی مصطلحات سے خالی نہیں تھی۔ ذیل میں چند نمونے دکھائے جاتے ہیں جن سے ہمارے قول کا کافی ثبوت ملتا ہے:۔

اصطلاحات حکمیہ

عربی	ایرانی	عربی	ایرانی
عقل اول	بہین ہوش	واجب	بایست
علت	ایرایہ	ممکن	شایست
علت مادی	مایئی	ممتنع	نابایست
علت صوری	پیکری	جوہر	گوہر
علت فاعلی	کاری	عرض	بیان
علت غائی	کرانی	بسیط	آذز
قدیم	باش	مرکب	دربست۔ کاموس
	حادث	رستہ نورستہ	

اصطلاحات منطق

نوع	گونہ	دعویٰ	خواست

عربی	ایرانی	عربی	ایرانی
جنس	مہ گونہ	برہان	روشنگر
فصل	بازآر	برہان تطبیق	برہم روشنگر
خاصہ	ویژ	برہان سلمی	زینہ روشنگر

اصطلاحات فلسفہ

ازل	آغاز بخت	مادہ	سرمایہ
عنصر	گوہر	لاشے	ناچیز
شئے	چیز	وجود	توانائی
زمانہ	روزگار	حرکت	جنبش
یبوست	خشکی	سکون	آرام
قوت	نیروے	قسر	افسردگی
نوع	بخش	متحرک بالطبع	جندہ خو
سیال	رادق پذیر	دوران	گشت
تغیّر	فرسودن	فنا	تباہی
متحرک بالارادہ	پویندہ	حرارت	گرمی
برودت	سردی	مائیت	تری

دیگر اصطلاحات مختلفہ

لفظ	معنی	لفظ	معنی
ویژہ	خاص	تال وال	ریزہ ریزہ
مر	شمار	تخش	تیر
ترک	کلاہ آہنی	ترنگ	کمان کی آواز
آخو	اصطبل	تلاش	پراگندہ
آزین	زینت و آرائش	تنگ آمدن	نزدیک آمدن

لفظ	معنی	لفظ	معنی
آذرگشسپ	بجلی	آستی	آستین
چاک	سپیدۂ صبح	چاک چاک	تلوار مارنے کی آواز
آغاز	ارادہ	چرنگ	آواز گرز
افسوس	ظلم وستم	چک Cheque	قبالہ۔ دستاویز
شارستاں	شہر و شہرستان	الونشہ	آفریں
شبگیر	صبح	بادسر	مغرور
بارگی و بارہ	اسپ	باژ	خراج
غُرم	پہاڑی بھیڑ	غرچہ	مخنث۔ نامرد
غو	خروش	گو	پہلوان
پسیچ	ارادہ۔ کارسازی	بگماز	شراب
پازہر	تریاق	فیلہ	گلۂ اسپان
پذیرہ	استقبال کرنا	فش	دم و یال اسپ
پدرام	آراستہ	قارورہ	یکے از آلات جنگ
پہلوانی	پہلوی زبان	خشت	چھوٹا نیزہ
دبوس	گرز	درع	پیراہن زناں
درخت	دارالسیاست	درقہ	چمڑے کی ڈھال
ستاوہ	خیمہ	دستار	دسترخوان
ستارہ	مسہری	دست بند	زنان رقاص
ستودان	دخمہ	دست جابہ	جامہ سراپا
دست راست	وزیر اعظم	سرسری	فرومایہ
دستوار	عصا	سرولیا	شاخ گاو
سغت	دوش	دمدار	ساقۂ لشکر
شیب	تازیانہ	دواج	لحاف
صلاب	اصطرلاب	ردہ	صف

لفظ	معنی	لفظ	معنی
طبرخوں	بیدسرخ	رزمہ	بقچہ
طغرل	شکاری پرندہ کی ایک قسم	قرطہ	کرتہ
رنج	رنگ	کالوشہ	دیگچہ
روزبان	دربان	کشکین	جو کی روٹی
روسپی	فاحشہ	ریدک	غلام۔امرد
کنج	تھوک	کلاک	کمان
رمین	مکار	کنارنگ	بزرگ قوم
کند آور	پہلوان	زخم	عمارت
زمزم	کلمات مغاں کہ وقت پرستش گویند	گردگاہ	کمر
زمی	زمین	گریغ	گریز
زنہار خوردن	عہد شکنی	گشن	بسیار
زوار	خادم زندانخانہ	مزیح	طعنہ وظرافت
سان	عرض لشکر	مہت	گراں
دیلہ	نعرہ	ہرکارہ	دیگ سنگی
نخ	صف لشکر	نیو	پہلوان
ہوش	جان	وان	نگہبان
دیر	بادوفہم	لشک	جانور درندہ

ایران کے جنگی باجے

بتیرہ - گاؤدم - خرمہرہ - کوس - طبل - نقارہ - کرنائے - سرغین

اسلحۂ جنگ

زرہ - جوشن - مغفر - چار آئینہ - خفتان - ترک - بیربیان - برگستوان

آلات و سامان جنگ

گوپال - گرز - تیغ - سپر - درفہ - خنجر - ژوبین - ناوک - خشت - تیر - خانگ - کمند - سنان - نیزہ - ژوپن - پرتاب - تبرزین - دبوس - قارورہ - شراع - عرّادہ - رایت - علم - درفش - اختر - سراپردہ -

ترتیب فوج

قلب - میمنہ - میسرہ - طلایہ - ساقہ - دمدار -

نظام سلطنت

ملک و قوم میں سب سے بڑا شخص بادشاہ ہوتا تھا جس کی بیحد تعظیم و تکریم کی جاتی تھی - بادشاہ نہ صرف درجہ و مرتبہ میں افضلیت رکھتا تھا بلکہ نیک نیتی اور نیکوکاری میں بھی اس کو فوقیت حاصل ہوتی تھی - اختیارات میں بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا - اگرچہ ملک کے لئے آئین و قوانین مقرر ہوتے تھے - مگر بادشاہ کا ہر حکم قانون سمجھا جاتا تھا اہل دربار اور رعایا بادشاہ و سلطنت کی بیحد تعظیم کرتے تھے - حتیٰ کہ کوئی شخص بادشاہ کی جھوٹی قسم نہ کھاتا تھا - اور جو ایسا کرتا تھا اس کو برادری سے باہر کردیا جاتا تھا - بادشاہ کے بعد اہم ترین شخصیت وزیر کی ہوتی تھی - یہ شخص سب سے بڑا مہندس اور حکیم ہوا کرتا تھا - تمام سرکاری محکمے اور عہدیدار اس کے ماتحت ہوتے تھے -

وزیر کے خاص ماتحتوں میں دو استوار یعنی امین لوگ ہوتے تھے - ان کے علاوہ دو وقائع نویس جن کو اصطلاح میں شدہ بند کہتے تھے - یہ وزیر کے خاص مددگاروں میں ہوتے تھے - ملک کے واقعات سے باخبر رکھنے کے لئے ایک محکمہ خبر رسانی بھی قائم تھا - اور جو لوگ خبر رسانی کی خدمت انجام دیتے تھے ان کو اصطلاح میں رَوندار کہتے تھے -

فوج میں تمام سپاہ کا سردار اعلیٰ خود بادشاہ ہوتا تھا - اس کے بعد جو شخص ایک لاکھ فوج پر سردار ہوتا تھا اس کو سپہبُد کہتے تھے - اس کے نیچے ایک ایک ہزار فوج کے سردار ہوتے تھے جن کو سرہزار کہتے تھے - پھر اُنکے نیچے سو سو سپاہیوں کے سردار ہوتے تھے - جن کا نام سپہدار ہوتا تھا - ان کے نیچے دس دس آدمیوں کے افسر ہوتے تھے جو سالار کہلاتے تھے -

ہر شہر میں ایک کوتوال ہوتا تھا جس کو فرہنگ روز کہتے تھے - یہ شہر میں محکمۂ سراغ رسانی اور وقائع نگاری کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا -

محکمہ فوجداری کا افسر اعلیٰ فرہنگ دار کہلاتا تھا - اور محکمہ دیوانی کے افسر اعلیٰ کو دادستان کہتے تھے علماء دین کے فتوی کے بغیر بادشاہ کو بھی سزائے موت دینے کا اختیار حاصل نہ تھا -

آب و ہوا اور ماحول کا اثر زبان پر

مذہب کے بعد دوسری چیز جس کا زبان پر زبردست اثر پڑتا ہے وہ ملک کی آب و ہوا اور ماحول ہے۔ لہذا جب تک کسی ملک کے طبعی حالات سے واقفیت حاصل نہ ہو اس وقت تک کسی ملک کے فن انشار پر پوری طرح نقد و بصر ہونا محال ہے۔ کیونکہ ہر ملک کے فن انشار کی لطافت۔ نزاکت خیالات اور شیرینی ادا سے وابستہ ہوا کرتی ہے۔ اور استعارات و تشبیہات بلکہ امثال و محاورات سب کے سب طبعی سیاسی اور مذہبی اثرات کے تابع ہوا کرتے ہیں۔

انگلستان چونکہ ایک سرد ملک ہے۔ اس لئے وہاں اکثر کہر محیط رہتا ہے اور جب کبھی آفتاب عالمتاب کا رخ روشن بے پردہ نظر آنے لگتا ہے تو بیحد خوشی منائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی علم ادب میں جوانی کو فصل گرما اور بڑھاپے کو موسم سرما سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ یعنی ان لوگوں کے لئے گرمی خوش آیند چیز ہے۔ مگر عرب اور ہندوستان گرم ممالک ہیں۔ یہاں ٹھنڈی چیزیں پسند کی جاتی ہیں۔ مثلاً کسی عرب کو اگر کوئی چیز بلا مشقت حاصل ہوجاتی ہے تو وہ اسکو غنیمت بارد کہتا ہے یا جسکے دیکھنے سے دل کو راحت ہوتی اس کو قرۃ العین یعنی آنکھ کی ٹھنڈک کہتا ہے۔ ہندوستان میں بھی کسی کو دعا دیجاتی ہے تو کہا جاتا ہے۔ کلیجہ ٹھنڈا رہے۔ کوکھ اور مانگ سے ٹھنڈی رہو۔

خاک پاک ایران فنون لطیفہ کی قابلیت میں سب سے ممتاز ہے۔ شاعری اور نازک خیالی یہاں کا خمیر ہے۔ تمام ملک سرسبز و شاداب ہے۔ کوہستان کے دلفریب مناظر میدانوں کے دلکش سبزہ زار۔ روح پرور ہیں۔ یہاں سال میں چار موسم قرار دیئے گئے ہیں:—

بہار

اس موسم کی ابتدا ۲۱ مارچ سے ہوتی ہے۔ جاڑوں میں ہر چیز برف کی چادر میں ڈھکی ہوتی ہے۔ نوروز آیا اور برف پگھل کر بہنے لگی۔ شاخیں ہری ہونی شروع ہوئیں۔ آج کلی پھوٹی کل پھول نکل آیا۔ ہوا میں خنکی آفتاب میں ہلکی گرمی غرض عجب پر لطف موسم ہوتا ہے ایران گل و ریاحین کی کثرت سے گلزار ہوجاتا ہے۔ اس موسم نے ادبیات ایران پر جس قدر اثر ڈالا اسی قدر دوسرے موسم کا نہیں پڑا اور یہی وجہ ہے کہ قصائد اور غزلوں اور مثنویوں میں جس قدر تشبیہات بہار کی ہونگی اُداس قدر کسی اور موسم کی نہ ہونگی۔ اس زمانہ میں بارش کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ اس طرح گویا ایران کی بہار ہندوستاں کی بہار سے مختلف ہے۔ ہندوستان کی بہار میں گھٹا اور بارش کا ہونا ضروری ہے

تابستان

اس موسم کی ابتدا ۲۳ جون سے ہوتی ہے۔ برف پگھل پگھل کر دریاؤں میں پانی زور شور سے بہتا ہے میوے تیار ہوجاتے ہیں۔ کاروبار تجارت رونق پر ہوتا ہے۔ گرمی بازار یا گرم بازاری کا محاورہ اسی موسم کا رہین منت ہے۔ علاوہ ازیں گرمی ہنگامہ۔ گرمی صحبت شعر گرم۔ حسن گرم وغیرہ کا وجود اسی موسم کا نام لے رہا ہے۔

پائیز یہ موسم ۲۲ ستمبر سے شروع ہوتا ہے۔ برف باری ہونے لگتی ہے۔ کسان لوگ تخم ریزی کر چکتے ہیں۔ ادہر برف گری اور زمین ڈھک گئی۔ کاروبار تجارت میں کمی ہونے لگتی ہے۔

زمستان اس کا آغاز ۲۱ دسمبر سے ہوتا ہے۔ برسات کی شدت۔ اور برفباری کی کثرت سے تمام ملک طبقہ زمہریر بنجاتا ہے۔ ہر وقت آگ روشن کھنا ناگزیر ہوجاتا ہے برف باری کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی آسمان پرسے روئی دھنک دھنک کر نیچے پھینک رہا ہے۔ تمام کاروبار بند ہوجاتے ہیں۔ یہیں سے سرد بازاری یا سردی بازار کا محاورہ وجود میں آیا اور ایران میں یہ نہایت تکلیف دہ موسم ہوتا ہے۔

بڑھاپے میں چونکہ بال سفید ہوجاتے ہیں۔ انسان کے جسم میں حرارت غریزی کم ہوجاتی ہے۔ اس لئے بڑھاپے کو انگریزوں کی طرح ایران والے بھی فصل زمستان سے تشبیہ دیتے ہیں۔

زبان فارسی کی حقیقت قدرت کی نیرنگی ہے کہ ہر ملک میں بارہ کوس کے فاصلہ پر رسم ورواج۔ لباس و پوشش لب ولہجہ اور زبان میں کسی قدر تغیر واقع ہوجاتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایران جیسے وسیع ملک میں بعض تغیرات کے ساتھ مختلف زبانیں یا ایک ہی زبان مختلف طریقوں سے نہ بولی جاتی ہو چنانچہ ایران کے متعلق کتب لغت اور دیگر پرانی کتابوں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ سرزمین ایران میں سات زبانیں رائج تھیں۔ جو فارسی۔ دری پہلوی۔ ہروی۔ سگزی۔ زاولی اور سغدی کہلاتی تھیں۔ ان میں سے ہروی تو وہ زبان تھی جو ہرات کے علاقہ میں بولی جاتی تھی۔ سگزی زبان ملک سیستان یعنی زابل کی تھی، سغدی جس زبان کو کہتے تھے وہ سمرقند وغیرہ میں رائج تھی۔ اور جن ممالک کے نام سے یہ زبانیں موسوم تھیں وہیں تک وہ محدود تھیں۔ کل ملک ایران کا لنگوا فرینکا ہونے کا شرف ان زبانوں کو حاصل نہیں تھا۔ بلکہ ایسے سمجھنا چاہئے کہ جس طرح پنجاب والے اپنے گھروں میں اور اپنے آدمیوں کے ساتھ تو پنجابی زبان میں بات چیت کرتے ہیں مگر جب لکھنے بیٹھتے ہیں یا باہر والوں سے گفتگو کرنے پر آتے ہیں تو اردو لکھتے اور بولتے ہیں۔ الغرض یہ زبانیں مشترکہ نہیں بلکہ مختص المقام زبانیں تھیں۔ یہی حال ممالک افغانستان کا ہے کہ ملکی زبان پشتو ہے مگر دربار اور خواص کی زبان فارسی

دری اہل یورپ کی تحقیقات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایران کی قدیم ملکی زبان دری تھی۔ کیونکہ اس میں غیر زبانوں کے الفاظ اور محاورات داخل نہیں ہیں۔ نقش رستم و خرابات استخر میں جو کتبے پائے جاتے ہیں وہ اسی زبان میں ہیں۔ کیکاؤس۔ کیخسرو وغیرہ کی زبان یہی تھی۔ بہرحال اگر ملک کی مشترکہ زبان اگر دری نہیں تھی تو کم ازکم ثقات اور دربار کی زبان تو ضرور تھی۔ افسوس اب اس زبان کا کہیں پتہ نہیں اگر کچھ کچھ نشان ملتا ہے تو ایران کے صوبہ قہستان میں ملتا ہے۔

پہلوی محققین کا قول ہے کہ ایران کی مذہبی زبان ہے۔ اور وہی زبان ہے جس میں زرتشت کی کتاب ژند اسکی

شرح پاژند یا اس کی تفسیر ادستا یا اس کا خلاصہ خوردہ اوستا لکھی گئی تھیں۔ مگر بعض کا قول یہ بھی ہے کہ یہ کوئی زبان نہیں تھی بلکہ اس رسم الخط کا نام ہے جو اہل ایران نے ارامی و آشوری اقوام سے حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کی اصلی زبان خالص نہ رہی بلکہ اس میں ارامی۔ آشوری اور سریانی زبانوں کے بہت سے الفاظ داخل ہوگئے اور زبان بالکل مخلوط ہوگئی۔ الغرض یہ وہ زبان ہے جو دری کے بعد کی ہے۔ آج کل پرانی فارسی کا جو کچھ ذخیرہ پارسیوں کے یہاں یوروپ و ایشیا کے کتب خانوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ سب اسی پہلوی جدید میں ہے۔

فارسی محققین کا خیال ہے کہ یہ ایک عجیب الخلقت زبان ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ پہلوی زبان سے اجنبی الفاظ اخراج کرنے کے بعد جو زبان بنی وہ فارسی ہے۔ مگر بعض محققین کا قول ہے کہ فارسی زبان کوئی خاص زبان نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت اگر پہلوی زبان پارسیوں کے رسم الخط میں لکھی جائے تو وہ پہلوی ہے، اور اگر عربی رسم الخط میں ہو تو فارسی ہے۔ گویا جس زبان کو فارسی کہتے ہیں وہ نہ دری ہے نہ پہلوی بلکہ ایک رسم الخط ہے جو فتوحات اسلامیہ کے بعد پیدا ہوا مگر ہمیں اس تحقیقات سے اختلاف ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کی جو فصیح ترین زبان خیال کی جاتی تھی وہ برج بھاشا تھی جس کا اثر ہندوستان کی دیگر زبانوں پر پڑا۔ اور ان زبانوں نے عربی و فارسی کا اثر لیکر جدید لشکری زبان قائم کی جس کو عرف عام میں اردو کہتے ہیں۔ اسی طرح فارسی فارس کی زبان تھی جسکا دارالحکومت شیراز ہے اور ایران بھر میں یہیں کی زبان اسی طرح ٹکسالی کہی جاتی جیسے ہندوستان میں لکھنؤ اور دہلی کی بول چال۔

ف۱ قدیم فارسی یعنی۔ پہلوی اور جدید فارسی کے الفاظ کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ موجودہ فارسی زبان قدیم زبانوں کے تغیر پذیر ہونے سے کیونکر بنی:—

قدیم فارسی یا ژند	پہلوی	جدید فارسی	قدیم فارسی یا ژند	پہلوی	جدید فارسی
مُرکھا (موت)	مُرگ	مرگ	چھتھوارہ (چار)	.	چہار
تھریتادنا (بادشاہ کا نام)	فریتون	فریدوں	بندکا (غلام)	بندک	بندہ
آپ (پانی)	آپ	آب	سپادہ (فوج)	.	سپاہ
ہُوُتُو (خود)	خُوُث	خُود	دادی (میں دیتا ہوں)	.	دہم
رَوساکَ (دن)	روج	روز	مُدھو	.	مے
ہَسا	آج	از	بُودھو	بود	بوئی
کوفَہ (پہار)	کوف	کوہ	پادھ (پادن)		پے
گاتھو (جگہ) ژند گاتو	گاس	گاہ	کدھ (کپ)		کے

پاروتی

کیچڑ پٹ بھرے ہوئے تالابوں میں اکثر ایسے کنول دکھائی دیتے ہیں جن کے مقابلہ میں شاہی محلوں کے حوض میں کھلے ہوئے پھول پھیکے معلوم ہوتے ہیں - وہ رنگ وہ روپ جو اُن میں ہے اِن میں کہاں ؟

پاروتی کیچڑ سے بھرے تالاب کے کنول کی کلی تھی - ایسی کلی جو جنگلی چڑیوں کی چھیڑ سے قبل از وقت کھل کر دنیا کا تماشہ دیکھنے لگی ہو - پندرہ سال کی عمر تھی وہ حسن و لطافت کی ایک دلکش دیوی تھی - تیر کی طرح سیدھی کھڑی ہو کر جب وہ مست شباب جھومتی ہوتی چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا حسن کا دیوتا اس کی راہ میں قدم قدم پر پھول برسا رہا ہے - اس کی " سویت - شیام - رتنار " آنکھوں میں وہ جادو تھا جو بڑے سے بڑے سنگدل کو بھی اپنا غلام بنائے بغیر نہیں رہتا -

پھوس کی ایک جھونپڑی میں وہ رہتی تھی - جھونپڑی ایک باغ کے وسط میں تھی اور وہ باغ چاروں طرف باغوں سے گھرا ہوا تھا اُسی باغیچہ میں وہ اپنے ساس اور سسر کے ساتھ رہتی تھی - ماں باپ تو پہلے ہی مر چکے تھے جب اُس نے بارھویں سال میں قدم رکھا تو پاروتی کا شوہر بھی مر گیا اور وہ بیوہ ہو گئی - اس کے سسر نے دو باغ ٹھیکے پر لے رکھے تھے دو بکریاں اور کچھ مرغیاں پلی تھیں - جاڑے میں انڈے اور امرود اور برسات میں آم اور کٹھل بیچ کر اُن لوگوں کا کام چلتا تھا اسی میں وہ خوش تھے - اگر ایک وقت روکھا سوکھا کھا کر - پھٹے پُرانے کپڑے پہن کر بسر اوقات کرنے کو سکھ کہہ سکیں - گھر کا سارا کام پاروتی کرتی تھی اس پر بھی اس کو روزانہ ساس اور سسر کی جھڑکیاں سنی پڑتی تھیں -

پوس کا مہینہ اور صبح کا وقت تھا - پاروتی جھونپڑی میں جھاڑو دے رہی تھی اس کا سسر جوکھو کھاٹ پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا - جھاڑو دیتے ہوئے پاروتی نے کہا " بابا آج کھانے کو کچھ نہیں ہے "

" کچھ نہیں ہے ؟ " ناریل منہ سے ہٹا کر - جوکھو نے بڑی حیرت سے پوچھا -

" کچھ نہیں ہے - آٹا - دال نمک جو کچھ بھی تھا کل ختم ہو گیا "

" اتنی جلدی کیسے ختم ہو گیا رے - ابھی پچھلے اتوار کو اناج لے آیا تھا "

" تو کیا میں نے بیچ کر کھا لیا "

" اینڑی بینڑی " کیوں بولتی ہے رے ؟ سیدھے منہ بات نہیں کی جاتی رانڈ ! بیکار ہی ٹرٹرا رہی ہے "

مجھے "اینڑی بیڑی" بولنا نہیں آتا میں نے تو ایک سیدھی سی بات کہی تھی"۔

"بس چپ رہ! نہیں تو مزاج درست کردونگا"۔

پاروتی چپ ہوگئی - چلم زمین پر اُلٹ کر۔ ناریل ایک طرف رکھکر جوکھو نے تازے امرودوں کا ٹوکرا سر پر رکھا اور بازار کی طرف چل دیا اس کے جانے کے بعد پاروتی نے مرغیوں کو دربے سے نکالا اور انھیں چرانے کے لئے ہانکتی ہوئی باغوں کی طرف چلی۔

پاروتی ایک پیڑ کے نیچے کھڑی تھی کہ یکبارگی اس کے کانوں میں بانسری کی آواز آئی کیسی رسیلی تان تھی پاروتی کا دل دھڑکنے لگا کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہ آئی - ساری کو سنبھالتی ہوئی وہ بانسری بجانے والے کی تلاش میں ادھر ادھر پھرنے لگی۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیا - بانسری خاموش ہوگئی پاروتی کو ایسا معلوم ہوا گویا ساری دنیا ایک گہری نیند میں سوگئی - دھڑکتے ہوئے دل کو ہاتھوں سے دبا کر وہ آگے بڑھی بانسری پھر بجنے لگی باغ میں پھر وہی سماں چھا گیا - مرغیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا - کھیا کر پاروتی نے مرغیوں کو لگی سے آگے بڑھانے کی کوشش کی مرغیاں ادہرادُہر بھاگنے لگیں - پاروتی حیران ہوگئی - اس کی آنکھیں پھر بانسری بجانے والے کو تلاش کرنے لگیں یکایک بانسری پھر رک گئی لیکن اس مرتبہ اس کی مراد برآئی اُس نے کچھ دور ایک آم کی ڈال پر بانسری والے کو بیٹھے دیکھ لیا - وہ سانولے رنگ کا ایک خوشرو نوجوان تھا اس کے بغل میں دو کتابیں دبی ہوئی تھیں - پاروتی پر گویا اُس بڑی بڑی آنکھوں والے نوجوان نے کوئی جادو کردیا وہ ایک ٹک دیکھتی کھڑی رہ گئی - نوجوان مسکرایا اور ڈال سے زمین پر کود پڑا - اس کی طرف سے نظر ہٹا کر پاروتی زمین کی طرف دیکھنے لگی آج تک کبھی کسی نوجوان کو دیکھکر اس کے دل میں ایسی ہلچل نہ مچی تھی اسوقت اس کو ایسا معلوم ہوا گویا اس دنیا میں نہیں ہے بلکہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے - اس کے قریب پہونچکر نوجوان نے پوچھا - کیا تم یہیں رہتی ہو؟ شرمائی ہوئی نظروں سے نوجوان کی طرف دیکھکر پاروتی نے جواب دیا - "ہاں! ادہر اس "بگیا" (باغ) میں جو کٹیا ہے اسی میں رہتی ہوں"

"یہ تمھاری مرغیاں ہیں"

"جی ہاں"

"تم ہی ان کو چرایا کرتی ہو"

"ہاں"

"تمھارے کون کون ہیں"

"یہ سب پوچھکر کیا کروگے بابو!"

کچھ نہیں۔ یونہی پوچھ رہا تھا" نوجوان کے چہرہ پر اُداسی چھاگئی۔ یہ دیکھکر پاروتی کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ دنیا کی شرم و لحاظ سے وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ لگی ادھر ادھر گھماتی ہوئی وہ مرغیوں کو آگے بڑھانے لگی۔

ایک ٹھنڈی آہ بھر کر نوجوان نے حسرت بھری نظروں سے پاروتی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جاتی ہو! اچھا جاؤ ایک بات تو بتاتی جاؤ تمھارا کیا نام ہے؟"

پاروتی اب انکار نہ کرسکی اس معمولی سوال کا اُسے جواب دینا ہی پڑا۔ مڑکر نوجوان کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی شرماکر پاروتی نے کہا "میرا نام پاروتی ہے"

"پاروتی!"

"جی ہاں" وہ آگے بڑھ گئی۔

جب تک پاروتی دکھائی دیتی رہی نوجوان اسے برابر دیکھتا رہا۔ پاروتی نے بھی کئی مرتبہ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ جب پاروتی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو نوجوان ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بانسری بجاتا ہوا آگے بڑھا۔ بانسری کی آواز میں اس وقت درد و غم بھرا تھا جس سے خود نوجوان کا دل تڑپ اُٹھا ادھر وہی آواز ہوا میں اُڑکر پاروتی کے کانوں میں پہونچی اور درد دل کو بڑھانے لگی۔ کچھ دیر ٹھہر کر نوجوان اس باغ میں پہونچا جہاں پاروتی نے اپنی جھونپڑی بتائی تھی۔ وہ امرودوں کا باغ تھا اسوقت پاروتی کی بوڑھی ساس رادھا کے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا ——

"مائی پرنام"

"جیتے رہو بابو جی بھگوان آپ کو بناے راکھے" رادھا اپنی کمزور آنکھوں سے نوجوان کی طرف دھیان سے دیکھنے لگی "مائی! کچھ امرود کھلا سکتی ہو"

"بڑی خوشی سے"

"مگر بڑھیا امرود ہوں؟"

"میرے باغ کے امرود بڑے میٹھے ہیں۔ کھا کر آپ کا جی کھوس (خوش) ہوجائیگا۔ آیئے چارپائی پر بیٹھ جایئے میں ابھی توڑے دیتی ہوں" لگی اُٹھا کر رادھا امرود توڑنے لگی۔

کھاٹ پر بیٹھکر نوجوان بانسری بجانے لگا۔ بانسری میں اس وقت بیراگ کا وہ نغمہ نکل رہا تھا جس سے بےچین دل کو چین ملتا ہے۔ رادھا نے پکار کر کچھ کہا۔ نوجوان نے بانسری بند کردی۔ "کیا ہے مائی"

"کتنے کا دوں بابو جی"

"جتنے کا جی چاہے دیدو مگر خوب عمدہ امرود ہوں"

"بہت اچھا بابو"

نوجوان پھر بانسری بجانے لگا تھوڑی دیر میں دس بارہ چھوٹے بڑے امرود رادھا نے لاکر نوجوان کے سامنے رکھدیئے بانسری کو ایک طرف رکھکر نوجوان امرود کھانے لگا۔ "سچ مچ تمھارے باغ کے امرود بڑے میٹھے ہیں"۔

رادھا کے چہرہ پر فخر و خوشی کی جھلک دکھائی دی۔

"تمھارے گھر میں کتنے پرانی ہیں"

"میں- میرا پتی اور ایک بیوہ بہو کے سوا اب بابوجی ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ہائے میرا جوان بیٹا مجھے اس بوڑھائی (ضعیفی) میں داغ دے گیا" رادھا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

"تم یہاں اکیلی ہو"

"میرا پتی سودا بیچنے گیا ہے اور میری بدنصیب ودھوا بہو مرغی چرانے گئی ہے میں یہاں باغ کی رکھوالی کررہی ہوں"

"اس سال فصل کیسی ہے"

"بہت اچھی ہے بابوجی۔ دیکھئے نہ سارے پیڑ پھلوں سے لدے پڑے ہیں۔ ابھی تو بہت اچھا رنگ ہے، آگے چل کر اترنہ جائے تو جانوں"

"یہ باغ بڑی اچھی جگہ پر ہے"

"ہاں بابوجی! اس "بگیا" کو لئے مجھے آٹھ سال ہوگئے اسے چھوڑ کر میرا جی کہیں جانے کو نہیں چاہتا"

"میں آج پہلی مرتبہ آیا ہوں لیکن میرا بھی یہی حال ہے"۔

"آپ کا گھر کہاں ہے بابوجی!"

"میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، یہاں ایک ضروری کام سے آیا ہوں"

"یہاں کب تک ٹھہرنا ہوگا بھیا"

"دو تین مہینے تو یہاں ضرور رہونگا"

"آپ کیا کام کرتے ہیں"

"ابھی تو پڑھتا ہوں"

"آپ کے ماں باپ تو ہیں نہ بھیا"

"صرف بوڑھے باپ ہیں اور کوئی نہیں- جب میں سات برس کا تھا تو میری ماتا جی سرگباش ہوئیں۔

پتا جی زمینداری کا کام کرتے ہیں"

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ جوکھو آگیا وہ بھی نوجوان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ جوکھو کی طرف دیکھتے ہوئے نوجوان نے کہا۔ "کیوں بابا میرے لئے یہاں کوئی کٹیا بنوا سکتے ہو مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے یہاں رہنے کو جی چاہتا ہے"

"اچھی بات ہے بھیا۔ میں اس باغ میں آپ کو کٹیا بنوا دونگا آپ یہاں خوشی سے رہیں"

"کٹیا بنوانے میں کتنا خرچ لگے گا بابا!"

"پندرہ روپئے سے کیا کم لگے گا"

نوجوان نے اسی وقت جوکھو کو پندرہ روپئے دیدیئے۔ جوکھو نے پوچھا۔ "آپ کا کیا نام ہے بابوجی"

"میرا نام رام سیوک ہے"

ایک گھنٹے کے بعد مرغیوں کو چرا کر جب پاروتی واپس ہوئی تو اپنے سسر کے ساتھ رام سیوک کو باتیں کرتے دیکھکر اس کو بڑا تعجب ہوا۔ خوشی کے مارے اس کا دل ناچ اُٹھا اس کو ایسا معلوم ہوا گویا اس کی کھوئی ہوئی چیز مل گئی۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے ایک مرتبہ رام سیوک کو دیکھکر وہ جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔ خود کو تھوڑی دیر تک سنبھالے ہوئے وہ چپ چاپ کھڑی رہی پھر ہار کر پھوس کی ٹٹی کے ایک بڑے سوراخ میں آنکھیں لگا کر وہ باہر کی طرف جھانکنے لگی۔ اب رام سیوک جانے کے لئے تیار تھا اس نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر جوکھو کو دیا اور کہا "امرود کے دام لے لو"

جوکھو نے کہا بیٹے تو اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔ دلھن۔ اری او دلھن! تیرے پاس ایک روپیہ کا پیسہ ہے'۔

"سوراخ سے الگ ہٹ کر اور جلدی سے باہر نکل کر پاروتی نے کہا نہیں بابا پیسے تو نہیں ہیں

رام سیوک نے کہا۔ کوئی پرواہ نہیں پھر لے لونگا۔ اچھا اب چلتا ہوں کل پھر اسی وقت آؤنگا۔ بندگی!" آگے بڑھ کر رک کر ایک بار پاروتی کی طرف دیکھکر رام سیوک باغ سے باہر نکل گیا۔ ایک طرف زمین پر بیٹھکر من مارے ہوئے پاروتی جھوٹے برتن صاف کرنے میں لگ گئی دور سے پھر بانسری بجنے کی آواز سنائی دی پاروتی کا دل اس کے قبضہ سے نکل جانے کے لئے تڑپ رہا تھا لیکن وہ تو خود سماج کی پابندیوں میں گرفتار تھی دل کو کیسے آزاد کر سکتی تھی۔

چار دن میں کٹیا تیار ہوگئی۔ پانچویں دن سویرے رام سیوک چمڑے کا بڑا بکس اور ایک بستر لے کر آگیا

جوکھو نے اس کے آرام کی تمام چیزیں مہیا کردیں۔

اس پر فضا مقام پر رہتے ہوئے رام سیوک کو دو مہینے ہوگئے۔ وہ وہاں کی سادی زندگی کا بخوبی عادی ہوگیا۔ باغ سے کچھ دور پر گنگا جی بہتی تھیں صبح و شام رام سیوک وہیں سیر کرنے چلا جاتا۔ دوپہر کو کسی گھنے درخت کے نیچے لیٹ کر یا تو کوئی کتاب پڑھتا یا محو خیال رہتا۔ شام کے وقت پاروتی اس کے لئے کھانا پکا دیتی دوپہر کو وہ صرف دودھ یا پھل پر گزارہ کرتا۔ ایک دن شام کے وقت جب وہ سیر سے واپس ہوا تو اُس نے جوکھو کی عورت بھگی کو اپنی کٹیا پر بیٹھے دیکھا"

رام سیوک نے پوچھا۔" یہاں کیوں بیٹھی ہو مائی!"

"تم یہاں نہیں تھے اس لئے یہاں آگئی۔ یہاں کا کچھ ٹھیک نہیں ہے بھیا۔ چور بدمعاش ادھر آتے رہتے ہیں" لالٹین کی روشنی میں رام سیوک نے دیکھا کہ بھگی کی ساری کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔

"تمھارے پاس کوئی دھوتی نہیں ہے کیا؟

"نہیں بیٹا! دو دھوتیاں تھیں دونوں پھٹ گئیں؟"

"اچھا میں کل شہر جاکر تمھارے لئے دھوتیاں لاؤں گا"

"جیتے رہو بیٹا! تم بڑے آدمی ہو۔ ہم غریب آدمیوں کو تم ہی ایسے امیروں کا سہارا رہتا ہے"

"میں بڑا آدمی نہیں ہوں مائی! یہ تمھاری بھول ہے دنیا میں ہم سب برابر ہیں۔ بڑا۔ چھوٹا۔ نیچ۔ اونچ۔ امیر و غریب یہ سب دنیا کا تماشہ ہے اسی کی وجہ سے آج ہماری یہ خراب حالت ہو رہی ہے"

"ٹھیک کہتے ہو بھیا! (مدار لیکن) جیسا تمھارا خیال ہے ویسا سب کا تو نہیں ہے۔ تمھارا کھانا تیار ہوگیا ہی یہاں لے آؤں۔

"کیوں تکلیف کروگی چلو میں وہیں کھالوں گا"

"اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے بیٹا۔ ہمارے بھاگ دھن ہیں جو تم ہمارے ہاتھ کا بنایا کھانا کھا لیتے ہو کوئی ہم لوگوں کا چھوا ہوا پانی بھی نہیں پیتا"

"وہاں مائی اسی چھوت چھات نے تو ہمارا ستیاناس کردیا ہے یہی اندھیر دنیا میں چاروں طرف دیکھ رہا ہوں"

بھگی اُٹھکر اپنی جھونپڑی سے رام سیوک کے لئے پھول کی ایک چمکتی ہوئی تھالی میں کھانا لے آئی اسوقت وہ بہت خوش تھی گویا وہ پوجا کا سامان لے کر کسی دیوتا کے سامنے آئی ہے۔ تھالی کو رام سیوک کے سامنے رکھ کر بھگی کھاٹ کے قریب زمین پر بیٹھ گئی۔ رام سیوک کھانا کھانے لگا۔

"تمھارے یہاں بہت اچھا کھانا پکتا ہے مائی!"

یہ تمھارا خیال ہے بھیا! تمھارے گھر سے بڑھکر ہمارے یہاں کھانا نہیں بن سکتا"

"نہیں مائی! جھوٹی تعریف نہیں کرتا۔ بالکل سچ کہہ رہا ہوں"

بھگی کا دل فخر و انبساط سے پھول گیا۔

"میں نے بڑے بڑے گھروں میں کھانا کھایا ہے لیکن جو لطف جو مزہ تمھارے کھانے میں مجھے ملا ہے وہ کہیں نصیب نہیں ہوا۔ مائی یہ تمھاری محبت کی وجہ سے ہے"

"خوشی کی ترنگ میں ہلوریں لیتی ہوئی بھگی چپ چاپ بیٹھی رہی۔"

"کھانا کھا کر رام سیوک منہ ہاتھ دھونے لگا اور بھگی جھوٹی تھالی لیکر چلی گئی"

دوسرے دن رام سیوک نے اپنا وعدہ پورا کر دیا شہر سے وہ کپڑے خرید لایا۔ دو دھوتیاں بھگی کے لئے دو پاروتی کے لئے اور دو جوکھو کے لئے تھیں۔ بھگی اور پاروتی کے شلوکوں کے واسطے بھی کپڑے تھے۔ جوکھو کے لئے مرزئی اور کرتے کا کپڑا تھا۔ ایک ساتھ اتنے کپڑے ان غریبوں کو کبھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ بھگی نے تو اپنی دھوتیاں رنگ لیں لیکن پاروتی کا تو سہاگ اجڑ چکا تھا وہ تو بیوہ تھی رنگین دھوتی نہیں پہن سکتی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا تنہائی سے چل کر رام سیوک جوکھو کے باغ میں پہونچا اس وقت پاروتی کے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا۔ جھونپڑی کے سامنے ایک کھاٹ پر بیٹھی پاروتی چاول بن رہی تھی گھونگھٹ کی اوٹ سے ایک بار رام سیوک کی طرف دیکھکر اس نے پھر اپنا سر جھکا لیا۔

"پاروتی!"

"جی"

"سب لوگ کہاں چلے گئے"

"اماں ایک پڑوسی کے یہاں گئی ہیں اور بابا سودا بیچنے گئے،،"

"تم کہیں نہیں گئیں"

"جی نہیں۔ یہاں "بگیا" تاکنے کے لئے کسی کا رہنا ضروری تھا۔ اور یوں بھی کسی کے گھر جانا مجھے اچھا نہیں لگتا"

"یہ کیوں؟"

"جس کے یہاں جاؤ وہی اپنا دکھڑا سنانے لگتا ہے مجھے یہ اچھا نہیں لگتا"

"تمھارے ساس سسر تمھارے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں"

"اب تو انھیں لوگوں کے پالے پڑی ہوں جیسا بھی برتاؤ کریں گے مجھے سہنا پڑے گا"

"ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رام سیوک نے کہا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم یہاں خوش نہیں ہو"

پاروتی کے اداس چہرہ کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھکر رام سیوک کا دل بھر آیا وہ ایک آہ کھینچ کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا ــــ

"بابوجی"

"کیا ہے پاروتی!" کچھ رکتی ہوئی آواز سے رام سیوک نے کہا۔

"آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں

"بڑی خوشی سے پوچھ سکتی ہو"

"آپ ہم لوگوں کے لئے یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں"

"اس کا میں کیا جواب دوں پاروتی! اچھا یہ بتاؤ اگر میں تمھاری جگہ پر ہوتا اور تم میری جگہ پر تو کیا تم میرے ساتھ یہی نہ کرتیں"

"کچھ سوچکر پاروتی نے کہا ــــ "ہاں کیوں نہ کرتی۔ضرور کرتی"

"بس یہی جواب ہے"

"ایک بات اور ہے بابوجی! آپ کون ہیں اور کیا کام کرتے ہیں۔یہ تو میں سُن چکی ہوں کہ آپ لکھنؤ کے کسی زمیندار کے لڑکے ہیں لیکن آپ نے اصلی حال چھپایا ہے"

"میں کون ہوں؟" رام سیوک بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ وہ کون ہے اس کے لئے یہ بتانا مشکل ہوگیا۔ کچھ دیر چپ رہ کر اُس نے کہا ــ تم یہ جان کر کیا کروگی پاروتی!"

"کچھ نہیں۔یوں ہی پوچھ رہی تھی"

"اچھا کچھ دن اور صبر کرو تمھیں سب معلوم ہوجائیگا"

"پاروتی کی پہیلی حل نہ ہو سکی وہ ہار کر پھر جا دل بننے لگی۔ رام سیوک نے بھی وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور گنگناتا ہوا اپنی کٹی کی طرف چلا گیا۔

رام سیوک کی فیاضی کی خبر آہستہ آہستہ آس پاس کے گانوں میں پھیلنے لگی۔جو کھو سے سب جلنے لگے۔ آخر جوکھو نے کون سے اچھے کام کئے ہیں جو بھگوان نے اس کے گھر پر ایسا نیک اور فیاض انسان بھیج دیا۔ وہ اپنے باپ کا نہیں ہوا بھائی کا نہیں ہوا لڑکپن ہی میں وہ اپنے باپ سے الگ ہوگیا آگے چل کر بھائی سے مقدمہ بازی کی پھر بھی جوکھو سے بھگوان خوش ہے۔ رام سیوک کا درشن کرنے کے لئے لوگ اس کی کٹی پر پہونچنے لگے اور رام سیوک حتی المقدور اُن کی مدد کرنے لگا۔ رام سیوک مدد کرنے سے تو نہ گھبراتا تھا لیکن وہ تو تنہائی چاہتا تھا اسی کے لئے تو اس نے

اپنا گھر بار چھوڑا تھا لیکن اب تو وہ آدمیوں سے گھبرا رہنے لگا اُس نے سوچا کہ اب وہ یہاں نہ رہے گا لیکن یہاں سے جانے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ جس خیال کو وہ اتنے دنوں تک اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا اب وہ اس سے بہت پریشان رہنے لگا۔

شام کا وقت تھا کھانا کھا کر رام سیوک اپنی کٹی میں آرام کر رہا تھا۔ پان کے دو بیڑے ہاتھ میں لئے پاروتی دروازہ پر آکر کھڑی ہوگئی۔ "پان لے لو بابوجی!"

"کون پاروتی؟ اچھا!" کہتا ہوا رام سیوک اُٹھا اور اُس نے پاروتی کے ہاتھ سے پان کے بیڑے لے لئے اس کی انگلیاں پاروتی کی انگلیوں سے مس ہوگئیں۔ دونوں کا جسم کانپ اٹھا۔

پاروتی نے محبت آمیز لفظوں سے رام سیوک کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں بابوجی"

"کہو! پاروتی بڑی خوشی سے کہو۔ تم تو ہمارے .... تم ..... جانتی ہو ......" رام سیوک رک گیا

پاروتی کچھ شرما سی گئی۔

رام سیوک نے کہا "ہاں تو پاروتی تم کیا کہنا چاہتی ہو"

"رات کے وقت بانسری نہ بجایا کیجئے"

"کیوں؟" رام سیوک نے مسکرا کر پوچھا۔

"کچھ سوچ کر پاروتی نے کہا۔ یہاں جنگل ہے چاروں طرف سانپ رہتے ہیں ان کے نکلنے کا ڈر رہتا ہے"

"تم سانپ سے ڈرتی ہو کیا؟"

"جی نہیں۔ کئی بار تو میں نے خود سانپوں کو مارا ہے"

"تو پھر؟ کیا سچ مچ تم اسی لئے مجھے منع کر رہی ہو"

پاروتی کچھ جواب نہ دے سکی۔ ان سب باتوں کو جنھیں وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھی اس وقت ایسا کھولنے کی ہمت پاروتی میں نہ تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ "جب تم رات کو بانسری بجاتے ہو تو دل میں ہوک سی اُٹھنے لگتی ہے مجھے ساری رات نیند نہیں آتی" لیکن وہ ایسا نہ کہہ سکی وہ اپنا دل مسوس کر رہ گئی مگر رام سیوک سے اس کی یہ حالت پوشیدہ نہ رہ سکی رام سیوک نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا —— "اچھا پاروتی! اب رات کو بانسری نہ بجایا کروں گا" پاروتی اُٹھتی ہوئی آہ کو دبائے ہوئے رام سیوک سے رخصت ہوگئی۔ رام سیوک اپنے بستر پر گر پڑا۔ وہ پاروتی کے دل کا حال اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا یہ نہ ہو سکا۔ پھر بھی پاروتی کے حال سے وہ ناواقف نہ تھا۔ اُس نے سوچا اب یہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں ہے اگر زیادہ دن رہوں گا تو بدنام

ہوجاؤں گا - میں تو گھر سے اسی بات پر ناخوش ہو کر نکلا تھا کہ شادی نہ کرونگا مگر قدرت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے جنگل میں آکر مصیبت میں پھنس گیا ـــــ کیا پاروتی میری ہو سکتی ہے ؟ مگر وہ تو بیوہ ہے اس کے ساس سسر بھلا اسکی دوسری شادی کیوں کرنے لگے ؟ مگر نہیں ایک مرتبہ پاروتی سے پوچھ لوں اگر وہ راضی ہوجائے تو میں دنیا کی بدنامی کا کچھ خیال نہ کروں گا - پتاجی کو میں منالوں گا تو بس ٹھیک ہے آج کی رات یہاں اور رہوں پھر یا تو پاروتی میری ہوجائے گی یا میں یہاں سے پھر کہیں بھاگ جاؤں گا ایسی جگہ جہاں میرا کوئی نام ونشان بھی نہ پائے گا"

دوسرا دن بھی گذر گیا لیکن رام سیوک کو اُس دن پاروتی سے ملنے کا موقع ہی نہ ملا کیونکہ پاس کے گاؤں سے بہت سے لوگ اس سے ملنے آگئے اور تمام دن رام سیوک کو گھیرے رہے - شام کے وقت ایک بوڑھے کسان نے رام سیوک کو علیحدہ بلا کر چپکے سے کہا - " بھیا ! گاؤں میں آپ کی بڑی بدنامی ہو رہی ہے"

رام سیوک کا کلیجہ دھک سے ہوگیا ـــ

سب لوگ کہتے ہیں کہ آپ اور پاروتی ـــــــــ

رام سیوک نے اپنا منھ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا جس بات سے وہ ڈرتا تھا وہ اس کے سامنے آگئی - شام کو سب لوگ چلے گئے اور اس کی کٹی سنسان ہوگئی لیکن رام سیوک کے دل میں جذبات کے طوفان اُٹھ رہے تھے بس میں آج ہی رات کو یہاں سے بھاگ جاؤں گا - میں پاروتی کی بدنامی نہیں چاہتا"

شام کو اسنے کھانا بھی نہ کھایا بلکہ سر میں درد ہونے کا بہانہ کر کے وہ اپنی کھاٹ پر پڑا رہا - رات کے بارہ بجے تھے رام سیوک اپنے بستر پر بڑی بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی عجیب طرح کے خیالات اس کے دل میں آرہے تھے، لیکن وہ سوچتا " بس اس وقت یہاں سے چل دینا چاہئے " اور کبھی کہتا نہیں ایک مرتبہ پاروتی سے مل کر اس سے بھی تو پوچھ لوں" وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس کی جھونپڑی کے دروازہ پر آکر کوئی کھڑا ہوگیا - رام سیوک نے پوچھا ـــــ " کون ؟"

" میں ہوں"

" کون پاروتی ! اس کے تعجب کا کوئی ٹھکانا نہ تھا -

" جی ہاں "

رام سیوک نے اُٹھکر لالٹین جلائی - دروازہ پر پاروتی گھبرائی ہوئی کھڑی تھی - اس کے لمبے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے - رام سیوک نے کہا - " اندر آجاؤ پاروتی ! کیا بات ہے؟"

بغیر کسی جھجھک کے پاروتی اندر آگئی -

"بیٹھ جاؤ"

"پاروتی ایک طرف زمین پر بیٹھ گئی اور کہا۔۔۔" بابو جی! آج تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا۔ کیا خفا ہوگئے؟"

"نہیں پاروتی! میں بھلا خفا ہوسکتا ہوں اصل بات یہ ہے کہ میری طبیعت کچھ خراب تھی"

"کیا یہ بات سچ ہے؟"

رام سیوک کوئی جواب نہ دے سکا۔ تھوڑی دیر انتظار کرکے پاروتی نے کہا۔ "بابو جی! تم کو اصلی بات بتانی پڑے گی میں تمھارے پاؤں پڑتی ہوں بتا دو" یہ کہتی ہوئی پاروتی نے رام سیوک کے قدموں پر سر جھکا دیا۔ ہاں ہاں یہ کیا کرتی ہو؟" کہتا ہوا رام سیوک کھڑا ہوگیا۔ دبی ہوئی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ رام سیوک اب اپنے کو نہ سنبھال سکا۔ اس نے پاروتی کو ٹھہرانا چاہا تھا لیکن خود ہار گیا وہ پاروتی کی زبان سے اس کا حال دل سننا چاہتا تھا لیکن آج اس کو خود اپنا دردِ دل سنانا پڑا اس نے کچھ دیر ٹھہر کر کہنا شروع کیا" پاروتی آس پاس کے گاؤں میں ہماری بدنامی ہورہی ہے اور اس کو بھی جانے دو یہ بتاؤ اگر اس وقت یہاں تم کو کوئی دیکھ لے تو کیا ہو"

"چاہے جو ہو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں بہت ہوگا گھر سے نکال دی جاؤنگی۔ محنت مزدوری کرکے میں اپنا پیٹ پال سکتی ہوں"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن دنیا میں ہماری تمھاری بہت بدنامی ہوگی"

"ہوا کرے نیکنامی بدنامی کوئی چیز نہیں ہے دوسروں کو بدنام کرنے والوں کو میں خوب سمجھتی ہوں اتنے دنوں سے دنیا کا رنگ دیکھ رہی ہوں جو دوسروں کو بدنام کرتے ہیں وہ خود بڑے ہوتے ہیں"

"ٹھیک کہتی ہو پاروتی! دنیا کا رنگ بالکل یہی ہے تمھاری باتیں سنکر مجھے بڑی خوشی ہوئی تم سچ مچ بہادر عورت ہو"

"فخر سے پاروتی کا چہرہ کھل گیا"

"رام سیوک نے پھر کہا" پاروتی! میں تم سے ایک بات بہت دنوں سے کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا"

"وہ کون بات بابو جی!"

"تم میری ہو جاؤ"

"پاروتی نے شرما کر اپنا سر نیچا کر لیا"

"پاروتی! بولو کچھ جواب دو"

"میں تو آج سے نہیں بلکہ اسی دن سے جب میں نے تم کو پہلے پہل دیکھا تھا تمھاری ہو چکی ۔۔۔۔۔ لیکن خیال رہے کہ میں بیوہ ہوں"

"کوئی پرواہ نہیں ۔ میں کوئی پاپ نہیں کر رہا ہوں ۔ میں تمھارے ساتھ اپنا بیاہ کرونگا"

"میں نے ایک غریب نیچ ذات کھٹک کے گھر میں جنم لیا ہے"

"کچھ حرج نہیں"

"تمھارے پتا جی کیا کہیں گے"

"کچھ بھی نہیں"

"برادری تمھارا ساتھ چھوڑ دیگی"

"تم کو پاکر مجھے برادری کی کوئی فکر نہیں ۔ برادری تو صرف دولت کی بھوکی ہے ایک بھوج دے کر سب کو ٹھیک کر لوں گا"

پاروتی کی آنکھوں میں جوش مسرت سے آنسو بھر آئے ٹھیک اسی وقت دروازہ پر جھکو اور بھگی نے قدم رکھا ۔ جھکو نے دانت پیس کر پاروتی سے کہا ۔ "رانڈ ! یہ کیا ۔ تو نے کہیں ہمیں منہ دکھانے کے لائق نہ رکھا ۔ اور بابوجی تم ! تم تو بڑے بگلا بھگت نکلے"

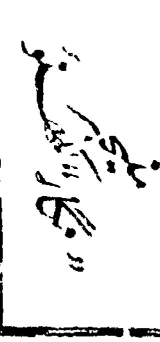
پاروتی نے کہا ۔ بابا ! بابوجی کو کچھ نہ کہو میں اپنی خوشی سے اُن کے پاس آئی ہوں"

بھگی بولی ۔ پاپن چپ نہیں رہتی ۔ بات کرتے شرم نہیں آتی"

"میں نے کوئی پاپ نہیں کیا"

"اچھا پاپن تو اب یہاں سے اپنا منہ کالا کر ہم لوگوں کو اب تجھ سے کچھ مطلب نہیں" یہ کہکر دونوں وہاں سے چل دیئے ۔ صبح ہوئی تو باغ میں رام سیوک اور پاروتی کا پتہ نہ تھا کٹیا خالی پڑی تھی بہت دنوں تک گانوں والے اس کا چرچا کرتے رہے لیکن پھر رام سیوک اور پاروتی کو بالکل بھول گئے ۔ ادھر پاروتی رام سیوک کے ساتھ لکھنؤ پہنچی جہاں ان دونوں کا بیاہ ہوگیا برادری نے اس شادی کی ضرور مخالفت کی مگر ایک بھوج دینے ہی سے سب راضی ہوگئے ۔ (ماخوذ از ...)

اعظم کریوی



فلسفہ قدیم ۱۲ ؍ ۔ ہدایات بھاشا ۱۲ ؍ ۔ نقاب اٹھ جانے کے بعد ۱۲ ؍ ۔ لالۂ رخ ۱۲ ؍ ۔ فراست التحریر مکمل ۱۲ ؍ ۔ سولہ فسانے ۱۲ ؍

ایک ارزاں سودا

ان سب کتابوں کی مجموعی قیمت علاوہ محصول ۲۰ ؍ ۱۱ ہے ۔ لیکن یہ سب کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے میں آپ کو علاوہ محصول ۵ ؍ میں مل سکتی ہیں ہر آرڈر کے ساتھ چوتھائی قیمت آنا ضروری ہے

عرب و اسرائیل کا مستقبل ۱۲ ؍ ۔ شاعر کا انجام ۱۰ ؍ ۔ تبسم ۱۲ ؍ ۔ موج تبسم ۱۲ ؍ ۔ فراست الید ۱۲ ؍ ۔ مذاکرات نیاز ۱۲ ؍

... خیال ۱۲ ؍ ۔ زہر عشق ۱۲ ؍ ۔ شہنشاہ ۱۲ ؍ ۔ فلسفہ مذہب ۱۲ ؍ ۔ تذکرہ خندۂ گل ۶ ؍ ۔ انتخاب گلابی اردو ۸ ؍

باب المراسلۃ والمناظرۃ

عید نوروز

(جناب خیر بھوروی صاحب دفتر العلیم گورکھپور)

مصدر لطف وکرم مولانا نیاز! سلام مسنون

دنیائے اسلام آپ کی سنت پذیر اور شکرگزار ہوگی اگر آپ اپنے فرصت کے خاموش لمحوں میں میرے معروضات پر غور فرما کر اپنی تحقیقی "خیز فانی" وزریں رائے کا اظہار فرمائیں گے۔

۱- "عید نوروز" کی تاریخی، قدامت اور حیثیت کیا ہے؟ آیا اس "جشن پارسی" کو "اسلامی عید" اور مذہب کا ایک ضروری جزو قرار دیکر متبرک سمجھنا اور دنیائے اسلام کو شمولیت کی دعوت عام دینا طفلانہ ضد اور ہٹ سے زیادہ وقیع ہے؟

۲- "جونپور" کے ایک رئیس کا نام نامی اسم گرامی یوں سپرد قلم ہوکر زیب قرطاس ہوتا ہے

"سالک مسلک جعفریہ کاشف حجب ظلمانیہ جہلیہ محقق علل نورانیہ قدسیہ
مؤید اخبار و احادیث نبویہ فاضل جلیل جناب مولانا سید محمد ہادی صاحب
حرسہ اللہ عن شر البریۃ"

اپنے رسالہ "شمسیہ" مطبوعہ کاظمی پریس جونپور" میں "عید نوروز" (جشن پارسی) کو "اسلامی عید" ہونا قرار دیتے ہیں لیکن ریسرچ (تحقیق) سے الگ محض خوش عقیدگی کی بنا پر یا زیادہ سے زیادہ اپنی جماعت کو خوش کرنے کے لئے۔

میں اسے محسوس کرتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ میرے اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد شیعی ارباب صحافت "نوروز" کے مضمون پر بہت کھل کھیلیں گے اور ہندوستان کے شیعی افق سے تحریرات "عید نوروز" کی گھٹائیں زور وشور سے اٹھیں گی کوئی گھٹا زیادہ اور کئی بار برسے گی اور کسی سے صرف ترشح رشحات ہی ہوکر رہ جائیگا۔

بہرحال حقیقت اور واقعیت کا بے نقاب ہونا مقصود ہے نہ کہ کسی کی دل آزاری

یا مناظرہ و مجادلہ شیعی ارباب صحافت و محققین سے بحث نہیں، بلکہ

"کاشف حجب ظلمانیہ جہلیہ تحقیق علل نورانیہ قدسیہ جناب مولانا مولوی

سید محمد ہادی" صاحب "جونپوری"

اگر محققانہ جواب دے سکتے ہیں تو بذریعہ "نگار" صرف امور ذیل کا جواب دیں اور جو ثبوت اور دلیل پیش کریں وہ صرف جہلا ہی کے لئے دل خوش کن نہ ہو بلکہ اہل علم کی جماعت کے لئے بھی) قابل قبول ہو "ثلاث عشرۃ کاملۃ"

۱- اسلام کے اعمال و احکام میں سال و ماہ قمری کا لحاظ رکھا گیا ہے یا شمسی کا؟ اور اگر دونوں ملحوظ ہیں تو کس کس علم و حکم میں-؟

۲- اسلام میں سال کے اندر کتنی عیدیں رسول صلعم کے عمل یا قول سے ثابت ہیں؟

۳- آیا عید الفطر اور عید الضحےٰ کی طرح "عید نوروز" بھی آنحضرت صلعم کے فعل یا قول سے کہیں ثابت ہے؟ اور اس کے بغیر اس کو "اسلامی عید" قرار دینا اور کہنا صحیح ہے؟

۴- اگر رسول صلعم کے قول یا فعل سے ثابت نہیں تو سیدنا علیؓ "باب مدینۃ العلم" نے کبھی یہ عید منائی؟ یا اس کا حکم کسی کو دیا؟ خواہ اس کا استحباب ظاہر فرمایا؟ "ثابت" بدرا امام بو حنیفہ کا ہدیہ "نوروز" جو قبول فرمایا تو اس وقت کم از کم اُس دن کی کوئی اچھائی بیان فرمائی؟

۵- یہ نہیں تو سیدنا امام حسنؓ، امام حسینؓ، امام زین العابدینؓ، امام باقرؒ، (رضی اللہ علیہم اجمعین) میں سے کسی نے یہ عید منائی؟ یا اس کو مستحب و پسندیدہ قولاً یا عملاً قرار دیا؟

۶- یہ سب نہیں تو سیدنا امام جعفر صادقؓ کا عمل کہیں سے ثابت ہے؟ یا "معلی بن خنیس" کے ذریعے صرف دوسروں ہی کو ہدایت فرما دی؟

۷- یہ بھی نہیں تو "معلی بن خنیس" کے سوا کسی اور واسطے سے بھی حضرت امامؓ کا یہ قول یا اس کا ہم معنی کوئی قول ثابت ہے؟ یا صرف "معلی بن خنیس" ہی کے حصے میں ایسی انچھوتی روایت ازل کے روز لکھی گئی تھی؟

۸- حضرت امام صادق آیا اپنے جد خیر المجدود صلعم کے متبع اور پیرو تھے، یا خود صاحب شریعت یا متمم یا مصلح شریعت نبیؐ تھے اور متقدم نبیؐ کی شریعت سے زائد ایک جدید شرعی و اسلامی عید وہ قائم کر سکتے تھے؟

۹- تمام عالم کے مسلمان سُنی و شیعہ تو بظن غالب یہی یقین رکھتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؓ بھی

ناطق تھے۔ خدا اور رسول کے احکام و ہدایات سے خارج نہ ان کا قول ہوتا تھا نہ فعل۔ لیکن "معلی بن خنیس" شریعت مصطفوی سے خارج اور احیاء اسلامی سے زائد ایک عید کی قرارداد آنجناب کی ذات مقدس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس صورت میں راوی یا مصنف کو غلط بیان تسلیم کر لینا مقتضائے حسن ظن و مقتضائے عقل ہے۔ یا حضرت امامؑ کے دامن عصمت پر سنت رسول کی خلاف ورزی اور بدعت کا دھبہ قرین قیاس ہے؟

۱- "نوروز" کو عام "اسلامی عید" کہنا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے جو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہو اور آنجناب بھی اسی صورت میں مانا جا سکتا ہے جب حضرت ہی کے فعل سے ثابت ہو اور جب تک ان دونوں میں سے کسی کا باضابطہ ثبوت پیش نہ لایا جائے اس وقت تک اس دن کو "اسلامی عید" کہنا کیسا مسلمہ سے دور ہٹ ہوا ہے۔

(نگار) ہر چند مجھ پر مکتوب گرامی کا جواب عائد نہیں ہوتا کیونکہ آپ نے براہ راست سید محمد ہادی صاحب جونپوری کو مخاطب کر کے انھیں سے جواب چاہا ہے، لیکن جس حد تک صرف "جشن نوروز" کا تاریخی یا معاشری تعلق ہے مجھے اظہار رائے کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔

"عید نوروز" نہایت قدیم چیز ہے اور شاید ہی کوئی قوم ایسی ہو جس نے سال میں ایک دن اس تقریب کے لئے مخصوص نہ کیا ہو اور اسی دن سے سال کی ابتدا نہ کی ہو۔ چونکہ اس جشن کا تعلق آغاز موسم بہار سے ہے اور مختلف ممالک میں بہار کے مختلف زمانے ہوتے ہیں اس لئے "عید نوروز" کی تاریخیں بھی مختلف نظر آتی ہیں۔ قدیم مصریوں اور ایرانیوں میں عید نوروز کا زمانہ وہ ہوتا تھا جب آفتاب برج حمل میں جاتا تھا اور خط اعتدال پر ہوتا تھا۔ یعنی ۲۱ ستمبر۔ یونانیوں میں پانچ سو سال قبل مسیح تک جو وقت اس جشن کا مقرر تھا وہ ۲۱ دسمبر سمجھنا چاہیئے اس کے بعد انھوں نے ۲۱ جون کا وقت مقرر کیا۔ قدیم رومیوں میں بھی پہلے ۲۱ دسمبر ہی مقرر تھی لیکن پھر یکم جنوری کر دی گئی۔ یہودیوں میں اس کا زمانہ تشرین کے مہینے پر ہوا کرتا تھا۔ یعنی مابین ستمبر و اکتوبر۔ عہد وسطیٰ کے عیسائیوں میں جشن نوروز ۲۵ مارچ کو ہوا کرتا تھا لیکن ۱۵۶۳ء تک یورپ کے اکثر ممالک نے یکم جنوری کو متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہندوؤں کے یہاں بسنت و ہولی کا زمانہ سمجھئے۔ عربوں میں قبل ظہور اسلام جو صورت بھی رہی ہو لیکن ظہور اسلام کے بعد یقیناً کوئی مخصوص تاریخ عید نوروز کی ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ قمری مہینوں کے سال میں اس کا التزام ناممکن ہے اور اسلام نے موسم کے لحاظ سے "اعیاد و رسوم" کے تعین پر کوئی توجہ نہیں کی اور نہ اس وقت کی سیاسیات کا اقتضاء یہ ہو سکتا تھا اس لئے مذہبی نقطۂ نظر سے "عید نوروز" کی اہمیت کو ثابت کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ دعویٰ کرنا کہ ماہ محرم قمری حساب سے بھی ہمیشہ ایک ہی موسم میں آ سکتا ہے۔ البتہ معاشری حیثیت سے میں اس طرح کی تمام

تقریبوں کا قایل ہوں اور اگر کوئی شخص ان کی پابندی کرے تو اہل مذہب کو دخل دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ انسانی نظام تمدن کے اس شعبہ سے وابستہ ہے جہاں مذہب کو بالکل سکوت اختیار کرنا چاہئے۔

آپ قوموں کے مراسم پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کا تعلق موسم سے ہے۔ چنانچہ انھیں میں سے ایک "نوروز" بھی ہے اس لئے اگر ایران کے مسلمان جہاں زمانۂ قدیم سے عید نوروز منانے کی رسم چلی آتی ہے اس میں حصہ لیں تو اعتراض کا موقعہ نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کا "ایرانی نوروز" منانا البتہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ اس ملک کا نوروز وہی ہے جو یہاں کے موسم کے لحاظ سے ہندوؤں نے مقرر کیا ہے اور اس میں ضرور مسلمانوں کو شریک ہونا چاہئے۔

اس قسم کی سالانہ تقریبیں ہمارے نظام معاشرت و تمدن کے لئے بہت مفید ہیں اور اس نوع کی اجتماعات سے علاوہ اتحاد و اتفاق یا تبادلۂ خیالات کے ولولۂ نشاط و عمل میں بھی تحریک پیدا ہوتی رہتی ہے جو دلیل ہے ایک قوم کے بقاء حیات کی۔

بہرحال میرے نزدیک "عید نوروز" کو "اسلامی عید" کہنا تو کسی طرح درست نہیں کیونکہ مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں، البتہ اسے "ایرانی عید" یا "موسمی عید" کہکر ایران کے مسلمانوں کو ضرور اس میں حصہ لینا چاہئے جس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بسنت اور ہولی میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ جشن مسرت میں شریک ہونا ضروری ہے۔

ہندوستان کے شیعہ حضرات نے، محض اس لئے کہ ایران ان کے مذہب کا مرکز رہا ہے اور ہے وہاں کی اس قدیم رسم کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا ہے ورنہ مذہب کو اس سے کیا تعلق۔

چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کے امن و سکون کا راستہ معلوم کریں تو اسکو ملاحظہ فرمائیے

مادئین کا مذہب

وجود باری کے ثبوت میں بےمثل مضمون

حرکت کے کرشمے

اگر آپ قدرت کے کرشموں کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے ملاحظہ فرمائیں تینوں ایک ہی جلد میں ضخامت ۲۰۰ قیمت معہ محصول عہ

باب الاستفسار

ازدواج بے خلوت

(جناب خواجہ اختر حسین صاحب پٹنہ)

گذارش خدمت ہے کہ وہ دو ہستیاں جو ازدواجی زندگی کے رشتہ میں منسلک کردیجاتی ہیں اگر اقتضائے فطرت کو جس کا مفہوم بقائے نسل ہے اپنی شب عروسی سے کلیتاً عمل میں نہ لائیں (خواہ ان کا یہ عمل کسی ایک جانب سے ہو یا باہمی رضامندی سے) اور اُن کا مطمح نظر بھی دنیا کے اس متذکرہ نظریہ سے بالکل علیحدہ اور جدا ہو تو کیا ان کے میان عالمگیر محبت کی نشو و نما ہو سکتی ہے ۔ اور ایک دوسرے کے جذب و کشش کا مرکز بن سکتی ہیں؟ مہربانی فرما کر آپ ہر دو صورتوں میں اس کے اسباب و علل سے مطلع فرمائیں

(نگار) میں نے آپ کا استفسار کئی بار پڑھا اور ہر مرتبہ کوشش کی کہ اس کا صحیح مدعا ذہن نشین ہو جائے لیکن اپنی کامیابی کا مجھے کبھی یقین نہیں ہوا ۔ آپ کی تحریر کا مفہوم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "اگر شادی کے بعد میاں بیوی خلوت صحیحہ کے تعلقات سے علیحدہ رہیں تو باہمدگر محبت قائم رہ سکتی ہے یا نہیں" —— لیکن آپ کے اس فقرہ سے جس میں آپ نے "اقتضاء فطرت کا مفہوم "بقاء نسل" قرار دیا ہے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ کہیں آپ کی مراد "قطع پیدائش" یا (Birth Control) سے تو نہیں —— اسی کے ساتھ "عالمگیر محبت کے نشو و نما" والا فقرہ بھی الجھن میں ڈالنے والا ہے ۔ ممکن ہے آپ کا مدعا اس سے یہ ہو کہ تعلق جنسی پیدا نہ کرنے کے بعد ساری دنیا سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے یا نہیں ۔

بہرحال ان میں سے جو مفہوم بھی ہو ، بہت غور طلب ہے اور کافی بحث چاہتا ہے ۔ گو اس وقت میں اسکے لئے طیار نہ ہوں ——

اس مسئلہ میں سب سے پہلے "شادی" یا فلسفۂ ازدواج پر غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ ممکن ہے آپ اس کے مخالف ہوں ، لیکن ، جیسا کہ بارہا میں نگار کے صفحات میں ظاہر کر چکا ہوں ، میرے نزدیک شادی کا تعلق محبت سے ہو ہی نہیں سکتا ، اور نہ محبت کے اصول پر رشتۂ ازدواج قائم کرنا کوئی فعل مستحسن ہے ۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو "محبت وحسن" کا مفہوم محض "خیالی غیر مادی" قرار دیکر ان کو کسی اور دنیا کی چیز ظاہر کرتے ہیں بلکہ میرے نزدیک (جہاں تک مرد عورت کا تعلق ہے) "محبت" شاعرانہ نام ہے صرف "خواہش جنسی" کے ہیجان کا اور "حسن" سے مراد ہے صرف وہ "محل یا مصرف" جہاں ہم اپنی "خواہش جنسی" کے ہیجان کا علاج چاہتے ہیں۔ یہ میں اسی دنیا کی باتیں کر رہا ہوں۔ عالم لاہوت وغیرہ کا ذکر نہیں جہاں "حسن مجرد" اور "عشق حقیقی" وغیرہ کی بہت سی نہ سمجھ میں آنے والی اصطلاحیں گھڑ لی گئی ہیں ــــــ

پھر جب محبت سے مراد صرف "ہیجان نفس" ہوا تو محبت کے اصول پر شادی کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ جس وقت یہ خواہش پوری ہو جائے گی نکاح کی بھی اہمیت جاتی رہیگی اور اس غریب کی بھی جسے صرف خواہش نفسانی کے پورا کرنے کا ذریعہ سمجھکر بیوی بنایا گیا تھا۔ ممکن ہے آپ کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہو لیکن یورپ کی موجودہ ازدواجی زندگی کو دیکھئے اور پھر فیصلہ فرمائیے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا اس میں کس حد تک صداقت پائی جاتی ہے ــــــ مغرب نے ہمیشہ مشرق کے مقابلہ میں یہی فخر کیا کہ اس نے عورت کی سطح کو بہت بلند کر دیا اور شادی کو محبت کے اصول پر قائم کر کے "جنت ارضی" کا مالک بن گیا، لیکن نگاہ حقیقت شناس بخوبی واقف ہے کہ اس کے یہ دونوں دعوے غلط ہیں، عورت کے ساتھ عیسوی مذہب اور عیسوی جماعت نے جو جو بدسلوکیاں روا رکھیں اور دنیائے معاشرت میں جس پستی تک اسے پہونچا دیا اس کے متعلق تو ہم آئندہ اشاعت میں مفصل تحریر کریں گے، لیکن "نکاح" کے سلسلہ میں "محبت" کی یا "محبت" کے سلسلہ میں "نکاح" کی جیسی مٹی انھوں نے پلید کی ہے، اس کو تو آپ اسی وقت سمجھ لیجئے اور مغرب کے اخباروں کو اٹھا کر دیکھئے کہ یہ محبت کی بنا پر شادی کرنے والے کیا کر رہے ہیں اور کس عذاب میں مبتلا ہیں ـ عبدالماجد دریابادی نے تو خیر کئی مہینے صبر کیا، مگر وہاں تو بسا اوقات ایک رات بھی صلح و آشتی سے بسر کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور طلاقوں کا شمار نکاح سے زیادہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کا سبب وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا کہ وہاں تعلق ازدواج کی اہمیت کا اندازہ جذبۂ محبت کی بنا پر کیا جاتا ہے اور محبت چونکہ ہیجان نفس کا "تجارتی نام" ہے اس لئے یہ سودا جو پہلے بڑی خوشی خوشی کیا جاتا ہے بعد کو بلائے جان ہو جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ محبت میں بڑی لذت ہے لیکن اس لذت کا فلسفہ صرف یہ ہے کہ جس ہستی سے جذبۂ محبت یا ہیجان نفس متعلق ہو جاتا ہے وہ ہمارے لئے عسیر الحصول ہوتی ہے یا یہ کہ ہماری نہیں ہوتی اور ہم میں اس کی جستجو پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر جب وہ حاصل ہو جاتی ہے تو ہم میں قدرتاً یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ بالکلیہ اُسپر قابض ہو جائیں

اور کسی اور کے تصرف کے لئے اسے شجرِ ممنوع قرار دیدیں۔ پھر جس قدر یہ جذبہ بالتصرف جس قدر شدید و قوی ہوگا اتنی ہی کمی محبت میں پیدا ہو جائے گی اور چونکہ ازدواج کا رشتہ ایک عورت کو پوری طرح مرد کے قابو میں لے آتا ہے اسلئے محبت بھی پوری طرح ختم ہو جاتی ہے اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ نکاح سے زیادہ لذات کی دشمن کوئی چیز نہیں ایک بازاری یا دوسری عصمت فروش عورت کے ساتھ مواصلات کے بعد بھی خواہ وہ کیسی ہی معمولی چیز کیوں نہ ہو، یک گونہ ہیجان یا تعلق شیفتگی قائم رہتا ہے صرف اس لئے کہ اس پہ تصرف کامل نہیں ہوتا اور رقابت کی آگ مشتعل رہنے کے اسباب پیدا ہوتے رہتے ہیں، برخلاف اس کے گھر میں بیوی خواہ کتنی ہی جمیل و خوش ادا کیوں نہ ہو اس کی طرف میلان باقی نہیں رہتا محض اس وجہ سے کہ وہ چیز اپنی ہے اور بالکل اپنی یہی وہ فلسفہ ہے جس کی بنا پر ایک عورت کی خوبی یا دلکشی کا نظریہ صرف یہ قرار دیا جاتا ہے کہ "عورت ہو اور پرائی ہو"۔

اس لئے اگر ہم کسی عورت سے صرف جذبۂ محبت کی بنا پر شادی کرینگے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مواصلت کے بعد وہ کیفیت ختم ہو جائے گی اور اس کی طرف سے احتراز پیدا ہونے لگے گا۔ لیکن اگر نکاح کو ضرورتاً اس کی ضرورت سمجھ کر عمل میں لایا جائے اور محبت و عشق کا جھگڑا درمیان میں نہ ڈالا جائے تو کوئی الجھن پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ بُعد و افتراق کی نوبت آ سکتی ہے۔

بیوی کو موقتہ بنا کر رکھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اُس کو معشوقہ سمجھنا سخت اصولی غلطی ہے آپ نے اگر اسے صرف تعلق جنسی کا ذریعہ یا آلہ سمجھا تو چند دن میں وہ بالکل بے مزہ چیز ہو کر رہ جائے گی، لیکن اگر اُس کو رفیق حیات، شریک زندگی، اور ایک پرخلوص دوست کی حیثیت دی گئی تو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ تعلق اور زیادہ قوی ہوتا جائے گا اور رشتۂ ازدواج کی اہمیت کا صحیح اندازہ آپ کو ہونے لگے گا۔

اب اس تمہید کے بعد میں آپ کے استفسار پر غور کرتا ہوں — — — — آپ فرماتے ہیں کہ اگر رشتہ ازدواج کے بعد استمتاع فطرت کی طرف اعتنا نہ کیا جائے اور میاں بیوی دونوں تعلق جنسی سے علیحدہ رہیں تو کیا جذباتِ محبت قائم رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کے جواب میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہر چند اس صورت میں کوئی استحالۂ عقلی تو نہیں پایا جاتا، لیکن اسکو ہم "محال عادی" ضرور کہہ سکتے ہیں، علاوہ اس کے یہ صورت کچھ مناسب بھی نہیں معلوم ہوتی کیونکہ رشتۂ ازدواج کا ایک مقصد بقائے نسل بھی ہے اور اگر اس کو نظرانداز کر دیا گیا تو پھر مرد و عورت کی زندگی ایک سنسان بے آب و گیاہ صحرا سے زیادہ نہیں رہتی۔ اور یہی وہ چیز ہے جو نظام تمدن سے نوع انسانی کی وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اور اسی کا وجود ہم کو بتاتا ہے کہ دنیا میں صحیح محبت کس چیز کا نام ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ "کیا اس سے عالمگیر محبت کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بے تعلقی خود اپنے نفس سے بھی چند دن میں انسان کو بیزار کر دینے والی ہے چہ جائیکہ "عالمگیر محبت" کا جذبہ پیدا ہوتا

ہاں میں اس کا ضرور مخالف ہوں کہ ضرورت سے زیادہ اولاد پیدا کی جائے۔ اور اگر تعلق جنسی قطع کر دینے کے علاوہ کوئی اور صورت کثرت اولاد کو روکنے کی نہیں ہو سکتی، تو میں پھر اس تعلق سے بھی باز رکھنے کا مشورہ دوں گا، کیونکہ اس وقت ہمارے متعدد اسباب نکبت و افلاس میں ایک بڑا سبب یہ بے تکا پن بھی ہے کہ اپنی مالی حالت کا اندازہ کئے بغیر اولاد پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ اگر زندگی کا مقصود صرف اولاد پیدا کرنا ہے۔ بلا لحاظ اس کے کہ ہم اُن کی تعلیم و تربیت یا صحیح نشوونما کے ذرائع رکھتے ہیں یا نہیں، تو خیر، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس سلسلہ کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے دیں۔ خواہ اس کے لئے ہم کو تعلق جنسی ہی سے کیوں نہ تائب ہونا پڑے ——

آپ اس ماہ کی اشاعت میں مسٹر محمد عاقل ایم۔ اے کا ایک مضمون ملاحظہ فرمائیں گے جس میں "آبادی" کے مسئلہ پر نہایت فاضلانہ گفتگو کی گئی ہے، اس لئے میں ضرورت نہیں سمجھتا کہ ان اشارات سے آگے بڑھوں آپ اس مضمون کو غور سے پڑھئے اور معلوم کیجئے کہ "بقاء نسل" سے کیا مراد ہے اور "کثرت اولاد" ممکن ہے "بقاء نسل" ہو لیکن بقاء قوم و انسانیت نہیں۔

کاجل - سرمہ - چورن - منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے۔
دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو:- سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا ایک شیشی اور بھیجدیجئے۔

کاجل - آشوب سرخی، ضعف بصارت کے لئے از بس مفید ہے بک بیہ جو ایک شخص کیلئے سال بھر کو کافی ہے قیمت ۱۰ **سرمہ** - یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں نہ ممیرہ ہے نہ کوئی معمولی سرمہ ہے جن کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھند، موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے قیمت فی پڑیہ ۱۰ علاوہ محصول - **چورن** - یہ وہ اکسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے پیٹ کا درد، قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم، دستوں کا آنا سب یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ ۱۰ علاوہ محصول **منجن** - اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ، تولہ ایک روپیہ ۱۰ علاوہ محصول۔

نوٹ:- سب چیزیں مع منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف

پتہ:- م بیگم ذریعۂ رسالہ نگار لکھنؤ

سیر محشرستاں

(یہ نظم مثنوی ابر گہربار دیکھنے کے بعد لکھی گئی)

عزم تھا سیرِ محشرستاں کا   دل میں طوفان شوقِ ارماں کا
پہلے دل وقفِ سوز و ساز ہوا   پھر کھل کر [illegible] ہوا
پی کے اک معرفت کا پیمانہ   کیفِ عرفاں میں بے حجابانہ
وادیٔ مہر و ماہ سے گزرے   ہر جنوں خیز راہ سے گزرے
گفتۂ قلبِ ناصبور کیا   ہفت افلاک کو عبور کیا
گھوم کر ساری جلوہ گاہوں سے   آخرش حشرگاہ میں پہنچے
مجتمع تھا ہجومِ بے پایاں   دم بخود تھے تمام پیر و جواں
ایستادہ تھے سب امیر و فقیر   فکر میں غرق تھے صغیر و کبیر
دیدنی تھا ہر ایک چہرۂ زرد   ہونٹ تھے خشک اور جسم تھے سرد
ہر بشر خوف سے پریشاں تھا   روح لرزاں تھی جسم لرزاں تھا
تل رہے تھے ہر ایک کے اعمال   ہر بشر تھا غم و الم سے نڈھال
تختِ ذی شاں جلال آرا تھا   داورِ حشر جلوہ فرما تھا

یک بیک ایک بندۂ آزاد   راست قد خوبرو و شوخ نہاد
یعنی وہ شاعرِ طلسم نگار   غالبِ نکتہ سنج و بادہ گسار
عجب اندازِ بے قراری سے   یعنی اک شانِ وضعداری سے
چیر کر سب ہجوم کو نکلا   اور بصد احترام یوں بولا
اے خدائے جہان کے معبود   ناظرِ عرش کے [illegible] وجود
سارے احوال تجھ پہ ظاہر ہیں   میرے اعمال تجھ پہ ظاہر ہیں
جانتا ہے حریفِ ہوش ہوں میں   کشتۂ ذوقِ ناؤ نوش ہوں میں

عمر پینے ہی میں سب بسر کی ہے   زندگی میکشی میں کھو دی ہے!
عاشقِ بادۂ مجاز رہا ہوں میں   پیکرِ شوقِ جاں گداز ہوں میں
فردِ اعمال میں بھرا کیا ہے   اس کی پرتال میں دھرا کیا ہے
گر جہنم میں بھیجنا ہے مجھے   تو بھلا اس میں عذر کیا ہے مجھے
جس کا دل [illegible] ہو   کیا جہنم کا اس کو دھڑکا ہو
مجھ سے بڑھ کر تو حالِ زار نہیں   حسرتوں کا کوئی شمار نہیں
ذکرِ آرام و بیکسی کیا ہے   نامرادوں کی زندگی کیا ہے
جنبشِ دیدہ نہیں ہے تابِ شکیب   کھا گیا ہوں تمام عمر فریب
مجھ کو انصاف کا خیال بھی ہے   دل کو وقتِ احتمال بھی ہے
کیا کروں دل یہ مانتا ہو جب   عدل ہے ایک لفظِ بے مطلب

یاد ہے تجھ کو عادلِ یکتا   ماجرا میری جاں نگاری کا
آہ وہ حشر آفریں راتیں   برق و باراں کی دلنشیں گھاتیں
وہ گھٹاؤں کا کیف وجدانی   وہ فضاؤں میں مے کی طغیانی
نغمہ ہائے طرب سے شور بدوش   آہ وہ میکدہ کا جوش و خروش
نعرہ مستوں کا ہجومِ مستانہ   مستیوں کا شعارِ رندانہ
گلرخوں کی ادائیں بہکی ہوئیں   مطربوں کی نوائیں بہکی ہوئیں
عیش کی کامرانیوں کا سماں   حشر آرا جوانیوں کا سماں
لیکن اس کیف زارِ عشرت میں   موسمِ زرنگارِ عشرت میں
آہ وہ میرے گھر کا حال خراب   زندگی تھی کہ ایک طرفہ عذاب

سچ تو یہ ہے کہ شق ہیں قلب و جگر — روح میں جذب ہیں الم کے شرر
مجھ کو جنت میں بھی اگر بھیجا — دل وہاں کیا لگے گا اب میرا
خلد و دوزخ کی جب نہیں پروا — کس طرح ہوگا فیصلہ میرا

گر اشارہ کری فرشتے سے — جا کے دو چار مے کے خم لا دے
جب تلک بزمِ حشر گرم رہے — بادۂ جانفزا کا دور چلے
سن رہے تھے یہ خطبۂ رنگیں — ہمہ تن گوش ہو کے پاس کہیں
رندِ آزاد، حضرتِ خیام — بولے با اضطراب و شوق تمام
حشر میں میکشی ضروری ہے
آپ کی گفتگو اصولی ہے

خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا — فکر کیا حشر کے نتیجے کا
ہاں مگر تا ہنوز اے غفار — اپنے اعمال پر ہیں ہم مختار
خونِ دل کس لئے پئیں پھر ہم — تشنہ لب کس لئے جئیں پھر ہم

عدم

نشاطِ روح

سوائے درد نہیں اور حسرتِ بیمار — نشاطِ روح تمنا ہے لذتِ آزار
کہاں ہے موجۂ مے میں وہ شوخیِ رفتار — ہزار جام پہ بھی ہے فسردگیِ خمار
بہار میں بھی ہوں بیگانۂ نشاطِ بہار — مرے شباب میں ہے زہرِ خندۂ بیمار
مرا تبسمِ بے کیف — گریۂ خاموش — شگفتگیٔ دل — افسردگیٔ شمعِ مزار
یہ سوچتا ہوں کہ انجامِ کار کیا ہوگا — ابھی سے موجِ نفس میں ہے رنگِ کاوشِ خار
شریکِ حسن اگر ذوقِ خود نمائی تھا — نگاہِ شوق کو دینی تھی طاقتِ دیدار
شگفتگی ہے نثار ایک ایک ذرے پہ — نسیمِ صبح تھی کس کی لطافتِ رفتار
نوائے پردۂ دل ہے رہینِ سازِ الست — ہنوز روح فزا ہے وہ لذتِ گفتار
قصورِ عشق نہیں شکوہ سنجیٔ کوکب
متاعِ دل سے ہے اے دوست گرمیٔ بازار

کوکب شاہجہانپوری

چاند

اے نگار مہ جبیں اے شمع بزم امکاں
اے بت سیمیں تن اے چشم و چراغ آسماں

ہیں ترے شایانِ شاں اے آسماں کے تاجدار
یہ تصور نیلگوں یہ تخت و تاج زرنگار

یہ کمال حسن تیرا اور یہ نورانی شباب
اللہ اللہ اس قدر بے پردہ عریاں بے حجاب

سطح دریا پر بہار جلوۂ مہتاب ہے
یا کبھی پانی پہ اک چادر سیماب ہے

وہ ترا گرداب کے حلقوں میں رقص جلوہ پاش
وہ تری موجوں کے ہمراہ مستیٔ بے راہ و تلاش

شیشۂ سیال میں وہ عکس مہتابی ترا
موج کی آغوش میں وہ رقص سیمابی ترا

اے بت ساغر بکف اے ساقیِ مینا بدوش
اے بہار میکدہ اے آرزوئے بادہ نوش

تیرے ہی دم سے ہے صہبائے کہن میں کیف و جوش
تیرے ہی دم سے ہے شور انگیز بزم نائے و نوش

تیرے ہی دم سے ہے شوخیٔ جام شراب
تیرے ہی دم سے ہے کیف نغمۂ چنگ و رباب

اے مہ شب تاب اے چشم و چراغ کائنات
اے مہ شب تاب اے شمع شبستان حیات

میرے ویرانے میں بھی کاش آئے دم بھر چاندنی
سر براہ تجلی سے آ جائے جبیں کی چاندنی

کس قدر جاں بخش ہے یہ خوبی تری
کس قدر جانِ شعریت ہے یہ خوبی تری

یہ جمال دلربا یہ عارض سیمیں ترا
یہ عذار یاسمین یہ خندہ نوشیں ترا

تو نکلتا ہے تو بڑھ جاتی ہے بے تابی مری
مجھکو تڑپا دیتی ہے تقدیر سیمابی مری

مجھکو کر دیتا ہے سودائی یہ نظارہ ترا
دیکھتا رہتا ہوں میں روئے جمال آرا ترا

تو نکلتا ہے تو از خود رفتہ ہو جاتا ہوں میں
بیخودی شوق کی وسعت میں کھو جاتا ہوں میں

تیری کرنوں سے لپٹ جاتا ہوں میں مستانہ وار
چومتا ہوں عارض سیمیں ترا دیوانہ وار

گھر سے باہر جانب صحرا نکل جاتا ہوں میں
دل کے ذرہ ذرہ کو پھر وجد میں لاتا ہوں میں

اس فضائے مست کے نغموں پہ سر دھنتا ہوں میں
تجھ سے پیغام محبت آفریں سنتا ہوں میں

تیری ان سیمیں اداؤں پر غرض مرتا ہوں میں
تیری ان جلووں سے دامانِ نظر بھرتا ہوں میں

تجھسے جب ہوتی ہیں خلوت کی ملاقاتیں مری
ہائے تو کرتا ہے پھر کیا کیا مداراتیں مری

تو ہے جب تک تجھسے ہوتی رہتی ہیں باتیں مری
یونہی کٹ جاتی ہیں ساری چاندنی راتیں مری

چھیڑتا ہوں داستاں درد محبت کی کبھی
شرح کرتا ہوں غم جانکاہ فرقت کی کبھی

اے مرے چاند! اے سراپا داغہائے سوز و ساز
اے مری چاند! اے حبیب جاں نواز و دل نواز

کر دیا تیری محبت نے مجھے یوں بے نیاز
اب نہیں اٹھتی کسی جانب نگاہ پاک باز

ہو گیا حسن حقیقت کا مجھے عرفان راز
اب نہیں کچھ جاذب ذوق نظر حسن مجاز

تو ہی اس عالم میں ہے میرا انیس و غمگسار
تو ہی ہے اک مایۂ تسکین جان بیقرار

آشنائے درد پنہاں ہے شریک غم ہے تو
محرم راز نہاں ہے مونس و ہمدم ہے تو

تو مرا آرام جاں ہے تو مرا محبوب ہے
تو مری جان تمنا ہے، مرا مطلوب ہے

باوجود اس قرب کے بھی آہ تجھسے دور ہوں
اے مہ کامل! ترا میں عاشق مہجور ہوں

میرے پیارے چاند! آجا تو مری آغوش میں
دوسرا کوئی نہیں اس وادی خاموش میں

آکہ اب تجھپر فدا ہو جاؤں میں پروانہ وار
آ ترے قدموں پہ یہ جان حزیں کر دوں نثار

محمد یحییٰ (اعظم گڈھ)

زندگی کا طوفان

آسماں پر گھٹائیں چھائی ہیں
کالی کالی بلائیں چھائی ہیں

وحشت انگیز خشمگیں بادل
حشر زا، حشر آفریں بادل

عالم طیش میں گرجتے ہیں
یا جنوں کے رباب بجتے ہیں

غیظ آلود قہر خیز ہوا
مرتعش اور تیز تیز ہوا

جب فضاؤں میں سرسراتی ہے
روح آفاق کانپ جاتی ہے

موت اس زندگی کے طوفاں میں
بزم ہستی کے محشرستاں میں
بجلیوں کی کڑک سے سہمی ہوئی
خوف سے سانس لے نہیں سکتی

باقی صدیقی (راولپنڈی)

ناتمامی

درست ہو نہ سکے کائنات کے اجزا — حیات گرچہ رہینِ صدا اضطراب رہی
اصول رزم سکھائے نظام بزم دیا — نگاہ شوخ بنی، محرم حجاب رہی
کبھی ترانۂ آغاز و گاہ حزن مآل ہو — سکوتِ پیری و ہنگامۂ شباب رہی
کہیں فضائے تبسم میں اشکباری کی — فسردگی میں کبھی صرفِ آب و تاب رہی
کمال ناز بنی، نازش کمال ہوئی — نقاب راز اٹھایا، تہ نقاب رہی
نوائے مرغ گلستاں کو دردمند کیا — کلی کی طرح کھلی صورتِ گلاب رہی
خوشی کے راگ سنائے سرشک درد بہائے — پیام امن ہوئی، درس اضطراب رہی
سحر کی بزم میں چھیڑا سرود بیداری — فضائے شام میں وقف نشاطِ خواب رہی
دلوں کو سوز محبت سے بہرہ مند کیا — حدیث مطرب و کیفِ شراب ناب رہی
کہیں وفور طرب سے نشاط روح بنی — فنا کی زد میں کبھی صرفِ پیچ و تاب رہی
کبھی تبسم دلکش، کہیں نگاہ عتاب — سکونِ ماہ بنی، جوشش آفتاب رہی
ہزار بار جلائے چراغِ امن و سکوں — ہزار مرتبہ سرگرم انقلاب رہی
غرض ہزار طریقوں سے بزم گیتی میں — ستیزہ کار ہوئی موردِ عذاب رہی
مگر بایں ہمہ سعی و عمل گرہ نہ کھلی — حیات، موت کے ناخن کی زخم یاب رہی

ہجوم ظلمت روز سیاہ ہو کے رہا
مآل کار گلستاں تباہ ہو کے رہا

علی اختر (حیدر آباد دکن)

صبحِ نور افروز

سحر انگڑائیاں لیتی افق سے اس طرح آئی
کہ ہر ذرہ پکار اُٹھا قیامت کی ہے رعنائی
جگایا نیند کے ماتوں کو آ کر خوابِ راحت سے
خرامِ ناز ہے ہمرنگِ اعجازِ مسیحائی
دیا درسِ عمل بھی اور پیامِ کار بھی لائی
گلستانِ مسرت میں بہارِ آرزو آئی

نسیمِ سرد کے جھونکے بہ عنوانِ خراب آئے
گلوں میں مستیاں بھر نے بہ اندازِ شباب آئے
یہ مستی اور یہ اٹھکھیلیاں گلشن کی کلیوں سے
کہ جیسے پی کے متوالا کوئی خانہ خراب آئے
ادھر معصوم غنچے شرم سے گردن جھکاتے ہیں
اُدھر جھونکے ہوا کے چوم کر منھ جھوم جاتے ہیں

طیورِ خوش نوا کے ساز میں ساری فضا گم ہے
طرب انگیز نغمے ہیں، نشاط آگین ترنم ہے
صبوحی پی چکے نخلِ چمن سرشار ہیں پتے
گلوں کے قہقہے ہیں اور غنچوں کا تبسم ہے
گلستاں میں نمو ہے وجد میں سارا زمانہ ہے
زمانے کی زباں پر اب مسرت کا ترانہ ہے

خدا معلوم کتنی سیلِ نوری میں روانی ہے
فضاؤں پر فدا دل سے بہارِ بوستانی ہے
زمیں کا گوشہ گوشہ بن گیا صہبا اثر جنت
ہر ایک ذی روح کو حاصل سکونِ جاودانی ہے
اذاں مسجد میں، گرجا میں گجر، ناقوس مندر میں
دلاتے ہیں کسی کی یاد وقتِ روح پرور میں

ردائے شب اٹھی اب شرق سے پیرِ مغاں آیا
لرزتے ہاتھ میں لیکر شرابِ ارغواں آیا
پھلوں پھولوں کو سبزی کو عجب دلکش بنایا ہے
جہانِ رنگ و بو لیکر چمن کا پاسباں آیا
شعاعِ مہر کی زرکاریاں کندن چڑھاتی ہیں
طلائی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہر شے دکھاتی ہیں

شفق نے اس طرح آ کر لگا دی آگ ظلمت کو
کہ گھیرا سُرخ شعلوں نے زمانے بھر کی وسعت کو
ستارے کھو چکے اپنی متاعِ صبر و طاقت کو
زمیں پر رشک آتا ہے فضائے باغِ جنت کو

بہار آگیں فضا دست بنا کیف نظر جنت
یہاں جنت وہاں جنت اِدھر جنت اُدھر جنت

فضا پر حسن چھایا ہے نظر افروز دنیا ہے　　ہر ذرہ بہار آگیں مناظر کا سراپا ہے
نیاز و ناز کی پابندیاں بھی اب مٹیں فطرت　　کوئی مصروف آرائش کوئی محو تماشا ہے

تصور سے کسی کے آج ہم آغوش بیٹھی ہو
شراب آتی ہے خود مجھ تک عجب بیہوشی میں بیٹھی ہو

فطرت واسطی

تبصرہ

طفلی تو گئی تھی شادمانی رہتی　　ہر روز بہار شادمانی رہتی!
پیری نے بھی آکے ستائی رہتی　　کیوں رستے ہوئے عیش کی کہانی رہتی

طفلی کی بھی نیند بے خبر تھی واللہ　　عہد شباب طرفہ تر تھی واللہ
پیری کہاں پڑی یہ آخر پیری آخر　　نفرت جس سے کہ عمر بھر تھی واللہ

بچپن کا عہد تو بچو دانہ گزرا　　اور عہد شباب دیوانہ گزرا
کس حال میں کٹتی ہے یہ پیری دیکھو　　اب تک تو مزے ہی کا زمانہ گزرا

امین حزیں

غزل

آنکھوں میں لیکے جلوۂ حیرت اثر کو میں　　اللہ جانے آج چلا ہوں کدھر کو میں
لائی عدم سے عرصۂ ہستی میں قید زیست　　اہل وطن سے چھوٹ گیا عمر بھر کو میں
دیر و حرم تو راہ کی بس میں رہ گئے　　اے بیخودی بتا کہ چلا اب کدھر کو میں
ہر نقش پا پہ جھکتے جبین نیاز کو　　آنکھوں سے چومتا ہوں تری رہگزر کو میں
کیا علم تھا کہ دقت پہ مر جائیگا حجاب　　کرتا شریک [illegible] نظر کو میں
افسر بساط صبر و تحمل کو جانچ لوں
آنکھوں کا ہر جمال تحیر اثر کو میں

افسر صدیقی (امروہوی)

دو اور حالتیں بے برادر اور بے انیس سونے کی نہایت خوبی سے مذکور ہوئی ہیں۔

(موٴلف) مجیب نے اپنے قاعدہ کے موافق چھ جواب دئے ہیں۔ جن کی حالت یہ ہے کہ پہلے جواب میں کہتے ہیں کہ ہائے مختفی نسبتی اور تعین مقدار کو ایک ہی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ دلیل قابل تسلیم ہے مگر قاعدہ یونہی جاری ہے جیسا کہ معترض نے کہا ہے لہذا یہ اعتراض دور نہیں ہو سکتا۔ (دوسرا جواب) کہ چند روزہ چند ہفتہ صفت بعد صفت ہیں۔ جس کے ثبوت اور سند میں بدر چاچی کا شعر لکھا ہے۔ اس واسطے غلط ہے کہ یہ صفت بعد صفت نہیں ہے۔ ہر صرف اور نحو کا جاننے والا اس کو سمجھ سکتا ہے صفت بعد صفت کی مثال یہ ہے کہ زید عالم و عادل ہے۔ اس شعر کی اصلی ساخت یوں ہے۔ کہ ما بے برادر و بے انیس چند روزہ و چند ہفتہ یادگار رنگکار و مہمان جہان ہستیم معلوم۔ اس میں صفت بعد صفت کیونکر پیدا کی گئیں ہائے ظرفیت و ہائے تعین مقدار کا جواب بھی کوئی نہیں دیا گیا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب معترض صفت بعد صفت کو مانتا ہی نہیں تو پھر یہ کہنا اسکے لئے بیکار ہے کہ عطف کی ضرورت نہیں ہے اس مصرع میں (چند روزہ چند ہفتہ بے برادر بے انیس) بغیر عطف کے کام ہی نہیں چل سکتا۔ رہا یہ اعتراض کہ اعلان اور اشباع حرکت ماقبل ہائے مختفی مذموم ہے۔ جائز نہیں ہے نہ معترض کا یہ خیال ہے بلکہ وہ غیر فصیح کہتا ہے اس کے لئے چنداں سند کی ضرورت نہیں تھی پانچویں اور چھٹے جوابات صرف معنوی خوبیوں کے دکھلانے کے لئے دئے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ اس وقت تک بیکار ہیں جب تک کہ شعر کی ترکیب درست نہ ہو۔ غرض یہ کہ اعتراض نہیں اٹھ سکا۔ اور چند روزہ کی طرح چند ہفتہ کے معنے چند ہفتہ کے لئے نہیں نکلے۔ چند ہفتہ مہمان ہستم کی ترکیب بغیر ہائے کے صحیح نہیں۔

مرزا دبیر - الوداع اے شوق تصنیف الفراق اے ذوق نظم   شد حواس خمسہ و دہ عقل ششدر بے انیس

اعتراض - مصنف اپنے حواس خمسہ اور دہ عقل کے ششدر ہونے کی وجہ سے شوق تصنیف کو الوداع اور الفراق فرماتے ہیں۔ پس مرزا صاحب کی دس عقلیں کون ہیں اور اگر وہ عقل سے عقول عشرہ مسلمہ حکما مراد ہیں تو معنے بے ربط ہوئے جاتے ہیں۔

جواب - دہ عقل سے مراد عقول عشرہ مصطلحہ حکما ہیں اور حواس خمسہ سے بھی علی العموم تمامی عالم کے حواس خمسہ مراد ہیں اور اس طرح معنے بلیغ اس شعر کے یہ ہیں۔ کہ چونکہ غم فراق میر انیس صاحب میں کل عقول عشرہ اور کل حواس خمسہ تمام عالم کے ششدر رہیں تو سلئے اس ضمن میں مصنف پر بھی بڑا اثر پڑا اور یہ وجہ خاص کلمۂ الوداع اور الفراق نسبت شوق تصنیف و ذوق نظم کے کہدینے کی ہے دوسرے یہ ممکن ہے کہ مراد مصنف کی یہ ہو کہ حواس خمسہ مصنف کے جو ذریعہ استفاضۂ مضامین عالیہ تھے اور کل عقول عشرہ جن میں سے عقل عاشر

مبدا فیاض عام مضامین بھی خیال کیجاتی ہے اس غم میں ششدر ہیں اور اس وجہ سے باب استفاضہ وافاضہ مضامین بالکل مسدود ہوگیا ہے جس کی وجہ سے شوق تصنیف اور ذوق نظم سے اب جدائی اختیار کرنا ضرور ہے۔ کیونکہ ان سے فائدہ ممکن نہیں ہے۔

(مولف) یہ صرف تاویلیں ہیں۔ ورنہ اصل میں معترض کے اعتراض کا کوئی جواب نہیں۔ اگر عقول عشرہ سے عقول مسلمہ حکماء ہی مراد لیجائیں تو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ وہ عقول عشرہ اور حواس خمسۂ عالم کیا سوائے شعرگوئی کے اور کوئی کام نہ کرتی تھیں ورنہ اب وہ معطل و بیکار ہیں تو اس کے کیا معنے کہ شعرگوئی اور تصنیف کا دروازہ تو بند ہے۔ باقی سب کام بدستور جاری ہیں۔ دوسرا جواب یہ کہ عقل عاشر یعنی مبدا فیاض عالم بھی معطل ہے میرے نزدیک تو سخت گناہ ہے۔ فاضل مجیب کے نزدیک میر انیس کے مرنے میں اگر عقل عاشر ششدر اور حیران ہے تو ہو۔ باقی اور کوئی تو شاید نہ مانے۔ باقی دو جواب ہیں جو مجیب نے وہی تاویلی معنے بیان کئے ہیں جن کا لکھنا طول لاطائل ہے۔

مرزا دبیر — بیگہ در بزم سوزد داغ غم بالائے داغ نیست جز طاؤس در پروانہ دیگر بے انیس

اعتراض ۔ اس شعر میں پروانہ موصوف اور دیگر صفت ہے لہذا علامت موصوف کی آخر پروانہ میں ضرور چاہئے اور روشن ہے کہ بدوں شمع کے پروانہ بے لطف اور بیکار ہے۔ اور طاؤس کو بزم سے کیا مناسبت ہے اس کو اگر سروکار ہوتا ہے تو باغ سے ہوتا ہے نہ کہ کسی محفل اور مجلس سے۔

جواب ۔ (۱) ترکیب توصیفی اگر مان لی جائے تو اُس کا حذف جائز ہے جیسے کہ خسرو کا یہ شعر ؎

بیچارہ خسرو خستہ را خوں بچتن فرمودہ است خلقے بمنت یکطرف آں شوخ تنہا یکطرف

(۲) علامت اضافت اور ترکیب توصیفی کا فارسی میں ایک حال ہے اور فک کسرہ ہائے مختفی کا بحالت اضافت صحیح متصور ہوکر کلام اساتذہ اہل زبان میں اکثر واقع ہوا ہے نظامی ؎

توئی کافریدی زیک قطرہ آب گہرہائے روشن تر از آفتاب

اور دوسروں نے بھی ایسا کیا ہے مولانا روم ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد میلش اندر طعنۂ پاکاں دہد

(۳) اس شعر میں نیست کو بطور ایک فعل ناقص کے فعل رابط اور پروانہ کو اس کا اسم اور دیگر کو خبر کہدینا ایک صاف جواب ہے اس صورت میں حذف اضافت کے تسلیم کی بھی ضرورت نہیں۔

(۴) پروانے کے لئے شمع چاہئے اور شمع داغوں کو بھی کہہ سکتے ہیں۔ لہذا پروانہ کا ذکر بے لطف نہیں ہے۔

(۵) طاؤس کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ پروانے سب فنا ہو گئے۔ اور چونکہ طاؤس بھی داغدار ہوتا ہے اس واسطے دل کے ساتھ اس کی تشبیہ ہو سکتی ہے۔

(مولف) اس شعر میں مجیب نے جس قدر جوابات دیئے ہیں وہ قریب قریب ایسے ہیں کہ ضرورت پر اُن کو مانا جا سکتا اور تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

مرزا دبیر۔ سوخت بر آتش دل یاراں اگر مثل سپند ۔۔۔ نالۂ آہستہ می آید ز مجمر بے انیس

اعتراض۔ شے مرغوب و محبوب کے دفع عین الکمال کے لئے سپند جلانا مرسوم ہے نہ کہ وفات میں اور جبکہ کوئی جلتا ہے تو بلا ضبط اور بلا اختیار بشور و فغاں نالہ بلند ہوتا ہے۔ پس مجمر سے نالۂ آہستہ آنا کیا معنے۔

جواب۔ اس میں دل یاراں کے جلنے کا ذکر ہے اور اس کی تشبیہ سپند کے جلنے سے دیگئی ہے۔ سپند کے جلانے کا خیال نہیں (۲) گو ایسے حال میں سپند جلانے کا مرسوم نہیں ہے۔ مگر سپند دل یاراں کے جلنے کا تو ضرور دستور ہے۔ پس معترض کا اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے کہ یہ نہیں دریافت کیا گیا ہے کہ یہاں ذکر ایک مجمر غم اور آتش شورش و الم اور سپند دل زار یاران و فادار کا ہے نہ کہ معمولی سپند اور مجمر وغیرہ کا۔ (۳) سپند کے جلنے کا ذکر علی العموم وہاں کیا جا سکتا ہے جہاں کسی شے کے جلنے کی تشبیہ دیجائے۔ چنانچہ اساتذہ کے یہ شعر

خالص۔ مانند سپندے کہ بر آتش بر شیند ۔۔۔ با یار نشستیم چہ بسیار نشستیم

سعدی۔ آتش سوزاں نکند با سپند ۔۔۔ آنچہ کند دود دل مستمند

(۴) بزم کی مناسبت سے جو پہلے شعر میں ہے سپند اور مجمر لایا گیا (۵) یوں بھی معنے اس کے کئے جا سکتے ہیں کہ جس مجمر اور جس بزم میں اس سے پہلے دفع چشم بد کے واسطے سپند جلانے کا دستور تھا اس پر اب یاروں کا دل جلتا ہے۔ اس صورت میں سپند کا ذکر انسب ہوگا۔ (۶) نالہ مجمر کی آہستگی کا ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یاروں کا دل زار ہو گیا ہے (۷) جب کوئی شے جل کر ختم ہونے کے قریب ہوتی ہے تو اس کی آواز آہستہ آتی ہے۔ (۸) اگر جلنے والے کا نالہ شور و فغاں کے ساتھ تسلیم کیا جائے تو یہاں تو مجمر کے نالہ کا ذکر ہے۔ (۹) شاعر نے اگر نالۂ مجمر آہستہ سنا تھا تو اُسے آہستہ ہی ذکر کرنا چاہئے۔

(مولف) کوئی جواب مطمئن کرنے والا نہیں ہے۔ اس واسطے معترض کا اعتراض اپنی جگہ پر قایم ہے

مرزا دبیر۔ سال تاریخش بزبر دبینہ شد زیب نظم ۔۔۔ طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

اعتراض۔ لفظ زُبُر بضمتین ہے۔ نہ کہ بسکون اوسط جیسا کہ اس شعر میں نظم کیا گیا ہے۔

جواب - کتب معتبرۂ لغت سے ثابت ہے کہ اصل لغت میں لفظ مفرد اس مادہ سے جو معنی مناسب معنی مقصود سے رکھتی ہو۔ ایک لفظ زبر بالفتح ب جو معنی کتابت ہے اور زبر بکسر زا و سکون با یا مکتوب کے معنے میں ہے اور لفظ زبر بضمتین یا بالضم اول و فتح ثانی صیغہ جمع ہے اور ظاہراً انہیں الفاظ کو معنی مقصود میں نقل کیا ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو ضرور لفظ مفرد معنی مفرد مقصود کے واسطے نقل کی گئی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ زبردینہ میں لفظ زبر ضرور بضم اول اور فتح اوسط ہے۔ (۲) منتخب میں زبر بضمتین ہے مگر وہ قابل اعتبار نہیں۔ اگر ہے تو بہ ضرورت شعر متحرک کو ساکن کرنا جائز ہے۔ اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ کیا کیا چیزیں بضرورت شعر جائز ہیں۔ (۱) وصل - یعنی ایک حرف کا حسب ضرورت معنی و بیشتر کتب فن سے زیادہ کر دینا جیسے خاقانی کے اس مصرع میں ؎

زادۂ سیمرغ کیست جز پدر رستم

(۲) قطع یعنی کسی حرف اصلی کا گرا دینا جیسے خاقانی کے اس مصرع میں کبوتر کو کوتر کہا گیا ہے ؎

ارزن دہ برج کوترانش

(۳) تخفیف یعنی حرف مشدد کو مخفف کر کے استعمال کرنا - جیسے غنی کا یہ شعر ؎

گوئی کہ در تنور فلک قحط ہیزم است　　تا آتشے نہ سوخت تنہ ریختہ نان ما

لفظ تنور مشدد تھا (۴) تشدید یعنی حرف مخفف کو مشدد کر کے کہنا جیسا کہ [illegible] ؎

وجود مردم دانا مثال زر طلا است　　کہ ہر کجا برود قدر و قیمتش دانند

زر مخفف ہے مگر مشدد استعمال کیا ہے (۵) ممدودہ الف کو مقصورہ بنا کر استعمال کرنا جیسے اوستاد کا یہ مصرع ؎

زبخشش جہانت و جہان اختیار توئی مقصود

اصل لفظ آبخشش ہے (۶) مقصورہ الف کو ممدودہ بنا دینا جیسے سعدی کے اس شعر میں ؎

شنیدم کہ فرماندہے دادگر　　قبا داشتے ہر دو رو آستر

(۷) اسکان یعنی حرف متحرک کو ساکن کر کے استعمال کرنا جیسے نظامی کا یہ شعر ؎

گشت جہاں از نفس تنگ تر　　وز سپرش معصفرے رنگ تر

لفظ معصفر کا عین مفتوح ساکن استعمال ہوا ہے۔ (۸) تحریک یعنی ساکن کو متحرک کر کے استعمال کرنا جیسے فردوسی کا یہ شعر ؎

بفرمود تا بہمن آمدش پیش　　سخن گفت با او ز اندازہ بیش

شین آمدش کا ساکن تھا۔ مگر وزن پورا کرنے کے لئے متحرک استعمال ہوا ہے۔

(مولف) اگرچہ فاضل مجیب نے جواب دینے میں آسمان و زمین ایک کر دیئے ہیں مگر اعتراض اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا یہاں زُبُر بضمتین استعمال کیا گیا ہے بہ سہواً یا غلطی سے بے کو ساکن کر کے لائے ہیں، رہا یہ قاعدہ کہ سکون جائز ہے - اول تو اس میں عجز طبیعت پایا جاتا ہے اسواسطے اکثر لوگ اس سے محترز بلکہ اس قاعدہ سے منحرف ہیں اور یوں تو غلط کلام کی مثال بھی اساتذہ ہی کے کلام سے دیجاتی ہے - (دوسرے) ایسے الفاظ کا جو دوسرے زبان کے ہوں اہل زبان کو بدلکر استعمال کرنا جائز ہے مگر دوسرے زبان والوں کو صحیح کی تقلید کرنا چاہیئے - (۳) منتخب اللغات مستند لغت ہے مجیب نے اسکو غیر معتبر قرار دیا ہے یہ ہرگز قابل تسلیم نہیں ہے - مجھے اس جگہ ایک شاعر کا قول اور ایک بادشاہ کا جواب یاد آیا شاعر نے اپنے کسی شعر میں ساکن کو متحرک نظم کیا - بادشاہ نے سنکر اعتراض کیا اور پوچھا کہ ایں چیست شاعر نے جواب دیا کہ ایں ہمہ برائے ضرورت شعری ہست - بادشاہ نے جواب دیا کہ پس شعر گفتن چہ ضرور

مرزا دبیر -

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے ایلیں

معترض - یہ مصرع قریب قریب ایک اور شاعر کا ہے جو اودھ کے مشہور فرمانروا آصف الدولہ کی تاریخ میں نظم کیا گیا ہے ؎

لکھنؤ بے آصف است و آسماں بے آفتاب　　　چرخ چارم بے مسیح و طور سینا بے کلیم

جواب - شاعر سابق کے کلام کے عنوان پر اور اس کے قریب قریب الفاظ میں شعر کہنا لائق اعتراض نہیں ہے اس طرح کے اکثر شعر موجود ہیں -

(مولف) یہ صحیح ہے کہ اگر کسی شاعر کا خیال دوسرے سے ملجائے تو وہ قابل ایراد نہیں ہے مگر یہ قاعدہ اسی جگہ کے لئے ہے جہاں ــــ بلا ارادہ ایسا ہو جائے - ــــ ــــ ــــ مخصوص اور مشہور مصرعوں کے اور اشعار میں یہ قاعدہ جاری نہیں ہو سکتا اس واسطے کہ جس مصرع تاریخ کو مستعار لیا گیا ہے وہ بھی مایہ ناز تاریخ ہے اور یہ بھی - پھر یہ کیونکر کہا جائے کہ مرزا صاحب نے وہ تاریخ نہ دیکھی ہوگی - اگر اس قسم کے شعر و غیر سرقہ کا الزام قایم نہ کیا جائے تب بھی اس بات سے انکار کرنا محال ہے کہ وہ الفاظ اور وہ خیال دوسرے ہی کے شعر سے مستنبط ہوتے ہیں - مثال کے طور پر سعدی کے اس شعر کو لیجئے -

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسماں　　　نہم زیر پائے قزل ارسلاں

اصل شعر ظہیر فاریابی کا تھا جسکو دیکھے بغیر یہ خیال پیدا نہیں ہو سکتا تھا -

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا　　　تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

یا فیضی کی یہ رباعی ؎

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد ۔۔۔ دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد

عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد ۔۔۔ کونین بہ ذات پاک اکبر نازد

یہ رباعی ایک ایرانی شاعر کی یہ رباعی دیکھنے کے بعد کہی گئی ؎

رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد ۔۔۔ زنگی بہ سیاہ خیل و لشکر نازد

اکبر بہ خزینۂ زر نازد ۔۔۔ عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

یا مرزا غالب کا یہ شعر ؎

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست ۔۔۔ قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

عرفی کا یہ شعر دیکھنے کے بعد کہا گیا ؎

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحون عشق ۔۔۔ روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

ظاہر ہے کہ سعدی کا شعر بالکل ظہیر فاریابی کے رنگ میں ہے۔ مگر اصلی رو دونوں میں ایک ہی ہے۔ اسی طرح یہ روایت کہ ظہیر نے کسی اپنے ممدوح کے پاس کے نیچے چھپائی تھی میں ایسا نہیں کر سکتا۔ فیضی کی رباعی جواب ہے مگر طرز بیان وہی ہے جو اصل رباعی کی تھی۔ بغیر اس کو دیکھے یہ نہیں کہی جا سکتی تھی۔ یا غالب کا شعر جواب ہے عرفی کے شعر کا مگر اصل خیال عرفی ہی کا گنا جائے گا۔ بالکل اسی صورت سے مرزا صاحب کا مصرع ہے۔ جو آصف الدولہ ہی کی تاریخ سے لیا گیا ہے۔

خواجہ میر درد[1] و آزاد دہلوی

میر درد ۔ مدرسہ یا دیر تھا۔ یا کعبہ یا بتخانہ تھا ۔۔۔ ہم سبھی مہمان تھے تو آپ ہی صاحبخانہ تھا

---

[1] خواجہ میر درد دلی کے اُن شعرا میں سے تھے جن پر دلی کی سرزمین قیامت تک ناز کیا کرے گی۔ میر تقی۔ سودا۔ سوز۔ قائم وغیرہ کے معاصر تھے۔ اور یہ سب لوگ خواجہ صاحب کی عزت کرتے تھے۔ پاک دل پاک صفات عالی ظرف۔ صابر متوکل۔ گوشہ نشین تھے۔ ایک مشاعرہ ہر پندرہویں تاریخ کو اپنے مکان پر کیا کرتے تھے۔ جو آخر میں میر تقی میر کو سپرد کر دیا تھا۔ ان کی غزلوں میں سوز و گداز اس درجہ ہے کہ دیکھ کر درد کی مجسم تصویریں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جو کچھ کہا ہے وہ حال ہے قال نہیں۔ اور بہت سی تصانیف کے علاوہ ایک فارسی اور ایک اردو کا دیوان بھی اُن سے یادگار ہے۔ اردو کا دیوان (بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲۰)

اعتراض آزاد - گویا تنخانے کو کثرت استعمال کی وجہ سے ایک لفظ تصور کیا کہ دَیر کے حکم میں ہو گیا - ورنہ ظاہر ہے کہ یہ قافیہ صحیح نہیں ہے -

(مولف) اگرچہ یہ لفظ ترکیب پاکر اتنا مشہور رہا کہ ایک ہی لفظ سمجھا جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ صاحب خانہ کے مقابلے میں مطلع میں یہ قافیہ لانا عیب سے خالی نہیں ہے - شائیگاں کا عیب اس میں موجود ہے اور اس کو ایطائے جلی کہہ سکتے ہیں - اگرچہ آج صحیح طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ درد نے در اصل کیا لکھا تھا - مگر مطبوعہ نسخوں میں یہی ہے --

---

درد - چلئے کہیں اس جاگہہ کہ ہم تم ہوں اکیلے   گوشہ نہ ملے گا کوئی میدان ملے گا

اعتراض آزاد - جاگہ کے علاوہ اکثر جگہ کی - کے - اور ہے وغیرہ دب دب کر نکلتے ہیں

(مولف) عیب کسی کے یہاں کسی حالت میں بھی کیوں نہو عیب ہی مانا جائے گا - مگر جس وقت زمانہ کا رواج یونہی ہو تو پھر مرگ انبوہ جشنے دارد کا معاملہ ہو جاتا ہے اسی طرح خواجہ صاحب کے دور میں یہی رواج تھا اور چھوٹے بڑے سب ایک حالت میں تھے - اس وجہ سے اس کو عیب نہیں کہہ سکتے -

---

درد - اک لحظہ اور بھی وہ اُڑ آتا چمن کا دید   فرصت ندی زمانے نے اتنی شرار کو

اعتراض - دید کو مذکر باندھا ہے -

(مولف) اس کے جواب تین ہیں - ایک تو یہ کہ اس وقت میں دید کو بہ تذکیر بھی لکھتے تھے - اور بہ تانیث بھی جیسا کہ ذیل کی مثال سے معلوم ہوگا -

نظیر؎   سوکر دفن بنانا سوزنگ روپ بھرنا   عاشق کو ہر طرح سے خوباں کا دید کرنا

دوسرے یہ کہ قواعد تذکیر و تانیث کی اس وقت کوئی خاص پابندی نہیں کی جاتی تھی - ذیل کی مثالوں سے یہ راز

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۸) نہایت مسخ ہو کر چھپا تھا جس کو مطبع نظامی نے صحیح کر کے چھپوایا - مگر وہ صحت ایسی ہے جسے شاید خواجہ صاحب سے کوئی نسبت نہیں ہے - اسی بنا پر میں نے قدیم قدیم نسخوں سے مقابلہ کر کے اس کو معہ مقدمہ کے مطبع نولکشور میں شائع کرایا

خواجہ صاحب نے ۱۱۹۹ھ میں دہلی میں انتقال کیا -

آپ نے اپنی عمر میں نہ کسی پر اعتراض کئے نہ آپ کے کوئی سامنے آیا - مگر مولانا محمد حسین آزاد نے تذکرہ آب حیات کے لکھتے وقت چند اعتراضات بھی کئے ہیں جو بجنسہ درج ہیں -

آتشہ ہو جاتا ہے ۔

میر حسن چشم کو مذکر لکھتے ہیں حالانکہ مونث بھی ان کے کلام میں پایا جاتا ہے ۔

پلٹا دل کے زخموں کا انگور کیا   کہ یہ چشم خوں بستہ کچھ نم ہوا

مجھے بھی حسن سو تھی مطلب غرض   ڈبوے گا یہ چشم نم آپ کا

تاب و تواں مذکر ۔ میر حسن ؎ وہ تاب و تواں کہاں ہے یارب   جو اس دل ناتواں میں تب تھا

دشنام مذکر   اس لب کی بات کی کیا کریں توقع   جس لب سے کہ آکے دن کبھی دشنام نہ پایا

شاہ نیاز احمد بریلوی ننگ کو مذکر لکھتے ہیں ۔

اسرار حقیقت سے جب آگاہ ہوئے   معلوم ہوا ... ننگ نہ ہوتا

عمر مذکر ہے ۔۔۔ میر ممنون دہلوی مونث لکھتے ہیں ؎

دے جو تصرف میں مرے میکدہ ساقی   اک دم میں عمر کی خمیس عام کروں گا

مرگ آج مونث ہے میر مذکر لکھتے ہیں ۔

جس صید گاہ عشق میں یاروں کا جی گیا   مرگ اس شکار گاہ کا صید رمیدہ تھا

گلگشت مونث ہے مگر میر مذکر لکھتے ہیں ؎

بہار بلبل اور گل یہ تو عبرت سے آنکھ کھول   گلگشت سرسری نہیں اس بارگاہ کا

تلاش مونث ہے سودا مذکر لکھتے ہیں ؎

کرے کیوں سودا دل بستہ دلالوں جہانگیرا   خیال زلف دراز گویا تلاش ہے عمر جاوداں کا

عار بتذکیر مستعمل ہے ۔ مگر حسرت دہلوی نے بتانیث استعمال کیا ہے ؎

غیر کے پاس روز جاتے ہو   اپنے حسرت سے عار آتی ہے

خلش آج بالاتفاق بتانیث مستعمل ہے مگر سودا نے مذکر بھی استعمال کیا ہے اور اکثر جگہ ؎

؎ زباں ہے شکر میں تا ہم شکستہ بالی کے   کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

؎ نگاہوں کا ان آنکھوں کے ہی ترچھا پن وہی اب تک   وہی کاوش وہی دل سے خلش رہتا ہے مژگاں کو

؎ خوش ہیں شکستہ بالی سے ہم اپنی اس لئے   پرواز کا تو دل سے خلش دور ہو گیا

متقدمین نے ہر لفظ میں نہایت آزادی سے کام لیا ہے ۔ اسی کو مذکر اور اسی کو مونث ۔ دم بھر میں کچھ اور دم بھر میں کچھ

یہ اعتراض کم نظری ہے ۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ کون دعوے کر سکتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اسی طرح لکھا تھا۔ اس لئے کہ قافیہ یا ردیف

کی صورت ایسی حالت میں واقع نہیں ہوئی ہے کہ دید کو اس جگہ تبانیت نہ پڑھ سکیں

اک لحظہ اور بھی وہ اڑاتا چمن کی دید — فرصت نہ دی زمانے نے اتنی شرار کو

غرضکہ یہ اعتراض اہل نظر کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

شیخ ابراہیم ذوق [۱] و شاہ نصیر مرحوم

ذوق۔ — کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد — آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب و خاک باد

---

[۱] شیخ ابراہیم ذوق دلی کے رہنے والے تھے۔ شاہ نصیر مرحوم کے شاگرد اور ظفر بہادر شاہ آخری تاجدار دہلی کے استاد تھے مح بندی کے ماہر تھے۔ نہایت قانع متوکل نیک مزاج دنیا کے خرخشوں سے بیخبر رہ کر زندگی بسر کرنے والے بزرگوں میں تھے ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۲ھ میں بمقام دہلی انتقال کیا۔ آزاد مرحوم نے اپنے تذکرہ آبحیات میں اُن کے حالات مفصل لکھے ہیں۔

شاہ نصیر دہلوی

آپ کا نام نصیر الدین تھا۔ شاہ غریب نام ایک بزرگ کے خلف اکبر تھے۔ کالا رنگ تھا اس لئے میاں کلو کے عرف سے معروف تھے۔ دلی ہی میں پیدا ہوئے۔ دلی ہی میں ہوش سنبھالا۔ شاعری کی طرف رجحان ہوا۔ اور شاہ محمدی مایل شاگرد قا[ئم] کے شاگرد ہوئے۔ اور چند ہی روز میں اس فن میں وہ کمال حاصل کیا کہ خود استاد ہو گئے۔ بادشاہ وقت کو اصلاح دینے لگے۔ لکھ[نؤ] اور حیدر آباد کے بڑے بڑے معرکہ آرا مشاعروں میں بھی شریک ہوئے اور اپنے زمانے کے لحاظ سے اس فن کو معراج [کمال] پر پہونچا دیا۔ ان کی شاعری کا ممتاز جوہر زباندانی اور مشکل مشکل بحروں میں طبع آزمائی ہے جس زمین کو لیتے ہیں اُ[سے] پانی کر کے بہا دیتے ہیں۔ آخر وقت تک شاعری کرتے رہے ۱۲۵۴ھ میں انتقال کیا۔ ذوق اول اول انھیں سے اصلاح لیتے [تھے] مگر کچھ اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ ناچاقی ہو گئی۔ اور غزلیں دکھانا چھوڑ دیں۔ مولوی محمد حسین آزاد نے شاگرد و استاد کا ایک معرکہ بھی لکھا ہے جو انھیں کی زبان سے سناتا ہوں۔

"کئی برس کے بعد نصیر مرحوم دکن سے پھرے۔ اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا۔ شیخ علیہ الرحمۃ کی مشقیں خوب زور پر چڑھ گئی تھیں انھوں نے بھی جا کر مشاعروں میں غزلیں پڑھیں۔ شاہ صاحب ذوق نے دکن میں کسی کی فرمائش سے ای[ک] غزل کہی تھی "آتش و آب و خاک و باد" وہ غزل مشاعرہ میں سنائی اور کہا اس طرح میں جو غزل لکھے اُسے میں استاد جا[نتا] ہوں۔ دوسرے مشاعرے میں ذوق نے اسپر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف (ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۲۲)

اعتراض - سنگ میں آتش کے جلنے کا ثبوت چاہئیے

جواب ذوق - جب پہاڑ کو پڑہنے کے سبب سے حرکت ہے تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہوگی -

اعتراض - سنگ میں آتش کا ثبوت چاہئیے -

جواب ذوق - مشاہدہ اس کی سند ہے -

معترض - سند کتابی ہونا چاہئیے -

جواب ذوق - تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی -

معترض - شاعری میں شعر کی سند درکار ہے - تاریخ نہیں چلتی -

جواب ذوق - محسن تاثیر کا یہ شعر ہے ؎

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم　　آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

سودا　　ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا　　. . . . .

معترض - مگر اس میں آگ کے جلنے کا ثبوت نہیں ہے -

جواب ذوق - اس میں تغلیب ہے -

(ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲۱) سے اسیر اعتراض ہوئے جس قریب تھا شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا - مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اس کی صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں اُنھوں نے شکر پڑہنے کی اجازت دی مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا - انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا -

بود گفتۂ من حرف اعتراض بیاں　　کسے بہ دیدۂ بینا فرو برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہوگیا - اور دربار شاہی میں جاکر قصیدہ سنایا - اس کے بڑے بڑے چرچے ہوئے اور کئی دن کے بعد سنا کہ اسیر اعتراض لکھے گئے ہیں - شیخ مرحوم قصیدۂ مذکور کو مشاعرے میں لے گئے کہ وہاں پڑہیں - اور روبرو سر معرکہ فیصلہ ہوجائے - چنانچہ، قصیدہ پڑھا گیا شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالب علم کو کتب تحصیلی خوب رواں تھیں جلسہ میں پیش کرکے فرمایا کہ انھوں نے اسیر کچھ اعتراض لکھے ہیں شیخ علیہ الرحمہ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے اعتراضوں کیلئے قابل خطاب ہوں - انھوں نے کہا کہ مجھ سے کچھ تعلق نہیں اُنھوں نے کچھ لکھا ہے - شیخ مرحوم نے کہا خیر تحریر تو اسی وقت تک ہے کہ فاصلۂ دوری درمیان ہو - جب آمنے سامنے موجود ہیں تو تقریر فرمائیے"

چنانچہ اس کے بعد بحث شروع ہوگئی - ذوق مرحوم نے اپنا مطلع پڑھا -

معترض - یہ تغلیب کہیں نہیں آئی -

(مولف) ذوق مرحوم کا جواب صحیح ہے ۔ رہا تغلیب کا مسئلہ وہ یہ ہے کہ تغلیب اصطلاح میں ایک چیز کو دوسری چیز کے ماتحت لانے کو کہتے ہیں ۔ معترض کا یہ خیال بھی صحیح نہیں تھا کہ ایسی تغلیب کہیں نہیں آئی یہ تو ظاہر ہے کہ ایک چیز کی مثال بجنسہ پیش کرنا دشوار ہے ۔ مگر تغلیب کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے محسن تاثیر کا یہ شعر ہے - اس میں آب کو جارو (جاروب) کے تحت میں لایا گیا ہے کیونکہ کشیدن کا تعلق جاروب سے ہے نہ کہ آب سے ؎

تا بگبر د منصب دربار جاناں دیدہ ام　　آب جاروبی کشد از اشک مژگاں دیدہ ام

اسی طرح جلنا اگرچہ آتش کے لئے نہیں ہے مگر ذوق کے شعر میں آتش کو آب کے تحت میں لایا گیا ہے -

---

دیگر معترضین کے اعتراضات

ذوق - سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے　　یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

معترض - پا - میں ری اکا زیادہ کرنا بغیر اضافی یا صفتی ترکیب کے جائز نہیں ہے -

جواب آزاد - یہ معترض کی کم نظری ہے ۔ سعدی کا یہ شعر ایسا ہی ہے ؎

درختے کہ اکنوں گرفت ست پائے　　بہ نیروئے شخصے بر آید ز جائے

(مولف) آزاد کا جواب صحیح تو ضرور ہے مگر پھر بھی ذوق کے اس شعر میں زیر پا کی جگہ زیر پائے کچھ فصیح نہیں ہے -

---

ذوق - دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو　　آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہم کو

اعتراض - جزو صحیح نہیں جزو ہونا چاہئے

جواب آزاد - یہ اعتراض بھی صحیح نہیں خسرو لکھتے ہیں -

ہر چہ کنند در جزو در کل اثر

میر تقی میر - جزو مرتبہ کل کو حاصل کرے ہے آخر　　اک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

(مولف) آزاد کا جواب صحیح ہے - جزء - اصل میں جزء بہمزہ ہے ۔ مگر جب اس کو کسی کی طرف مضاف کرتے ہیں تو یہ ہمزہ واو سے بدل جاتا ہے ۔ جیسے کہ جزو بدن - جزو طلا وغیرہ - مگر فارسی والوں نے اس کو بغیر واو کے بھی استعمال کیا ہے -

---

ذوق و اوج[1]

ذوق - مقابل اُس رُخِ روشن کے شمع گر ہو جائے — صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

اعتراض - یہ تصرف فی المحاورہ ہے - اس محاورہ کو یوں باندھنا چاہئے جیسے ہم نے باندھا ہے ؎

یاں جو برگِ گُل خورشید کا کھڑکا ہو جائے — دھول دستارِ فلک پہ لگے تڑکا ہو جائے

جواب ذوق - شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں - میرا مطلب یہ ہے کہ اگر شمع مقابلہ کرے تو اس گستاخی کی سزا میں صبا اُسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے اور ایسی بجھے کہ بس اس کے حق میں سحر ہو جائے یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔

جواب آزاد - ناسخ کا یہ شعر بھی اسی ترکیب کا ہے -

جو ستمگر ہیں کبھی وہ پھولتے پھلتے نہیں — سبز ہوتے کھیت دیکھا ہو کہیں شمشیر کا

محاورہ میں تلوار کا کھیت کہتے ہیں شمشیر کا کھیت نہیں ہے -

(مولف) اگرچہ استادوں نے اس قسم کے محاورات میں تصرفات کئے ہیں اور تلاش کرنے پر بہت سے شعر مل سکتے ہیں مگر وہ سب غلط ہیں کیونکہ محاورہ میں تصرف جائز نہیں -

---

ذوق - منھ اٹھائے ہوئے جاتا ہو کہاں تو کہ تجھے — ہے ترا نقشِ قدم چشم نمائی کرتا

اعتراض نواب کلب حسین خان نادر - کہ تجھے پہلے مصرع میں لایا گیا ہے یہ دوسرے مصرع کا حق ہے -

جواب آزاد - اس کا جواب مجھے نہیں آتا۔

(مولف) آزاد نے یہ طنزاً لکھا ہے - کہ اس کا جواب نہیں آتا - اصل یہ ہے کہ یہ اعتراض معترض کی نادانی پر مبنی ہے - اس قسم کے ہزارہا شعر موجود ہیں جو اساتذہ کے دواوین سے مل سکتے ہیں -

---

[1] اوج مرحوم کا نام عبد اللہ خاں تھا سر ہند کے رہنے والے تھے - مگر ہمیشہ دلی میں رہتے تھے - اگرچہ انکی علمی استعداد معمولی تھی - مگر طبیعت میں رسائی - اور فکر میں خداداد تیزی تھی سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور اپنے معاصرین غالب و ذوق وغیرہ پر خوب خوب چوٹیں کرتے تھے - بنانے والے تو قیامت کے ہوتے ہیں - بنانے کے لئے انکو استاد کہا کرتے تھے - اور یہ بھی اس سے خوش ہوتے تھے - مرزا مغل مخزون کی سرکار میں ملازم تھے - ۱۲۸۰ھ میں انتقال کیا -

ایکمرتبہ ذوق نے مشاعرہ میں غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا۔

ہاتھ میں خاتم لعل کی ہو اس میں زلف سرکش ہو　　پھر زلف بنے وہ دست موسیٰ جس میں اخگر آتش ہو

شاہ نصیر نے اس خیال سے کہ پہلے مصرع میں سبب خفیف کی کمی ہے اعتراضاً کہا کہ پھر پڑہو' ذوق سمجھ گئے اور فوراً کمی کو پورا کرکے جواباً یوں پڑھا۔

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے الخ

ذوق۔ نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر　　ایما یہ ہے کہ بھیجدے آنکھیں نکال کر

اعتراض شاہ نصیر۔ پھول بٹوے میں نہیں ہوتے یوں کہنا چاہئے ۔۵

نرگس کے پھول بھیجے ہیں دونے میں ڈالکر

اعتراض ذوق۔ دونے میں رکھنا ہوتا ہے ڈالنا نہیں ہوتا۔ یوں ہونا چاہئے ۔۵

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر　　ایما یہ ہے کہ بھیجدے آنکھیں نکال کر

(مولف) اعتراض شاہ نصیر کا صحیح تھا مگر اصلاح صحیح نہیں تھی ذوق مرحوم نے صحیح مصرع لگایا۔

ریاض[۵۱] خیرآبادی و حکیم ناطق لکھنوی

ریاض۔ آنکھیں ہمیں قدموں سے وہ ملنے نہیں دیتے　　ہم چٹکیوں سے دل کو مسلنے نہیں دیتے

---

۵۱ جناب ریاض احمد صاحب ریاض کا مولد و مسکن خیرآباد ضلع سیتاپور ہے۔ آپ کی عمر اس وقت ستر چھہتر سال سے متجاوز ہوگی آپ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے شاگرد ہیں اور آج ہندوستان میں ایک سربرآوردہ استاد ہیں آپ کی شاعرانہ شوخیاں آپکے ایک ایک شعر سے نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ خصوصیت سے شراب کے مضامین جیسے آپ کے یہاں پائے جاتے ہیں ایسے ہندوستان میں کسی شاعر کے یہاں نہیں ہیں۔ شوخی بیان۔ معاملہ بندی طرز ادا وغیرہ میں آپ کو ید طولے حاصل ہے ادنیٰ مضمون کو آپنے حسن بیان سے اس طرح نادر کرکے پیش کرتے ہیں کہ سامعہ خوامخواہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ ابتک دیوان طبع نہیں ہوا۔ مگر اس مرتبہ جنوری ۱۹۳۱ء میں جو مجھ سے ملاقات ہوئی تو ارادہ ظاہر ہوا کہ اب عنقریب شائع ہوگا مجھ پر نہایت ہی مہربانی فرماتے ہیں اور اکثر لکھنؤ کی آمد و رفت کے سلسلہ میں غریب خانے پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ نیک نہاد فرشتہ خو۔ عالی ظرف۔ مرنجاں مرنج صلح کل بزرگ ہیں۔ جوانی کی وجاہت بڑھاپے کا وقار (ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۲۶)

اعتراض ناطق - حاصل شعر یہ ہے کہ وہ ہم کو اپنے تلووں سے آنکھیں نہیں ملنے دیتے ہم ان کو اپنا دل چٹکیوں سے مسلنے نہیں دیتے۔ مناسبات الفاظ کی خوبیاں تو اچھی ہیں - ادھر آنکھیں ادھر دل - ادھر پاؤں ادھر چٹکیاں یعنی ہاتھ ادھر ملنا - ادھر مسلنا - یہ الفاظ آپس میں ایک دوسرے سے لفظی مناسبت رکھتے ہیں - مگر لفظی مناسبات کا خیال یا شعر میں اس خیال کا جزو اعظم ہونا شاعری کے اعلیٰ رنگوں میں نہیں بلکہ ادنیٰ اور بالکل ادنیٰ - انہیں وجود سے امانت کی شاعری بدنام ہوئی - اور لکھنؤ کو ان کے نام سے ہرگز فخر نہیں - اور اسی وجہ سے شرفائے لکھنؤ نے ضلع جگت

(ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ از صفحہ ۱۲۵) بنکر رہ گئی ہے - مگر پھر بھی ہر بات چٹکلا - ہر لفظ ایک لطیفہ ہوتا ہے - زمانہ کے افکار و حوادث کا شکار ہو رہے ہیں - مگر ممکن نہیں کہ کوئی دیکھنے والا یہ بھی سمجھ لے کہ اس وقت کسی فکر میں ہیں - ہر وقت خندہ پیشانی بزرگوں میں بزرگ جوانوں میں جوان بڈھوں میں بڈھے ہیں علم کے ساتھ اب عمل کو بھی شامل کر لیا ہے - یادِ خدا میں مشغول رہتے ہیں اور کبھی کوئی نماز قضا نہیں ہوتی - وضعداری کا یہ عالم کہ جس سے ایک دفعہ مل لئے عمر بھر کے لئے اس کے دوست ہوگئے - تحمل کا یہ حال کہ آج تک کسی پر شاید اعتراض نہیں کیا - خودداری کا یہ رنگ کہ ساٹھ برس شاعری کی دنیا میں آئے ہوئے گزر گئے مگر کبھی واہ وا کی لالچ پر کسی مشاعرہ میں شریک نہیں ہوئے - اللہ اللہ مولانا حالی کا ایک شعر یاد آتا ہے -

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
اب یہ تکلیں نہ دکھائے گا زمانا ہرگز

یہی حال ریاض کا ہے - اب کیوں ایسے لوگ پیدا ہوں گے اور کیوں لوگ ایسی متبرک ہستیاں دیکھیں گے -

حکیم ناطق لکھنوی

آپ کا نام نامی حکیم سعید احمد ہے آپ سنہ ۱۸[illegible]ء میں پیدا ہوئے - آپ کے خاندان کے تعلقات سادات بلگرام و شیوخ استعاری سے ہیں - کہنہ مشق شاعر ہیں - اردو کی شاعری میں اس وقت استاد ہیں - کانپور میں مطب فرماتے تھے اور وہاں آپکی شاعری عروج پر تھی بہت سے شاگرد پیدا ہوئے تھے مگر اتفاق سے چند مصالح کی وجہ سے بغرض مطب کلکتہ چلے گئے - دو تین برس وہاں رہکر واپس چلے آئے - پھر چند روز لکھنؤ میں رہکر حیدرآباد گئے - اس زمانہ میں مستقلاً لکھنؤ میں قیام ہے - نہایت آزاد طبع یار باش آدمی ہیں - مگر تنقید میں آپ کو ایک قدرتی ملکہ حاصل ہے بہت سی تنقیدیں آپنے مشاہیر کے کلام پر لکھی ہیں جو وقتاً فوقتاً ملک میں شائع ہوتی رہیں - اور اسی وجہ سے خود لوگوں نے بھی آپ پر کافی تنقیدیں لکھیں - بہرحال اس میں شک نہیں کہ آپ کو فن تنقید پر اچھا عبور ہے - اور اس میں وہ کسی دوست دشمن کا خیال نہیں کرتے - آپ سرِ دست مرزا فخر اللہ بیگ صابر کے دولتخانہ پر حسین گنج میں قیام پذیر ہیں آپ کی تنقیدی زد میں غریب ریاض بھی آگئے ہیں اور آپنے ان کی ایک غزل پر اس طرح اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے یہ تنقید رسالہ معیار جولائی سنہ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی تھی -

کا شغل بالکل متروک کردیا۔ کیونکہ اس کو ادنے لوگوں نے اختیار کر لیا ہے۔ یہاں تک مضائقہ نہیں بلکہ حسن ہے اگر خود بخود الفاظ مناسب ہو جائیں۔ اور جزو اعظم معنوی مناسبات رہیں۔ اور اگر شاعر کا مقصود اصلی رعایت الفاظ ہو تو وہ شاعری دنیا کا گویا سفلی مذاق ہے۔ اس شعر میں اگرچہ یہ ظلم مضمون پر نہیں کیا گیا۔ کہ الفاظ مناسب ہوں چاہے معانی خاک میں مل جائیں اور بدمذاق ہو جائے۔ مگر چونکہ خاص توجہ اس کے مذاق کی طرف موزوں کرتے وقت نہ رہی اس واسطے فن شاعری کی بے پناہ نزاکتوں نے معمولی اسقام پیدا کر دیئے وہ یہ کہ معشوق سے بدلہ لینے کی غرض سے اس کو ایک مزہ دار ظلم سے باز رکھنا۔ یعنی چٹکیوں سے دل مسلنے سے روکنا۔ اور دل کو اس سے بچانا کوئی خوبصورت شوخی اور عاشقانہ انداز نہیں۔ حالانکہ ذہن نقاد۔ جواب بھی اچھا خاصہ دیتا ہے۔ کہ بدلہ بھی کس بات کا لیا جاتا ہے اس بات کا کہ وہ آنکھوں کو اپنے تلووں سے ملنے نہیں دیتے۔ اور یہ خاص عاشقانہ مذاق ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بدلہ ٹھیک نہیں کیونکہ چٹکیوں سے دل کا مسلنا اک طرح کا ظلم ہے اور معشوق کے تلووں سے کسی عاشق کو اپنی آنکھیں ملنا اعلیٰ درجہ کی راحت ہے۔ تو اپنے کو راحت نہ پہونچنے کے معاوضہ میں معشوق کو ایسے ظلم سے جو اس کی فطرت میں ہو باز رکھنا خود غرضی ہے۔ اور عاشقانہ اخلاق کے بالکل خلاف اور علاوہ اس کے عقلاً بھی یہ معاوضہ کچھ بے جوڑ سا ہے۔

(مولف) جہاں تک ناطق صاحب نے مناسبات کے متعلق کچھ لکھا ہے وہ بھی اگرچہ پیش پا افتادہ باتیں ہیں۔ مگر پھر بھی مجھے اُن سے حرف حرف اتفاق ہے۔ مگر یہ کہنا کہ ریاض صاحب نے اس شعر میں توجہ اس طرف زیادہ منعطف فرمائی ہے۔ اور وہ امانت مرحوم کی طرح اس رنگ کے کہنے کے لئے بیٹھے ہیں سراسر شاعری اور سخن فہمی پر ظلم کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شعر اعلیٰ نہیں۔ مگر یہ اعتراضات معجون خانہ ساز کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور ان کا جواب صرف یہی ہے کہ تھوڑی سی کاوش کے بعد دنیا کے بہتر سے بہتر شعر میں ایسی ہی غلطیاں نظر آجائیں گی مختصر یہ کہ جہل مرکب سے دنیا کی فطرت ہے اور حکیم صاحب بھی اسی دنیا میں ہیں پھر یہ اعتراض کہاں تک انصاف پر مبنی ہو سکتا ہے۔ اعتراض کرتے ہیں پھر جواب دیتے ہیں۔ پھر اعتراض کرتے ہیں۔ اور چاہتے تو پھر کوئی جواب دے لیتے۔ در اصل نہ یہ اعتراض اعتراض ہیں۔ نہ جواب جواب ہیں۔ خدا معلوم کیا ہیں۔

ریاض جلتا ہوں بچاتے ہیں اسی سوز دروں سے دشمن کو مری آگ میں جلنے نہیں دیتے

اعتراض ۔ مصرع اولیٰ میں اتنے الفاظ موزوں نہ ہو سکے۔ جو مفہوم کو صفائی سے دکھلا دیں (جلتا ہوں) یہ ٹکڑا علٰحدہ ہے۔ اور سوز دروں کا مضاف الیہ مقدر ہے۔ ان دو وجہوں سے عبارت فصیح نہ رہی کیونکہ جلتا ہوں کے بعد کاف

بیانیہ ہوتا تو فصاحت کا پہلو نہ دبتا۔ اور سوز دروں کا مضاف الیہ ظاہر ہوتا تو بہتر تھا۔ نہیں معلوم کہ شاعر کا مقصود اپنے سوز دروں سے ہے یا غیر کے۔ شان عبارت غیر کو مضاف الیہ بتاتی ہے۔ اور معنوی نزاکت کہتی ہے کہ عاشق کا سوز دروں ہے کیونکہ دوسرے مصرع میں جو مری آگ ہے اسی کی طرف سوز دروں کی شعاعیں رُخ کر رہی ہیں۔ عبارت اور معنی میں تناقص اور معانی و بیان کے خلاف ہے۔

(مولف) اگرچہ شعر اپنے بندش کے لحاظ سے چست نہیں ہے۔ مگر مطلب بالکل صاف ہے۔ سوز دروں کا مضاف الیہ دشمن ہے جو الفاظ سے ظاہر ہے۔ اتنی کمی ضرور ہے کہ جلتا ہوں کے بعد کاف بیانیہ نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے شعر میں گنجلک ہے۔

ریاض۔ بوسے لئے کیا میں نے جو بل کھاتے ہیں گیسو تم کالوں کو کیوں زہر اگلنے نہیں دیتے

اعتراض۔ پہلے مصرع میں گیسوؤں کے اظہار غضب سے اختلاف ہے۔ اور دوسرے مصرع میں اتفاق ہاں اگر کالوں سے کالے سانپ مراد ہیں تو یہ تناقص رفع ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کوئی بات نہیں ہے نہ کوئی تعلق ہے۔

(مولف، میرے نزدیک شعر مہمل سا ہے اور کوئی اچھے معنے نہیں نکلتے معترض کی رائے صحیح ہے۔

ریاض۔ آئی ہے یہ کہتی ہوئی کس کی شب فرقت ہم رنگ زمانہ کو بدلنے نہیں دیتے

اعتراض۔ کس کی سے جو ابہام پیدا ہوتا ہے وہ کچھ لطف نہیں دیتا۔ سوائے معشوق کے اور کس کی فرقت کی رات ہو سکتی ہے۔ اور ایک معنوی شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شب فرقت پہلے نہ تھی اور اب آئی ہے تو رنگ زمانے کا بدل ہی گیا۔ پھر اس کا یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ تغیرات کے مخالف تو وہ اسوقت ہو سکتی تھی کہ عاشق کے گھر میں ہمیشہ سے ہوتی۔ جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آئی تو رنگ بدلنے کی محرک ہوگئی۔

تصحیح

گزشتہ ماہ حضرت حفیظ جالندھری کا ایک شعر غلط لکھا گیا ہے۔ وہ شعر فی الاصل یوں ہے:۔

بڑھی ہر لعنتی تہذیب نو سیلاب کی صورت ہے جس کے حلقۂ ہر موج میں گرداب کی صورت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شایع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۲ — فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء — شمارہ ۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۲ | اکتوبر ۱۹۳۲ء | شمارہ ۴

ملاحظات

آخر کار سید سلیمان صاحب ندوی سے ضبط نہ ہوا اور اُنھوں نے بھی ستمبر کے معارف میں پانچ سطریں (ا)ڈیٹر نگار کے ملحدانہ مضامین کے متعلق سپرد خامہ کرہی دیں۔

بہ صورت سبزہ لفے کہ از کمر گزرد

اس دوران میں عبد الماجد دریا بادی نے سچ کے صفحات پر جو کچھ لکھا اس کو تو میں نے اس لئے قابل اعتنا قرار نہیں (د)یا کہ اب سچ کا جھوٹ بہت سے لوگوں پر ظاہر ہو چکا ہے، لیکن سید سلیمان صاحب کا (جو اپنے کو صاحب معارف اڈیٹر سمجھتے ہیں) پھر اسی ساز کو چھیڑنا ہر چند مستبعد تو نہیں (کیونکہ سال گزشتہ فتنۂ نگار کے متعلق عبد الماجد کے پروپاگنڈا (کے) سلسلہ میں ان حضرت کی ذہنیت و بلندیِ اخلاق کا بھی کافی مطالعہ کر چکا ہوں) لیکن قابل ذکر ضرور ہے۔

اڈیٹر معارف نے ماہ ستمبر کی اشاعت میں مجھ پر دو الزام قائم کئے ہیں ایک یہ کہ میں نے اپنے ملحدانہ مضامین سے صدق دل توبہ کا اعلان کیا تھا لیکن پھر ویسے ہی مضامین لکھ رہا ہوں اور دوسرے یہ کہ آئندہ مذہبی مضامین

کی عدم اشاعت کا شریفانہ وعدہ کیا تھا لیکن باز نہیں آتا۔

پہلا الزام تو اس لئے غلط ہے کہ نہ کبھی نگار میں ملحدانہ مضامین شایع ہوئے اور نہ میں نے کبھی اس امر کا اعتراف کیا کہ نگار میں ملحدانہ مضامین شایع کئے جاتے ہیں بلکہ میں نے صاف الفاظ میں ظاہر کیا تھا کہ نگار کے تمام مذہبی مضامین خلوص نیت کے ساتھ خدمت دین و مذہب کے سلسلہ میں لکھے جاتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمانوں کی کسی جماعت کو اُن سے تکلیف پہونچے تو آئندہ سے اس نوع کے مضامین کا سلسلہ بند کر دیا جائیگا۔ چنانچہ گزشتہ جنوری سے اس وقت تک کوئی مضمون ایسا نہیں شایع ہوا جو مذہب اسلام کے متعلق لکھا گیا ہو اور اس سے کسی کو شکایت پیدا ہو سکے — دوسرے الزام کے متعلق مجھے حیرت ہے کہ اُنھوں نے کیونکر اس کو پیش کرنے کی جرأت کی — کیا ان کی جماعت کی وہ آخری تحریر (جو حقیقت میں شایع ہوئی تھی) اُن کے سامنے نہیں ہے جس کی رو سے معاہدہ وغیرہ کو کالعدم قرار دیکر میرے خلاف مقدمہ چلانے کی طیاریاں شروع کی گئی تھیں، اور کیا سید سلیمان صاحب کو مینے اسی وقت ذریعہ تحریر اطلاع نہیں دیدی تھی کہ اگر مقدمہ چلانے کی کارروائی کو ختم نہ کیا گیا تو پھر میں آزاد ہوں اور مجھ پر معاہدہ کی کوئی پابندی عاید نہ ہوگی۔ اس کے بعد جب وہ لکھنؤ میں میرے مکان پر تشریف لائے تو کیا میں نے زبانی پھر اسی امر کا اظہار ان سے نہیں کیا تھا — اس کے بعد جو کچھ ہوا انھیں بھی معلوم ہے اور مجھکو بھی — مقدمہ چلانے کے لئے حصول اجازت کی غرض سے مموریل کی طیاریاں، ہوم ممبر کے پاس جا جا کر میرے خلاف زہر افشانیاں، بھوپال ہاؤس میں بیٹھ کر اجتماعی قوت کے ساتھ مجھ کو قید و بند میں ڈالنے کے مشورے کیا ایسے واقعات ہیں جنکو بھلایا جا سکتا ہے۔ اور کیا سید سلیمان کہہ سکتے ہیں کہ وہ خود ان تمام مساعی میں ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے کام نہیں کر رہے تھے — چنانچہ مموریل پر بہت سی حضرات کے دستخط حاصل کر کے اُسکو گورنر یوپی کے پاس بھیجا گیا، لکھنؤ کے ایک خان بہادر رئیس کو مقدمہ بازی کے تمام مصارف اُٹھانے کے لئے طیار کیا گیا، کوشش کر کے سرکاری مشیر قانونی سے اپنے موافق رائے لکھوائی گئی۔ الغرض مقدمہ چلانے کے لئے وہ کونسا دقیقہ کوشش کا تھا جو اُٹھا رکھا گیا۔ لیکن خدا بھلا کرے نواب سر مزمل اللہ خاں کا جو اس وقت ہوم ممبر تھے کہ انھوں نے انجام و عواقب پر نظر ڈالکر — اور نیز اس خیال سے کہ میں نے آئندہ کے لئے اس نوع کے مضامین کی اشاعت روک دی ہے، موافقت نہیں کی، ورنہ یہ حضرات تو اپنے مقدور بھر سبھی کچھ میری تباہی کے لئے کر چکے تھے۔ پھر کیا سید سلیمان صاحب اسی کو معاف کرنے کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور کیا ناکامی کا نام رحم و کرم رکھ کر خفت کو اسی طرح مٹایا جاتا ہے — آج سید سلیمان یہ لکھنے کے لئے تو طیار ہیں کہ پھر بھی وہ شریف مسلمان اپنے ملحدانہ مضامین ابتک اسی طرح شایع کر کے اپنے اسلام و شرافت کا برملا اعلان کر رہا ہے" — لیکن اخبار حقیقت کا وہ آخری اعلان جو ان کی جماعت کی طرف سے شایع ہوا ہے ان کے سامنے نہیں جس کی رو سے معاہدہ کالعدم ہو چکا ہے اور "وہ شریف مسلمان" خود انھیں کے قول کے مطابق سب کچھ لکھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر سید سلیمان نے

"اس سلسلہ میں کوئی مصلحانہ روش اختیار کی ہوتی، اگر انھوں نے میری تحریر موصول ہونے کے بعد مقدمہ کی کارروائی کو ختم کردینے کا مشورہ دیا ہوتا، تو میں کہہ سکتا تھا کہ انھوں نے عفو و درگزر سے کام لیا اور اب ان کو میرے اوپر یہ الزام رکھنے کا حق حاصل ہے، لیکن جب یہ کچھ نہیں ہوا تو پھر کس منھ سے وہ معافی اور توبہ و معذرت کا ذکر کرتے ہیں اور جس معاہدہ کو وہ کالعدم قرار دے چکے ہیں اس کی پابندی مجھ سے کس اصول کی بناء پر چاہتے ہیں۔"

یہاں تک تو خیر الزامی جواب ہوا ان کے اعتراضات کا۔ لیکن اب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ وہ مجھے ملحد کیوں کہتے ہیں اور نگار میں کون سے ایسے مضامین شایع ہوئے ہیں جنکو کفر و الحاد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

وہ شخص جو خدا کو ایک "قوت فعال لما یرید" مانتا ہو، جو رسول اللہ کو بڑا زبردست نبی تسلیم کرتا ہو، جو ہمیشہ اعلان کرتا رہتا ہو کہ اسلام ہی دنیا کا تنہا ذریعۂ امن و نجات ہے، کیا اسے صرف اس لئے ملحد قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ فروع میں سید سلیمان یا کسی اور مولوی کا پیرو نہیں؟ وہ شخص جو توحید ربانی کا "وحدت وجودی" کی حد تک قائل ہے جو رسول کی سیرت کو پاکیزہ ترین نمونہ اخلاق و انسانیت کا قرار دیتا ہے اور جو اسلام کو مذہبیات کی دنیا میں "آخری لفظ" کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، کیا اسے صرف اس بناء پر کافر و بے دین بنایا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کو خود سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور مفسرین کی کورانہ تقلید نہیں کرتا ــــــ وہ شخص جو تمام کائنات کو مظہر قوت ربانی قرار دیتا ہے، جو اسوۂ محمدی کو بہترین اسوۂ انسانیت سمجھتا ہے اور جو قرآن مجید کو بے مثل صحیفۂ رشد و ہدایت باور کرتا ہے، کیا اسے صرف اس دلیل پر کافر و مرتد کہہ سکتے ہیں کہ اس کے مطالعہ کا زاویۂ نگاہ خود اس کا ہے اور دوسرے سے استعارہ نہیں کیا گیا۔ حیران ہوں کہ ان لوگوں کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے، یہ کیا سمجھ رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ سچ ہے ؎

بیگانہ براں رند حرام ست کہ غالب
در بیخودی اندازۂ گفتار نہ داند

آپ کی سمجھ میں تو کبھی نہ آئے گا لیکن آئیے میں بتا دوں کہ مجھ میں آپ میں اختلاف کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ چونکہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم کے لئے موزوں ہو سکتا ہے اس لئے اس میں ہر زمانہ کا ساتھ دینے کی لچک پائی جاتی ہے۔ اور اس کی تعلیم ہر شخص کے لئے قابل قبول ہے۔ لیکن آپ کہتے ہیں کہ نہیں اسلام کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے وہی ہے جو آپ فرماتے ہیں اور اس لئے اسلام صرف اہل عرب کے لئے تھا اور اسی زمانہ کے لئے موزوں تھا جب اس کا ظہور ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام فطری مذہب ہے اور اگر اس کا صحیح مفہوم پیش کیا جائے تو ہر شخص اس کی صحت پر ایمان لا سکتا ہے، اس لئے میں پہلے اصول صداقت قائم کرتا ہوں اور پھر قرآن مجید کی تعلیمات پر روشنی ڈالتا ہوں، آپ فرماتے ہیں نہیں، اسلام صرف مسلمانوں کا مذہب ہے اور مسلمانوں ہی کے سامنے پیش ہونا چاہئے، اسلئے آپ پہلے اپنے مفروضات و مزعومات کے لحاظ سے قرآن پر ایمان لانے کی ہدایت کرتے ہیں اور پھر اس کو لوگوں سے

تسلیم کراتے ہیں - میں کہتا ہوں کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اصول انسانیت پر اپنی تعلیم کی بنیاد قایم کی اور تمام عالم کو ایک "مرکز اخوت" پر جمع ہونے کی دعوت دی اسی لئے میں فروع کی پابندی کو لوازم مذہبی میں داخل نہیں سمجھتا اور تمام مذاہب کو سچا سمجھتا ہوں - آپ فرماتے ہیں کہ نہیں اسلام نے عصبیت و افتراق کی تعلیم دی ہے اور "جامعۂ انسانیت" کا قیام اس کا مقصود نہیں، اسی لئے آپ دوسروں کو بُرا کہتے ہیں اور کافر و ملحد وغیرہ کہکر بیزاری کا اعلان کرتے رہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اسلام نام ہے صرف تکمیل اخلاق کا، آپ کہتے ہیں نہیں اخلاق ہوں یا نہ ہوں صرف ارکان مذہب کی پابندی کافی ہے - میں کہتا ہوں کہ خدا سے محبت کرنا سیکھو، اور آپ فرماتے ہیں اس سے ڈرو، میں کہتا ہوں کہ اخلاق نبوی کو انسانیت کا بہترین نمونہ سمجھکر اس کا اتباع کرو اور آپ فرماتے ہیں کہ نہیں پہلے اس کے معجزات و محیر العقول باتوں کو باور کرو اور پھر کچھ اور دیکھو، میں کہتا ہوں کہ اسلام نام روزہ و نماز کا نہیں ہے آپ فرماتے ہیں اسلام صرف اسی کا نام ہے - میں کہتا ہوں کہ اسلام نام نہ لمبی ڈاڑھی کا ہے نہ عبا و عمامہ کا آپ فرماتے ہیں کہ نہیں یہی تو اسلام کی نشانیاں ہیں -

میں کہتا ہوں ملائکہ نام ہے ان قوائے کامنہ کا جن کو خدا نے انسان کے اندر اپنے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ودیعت کر دیا ہے، آپ کہتے ہیں کہ نہیں ملائکہ ایک مخلوق ہے "حیز مکان و زماں" سے متعلق جو ہاتھ پاؤں رکھتی ہے اور جس کے بال و پر ہیں - میں کہتا ہوں کہ جنت و دوزخ نام ہے انفرادی، قومی و روحانی احساس عروج و زوال کا آپ کہتے ہیں کہ نہیں اس کا تعلق مادی لذائذ سے ہے، میوہ دار درختوں سے ہے، شہد و لبن سے ہے، خوبصورت عورتوں اور حسین لڑکوں سے ہے - میں کہتا ہوں اچھا کام خود آپ اپنی جزا اور بُرا کام آپ اپنی سزا ہے، آپ فرماتے ہیں نہیں اچھے کام کا عوض حور و قصور ہونا چاہئے اور بُرے کام کی پاداش نار و جہنم و مار و حمیم میں کہتا ہوں کہ خدا کی عظمت و بزرگی اس سے بہت زیادہ ہے کہ وہ ہمارے افعال سے متاثر ہو کر جذبۂ تحسین و انتقام اپنے اندر پیدا کرے، آپ فرماتے ہیں نہیں وہ دنیاوی بادشاہوں کی طرح خفا بھی ہوتا ہے اور خوش بھی میں کہتا ہوں کہ جو خدا روزانہ بیشمار کرۂ زمین سے ہزاروں لاکھوں گنا بڑے بناتا بگاڑتا رہتا ہے اور جس کا یہ مشغلہ ازل سے ابد تک جاری رہنے والا ہے، وہ زمین ایسے حقیر کرہ کی ذلیل مخلوق کو تباہ کرنے کے بعد کیوں دوبارہ زندہ کرنے لگا، اس کو کیا غرض ہے، اس کا اس میں کیا فایدہ ہے کیا مصلحت ہے - آپ کہتے ہیں کہ نہیں خدا کی عظمت صرف اسی ایک کرہ سے متعلق ہے اور اس کی خدائی کا مفہوم اسی طرح ثابت ہو سکتا ہے - پھر لطف یہ ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں ہے - اس سے قبل بھی لوگوں نے کہا ہے اور وہ اسلام سے خارج نہیں سمجھے گئے - لیکن آج میں باوجودیکہ وحدانیت کا قائل ہوں، رسالت رسول کا ماننے والا ہوں، قرآن پاک کی بلند تعلیمات پر ایمان رکھنے والا ہوں، کافر قرار دیا جاتا ہوں، ملحد بتایا جاتا ہوں، اور بیدینی کا سب سے بڑا علمبردار ہوا - کیوں ؟

دلے گر پردہ ازیں رازِ نہاں برخیزد

آیئے آج کی صحبت میں مختصراً اس راز کو بھی ظاہر کر دوں جن حضرات نے شروع سے نگار کا مطالعہ کیا ہے وہ

اس حقیقت سے بیخبر نہیں ہیں کہ میرا موضوع سخن ہمیشہ علماء سوء کا گروہ رہا ہے، اور میں نے ان کے حرکات ناشائستہ ان کے اخلاق ذمیمہ ان کے افعال رکیکہ اور ان کے مشاغل سخیفہ کو بے نقاب کرکے لوگوں کو بتایا ہے کہ ان کا وجود اللہ کا عذاب ہے، ان کی ہستی خدائی لعنت ہے جس نے مسلمانوں کو گھیر رکھا ہے۔ ان کا مقصود زندگی صرف ریا و مکر سے دولت کمانا ہے، اور ان کو مطلق پرواہ نہیں۔ اگر ان کی تعلیمات سے اسلام وصاحب اسلام دنیا میں بدنام ہوجائے یہ مذہب اسلام کو بے عقلیوں کا مجموعہ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ موضوع احادیث کو سامنے رکھ کر لغو دھمل روایات کو اسلام سے منسوب کرکے مذہب کو ذلیل کر رہے ہیں یہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے انسانوں کی عقلوں پر مہر لگا کر قرآن مجید پر غور و خوض کرنے کو حرام بتا رہے ہیں، یہ ذہنی و عقلی آزادیاں سلب کرکے مسلمانوں کو درجۂ انسانیت سے گرا کر حیوان بناتے جا رہے ہیں، یہ اس دور علم و روشنی میں ہمیں پھر جہل و تاریکی کی طرف لئے جا رہے ہیں اور وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو ایک خود غرض، نفس پرست انسان نما حیوان کر سکتا ہے۔ میں نے قرون اولیٰ کی تاریخ سے، عہد عباسیہ و امویہ کے واقعات سے، حکومت ترکی و ایران کے حالات سے، اور افغانستان کے انقلاب حالیہ کی روداد سے لوگوں پر ظاہر کیا کہ اس جماعت نے جو اپنے کو علمبردار مذہب بتاتی ہے انسانیت پر کیا کیا مظالم روا رکھے ہیں، اخلاق کا خون کس بیدردی سے بہایا ہے اور عروج و ترقی کے پامال کرنے میں ان کی دراز دستیوں نے کیا کیا کام کئے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ مجھ سے زیادہ ان کا دشمن اور کون ہو سکتا تھا، اور اس کا انتقام لینے کے لئے وہ حسب معمول سوائے مذہب کے اور کس چیز کی آڑ لے سکتے تھے۔ پھر اگر مذہب اسلام حقیقتاً نام ہے انھیں عقاید و تعلیمات کا جو ان کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں، انھیں اخلاق کا جو ان میں پائے جاتے ہیں، اسی محبت و رواداری کا جو ان کی طرف سے ظاہر ہو رہی ہے اور اسی وسعت نظر و بے مائیگی کا جو ان اقوال و افعال کی سرمایہ دار ہے، تو میں نہایت صفائی سے، ایک بار اور ہمیشہ کے لئے یہ اعلان کئے دیتا ہوں کہ

میں مسلمان نہیں ہوں

اور آج سے میری تمام تحریرات، ایک ایسے شخص کی تحریرات سمجھی جائیں جسے اسلام سے کوئی علاقہ نہیں۔ لیکن اگر اسلام ضمیر و خیال کی آزادی کو نہیں چھینتا اگر وہ فکر و رائے کی حریت کا دشمن نہیں ہے، اگر وہ بغیر اطمینان نفس پیدا کئے ہوئے بہ جبر اپنی حقیقت کسی سے تسلیم نہیں کراتا، اگر وہ مجموعۂ مزخرفات و خرافیات نہیں ہے اور اگر وہ ہر شخص کے لئے ہر زمانہ میں دستگیر و رہنما بن سکتا ہے تو اے مسلمانو، میں تمھیں سے پوچھتا ہوں کہ ان مولویوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے اسلام سے خارج کریں ان کو کیا منصب حاصل ہے کہ وہ ایک توحید خداوندی کے اقرار کرنے والے کو کافر کے لقب سے یاد کریں۔ جس طرح وہ مجھے ملحد و بیدین کہتے ہیں میں بھی انھیں کہہ سکتا ہوں، اور ان کے نقطۂ نظر سے اگر میں غلطی پر ہوں تو میرے نقطۂ نظر سے وہ بھی گمراہی میں مبتلا ہیں مجھے بھی انھیں کی طرح اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور مسلمان سمجھنے کا حق حاصل ہے میں بھی اسلام و تعلیمات اسلام پر غور کر سکتا ہوں خدا نے مجھے بھی عقل عطا کی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ مجھے کافر و ملحد کہتے ہیں وہ خود کافر و ملحد ہیں کیونکہ میرے نزدیک

وہ خود تعلیمات اسلامی سے منحرف ہیں، رسول کی توہین کرتے ہیں، مذہب کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں اور خدا ان سے بیزار ہے

میں ناظرین نگار کو یقین دلاتا ہوں کہ مولویوں کی جنگ مجھ سے نہ مذہب سے کوئی تعلق رکھتی ہے نہ دین کی ہمدردی سے بلکہ یہ حربہ انکا صرف اس لئے ہے کہ میں ان کے خلاف کیوں لکھتا ہوں، ان کی حقیقتوں کو کیوں بے نقاب کرتا ہوں۔ سو انھیں معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اب ان کے قصر عظمت و پندار کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں، انکی مذہبیت و اخلاق کے چہرہ سے پردہ اُٹھ چکا ہے، اور دنیا اُن سے متنفر ہو کر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ افسوس ہے کہ آج ہندوستان میں حکومت اسلامی نہیں ورنہ ہندوستان اُن کے عذاب سے کب کا نجات پا چکا ہوتا۔ آج ترکی حکومت کی ترقی کی بنیاد صرف اسی جماعت کے انہدام پر قائم ہے اور ایران کی بیداری کا آغاز اسی گروہ کے بیدست و پا کر دینے سے ہوتا ہے

جب کوئی زبردست قوت ان کے مقابلہ میں آتی ہے تو یہ حکومت برطانیہ کا دروازہ کھٹکھٹانے لگتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ "قانون کب تک اس قسم کے شیر بردں کو موقع دیتا رہیگا" حالانکہ اس نوع کا احتجاج اُن کے ضعف کی دلیل ہے، اُن کی عقلی بے مائیگی کا ثبوت ہے۔ اور ایک ایسا اظہار عجز ہے جس سے ہر خوددار انسان کو شرم آنی چاہیئے۔ اگر ان کے مفروضہ عقاید کے خلاف کوئی صدا اٹھتی ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ عقلی دلائل سے اس کا جواب دیں نہ یہ کہ حکومت کے سامنے دامن پھیلا کر کھڑے ہو جائیں۔ علاوہ اس کے مجھے حیرت ہے کہ اگر میں واقعی ملحد ہوں تو اُن کو کیوں تکلیف پہونچ رہی ہے کیا اس سے پہلے کوئی ملحد پیدا نہیں ہوا کیا اس وقت دنیا میں میرے سوا کوئی کافر و ملحد نہیں پایا جاتا پھر ایک میرے ہی خلاف یہ جہاد کیوں ہے۔ میرے ہی اوپر کیوں اس قدر عنایت صرف کی جاتی ہے۔ خدا کی خدائی میں لاکھوں غیر مسلم و بیدین پائے جاتے ہیں، آپ کہاں تک سر پیٹیں گے، کب تک غم اٹھائیں گے اور آپ کے اس واویلا کو سنتا کون ہے۔ میں اگر اکابر مذہب کو گالیاں دوں، کسی کی توہین کروں تو بیشک شکایت کا موقع ہے لیکن جب یہ کوئی بات نہیں ہے تو پھر برہمی کے کیا معنی۔ آپ جب مجھے کافر بنا چکے، ملحد قرار دے چکے تو پھر کیوں انتظار کرتے ہیں، سمجھ لیجئے کہ جہاں اور غیر مسلم جماعت کو دوزخ کا ایندھن بننا ہے وہیں مجھے بھی جانا ہے لیکن اگر ان کا مقصود واقعی مجھے راہ راست پر لانا اور اپنا تبلیغی فرض ادا کرنا ہے تو میں سید سلیمان ندوی اور ان تمام علماء کرام کو جو اُن کے ہم آہنگ ہیں کھلا ہوا چیلنج دیتا ہوں کہ وہ کسی مجمع میں جو بالکل غیر جانبدار لوگوں پر مشتمل ہو اپنے اسلام کو پیش کریں، پھر مجھے موقع دیں کہ میں نے جو کچھ اسلام کو سمجھا ہے اسے بیان کروں اور اس کے بعد اس مجمع سے فیصلہ چاہیں کہ وہ کس کو پسند کرتے ہیں اور یہ بھی جانے دیجئے، خود مجھے موقع دیں کہ میں اُن سے اسلام کی حقیقت کو سمجھوں اور اگر وہ مجھے سمجھا سکے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میں بغیر ایک لمحہ کا پس و پیش کئے ہوئے سر عجز جھکا دوں گا اور انھیں جیسا مسلمان ہونے کا اقرار کرلونگا۔ ورنہ یوں تیغ و تفنگ، یا حکومت کی امداد سے کسی کو زبردستی مسلمان بنانا، یا کسی کی آزادئ خیال کو چھیننا، تو اسلام کی حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ چنگیز و ہلاکو اس سے

کرچکے ہیں لیکن دنیا نے انھیں جیسا سمجھا وہ آپ کو بھی معلوم ہے اور ہمیں بھی ——

میں حضرات علماء کرام کو پھر توجہ دلاتا ہوں کہ اس دور علم و عقل میں اگر وہ مذہب اسلام کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ انھیں حربوں سے جواب دیں جن سے مخالفین کام لے رہے ہیں۔ اگر صرف قرآن مجید اور احادیث پر اپنے دلائل کی بنیاد آپ قائم کرتے ہیں تو اُس کو ایک مسلمان تو مان لے گا، لیکن غیر مسلم کو آپ کیونکر ساکت کرسکتے ہیں جب تک آپ پہلے قرآن مجید کی صداقت نہ ثابت کردیں۔ اس لئے اب آپ اپنے منقولات کو تو تہ کرکے رکھدیجئے اور صرف معقولات کو ذریعۂ دفاع قرار دیجئے اگر آپ کے بس کی بات ہے، ورنہ دوسروں کو یہ خدمت انجام دینے دیجئے اور اُن کو بُرا نہ کہئے کیونکہ ان کا مقصود واقعی اس سے اسلام کی خدمت ہے

آپ حضرات کو مطلق خبر نہیں کہ علوم جدیدہ نے کتنی راہیں اعتراضات کی کھولدی ہیں اور تمام مذاہب عالم کا تار و پود اس وقت بکھرا جارہا ہے۔ پھر اگر آپ کا اسلام ایک حقیقت مبرہن ہے، ایک صداقت واضحہ ہے، تعلیم فطرت ہے، اقتضاء عقل و فراست ہے تو آپ کیوں نہیں آگے بڑھتے اور لوگوں کے دلوں سے ان خدشات کو دور کرتے جنھوں نے ان کے ایمانوں کو متزلزل کررکھا ہے۔ لیکن آپ کو اتنا ہوش کہاں، آپ کو مذہب کی حمایت سے کیا واسطہ، رہتا ہو رہے، مٹتا ہو مٹے، آپ کو تو صرف قورمہ پلاؤ کھلانے کے لئے ایک احمق جماعت کی ضرورت ہے سو ہندوستان میں اسکی کمی نہیں کھا کھاکر "لحم و شحم" میں برابر اضافہ کرتے جائے اور جب کوئی دکھتی ہوئی رگ پکڑے تو چیخکر حکومت سے فریاد کیجئے کہ دیکھئے فلاں شخص ہمیں ستاتا ہے ——

اگر سید سلیمان طیار ہوں تو میں ان اعتراضات کو پیش کروں جو اس وقت اسلام پر عاید ہوتے ہیں اُن خدشات کو بیان کردوں جو اس وقت ۹۰ فی صدی جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دلوں میں پائے جاتے ہیں پھر دیکھوں کہ ان کا جواب دینے میں وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ یا یہ ملحد بیدین ——

میں حیدرآباد میں ۱۱ ستمبر سے مقیم ہوں اور غالباً وسط دسمبر تک قیام پر مجبور رہوں گا، کاتب صاحب بھی میرے ساتھ ہیں اور یہیں سے کاپیاں طیار کرکے لکھنؤ روانہ کی جاتی ہیں۔ منیجر مع اپنے دفتر کے وہیں ہیں —— جو حضرات خصوصیت کے ساتھ مجھ سے مراسلت کرنا چاہیں وہ امپریل پوسٹ آفس حیدرآباد دکن کی وساطت سے میرے نام خطوط روانہ کریں۔ دفتر کے متعلق جو خطوط ہوں وہ براہ کرم براہ راست لکھنؤ کے پتہ سے روانہ کئے جائیں ——

اس سے قبل جب میں جولائی میں یہاں آیا تھا تو مولانا ہوش بلگرامی اور راجہ نارائن پرشاد صاحب کی لطیف صحبتوں میں تقریباً روزانہ راجہ دھن راجگیر جی صاحب کا ذکر سنا کرتا تھا۔ کیونکہ راجہ صاحب موصوف اُس وقت بنگلور وجوارِ بنگلور کی دلکش فضا میں سیاحت فرما رہے تھے اور میری واپسی تک مراجعت نہ ہوئی تھی۔

اس مرتبہ لکھنؤ چھوڑنے سے قبل ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ :-

"یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور"

اور جس وقت سکندرآباد اسٹیشن پر مولانا ہوش سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے بھی اس کی تصدیق فرمائی۔ ولولۂ شوق کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں اولین فرصت میں راجہ صاحب موصوف کے دولت کدہ پر حاضر ہوتا، لیکن کچھ تو انتظام قیام کی ابتدائی دشواریوں میں اُلجھے رہنے کی وجہ سے اور کچھ اس لئے بھی کہ راجہ صاحب موصوف کا مزاج نادرست تھا، یہ حاضری ٹلتی رہی۔ آخر کار وہ دن آیا جس کو میں تاریخ سیاسیاتِ ہند کا نہایت اہم دن قرار دیتا ہوں یعنی ٹھیک اسی دن جب کہ لوگوں کے دل مہاتما گاندھی کی روزہ شکنی کے خیال سے لبریزِ مسرت تھے۔ شام کو مولانا ہوش اور مولوی حکیم مقصود علی خاں صاحب (جو یہاں کے نہایت ہی سربرآوردہ وحاذق اطبا میں سے ہیں اور علاج سے قبل ہی نصف مرض اپنی پرخلوص گفتگو سے زائل کر دیتے ہیں) میری فرودگاہ پر تشریف لائے اور راجہ صاحب موصوف کا فرمانِ طلب و حاضری سنا کر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔

آج کل راجہ صاحب اپنے اُس قصر میں مقیم ہیں جو بلدہ کے ایک بعید ترین حصہ میں تعمیر کیا گیا ہے اور جو ماحول کی آبادی و مکانات کو دیکھتے ہوئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو شب تار میں ماہ چار دہم کو حاصل ہے۔ یہ قصر معہ اپنے تمام ملحقہ عمارات و تفریح گاہوں کے نہایت وسیع حصۂ زمین کو محیط ہے، اتنا وسیع کہ یہاں داخل ہونے کے بعد ایک انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس احاطہ سے باہر شاید کسی انسانی آبادی کا وجود ہی نہیں ہے۔ میں نے چل پھر کر قصر کے اندرونی و بیرونی مختلف حصوں کو دیکھا، ان کی آرائش وزیبائش میں جو دولت و ذہانت صرف کی گئی ہے ان کا مطالعہ کرتا رہا، تمدن جدید کے ان تمام اسبابِ آرائش کو، جو تھوڑی دیر کے لئے نظریۂ فردوس کو بھی دماغ سے محو کر دیتے ہیں دیر تک دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں مغرب کی موجودہ ترقی علوم و فنون کو دعائیں دیتا رہا جس نے تمدن انسانی کے معیار کو اس قدر بلند کر کے غریبوں کی حیثیت حشرات الارض سے زیادہ نہیں رکھی ہے۔ اور انسانی ارتقاء و حضیض کا مفہوم متعین کرنے کے لئے مادیات کی اتنی زبردست دیوار حائل کر دی ہے۔

اس قصر کے بلند ایوان، وسیع و مرتفع شہ نشین، اس کا مرمریں فرش، مرصع سقف، منقش دیواریں، قیمتی تصاویر، دلفریب مجسمے، نقرئی و طلائی ظروف، حریری پردے، متعدد سبزہ زار، مختلف صناعیوں کے بڑے بڑے حوض اور بجلی کی رنگین روشنیوں کے انعکاس میں قوس قزح کے رنگ پیدا کرنے والے فوارے، الغرض میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ دنیا سے الگ یہ کوئی بازیگاہ فطرت ہے، جہاں وہ ہر وقت رنگ و نور، ریشم و طلا کے ساتھ کھیلا کرتی ہے یا یہ کہ شاید میرے ہی ہاتھ الہ والدین کا چراغ آگیا ہے، اور یہ عالیشان قصر آن واحد میں میرے ہی لئے طیار ہوا ہے -

جاہ و ثروت والے دنیا میں بہت سے پائے جاتے ہیں، لیکن دولتِ دنیا کے ساتھ، دولت دماغ بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے اور بہت کم دیکھا گیا ہے کہ دولت و ذہانت، ثروت و خوش سلیقگی، ایک محل میں جمع ہو جائیں - میری زندگی میں غالباً یہ بالکل پہلا موقعہ ہے کہ ان دونوں کا اجتماع میں نے اس قدر تکمیل کے ساتھ دیکھا ہو — اگر راجہ صاحب اس ودیعت ربانی پر خراج تحسین حاصل کرنے کے مستحق ہیں تو اُس مبدء فیاض کو کیوں نہ سراہا جائے - جس نے راجہ صاحب کی ذات اور ان کے دل و دماغ کو اس کے لئے منتخب کیا -

اس قصر کی طیاری و آرائش میں جس قدر بیدریغ دولت صرف کی گئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف ایک حمام کی طیاری میں لاکھ سے زیادہ روپیہ صرف کیا گیا ہے -

---

تھوڑی دیر کے بعد　　راجہ صاحب موصوف راجہ نارائن پرشاد صاحب کی معیت میں باہر تشریف لائے اور مجھ سے مخاطبت کی تو بے اختیار عرفی کا یہ شعر مجھے یاد آ رہا تھا کہ

زباں چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت
فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

راجہ صاحب ایک جوان العمر کشیدہ قامت نہایت خوش قیافہ و خوش شمایل انسان ہیں، اور باوجود دولت و ثروت کی اس فراوانی کے آپ کا انکسار آپ کی وسعت اخلاق، آپ کی فراخ حوصلگی اور سیر چشمی اس جوار میں ایک ضرب المثل کی سی حیثیت رکھتی ہے اور شاید ہی کوئی قومی، ملکی یا علمی تحریک ایسی ہو جس کو آپ کے "طلا دست افشار" کی اعانت نہ حاصل ہوئی ہو - سیاسی معاملات میں آپ نہایت صائب رائے رکھتے ہیں اور مذہبیات میں آپ کا مسلک صرف اخوت عامہ و انسانیت پرستی پر مبنی ہے جہاں عصبیت و تمیز نسل و رنگ کا گزر نہیں -

تھوڑی دیر کے بعد سردخانہ میں تشریف لے گئے اور چونکہ ہمارے حکیم صاحب ایک مریض کو دیکھنے شہر چلے گئے تھے اور فضائے تقدس واتقاء کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے، اس لئے کچھ گفتگو کا موضوع بھی بدلا، زاویۂ نظر میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور اگر سامعہ ادھر امین کی دلکش سروں میں محو تھا تو ادھر بقول نسیم دہلوی :-

نگاہیں ڈوب کر رہ گئیں جام لبالب میں

آخر کار یہ صحبت لطیف جو رنگین کم مگر دلکش زیادہ تھی، ایک بجے رات کو ختم ہوئی اور واپس آنے کے بعد عالم خواب میں بھی اسی کیفیت سے لذت اندوز ہوتا رہا مگر کبھی کبھی اس ڈر سے آنکھ کھل جاتی تھی کہ کہیں حکیم صاحب تو تشریف نہیں لے آئے -

---

میرے قیام کا سبب حیدرآباد میں یہ ہے کہ مہاراجہ سر صدر اعظم بہادر کی مثنوی پریم درپن کا گویا فلم طیار ہو رہا ہے اور مکالموں، گانوں اور مناظر کی نگرانی میرے سپرد ہوئی ہے - اس فلم کو یہیں حیدرآباد کی ایک لمیٹڈ کمپنی طیار کر رہی ہے جس کے مینجنگ ایجنٹ ایک انگریز میجر ریڈ ہیں اور جو اس سے قبل یہیں، حیدرآباد میں ایک نہایت کامیاب فلم "شکاری" طیار کر چکے ہیں - پریم درپن کے فلم کو مسٹر داؤد بیگ ڈائرکٹ کر رہے ہیں جو ایک زمانہ تک یورپ میں رہکر اس فن میں کافی دستگاہ حاصل کر چکے ہیں -

میں کوشش کر رہا ہوں کہ ہندوستانی فلموں میں جو نقائص عام طور پر نظر آتے ہیں وہ اس میں نہ پائے جائیں اور ہر ممکن حد تک تمام مناظر و گفتگو وغیرہ فطری حالت میں پیش ہو سکیں - یہ فلم غالباً دسمبر تک مکمل ہو سکے گا اور اس لئے میرا بھی اس وقت تک یہاں قیام کرنا ضروری ہے -

---

۲۰ ستمبر سے لیکر ۲۶ ستمبر کا زمانہ بھی تاریخ ہند میں ایک ایسی زبردست یادگار عزم انسانی وصداقت نیت کی قائم کر گیا ہے کہ شاید ہی اس کی دوسری نظیر پیش کی جا سکے - دنیا میں مصلح و ریفارمر بھی آتے ہیں اور قائد و رہنما بھی، ماہرین سیاست بھی نظر آتے ہیں اور قوم کے فدائی بھی، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ سب اسی منزلت و مرتبت کے حامل ہوتے ہیں جو اس وقت مہاتما گاندھی کو حاصل ہے اور کیا اُن کی آواز میں وہی اثر ہوتا ہے جو اس نحیف الجثہ حقیر صورت انسان کی آواز میں پایا جاتا ہے -

وہ ایک بار اعلان کر دیتا ہے کہ میں ۲۰ ستمبر سے اپنی زندگی کا آخری روزہ شروع کر دونگا اور مشرق سے لیکر غرب تک ایک اضطراب کی لہر دوڑ جاتی ہے، وہ عہد کرتا ہے کہ میں اس فاقہ کو فنا کی حد تک

کھینچ لیجاؤں گا اور دنیا کی کوئی قوت اُسے اس عزم سے ہٹانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی — کیوں؟ دنیا باور کرے یا نہ کرے، لیکن میں یقین لاتا ہوں کہ مہاتما گاندھی نے جو کچھ کیا وہ فرمان خداوندی کی تعمیل تھی اور جو کچھ اُنھوں نے کہا وہ یقیناً الہام ربانی تھا —

کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ ہندو آبادی میں جو مسئلہ چھوت و اچھوت کا ایک زمانۂ نامعلوم سے اُلجھا چلا آرہا تھا وہ کبھی سلجھ سکے گا۔ اور کیا کسی انسان کے امکان میں تھا کہ وہ برہمن و شودر کو ایک ہی صف میں لاکر کھڑا کردے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب خدا اپنے کسی بندہ کو اپنا پیام سنانے کے لئے چن لیتا ہے تو زبان میں یہی اعجاز ارادہ میں یہی عزم پیدا کردیتا ہے اور پھر تمام طاغوتی قوتیں اس کے سامنے اسی طرح سربسجود ہوجایا کرتی ہیں۔

اگر امم قدیمہ کے مصلحین کی ان قربانیوں سے جو انھوں نے نوع انسانی کے لئے روا رکھی ہیں انکار نہیں کیا جاسکتا، تو کوئی وجہ نہیں کہ عہد حاضر میں ہندوستان کے اس مصلح اعظم۔ اس قاید اکبر اور پیام خداوندی کے اس عظیم الرتبت حامل و مبلغ کی صداقت و قربانی کو نہ تسلیم کیا جائے جس نے اب واقعۃً ایک معجزہ کی سی صورت اختیار کرلی ہے اور کرلینی چاہئے تھی

لیکن اب سوال یہ ہے کہ ہمارے ہندوستان کی وہ دوسری قوم اب کیا کرنا چاہتی ہے جس نے اس وقت تک اپنی ساری عمر ترکستان و عربستان ہی کی فکروں میں ضایع کردی اور ہندوستان کے وردنے کبھی اس کو بیتاب نہ بنایا۔ اگر اس کے دماغ میں کوئی حقیر ترین ذرہ بھی عقل کا موجود ہے تو اُس کو سمجھنا چاہئے کہ یہ سب کچھ جواب ہے مہاتما گاندھی کی طرف سے ان کی حماقتوں اور شرارتوں کا جو مخلوط انتخاب کے مسئلہ میں ان کی طرف سے ظاہر ہوئیں اور انتقام ہے فطرت کا جو وہ ہمیشہ بے عقل و کج فہم قوموں سے لیا کرتی ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا مسلمان اب بھی ہندوؤں سے چھوت قوموں کی علیحدگی کی کوئی صورت نکال سکتے ہیں اور کیا اب بھی ان کو توقع ہے کہ ہندو قوم کی تفریق ان کے انتخاب جداگانہ کو کامیاب بنا دینے والی ثابت ہوگی۔ مگر نہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ طلسم فریب اب ٹوٹ چکا ہے، حقیقت بڑی حد تک بے نقاب ہوچکی ہے اور اگر اس کے بعد بھی مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کی لعنت کو اپنے اوپر سے دور نہ کیا تو پھر اس کے بعد غالباً کوئی دوسری نشانی قدرت کی طرف سے ظاہر ہونے والی نہیں ہے۔ اور اب جو فیصلہ دست خدا میں اس قوم کے لئے انتظار کر رہا ہے وہ صرف یہی ہے کہ

کونوا قردۃ خاسئین

نیاز

بنی فاطمہ کی سیاسی تحریکیں اور اُن کا تاریخی انجام

عہد امویہ و عباسیہ کی داستان خونیں کے چند صفحے

ہر انسان پر خواہ وہ زاہد شب زندہ دار ہو، یا رند معصیت کوش زندگی کے بعض ایسے معصوم اور برگزیدہ لمحے بھی گزر جاتے ہیں، جب اشیاء و مناظر کی حقیقت پر بھی اُسے غور کرنا پڑ جاتا ہے پھر اُس کا موضوع فکر کبھی خود اس کی ذات ہوتی ہے اور کبھی ماورائے ذات۔ چنانچہ فلسفہ کے مختلف مذاہب، شاعری کے مختلف اسالیب اخلاقیات و عمرانیات کے مسائل اسی خیال کی تحلیل کا نتیجہ ہیں۔

سب سے پہلے انسان کی نظر زندگی اور اس کی حقیقت پر پڑتی ہے، اور اسی عقدہ کے حل کرنے کے بعد انسان ماورائے ذات کے ساتھ اپنے ربط و علاقہ کی تعیین کرتا ہے۔ حقیقت زندگی کیا ہے؟ اس کے جواب میں خیالات کا ایک عمان بے پایاں سامنے آجاتا ہے، لیکن بچین قلوب کو نہ افلاطون کے "تصورات" کی موشگافیاں تسکین پہونچا سکتی ہیں نہ ارسطو کی ثنویت اور اس کے آفریدگار کی بے نیازیاں،

ازیں چہ سود وزیاں در کمال حکمت او　　کہ بوعلی مقر و ارسطو بہ انکار است

مذاہب کو ان کے پرستاروں کی انانیت اور خود غرضیوں نے سیاسیات سے زیادہ بلند سطح پر نہیں رکھا اس لئے اس کے مکارم و معالی، نشو و ارتقا کی تدریجی رفتار کے ساتھ فنا ہونے لگے اور آخر کار مذہب اپنے خود غرض پرستاروں کی وجہ سے ہلاکت و فساد کا ایک خوفناک نظام بنگیا۔ اس لئے انسان اپنی ہی طرف دیکھتا ہے، اور سوال کرتا ہے زندگی کیا ہے؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر محرومیاں اور کامرانیاں دونوں آئندہ چل کر خواب و خیال بنجاتی ہیں تو پھر ہم مستقبل کے ساتھ اس قدر آرزومندانہ انہماک کیوں رکھتے ہیں ہم ساری آرزوؤں کو کیوں نہیں تیاگ دیتے اور پھر سوال یہ ہے کہ اس افسردگی تمنا کے بعد ہم میں جینے کا حوصلہ کیوں باقی رہتا ہے۔ غالب اپنے فلسفیانہ انداز میں اس کا جواب دیتے ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　نا اُمیدی اُسکی دیکھا چاہیے

مرزا کا عقیدہ ہے کہ زندگی محض اُمیدوں کے سہارے قائم رہتی ہے، اگر اُمیدیں باقی نہ رہینگی، تو موت اُمید بنجائیگی، یعنی انسان زندہ رہنا پسند نہیں کریگا، غالب کا یہ شعر زندگی کی بالکل حقیقت ہے۔

انسان فطرتاً رجائیت کا جذبہ لیکر آیا ہے، اور جب تک وہ زندہ رہتا ہے، محرومیوں کے باوجود مستقبل کے ساتھ ایک آرزو رکھتا ہے، زمانہ اور اس کا انقلاب یا تو انسانی قلوب کو مدفن تمنا بنا دیتا ہے، یا گلشن تمنا، لیکن انسان جب ماضی کا جائزہ لیتا ہے تو اس کی کامیابیاں بھی محرومیوں سے زیادہ ناکام نظر آتی ہیں۔ ناکامی تو خیر خلش دل بنکر زندگی کا ساتھ دیتی ہے، لیکن کامرانیوں کا انجام تو بے کیفی اور افسردگی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ انسان کیفیت چاہتا ہے خواہ وہ درد ہو یا نشاط! رونا بھی آرزو کے وجود کی دلیل ہے، کیونکہ انسان روتا بھی اسی وقت ہے جب دل میں کوئی آرزو موتی ہے۔ اور اصل رونا تو نہ رونے کا ہے، دل کی حسرتیں ختم ہو جاتی ہیں تو آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ ظہوری اس نفسیاتی مسئلہ کے متعلق اپنے شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں،

گریۂ حسرت اے ظہوری چند آرزو ہا ہمہ ز دیدہ چکید

فلسفی شاعر کہتا ہے، کہ انسان کبتک روئے، ارے ساری آرزوئیں تو آنکھوں کی راہ بہگئیں اب آرزو ہی نہیں تو روئیں کیا۔ یہ صرف شاعری نہیں ہے، بلکہ شاعر نے ایک نفسیاتی واقعہ بیان کر دیا ہے۔

الغرض ماضی کا جائزہ لینے اور مستقبل کا تجزیہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہونچتا ہے، کہ زندگی نام ہے دراصل ماضی کے خواب و خیال بنجانے اور مستقبل کے ساتھ آرزوؤں کی وابستگی کا، بس یہی زندگی کی حقیقت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس انکشاف کے بعد ہم پر یاس و بے حسی کیوں نہیں طاری ہو جاتی۔ یہیں پہونچکر نظام فطرت انسان کو اندھا بنا دیتا ہے، اور جب تک انسان کے قوی باقی رہتے ہیں وہ فطرت کے ذوق آرائش میں اپنی زندگی تباہ و برباد کرتا رہتا ہے، عمرانیات کا سارا ساز نشاط، حکومتوں کی ساری حکمت عملی، ذہن و جسم کی تمام پیداوار ایک اسی فریب خیال کا نتیجہ ہیں ورنہ سلف کے تمدنی کارنامے قدما کے آثار حکومتوں کا قیام و زوال خاندانوں کا عروج و انحطاط ہمارے اندر کیوں نہیں ایک نفسی رد عمل پیدا کر دیتا ہے، آخر ہم کیوں آرزوہائے خیالی کے دیوانے ہیں ہم دل کے اندر امیدوں کی پرورش کیوں کرتے ہیں اور ان کے پورا ہونے کے لئے اس قدر سرگرداں کیوں ہیں؟ قرآن نے اپنے اچھوتے فلسفیانہ انداز میں اس کی طرف ایک جگہ اشارہ کیا ہے،

اتبنون بکل ریع آیۃ تعبثون ہ وتتخذون مصانع لعلکم تخلدون + (شعراء)

کیا تم ہر اونچے مقام پر ایک یادگار بناتے ہو جو بالکل عبث ہے اور بڑے بڑے محل طیار کرتے ہو جیسے ہمیشہ تم کو دنیا میں رہنا ہے۔

یہ ہے اسلامی عمرانیات کا وہ سہل و سادہ اصول جو انسان کو دنیا کی بہت سی ابلہ فریبیوں سے بچا سکتا ہے۔

لیکن انسان کے اندر جسوقت جذبۂ انانیت پیدا ہوتا ہے وہ دولت و جاہ امارت و حکومت، شہرت و عزت خود غرضی و کامرانی کے نشہ میں سرشار ہو جاتا ہے اور ایسے ذرائع ڈھونڈھنے لگتا ہے جن کی بدولت اسکو ابنائے

جنس پر تفوق و برتری حاصل ہو، یہیں سے اخلاقیات کی ساری فرومایگی شروع ہوتی ہے اور انسان سے تو اہیں اخلاقی رفتہ رفتہ رخصت ہونے لگتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک درندہ بنجاتا ہے۔ جس کی بیشمار مثالیں صفحات تاریخ میں موجود ہیں۔ اچھا تو آیئے آج کی صحبت میں "بنی فاطمہ" کی مظلومیت اور امویہ و عباسیہ کی خون آشامیوں پر ایک نگاہ ڈال کر فطرت انسانی کی ہوسناکیوں کا مطالعہ کریں۔

مختصراً اگر میں کہنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ کے صفحات علویہ و اہلبیت کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ حضرت زید شہید کو جس طرح فنا کے گھاٹ اتار آگیا وہ ہشام و ولید کو ابدی لعنت میں گرفتار رکھنے کے لئے کافی ہے۔ حضرت یحییٰ ابن زید کا سر کاٹ کر بی بی ربطہؓ کے آغوش میں دنیا ایک ایسی وحشت ہے، جس پر چنگیز و ہلاکو بھی رشک کریں گے، محمد نفس الزکیہ اور ابراہیم کو جس غداری اور بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا وہ خلیفہ منصور کے دامن پر ایسا دھبہ ہے، جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔ ہارون الرشید اسلامی دنیا کا ایک نامور خلیفہ سہی اس کی بیدار مغزی اس کی سیاسی اہمیت اس کا قانخانہ جوش و خروش مسلم لیکن آہ! یحییٰ ابن عبد اللہ محض کو امان دیکر زہر دلا دینا کیا معمولی واقعہ ہے، اور کیا اس کو آسانی کے ساتھ معاف کیا جا سکتا ہے، کیا ابو الحسین ابن علی العابد کا واقعہ اور مصائب "فخ" محض اس بنا پر فراموش کئے جا سکتے ہیں کہ خلیفہ ہادی کے حکم سے یہ بلا انگیزیاں نہیں ہوئی تھیں امام محمد تقی کہا کرتے تھے۔

لم یکن لنا بعد الطف مصرع اعظم من فخ } کربلا کے بعد سب سے بڑی مصیبت جو ہم پر نازل ہوئی وہ واقعہ فخ ہے۔

کیا امام جعفر صادق جیسے گوشہ نشین عالم کو زہر دینا خلیفہ منصور (۱۳۶ھ - ۱۵۸ھ) کی معمولی دنائت تھی، کیا حضرت امام موسیٰ کاظم کو زہر دینے کے بعد بھی رشید (۱۷۰ھ - ۱۹۳ھ) اسلامی دنیا کا ہر دلعزیز تاجدار کہا جا سکتا ہے، کیا امام علی نقی کو زہر کا پیالہ پلا دینا خلیفہ المعتز (۲۵۲ھ - ۲۵۵ھ) کا ایسا کارنامہ ہے جس پر دنیا عباسیہ کے جاہ و جلال اور اسلامی شان و شکوہ کی داد دے سکتی ہے۔ الغرض کہاں تک عباسیہ کی سیہ کاریوں ... کا شمار کیا جائے، میں مانتا ہوں کہ انھوں نے اپنی جلالت و عظمت، علمی و سیاسی خدمات، معاشرتی و عمرانی ترقیوں کے ذریعہ سے عربوں کو دنیا کی ملتوں کے سامنے بہت سربلند کر دیا۔ لیکن کیا دنیا میں صرف سربلندی حاصل کر لینا ہی اسلام کا اصل پیام ہے، کیا ترقی کا حقیقی معیار اسلام کے نزدیک یہی ہے کہ بغداد میں مہدیہ جیسی شاندار عمارتیں بنا دی جائیں، یونانی زبان کی خرافات کا عربی میں ترجمہ کیا جائے، عباسی حکومت کو اطراف و اکناف عالم تک وسیع کر دیا جائے۔ کیا یہ سب کچھ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی تھی۔ بالفرض ہو بھی تو بنی فاطمہ کے ساتھ اُن کا سلوک کیا ان کو اسلامی دنیا کے لئے رحمت بتا سکتا ہے۔

زید شہید

حضرت زید بن امام علی زین العابدین فریادی بنکر ہشام اموی کے دربار میں تشریف لے جاتے ہیں، ہشام اپنے افسر فوج کو حکم دیتا ہے کہ زید ہمارے لشکر میں رہنے نہ پائیں حضرت زید یہ سنکر فرماتے ہیں کہ جو شخص تلوار کی زد ناپسند کرتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے" لوگوں نے یہ خبر دربار میں پہونچا دی ہشام سمجھا کہ آپ اسپر خروج کریں گے، وہ مکہ میں آیا' اور حضرت زید' داؤد بن علی بن عبداللہ بن عباس اور محمد ابن عمر بن حضرت علی کو گرفتار کیا اور الزام یہ لگایا کہ خالد قشیری کا مال اُن کے یہاں موجود ہے۔ جب یہ لوگ گرفتار کرکے کوفہ میں یوسف ابن عمر ثقفی کے پاس بھیجے گئے تو ان لوگوں نے قسم کھائی کہ خالد کا مال ان کے ذمہ نہیں ہے چنانچہ یوسف نے ان کو رہا کر دیا اس کے بعد شیعہ، زید کو قادسیہ سے کوفہ کی طرف لائے اور آپ سے بیعت کی۔ جو لوگ آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے' زیدیہ کہلاتے ہیں اور جنھوں نے آپ کو چھوڑ دیا" رافضہ" کہلاتے ہیں صرف کوفہ میں زید کے ساتھ پندرہ ہزار آدمی موجود تھے' اس کے علاوہ مدائن بصرہ' واسط، موصل' خراسان رے' جرجان، جزیرہ وغیرہ کے باشندوں نے بھی ساتھ دیا۔ ۱۲۱ھ میں آپ نے لوائے خروج بلند کیا رفتہ رفتہ آپ کے رفیقوں نے آپ کو چھوڑنا شروع کیا یہاں تک کہ صف آرائی کے دن آپ کے ساتھ صرف تین سو آدمی تھے' امویہ کی طرف سے یوسف ابن عمر ثقفی دس ہزار فوج لیکر آیا تھا میدان کارزار گرم تھا کہ یوسف ابن عمر ثقفی کے ایک غلام نے جس کا نام "راشد" تھا ایک تیر مارا جس سے حضرت زید کی پیشانی زخمی ہوگئی آپ کو سواری سے اتار اگیا آپ کا سر مبارک مسلم ابن محمد خیاط کے گود میں تھا' آپ کے صاحبزادے یحییٰ ابن زید تشریف لائے' اور روکر کہا "ابا جان! بشارت ہو کہ آپ حضرت رسول اللہ علی، فاطمہ' اور حسن و حسین سے ملیں گے" حضرت زید نے فرمایا "میرے عزیز بچے اب تم کیا کروگے"؟ حضرت یحییٰ نے جواب دیا "ابا جان میں تن تنہا بھی اُن سے لڑونگا" حضرت زید نے فرمایا "ہاں میرے بچے یہی کرو' چونکہ تم حق پر ہو اور وہ ناحق پر اگر انھوں نے تم کو شہید کیا تو تم جنت میں داخل ہوگے اور اگر وہ مارے گئے تو واصل جہنم ہوں گے" اس کے بعد تاریخ میں حضرت زید کا وہ حسرتناک انجام مرقوم ہے' جسے علامہ سراج الدین رفاعی نے اس طرح لکھا ہے[1]:۔

پھر تیر آپکی پیشانی سے نکالا گیا اور اسی کے ساتھ آپ نے رحلت کی۔ سعید بن خیثم کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم لوگ آپ کو ایک چشمہ کے نزدیک لائے جو ایک باغ کے اندر جاری تھا آپ کی لاش دفن کر دی اور ہمارے ساتھ ایک سندی غلام تھا اُس نے یوسف کو خبر کردی۔ صبح کے وقت آپ کی لاش چشمہ سے نکالی اور ایک کنیسہ میں سولی دیدی اور چار برس تک سولی ہی پر لٹکائے رکھا (اس عرصہ میں) ہشام نے قضا کی اور ولید ثانی ابن

---

[1] صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار

یزید ثانی (۱۲۵ھ ۔ ۱۲۶ھ) نے یوسف کو لکھا کہ تم کو جس وقت میرا خط ملے فوراً اہل عراق کی طرف جاؤ اور (زید کو) جلاکر آپ کی خاک دریا میں منتشر کردو، یوسف نے سولی سے لاش اتاری اور جلاکر راکھ ہوا میں منتشر کردی،

یحییٰ ابن زید شہید

حضرت زید کے چار بیٹے تھے، یحییٰ، حسین ذوالدمعہ، عیسیٰ موتم الاشبال، اور محمد حضرت یحییٰ سب سے بڑے صاحبزادہ تھے۔ آپ لاولد مرے حضرت زید کی شہادت کے بعد آپ مدائن میں آئے خلیفہ ولید اموی کے گورنر یوسف ابن عمر نے آپ کو بلایا آپ رے کی طرف چلے گئے وہاں سے نیشاپور اور سرخس میں آئے اس کے بعد یوسف نے نصر ابن سیار کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی تین دن تک سخت لڑائی ہوئی لوگوں نے جمعہ کے دن عصر کے بعد ۱۲۵ھ میں آپ کو جام شہادت پلادیا شہادت کے وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی آپ کا سر مبارک ولید کے دربار میں آیا، جسد مبارک سولی پر لٹکا دیا گیا، ولید نے سر مبارک مدینہ میں بھیجا کہ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی ریطہ بنت عبد اللہ بن محمد بن علی بن ابی طالب کے گود میں ڈالدیا جائے بی بی ریطہؓ حضرت شیر خدا کی پوتی تھیں آپ کی رگوں میں وہی خون جاری وساری تھا آپ نے سر کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور امویوں کی طرف خطاب کرکے کہا۔

شردتموه عنی طویلا واهدیتموه الی قتیلا
صلوات الله علیه بکرة واصیلا

ایک عرصہ تک تم نے مجھکو اسکا داغ فراق دیا اور (اب) قتل کرکے اس کا تحفہ دیتے ہو، اللہ تعالیٰ کی بخششیں اس پر صبح وشام ہوا کریں

ایک غیر متعصب طالب علم امویوں کی اُن سیہ کاریوں کی داستان پڑھکر حیرت میں آجاتا ہے کہ امویہ مسلمان تھے یا ننگ اسلام!

بنوحسن کی سیاسی جد وجہد

بنوحسن نے بدسلوکیوں کے باوجود نہ تو قایم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی نہ سیاسیات میں کوئی حصہ لیا تھا۔ علی ثانی (امام زین العابدین) کی اولاد عزلت گزیں زندگی گزارتی تھی اور علمی وفلسفیانہ مشاغل میں مصروف، اُنھوں نے خود کو بنی عباس کی سیاسی تحریکوں سے بالکل علیحدہ رکھا، البتہ زید شہید اور آپکے صاحبزادہ نے مظلومیت کی بنا پر ہشام اور یزید کے خلاف اسلحہ اُٹھایا اور اپنی زندگی قربان کردی۔ بنوحسن اور بنوحسین مدینہ میں رہتے تھے اور کبھی کبھی قلیل جایداد کچھ تجارتی منفعت اور مدارس کی غیر متعین آمدنی پر ان کی بسر ہوتی تھی، لیکن اس فلاکت کے باوجود، مقامی باشندے ان کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، مدینہ میں خلفائے ثلاثہؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور اکابر صحابہؓ کی اولاد بھی رہتی تھی، اور یہ سب علویہ کے ساتھ علاقہ رکھتے تھے۔ علویہ کے اس اثر ورسوخ اور عزت و برتری کو دیکھ کر منصور عباسی کو خوف ہوا کہ جس آسانی کے ساتھ بنی مروان تباہ ہوگئے

کہیں اس کا خاندان بھی نہ برباد ہوجائے۔ چنانچہ اُس نے مختلف طریقوں سے پتہ لگانے کی کوشش کی کہ کہیں بغاوت کا سامان تو نہیں، اُس نے اپنے آدمیوں کو یہ ہدایت کرکے علویہ کے یہاں بھیجا کہ وہ اُن کے معتمد بنجائیں اور ان کو بلاخوف بولنے کی ترغیب دیں، تاکہ اس کو دارو گیر کے لئے حجت مل جائے اس طرف جب امویہ کی حکومت کو زوال ہورہا تھا تو فطری طور پر علویہ اس سے دلچسپی لے رہے تھے۔ مدینہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں بہت سے بنوحسن اور بنوحسین جمع ہوئے۔ منصور بھی اس میں شریک تھا۔ اس جمعیت میں امام حسن کے پوتے محمد (جو بنوحسن کے سردار تھے) خلیفہ منتخب ہوئے آپ کی صداقت و شرافت اخلاق کے باعث آپ کو "نفس الزکیہ" کا لقب ملا تھا۔ سارے مجمع نے مع ابوجعفر منصور متفقہ طور پر آپ کی لیاقت و فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ سے بیعت کی جب منصور تخت خلافت پر بیٹھا، اس ناقابل فراموش بیعت کی یاد سے اس کی زندگی تاریک نظر آنے لگی، اور اس کا شک قوی ہوگیا۔ اور اس نے محمد نفس الزکیہ اور آپ کے بھائی ابراہیم کو گرفتار کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ لوگ فرار ہوگئے اس نے خاندان کے بڑے بڑے لوگوں کو گرفتار کیا جن میں ضعیف العمر حضرت عبداللہ محض اور آل عثمان کے سردار محمد العثمانی بھی شامل تھے جن کی صاحبزادی ابراہیم کی زوجیت میں تھیں ان کو پابزنجیر کوفہ میں بھیجا گیا اور قلعہ میں قید کیا گیا۔ محمد العثمانی کو اہل شام بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، اس لئے اُن کی شخصیت بھی تخت عباسیہ کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی، چنانچہ آخرکار آپ کو کوڑے لگائے گئے اور پھر قتل کردیا گیا۔ دوسروں کے ساتھ بڑی سفاکی کی گئی۔ یہاں تک کہ غریب مظلوموں نے اعتراف کیا کہ وہ اس لحاظ سے تو دور اموی ہی میں اچھی طرح بسر کرتے تھے۔ محمد اور ابراہیم کی گرفتاری کے لئے چاروں طرف لوگ سرگرم تھے، بدوؤں کو پانی کے مقامات پر متعین کیا گیا کہ وہ جاسوسی کریں۔ جن لوگوں پر پناہ دینے کا شبہ تھا ان کو کوڑے مارے گئے قید کیا گیا۔ آخر ناامید ہوکر محمد نے اپنے بھائی ابراہیم کو اہواز اور بصرہ کی طرف تحریک کیلئے بھیجا، اور خود مدینہ میں تشریف لائے، منصور کے عزل کا اعلان بہ یکوقت بصرہ اور مدینہ میں ہونا قرار پایا۔ اگر یہ کارروائی کامیاب ہوجاتی تو غالب گمان تھا کہ عباسیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوجاتا لیکن محمد پر اُن کے بھائی کی تیاریوں کے قبل اعلان کرنے کا زور دیا گیا اور اس لئے منصور باری باری دونوں پر حملہ کرنے کے لائق ہوگیا منصور کا عامل جو مدینہ میں تھا گرفتار کرکے قید کردیا گیا اور چند دنوں کے اندر سارے حجاز اور یمن نے محمد کو دنیائے اسلام کا خلیفہ مان لیا امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے محمد کی تائید میں فتویٰ دیا۔ منصور نے جب اس تحریک کو توقع سے زیادہ خطرناک پایا تو اپنی رسمی روباہ بازی سے کام لیا اور محمد نفس الزکیہ کو ایک خط لکھا اور اُن کو اجازت دی کہ جہاں جی میں آئے رہیں اسی کے ساتھ ایک بڑے وظیفہ کی لالچ دی اور ان کے رشتہ داروں کے حق میں بھی رعایت کا وعدہ کیا۔ محمد نے اس کا جواب دیا کہ آمرزش اور مہربانی کرنے کا حق تو ہم کو ہے، کیونکہ حقیقت

کے اعتبار سے خلافت میری چیز ہے'، اور امان کے متعلق یہ لکھا کہ اس کی حقیقت اسی امان کی سی تو نہیں جو ابومسلم، عبداللہ بن علی اور یزید بن ہبیرہ کو دی گئی تھی۔ منصور اس تلخ جواب سے جل گیا اور اس نے محمد نفس الزکیہ کو ایک طویل خط لکھا۔ اور اس پر زور دیا کہ چونکہ آنحضرتؐ نے کوئی اولاد ذکور نہیں چھوڑی اس لئے آپ کی صاحبزادی کی اولاد کو وراثت نہیں پہونچتی، بلکہ اس کی حقدار آپ کے چچا عباس کی اولاد ہوئی۔ منصور نے اپنے بھیتجہ عیسیٰ کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا تاکہ وہ نفس الزکیہ کو کچل ڈالے۔ جنگ کے قبل محمد نفس الزکیہ نے اپنے رفقاء سے کہا کہ جس کے جی میں آے میرے ساتھ رہے، اور جو جانا چاہے چلا جائے۔ اسپر آپ کے معاونین کی اکثریت نے اپنے اپنے گھر کا راستہ لیا اور آپ صرف تین سو آدمیوں کے ساتھ منصور کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے رہگئے۔ آپ کے تمام ہیرد ایک ایک کرکے شہید ہوگئے اور ان کی لاشیں حسب دستور دار پر لٹکائی گئیں اہلبیت کی ایک خاتون نے عیسیٰ سے اجازت لیکر مقتولین کو مدینہ کے نزدیک "روضۃ الشہدا" میں دفن کردیا۔

اسمعیلیہ دادارسہ عباسیہ نے فاطمیہ کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ وہ خراب وخستہ رہیں، لیکن فطرت اپنا اصول کب چھوڑتی ہے، جہاں تک ان کو ستایا گیا جہاں تک انکی جمعیتیں پریشان کی گئیں، اتنا ہی لوگوں کے دل ان کے گرویدہ ہوتے گئے اور یہ بھی تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے کہ اس پریشان حالی بے سروسامانی اور فلاکت کے باوجود فاطمیہ کی دو زبردست حکومتیں اسمعیلیہ اور ادارسہ قایم ہوگئیں۔ حضرت امام حسین کی اولاد نے بہ استثنائے حضرت زید و یحییٰ کوئی ایسی سیاسی تحریک نہیں کی، پھر بھی حضرت اسمعیل ابن امام صادق کی اولاد نے مغرب میں جلالت وشکوہ کے وہ کارنامے چھوڑے کہ دول اسلامیہ کی تاریخ میں ان کو ایک خاص امتیاز واہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، عبیداللہ المہدی سے فاطمیہ مصر کے آخری فرمانروا العاضد لدین اللہ (۲۹۷ھ۔ ۵۵۵ھ) تک ڈھائی سوصدیوں سے زیادہ زمانہ ہوتا ہے، انھوں نے صقلیہ تک اپنی حکومت وسیع کی آل حسن نے عباسیہ کے لئے ایسی ایسی سیاسی نزاکتیں پیدا کردیں کہ منصور ورشید کے ہوش پراگندہ ہوگئے، محمد نفس الزکیہ اگر منصور ہی کی طرح سیاسی چالبازیوں سے باخبر ہوتے تو آج اسلام کی تاریخ میں عباسیہ کی جگہ فاطمیہ وعلویہ ہی نظر آتے، اگر رشید حضرت یحییٰ کو دیلم سے بلاکر زہر نہ دلا دیتا تو وہ دیلم کے بادشاہ ہو چکے تھے، اور تاریخوں میں "صاحب الدیلم" ہی کے لقب سے مشہور ہیں۔ حضرت عبداللہ محض ابن حسن مثنی ابن امام حسنؑ کے چار صاحبزادوں محمد، ابراہیم، یحییٰ، ادریس نے ظلم وستم سے اکتاکر ایسی ایسی تحریکیں کیں کہ عباسیہ خوفزدہ ہوگئے لیکن سیاسیات کے مکروفریب سے باخبر ہونے کے باعث ان کو ناکامیاں ہوئیں حضرت ادریس کو خدا نے مغرب کا بادشاہ بنایا اور اس طور سے یہ دوسرا فاطمی

خاندان ہے، جس کو حکومت و سلطنت ملی ۱۶۹ھ سے ۳۱۹ھ تک ان کی حکومت رہی، یحییٰ سوم کے زمانہ ۳۱۹ھ میں ادارسۂ مصر کا خاتمہ ہو گیا اس کے بعد ادریسی خاندان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قایم ہوئیں جن پر ۳۱۹ھ میں امویہ اندلس اور اسمٰعیلیہ متصرف ہو گئے۔

یحییٰ فرمانروائے دیلم

آپ صاحب الدیلم مشہور ہیں جیسا کہ مشہور نسابہ سید عمید الدین حسینی نے بیان کیا ہے، آپ حضرت امام حسن کے پوتے تھے، آپ کے والد کا نام عبد اللہ محض ابن حسن مثنیٰ بن امام حسن ہے، آپ خلیفہ رشید کے زمانہ میں بھاگ کر دیلم پہونچے وہاں کے باشندوں نے آپ سے بیعت کی اور اور آپ کے پاس جمع ہو گئے آپ کی شان و شوکت بڑھی، ہارون الرشید کو اس کا بڑا صدمہ و قلق ہوا اُس نے فضل ابن یحییٰ برمکی کو لکھا کہ یحییٰ نے میری آنکھوں میں کانٹے چبھوئے ہیں، جو وہ چاہیں اُن کو دو اور ان کی طرف سے میرا اندیشہ دور کر دو، فضل بن یحییٰ ایک بڑا لشکر لیکر آ دھمکا اور خوف و لالچ جہر و قہر سے اُن کو پیام دیا۔ یحییٰ نے امان طلب کی فضل نے رشید کے وکیل کی حیثیت سے امان نامہ لکھدیا بعض روایت میں ہے کہ آپ دیلم میں غلامی کی حالت میں پہونچے وہاں کے باشندوں نے ایک لاکھ دینار میں آپ کو فضل سے خرید لیا حضرت یحییٰ مدینہ میں چلے گئے اس قیام مدینہ کے زمانہ میں عبد اللہ بن مصعب بن ثابت بن عبد اللہ زبیر رضؓ نے آپ کے خلاف رشید سے کہدیا کہ وہ مجھ سے بیعت لینا چاہتے تھے۔ رشید نے دونوں کو بلایا یحییٰ بھی مدینہ سے آئے جب آپ سے زبیری (عبد اللہ بن مصعب) کا سامنا ہوا تو اُس نے کہا "تم نے ہمارے خلاف سازش کی اور ہماری حکومت کی تباہی کا ارادہ کیا"

یحییٰ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم کون ہو؟ رشید کو بے اختیار ہنسی آ گئی یحییٰ نے کہا یا امیر المومنین یہ شخص جو آج ہم پر تہمت رکھ رہا ہے ہمارے بھائی نفس الزکیہ کے ساتھ آپ کے جد منصور کے خلاف خروج میں شامل تھا اور یہ اسی نے کہا ہے۔

قوموا ببیعتکم ننهض بطاعتنا　　　ان الخلافة فیکم یا بنی حسن

(ترجمہ) اے آل حسن! اپنی بیعت کیلئے اٹھ کھڑے ہو، ہم تمھاری فرمانبرداری کیلئے مستعد ہیں خلافت تمھاری چیز ہے

اور اے امیر المومنین یہ شخص جو تہمت رکھ رہا ہے وہ آپ کی محبت اور آپ کی حکومت کے ساتھ ہمدردی رکھنے کا نتیجہ نہیں بلکہ ہم تمام اہل بیت کے ساتھ عناد پروری کا مظاہرہ ہے، میں حلف اُٹھانے کو کہتا ہوں اگر وہ حلف اُٹھا لیگا کہ میں نے اس سے بیعت کے لئے کہا تھا تو پھر میرا خون آپ کے لئے حلال ہو گا۔"

جب عبد اللہ نے جھوٹا حلف لیا تو، یحییٰ نے کہا یا امیر المومنین مجھے تین دن تک حوالات میں رکھئے۔ اگر عبد اللہ پر کوئی بلا نازل نہ ہو تو میرا خون حلال ہے۔ رشید نے یحییٰ کو فضل برمکی کے سپرد کیا فضل روایت

کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم ہم نے ابھی اس دن عصر کی نماز بھی نہ پڑھی تھی کہ عبد اللہ بن مصعب کے گھر سے چیخنے کی آواز آئی، میںنے دریافت حال کے لئے آدمی بھیجے معلوم ہوا کہ وہ جذام کے مرض میں مبتلا ہوگیا۔ میں اس کے یہاں گیا لیکن میں نے اس کو نہیں پہچانا، وہ سیاہ کوئلہ کے مثل ہوگیا تھا^ک۔ میں رشید کے پاس گیا تاکہ اس کو خبر دوں ابھی میں نے بات بھی پوری نہیں کی تھی کہ اس کی موت کی خبر آئی۔ مگر رشید کا ظلم تو دیکھئے کہ وہ اس پر بھی باز نہ آیا آخر امان نامہ پھاڑ ڈالا، اور یحیٰی کو جیلخانہ میں بھیجدیا، چند دن گزرنے کے بعد قاضی اور اہل دربار جمع ہوئے سبھوں نے کہا کہ امان نامہ صحیح ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں، یحیٰی خموش تھے حاضرین میں سے کسی نے کہا آپ چپ کیوں ہیں؟

آپ نے اپنے منھ کی طرف اشارہ کیا کہ مجھ میں بولنے کی طاقت نہیں اور اپنی زبان نکالی آپ کا رنگ سیاہ ہوگیا تھا رشید نے کہا یہ تم کو وہم دلارہے ہیں کہ ان کو زہر دیا گیا ہے، پھر آپ کو جیلخانہ میں واپس کردیا اس کے بعد آپ کی کوئی خبر نہ ملی،

آپ کے واقعۂ شہادت کے متعلق مختلف روایتیں بیاں کی جاتی ہیں ایک روایت تو یہ ہے، کہ ایک حوض میں بھوکے شیروں کے سامنے چھوڑ دیا گیا اور وہ آپ کو نوچ کر کھا گئے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ سندی ابن شاہک کے گھر میں ایک کمرہ کے اندر بند کردیا اور اس کو مٹی وغیرہ سے بھر دیا۔

ابو الحسین ابن علی عابد آپ حضرت حسن مثلث ابن حسن مثنیٰ ابن امام حسنؑ کی اولاد میں تھے، آپ نے خلیفہ ہادی ابن مہدی عباسی کے زمانہ میں علویہ کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ میں خروج کیا محمد ابن علی ابن عیسیٰ اور محمد ابن سلیمان بن منصور نے بمقام فخ ۱۶۹ھ میں آپ کو جام شہادت پلایا اور آپ کی گردن مبارک کاٹ کر خلیفہ ہادی کے دربار میں بھیجی، ہادی کو اُن کی یہ حرکت پسند نہ آئی امام محمد تقی ابن امام علی رضا فرمایا کرتے تھے کہ کربلا کے بعد سب سے بڑی مصیبت واقعۂ فخ ہے جو ہم لوگوں پر گزری۔

عبد المالک (آروی)

(نگار) ہمارے عزیز دوست مولوی عبد المالک آروی نے جس سوز و درد کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، اُس سے کس کو ہمدردی نہ ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ امویہ و عباسیہ کی تمام سختیاں

ک (نگار) حیرت ہے کہ یحیٰی کے خلاف جھوٹی قسم کھانے پر ایک شخص تو مبتلائے جذام ہوجائے، لیکن خدا ان لوگوں کو چھوڑ دے جو واقعی ظلم وستم کے بانی تھے۔ اس نوع کی روایات ماننے میں مجھے بہت تامل ہے۔ نیاز

مومنین کے خلاف کیوں تھیں؟ کیا اس لئے تھیں کہ وہ آل رسول و معاونین آل رسول تھے؟ کیا محض اس لئے تھیں کہ بانی اسلام کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا؟ نہیں، بلکہ یہ مخالفت صرف اس لئے تھی کہ وہ ڈرتے تھے کہیں اُن کی حکومت نہ چھین جائے اور علویین اُن کی سلطنت پر قابض نہ ہوجائیں۔ پھر جب یہ امر مسلم ہے کہ عہد خلافت کے بعد، امیر معاویہ کے عہد سے اسلام میں خالص دنیاوی حکومت شروع ہوگئی تھی اور بنی امیہ و بنی عباس میں جن جن کو خلفاء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے وہ سب کے سب اُنھیں اصول سیاست کے ماتحت اپنی حکومتوں کو قائم رکھنا چاہتے تھے، جو دنیا کے حکمرانوں نے ہمیشہ اختیار کئے ہیں، تو پھر اُن کے مظالم کا شکوہ کیوں کیا جائے؟

اگر تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ امویہ وعباسیہ نے علویین پر ظلم کئے تو یہ بھی ثابت ہے کہ علویین نے ہمیشہ درپردہ اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور بارہا امویہ وعباسیہ کے خلاف خروج بھی کیا۔ اس لئے اگر امویہ وعباسیہ نے اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو دنیائے ارباب حکومت ——— اپنی سلطنت کے تحفظ کے لئے ہمیشہ کیا ہے اور ہمیشہ کریں گے تو کیا الزام ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر امویہ وعباسیہ اس قدر سختیاں نہ کرتے، اتنی احتیاط سے کام نہ لیتے تو علویین کا برسراقتدار ہوکر حکمراں ہوجانا یقینی تھا اور امویہ وعباسیہ اُسے کس طرح گوارا کرسکتے تھے۔ اگر وہ سمجھتے کہ آل رسول ہی مستحق خلافت ہیں اور حکومت وسلطنت اُنھیں کو ملنا چاہئے تو یہ جھگڑا اٹھتا ہی کیوں۔ الغرض تمام دنیاوی حکومتوں کے قیام کی تاریخ اسی طرح کی خونیں داستانوں سے معمور ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر علویین برسرحکومت ہوتے تو امویہ وعباسیہ کے ساتھ وہ کوئی دوسرا سلوک کرتے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ امویہ وعباسیہ اگر واقعی مسلمان ہوتے تو آل رسول کے ساتھ اس قدر بدتمیزی کا سلوک کبھی گوارا کرتے، اس پر دونوں جانب سے بہت کچھ کہا جاسکتا ہے اور اس قسم کے مباحث کو چھیڑنا اب بالکل بیکار ہے جبکہ مسلمانوں سے خلافت وحکومت دونوں چیزیں چھین لی گئی ہیں اور علویین وغیر علویین سب کے لئے یہ "باب نزاع" الحمدللہ ہمیشہ کیلئے بند ہوگیا ہے۔

یہ وقت اس بحث کا نہیں کہ اس سے قبل ہم پر کیا گزر گیا، بلکہ یہ دیکھنے کا ہے کہ آئندہ ہم پر کیا گزرنے والا ہے۔ یعنی اب ضرورت گزشتہ اختلافات کے دہرانے کی نہیں ہے بلکہ آئندہ کسی ایک امر پر متفق ومتحد کردینے کی ہے۔ وللہ درماقال

بحث وجدل بجائے ماں، میکدہ جوئی کاندراں　　کس نفس از جمل نزد، کس سخن از فدک نخواند

(نیاز)

ناموس خاندان

(تمثیل)

سین — ~~قاضی صاحب~~ ایک قدیم وضع کے زمیندار کی میلی کچیلی بیٹھک جسمیں برائے نام سامان آرائش ہو
کمرے کے کچے فرش پر کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ایک کثیف دری بچھی ہے۔ کھڑکیاں ندارد ہیں صرف
ایک روشن دان اور دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ سڑک کی جانب ہے دوسرا زنانہ مکان
میں کھلتا ہے۔ زنانہ مکان کے دروازے پر ٹاٹ کا ایک موٹا پردہ پڑا ہے۔ داخلہ کے دروازہ
کے بالکل مقابل، کمرے کے وسط میں دیوار سے متصل ایک تخت ہے جس پر پھٹا پرانا فرش
بچھا ہے۔ اسی فرش پر ایک پیرانہ سال قاضی جی مع اپنی ریش دراز کے جلوہ افروز ہیں سفید
ململ کا قدرے کثیف کرتا اور ڈھیلے ڈھالے پائچوں کا پائجامہ زیب بدن ہے۔ داہنی جانب
تہ کی ہوئی جانماز اور قریب ہی تپائی پر لوٹا رکھا ہے۔ بائیں طرف ایک پرانے خاصدان کے پاس
کچھ کتابوں کا ڈھیر ہے۔ تخت پر قاضی صاحب کے بالکل سامنے حقہ رکھا ہے۔ بائیں طرف کی دیوار
سے ملی ایک چارپائی ہے جس پر ایک جانب تہہ کئے ہوئے بچھونے کا پلندہ رکھا ہے۔ تخت کی داہنی
طرف دو تین شکستہ حال کرسیاں جن کے ہتھے ٹوٹ گئے ہیں پڑی ہوئی ہیں۔ قاضی صاحب
اکیلے بیٹھے ایک کتاب کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔ حقہ کی نے منھ سے لگی ہوئی ہے۔ تھوڑی تھوڑی
دیر کے بعد ایک آدھ کش لگا لیتے ہیں۔ ٹھیک جسوقت قاضی صاحب کتاب کے مطالعہ میں
منہمک ہوتے ہیں۔ پردے کے پیچھے سے دو آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں پھر ایک بار آواز
سنائی دیتی ہے:— "اے تم اکیلے ہی بیٹھے ہو نا؟" قاضی صاحب چونک کر گردن اٹھاتے ہیں
"اچھا تم ہو بی"—— جواب ملتا ہے "ہاں۔ کہو تو ذرا کی ذرا چلی آؤں۔ کچھ کہنا ہے"
قاضی صاحب سلیپر پہن کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہتے ہیں:— "ٹھہرو۔
ذرا دروازہ بند کر لوں"— دروازہ بند کر کے اپنی جگہ پر واپس آتے ہیں۔

قاضی صاحب — لے اب چلی آؤ۔

(تیس اور چالیس سال کی درمیانی عمر کی ایک عورت، چوڑی دار پائجامہ اور کرتا پہنے، گلابی رنگ کا دوپٹہ جس میں سستے قسم
کی لیس ٹکی ہے اوڑھے، آکر تخت کے کونے پر بیٹھ جاتی ہے، ہاتھ میں ایک تھالی لئے ہے جس میں پان کے دو تین بیڑے،

چھالیا اور سروتا رکھا ہے - تھالی تخت پر رکھدیتی ہے)

قاضی صاحب :- کہو کیا ہے - بی - (پان کا ایک بیڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے ہیں)

بی :- اے کچھ نہیں - نجمہ کے کپڑوں کے بارے میں کہنے آئی تھی -

قاضی صاحب :- نجمہ کے کپڑے ؟

بی :- ہاں - تمھیں تو معلوم ہی ہے - دس بارہ دن میں حشمت کا بیاہ ہونے والا ہے نا - آخر لڑکی کے لئے کچھ کپڑے درکار ہوں گے کہ نہیں - بچاری کے پاس ایک تار نہیں ہے - (ٹھنڈی سانس بھرتی ہے) ہا ! غریب کے لئے میرا دل کیسا کیسا کرتا ہے ! ——— (کچھ توقف کے بعد) خیر گہنے پاتے کا تو کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائیگا - مانگے کی دو چار چیزوں کا کہیں سے بندوبست ہو جائیگا - اب رہے کپڑے ———

قاضی : تو پھر کہیں سے مانگے کے کپڑوں کا بھی بندوبست کر لو -

بی : مانگے کے کپڑے ! اے ہٹو بھی - کیسی باتیں کرتے ہو ؟ بھلا سوچو تو برادری کیا کہے گی ؟

قاضی صاحب :- (مسکراتے ہوئے) اور برادری زیور کے بارے میں کچھ نہ کہے گی ؟

بی :- زیور - زیور کا معاملہ دوسرا ہے - آج کل سبھی مانگے تانگے کے زیور سے کام چلاتے ہیں ابھی اس دن کی بات ہے مولوی رحمٰن کی دلھن خانصاحب کی بڑی بہو کا جھومر اور گلوبند پہنے تھیں میں نے دیکھتے ہی تو پہچان لیا میں بولی " اے ہے سارہ کیسا پیارا گلوبند ہے !" بس سارہ کا تو جیسے خون خشک ہو گیا ہو - مگر ان کی ساس بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھیں - بڑھیا ڈھڈو - نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت - قبر میں پاؤں لٹکائے تو بیٹھی ہیں لیکن اب تک شوخ رنگ کے کپڑے پہننے کا ارمان نہ گیا جب دیکھو پوپلے منہ میں پان ٹھنسا ہوا ہے - منمناتی ہوئی آواز میں بولیں " تمھیں بھی پسند آیا - اے یہ نگوڑا گلوبند ہی ایسا - جس نے دیکھا پسند کیا - اچھا ہے نا ؟" میں نے کہا بیشک بڑا خوبصورت ہے ذرا دیکھنا خانصاحب کی دلھن کے گلوبند سے کتنا ملتا جلتا ہے - جیسے ایک ہی کاریگر کے ہاتھ کا بنا ہوا ہو - رتی برابر بھی تو فرق نہیں " بس میرا یہ کہنا تھا کہ بڑھیا پیک کی پچکاری مار گول گول دیدے بنا کے کہتی کیا ہے " کہاں خاں صاحب کی دلھن کا گلوبند کہاں یہ - ہٹو بھی بہن کیسی باتیں کرتی ہو - ہوش کے ناخن لو - ابھی پرسوں تو سارہ کا دولھا اس کے لئے لکھنؤ سے یہ گلوبند مول لایا ہے "——— اللہ اکبر ! ذرا یہ دیدہ دلیری کا سفید جھوٹ تو دیکھو - میں بولی " بہن خیر - خدا کا شکر ہے - چلو داماد کمانے کے قابل ہوا - مبارک ہو - پھر اس پر طرہ یہ کہ ....

قاضی جی :- (بات کاٹتے ہوئے) اچھا - اچھا - ہوگا - اب یہ بتاؤ کہ نجمہ کے کپڑوں کے بارے میں کیا طے کیا کتنی لاگت آئے گی ؟

بی :- اب میں کیا جانوں - منالال بزاز کو کھڑے کھڑے بلوا لیتے - وہ حساب کر کے بتا دے گا -
قاضی صاحب :- لیکن آخر تم نے بھی تو کچھ اندازہ لگایا ہوگا -
بی :- اچھا ٹھہرو - بتاتی ہوں (قدرے توقف کے بعد) اب تم یوں سمجھو کہ کم سے کم دو جوڑے تو چاہئے ہی ہوں گے -
قاضی صاحب :- دو جوڑے کیسے ؟ ایک سے کام نہیں چل سکتا -
بی :- تم بھی کیسے بھولے ہو - جانتے ہو کہ لڑکی رات کی رات مہمان رہے گی - آخر دوسرے دن جوڑا بدلنا چاہئے کہ نہیں ؟ ——— کیا تمھارا مطلب ہے بچاری دو دن تک وہی جوڑا پہنے رہے !
قاضی صاحب :- (سٹپٹا کر) لیکن اس میں ہرج ہی کیا ہے ؟
بی :- ہرج ! میں کہتی ہوں لوگ کیا کہیں گے - دیکھ لینا ہر طرف تھڑی تھڑی ہو گی - مہمان ایک دوسرے سے کانا پھوسی کریں گے " اے دیکھنا بہن قاضی صاحب کی دلھن کے پاس بس یہی ایک جوڑا ہے - کل شام کو بھی اسی کو پہنے ہوئے تھیں - آج پھر وہی ڈانٹے ہیں ——— اور پھر یہ لوگ اپنے کو رئیس اور نواب کہتے ہیں " ہونھ ، مجھ سے نہ ہوگا کہ میں چپکی بیٹھی یہ طعنے سنا کروں - یہ بڑا عزت آبرو کا معاملہ ہے میں اپنی بچی کو کپڑے لتے سے آراستہ کئے بغیر ہرگز تو برات میں جانے نہ دوں گی - واہ .. ..
قاضی صاحب :- لیکن بی - تم جانتی ہو آج کل خرچ کی کیسی تنگی ہے -
بی :- خرچ - خرچ کی تو ہمیشہ ہی تنگی رہتی ہے - کوئی نئی بات ہے ——— مگر ....
قاضی صاحب :- مگر کیا ؟ -
بی :- مگر یہ کہ کیا مہاجن سے کچھ روپیہ قرض نہیں لیا جا سکتا - اب ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ ایک چھوٹی سی رسم کے لئے وہ انکار کر دے -
قاضی صاحب :- لیکن تم نے یہ نہ بتایا کہ آخر کپڑوں میں خرچ کتنا ہو گا -
بی :- ٹھہرو - مجھے سوچنے دو (سوچتی ہے اور انگلیوں پر کچھ حساب لگاتی ہے) بس یہ سمجھو کہ کوئی دو سو روپئے درکار ہوں گے -
قاضی صاحب :- (تعجب کے لہجے میں) دو سو !!!
بی :- ہاں دو سو - بات یہ ہے کہ گھر میں پہننے کے کپڑوں سے تو بہر حال یہ جوڑے اچھے ہونا ہی چاہئے - اسی سے دام بھی زیادہ لگیں گے - لڑکی انھیں کوئی روز روز تھوڑی پہنے گی - وہ تو شادی بیاہ کے موقعوں کیلئے ہوں گے ———

قاضی جی:۔ (تعجب کے لہجے میں دوبارہ) دو سو بی!!

بی:۔ دو سو سے تو کم میں کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ آخر کچھ اپنی حیثیت کا، خاندان کے ناموس کا بھی تو خیال کرو۔ اور روپیہ کا کیا ہے؟ روپیہ تو ہاتھ کا میل ٹھہرا۔ ادہر آیا ادہر خرچ ہوا۔ بڑی چیز عزت آبرو کا پاس ہے۔ اُس سے کیا فائدہ کہ لوگ طعنے دیں کہ "ہاں بہن۔ بیاہ تو بڑے دھوم دھڑکے سے رچایا لیکن اب ذہن کی گت دیکھو۔ بدن پر چیتھڑا تک نہیں"

قاضی صاحب:۔ (مری ہوئی آواز میں) تمھیں معلوم ہے بی۔ وہ جو اس بیاہ کے لئے میں نے دس ہزار کی رقم قرض لی تھی اب قریب دگنی ہوگئی ہے۔ اور اصل تو درکنار اب تک سود تک ادا کرنے کی نوبت نہیں آئی ہے

بی:۔ روپیہ! روپیہ —— خدا کی مار اس موئے روپے پر۔ جب دیکھو روپے کی پکار مچی ہوئی ہے۔ روپیہ کوئی ہمارے ساتھ عاقبت میں تو بخشوانے جائیگا نہیں؟ —— تو پھر لوہ کیا کہتے ہو۔

قاضی صاحب:۔ (اکتاکر) اچھی بات ہے بی۔ سوچ کر بتاؤں گا۔

بی:۔ سوچ کر بتاؤگے؟ —— خوب کہی۔ میں نہیں جانتی۔ اسی اٹھوارے میں کپڑے سل کر تیار ہو جائیں سمجھے کہ نہیں —— آخر منالال بزاز کو کیوں نہیں بلوا بھیجتے'

قاضی صاحب:۔ منالال بزاز کو کس منھ سے بلوا بھیجوں۔ ابھی ابھی تو اُس نے حساب بھیجا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں کہ بغیر پچھلا روپیہ بیباق ہوئے وہ کپڑا دینے کو تیار ہو جائے۔ خیال تو کرو کتنے دنوں سے رقم چڑھی ہوئی ہے کہاں تک صبر کرے بےچارہ؟ ۔

بی:۔ (پان کا بیڑا کلے میں دبائے ہوئے) جو کچھ بھی ہو فصلانہ کی وصولیابی تک تو اُسے انتظار کرنا ہی پڑیگا

قاضی صاحب:۔ فصلانہ؟

بی:۔ ہاں فصلانہ کی وصولی میں اب دن ہی کتنے باقی ہیں۔ دس بارہ روز میں وصول ہو جائیگا۔ سوچتی ہوں فصلانہ ملتے ہی مجمہ کے گلوبند مہاجن کے یہاں چھڑوا لوں۔ کب سے گروی پڑا سڑ رہا ہے۔

قاضی صاحب:۔ مگر بی۔ فصلانہ تو جو کچھ وصول ہوگا سرکاری مالگذاری میں چلا جائیگا۔

بی:۔ سرکاری مالگذاری!

قاضی صاحب:۔ ہاں مالگذاری تھوڑی روکی جا سکتی ہے۔ مہاجن اور بزاز کو تو خیر ٹالا بھی جا سکتا ہے لیکن سرکاری مالگذاری کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ کسی طرح نہیں ٹل سکتی۔

بی:۔ یکایک رو پڑتی ہے) میں سمجھ گئی۔ تم مجھے الو بناتے ہو —— یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں......

(بی ہچکیاں لے لے کر رونے لگتی ہے۔ قاضی صاحب ہکا بکا ہو کر بیوقوفوں کی طرح چاروں طرف دیکھتے ہیں)

اوں اوں ـــــ دنیا جہان کی بہو بیٹیاں (ہچکی) کیسے اچھے اچھے (ہچکی) ـــــ کیسے اچھے اچھے (ہچکی) کپڑے پہنتی اوڑھتی ہیں (ہچکی) ـــــ گہنے پاتے سے (ہچکی) گوندنی کی طرح لدی رہتی ہیں ـــــ اور ـــــ اور میری بچی (ہچکی) موئے کنگالوں کی طرح چیتھڑے لگائے ..... (ہچکی) کیسی ذلت کی بات ہے!!

قاضی صاحب :- ہائیں - ہائیں بی ـــــ سنو تو ـــــ ارے بھئی (کھڑے ہوکر) اچھا میں ابھی بزاز کو بلوائے دیتا ہوں -

بی :- (آنسو خشک کرتے ہوئے) تو پھر جلدی کرو -

قاضی :- اور تم ! آخر تمھیں بھی تو کپڑے چاہئے ہیں -

بی :- اونھ - میرا کیا ہے ؟ تم میری فکر نہ کرو -

قاضی :- لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ کپڑے تو تمھیں بھی درکار ہوں گے -

بی :- نہیں جی - میرا کیا ہے - لشتم پشتم جو کچھ ملیگا پہن لوں گی ـــــ مگر میری بچی کو اچھی طرح حیثیت کے موافق پہن اوڑھ کر جانا چاہئے -

(اندر سے ایک آواز سنائی دیتی ہے)

آواز :- اماں - اماں

بی :- کون ؟ - جعفر - مدرسہ میں آج جلدی چھٹی ہوگئی کیا ؟

(اٹھارہ سال کا ایک الول جلول لڑکا 'بدوضع کپڑے پہنے' ہونقوں کی صورت بنائے داخل ہوتا ہے)

بی :- (جعفر کے اترے ہوئے چہرے اور آنسو بھری آنکھوں کو دیکھکر) خیریت تو ہے جعفر ؟ ـــــ بیٹا تم اداس کیوں ہو ؟ ـــــ

جعفر :- اماں - فیس

قاضی :- فیس ؟

جعفر :- جی ہاں - آج داخل ہوجانا چاہیئے یہیں تو - نام کٹ جائے گا - اور ماسٹر صاحب کہتے تھے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت بھی نہیں ملے گی -

بی :- (جعفر کے پاس آکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ـــــ میرا بچہ ! میرا بچہ ـــــ یہ ماسٹر نگوڑے یونہی روز روز میرے لال کے پیچھے پڑے رہتے ہیں ـــــ ابھی اسی روز بچارے کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، یا جانے کیا تو درجے میں بیٹھنے بھی نہ دیتے تھے -

جعفر :- ہاں اماں - خوب یاد دلایا - قواعد کی کتاب آج ہی مل جائے - نہیں تو انگریزی کے ماسٹر صاحب

مدرسہ کے پاس نہیں پھٹکنے دیں گے۔

قاضی :- خدا غارت کرے ان ماسٹروں کو! کتابیں ---- کاپیاں ---- فیس ---- روز ہی رونا - روز ہی چیخ پکار! آخر ہم نے بھی تو پڑھا ہے - ہم نے تو اتنی عمر میں کبھی نہ اتنی کتابیں خریدیں نہ ڈھیر کی ڈھیر کاپیاں مول لیں - تختیوں سے خاصہ کام چل جاتا تھا ---- یہ انگریزی تعلیم تو ہمارا دیوالہ نکالے دیتی ہے -

بی :- اور پھر کتابیں بھی کیسی ---- کیڑوں مکوڑوں جیسے مہین مہین حرفوں سے لپی ہوئی - میں تو جعفر سے کہا کرتی ہوں کہ بچے یہ کتابیں پڑھ پڑھ کے ایک دن تو اپنی آنکھیں پھوڑ لے گا -

جعفر :- (تھوڑے توقف کے بعد) - اباں فیس -

قاضی صاحب :- (جھنجھلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں) میں کہتا ہوں تمھارے ماسٹر صاحب دو چار دن صبر نہیں کر سکتے - کوئی فیس لیکر بھاگا نہیں جا رہا ہے -!

جعفر :- لیکن یہ رقم کوئی ان کی جیب میں تو جائیگی نہیں - آپ تو جانتے ہیں کہ ....

قاضی :- اچھا کل کتنی فیس ہوئی ؟

جعفر :- پچیس روپئے -

قاضی :- پچیس روپئے ؟ خدا کی پناہ! .... پچیس روپئے!!

جعفر :- ہاں ابا -

قاضی :- پچیس روپئے - جاؤ بیٹا - اپنے ماسٹر صاحب سے کہدینا کہ وہ مجھے اس طرح الّو بنا کر نہیں لوٹ سکتے

جعفر :- (متعجب ہوکر) مگر ابا یہ تو میرے امتحان کی اور پڑھائی کی فیس ہے -

قاضی :- (غضبناک ہوکر) بلا سے - ہوگی امتحان کی فیس ---- مجھے تمھارا انگریزی مدرسہ میں پڑھنا کبھی پھوٹی آنکھ نہ بھایا ---- لڑکوں کو اچھا خاصہ کرسٹان بنا دیتے ہیں - جہاں شد بد پڑھ لیا بن داڑھی منڈا، فرنگیوں جیسے کپڑے پہن، لگے ادھر اُدھر اینڈنے -

بی :- اے ہاں - ٹھیک تو کہتے ہو - دور کیوں جاؤ لے اب سجاد ہی کو دیکھ لو نا - پکا کرسٹان بنا پھرتا ہے - روزہ رکھنا اس کے نزدیک فاقہ کرنے کے برابر ہے - نماز پڑھنے کو توبہ توبہ نعوذ باللہ ٹکریں مارنے کے برابر سمجھتا ہے - داڑھی مونچھ غائب - موئے فرنگیوں کی طرح چوکی کے بدلے پاٹ پر بیٹھتا ہے ---- تا بابا! میں باز آئی اپنے بچے کو ایسے مدرسے میں بھیجنے سے!

جعفر :- لیکن اماں - آپ کو معلوم ہے مجھے پڑھنے کا کتنا شوق ہے -

بی :- میرے لال اس پڑھائی سے میں پوچھتی ہوں، آخر فائدہ کیا - کوئی لاٹ گورنر تو بن نہیں جاؤ گے ؟ ....
.... رہا پڑھنے کا شوق - سو تمھارے ابا کے پاس ایک چھوڑ نہ جانے کتنی کتابیں بھری پڑی ہیں جب جی چاہے پڑھو - کوئی منع کرتا ہے ؟

جعفر :- اماں آپ تو سمجھتی نہیں — یہ کتابیں میرے کس کام کی عربی فارسی کی کتابیں -

قاضی :- (غصہ میں) کیا کہا ؟ پھر تو کہنا یہ کتابیں کس کام کی ——
—— ہاں بھلا یہ کتابیں جن میں خدا رسول کی باتیں لکھی ہوں، جنھیں پڑھنے سے عاقبت درست ہو - تیرے کس کام کی !!

جعفر :- مگر ابا - اب آج کل تو ان کتابوں کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا —— اور میں کہتا ہوں آخر ایسی کتابوں کے پڑھنے سے فائدہ ہی کیا ؟ سوا اس کے کہ انھیں پڑھ پڑھ کے آدمی اچھا خاصا "ملا نٹا" بن جائے سو مجھے تو ملا بننے سے چڑھ ہے -

قاضی :- (کھڑے ہو کر جعفر کی طرف بڑھتے ہوئے) چپ رہ - نالائق ! میرے سامنے ایسی واہیات باتیں ! پاجی کہیں کا - دور ہو جا میرے سامنے سے —— دیکھتی ہو اس پاجی کی بدتمیزی - یہ انگریزی تعلیم کا اثر ہے - نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ - بس خدا رسول کا مضحکہ اڑانے کو دیدو ....
ٹھہر تو جا مردود ! ابھی مزہ چکھاتا ہوں اس گستاخی کا (قاضی صاحب دانت پیستے ہوئے جعفر کی طرف بڑھتے ہیں - بی ان کا ہاتھ تھام لیتی ہے)

بی :- جعفر کے ابا ! جانے دو - چلو ہوگا - بچہ تو ....

قاضی :- بچہ ہے ؟ انیسواں سال لگ گیا اور ابھی —— بچہ ہی ہے —— لچا لفنگا کہیں کا نکل یہاں سے مردود!

بی :- اے یہ تمھیں ہو کیا گیا ہے - لے بس اب غصہ تھوک دو - چلو کھانا کھائیں جعفر غریب بھوکا ہوگا -
کندن ! اری او کندن ! ....

کندن :- اچھا بی - آئی -

بی :- کندن - کھانا تیار ہوا ؟

کندن :- بی للو ابھی ابھی بنئے کے ہاں سے پلٹا ہے موئے نے سودا وودا کچھ بھی نہیں دیا کہلوا بھیجا ہے کہ جب تک پچھلا حساب چکایا نہ جائیگا میں ایک دانہ نہیں دینے کا -

بی اور قاضی صاحب :- (ہم آواز ہو کر) یہ کیا ؟ —— اس کے کیا معنے ہیں ؟!!

جعفر :- خدایا روز یہی رونا رہتا ہے —— مجھ سے نہیں دیکھا جا سکتا - میں نہیں برداشت کر سکتا آج

پیسہ کی تنگی ہے۔ کل روٹی کی محتاجی ہے —— میں نکل جاؤنگا۔ مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالوں گا
قاضی :- کیا بکتا ہے بے ہودہ ! تجھ سے بیچ میں ٹانگ اڑانے کو کس نے کہا تھا۔
جعفر :- ابا۔ آپ ہی بتائیے آخر کب تک اس طرح کام چلے گا۔ اس مصیبت کا کوئی علاج تو ہمیں سوچنا ہی پڑے گا۔
قاضی :- بس بس خاموش رہ۔ نہیں تو ایسا ٹھیک کروں کا لہ یاد کرے گا۔
جعفر :- ابا۔ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ مفلسی اور ناداری کی یہ زندگی نہیں دیکھی جاتی —— یہ پیسہ پیسہ کی محتاجی ! آہ کس قدر ذلت کی بات ہے۔ ہم سے ایک معمولی مزدور ابھی اچھا ہوگا۔ دن بھر محنت مشقت کرکے ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کیا۔ شام کو مٹھی بھر پیسے ملے۔ بس مگن ہوگیا۔ آہ کیسا اطمینان کتنی آزادی !—
اور ہم ؟ ہم جو رئیس اور نواب کہلاتے ہیں۔ شریف بنے اینٹھتے پھرتے ہیں۔ ذرا خیال تو کیجئے ہم لوگوں نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے ... ہم فاقے کرتے ہیں بھوکوں مرتے ہیں لیکن کیا مجال جو ہاتھ پاؤں ہلائیں کوئی کام کاج کریں —— ہم کتوں سے بھی بدتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارا وجود ایک آسمانی بلا ہے ایک ہولناک عذاب !! ....
قاضی صاحب :- اب چپ رہتا ہے کہ نہیں۔
بی :- (قاضی صاحب اور جعفر کے درمیان بیچ بچاؤ کرتے ہوئے) جعفر کے ابا ...... اجی جعفر کے ابا—
جعفر :- نہیں ہرگز نہیں چپ ہونگا۔ بولے جاؤنگا۔ خوب چیخونگا۔ دل کی بھڑاس نکالے بغیر زبان نہیں روکوں گا۔ اب مجھ میں ضبط کی قوت باقی نہیں۔ چپکا بیٹھا اس ذلت آمیز مفلسی کا تماشا نہیں دیکھ سکتا ...... اماں کے یہ میلے کچیلے چیتھڑے، یہ نحیف کمر ٹوٹی دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے کلیجے پر گھونسہ مار دیا ہو........ جب دیکھو خرچ کی تنگی ہے۔ جب سنو بنیئے کے یہاں سے ادھار آرہا ہے مہاجن کا سود چڑھتا جاتا ہے —— اور یہ ظالم بنئے اور مہاجن۔ انسانی جونکیں ! یہ ہم لوگوں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس کر چھوڑیں گے ... آخر کب تک صبر کروں ؟ کب تک یہ اذیتیں سہوں ؟—
نہیں نہیں ایک منٹ کے لئے نہیں ٹھہر سکتا۔ جہاں سینگ سمائیں گے نکل جاؤنگا اور مزدوری کرکے پیٹ پالونگا ——۔
بی :- (جلدی سے جعفر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے) ہائیں جعفر ! کیا بکتے ہو ؟ مزدوری کروگے ؟ باپ دادا کی عزت پر بٹہ لگاؤگے ؟ خاندان کا نام ڈبوؤگے ؟
جعفر :- باپ دادا کی عزت ! خاندان کا نام !.. ...... سب وہم ہے۔ سب دھوکہ ہے۔ کیسا ننگ ناموس ؟

اور کہاں کی عزت !! جب ہمارے پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا ہی نہ ہوگا تو کیا خاندان کے نام کو شہد لگا کر چاٹیں گے - ؟ ——————

یہ جھوٹی شیخی ایک عجیب بلا ہے جو ہمیں نگلے جا رہی ہے - یہ مصنوعی ننگ و نام ایک مہلک پھوڑا ہے جو اندر ہی اندر ہماری ہڈیاں تک گھلائے دے رہا ہے !!

قاضی صاحب :- لونڈے کا دماغ خراب ہوگیا ہے -

جعفر :- دماغ خراب نہیں ہوا ، درست ہوگیا ہے - پہلے میں پاگل تھا - اب جنون کا سودا سر سے اترا ہے اب ہوش آیا ہے ، آنکھیں کھلی ہیں جیسے کوئی ہولناک خواب دیکھتے دیکھتے یکایک بیدار ہو جائے - —— یہ ہم پر خدا کا قہر نازل ہو رہا ہے - باپ دادا کی نام نہاد شرافت ہمیں زہریلی ناگن بن کر ڈس رہی ہے - آہ افسوس ! افسوس ! . . . . ننگ و ناموس ! عزت آبرو - سب خیال ، سب وہم !!! —— ذرا آنکھیں اٹھا کر اماں جان کی طرف دیکھئے - ان کے چیتھڑوں پر نظر ڈالئے — ننگ و ناموس اسی چیز کا نام ہے ؟ عزت اور شرافت اسی کو کہتے ہیں ؟ . . . .

اچھا رخصت - اس ذلیل زندگی کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ !!

(جعفر دروازہ کی طرف بڑھتا ہے - بی دونوں ہاتھ پھیلائے وحشتناک صورت بنائے اس کے پیچھے پیچھے لپکتی ہیں)

بی :- میرا بچہ ! میرا لال . . . .

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

اسد اللہ کاظمی - ایم - اے

خواب وخیال ۶ر زہر عشق عہ شوپنہار عہ فلسفہ مذہب ۱ہ تذکرہ خندۂ گل ۶ر انتخاب کلامی اردو ۸ر عرب اور اس کا مستقبل عہ	**ایک ازراں سودا** ان سب کتابوں کی مجموعی قیمت علاوہ محصول للعہ ہے لیکن یہ سب کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے میں آپ کو علاوہ محصول للعہ میں مل سکتی ہیں ہر آرڈر کے ساتھ چوتھائی قیمت آنا ضروری ہے —	شاعر کا انجام (۱۰ر) بحر تبسم عہ موج تبسم (عہ) فراست الید عہ مذاکرات نیاز (۱۲ر) فلاسفہ قدیم عہ جذبات بھاشا (۱۲ر) لالہ رخ عہ فراست التحریر مکمل . . . . عہ نقاب اٹھ جانے کے بعد ۵ر منیجر نگار لکھنو

دینِ مسیحی اور صنفِ نازک کی تحقیر

مسیحی دنیا کا دعویٰ ہے کہ نصرانیت نے عورت کا مرتبہ بہت بلند کر دیا اور نصرانیت عورتوں کی بہترین دوست و مددگار رہی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر فیر بیرن لکھتے ہیں کہ نصرانیت نے عورت کے گرد "ایک حلقۂ تقدس" قائم کر دیا اور ہم کو عورت کا احترام کرنا سکھایا"۔ اسی طرح بعض عیسائی مصنفین لکھتے ہیں کہ "مشرک اور بت پرست لوگ عورت کو صرف خواہشات نفسانی کی تسکین کا آلہ سمجھتے تھے۔ مگر مسیحیت نے آکر عورت کی ذلیل حالت بدل دی"

لیکن کیا مسیحی دنیا کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے آپ نصرانی تمدن کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا۔ کہ نصرانیت نے عورت کی تذلیل میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور مسیحی دنیا میں عورت قانونی لحاظ سے ہمیشہ لاشئے محض سمجھی گئی۔ یعنی جانوروں تک کو کچھ نہ کچھ حقوق حاصل تھے اور نہیں تھے تو عورت کو — چنانچہ امریکہ کی ایک خاتون الزبتھ کیڈی اسٹانٹن نے شہر بوسٹن کے طبقۂ نسواں کی حالت جو ۱۸۵۵ء میں تھی اس طرح ظاہر کی ہے:—

"عورت کوئی ملکیت نہیں رکھ سکتی تھی، نہ رکھتا مانع دراثتاً اگر وہ کتخدا تھی تو اس کی تمام جائداد و ملکیت کسی ٹرسٹی کے سپرد ہو جاتی تھی۔ اگر عورت کا ارادہ شادی کرنے کا ہوتا تھا اور وہ اپنی ملکیت ٹرسٹی کے ہاتھوں سے نکالنا چاہتی تھی تو از روئے قانون مجبور تھی کہ وہ تمام حقوق ملکیت اپنے شوہر کے حق میں منتقل کر دے۔ کوئی عورت خواہ وہ ناکتخدا ہو یا شادی شدہ، کوئی "شخص" نہیں تھی۔ خاندان بشری میں کوئی رکنیت نہیں رکھتی تھی۔ اور تمدن کے حساب میں صفر کی حیثیت رکھتی تھی ....."

شادی شدہ عورت کا مرتبہ گھر کی خادمہ سے شاید ہی کسی قدر بہتر ہوتا تھا۔ انگریزی قانون عامہ کی رو سے (جو بوسٹن میں رائج تھا) عورت کا شوہر اس کا آقا اور مالک ہوتا تھا، وہی اپنی بیوی اور اس کے چھوٹے بچوں کا نگران ہوتا تھا۔ وہ اس کو "نر انگشت" کے برابر موٹی چھڑی سے زد و کوب کر سکتا تھا مگر عورت اس کی کوئی شکایت نہیں کر سکتی تھی .... قانون کی نظر میں میاں بیوی شخص واحد سمجھے جاتے تھے۔ مگر وہ شخص واحد شوہر ہوتا تھا۔ وہ بذریعہ وصیت اپنی بیوی کو اپنی ملکیت سے قطعی محروم کر سکتا تھا بلکہ اس ملکیت سے بھی محروم کر سکتا تھا جو قبل از شادی بیوی کی تھی۔ بیوی کوئی معاہدہ یا وصیت نہیں کر سکتی تھی اُسے کوئی ذاتی حقوق حاصل

نہ تھے بلکہ وہ اپنی جان کو بھی اپنی نہ کہہ سکتی تھی۔ اس کا شوہر اس کے بچوں کو چھین لے سکتا تھا۔ وہ اس کے کپڑے تک اتارلے سکتا تھا۔ اور وہ اس کے نان و نفقہ سے بھی غفلت کر سکتا تھا۔ اور اگر عورت محنت کرکے کچھ کمائی تھی تو شوہر اس کی تنخواہ خود پا لینے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔

کیا طبقۂ نسواں کی تحقیر و تذلیل کی اس سے زیادہ کچھ اور ہو سکتی ہے؟ پھر غالباً دنیا یہ معلوم کرکے تعجب کرے گی کہ یہ تمام تحقیر و تذلیل نصرانیت ہی کی بدولت ہوئی۔ ورنہ نصرانیت سے پیشتر عورت آزاد تھی اور اس کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ اس حقیقت کا پورا علم حاصل کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ قبل ظہور نصرانیت جو حالت عورت کی تھی اس کا مطالعہ کیا جائے۔

عورت مسیح سے پہلے

عیسائی پادری بابل و نینوا کی عورتوں کی اخلاقی حالت ہمیشہ گری ہوئی ظاہر کرتے ہیں، مگر قانون حمورابی کے دیکھنے سے جو مسیح سے ۲۱۰۰ سال قبل رائج تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان بالکل غلط ہے، بلکہ برخلاف اس کے عورت کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ دیکھا جاتا تھا ناظرین نگار قانون مذکور کی دفعات ذیل کو ملاحظہ فرمائیں:-

دفعہ ۱۲۷ - اگر کوئی مرد کسی کاہنہ یا دوسرے مرد کی بیوی کی طرف ناجائز طور پر انگلی اٹھائیگا تو اس شخص کو قاضی کے سامنے پیش کیا جائیگا اور اس کی پیشانی پر مہر لگا دی جائیگی۔

دفعہ ۱۳۴ - اگر کوئی شخص قید کر لیا جائے اور اس کی بیوی مجبور ہو کر دوسرے گھر میں بیٹھ جائے تو اس عورت کا یہ فعل ہرگز قابل الزام نہیں ہے۔

دفعہ ۱۳۷ - اگر کوئی مرد اپنی داشتہ عورت یا اپنی بیوی کو طلاق دیدے اس حال میں کہ اس کے اولاد ہے تو اس شخص پر لازم ہوگا کہ وہ اس عورت کو اس کا جہیز واپس کرے اور اس کو کشت زاروں کی پیداوار اور باغوں کے پھلوں اور جائداد کی آمدنی کا اس قدر حصہ دے کہ وہ عورت اپنے بچوں کی پرورش کر سکے۔

دفعہ ۱۳۸ - اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو جس کے اولاد پیدا نہیں ہوئی طلاق دے تو وہ اس کو اس عورت کا تمام مہر ادا کریگا اور اس کا تمام جہیز واپس کریگا جو وہ اپنے باپ کے یہاں سے لائی تھی۔

دفعہ ۱۳۹ - اگر عورت کا کوئی مہر مقرر نہیں ہوا تھا تو وہ اس عورت کو طلاق کے بعد ایک مینا (بابلی وزن یا پیمانہ) چاندی دیگا۔

دفعہ ۱۴۲ - اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے نفرت کرے تو اس نفرت و ناپسندیدگی

کے اسباب کی تحقیقات کی جائیگی۔ اگر وہ عورت محتاط و معصوم ہے اور شوہر اس کی طرف سے غفلت کرتا ہے تو اس عورت پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنا جہیز لے لیگی اور میکے چلی جائے گی۔

دفعہ ۱۷۱ - بیوی کو اس کا جہیز اور وہ تمام ملکیت ملے گی جو اس کے شوہر نے بذریعہ تحریر ہبہ کر دی ہے۔ اور وہ اپنے شوہر کے گھر جا کر رہیگی اور تمام ملکیت و مال سے متمتع ہوگی لیکن وہ اس مال کی ملکیت کو فروخت نہ کر سکے گی۔ اور اس کی وفات کے بعد اولاد کی ہو جائیگی

دیکھا آپ نے کہ یہ قانون ہر چند سنہ ۲۲۵۰ ق م کا ہے مگر اس قانون سے جو انگلستان و امریکہ میں چار ہزار برس بعد جاری ہوا کس قدر ملتا جلتا ہے۔

بابل میں اگر کسی مرد و عورت پر زنا کا جرم ثابت ہو جاتا تھا تو دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر فرات میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا مرتکب ہوتا تھا تو اس کو زندہ جلایا جاتا تھا۔ اسی طرح اگر کوئی عورت ناجائز بچہ جنتی تھی تو اس کو مع بچہ کے زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی خسر اپنے لڑکے کی بیوی سے اختلاط کرتا تھا تو اسے پانی میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی کاہنہ کسی شرابخانہ میں میخواری کے لئے جاتی تھی تو اسے زندہ جلا دیا جاتا تھا اور کوئی عورت مندر میں فحش کی مرتکب نہیں ہو سکتی تھی۔

بابل کے اولین خاندان شاہی کے عہد میں طبقہ نسواں کو جو آزادی حاصل تھی اس کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کا ایک خاص طبقہ ایسا تھا جو خدمت دین کا پیشہ اختیار کر لیتی تھیں۔ مگر اُن کو اختیار حاصل تھا کہ جب ان کا دل چاہے وہ اپنی شادی کر لیں البتہ مندر میں داخل ہوتے وقت جو حلف اٹھا لیا جاتا تھا اس کی رو سے انھیں ہمیشہ باکرہ رہنا پڑتا تھا اور وہ اولاد پیدا نہیں کر سکتی تھیں مگر وہ اپنی ذاتی ملکیت رکھ سکتی تھیں اور اُن کو جو عزت و مرتبت سوسائٹی میں حاصل تھی اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس طبقہ میں شریف زادیاں حتی کہ شہزادیاں تک داخل ہو جاتی تھیں۔ الغرض قدیم بابل میں عورت بالکل آزاد تھی۔ اس کے حقوق قانون کے ذریعہ سے محفوظ تھے۔ مرد کی طرح وہ بھی ملکیت کی قانوناً مالک ہوتی تھی اور وہ خود مختار تھی۔ اور اگر اس کا شوہر نالائق ہو تو وہ اُسے طلاق دے سکتی تھی۔

طبقۂ نسواں کا یہی مرتبہ قدیم مصر میں بھی تھا۔ وہاں بھی عورت آزاد و مختار تھی۔ مشہور ماہر مصریات ڈاکٹر فلنڈرس پیٹری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ گھر میں شوہر کی حالت بالکل ایسی تھی جیسے کسی مہمان کی" ایک دوسرا ماہر مصریات ماسپیرو رقمطراز ہے کہ "شوہر ایک منظور نظر مہمان کی حیثیت رکھتا تھا۔" قدیم مصری مقابر کے اندر بہت سے کتبوں میں لکھا ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی محبوبہ اور گھر کی مالکہ ہوتی تھی۔ اور اس زمانہ میں کوئی

"چھڑی نہ انگشت کے برابر موٹی" بیوی کو زدوکوب کرنے کے لئے مکان کے کونہ میں رکھی ہوئی نہ ہوتی تھی۔ مصر قدیم میں ایک کتاب چار ہزار برس سے بھی زیادہ قبل لکھی گئی تھی جس کا نام تھا "فتاح حاطب کے نکات حکیمہ" ایک نکتہ عورت کے متعلق کتاب مذکور میں یہ ہے کہ "اگر زنجیر اس کو پسند ہے تو دگنی محبت کریگی" یہ زنجیر سلسلۂ مناکحت ہے۔ ایک جگہ شوہر کو نصیحت کی گئی ہے کہ "جب تمھیں فرصت ملے تو اس (عورت) کا دل خوش کرو" اور اگر عورت میں کوئی عیب ہو تو "کچھ عرصہ تک اس پر مہربانی وشفقت رکھو۔ گھر سے نکال دو بلکہ اسے نان نفقہ دو" الغرض قدیم مصر کی عورت بھی مرد سے درجۂ مساوات رکھتی تھی۔ وہ نہ صرف اپنی طرف سے عدالت میں مقدمہ دائر کر سکتی تھی بلکہ اپنی طرف سے وکالت بھی کر سکتی تھی۔ وہ طبابت کا پیشہ اختیار کر سکتی تھی۔ وہ بحیثیت کاہنہ عزت کی زندگی بسر کر سکتی تھی۔

قصر شاہی میں بحیثیت ملکہ اس کا درجہ فرعون کے برابر ہوتا تھا۔ اور مصر کی بہت سی ملکہ ایسی گذری ہیں جنھوں نے تاریخ میں بہت بڑا نام چھوڑا ہے۔ ہامان حاطب چہارم کی ماں ملکہ طوائتی صمیم العزم ملکہ تھی کہ اس نے ملک مصر میں مذہبی انقلاب پیدا کر کے اصنام پرستی کے بجائے توحید پرستی جاری کر دی تھی۔

اسی طرح اہل کریٹ، خطیوں اور چینیوں کے قدیم تمدن کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ عورت کا مرتبہ اس وقت کتنا بلند تھا خصوصاً کریٹ میں جو عزت عورت کی کی جاتی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہاں کسی دیوتا کی پوجا نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کی پرستش گاہیں دیویوں ہی کے بتوں سے معمور تھیں۔ پھر ظاہر ہے کہ جو قوم عورت کی پرستار ہوگی اس کے نزدیک عورت کا درجہ کیا ہوگا۔

یہاں یہ عرض کر دینا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ جب مسیحی علماء کے سامنے مندرجۂ بالا واقعات پیش کئے جاتے ہیں تو وہ عموماً یہ کہتے ہیں کہ مصری، بابلی و آشوری تمدن کی یہ ترقی صرف ان یہودیوں کی وجہ سے ہوئی جو بخت نصر کے زمانہ میں قید ہو کر وہاں پہونچ گئے تھے اور انھوں نے عہدنامۂ عتیق کی تعلیمات کو ان میں رائج کیا۔ لیکن اس کا جواب بہت آسان ہے کیونکہ توراۃ کی کتابیں زیادہ سے زیادہ ۵۰۶ یا ۱۴۹۰ سال قبل مسیح لکھی گئی تھیں اور ظاہر ہے کہ قانون حمورابی اس سے بہت پہلے کی چیز ہے۔ علاوہ اس کے خود توریت میں جو احکام عورت کے متعلق موجود ہیں انھیں سے کب عورت کی عزت ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ کتاب موسیٰ "احبار" کے باب ۱۲ میں حسب ذیل احکام ملاحظہ ہوں:۔

> پھر خدا نے موسیٰ سے ہمکلام ہو کر فرمایا کہ بنی اسرائیل سے کہہ دو کہ جو عورت حاملہ ہوا اور لڑکا جنے تو وہ سات دن (ایام حیض کی طرح) ناپاک رہیگی۔ اور آٹھویں دن لڑکے کا ختنہ کیا جائے اور بعد اس کے وہ اپنے تئیں پاک کرنے میں تینتیس دن ٹھہری رہے۔ اور کسی مقدس چیز کو نہ چھوئے

اور جب تک اس کے پاک ہونے کے دن نہ آئیں بیت المقدس میں داخل نہ ہو۔ اور اگر وہ لڑکی جنے تو دو ہفتہ ناپاک رہیگی اور چھیاسٹھ روز خون سے اپنے تئیں پاک کرنے میں ٹھہری رہے آپ نے دیکھا کہ لڑکے کو لڑکی پر کس قدر جابرانہ ترجیح دیگئی۔ لڑکا جنے تو صرف سات دن ناپاک اور ۳۳ دن لہو سے اپنے تئیں پاک کرے۔ لیکن لڑکی جنے تو ایام ناپاکی اور خون سے صاف کرنے کے دنوں کی تعداد مضاعف ہوجائیگی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی الہامی حکم نہیں ہے بلکہ بنی اسرائیل کے قبائلی دستور و رواج میں بنی اسرائیل میں لڑکی کو قہر و ذلیل مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ والدین لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر جانوروں کی طرح جس مرد کو چاہتے تھے سپرد کردیتے تھے۔ لڑکی کو اس میں بولنے یا انتخاب شوہر کا کوئی حق حاصل نہ تھا، عورت کا خاوند اس کا مالک ہوتا تھا، نہ عورت کوئی حق ملکیت رکھتی تھی اور نہ اس کی شخصیت کسی شمار قطار میں تھی۔ اس کا شوہر جب چاہے اس کو طلاق دے سکتا تھا۔ مگر وہ اس کو نہیں چھوڑ سکتی تھی اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ بابلی عورتوں کا مرتبہ بلند تھا یا بنی اسرائیل کی عورتوں کا۔

عورت قدیم روما و یونان میں

قدیم یونان میں اگرچہ عورت مرد کی محکوم تھی مگر وہ ذلیل و حقیر کسی حالت میں نہیں سمجھی جاتی تھی ابتدا میں، جیسا کہ تمام وحشی اور غیر متمدن اقوام میں ہوتا ہے، یہ رواج تھا کہ جو شخص کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا وہ اس لڑکی کے باپ کو نذرانہ دیا کرتا تھا مگر یہ رواج بہت جلد موقوف ہوگیا بلکہ اس کے بجائے یہ دستور ہوا کہ باپ اپنی لڑکی کو کچھ جہیز دینے لگا۔

قدیم ادبیات یونان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اول اول وہ لوگ عورت کو کوئی اعزازی درجہ نہ دیتے تھے اور اس کو پبلک زندگی میں شریک نہ کیا جاتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یونان میں تحریک آزادی نسواں پیدا ہوئی اور بڑی حد تک انھیں آزادی مل گئی۔

افلاطون لوگوں کو ہمیشہ سمجھایا کرتا تھا کہ عورتیں بھی وہی قابلیتیں رکھتی ہیں جو مردوں کو حاصل ہیں اس لئے انکو بھی وہی تعلیم دی جانا چاہئے جو مردوں کو دی جاتی ہے۔ ابیقیورس جو خاتم الحکماء یونان ہے مرد و عورت کو ہمیشہ برابر سمجھتا تھا۔ یسوع مسیح کے زمانہ کے قریب یونانیوں کا بہت بڑا مصنف پلوتارخ گذرا ہے، وہ بھی یہی کہتا تھا کہ دل و دماغ کے لحاظ سے عورت و مرد مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

جمہوریہ رومہ کی ابتدائی صدیوں میں عورتیں یقیناً مرد سے فروتر سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن ظہور مسیح سے قبل ہی اس حالت میں بہت کچھ تغیر ہوگیا تھا اور رومی عورتوں نے سیاسیات میں قدم رکھنا شروع کردیا تھا اور رومۃ الکبریٰ کے بازاروں میں حقوق طلب عورتوں کے مظاہرے اسی جوش و خروش سے ہوتے تھے جیسے مغربی دنیا

میں اس وقت نظر آتے ہیں۔ عورتیں قدامت پرست اراکین حکومت کا راستہ روک لیتی تھیں اور اپنے حقوق کا مطالبہ کیا کرتی تھیں۔ ان کی مالی حالت اتنی ترقی کر گئی تھی کہ ان کی ملکیت وجائداد محدود کرنے کے لئے ایک قانون بنانا پڑا کیونکہ مردوں کو یہ عام شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ ان کی بیویاں جو قرض ان کو دیتی ہیں، ان پر بہت سخت سود لیتی ہیں۔

تباہ شدہ شہر پومپیائی کے قدیم کھنڈر کھود کر بعض آثار قدیمہ برآمد کئے گئے ہیں جن میں بعض "الیکشن ایڈریس" بھی نکلے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب میں روم کی عورتیں بھی نہایت سرگرمی سے حصہ لیا کرتی تھیں۔ اور حکومت بلدیہ میں عورتیں بھی بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہوتی تھیں۔ خاص شہر رومہ میں ایک "عورتوں کا کلب" (Conventus matronarum) بھی تھا جس میں عورتیں سلطنت کے مسائل پر بحث وتمحیص کیا کرتی تھیں۔

رومیوں کے اندر نہ صرف فلاسفۂ یونان کی آزاد خیالی بلکہ فرقہ رواقیین (Stoics) کے اخلاقی اصول بھی سرایت کر گئے تھے۔ جس سے رومیوں میں پرانی انضباطی سختی کسی قدر ڈھیلی پڑ گئی تھی اور سلسلۂ تعلیمات نہایت وسیع اور آزاد بنیادوں پر قائم تھا۔ الغرض شیوع نصرانیت سے قبل ہی رومی عورتیں ان تمام قیود سے آزاد ہو گئی تھیں۔

طبقۂ نسواں پر نصرانیت کا اثر

ظہور مسیحیت سے قبل امم قدیمہ میں عورت کا جو مرتبہ تھا اس کا حال تو آپ کو معلوم ہو گیا۔ اب دیکھئے کہ نصرانیت کا طرز عمل کیا رہا۔ اس کے متعلق انگلستان کا مشہور مقنن سر ہنری مین لکھتا ہے کہ "نصرانیت نے ابتدا ہی سے طبقۂ نسواں کی آزادی کا حلقہ تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور عورت کی غیر اہمیت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ چوتھی صدی عیسوی تک کوئی اصول نکاح متعین نہ ہوا بلکہ گیارہویں صدی عیسوی تک ادارۂ مناکحت کلیسا کے قبضہ سے باہر رہا۔

سینٹ آگسٹین نے خود ایک مرد کو اجازت دی تھی کہ اگر اس کی بیوی بانجھ ثابت ہو تو وہ اولاد پیدا کرنے کے لئے کوئی آشنا گھر میں ڈال لے۔ ایک اور عیسائی پادری نہایت فخر وناز سے فرمایا کرتے تھے کہ میں نے صرف گھر کی لونڈی سے اختلاط کرنے پر قناعت کی اور اس طرح اپنی عصمت وعفت کا خزانہ محفوظ رکھا۔ (ملاحظہ ہو کتاب "Eucharisticos" سطر ۱۶۶)۔

الغرض عیسائیوں کا یہ دعوی قطعی غلط ہے کہ نصرانیت نے عورتوں کا درجہ بلند کر دیا۔ شاہ روما تھیوڈوسیس کے زمانہ میں جو قوانین پادریوں کے اشارے سے مرتب کئے گئے تھے ان کے دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت طبقۂ نسواں پر کس قدر ظلم و ستم کیا جاتا تھا۔ اُس نے چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد، خالہ زاد بہن بھائیوں کی شادی ممنوع قرار دی۔ اُس نے شادی بیوگان پر سخت شرائط و قیود عاید کئے۔ اس نے حکم دیا کہ کوئی عورت طلاق لینے کے بعد پانچ برس تک دوسرا نکاح نہ کرے۔ اگر اس نے کسی سخت شکایت کی بنا پر شوہر سے علٰحدگی اختیار کر لی ہے تو وہ پانچ برس ٹھہرنے کے بعد نکاح کر سکے گی مگر اس کا حق وراثت زائل ہو جائیگا۔ اور اگر اُس نے کسی معمولی شکایت کی بنا پر طلاق لی ہے تو اس کا جہیز بھی ضبط ہو جائیگا۔ اور وہ دوسرا نکاح ہرگز نہیں کر سکے گی۔ اور وہ جلاوطن بھی کی جا سکتی ہے۔ مگر ان حالات کے ماتحت شوہر کو دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت تھی۔

یہ ہے وہ مسیحی انصاف جو عورتوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ اور یہ ہے وہ "بلندی مرتبہ" جو طبقۂ نسواں نے اُس سب سے بڑے سخت اور متعصب عیسائی شہنشاہ کے زمانہ میں حاصل کی تھی۔ انیسویں صدی سے قبل نہ یسوع نے اور نہ یسوع کے کسی چیلے نے عورتوں کی مدد کی۔ بلکہ انیسویں صدی کا بھی تین چوتھائی زمانہ یوں ہی گذر گیا تھا۔

اناجیل کو اٹھا کر دیکھئے جہاں کہیں بھی یسوع نے اپنی ماں کی نسبت کوئی گفتگو کی ہے وہاں ہمیشہ سختی اور درشتی سے کام لیا ہے۔ ایک آیت بھی انجیل کی ایسی نہیں جس میں اُنھوں نے اپنی والدہ کا محبت کے ساتھ ذکر کیا ہو۔ یسوع کی نظروں میں عورت شیطان کا دام فریب تھی۔ اس لئے انھوں نے عورت کی طرف متوجہ ہونے کی کبھی زحمت گوارا نہ کی۔

یسوع کی طرح پولوس کی ذہنیت نے بھی عورت کے مرتبہ کو خاک میں ملایا۔ اس کے نزدیک آدم کو بہکانے میں شیطان کا خاص آلۂ کار عورت ہی تھی۔ اسی روایت میں پولوس نے کتاب پیدائش کی اس روایت کو شامل کر دیا کہ عورت مرد کی پسلی سے اور مرد کے لئے بنائی گئی تھی۔ آدم کی حالت عدن کے باغ میں دیوتاؤں جیسی تھی مگر عورت نے اسے بہکا کر گناہ کرایا اور انسان کی پُر از آلام و مصائب دنیوی زندگی کا باعث ہوئی۔

پولوس کا حکم ہے کہ جو مرد سر ڈھکے دعا کرتا ہے وہ اپنے سر کو بے حرمت کرتا ہے۔ اور جو عورت بے سر ڈھکے ہوئے دعا کرتی ہے وہ اپنے سر کو بے حرمت کرتی ہے ..... مرد کو اپنا سر ڈھانپنا نہ چاہئے کیونکہ وہ خدا کی صورت اور اس کا جلال ہے۔ مگر عورت مرد کا جلال ہے۔ اس لئے کہ مرد عورت سے نہیں بلکہ عورت مرد سے ہے اور مرد عورت کے لئے نہیں بلکہ عورت مرد کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ پس عورت کو چاہئے کہ وہ اپنے سر پر محکوم ہونے کی علامت رکھے۔" (پولوس کا پہلا خط کرنتھیوں کے نام آیات ۴-۱۰) - دیکھا آپ نے پولوس نے عورت کا مرتبہ کس قدر بلند کر دیا ہے۔

الغرض عورت کی محکومیت اور عورت کا آدم سے پہلا گناہ کرانا۔ یہی وہ دو خیالات ہیں جن کی وجہ سے مسیحی دنیا میں عورت کو ذلیل و حقیر سمجھا گیا۔

دوسری صدی میں جسٹن نے حکم لگایا کہ "جو مرد مطلقہ عورت سے نکاح کرتا ہے وہ زناکاری کا مجرم ہے"۔ اسی طرح اتھینا غورث نے دوسری شادی کی نسبت کہا کہ وہ مہذب قسم کی زناکاری ہے۔ اور سینٹ ہیل حکم دیتے ہیں کہ :- جب شوہر فحش کرکے آئے تو بیوی اس کو گھر میں واپس لے لیگی۔ مگر ایک گنہگار بیوی کو شوہر گھر سے نکال دیگا"۔

طرطولین صنف نازک کی نسبت لکھتا ہے کہ :- "تو شیطان کا دروازہ ہے۔ تو نے ہی عدن میں درخت کا پھل آدم کو کھلایا۔ تو ہی وہ ہستی ہے جس نے سب سے پہلے خدائی قانون کو توڑا"۔

کلیمنٹ لکھتا ہے کہ :- "اگر عورت اپنے دل میں غور کرکے اپنی سرشت کو دیکھے تو وہ شرمندہ ہو جائے"۔ اور گریگوری نے تو عورت کی عصمت و عفت پر یہاں تک مہر لگا دی تھی کہ "تم کو ہزار میں ایک باعصمت و عفت مرد مل جائیگا مگر عورت ہزار میں ایک بھی نہ ملیگی"۔

سینٹ جیروم کا قول ہے کہ :- عورت تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اور نکاح ان لوگوں کے لئے اچھا ہے جو تنہا سونے سے ڈرتے ہیں"۔

الغرض نصرانیت کے نزدیک عورت کا یہ مرتبہ ہے کہ وہ "شیطان کا دروازہ ہے"، انسانی لعنت کا سبب اولین ہے۔ مسیح کی موت عورت کی وجہ سے واقع ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ الغرض پولوس سے لیکر آگسٹین تک تمام مسیحی لیڈروں نے عورت کے لئے حقارت آمیز الفاظ استعمال کئے

بائبل نے عورت کی تحقیر و تذلیل میں کس قدر حصہ لیا، اس کے متعلق ذیل کی چند آیات ملاحظہ ہوں :-

(۱) عورت کو تابعداری سیکھنا چاہئے۔ اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت مرد پر حکم چلائے بلکہ چپ چاپ رہے کیونکہ پہلے آدم بنایا گیا اس کے بعد حوا۔ اور آدم نے فریب نہیں کھایا بلکہ عورت فریب کھاکر گناہ میں پڑ گئی ——"

(۲) اور جب تو لڑائی کے لئے اپنے دشمنوں پر خروج کرے اور خداوند تیرا ان کو تیرے ہاتھوں میں گرفتار کرائے اور تو انھیں اسیر کر لائے اور ان اسیروں میں خوبصورت عورت دیکھے اور تیرا جی چاہے تو اسے اپنی جورو بنائے تو تو اسے گھر میں لا . . . . بعد اس کے تو اس سے خلوت کر . . . . بعد اس کے اگر تو اس سے خوشوقت نہ ہو تو جہاں وہ چاہے اسے جانے دے . . . . . . نیز ملاحظہ ہو کتاب اعداد باب ۳۱ آیۃ ۱۸ - "وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لئے زندہ رکھو"۔

(۳) اے بیویو! اپنے شوہروں کی ایسی تابعدار رہو جیسے خداوند کی ---- کیونکہ شوہر بیوی کا سر ہے جیسا کہ مسیح کلیسا کا سر ہے ...... لیکن جیسے کلیسا مسیح کے تابع ہے ویسے ہی بیویاں بھی ہر بات میں اپنے شوہروں کے تابع ہوں ----

(۴)- یسوع نے اپنی والدہ سے کہا:- اے عورت مجھے تجھ سے کیا واسطہ؟ (ملاحظہ ہو انجیل یوحنا باب ۲ آیت ۴) ----

(۵) بائبل میں "مادہ" کے لئے جو عبرانی لفظ استعمال ہوا ہے اس کے معنی اس قدر تکلیف دہ اور حیا سوز ہیں کہ ان کو سنکر شرم و غیرت بھی عرق عرق ہوئی جاتی ہے - یعنی "وہ چیز جس میں سوراخ کیا جائے"

بائبل میں اسی قسم کی صدہا آیات ہیں جن میں طبقۂ نسواں کی حد درجہ تذلیل و تحقیر کی گئی ہے - چلتے چلتے دو ایک آراء عیسائی محققین کی بھی ملاحظہ فرما لیجئے - الیزبتھ کیڈی اسٹانٹن بائبل کی کتابوں کے بارہ میں لکھتی ہے کہ:- میری نظر سے کوئی کتاب ایسی نہیں گذری جس میں عورتوں کی تحقیر و تذلیل اس طرح سکھائی گئی ہو"

ہیلن گارڈنر لکھتی ہیں:- جس ذلت و حقارت کی حالت میں عورتیں تھیں اس سے نہ مذہب نے نجات دلائی نہ یہوداہ نے بلکہ ان مردوں کی منصف مزاجی اور غیرت نے نجات دلائی جنھوں نے مذہب و یہوداہ کے احکام شریعت کو ٹھکرا دیا - پولوس نے عورت کو جس مقام پر باندھ رکھنے کی کوشش کی تھی وہاں سے عورت کو آزادی ان عظیم الشان اور بہادر مردوں نے دلائی ہے جنھوں نے پولوس کو بے حقیقت سمجھا اور جو پولوس کے خدا پر بھی سبقت لے گئے "

یوروپ کے قرون وسطیٰ میں عورتوں کی حالت

جرمنی کے مشہور اشتراکیت پسند مورخ ڈاکٹر بیبل نے لکھا ہے کہ ۵۸۵ء میں بمقام ماکون اسقفوں کی ایک کونسل منعقد ہوئی جس میں نہایت سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ عورت کے روح ہے یا نہیں؟ - جب رومہ میں بت پرستی کا رواج تھا، اس وقت عورت ایک شخصیت رکھتی تھی - مگر جب نصرانیت کا زمانہ آیا تو اُس نے طبقۂ نسواں کو اس قدر ذلیل و حقیر کردیا کہ عورت کو ایک جایداد ایک محکوم مخلوق اور قطعی ادنیٰ درجہ کی مخلوق بنا دیا - الغرض پانچویں صدی عیسوی سے عورت کے مرتبہ کو جو تنزل شروع ہوا تو وہ گرتے گرتے قعر مذلت میں جا پڑی -

قرون وسطیٰ کے زمانہ میں انگلستان کے اندر بھی عام عورتوں کی حالت بہت خراب تھی - اکثر ممالک میں جہاں عہد بت پرستی کے جذبات ہنوز باقی تھے وہاں "عہد شجاعت" میں بھی طبقۂ امرا کی عورتوں کی حالت کسی قدر اچھی رہی - اگر کوئی شریف زادی حسین و جمیل ہوتی تھی تو اس زمانہ کے شہسوار بانکے اس پر لڑ بھڑ کر جانیں دیدیتے تھے - مگر طبقۂ ادنیٰ یعنی کاریگروں اور دکانداروں کی بیویوں اور بیٹیوں کی حالت

ناگفتہ بہ تھی - ان کے لئے اس زمانہ کی دنیا بالکل جہنم تھی۔ شہسوار بانکوں کی ہوس ناکیوں اور نفس پرستیوں سے ان کی حفاظت نہ کوئی قانون کرتا تھا نہ کوئی مذہب۔

قرونِ وسطیٰ میں ایک دستور اور بھی تھا جسے "حق شبِ اول" (jus primae noctis) کہتے تھے - یعنی زمیندار کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنے کاشتکار کی لڑکی کو بعد از نکاح پہلی شب یا دو چار راتوں تک اپنے پاس رکھے - یہ رواج یوروپ کے بہت بڑے حصہ پر صدیوں تک جاری رہا بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ زمیندار اتفاق سے کوئی اسقف یا اَبت ہوتا تھا اور اسے بھی حسب دستور "شبِ زفاف" کا حق حاصل ہوتا تھا - اگر اسقف صاحب کے ملازم کسان کی لڑکی کو خوبصورت ظاہر کر دیتے تھے تو اسقف صاحب بھی ایک شب کے لئے جیتے جی جنت میں پہونچ جاتے تھے - قرونِ وسطیٰ کے انگلستان میں بھی یہ رواج عام تھا - اور اس زمانہ کے زمیندار اور نواب اس وقت کا سخت انتظار کیا کرتے تھے جب کسی حسین و جمیل رُوستا زادی کی شادی ہو اور انھیں "شبِ اول کا حق" نصیب ہو - انگلستان کے پادری آدم بیڈ نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں یہ رواج تھا کہ زمیندار اپنے علاقہ میں جس کسان کی لڑکی کو وضعدار دیکھتا تھا، اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا کرتا تھا اور جب وہ لڑکی حاملہ ہو جاتی تھی تو اُسے فروخت کر دیتا تھا" قرونِ وسطیٰ کے یوروپ میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ عصمت و عفت کس چیز کا نام ہے اور کسی کسان یا دہقانی کی کیا مجال تھی کہ وہ اس امیر یا سپاہی کی شکایت زبان پر لا سکے جو اس کی لڑکی کی عصمت دری کرتا ہے -

کیڈی استانٹن نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں عورتوں سے جو برتاؤ کیا جاتا تھا اس میں انسان تذلیل و تحقیر کی آخری حد تک پہونچ گیا تھا"

قدیم رومی تمدن کے زوال اور جدید مغربی تمدن کے عروج کے درمیان جو زمانہ گذرا ہے اس میں بزرگانِ دینِ مسیح یعنی اسقفوں کی یہ حالت تھی کہ وہ جلسے کر کرکے عورتوں کی تذلیل کیا کرتے تھے - چنانچہ ۵۸۶ء میں ایک کونسل بمقام آگزیرہ منعقد ہوئی اور اس میں یہ فتویٰ دیا گیا کہ چونکہ عورتیں "ناپاک" ہیں اس لئے انھیں مردوں کی طرح عشاء ربانی کا جام اپنے ہاتھ میں ہرگز نہ لینا چاہئے -

انھی بزرگانِ دینِ مسیحی کے فتاویٰ پر وہ قانون مرتب کیا گیا جسے عرف عام میں "قانون کلیسا" (Canon Law) کہتے ہیں چونکہ اس زمانہ میں تمام سیاہ و سفید کا مالک کلیسا تھا اور عنانِ قانون اسقفون اور رئیسانِ دیر کے ہاتھوں میں تھی اس لئے انھوں نے عورتوں کے حق میں جو چاہا کیا -

۱۰۰۰ء تک یعنی جب تک بت پرستانہ تمدن کا اثر رہا عورت کی حالت بھی اچھی رہی اور یہ اچھی

حالت اس کی چار ہزار سال قبل مسیح سے چلی آتی تھی۔ مگر ۵۰ء کے بعد عورت قعر مذلت میں ڈال دی گئی اور اس کی اس قدر تحقیر و تذلیل ہوئی جس کی نظیر بت پرست زمانہ کی تاریخ میں بھی نہیں مل سکتی اور ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یعنی جب تک دنیا پر نصرانیت کی گرفت قائم رہی عورت اسی ذلت کے غار میں پڑی رہی —

جن لوگوں نے عورت کو سب سے زیادہ ذلیل سمجھا وہی کلیسا کی تاریخ میں مذہبی ہیرو اور اولیاء اللہ شمار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً سینٹ گریگوری، سینٹ برنارڈ۔ سینٹ آگسٹین، سینٹ جیروم۔ حتیٰ کہ خود یسوع اور پولوس کی تعلیمات کا مطلب یہی ہے کہ عورت ایک حقیر و ذلیل چیز ہے۔ وہ بمقابلہ مرد کے ایک ادنیٰ مخلوق ہے۔ عورت ہی کی اخلاقی کمزوری کے باعث بنی نوع انسان شیطان کے قبضہ میں آگئے اور آدم بہشت سے نکالا گیا۔ جس قدر عورت میں ناز و انداز اور غمزے ہوتے ہیں اتنے ہی کانٹے شیطان نے جنّتی پکڑنے کے لئے بچھا دئے ہیں۔

سرمہ۔ کاجل۔ چورن۔ منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کرکے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے۔ دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو۔ سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا ایک شیشی اور بھیجدیجئے

کاجل - آشوب سرخی ضعف بصارت کے لئے ازبس مفید ہے ایک ڈبیہ جو ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہے قیمت عہ **سرمہ** - یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں نہ ممیرہ ہے نہ کوئی معمولی سرمہ ہے جن کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا دھند موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ اور بارہا آزمایا ہوا ہے قیمت فی ڈبیہ عہ علاوہ محصول۔ **چورن** - یہ وہ اکسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم، دستوں کا آنا سب یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول۔ **منجن** - اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول۔ **نوٹ**: سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف

پتہ :- م بیگم ذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ

عصمت بی بی ازبیچارگی

" غرض یہ کہ اس بے لطف زندگی سے میری طبیعت اکتاگئی ہے - اس میں شک نہیں کہ آپ نے میری ہر فرمائش کی تعمیل کی خواہ اس میں کتنا ہی روپیہ صرف ہو، لیکن دنیا میں اس کے علاوہ اور بھی چیزیں ہیں جن کے لئے زندگی بیتاب رہتی ہے - اپنی آئندہ زندگی خوشگوار بنانے کے لئے ایک موقع ہاتھ آیا ہے۔ اور اس سے میں فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں اسلئے ہمیشہ کے لئے خدا حافظ "

اس کے بعد دو تین جملے اور لکھ کر خورشید النساء نے دستخط کئے، اور لفافہ بند کر کے مکتوب الیہ کا نام لکھا —— "جب وہ یہاں آئیں گے تو اُن کی نظر ضرور اس پر پڑے گی" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اس نے اپنے شوہر، حامد حسین خان کے کمرے کا رُخ کیا، اور دھڑکتے ہوئے دل سے سنگار کی میز کا خانہ کھینچا - جو چیزیں اس میں رکھی ہوئی تھیں ان کو ادھر ادھر ہٹا کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کو مناسب جگہ پر رکھ دیا مگر میز کے خانہ کو بند کرنا ہی چاہتی تھی کہ اس کے خیالات میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا، دم گھٹنے لگا - وہ گھبرا اٹھی، اور لفافہ کو وہاں سے اُٹھا کر کھڑکی کی طرف گئی - اس کو کھولا تو ہوا کے خنک جھونکوں کی وجہ سے پھر اس کے بے چین قلب میں کچھ سکون پیدا ہوا —— اور وہ اپنے ارادے پر زیادہ مضبوطی سے قائم ہو گئی۔

لوٹ کر لفافہ کو آئینہ کے سہارے ایک نمایاں جگہ پر رکھ دیا، اور جلدی جلدی اپنے کمرے کی طرف جا کر کریم بی کا نہایت بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔

اتنے میں کریم بی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اطلاع دی "سواری دروازے پر موجود ہے" خورشید نے ایک ٹرنک اور صندوقچہ اس کے حوالہ کیا، اور جھٹ پٹ موٹر میں سوار ہو گئی۔

"ابھی ساڑھے پانچ بجے ہیں" خورشید نے کریم بی سے مخاطب ہو کر کہا "اور ریل ساڑھے چھ بجے روانہ ہو گی" آدھا راستہ طے ہونے پایا تھا کہ مطلع ابر آلود ہو گیا اور بارش ہونے لگی - تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک ادھ موٹر سر سے گزر جاتا تھا ورنہ سڑک صاف تھی - خورشید کا

موٹر نہایت تیزی سے گذر رہا تھا - ریل کے آنے میں ابھی دیر تھی اس لئے کریم بی نے خورشید کو وٹینگ روم میں پہو نچا دیا ——

چھ بج چکے، لیکن حکیم کا کوئی پتہ نہ تھا - خورشید اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی اور تاخیر کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا خورشید کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا - اور طرح طرح کے خوفناک اور مایوس کن خیالات اس کے دل میں آرہے تھے -

---

زنانہ وٹینگ روم سے ملحق کمرے میں کچھ لوگ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں - خورشید جس کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے وہ اس بند دروازے سے ملی ہوئی ہے، جو دونوں کمروں کے درمیان واقع تھا ایک شخص نے کسی قدر بلند آواز میں یہ خبر پڑھنی شروع کی "حیرت انگیز واقعہ" جواہرات کا سرقہ - عبدالحکیم نامی ایک خوش پوش - نوجوان کو عین فرار کے وقت گرفتار کر لیا گیا - متعدد افراد نے نشان دہی کی "

حکیم کا نام سنتے ہی خورشید کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی - اس کا دل دھڑکنے لگا، اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا —— اُس نے ضبط کر کے اپنے آپ کو سنبھالا، اور کریم بی سے ایک اخبار لانے کے لئے کہا - سرورق پر حکیم کا فوٹو اور "جواہرات کا سرقہ" دیکھ کر اس کے ہوش اُڑ گئے اور سکتہ کا عالم طاری ہو گیا —— "واپس چلو —— جلدی" خورشید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، اور اُٹھ کھڑی ہوئی - خادمہ نے دوڑ کر ایک موٹر کو اشارہ کیا اور خورشید اس میں سوار ہو گئی ——

اب اس کے لئے صرف ایک اُمید رہ گئی تھی —— یعنی حامد سے پہلے مکان پہونچ کر اس لفافہ کو اُٹھا لے ——

—— بارش رک گئی تھی مطلع صاف تھا - ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آرہی تھیں اور راستوں پر کافی چہل پہل تھی - خورشید بار بار شوفر کو تیز چلانے کے لئے کہہ رہی تھی - اس کی حالت اس خونیں مجرم کی سی تھی جس کے قصاص کا وقت قریب ہو، لیکن خفیف سی اُمید جان بخشی کی بھی ہو —— اس کی یہ اُمید صرف اس بات پر قائم تھی کہ حامد اس دن دیر سے گھر لوٹنے والا تھا -

موٹر مکان کے دروازے پر رکی، خادمہ نے دروازہ کھولا خورشید جھٹ سے مکان میں داخل ہو گئی اور نہایت تیزی سے حامد کے کمرے کی طرف بڑھی —— اپنے خط کو وہاں نہ پایا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، دل دھڑکنے لگا، اور وہ اُس آئینہ کے سامنے بت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی —— یکایک اس کی نظر حامد پر پڑی، جو پلنگ کے نیچے جھک کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا -

حامد کی نظر خورشید پر پڑی تو اس نے پر استعجاب لہجہ میں کہا "کیوں آگئیں!" ——

وہ دم بخود ہوگئی۔ کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا ــ اس کے ہونٹ خشک تھے، اور سانس نہایت تیزی کے ساتھ چل رہی تھی ــــــــــ

"کب سے کف کے بٹن ڈھونڈھ رہا ہوں" حامد نے جھلا کر کہا۔

خورشید نے میز کے نیچے اپنا بند لفافہ دیکھا اور فوراً جھک کر اُس کو اُٹھالیا۔

میر حسن (جامعہ عثمانیہ)

نگار مفت بلکہ تین روپیہ تین آنہ اور زائد

یعنی

ایک سال تک نگار مفت پڑھیے اور تین روپیہ تین آنہ ہم سے اور لیجئے

اس کی ترکیب کیا ہے؟

نگار کے سرورق کو اُلٹ کر دیکھئے تو آپ کو ایک فہرست کتابوں کی نظر آئے گی جو نگارستان سے شروع ہو کر فراست التحریر پر ختم ہوتی ہے اس فہرست میں جتنی کتابیں درج ہیں ان کی قیمت علاوہ محصول عـــہ/۱۲ ہوتی ہے، لیکن اگر آپ ان تمام کتابوں کو اکٹھا طلب کریں گے تو علاوہ محصول صرف ۵؍ میں دیجائیں گی یعنی آپ کو ۳ـــے کا فائدہ ہوگا۔ اگر آپ اسی ۳ـــے کی بچت میں سے نگار کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ادا کردیں تو بھی تین روپیہ تین آنہ آپ کے پاس بچ رہیں

مگر یہ رعایت اسی وقت ممکن ہے

جب آپ نگار کا سالانہ چندہ بھیجدیں ــ وہ حضرات جن کا چندہ آئندہ دسمبر میں ختم ہو رہا ہے اُن کے لئے اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کا خاص موقعہ ہے ــ دسمبر سے پہلے بھی ہر خریدار خواہ جدید ہو یا قدیم اس رعایت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ نگار کا چندہ سالانہ پیشگی بھیجدے۔

مینیجر نگار لکھنؤ

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

دورحاضر کی روحانیین کی جماعت میں سب سے زیادہ دلچسپ مبحث یہ ہے کہ "ماورائے قبر کیا ہوگا، کیسی سرزمین ہوگی، کیا موسم ہوگا، کیسے کھانے ملیں گے اور کس قسم کی صحبت میسر آئے گی۔ پڑھنے کے لئے عمدہ کتابیں۔ پہننے کے لئے عمدہ پوشاکیں اور محبت کرنے کے لئے جمیل صورتیں ملیں گی یا نہیں"

یہ مسئلہ واقعی بہت دلچسپ اور قابل غور ہے۔ ابھی تک اس مسئلہ پر کوئی قطعی رائے کسی ماہر فن کی دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔ روحانیین کی ایک جماعت یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ روح قالب سے جدا ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک بے خبر رہتی ہے، نہ اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور نہ یہ کہ اس پر کیا گزر رہی ہے پھر جب اس کو احساس اس انقلاب کا ہوتا ہے تو وہ اپنے گردوپیش ——— پر ایک غائر نظر ڈالتی ہے اور اپنی گزری ہوئی زندگی کی طرح وقت گزارنے لگتی ہے یعنی عالم ارواح میں بھی بالکل وہی مشاغل اختیار کر لیتی ہے جو دنیا میں اختیار کئے تھے۔

ایک سنجیدہ گروہ سر آلیور لاج کے اس عقیدہ کی جو اس نے ریمانڈ میں ظاہر کیا ہے تضحیک کرتا ہے کہ "ماورائے قبر دوکانیں ہیں، جہاں ارواح خرید و فروخت کر سکتی ہیں۔ اور جن کو عمدہ شرابیں، سگریٹ اور سوڈا وغیرہ مل سکتا ہے[1]" مسٹر ڈیل اون نے ویکلی ڈسپیچ میں اپنے اکتشافات ماورائے قبر کے متعلق

---

[1] ممکن ہے سر آلیور لاج کا یہ عقیدہ قابل مضحکہ قرار دیا جائے لیکن کم از کم مسلمانوں کو اس کی تضحیک کا حق حاصل نہیں ہے، کیونکہ ان کی روایات مذہبی میں بھی بکثرت اس نوع کی باتیں بہ سلسلہ "لذائذ جنت" ظاہر کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اہل اسلام کا یہ نہایت مشہور و معروف عقیدہ ہے کہ "جنتی جس چیز کی خواہش کریگا فوراً مہیا ہو جائے گی" پھر اس ہر چیز میں "شراباً طہوراً" تو خیر شامل ہی ہے، رہ گیا سوڈا سو حوض کوثر کے چھلکتے ہوئے جام میں اگر یہ صفت بھی نہ پائی گئی کہ وہ بہ ضرورت و خواہش "آب نمک" بن جائے تو بات ہی کیا ہوئی، البتہ سگریٹ کا معاملہ ضرور غور طلب ہے کیونکہ جنت میں آگ کا پایا جانا مستبعد ہے، سو ممکن ہے اس کے لئے وہاں اک خاص قسم کی "آتش سرد" پیدا کر دی جائے اور شعاع "ماوراء البنفسجی" (Ultra Violet Ray) کی طرح کسی کو نظر نہ آئے۔

سر آلیور لاج اور مسلمانوں کے عقیدہ میں فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ مرنے کے بعد ہی (ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۴۳)

شائع کئے ہیں۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ روحی میدانوں میں ہماری زندگی دنیاوی زندگی کا ایک صیقل شدہ آئینہ ہے، یہاں تک کہ اختلاط محبت، اور شادیاں بھی اس روحی دنیا میں پائی جاتی ہیں اور ہر شے اس دنیا سے زیادہ خوبصورت وہاں موجود ہے، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اس دنیا میں محبت نام ہے خواہشات نفسانی کا اور وہاں یہ بات نہیں ہے[۵]۔ روحانیئن کسی حد تک ہمارے برادران وطن کی طرح عقیدۂ تناسخ کے بھی قائل

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲) بلا تخصیص و تفریق ہر شخص کو ان لذائذ کا مستحق قرار دیتا ہے اور اہل اسلام صرف "مومنین قانتین" کیلئے مخصوص کرتے ہیں اور وہ بھی محض "فضائے فردوس" میں — ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد فردوس تک پہونچنے کا جو زمانۂ انتظار ہے اس میں مومنین کے لئے کوئی اور سامان تفریح و دلچسپی مہیا کر دیا جائے۔ کیونکہ خدا بڑا قدرت والا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو اس کے جی میں آئے اور انسان کی سمجھ میں کبھی نہ آئے —— تری شان جل جلالہٗ (اڈیٹر)

۵ خوب: یہ بات نہیں ہے تو پھر کیا ہے — کیا وہاں بھی اس امر کا اندیشہ انسانی اعصاب کو مضمحل کر دیگا کہ گناہ کیا نہیں اور "جنت کی حوریں چھنتی نہیں"! اہل اسلام کے مذہبی لٹریچر میں جس جگہ حوران فردوس کا بیان ہے وہاں ان کے حسن و جمال "و شدت و دوشیزگی" کا ذکر تو ضرور پایا جاتا ہے کہ لم یطمثھن قبلھم انس ولا جان (یعنی اس سے قبل ان کو کسی انس و جن نے ہاتھ ہی نہیں لگایا) لیکن کھلے الفاظ میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ ان حوروں کا مصرف کیا ہوگا — غالباً تہذیب و شائستگی مانع تھی کہ اس کا اظہار کیا جاتا اور صرف "ذہن سامع" یا "ولولۂ مومن" پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ اس خلا کو پُر کرے — اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ روحانیئن مغرب نے اس "محبت بے نفس" کا خیال کہاں سے پیدا کیا — ہو سکتا ہے کہ متصوفین کے "عشق حقیقی" سے استعارہ کیا گیا ہو، مگر اس کا تعلق تو غالباً "حسن مجرد" سے ہے، نہ کہ "حسن انسانی" سے۔ بہرحال مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ عقیدہ بھی ایک ناقص و نامکمل عقیدہ ہے اور وہ کبھی اس مفاہمت کے لئے طیار نہیں ہو سکتے کہ ساری عمر "نماز و روزہ و تسبیح و توبہ و استغفار" میں بسر کر دینے کے بعد اس کا اجر ملے بھی تو ایسی عورت کی صورت میں جسے وہ ہاتھ بھی نہ لگا سکیں!

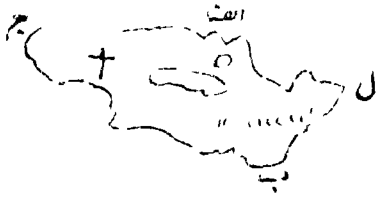
غالب نے تو خیر جنت کے مفہوم میں یہ چیز بھی شامل کی ہے کہ "وہاں کی دیواروں میں روزن ہوں اور وہ اُن سے تاک جھانک کرے، یہ حوروں کو بلائے اور وہ گریز کریں، یہ ان سے پوچھے کہ کب ملوگی اور وہ جھوٹی قسم کھا کر کل پر ٹالدیں وغیرہ وغیرہ" لیکن یہ تو ہیں غالب کی شاعرانہ بیہودگیاں جن پر اگر اُسے کافر قرار دیکر دوزخ میں ڈالدیا جائے تو عجب نہیں —— لیکن ہاں اب اتنی تہذیب بھی ٹھیک نہیں کہ "ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے"

بہرحال مغربی روحانیئن کی یہ محبت بغیر ہیجان نفس کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے —— افسوس ہے کہ یہ لوگ جو فطرت انسانی کے سمجھنے میں اپنے آپ کو بڑا ماہر جانتے ہیں، اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ "فلسفۂ لذت" کیا ہے۔ کاش یہ مولویوں کی تعلیمات کو سمجھیں اور اس کی حقیقت پر ایمان لائیں —— (اڈیٹر)

نظر آتے ہیں، لیکن ـــــ اس ترمیم کے ساتھ ـــــ کہ ایک مرتبہ جو انسان پیدا ہو چکا ہے وہ دوسرے جنم میں بھی انسان ہی پیدا ہوگا اور جانوروں کی صورت اختیار نہ کریگا۔

ایک مرتبہ چند احباب میز پر بیٹھے ہوئے معمول کے ذریعہ سے کچھ اخبار غیب معلوم کر رہے تھے کہ ایک صاحب بغیر اجازت کے کمرہ میں داخل ہوگئے اور دفعتاً وہ سلسلہ بند ہوگیا تھوڑی دیر کے بعد سرخ روشنی دیواروں پر اور خصوصیت سے ان صاحب کے چہرہ پر پڑنے لگی۔ یہ دیکھ کر سب سہم گئے کیونکہ سرخ رنگ کی روشنی نہایت شریر اور خوفناک ارواح خبیثہ کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ سب کو سہا ہوا دیکھ کر وہ صاحب بھی سہم گئے تھوڑی دیر کے بعد دیوار پر لگی ہوئی گھنٹیاں زور سے بجنے لگیں۔ "وسیط" یا معمول سے حروف تہجی کے ذریعہ سے دریافت حال شروع کیا تو ش - م - س - ا - حرف سمجھ میں آئے جن سے کوئی مفہوم نہ پیدا ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک نیلی روشنی رقص کرتی نظر آئی اور اس نے سمٹ کر ایک انسانی چہرہ کی صورت اختیار کرلی لوگوں نے دریافت کیا کہ کس سے گفتگو مقصود ہے۔ وہ صاحب جو نووارد تھے کہنے لگے یہ تو میرے ایک مرحوم دوست ہیں جن کی موت پر اسرار طریقہ سے واقع ہوئی تھی آج ۲۵ برس کے بعد میں نے ان کو دیکھا ہے۔ ان کا نام شمشاد تھا۔ اب سب کو خیال آیا کہ ش - م - ش - ا جو حروف پیدا ہوئے تھے وہ یقیناً شمشاد کے حروف تھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب وہ ماورائے قبر پُرسکون زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک پیشہ ور عورت نے ان کی روح کو پریشان کر رکھا ہے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ اس دنیا کی زندگی بھی اسی دنیا کی زندگی کا باقی حصہ ہے اور جس طرح اس دنیا میں زندگی بسر کی ہے[1] اسی طرح دوسری دنیا میں بسر کریگا۔

جب پوچھا گیا کہ وہ عورت کون ہے جس نے شمشاد کی روح کو پریشان کر رکھا ہے تو شمشاد نے وسیط کو اشارہ کیا اس نے پنسل اپنے ہاتھ میں لی اور غیر ارادی طور پر حسب ذیل نقشہ بن گیا۔



[1] کس قدر لغو و مہمل خیال ہے۔ یعنی جس نے اس دنیا میں عیش و مسرت سے زندگی بسر کی ہے وہاں وہ بھی مزہ میں رہیگا اور جس نے یہاں تکلیف اٹھائی ہے وہاں بھی مبتلائے آلام رہیگا۔ (اڈیٹر)

اس نقشہ کو کوئی سمجھ نہ سکا لیکن بعد کو ڈوارڈ صاحب نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مقام ان کے مکان کے پشت پر واقع ہے جو اب مزبلہ کی حیثیت رکھتا ہے اُنھوں نے سمجھا یا کہ شمال میں الف سے مطلب احمد علی کا مکان ہے، جنوب میں ب سے مطلب یہ ہے کہ بنک کی عمارت ہے، مشرق میں لالہ رام سین کی حویلی ہے اور مغرب میں بابو جے پال کی دو کانیں ہیں اسی جگہ ایک مسیحی اسپتال اور گرجا بھی تھا جہاں صلیب کا نشان بنا ہوا ہے اور ایک کنواں چند درخت اور ایک مزبلہ موجود ہے۔ جب دریافت کیا گیا تو روح نے کہا کہ اب بہت دیر ہوگئی ہے اس لئے وہ جانا چاہتی ہے چنانچہ دفعتاً وہ غائب ہوگئی۔"

لارڈ بردھم نے بھی اپنے سوانح حیات میں ایک واقعہ اسی قسم کا تحریر کیا ہے جو بہت دلچسپ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماوراے قبر بھی ارواح اپنے ان اعزہ سے جن سے دنیا میں انکا تعلق رہا ہے ملنے کی متمنی رہا کرتی ہیں اور جو وعدہ کرتی ہیں ان کو پورا کرنے کی بھی کوشش کرتی ہیں وہ لکھتا ہے:-

"یہ واقعہ دسمبر ۱۷۹۹ء کا ہے، میں تعطیل کے زمانہ میں سویڈن گیا ہوا تھا موسم بہت سرد تھا میں نے نوکر کو گرم پانی کے لئے حکم دیا۔ حمام میں پانی رکھدیا گیا اور میں نہانے میں مشغول ہوگیا۔ جب میں طالب علم تھا اس زمانہ میں روحانیت کا بہت چرچا تھا۔ ایک طالب علم سے میری بہت دوستی تھی ہم دونوں نے وعدہ کیا کہ جو پہلے مرے وہ دوسرے کو اطلاع دے۔ میں تعلیم حاصل کرتا رہا اور میرا دوست فوج میں نوکر ہو کر ہندوستان چلا گیا۔ عرصہ سے اُس کی خبر نہ ملی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مسکرا کر مجھے دیکھ رہا ہے میں ٹب میں تھا۔ جلدی سے میں نے کپڑے بدلے دیکھا کرسی پر وہ بیٹھا ہے اور مسکرا رہا ہے۔ میں سہم گیا اور گر پڑا جب ہوش آیا تو دیکھا کہ میں زمین پر پڑا ہوا ہوں اور کرسی خالی ہے۔ اس واقعہ کو میں نے کسی سے نہ کہا۔ میں اڈنبرا چلا گیا وہاں جا کر مجھکو اپنے دوست کے انتقال کی خبر ملی۔"

اسی طرح میرے ایک دوست نے یہ بیان کیا کہ مردہ وعدہ ضرور پورا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب کا بیان ہے کہ اُن کی نانی کو اپنی سہیلی سے بہت محبت تھی دونوں نے یہ وعدہ کیا کہ جو پہلے مرجائے وہ مرنے کے بعد اطلاع ضرور دے اور یہ بتلائے کہ ماوراے قبر کیسا پیش آتا ہے چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد اُن کی سہیلی مرگئی۔ ان صاحب کی نانی کو بہت قلق ہوا اور وہ بھی علیل ہوگئیں۔ ایک دن ڈاکٹر انکو دیکھ کر باہر گئے تھے کہ وہ کہنے لگیں "آہاہ تم آگئیں! تم نے یقیناً اپنا وعدہ پورا کیا۔ کیوں وہاں پر کیسی گزرتی ہے تکلیف تو نہیں ہے"۔ سب گھر والے اس واقعہ سے پریشان ہوگئے تھوڑی دیر کے بعد اس کا بخار اُتر گیا اور بالکل سکون ہوگیا۔ دوسرے دن مریضہ نے بیان کیا کہ میں نے اپنی مری ہوئی سہیلی کو دیکھا ہے۔ اس واقعہ کے بعد مری ہوئی عورت کی نواسی آئی تو اُس سے یہ واقعہ بیان کیا گیا اس نے کہا کہ بالکل

صحیح ہے۔ کیونکہ جس دن اُن کا انتقال ہوا ہے اس دن انھوں نے یہی لباس استعمال کیا تھا"

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح اس زندگی میں ہم اپنے اعزہ سے ملاقات کے لئے بیتاب و مضطر رہتے ہیں اسی طرح ارواح بھی ہم سے ملنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ ایک عجیب بات ہے کہ ارواح بالعموم تاریکی میں نظر آیا کرتی ہیں اور زیادہ روشنی میں ارواح کا نظر آنا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ جب یہ اشکال نظر آئیں ان کے فوٹو لئے گئے۔ ان میں گلیڈ اسٹون اور ڈکنس کی تصاویر بہت زیادہ ان کی اصلی تصاویر سے ملتی جلتی پائی گئی ہیں۔ اسی سلسلۂ تصویر کشی میں ایک شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جس وقت کوئی روح آکر اپنے اعزہ کے حالات بیان کرتی ہے اگر اس وقت کیمرے کی پلیٹ ہاتھ میں لے لی جائے اور وہ روح اس کو چھولے تو اس میں روح کی تصویر آجائے گی۔ چنانچہ ایک وسیط نے ۱۹۲۰ء میں یہ کمال کیا کہ جب حالت خاص میں وہ پلیٹ پر ہاتھ رکھتا تھا ایک شکل عجیب آجایا کرتی تھی اور حلقے کے اراکین اس کو دیکھکر یہ کہدیا کرتے تھے کہ یہ ہمارا فلاں آشنا ہے۔

لیکن اس طرح فریب بھی دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک وسیط نے یہ اعلان کیا کہ وہ ارواح سے تحائف بھی حاصل کر سکتی ہے۔ چنانچہ جب وسیط سے کہا گیا تو اُس نے اپنے ہاتھ ایک شخص کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اور عامل نے اس پر عمل تنویم شروع کیا۔ اب ارواح آنا شروع ہوئیں۔ اور جو کچھ مانگا گیا دینے لگیں۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ سامان پہلے سے موجود تھا اور چونکہ کمرہ میں تاریکی تھی اس لئے کوئی اس شعبدہ کو سمجھ نہ سکا اور وسیط نے کافی روپیہ کما لیا۔

روحانیین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اگر شب و روز کوئی قوی شخص کمزور و نازک شخص پر قوت خیال صرف کرے تو وہ پریشان ہوکر ہر خواہش پورا کرنے کیلئے تیار ہوجائیگا اور آخرکار جب تک خیال ترک نہ کیا جائے اس کے قلب کو سکون میسر نہیں آئے گا۔

چنانچہ پنجاب کے ایک صاحب آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کررہے تھے اتفاقاً ایک لڑکی سے جو اسی کالج میں تعلیم حاصل کرتی تھی قلبی تعلق پیدا ہوگیا، لیکن اس لڑکی کو اُن پنجابی صاحب سے یک گونہ نفرت تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس چلے آئے اور یہاں اُنھوں نے ایک یوگی سے یہ عمل سیکھا اور شب و روز اس لڑکی کا خیال کرنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ــــ انگلستان میں اس لڑکی کی صحت خراب ہونا شروع ہوئی، بہت علاج کیا گیا مگر فائدہ نہ ہوا، آخر روحانیین کی ایک جماعت میں اس کی علالت بیان کی گئی تو ایک ڈاکٹر نے اس کے حالات دریافت کرنا شروع کئے اس گفتگو میں ان پنجابی صاحب کا بھی تذکرہ آیا۔ اس تذکرہ سے وہ لڑکی کچھ خائف معلوم ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے عمل تنویم سے یہ بتلایا کہ اُن پنجابی صاحب

قوت ارادی سے اُس لڑکی کو سزا دی ہے، لڑکی کے والدین نے اُن پنجابی صاحب کی خدمت میں لڑکی کی تصویر بھیجی اور درخواست کی کہ اس کو معاف کر دیا جائے۔ چنانچہ پنجابی صاحب نے بھی یہ سمجھکر کہ اب سزا کافی مل چکی ہے اس عمل کو چھوڑ دیا اور وہ لڑکی خود ہندوستان آگئی اور اُن سے شادی کرلی۔ یہ عورت وسیط کی حیثیت سے بہت عمدہ خدمات انجام دے سکتی تھی لیکن اُنھوں نے اس طرف توجہ نہ کی۔ اُس لڑکی کی علالت اور ہندوستان کی گرمی نے اس کی صحت کو بد سے بدتر بنا دیا اور اس کا انتقال ہوگیا۔

اس قسم کے واقعات بھی سننے گئے ہیں کہ عامل اپنے وسیط کے ذریعہ سے اخبار غیب بھی تبلا دیا کرتے ہیں۔ اور امراض کا علاج بھی کرتے ہیں۔ دنیا میں ایسی ہستیاں موجود ہیں جو اگر چاہیں تو اپنے خیالات سے دوسرے کو متاثر کر سکتی ہیں۔ اس قوت کا انحصار طبائع پر ہے۔ یہ ایک قسم کی مشق ہے، اگر ہم اپنے دماغ کو اس امر کا خوگر بنالیں کہ وہ دوسرے دل کی بات کا پتہ لگا سکے تو آسانی سے ممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ایک نابینا ——————— راستہ کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے۔ اسی طرح انسانی خواہش بھی یہ ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد اس کی روح عیش وسکون حاصل کر سکے کیونکہ جہاں تک عقل کی رسائی ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ روح ایک غیر مادی چیز ہے اس لئے وہ نہ خراب ہو سکتی ہے اور نہ اس کو فنا ہے۔

سر آلیور لاج نے ڈیلی نیوز میں لکھا تھا کہ مادی اسباب نہ تو روح کو پیدا کرتے ہیں اور نہ اسے ہلاک کر سکتے ہیں، روح ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ جسم خاکی صرف اس کی سیرت کو ایک خاص سانچہ میں ڈھال دیتا ہے، جس سے رہائی حاصل کرنے کے بعد روح کو اپنے افعال میں آزادی تام مل جاتی ہے۔ ایک مرتبہ ریورنڈ شیپرڈ نے ڈیلی نیوز میں لکھا تھا کہ میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ مرنے والے واقعی زندہ رہتے ہیں، ان کے اعمال اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ جسم خاکی چھوڑ کر بھی وہ اپنی بہبودی و فلاح میں منہمک رہتے ہیں حتیٰ کہ ابدی حیات کے مقررہ منازل طے کرنے کے بعد وہ قربِ خداوندی حاصل کر لیتے ہیں۔ جو مذہب کے نقطۂ خیال سے روح کا نصب العین ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر روح کا نصب العین تشنہ رہجاتا ہے تو وہ لوگوں کو دق کیا کرتی ہے، چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ بہرائچ اور بانسہ وغیرہ میں بعض عامل ارواح خبیثہ کو لوگوں کے جسموں سے جدا کر دیتے ہیں اور لوگوں کو صحتیں ہو جایا کرتی ہیں۔ بد روحیں نکالنا انجیل سے بھی ثابت ہے کہ حضرت مسیح نے بھی بد روحیں نکالی تھیں ایک مرتبہ ایسا ہی واقعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک حسین بیوہ عورت سے ایک صاحب نے شادی کی تھی تو اکثر پہلے شوہر کی روح اُن صاحب کو دق کیا کرتی تھی اور بالآخر وہ صاحب کچھ سہم گئے اور اُنھوں نے اس حسین بیوی کو چھوڑ دیا اس وقت ان غریب کی جان بچی وہ حسینہ دق میں مبتلا ہوگئی اور آخر کار تیزاب پیکر

اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا، جس کوٹھی میں وہ حسینہ نع اپنے سابق شوہر کے رہتی تھی وہاں اس کے سابق شوہر کی روح اکثر نظر آیا کرتی تھی لیکن جس دن سے وہ حسینہ مری ہے وہ روح کسی کو نظر نہیں آئی اور اب وہیں اسی کوٹھی میں ایک سرکاری دفتر موجود ہے۔

سر آلیور لاج نے اپنی کتاب حیات وممات میں لکھا ہے کہ "موت کے بعد غالباً ہم وجود اثیری قبول کر لیتے ہیں اور تبادلۂ خیالات کے لئے قوت ممیزہ سے بھی افضل تر کوئی طاقت ہمیں حاصل ہوجاتی ہے اس تغیر سے ہم ایک ایسے عالم میں چلے جاتے ہیں جہاں محبت، سکون، خوشی اور امید مکمل طریقہ سے غیر فانی اور تسلی بخش طور پر نصیب ہوتی ہے۔

یہ خیال اب دنیا میں زیادہ راسخ ہوتا جاتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد اپنی قوتوں کو زائل نہیں کرتا بلکہ وہ دنیا کو اُسی طریقہ سے فائدہ پہنچا سکتا ہے جس طرح ساری دنیا۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ اس دنیا میں بھی کالج ہیں، اخبار ہیں۔ فرقہ وارانہ مباحث میں کونسلیں ہیں، نمازیں ہیں، دعائیں ہیں، گانے بجانے ہیں، خواب پلانے والیاں ہیں اور اطمینان وسکون سے زندگی بسر ہوتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو موت کے خوف سے ہم لوگ کیوں گھبرائیں؟

مشیر احمد علوی، بی اے

(نگار)۔ سر آلیور لاج کو مابعد الطبیعیات وعالم ارواح کا بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے، لیکن میرے نزدیک شاید ہی کوئی شخص اُس سے زیادہ احمق بیسویں صدی کے دورِ علم وروشنی میں پیدا ہوا ہو ــــ وہ اول اول "فلسفۂ تشکیک" کا بڑا زبردست حامی تھا۔ لیکن بعد کو جب ردّ عمل ہوا تو وہ عالم ارواح کے وجود کا بھی اسی شدت حماقت کے ساتھ حمایت کرنے لگا اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ "متشککین" کے خیال کا ردّ عمل اسی طرح کی توہم پرستی پر منتہی ہوتا ہے کینن ڈائل کی دوسری مثال موجود ہے، دیکھ لیجئے

حقیقت یہ ہے کہ فطرت انسانی ہمیشہ اس چیز کی جستجو میں لگی رہتی ہے جو اس کے احاطۂ علم سے باہر ہے پھر کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ علم انسانی بعض حقایق تک پہونچکر ان کے چہرہ کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے اور کبھی حسرت اس کے قیاسات شدت انہماک سے ایک صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ انھیں کو حقیقت باور کرنے لگتا ہے "مرنے کے بعد کیا ہوگا" ــــ چونکہ یہ عالم انسانی کی سب سے زیادہ مخفی وغیر معلوم حقیقت ہے، اس لئے۔ ہر زمانہ اور ہر ملک میں لوگوں نے

اس پر انتہائی غور و انہماک سے کام لیا یہاں تک کہ جب انسان کسی اور طرح مطمئن نہ ہوسکا تو مذاہب عالم نے اس مسئلہ کو اپنے حیطۂ اقتدار میں لیکر دو ٹوک فیصلہ کر دیا ——— مدعا صرف یہ تھا کہ انسان فضول خیال آرائیاں چھوڑ دے اور ان میں اپنا وقت نہ ضائع کرے ——— اور یہ بھی یہی بات کہ انسان کا موت سے پہلے موت کی گتھیاں سلجھانا انتہائی حماقت ہے۔ جب تک زندہ ہیں ہم کو اپنے کام میں لگا رہنا چاہئے، جب موت آئے گی چل دیں گے۔ اور اگر اس کے بعد کوئی اور زندگی ہے تو اس میں لگ جائیں گے، اس وقت اس کے خیال میں وقت ضائع کرنا نہایت لغو و مہمل بات ہے۔

اس میں شک نہیں کہ معاد کے خیال پر بہت کچھ انحصار انسان کی درستیٔ اخلاق کا ہے، لیکن صرف اُسی جماعت کے لئے اور اُسی زمانہ تک جس کا تعلق "عہد تاریک" سے ہے اور جب تک انسان کے دماغ نے اس قدر ترقی نہیں کی ہے کہ وہ ایک اچھے کام کی اہمیت کا اندازہ محض اس کے "اچھے" ہونے کی حیثیت سے (بغیر خیال مُزد) کر سکے ——— پھر چونکہ مذاہب کی بنیاد ڈالنے والے ایک خاص قسم کا مصلحانہ دماغ لیکر آئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان کی جماعت ترقی کے کس دور میں ہے اور وہ کس تعلیم سے متاثر ہوسکتی ہے، اس لئے انھوں نے "نفسیات تبلیغ و ہدایت" کے اصول سے کام لیکر اسی قسم کی باتیں لوگوں کو بتائیں جنھیں لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور جن کا اُن پر اثر ہو ——— مذاہب عالم نے عالم کون کے معارف و حقائق سے کبھی بحث نہیں کی ہے، بلکہ صرف اصلاح نوع انسانی کو اصل مقصد قرار دیکر "عقاید" مخصوصہ کی طرح ڈالی ہے، اور ظاہر ہے کہ انکی اس فراست و دانشمندی سے کس کو انکار ہوسکتا ہے ——— بہرحال جس حد تک صرف اصلاح کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ معاد کے اعتقاد نے بہت کچھ دنیا میں کیا ہے اور غالباً ابھی عرصۂ دراز تک کرتا رہیگا، لیکن اگر آپ "حقیقت" کا سوال کریں گے تو ماننا پڑے گا کہ "بعد الممات" کے متعلق اس وقت تک نہ کسی مذہب نے ایسی بات بتائی ہے جس پر ہر شخص کو اطمینان ہوسکے اور نہ علوم جدیدہ کی ترقی اس معمہ کو سلجھا سکی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم مستقبل کو کسی طرح حال میں تبدیل نہیں کر سکتے اور انسان بندہ ہے صرف حال اور مشاہدۂ حال کا۔

مغربی لٹریچر میں کثرت سے حاضرات و طلب ارواح وغیرہ کے واقعات نظر آتے ہیں،

یہاں تک کہ روحوں کی تصاویر حاصل کرلینا، ان سے گفتگو کرنا بلکہ بسا اوقات اُن سے تعلق جنسی قائم ہوکر اولاد کا پیدا ہونا بھی حقیقت وواقعہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن اس لیٹریچر میں ۹/۱۰ حصہ تو محض بیہودہ یا گنڈا ہے اس جماعت کا جو ہندوستان کے گنڈا تعویذ لکھنے والوں کی طرح لوگوں کو احمق بناکر دولت کما نا چاہتی ہے اور باقی ۱/۱۰ نتیجہ ہے صرف "انسانی قوتِ انفعال" کا جو اپنے واہمہ میں مبتلا ہوکر خدا جانے کیا کیا دیکھنے لگتی ہے۔

امریکہ کے نہایت مشہور اخبار "سائنٹفک" نے ایک بار چند لوگ متعین کئے کہ وہ ہر جگہ جاکر تحقیق کریں کہ طلب ارواح کے دعوے میں کس حد تک حقیقت پائی جاتی ہے اور "وسیط" "معمول" کے بیانات قابل اعتبار ہیں یا نہیں ——— چنانچہ ایک زمانہ تک اس جماعت نے یورپ کے تمام ممالک کی سیر کی، تمام روحانیین سے ملے، معمولوں اور وسائط سے گفتگو کی، حاضرات میں شریک ہوئے، روحوں کے پیام سُنے، ان کی تصویریں لئے جانیکا تماشہ دیکھا اور آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ تمام دعوے بے بنیاد ہیں اور سو میں ایک بیان بھی ان روحانیین کا قابل اعتبار نہیں ہے۔ جس جس طرح یہ لوگ دہوکا دیتے ہیں، اور جن جن ترکیبوں سے یہ روحوں کی تصویریں لینا ظاہر کرتے ہیں، اُن کا مفصل حال اس کمیٹی نے قلمبند کیا اور اخبار مذکور میں شائع کرادیا — الغرض وہ سر آلیور لاج ہوں یا کوئی اور بزرگ ان کی تمام تحقیقات وہم وقیاس سے آگے نہیں بڑھی اور اس مسئلہ پر اب بھی تاریکی کا وہی پردہ پڑا ہوا ہے جو اب سے ہزار سال قبل پڑا ہوا تھا ———

پھر چونکہ ہمارے پاس اس کے باور کرنے کی کوئی قوی وجہ موجود نہیں ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اسی طرح کی زندگی بسر کرنا پڑے گی جیسی اس دنیا میں بسر کی ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اس کا قائل ہے کہ مرنے کے بعد انسان پر "انعدام محض" کی حالت طاری ہوجاتی ہے اور وہ بالکل نسیاً منسیاً ہوجاتا ہے تو کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ بات تو بہت کچھ قرین عقل بھی ہے اور وہ عقل سے بڑی حد تک دور ———

شمیم کا دوسرا ایڈیشن عمدہ کاغذ پر دو ضخیم جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ رنگین تصاویر جو اسی ناول کے لئے صدہا روپیہ صرف کرکے تیار کی گئی ہیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ قیمت ہر دو حصہ للعہ علاوہ محصول ڈاک (فرمائش کے ساتھ ۱۱ر کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں) "منیجر نگار لکھنؤ"

تاریخ کا ایک گم شدہ ورق

(وصل بعد از وصال)

نومبر ۱۸۴۸ء کی آٹھویں تاریخ ہے اور امیر عبد القادر جزائری معہ اپنی بیویوں، لڑکیوں، اور اعوان و انصار کے شہر امبواز کے ایک عالی شان قصر کے اندر فروکش ہوئے ہیں جسے حکومت فرانس نے اُن کے قیام کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

امیر عبد القادر جزائری وہی وطن پرست و غیور امیر تھا جس نے اپنے ملک اور اپنے آبا و اجداد کی روایات شجاعت کی حمایت میں ایک زمانہ تک عساکر فرنساوی سے جنگ کی اور اگر دس بار خود شکست کھائی تو پانچ مرتبہ دشمن سے بھی اپنی تلوار کا لوہا منوا کر چھوڑا —— لیکن فرانس کی زبردست حکومت و منظم فوج سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا، آخر کار اہل فرانس بلاد عربی میں ساحل سے لیکر ریگستانوں تک وسیع حصۂ زمین پر قابض ہو گئے اور ۲۸ راگست ۱۸۴۸ء کی شام کو امیر عبد القادر اپنی تلوار دشمن کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو ہی گیا —— ہر چند عساکر فرنساوی کے جنرل نے امیر موصوف سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو حوالہ کر دیں گے تو ان کو اجازت دیدیجائے گی کہ وہ شرقی دیار عرب میں جہاں چاہے چلے جائیں۔ لیکن حکومت فرانس اس عہد پر قائم نہ رہی اور انھیں فرانس بھیجدیا جہاں وہ قصر امبواز میں ایک قیدی کی حیثیت سے رکھے گئے۔ یہاں یہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۲ء تک رہے اور ۱۸۵۲ء میں جب انقلابی دور فرانس میں شروع ہوا تو امیر عبد القادر دمشق چلے آئے اور یہیں وفات پائی۔

ان لوگوں میں سے جنھوں نے امیر عبد القادر کا ساتھ دیا تھا اور جو اُن کے ساتھ امبواز میں نظر بند تھے ایک شخص عبد السمیع مغربی بھی تھا۔ اس نے جس طرح امیر کا ساتھ ان کے ایام کامیابی میں دیا تھا اسی طرح ادبار میں بھی دیا اور امیر کی محبت ترک کرنا کسی طرح گوارا نہ کیا۔ امیر بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے اور اُن کو پوری طرح احساس تھا کہ اُس نے محض ان کی محبت میں اپنے وطن اور اہل و عیال سب کو خیر باد کہدیا تھا عبد السمیع امیر سے کہا کرتا کہ "اے میرے آقا، میں نے اپنے قلب کے دو ٹکڑے کر لئے ہیں ایک خدا کے لئے وقف ہے اور دوسرا آپ کے لئے" —— لیکن اُسے خبر نہ تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے جب اسے اپنے قلب کے تین حصے کرنا پڑیں گے اور ایک حصہ کسی اور ہستی کے لئے وقف کرنا پڑے گا ——

یہ ترکی ایک نوجوان فرانسیسی لڑکی کی تھی جس کا نام الیس فونتان تھا - یہ لڑکی ایک خادمہ کی حیثیت سے امیر کے قصر میں کام کرتی تھی اور یہیں دونوں کے درمیان پیمانِ محبت استوار ہوگیا تھا اور اس نے بھی اپنے محبوب کے ساتھ اسیری کی زندگی اختیار کرلی تھی -

اتفاق سے ایک دن یہ لڑکی اپنے والدین واعزہ سے ملنے گھر گئی تو انھوں نے اُس کو قید کرلیا اور پھر نہ جانے دیا، کیونکہ ان کو اس کے تعلق خاطر کا حال معلوم ہوگیا تھا اور وہ کسی طرح گوارا نہ کرتے تھے کہ وہ ایک غیر مذہب و غیر ملک کے انسان سے وابستگی پیدا کرے —— انھوں نے صاف صاف کہدیا تھا کہ "ہم کو تیری موت گوارا ہے لیکن غیر کفو میں شادی کرنا کسی طرح منظور نہیں" —— اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی عہد کیا کہ وہ امیر اور عبدالسمیع دونوں سے اس کا انتقام لیں گے -

ہفتوں گزر گئے اور وہ لڑکی قصر تک واپس نہ آسکی عبدالسمیع کا تردد بڑھتا جارہا تھا اور حیران تھا کہ اُس کی غیر حاضری کا سبب کیا قرار دے - آخر کار اُس نے دوسری لڑکیوں سے تحقیق حال کی اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی محبوبہ مقید ہے اور ہر وقت ملول وحزیں رہتی ہے تو اس کی تکلیفیں اور بڑھ گئیں

نومبر ۱۸۵۱ء کی پانچویں تاریخ صبح کو جب اہل قصر کی آنکھ کھلی تو سنا کہ بائیں باغ کے سمت سے فریاد و زاری کی آواز آرہی ہے - سب لوگ دوڑ پڑے اور دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی رات کے لباس میں لوٹتی ہوئی چلی آرہی ہے اس حال میں کہ اس کے سینہ اور پہلو سے خون جاری ہے - لوگ اس کو فوراً قصر کے اندر لے آئے اور علاج میں مصروف ہوگئے - یہ لڑکی زخموں کی تکلیف سے بیتاب تھی، درد سے تڑپ رہی تھی، لیکن عبدالسمیع کا نام ہر وقت اس کی زبان پر تھا - لوگ حیران تھے کہ یہ کیا قصہ ہے - ابھی تک عبدالسمیع کو بالکل علم نہ تھا کہ کون لڑکی کس حال میں قصر کے اندر آئی ہے - جب عبدالسمیع نے یہ خبر سنی تو وہ بھی محض تماشائی کی حیثیت سے اس کو دیکھنے گیا، مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس کو معلوم ہوا کہ یہ تو اس کی محبوبہ تھی جس کے لئے وہ ہر وقت مضطرب رہا کرتا تھا اور جس کے دفعتاً غائب ہوجانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی —— یہ بے اختیار اُس سے لپٹ گیا اور دیوانوں کی طرح اس کا مجروح سینہ اور غم آلود چہرہ چومنے لگا — لوگ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے - جب جوش کم ہوا تو عبدالسمیع نے بھی محسوس کیا کہ وہ مشرقی روایات تہذیب سے ہٹا جارہا ہے اور اس لئے اس نے آہستگی سے لڑکی کا سر تکیہ پر رکھ دیا اور خاموش الگ کھڑا ہوگیا -

جب اس کے ساتھیوں نے پوچھا کہ "تمھاری شناسائی اس لڑکی سے کیونکر ہوئی اور اس بے تکلفی

و بیجا بی کے کیا معنی ہیں"۔ تو اُس نے کہا کہ "میں امیر کے روبرو تمام واقعات بیان کرونگا اور اگر مجھ سے کوئی گناہ ہوا ہے تو امیر ہی کے حضور میں سزا کو قبول کرونگا"

جب امیر عبدالقادر کو اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ دونوں سامنے لائے جائیں - چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور ان دونوں نے اپنی داستان محبت کو شروع سے آخر تک دہرایا — لڑکی نے گھر میں قید کر لئے جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ " اے امیر آج میں نے گھر سے بھاگ نکلنے کا ارادہ کر ہی لیا - خدا معلوم میرے بھائی کو کس طرح خبر ہوگئی - اور اُس نے مجھے راستہ میں پکڑ کر اصرار کیا کہ پھر گھر واپس جاؤں ، لیکن جب میں کسی طرح راضی نہ ہوئی تو اُس نے اپنا خنجر نکال کر میرے پہلو اور سینہ میں پیوست کر دیا ، میں گر پڑی اور وہ مجھے مردہ سمجھ کر بھاگ گیا "

لڑکی نے یہ کہا اور دفعتہً اس کی گردن شانہ کی طرف ڈھلنے لگی ، حتیٰ کہ چند لمحوں کے اندر وہ زمین پر گر پڑی اس حال میں کہ اس کی رُوح پرواز کر چکی تھی اور اس کا جسم سرد ہو گیا تھا -

امیر عبدالقادر نے حکومت سے اس لڑکی کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت حاصل کر کے اُسے قصر کے جوار میں سبز سایہ دار درختوں کے نیچے مدفون کر دیا اور دیر تک اس واقعہ سے متاثر رہا -

---

۱۱ دسمبر ۱۸۵۲ء کی صبح کو امیر عبدالقادر معہ اپنے ساتھیوں کے امبواز سے کوچ کی طیاریاں کر رہے ہیں کیونکہ حکومت فرانس نے ان کو آزاد کر دیا اور اجازت دیدی ہے کہ جہاں جی چاہے چلے جائیں - امیر جب اہتمام سفر سے فارغ ہو کر اپنے ساتھیوں کا جائزہ لینے لگا تو معلوم ہوا کہ عبدالسمیع ان میں موجود نہیں ہے - امیر نے جستجو کی تو دیکھا کہ عبدالسمیع اپنے کمرے میں مردہ پڑا ہوا ہے اور ایک تحریر اس کے سینہ پر رکھی ہوئی ہے جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ

" اے امیر میں الیس فونتان کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا ، اس لئے جائیے تو مجھے اس کے پاس دفن کر کے جائیے "

چنانچہ آج بھی فرانس کے شہر امبواز میں اگر کوئی سیاح جائے اور مسلمانوں کے قبرستان کی سیر کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک گوشہ میں چند درختوں کے نیچے ایک قبر زرد پتھر کی پائی جاتی ہے جس کے سرہانے سنگ مرمر کی تختی نصب ہے -- یہی ہے الیس فونتان اور عبدالسمیع کی قبر جہاں وہ کبھی نہ جدا ہونے کے لئے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے مل گئے ہیں -

انتخاب کلام افسوس

افسوس کا نام میر شیر علی تھا - یہ بیٹے تھے سید علی مظفر خاں کے - ان کا سلسلۂ نسب امام جعفر صادق تک پہونچتا ہے - اُن کے آبا و اجداد قصبۂ خواف (ایران) کے باشندے تھے اُن کے خاندان میں سب سے پہلے سید بدر الدین (سید عالم حاجی خانی کے بھائی) ہندوستان آئے اور نارنول میں قیام کیا۔

افسوس کی ولادت و تعلیم دہلی ہی میں ہوئی - جس وقت نواب عمدۃ الملک قتل ہوئے (۱۷۴۷ء) افسوس کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی اسلئے اُن کے والد اپنے بیٹے کو لیکر پٹنہ چلے گئے اور نواب جعفر علی خاں کی ملازمت میں آگئے - پٹنہ میں انکا قیام ۱۷۶۰ء تک رہا جب نواب جعفر علی خاں (جو میر جعفر کے نام سے زیادہ مشہور ہیں) ۱۷۶۰ء میں معزول کئے گئے تو یہ لکھنؤ چلے آئے اور پھر حیدر آباد چلے گئے اور وہیں انکا انتقال ہوا ـــــ

افسوس، اپنے والد کے لکھنؤ آنے سے دو سال قبل ہی لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے اور نواب سالار جنگ کی سرپرستی حاصل کر چکے تھے - اور مرزا جوان بخت جہاندار شاہ کے مصاحب ہو گئے تھے - جہاندار شاہ، شاہ عالم کے بڑے بیٹے تھے اور دہلی سے لکھنؤ آگئے تھے۔

چند سال قیام لکھنؤ کے بعد نواب آصف الدولہ کے نائب مرزا حسن رضا خاں نے افسوس کا تعارف رزیڈنٹ (کرنل اسکاٹ) سے کرا دیا - رزیڈنٹ کی سفارش لیکر یہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ گئے اور فورٹ ولیم کالج میں اردو کے میر منشی ہو گئے - ان کی تصانیف و تالیفات کی فہرست حسب ذیل ہے :-

۱- باغ اردو، ترجمۂ گلستان، جو زمانۂ قیام لکھنؤ کی چیز ہے یہ ترجمہ ۱۷۹۹ء تک مکمل ہو گیا تھا۔

۲- ترتیب کلیات سودا - (کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں)

۳- ان فارسی کتابوں کے ترجمہ کی صحت جو کالج کے اور منشیوں نے کی تھی۔

۴- آرائش محفل، یعنی خلاصۃ التواریخ کے ایک حصہ کا ترجمہ (خلاصۃ التواریخ ہندوستان کی تاریخ ہے جسے پٹیالہ کے منشی سوجان رائے نے ۱۶۹۵ء میں لکھا تھا) - آرائش محفل ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوئی اور ۱۸۰۸ء میں کلکتہ کے اندر طبع ہوئی - بعد کو اس کا انگریزی ترجمہ ام - جے، کورٹ نے کیا اور ۱۸۷۱ء میں الہ آباد کے کسی مطبع میں اسکی طباعت ہوئی - اس کا دوسرا اڈیشن کلکتہ میں شایع ہوا (۱۸۸۲ء)

۵- اردو دیوان - جو لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں مرتب ہو گیا تھا - اور جو اب کمیاب ہے - افسوس کا ۱۸۰۹ء

میں انتقال ہوا۔

افسوس کے حالات اس سے قبل علاوہ نگار کے اور رسائل میں بھی شایع ہو چکے ہیں اور اُن کی تصانیف پر بھی متعدد حضرات نے ریویو تحریر کئے ہیں، لیکن چونکہ اُن کا اردو دیوان کمیاب چیز ہے اس لئے نہ اس کا انتخاب کہیں شایع ہوا اور نہ اس پر رائے زنی کی گئی۔

اتفاق سے مجھے حیدر آباد کے کتب خانۂ آصفیہ میں ایک قلمی نسخہ دستیاب ہو گیا جس کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ کلام کے متعلق اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اس کو پڑھنے کے بعد بہ آسانی معلوم کر سکتا ہے کہ میر و درد کا رنگ کس پختگی کے ساتھ اُن کے کلام میں پایا جاتا ہے اور باوجود اس کے کہ افسوس نے لکھنؤ میں بیٹھکر اس دیوان کو مرتب کیا، مگر لکھنؤ کا کوئی اثر ان کے کلام پر نہیں پڑا۔

دیکھو بیتابی دل کی، اس در پر — ایک دن میں ہزار بار گیا
منزل عشق تک نہ پہونچا آہ — میں تو چلتے ہی چلتے ہار گیا
پاس سے اسکے سب گئے خورسند — ایک افسوس سوگوار گیا

اپنے دل کا ہو آشنا تو اگر — راز کھل جائے تجھ پہ ہر دل کا
آہ حسرت سے مر گئے ہم یار — نہ سنا تو نے درد پر دل کا
جی دیا اُس کے آگے سے نہ ٹلا — یار ڈھنگ دیکھیو جگر دل کا

ہم نے مانا کہ شمع رو ہیں آپ — پر ہمیں کب تلک جلائے گا
میں تو جی دینے پر بھی حاضر ہوں — کیا مجھے آپ آزمائے گا

چرخ کی گردش سے اسکا آشیانہ چھٹ گیا — جی جہاں لگتا تھا وہ اپنا ٹھکانا چھٹ گیا
آہ زور ناتوانی یہاں تلک مجھ پر ہوا — گاہ گاہے کا بھی اس کوچہ کا جانا چھٹ گیا
سرسری بھی مجھ سے وہ ملتا نہیں آکر کبھو — آہ جس کے واسطے سارا زمانہ چھٹ گیا

ٹک دور سے بھی ادھر نہ دیکھا ہم مر گئے تم نے پر نہ دیکھا
گو دید کیا جہان کو پر کب لطف اسی کہیں گر نہ دیکھا
دم آنکھوں میں آگیا پہ تو نے یکبار بھی رحم کر نہ دیکھا

کیونکر گندھے گی مجھ سے بھلا زلف پیچدار بالوں کے کھولتے ہی مراجی بکھر گیا

نگہ ناز سے دیکھا جو ادھر اُس نے ٹک دل سے نکلی یہ صدا ہائے مرے تیر لگا
ایک عالم ترے دیدار سے یاں حیراں ہے اے مری جان تو کیوں دیکھنے تصویر لگا

آج اُس بزم میں ٹھہرا تو ہے جانا اپنا جی دھڑکتا ہے دلے دل ہے دوانا اپنا
نہیں ملنے کے ترے کوچہ میں جوں نقش قدم خاک میں ہم کو ہے منظور ملانا اپنا

کرنے نہ دیا ٹک تری آنکھوں کا نظارہ اس تیر نظر نے تو مجھے مفت ہی مارا
سب پھول جلے رشک سے بلبل کے اڑے ہوش جامہ جو ذرا باغ میں اس گل نے اتارا
جس شخص کے باعث سے ہوئے سیکڑوں دشمن صد حیف کہ وہ ہی نہ ہوا دوست ہمارا

نے فقط ہیکل کا لچھا دل کو الجھائے گیا جان بھی بلکہ ترے بالے کا جھومکا لے گیا
شمع رو پھیکے نظر آتے ہیں اے خورشید رو نور ان دونوں کے منھ سے کس کا جلوا لے گیا

بے اختیار دوڑ کے اس سے لپٹ گئے اس فرط شوق نے ہمیں کیا بے ادب کیا
اس مضطرب کا رات کو احوال دیکھئے جس نے کہ اپنے روز کو مر مر کے سب کیا

اے بخت تیرہ آگ لگے تجھکو آج پھر غیروں کے گھر وہ روشنی انجمن گیا

عرصۂ عمر بہت کم ہے ولا گل کی طرح چمن دہر میں دن کاٹ تو ہنسکر اپنا

سر اپنا ڈھانپ لے ہے وقت شام اے حسن | خدا کے واسطے یہ زلف مشکناب چھپا
سوتا ہے میرے ساتھ وہ مہ ای شب وصال | دامن سے اپنے آج تو روئے سحر چھپا

پیارے کبھو کبھو تو کیا کر نگاہِ لطف | یا دل لیا نکر کسی خانہ خراب کا

ہے یاں تلک تو نزاکت گلوں کے گجروں سے | کچلنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا
قفس سے چھٹنے کی امید ہی نہیں افسوس | حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

ہمیں تو دو کہتے رہتے تھے تم میاں افسوس | یہ کہیئے آپ کا دل دیکے امتیاز رہا

نازک دلی میں کیا کہوں اس سرو ناز کی | چٹکی جو ٹک بجائی کسی نے دہل پڑا

کیا گلہ اس کی بیوفائی کا | کچھ بھروسہ ہے آشنائی کا
وصل میں چین کب رہا مجھکو | دل کو دھڑکا رہا جدائی کا

کچھ یاد کر کے ہم بھی گلشن میں خوب روئے | آباد گر کسی کا واں آشیان دیکھا

پھنسا زلفوں کا تیرے آج تک چھوٹا نہیں ظالم | کبھو نکلا نہیں ڈوبا تری چاہ زنخدان کا
تجھے غش آ گیا آنکھوں کے آگے برق سی چمکی | سر دیوار رکھکر ہاتھ وہ چنچل جو ٹک جھانکا

ساقیا کل زور کیفیت سے میں متانہ تھا | تھے لبوں میں اُسکے لب اور ہاتھ میں پیمانہ تھا
کیا بلا آنکھوں میں تیرے سحر ہے یک بھر نظر | تونے جس عاشق کو دیکھا بس وہیں دیوانہ تھا

دل صد چاک پہ کر ایک نظر بہر خدا | گو کہ اس تیر کے لائق یہ نشانہ نہ رہا
سوز حرماں سے جلا دل تو بلا سے پیارے | پر یہ غم ہے کہ ترے غم کا ٹھکانا نہ رہا

نزع میں زرد تھا رُخِ افسوس　　چنپئی رنگ نے اُسے مارا

نے خُلق تجھ میں ہے نہ مروت نہ تک وفا　　حیرت میں ہوں کہ دل تری کس بات پر گیا

چھلا تری انگشت کا آجائے اگر ہاتھ　　بھولے سے نہ لوں نام سلیماں کے نگیں کا

مجھکو کل بھا گئی شمیم صبا　　اس میں کچھ میل تھا تری بو کا

ٹک ہلا ہونٹ اے مسیح نفس　　تیرا بیمار رہا جاں بلب ہے اب
سانس لیتا ہوں میں بدشواری　　طاقت آہ مجھ میں کب ہے اب

مت بیٹھ وقت نزع تو یاں آکے میں بہت　　الفت نکر تو آہ دم واپسیں بہت
یہ کون جانے جھوٹ ہے یا سچ ولیک آج　　اس کم سخن نے پیار کی باتیں تو کیں بہت
دشنام سیکڑوں سنے یا گالیاں ہزار　　پر اُسکے منھ کی میں نے بلائیں تو لیں بہت

اے عندلیب آتش گل سے پناہ مانگ　　گو ہے چمن کے بیچ ترا آشیاں بلند
افسوس دل جلے کی خدا خیر ہی کرے　　اس کی گلی میں آج ہوا ہے دھواں بلند

نظر لگ جائے گی اس گل کو نرگس　　نہ دیکھ اس طرح اپنی آنکھ کر بند

کیا جانے یہ آہ ہے کہ کیا ہے　　کچھ آگ سی آئی ہے زبان پہ

اغیار ادھر ہی تک رہے ہیں　　دیکھیں تجھے کس طرح بلا کر

مطرب نہ بجا ساز نہ تکلیف کر اتنی　　رو دینے کو بس ہے ہمیں اک تار کی آواز

وہ رشک ماہ تو اس شب ہی مجھ پاس　　ٹک اک ٹھم ٹھم کے اے چرخ کہن چل

اے آفتاب صبح کو تو اُسکے منھ نہ چڑھ　　ایسا نہ ہو کہ ہو کہیں وہ مست خواب گرم

پھر نہ آویں گے کبھی بزم میں تقصیر ہوئی　　غصہ کاہے کے تئیں کرتے ہو لو جاتے ہیں
ہوش میں آتے ہیں ای یار اگر ہم گاہے　　تو ترے کوچہ میں ٹک آن کے رو جاتے ہیں

بزم میں اسکے نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں　　چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا مُنھ تکتے ہیں
آتشیں اشک سے یہ دیدۂ تر جلتے ہیں　　دیکھ لو مردم آبی کے بھی پر جلتے ہیں

کیا فائدہ جو پوچھیے احوال دل افسوس سے　　منھ دیکھ رو دیتا ہے وہ پر بات کچھ کہتا نہیں

سر کے ہے ذرہ ذرہ کرے ہے نہیں نہیں　　کس چوچلے سے آئے ہے میرے کنار میں

نالہ و فغاں گریہ و زاری ہم نے تجھ بن کیا نہ کیا　　مرنا اک باقی ہے پیارے سو وہ اپنے ہاتھ نہیں

بیتاب بہت ہوں آج یارو　　ٹک لیچلو اس کے پاس مجھکو

یہاں جلنے کو یارو ایک داغ بیکسی بس ہے　　چراغ و شمع کی حاجت نہیں گور غریباں کو

دیکھتے ہی اُسے حاضر ہوئے مرجانے کو　　وہ ہی غمخوار جو یاں آئے تھے سمجھانے کو
جھڑکیوں کا ترے انداز ہر اک کیا جانے　　جی سمجھتا ہے ترے ناز سے جھنجھلانے کو

ہوئی ہے اس قدر حالت مری ابتر ترے غم میں　　کہ رو دیوے ہے ہر اک دوست دشمن دیکھکر مجھکو

نکل کرتن سی جان منتظر آنکھوں میں پھرتی ہی جواب بھی آئے تو دیکھ لیویں اک نظر تجھکو

چھچہے میرے قفس پاس نکر اے بلبل جی نکل جائے گا میرا تری آواز کے ساتھ
شب مہتاب میں سینے سے لگ جا گلے میں ڈال کر اے ماہرو ہاتھ

کرتا ہوں طلب بوسہ جو اس سی تو پھر امنھ کہتا ہے وہ ہنس ہنس کے بہ تکرار اجی واہ

جو دم ہے داہ وا ہے مند جائیں گی پھر آنکھیں ٹک دید اور کر ہیں اس گلشن جہاں کی
کب سیر کی چمن کی کس وقت لی اجازت تیوری چڑھی ہی دیکھی نت ہم نے باغباں کی

دیدہ کی کرکے ایکدم باغباں اٹھ جاوں گا اور کچھ مطلب نہیں ہے اس گلستاں سی مجھے

دوستوں کے بیچ چل جاتی ہیں تلواریں دلا ناز سے ٹک اس کے ابرو کا جو خم چڑھ جائے ہی

اے مست شراب حسن و خوبی ٹک ہم کو بھی انکھڑیاں دکھالے
کیونکر کوئی جی بچائے اس سے جو آنکھ ملائے مار ڈالے

طرز صحبت ہے لگاوٹ نکروں گر اس سی تو وہ رہ رہ کے ہر اک بات پہ جھنجھلاتا ہے

آہ اے بخت زبوں سعی تجسس کے بیچ جان بھی جاتی رہی لیک نہ جاناں سی ملے

جتنے بیٹھے تھے اس گلی کے بیچ اپنے زانو پہ سر جھکائے تھے
کھینچے مت نگاہ قہر۔ چلے بس تمھیں دیکھنے ہی آئے تھے
کل کی نسبت تو حضرت افسوس آج ٹک ہوش میں کچھ آئے تھے

لیک پڑھتے تھے بس یہی اک بیت　　آنسو آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے
اے ستمگار تجھ سے کیا ہم نے　　جان کھونے کو دل لگائے تھے

چڑھ کے کوٹھے پہ ذرا دیکھ تو دیوار تلے　　کوئی جی توڑے ہے ظالم تری دیوار تلے

تیرے سر صدقے ہوا افسوس گو بسمل ہوا　　تو نے پچھتا کر عبث شمشیر کے ٹکڑے کئے

احوال دوست پوچھئے افسوس کس سے جا　　قاصد پھرا نہ ایک بھی اسکے دیار سے

اسکے ملنے کی ٹک نہیں اُمید　　کس طرح دل کو آج کل آئے

نہیں یاد چمن صیاد یکسر گلستاں بھولے　　قفس میں جی لگا ایسا کہ اپنا آشیاں بھولے

دیدۂ گریاں نے ٹک فرصت نہ دی ناچار ہو　　رکھدیا میں کاغذ تحریر اپنے ہاتھ سے

روز محشر تلک جو صبح نہ ہو　　سو وہ یار و شب جدائی ہے

دکھلا گیا وہ نزع میں اپنے تئیں مجھے　　دکھ دے گیا یہ اور دم واپسیں مجھے
یہ ہو گیا ہے حال ترے غم سے اندنوں　　روتے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ہمنشیں مجھے
میں منھ وہاں ہر ایک کا چپکا تکا کیا　　جس تس نے آہ سیکڑوں باتیں کہیں مجھے

کیا تو نے لکھا تھا کہ مرے خط کے تئیں دیکھ　　آنسو لگے افسوس کی آنکھوں سے ٹپکنے

کیا عشق پھر ہوا ہے تجھے افسوس اندنوں　　چہرہ اتر گیا ہے ترا رنگ زرد ہے

دل کی دل ہی میں رہ گئی حیرت کے باعث وصل میں
کچھ نہ اس سے کر سکے گفتار منھ دیکھا کئے

تونے جانا منھ پھرا بیٹھا ہے لیکن ہر گھڑی
ہم انکھیوں سے ترا اے یار منھ دیکھا کئے

یارو اب کیا کروں میں آہ کدھر کو جاؤں
مجھ سے وہ شوخ سر راہ جدا ہوتا ہے

روتے روتے عمر گزری کلبۂ احزاں کے بیچ
غیر اس دل کے کسی نیں تری غمخواری نہ کی

سو طرح اس سے کہوں درد دل اپنا لیکن
دیکھ کر اس کو اگر کچھ بھی مجھے ہوش رہے

قیامت لگاوٹ ہے آنکھوں کے بیچ
جسے مڑ کے دیکھا لگائے چلے

جو معشوق اس سے جدا ان رہے
نہ مرجائے عاشق تو پھر کیا کرے

جلتے جلتے ہی کٹ گئی سب عمر
ہم نے جوں شمع زندگانی کی

جو غم میں تھے انیس وہ غمخوار کیا ہوئے
تنہا پڑا ہوں ساتھ کے سب یار کیا ہوئے

فصل خزاں میں رو رو یہ کہتی ہیں بلبلیں
کرتے تھے سیر جس میں وہ گلزار کیا ہوئے

نالہ میں اب قفس میں اکیلا کروں ہوں آہ
کیا جانیے کہ اور گرفتار کیا ہوئے

زندگی کی مجھے اُمید نہیں
اس قدر دل کو بیقراری ہے

اُس کے کوچہ میں دل کو کھو بیٹھے
زیست سے نا اُمید ہو بیٹھے

کہوں اپنی خرابی کیا عزیز جس کا عاشق ہوں
وہ ظالم ہائے میرے نام سے بھی ننگ رکھتا ہے

قتل افسوس کو کیا تو نے
اے ستمگر یہ کیا کیا تو نے

سامعہ سے دل تک

انسان کی اکثر عزیز ترین چیزیں وہی ہوتی ہیں جو اکثر اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں

ایک انسان اپنی پسند کی چیز کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک بہت سی ناگوار باتوں کو برداشت نہ کرے

حُسن سب سے پہلی نعمت ہے جو فطرت ایک عورت کو عطا کرتی ہے اور یہی وہ اولین نعمت ہے جسے وہ سب سے پہلے چھین لیتی ہے۔

ایک شخص اگر دشمن سے انتقام لیتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بھی ویسا ہی ہو گیا۔

انسان کی مسرت اس سے وابستہ نہیں جو جیب میں ہے بلکہ اس سے جو قلب میں ہے

جب انسان کی صحت کھونے لگتی ہے تب اس کی حفاظت کی فکر ہوتی ہے۔

جب تک دولت رہتی ہے ایک انسان کو خائف رکھتی ہے اور جب وہ غائب ہو جاتی ہے تو رنجیدہ بنا کر جاتی ہے۔

آنکھ کی آسودگی، معدہ کی آسودگی سے زیادہ دشوار ہے۔

اگر تم مسرور نہیں ہو، تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تم وہ چیز طلب کرتے ہو جو تمھاری نہیں ہے اور اُس کو بھول جاتے ہو جو تمھارے پاس ہے۔

ایک شخص کا مرنا اس حال میں کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے دولت چھوڑ جائے اس جینے سے بہتر ہے جس میں وہ اپنے دوستوں کا محتاج رہا ہو۔

صحافت کی آزادی مطالعۂ انسانی کا حق ہے نہ کہ تحریر و انشاء کا

تھوڑی چیز قائم رہنے والی اس بہت سی چیز سے بہتر ہے جو جلد فنا ہو جانے والی ہے

اعتبارات

"کیا یہ آسمان و زمین، یہ وسیع کائنات، یہ بیشمار مخلوق، اور یہ نظام عالم آپ ہی آپ وجود میں آگیا؟ سورج کا روز ایک مقررہ وقت پر نکلنا، موسموں کا مخصوص حالات کے ساتھ رونما ہونا، چاند کا یکساں طور پر گھٹنا بڑھنا اور اسی طرح کے تمام نوامیس طبعی و مظاہر فطرت کیا اس امر کی دلیل نہیں کہ ان سب کا پیدا کرنے والا اور سنبھالنے والا کوئی اور ہے ——— کیا ممکن ہے کہ کوئی چیز بغیر خالق کے اپنے آپ پیدا ہو جائے، کیا عقل انسانی باور کر سکتی ہے کہ دھواں اُٹھے اور آگ کا وجود نہ مانا جائے"

——— یہ تھا خلاصہ ان دلائل کا جو ایک عالم دین کسی ملحد کے سامنے بیان کر رہا تھا ———

میں ان دلائل کو سنکر ایک خاص قسم کے ایقان کی روشنی دل و دماغ میں محسوس کر رہا تھا اور خوش تھا کہ ملحد ان دلائل کی تردید کبھی نہیں کر سکتا ———

اُس نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا اور بولا ——— "اگر یہ تمام چیزیں، یہ جملہ کیفیات از خود پیدا نہیں ہو سکتیں اُن کے خالق کا تصور اس لئے ضروری ہے کہ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا یقین لازم ہے تو بتائیے کہ خدا کو کسنے بنایا اور وہ از خود کیونکر پیدا ہو گیا" ——— عالم دین نے یہ سنکر کہا کہ "اے بیوقوف، تو بالکل نہیں سمجھتا - خدا تو ازلی و ابدی ہے، اس کو کسی نے نہیں بنایا، بلکہ اس نے سب کو بنایا ہے اس لئے تیرا یہ اعتراض بالکل غلط ہے"۔ ملحد نے کہا کہ "خوب جو آپ کا دعوےٰ ہے وہی آپ کی دلیل ہے - اگر آپ کسی کو از خود پیدا ہونے والا مان سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کائنات کو ایسا نہ مانیں اور اگر کائنات کے لئے یہ ممکن نہیں تو پھر خدا کے لئے اس کا امکان کیوں ہو؟"

میں یہ سنکر غصہ سے بیتاب ہو گیا اور عالم دین سے مخاطب ہو کر بولا "حضرت، یہ شیطان ہے اس سے گفتگو نہ کیجئے - لاحول پڑھیئے اور کہدیجئے کہ ہم نے خدا کو بلا کسی دلیل کے پہچانا ہے"۔ ملحد یہ سنتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہتا ہوا چلدیا کہ :-

"اگر بے دلیل کسی بات کا ماننا کوئی حقیقت ہو سکتی ہے تو دلیل کے ساتھ کسی بات کو نہ ماننا اور زیادہ حقیقت ہے"۔

عالم دین نے مجھے دیکھا اور کہا ——— "معاذ اللہ، شیطان بھی کس کس طرح انسان کو بہکاتا ہے"۔

میں خاموش دیر تک سوچتا رہا کہ "عقل انسانی بھی دنیا میں کتنی بڑی گمراہی ہے"۔

باب الاستفسار

کلیلہ و دمنہ

(جناب سید برہان الدین صاحب مغلپورہ۔ ہانسی)

کیا آپ مہربانی فرماکر بتا سکتے ہیں کہ کلیلہ دمنہ سب سے پہلے کب اور کس زبان میں لکھی گئی اور پھر کن کن زبانوں میں اس کے ترجمے کئے گئے۔ میں ایک کتاب ہند قدیم کی ادبیات پر لکھ رہا ہوں اور اس سلسلہ میں مجھے ان معلومات کی ضرورت ہے۔ ممنون ہونگا۔

(نگار) اس موضوع پر ُسی براکلمین کا لکھا ہوا تفصیلی مقالہ ملاحظہ فرمایئے جو انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں شائع ہوا ہے۔ مختصراً میں عرض کئے دیتا ہوں۔

یہ کتاب سب سے پہلے سنسکرت زبان میں لکھی گئی اور کلیلہ۔ دمنہ دونوں بگڑی ہوئی صورتیں ہیں اصل سنسکرت الفاظ کرٹکا اور دمنکا کی (یہ نام تھے دو گیدڑوں کے)۔ سُریانی زبان میں جو ترجمہ ہوا ہے اس میں یہ دونوں نام کلیلاگ اور دمناگ ہوگئے ـــ سنسکرت سے پہلا ترجمہ پہلوی زبان میں ہوا، اس کے بعد عربی میں اور پھر اسلامی و عیسوی ادبیات میں ہر جگہ یہ کتاب مشہور ہو کر مختلف زبانوں میں منتقل ہوئی۔

یہ کتاب سب سے پہلے سنسکرت زبان میں بمقام کشمیر سنہ ۳۰۰ء میں لکھی گئی تھی۔ اس کا مصنف کوئی وشنو ئی برہمن تھا جس کا نام اب تک متحقق نہیں ہو سکا۔ یہ کتاب امراء و شاہزادگان کی تعلیم و تربیت کے لئے لکھی گئی تھی اور جانوروں کے فرضی قصوں کے ذریعہ سے اصول جہانبانی بتانا اس کتاب کا اصلی مقصود تھا۔ سنسکرت کی دو مشہور کتابیں تنترا خیائیکا اور پنچ تانترا، اسی کتاب کی دو مختلف صورتیں ہیں۔

پنچ تانترا کا پہلوی زبان میں سب سے پہلا ترجمہ خسرو انوشیرواں (۵۳۱ - ۵۷۹) کے زمانہ میں ہوا۔ مترجم کا نام برزوی تھا، یہ دربار کا طبیب تھا اور محض اسی کام کے لئے ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ برزوی نے اس میں چند اور قصوں کا بھی اضافہ کر دیا جو ہندوستان ہی میں اس نے سنے تھے۔ اس کا دیباچہ خود اس نے لکھا تھا۔

بُرزوی کا یہ ترجمہ معدوم ہو چکا ہے لیکن اس سے جو ترجمہ سریانی زبان میں ۵۷۰ء کے قریب بیر وددت بُود نے کیا تھا اُس کا ایک نسخہ ضرور اب بھی پیرس میں پایا جاتا ہے۔

اس کے تین صدی بعد عبداللہ بن المقفع نے بُرزوی کے ترجمہ کو عربی میں منتقل کیا اور تھوڑا بہت اضافہ بھی اپنی طرف سے کیا۔ ابن المقفع کا یہ ترجمہ حقیقتاً ادبی خوبیوں اور اشارعالیہ کا بہترین نمونہ تھا جسے صرف خواص کے طبقہ تک محدود رہنا چاہئے تھا؛ لیکن موضوع اس قدر عام پسند تھا کہ ہر طبقہ و جماعت میں اسکی شہرت ہوگئی اور نقل و روایت کی عمومیت نے اس کو بڑی حد تک غارت کردیا۔ چنانچہ اس وقت عربی زبان میں جو ترجمے اس کے پائے جاتے ہیں ان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ ابن مقفع کے اصل نسخہ سے کتنا انحراف ان میں کیا گیا ہے۔

ابن مقفع کا ترجمہ تین مرتبہ عربی نظم میں لایا گیا۔ پہلی مرتبہ تو ابن مقفع کے ہمعصر ابان اللاحقی نے کیا جو اب ناپید ہے۔ دوبارہ ۱۱۰۰ء میں ابن الہباریہ نے کیا، تیسری بار "دُرّالحکم" کے نام سے عبدالمومن نے ۱۲۴۲ء میں کیا۔

دسویں یا گیارہویں صدی میں ابن مقفع کے ترجمہ کو ایک سریانی زبان کے عالم نے سریانی میں منتقل کیا ہرچند اس نے اس میں عیسوی رنگ پیدا کیا اور ترجمہ میں بھی غلطیاں کیں، لیکن چونکہ اس نے ایسے نسخہ سے ترجمہ کیا تھا جو ابن مقفع سے قریب تر عہد کا تھا، اس لئے اس کی اہمیت نقادانِ فن کے نزدیک بہت ہے۔

شاہنامہ میں فردوسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن المقفع کا ترجمہ پہلوی زبان میں نصر بن احمد سامانی کے عہد میں (۹۱۴ - ۹۴۳) وزیر بلعمی کے حکم سے کیا گیا تھا؛ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ختم نہیں ہو سکا۔ اسی بادشاہ کے حکم سے رودکی نے بھی اس کو نظم کیا لیکن صرف سولہ شعر اسدی کے لغات فرس میں نظر آتے ہیں۔

ابن مقفع کا ترجمہ فارسی نثر میں ۱۱۴۲ء کے بعد نظام الدین ابوالمعانی نصراللہ نے کیا تھا اور بہرام شاہ فرمانروائے غزنہ کے نام معنون کیا گیا تھا۔ اسی ترجمہ کو احمد بن محمود الطوسی قانعی نے نظم کرکے سلطان عزالدین کیکاؤس (۱۲۴۴ - ۱۲۶۳ء) کی خدمت میں پیش کیا۔ اور پھر نظرثانی کے بعد ملا حسین واعظ کاشفی (۱۵۰۴ء) نے جو حسین بیقرا (والی ہرات) کا واعظ دربار تھا وزیر احمد سہیلی کے نام پر انوار سہیلی کے عنوان سے پیش کیا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اس کا ترجمہ دنیا کی تمام زبانوں میں کیا گیا۔ لیکن چونکہ انوار سہیلی کی عبارت وانشار بہت دقیق و مشکل تھی اس لئے شہنشاہ اکبر نے ابوالفضل کو

ور کیا کہ وہ دوبارہ اس کو مرتب کرے، چنانچہ عیار دانش کے نام سے ۱۵۷۸ء میں دوسرا ترجمہ پیش کیا گیا
ا میں ابن مقفع اور بُرزوی کے اصل دیباچے بھی شامل تھے، مگر یہ کتاب شایع نہ ہوسکی۔

ترکی زبان میں بھی ابن مقفع کا ترجمہ دو بار منتقل کیا گیا لیکن نصر اللہ کے ترجمۂ فارسی سے۔ قدیم
ن میں بھی ایک شخص مسعود نامی نے اس کو منتقل کیا۔ اس کے بعد یہ منظوم بھی ہوا اور سلطان مراد اول کے
منے پیش کیا گیا۔ حال کی ترکی نثر میں بھی اس کو منتقل کیا گیا اور غالباً ۱۵۴۸ء سے کچھ زمانہ قبل علی بن صالح
لی چلپی نے انوار سہیلی کا ترجمہ مقفیٰ عبارت (ترکی) میں کیا اور ہمایوں نامہ کے نام سے سلطان سلیمان اول
سامنے پیش کیا۔ اسی ہمایوں نامہ کا ترجمہ بعد کو فرانسیسی، جادی، ملائی زبانوں میں ہوا، کہا جاتا ہے
ہمایوں نامہ بہ لحاظ حسنِ انشار کے انوار سہیلی سے بدرجہا بہتر تھا۔

ابن المقفع کی کتاب کا ترجمہ عربی سے ترکی میں عبد الغلام فیض خان اوغلو نے بھی کیا تھا جو ۱۸۸۹ء میں
ام قازان شایع ہوا۔

مغولی زبان میں بھی ملک افتخار الدین محمد بن ابی نصر نے اس کا ترجمہ کیا، لیکن اب وہ معدوم ہے، اسی
ح جبشی زبان کا ترجمہ بھی اب نایاب ہے۔

عبرانی میں اس کا ترجمہ ربی جوئیل نے کیا تھا اور ابن مقفع کے نہایت قدیم نسخہ کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا۔ اس کے
ربی جوئیل کا ترجمہ لاطینی اور ہسپانی زبانوں میں کیا گیا۔ گیارہویں صدی کے اخیر میں یونانی زبان میں بھی
کا ترجمہ کیا گیا لیکن براہ راست ابن مقفع کے نسخہ سے۔

عہد اکبری میں مفرح القلوب کے نام سے تاج الدین نے جو ترجمہ پیش کیا وہ پنچ تانترا کے ترجمۂ سنسکرت
پادیشلے سے کیا گیا تھا۔ اسی مفرح القلوب کو میر بہادر علی حسینی نے ۱۸۰۲ء میں ہندوستانی یا اردو زبان
منتقل کیا۔ اس کے ایک سال بعد گل کرائسٹ نے اسی کو اخلاق ہندی کے نام سے مرتب کر کے پیش کیا۔

ملائی زبان میں جو کتاب "حکایات کلیلہ ودمنہ" کے نام سے پائی جاتی ہے وہ ابن مقفع کی کتاب
پنچ تانترا کے تامیلی ترجمہ دونوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی۔

ابن مقفع کی کتاب کو سامنے رکھ کر تین اس طرح کی اور کتابیں لکھنے کی تین بار کوشش کی گئی۔ لیکن
یابی نہ ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ کلیلہ ودمنہ دنیا کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو شہرت و قبول کے
ئی درجہ تک پہونچیں اور کرۂ ارض کی تمام زبانوں میں جن کا ترجمہ ہوا۔

یہاں وہاں سے

لغزش قدم:-

شوبان، ایک تاجر کے دفتر میں ملازم ہے - آدمی خوش قد، خوش ادا ہے اور ان تمام خصوصیات سے آراستہ جو ایک عورت کو اپنی طرف مائل کرسکتی ہیں۔

ایک شام حسب معمول دفتر سے نکل کر جلدی جلدی چلنے لگا تاکہ اسٹیشن پہونچکر سب سے پہلی گاڑی پر سوار ہوکر اپنی قیام گاہ کو واپس جاسکے۔

ٹھیک اس وقت جبکہ وہ اسٹیشن کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا ایک نوجوان لڑکی زینہ سے پھسلی اور اُس نے زور سے چیخ ماری - شوبان نے بڑھکر اسے سنبھالا اور پوچھا کہ چوٹ تو نہیں آئی اس نے کہا "نہیں" اور اُس کے بازو پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالے ہوئے ریل کے ایک کمرہ میں بیٹھ گئی۔

رفتہ رفتہ یہ مراسم بڑھتے گئے اور آخرکار دونوں نے شادی کا عہد وپیمان کرکے ایک ہی جگہ زندگی بسر کرنی شروع کردی —— یہ لڑکی کپڑا سینے کے کارخانے میں ملازم تھی کچھ دن گزرنے کے بعد شوبان نے محسوس کیا کہ باہم تعلقات محبت کم ہوتے جاتے ہیں اور لوسی نے بھی شوبان کی بے اعتنائی کو محسوس کرکے آخرکار ایک دن اس سے صاف صاف پوچھا کہ یہ کیا بات ہے - شوبان نے جواب دیا "واقعہ یہ ہے کہ میں جس جذبہ کو محبت سمجھتا تھا وہ محبت کا جذبہ نہ تھا بلکہ کچھ اور تھا" - لوسی نے یہ سنکر فوراً اس کے کمرہ سے اپنا سامان سنبھالا تاکہ اپنی ماں کے گھر جا کر رہے۔

وہ اپنا سامان لئے اسٹیشن کی سیڑھی سے گزر رہی تھی کہ اُس کا قدم پھسلا اور ایک اور نوجوان نے بڑھکر اُسے سنبھالا اور نہایت الفت وہمدردی سے پوچھا کہ "چوٹ تو نہیں آئی"
اس نے کہا "نہیں" اور اس کے بازو پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالے ہوئے ریل کے ایک کمرہ میں بیٹھ گئی۔

یہ بھی کوئی بات تھی:-

لوسیا، ۱۸ سال کی نوجوان لڑکی تھی اور کافی قبول صورت - لیکن نہایت ہی خاموش ومتین بلکہ ایک

حد تک مغرور و متکبر تھی۔ نہ کسی سے بات کرتی تھی اور نہ کسی بزم میں آزادی کے ساتھ شریک ہوتی۔ اسکے والدین نے بہت نصیحت کی کہ یہ عادت خراب ہے اور اس کے مستقبل کو تباہ کر دینے والی ہے لیکن اسپر کوئی اثر نہ ہوا۔

اتفاقاً ایک جلسۂ رقص میں اس خاندان کو جانا پڑا۔ لوسیا کے والدین بہت متفکر تھے اور ڈر رہے تھے کہ سوسائٹی میں لوسیا پر ہر طرف سے اونگلیاں اٹھیں گی اور انھیں شرمندگی اٹھانا پڑے گی، لیکن دفعتہً ایک شخص اس جلسہ میں سے اُٹھ کر آیا اور لوسیا سے چند باتیں کرنے کے بعد اس کو اپنے ساتھ رقص کے لئے لے گیا۔ لوسیا بہت مسرور نظر آتی تھی اور مسکرا رہی تھی!

لوسیا کا مسکرانا اس کے والدین کے نزدیک دنیا کا عجیب و غریب واقعہ تھا۔ اس کی ماں نے اپنے شوہر سے کہا ۔"حقیقت یہ ہے کہ لوسیا تو فرشتہ ہے اس میں فرشتے کے سے اخلاق ہیں، لیکن اس وقت اس کا کوئی سمجھنے والا نہ ملا تھا"۔ شوہر نے کہا ۔"تم سچ کہتی ہو، آج مجھے کتنی مسرت ہے کہ لوسیا کی حقیقت سے آخر کار پردہ اُٹھکر رہا"۔

جب رقص ختم ہوا تو وہ اجنبی لوسیا کو لیکر آیا اور اُس کے والدین سے کہا کہ" اس لڑکی میں تو فرشتوں کے سے اخلاق ہیں"

ماں نے کہا ۔"یہ سب آپ ہی کی عنایت ہے کہ لوسیا میں دفعتہً ایسا عجیب و غریب انقلاب پیدا ہوا، حقیقت یہ ہے کہ آپ اس فن کے بڑے ماہر معلوم ہوتے ہیں ۔

اجنبی نے کہا ۔" مجھے آپ کی بیٹی کو رام کرنے میں مطلق کوئی زحمت نہیں ہوئی، اور نہ مجھے اس میں کوئی حیرت کی بات معلوم ہوتی ہے"

ماں ——"اس میں شک نہیں کہ تم اس فن کے بڑے جاننے والے ہو ایک ہی نگاہ میں لوسیا کی نطرت بدلدی ——"

اجنبی ——"یہ بھی کوئی بات تھی، میں روز یہی کرتا ہوں اور یہی میرا پیشہ ہے"

یہ سنکر وہ حیران ہوئے اور اُس سے پوچھا "آپ کیا کام کرتے ہیں"؟

اس نے نہایت خشک منھ سے جواب دیا کہ" میں جانوروں کے سدھانے کا کام کرتا ہوں"

اپنی ڈاک کا انتظام کیجئے | یہاں سے ہر خریدار کے نام رسالہ نگار پابندی وقت کے ساتھ کئی بار فہرست خریداران کا مقابلہ کرنے کے بعد روانہ کیاجاتا ہے۔ اس لئے اگر رسالہ کسی صاحب کو نہیں پہونچتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کی ڈاک کا انتظام درست نہیں۔ مینجر نگار لکھنؤ

انسان اور کائنات

مسکرائی نشاط کی دیوی — لی عروسِ سحر نے انگڑائی
خونِ تازہ رگوں میں دوڑ گیا — پیکرِ زندگی میں جان آئی
چھٹ گئے رات کے سیہ بادل — برقِ انوارِ صبح لہرائی
ہلکی ہلکی تجلیوں کا سماں — حسنِ پنہاں کی جلوہ آرائی
دھیمی دھیمی صدائے موجِ نسیم — سازِ فطرت کی نغمہ پیرائی
سبز پودوں کی دلپذیر لہک — زندگی، روح، کیف، برنائی
سرد چشموں کا دلفریب خرام — تازگی، حسن، عیش، رعنائی
کوبکو جاں نواز و نشہ فروش — عشرتِ دورِ جامِ صہبائی
چہچہے طائروں کے روح فزا — چمن آرا گلوں کی زیبائی
پتے پتے میں دفترِ اسرار — ذرے ذرے میں درسِ بینائی

دیکھ کر یہ بہارِ جلوۂ رنگ
تازہ ہونے لگی فسردہ امنگ

میں نے گیتی سے یہ سوال کیا — اے سراپا جمالِ عشرت و ناز
جو ہماری نظر میں ہے انجام — ہے وہی تیرا نقطۂ آغاز
کون پیتا خوشی سے جامِ فنا — زندگانی ہے اک ترا اعجاز
جانفزا تیری شام کا منظر — دلکشا تیری صبح کا انداز
کس نے پایا ترے کمال کا بھید — کس نے سمجھا ترے زوال کا راز

مہر رخشاں ترے چمن کا گلاب　　　ماہِ روشن تری جبیں کا طراز
ہے تری سطح کس قدر ہموار　　　بہ ہمہ وسعتِ نشیب و فراز
پھر مجھی پر ستم ہیں کیوں اتنے　　　دلشکن، صبر سوز، روح گداز
میری ہستی بھی کوئی ہستی ہے　　　نہ حقیقت کہیں جسے نہ مجاز
ہوں رہینِ غم شکستہ پری　　　نہ تحمل، نہ طاقتِ پرواز

سن کے میری زبان سے یہ سخن
پڑ گئی دہر کی جبیں پر شکن

پہلے دیکھا نگاہِ حیرت سے　　　مجھکو دنیا نے پھر دیا یہ جواب
اس قدر سطح بیں، خدا کی پناہ　　　باوجود نگاہ رہنِ حجاب!!
تیری مے سے ملا فروغ مجھے　　　میں ہوں اک ورنہ، خاکدان خراب
ذرہ ذرہ ترا مہ و خورشید　　　میرے چہرے پہ تیرگی کا نقاب
خاک سے تیرہ تر ہے میری نمود　　　زہر سے تلخ تر ہے میری شراب
میں سراپا ملالِ تشنہ لبی　　　تیرے ساغر میں لرزشِ مئے ناب
تجھسے رخشاں مری فضائے جمال　　　تجھسے روشن مری جبینِ شباب
میں طرب ناشناس تو سرشار　　　میں خذف تو ہے گوہرِ نایاب
شام تیری مسرتوں کا چمن　　　صبح تیری تجلیوں کا شباب
قلب تیرا امینِ سترِ ازل　　　اور میں کم سواد محفل خواب

جا رہا ہے کدھر خیال ترا
تازِ کونین ہے جمال ترا

علی اختر (حیدرآباد دکن)

زندگی

دل کی دھڑکن میں دل کی حدت میں
شعلہ ہائے جنوں کی شدت میں
روح کی حشر خیز آہوں میں
موت کی آتشیں نگاہوں میں
زندگی کا شرار لرزاں ہے
جذبۂ بیقرار لرزاں ہے
برق سوزاں کا التہاب ہے کیا
موج دریا کا اضطراب ہے کیا
بزم انجم کی روشنی کیا ہے
چاندکی مست چاندنی کیا ہے
جوشش احساس کامرانی ہے
یعنی اُٹھتی ہوئی جوانی ہے
مہر تاباں کی تیز کرنوں کا
آگ کے حشر خیز شعلوں کا
وحشت آلود برق و باراں کا
خشمگیں اور تند طوفاں کا
زندگی پر اثر نہیں ہوتا
خوف کا واں گذر نہیں ہوتا

زندگی آتشیں نواؤں کا
زندگی سرمدی صداؤں کا
ایک وحشت نواز پیکر ہے
شعلہ افشاں مہیب اژدر ہے
زندگی جب زباں ہلاتی ہے
موت کی روح کانپ جاتی ہے
زندگی ایک راز ہے یکسر
موت سے بے نیاز ہے یکسر

باقی صدیقی (سہام)

شعلۂ سینا

اعجازِ تجلی ہے کہ نیرنگِ تماشا
آئینۂ کثرت میں ہے اک جوہرِ یکتا

دل حسن کے پرتو سے ہو احسنِ سراپا
پہلو میں لئے پھرتے ہیں ہم شعلۂ سینا

پیدا تو کرے جوشِ طلب ذوقِ تماشا
ہے خاک کے ہر ذرہ میں اک جلوۂ رعنا

ہوں سرخوشِ کیفیتِ غمخانۂ ہستی
ہیں میرے لئے دیدہ و دل ساغر و مینا

بیگانۂ کونین ہے دیوانۂ الفت
اللہ ری رعنائی فردوسِ تمنا

ساقی کی نظر تھی کہ مئے ہوش ربا تھی
باقی ہی غمِ دوش، نہ اندیشۂ فردا

دینی تھی جلا عشق سے آئینۂ دل کو
ہوتا ہے کہیں داغِ جبیں دیدۂ بینا

ملتے نہیں وہ مجھ سے مگر ہوں میں نظر میں
ناکام نہیں عشق میں، ناکام تمنا

کس رنگ میں ظاہر نہ ہوئے حسن کے جلوے
یہ مان لیا عشق ہی ہر حال میں رسوا

اوروں کا تو کیا ذکر ہے کھو جاتے ہیں ہم بھی
کوکب وہ نظر آتے ہیں ہر بزم میں تنہا

کوکب شاہجہانپوری

رودادِ عمل

سیکڑوں تاریک راتوں کا سکوتِ حشر خیز
رہ چکا ہے مضطرب آنکھوں سے سرگرمِ ستیز

برق کڑکی، قہر ٹوٹا، آسماں تھرا چکے
موت کے بادل مرے سر پر بہت منڈلا چکے

روند ڈالا جراءتِ بیباک نے آلام کو
کر دیا تبدیل طرزِ گردشِ ایّام کو

دل کی وحشت خیزیوں نے حدِ امکاں توڑ دی
نغمۂ تقدیر سے تدبیر کی لے جوڑ دی

قہرمانی قوتیں مغلوب ہو کر رہ گئیں
میرے استغنا کی طوفاں خیز رو میں بہہ گئیں

عزمِ محکم کی قسم! جب طیش میں آتا ہوں میں
برق بن کر موت کے خرمن پہ چھا جاتا ہوں میں

خوگرِ غمہائے دوراں ہوں، ڈروں کس بات سے
حوصلہ مضبوط ہوتا ہے مرا آفات سے

بجلیوں کا سوز خوابیدہ ہے میری ساز میں
التہابِ زیست لرزاں ہے مری آواز میں

ناز کرتا ہے مری ہمّت پہ اقبالِ حیات
میرے نورِ عزم سے تاباں ہیں اعمالِ حیات

عدم

غزلیات

آسی الدنی:۔

نہ خوشی کی خوشی نہ رنج کا ہوش   زندگی موت سے ہے دوش بدوش
شوق بے صبر دل سراپا جوش   یہ بھی ظالم ہے وہ بھی ایذا کوش
ضبطِ غم کا نہیں ہے کچھ حاصل   کون سنتا ہے نغمۂ خاموش
رنج بیمائگی بڑی سنئے ہے   قطرہ قطرہ ہے بحر در آغوش
میری حسرت خروش بمعنی   دل کے ارمان محفل خاموش
اُن سے پوچھے کوئی حقیقت حال   کہتے کہتے جو رہ گئے خاموش
تیرے پردے نے یہ اثر ڈالا   ہوتا جاتا ہے اک جہاں روپوش
ہو چلا ہے جمود سا طاری   پھر پلا جام بادۂ سرجوش
منقلب ہے جہان جانبازی   بیخودی ہے نوید آمد ہوش
غنچے چٹکے کریں گریباں چاک   مل گیا اب تو اذنِ رخصتِ ہوش

ہر طرف سے بہاریں آسی
آرہی ہے صدائے نوشا نوش

شاد صابری:۔

روزِ ازل جبکہ سازِ جلوۂ کامل بنا   ایک نغمہ تھا کہ پردے سے نکل کر دل بنا
سوزِ غم سے ہے نظامِ زینتِ بزمِ جہاں   شعلۂ الفت بھڑک کر رونق محفل بنا
اللہ اللہ جوشِ وحشت کی اثر اندازیاں   ہر قدم مٹ مٹ کے میرا جادۂ منزل بنا
کس نگاہِ ناز سے دیکھا کیا میری طرف   گر کے نظروں سے تری میں رونق محفل بنا
دل کو دے اک زخم پنہانی نگاہ ناز سے   میں کسی قابل نہیں ہوں تو کسی قابل بنا

روح گرداب فنا میں آ نہیں سکتی کبھی
جو حباب بحر ٹوٹا، موجۂ ساحل بنا

کس قدر صبر آزما تھی منزل راہِ وفا
میرا اک اک گام نقش سعیٔ لاحاصل بنا

طرح انداز محبت تھیں نگاہیں قیس کی
جو بگولہ دشت میں اُٹھا وہ اک محمل بنا

غایت لطف و کرم سے کام لو اے حسن دوست
شاد کچھ ذوق نظر کو پردۂ حائل بنا

عابد شاہجہانپوری:—

جام آشنا نظر ہوئی ہر بادہ خوار کی
ڈوبی ہوئی اثر میں فضا تھی بہار کی

آواز بازگشت کو سمجھا تری صدا
یہ حد تھی اضطراب دلِ بیقرار کی

اے دل وداع ہوش کا پیغام آگیا
رعنائیاں فضا میں ہیں جوش بہار کی

جب سامنا ہوا کوئی شکوہ نہیں رہا
تاثیر دیکھیے نگہ شرمسار کی

جس ذرہ پر نگاہ پڑی کوئے یار میں
تصویر تھی کھنچی ہوئی جوش بہار کی

اب اُٹھ چکی نگاہِ طلب جانب حرم
جز و جبیں ہے خاک ترے رہگذار کی

ہنگامہ بہار ہے نظروں کے سامنے
مشکل اب کہاں سکون دلِ بیقرار کی

اب وہ نگاہِ شوخ ہے کیوں گردش آشنا
دنیا تو مٹ چکی ہے شکیب و قرار کی

ہر ہر نفس ہے عشق میں اک عالم جنوں
پابندیاں اب اُٹھ گئیں جوش بہار کی

دنیائے امتیاز رہی حد ہوش تک
اب کچھ خبر نہیں مجھے انجام کار کی

عابد جنون عشق کا شکوہ نہیں مجھے
حدت تو کوئی ہو جوش دل بیقرار کی

فرخ بنارسی:—

پہلے حجاب دیدۂ حیراں اُٹھائیے
پھر حسنِ دل فروز کا احساں اُٹھائیے

اے جوش سجدۂ درِ جاناں ذرا ٹھہر
دل کہہ رہا ہے منت درماں اُٹھائیے

کب تک علاج درد محبت کا کیجئے
کب تک نگاہِ ناز کا احساں اُٹھائیے

آساں نہیں ہے حسن سے دل کا معاملہ
کچھ فائدہ اگر ہو تو نقصاں اُٹھائیے

کیوں اعتمادِ عشق کو برباد کیجئے
کیوں پردۂ تبسم پنہاں اُٹھائیے

کیوں منہ قفس کا دیکھئے فصل بہار میں
کیوں نالے کرکے سر پہ گلستاں اُٹھائیے

کیوں کیجئے آزمائشِ حسنِ فریب کار کیوں اعتبارِ دیدۂ حیراں اٹھائیے
کیوں گھر میں بیٹھ کر درو دیوار دیکھئے جوشِ جنوں میں لطفِ بیاباں اٹھائیے
جب دردِ لا دوا ہو تو بے سود ہے دوا کیوں تہمتِ کشاکشِ درماں اٹھائیے
سازِ جنوں سے چھیڑئیے اک نغمۂ نشاط رنگینیٔ بہار کا طوفاں اٹھائیے
فرخ یہی ہے عشق کا حاصل کہ تا بہ مرگ
بارِ غمِ تغافلِ جاناں اٹھائیے

ناطق گلاؤٹھوی :-

کیا ادا دے ہیں وحشتِ دل کے کس سے ملنا ہے خاک میں مل کے
اے دل شکوہ سنج کیا گذری کس لئے ہونٹ رہ گئے سل کے
ہوگئی گردِ راہِ غمِ لیلےٰ چھوڑ مجنوں خیالِ محمل کے
مٹتے جاتے ہیں راہِ عمر میں دوست مل رہے ہیں نشان منزل کے
بحرِ غم بے نیازِ طوفاں ہیں ڈوبنے والے گردِ ساحل کے
نہ رہے جب اُمیدِ آسانی دن کٹیں کس طرح سے مشکل کے
چھوڑ ناطق فضائے بزمِ شکست
لے یہ ٹکڑے سنبھال لے دل کے

محمود الہ آبادی :-

نہ کیونکر اس ستم آرا سے ہم وفا کرتے کوئی بتائے ہم اہلِ وفا تھے کیا کرتے
تمام نغمۂ الفت تھی ہر صدا اُن کی فضا خموش جو ہوتی تو ہم سنا کرتے
وہ حسن پیکرِ انساں وہ کیف برق نگاہ صنم جو دیکھتے اس کو خدا خدا کرتے
ربابِ عشق تھا خاموش دہر میں محمود
وگرنہ نغمۂ الفت کو ہم سنا کرتے

معلومات واقتباسات

روس میں عورت کی موجودہ زندگی

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس میں سب سے زیادہ مہتم بالشان تبدیلی جس طبقہ میں ہوئی ہے، وہ عورتوں کا طبقہ ہے۔ کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہیں رکھا گیا کہ مرد و عورت دونوں میں حقیقی مساوات پیدا ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مساوات اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک عورت، اقتصاد معاش کے باب میں مرد کی محتاج نہ رہے اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ صنعت و تجارت، تعلیم و حرفت، زراعت و فلاحت الغرض زندگی کے تمام مدارج و منازل میں عورت مرد کے دوش بدوش کام کرے۔ چنانچہ روس میں اب اسی اصول پر عمل ہو رہا ہے اور عورت کے لئے ترقی کا میدان اسی طرح کھلا ہوا ہے جیسا مرد کے سامنے۔

اس سلسلہ میں بالشویک حکومت کے سامنے سب سے زیادہ اہم سوال شادی شدہ عورتوں کا تھا۔ وہ لڑکیاں یا عورتیں جن کی شادی نہیں ہوئی وہ تو خیر آزاد ہیں اور مردوں کے برابر کام کر سکتی ہیں، لیکن جن کی شادی ہو چکی ہے اور جن کو اپنے اوقات کا بڑا حصہ اولاد کی پرورش میں صرف کرنا پڑتا ہے وہ کیونکر اس مساوات کی برکت حاصل کر تی تھیں۔ اس کا جو انتظام بالشویک حکومت نے کیا ہے عجیب و غریب ہے۔

شادی شدہ عورتوں کے لئے بالشویک حکومت نے کھانا پکانے، کھانا کھانے کپڑا دھونے، بچوں کی پرورش اور ابتدائی تعلیم کے لئے سرکاری ادارے قائم کر دئیے ہیں۔ اور بچہ جننے کے بعد ایک عورت ان تمام فرائض سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔ گاؤں اور قصبات میں اس نوع کے ادارے صنعتی کارخانوں اور زرعی اداروں کے ساتھ ساتھ قائم کئے گئے ہیں۔

جمہوریہ سودیٹ کا جو سب سے بڑا صوبہ ہے وہاں بچوں کی پرورش گاہیں جو کارخانوں سے متعلق ہیں ایک سال کے اندر ایک لاکھ سے ایک لاکھ ۴۰ ہزار تک پہونچ گئی ہیں۔

کوکلہوزی میں کسانوں کے ۵۰ لاکھ بچے ان اداروں میں پرورش پا رہے ہیں۔ اس سال کے آخر تک ۳۵ لاکھ بچوں کے لئے اور انتظام ہو سکے گا۔

گزشتہ سال دو کرور پونڈ ان اداروں کے قیام پر صرف کیا گیا اور ۵ کرور پونڈ بچوں کی پرورش پر امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۳۳ء میں صنعتی رقبوں کی آبادی کے ۷۳ فی صدی بچے ان اداروں میں آجائیں گے

یعنی روس کی کل آبادی کے لحاظ سے ۵۸ فی صدی بچے ان اداروں میں داخل ہو سکیں گے - اس طریق کار کی وسعت و مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چار سال قبل ۱۹۲۸ء میں صرف ۲۸ فی صدی بچوں کی گنجائش ان اداروں میں تھی - لیکن اب ۷۳ فی صدی تک پہونچ گئی ہے -

ان اداروں کے قیام نے روس کی عورت کو امور خانہ داری اور تربیت اطفال کے بارے سبکدوش کرکے مردوں کے دوش بدوش تمام علمی و صنعتی تجارتی و زرعی کاموں میں مشغول ہونے کے لئے آزاد کر دیا ہے -

آٹھ سال قبل روس میں صرف ۲۳ لاکھ ۴۹ ہزار عورتیں اجرت پر کام کرتی تھیں لیکن اسوقت ۶۰ لاکھ ہیں اور اختتام سال تک ۱۵ لاکھ کے اضافہ کی اور توقع کی جاتی ہے - روس میں عورت و مرد دونوں کی اجرت بالکل برابر رکھی گئی ہے -

ان عورتوں کو وضع حمل سے آٹھ ہفتہ قبل اور آٹھ ہفتہ بعد تک پوری اُجرت پر چھٹی دیدیجاتی ہے لیکن جو عورتیں دماغی کام کرتی ہیں ان کو ۶ ہفتہ قبل اور چھ ہفتہ بعد کی رخصت ملتی ہے - اسی کے ساتھ بچے کے کپڑوں وغیرہ کے لئے کچھ الاؤنس بھی مقرر کر دیا جاتا ہے - اور طبی امداد بالکل مفت دیجاتی ہے -

اُن کارخانوں میں جہاں پہلے عورت نہایت ہی معمولی معمولی خدمت انجام دیتی تھی، وہیں اب وہ ماہرانہ حیثیت سے کام کرتی نظر آتی ہے اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ عورت کسی بات میں مرد سے کم نہیں ہے - عورتیں البتہ ان کاموں سے ضرور باز رکھی جاتی ہیں جو اُن کے نسوانی اعضاء کو صدمہ پہونچانے والے ہیں -

روسی عورتیں نظم حکومت میں بھی عملی حصہ لے رہی ہیں چنانچہ اس وقت وہاں ۳ لاکھ عورتیں مختلف سرکاری کمیٹیوں میں ممبر کی حیثیت سے اور ۵ لاکھ متعدد محکموں میں عاملانہ حیثیت سے کام کر رہی ہیں - سوویٹ ٹریڈ یونین میں ۵۴ لاکھ عورتیں شریک ہیں -

ان میں تعلیم بڑی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے - گزشتہ تین سال میں ایک کرور ۵۰ لاکھ جاہل عورتوں کو ابتدائی لکھنا پڑھنا سکھایا گیا اور صنعتی تعلیم میں ان کی تعداد بمقابلہ ۱۹۲۹ء کے ۲۰ فیصدی سے ۴۷ فیصدی تک پہونچ گئی -

یونیورسٹیوں میں عورتوں کی تعداد ۱۹۳۰ء میں ۲۷ فیصدی تھی لیکن ۱۹۳۱ء میں ۴۰ فیصدی سے بڑھ گئی

ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ مختلف تعلیمی شعبوں میں وہ کس نسبت سے آگے بڑھ رہی ہیں -

ڈاکٹری	۷۵	فی صدی
محکمۂ تعلیم	۵۱	فی صدی
صنعتی تعلیم	۳۹	فی صدی
تحقیقات علمیہ	۲۹	فی صدی

ابتدائی وثانوی تعلیم میں اس وقت ۷۶ فی صدی عورتیں درس وتدریس میں مشغول نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت روس ہی ایک ملک ایسا ہے جس نے نظام تمدن کی ترقی میں عورت کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا اور اس کو دماغی وجسمانی دونوں طرح کی مکمل آزادی سے آشنا کیا

ایک گم شدہ جزیرے کی جستجو

امریکہ کے سمندروں میں خط نصف النہار سے شمال پر ایک جزیرہ سارآن پایا جاتا تھا جو اب بالکل نظر نہیں آتا۔ ہر چند نقشوں میں اس کا نام اب بھی پایا جاتا ہوگا، مگر وہ خود کہیں نہیں ہے۔ چنانچہ امریکہ نے اپنے بحر پیسیفک کے بیڑے کو حکم دیا کہ اس جزیرہ کی جستجو کی جائے، دوسری طرف جرمنی بھی اس کے پالینے کی فکر میں کر رہا ہے۔

اس جزیرہ کی اہمیت فی الحال اس لئے بڑھ گئی ہے کہ یہی ایک چھوٹا سا جزیرہ ایسا ہے جہاں سے ۱۹۳۷ء میں واقع ہونے والے سورج گرہن کا پورا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ اور آس پاس کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں کوئی رصد گاہ قائم ہو سکے۔

سال رواں میں جو سورج گرہن ہونے والا ہے اور جسکے دیکھنے کے لئے ہزاروں ماہرین فلکیات نیو انگلینڈ پہونچ رہے ہیں صرف ڈیڑھ منٹ رہیگا، لیکن ۱۹۳۷ء کا گرہن سات منٹ ۳/۵ سکنڈ تک قائم رہیگا۔ گرہن پڑنے کی زیادہ سے زیادہ مدت سات منٹ ۲۰ سکنڈ ہو سکتی ہے، اس لئے ۱۹۳۷ء کا سورج گرہن ایک ایسا موقع ماہرین فلکیات کے لئے مشکل ہی سے پھر دوبارہ نصیب ہو سکتا ہے۔

اہل جرمن جن کو فلکیات کا بڑا شوق ہے بہت متمنی ہیں کہ اُن کو یہ جزیرہ مل جائے اور وہ مخصوص طور پر گرہن کے رصد کا انتظام کریں۔

اَب تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی، لیکن اُمید ہے کہ یہ جزیرہ دستیاب ہو جائے گا۔ اگر بہت زیادہ عمیق پانی نے اُسے نہیں چھپالیا اور اگر اس میں کامیابی حاصل ہوگئی تو یہ بھی یقینی ہے کہ یہاں سے جو تصویریں سورج گرہن کی ۱۹۳۷ء میں لی جائیں گی وہ فن کے لحاظ سے نہایت بیش قیمت چیز سمجھی جائیں گی۔

(مولف) معترض نے عجب طرح سے اس شعر کی شرح کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سمجھا ہی نہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ سوائے معشوق کے اور کس کی شب فرقت ہو سکتی ہے۔ یہ عجیب جملہ ہے۔ معشوق کی شبِ فرقت کیا معنی فرقت معشوق اپنے محل پر کہا جاتا ہے۔ شبِ فرقتِ معشوق نہیں کہا جاتا۔ اور کیا وجہ ہے کہ شب فرقت کو عاشق کی شبِ فرقت نہ مانا جائے۔ یہاں شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ایک میری ہی شب فرقت ایسی ہے جو یہ کہتی ہوئی آئی ہے کہ ہم زمانے کو رنگ تمہیں بدلنے دیتے ورنہ اور ایسا دنیا میں کون ہے' یعنی میری برابر کوئی بدنصیب نہیں۔

ریاض ۔ کیوں مجھکو جلاتے ہو دم وصل یہ کیا ہے　　کیوں پھونکتے ہو شمع کو جلنے نہیں دیتے

اعتراض ۔ اگر شعر کی خوبیاں لفظی مناسبتوں پر منحصر ہیں تو بہت اچھا شعر ہے۔ اور اگر معانی سے بھی بحث ہے تو اس میں کلام ہے۔ عاشق کے سامنے اگر وصل کے وقت چراغ نہ ہو تو وہ اس حد تک ناگوار نہیں ہو سکتا کہ جس سے عاشق کا جی جل جائے البتہ صرف یہ تماشا دیکھنے میں نہیں آسکتا کہ خلوت کے وقت کیا تغیرات معشوق کے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں۔

(مولف) یہ شعر یقیناً نہایت رکیک ہے۔

ریاض ۔ ہے جان مری کشمکش نزع میں دن رات　　ارمان تو کیا دم بھی نکلنے نہیں دیتے

اعتراض ۔ نزع سے مراد اگر واقعی نزع ہے تو ارمانوں کا ذکر صدائے بے ہنگام ہے۔ صرف "دم نکلنا" کافی ہے تاکہ یہ کشمکش رفع ہو۔ اور اگر نزع مصنوعی نزع ہے یعنی ارمان کے پیچھے نزع کا سا حال ہو گیا ہے تو بیشک ارمانوں کا ذکر لازمی ہے۔ مگر پھر دم نکلنے کی خواہش کرنا معشوق کو دھمکی دینا ہے۔

(مولف) شعر بہت صاف ہے۔ اعتراض لغو ہے۔ صاف مطلب یہ ہے کہ ارمان کی وجہ سے میری حالت حالت نزع سے مشابہ ہے۔ مگر معشوق کوئی توجہ نہیں کرتا۔ نہ مرنے دیتا ہے نہ ارمان نکالتا ہے اس میں اصلی اور مصنوعی نزع کی بحث چھیڑنا لغویت ہے۔

میر سجاد[ا] و میر تقی میر

میر سجاد ۔ کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یاں کوئی　　مرجا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا

ا؎ میر سجاد خلف میر محمد اعظم اکبر آباد کے رہنے والے تھے مگر دہلی میں قیام تھا۔ ان کے بزرگ (بقیہ فٹ نوٹ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۰)

اعتراض میر- اگرچہ باطل باطل ہے لیکن بجائے کافر کے جو پہلے مصرع میں واقع ہے اگر یہاں باطل ہوتا تو وہ صحیح تھا۔

(مولف) بہ لحاظ تناسب الفاظ باطل اچھا ہے۔مگر شعر کی صفائی جاتی رہتی ہے۔اور وہ برجستگی جو لفظ کافر میں پائی جاتی ہے باطل میں ہرگز نہیں

میر سجاد- میرا جلا ہوا دل کانٹوں کے کب ہے لائق اس آبلہ کو کیوں تم کانٹوں میں اینچتے ہو

اعتراض میر تقی- ہر چند کہ محاورہ میں تصرف جائز نہیں ہے۔اس واسطے کہ محاورہ یوں ہے کہ کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔مگر چونکہ شاعر قادر الکلام ہے اسو اسطے میں معاف کرتا ہوں۔

(مولف) میر صاحب کی معافی اس بنا پر ہے کہ سجاد قادر الکلام تھے۔مگر قادر الکلام سے غلطی ہونا اور بھی زیادہ قابل گرفت ہے۔رہا یہ کہ کانٹوں میں کھینچنا۔کانٹوں میں اینچنا بھی محاورہ ہے یا نہیں۔بعض اس کو جائز رکھتے ہیں۔مگر میرے نزدیک درست نہیں کیونکہ کانٹوں میں گھسیٹنا۔خوار و ذلیل کرنے کے معنی میں آتا ہے اور ذلت جو گھسیٹنے میں پائی جاتی ہے وہ کھینچنے میں نہیں ہے۔اس سے تکلیف کے معنے مفہوم ہوسکتے ہیں۔ہاں اگر کوئی شاعر غلط لفظ استعمال کرکے اس کی غلطی کی طرف اشارہ بھی کردے تو بیشک قابل اعتراض نہیں ہے جیسے بعض لوگوں نے حافظ کے اس شعر میں کہا ہے۔

صلاح کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

دوسرے مصرع میں قافیہ میں بے ساکن چاہئے تھی مگر مصنف متحرک لایا۔اور پہلے مصرع میں اشارہ بھی کردیا۔مرزا غالب کے اس شعر پر اعتراض ہوا ؎

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہوگئے عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

چونکہ صاحب میں حائے حطی مکسور ہے اس واسطے صاحب بفتح حا قابل اعتراض ہے۔مگر اس کا یہ جواب دیا گیا کہ یہ مرزا صاحب کا قول نہیں بلکہ دوسرے کے قول کی نقل ہے۔یہ لطیفہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا

(بقیہ فٹ نوٹ ملاحظہ ۱۲۹) بڑے بڑے عہدوں پر ملازم تھے۔یہ ریختہ کے اچھے شعرا میں تھے۔آبرو کے شاگرد تھے۔سجاد تخلص کرتے تھے طب میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے ان کے یہاں بالالتزام ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا میر تقی بھی اس میں شریک ہوتے تھے مگر آخر کار کچھ ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ باہم صرف شناسائی کے سوا کوئی خاص تعلق باقی نہ رہا۔میر صاحب نے نکات الشعرا میں ان کے ایک شعر پر اعتراضاً اصلاح دی ہے۔

کہ لوگ فردوسی کے اس مصرع کی نسبت کہتے ہیں ؎

فلک گفت احسن ملک گفت زہ

احسن اور ملک کی نسبت کسی نے اعتراض کیا کہ آپ نے شاہنامہ میں یہ التزام کیا ہے کہ الفاظ عربی نہ آنے پائیں گے۔ حالانکہ یہ دونوں عربی ہیں۔ فردوسی نے جواب دیا۔ کہ آن فلک گفت من چہ گفتم۔ یہ بالکل غلط مشہور ہے کہ شاہنامہ میں خالص فارسی زبان کا التزام کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں بہت سے الفاظ عربی وغیرہ کے پائے جاتے ہیں۔

سراج[1] و رشید

سراج ۔ موت نے قصہ چکایا نزع کا ہنگام تھا ۔۔۔ مجھکو بھی جانے کی جلدی تھی انھیں بھی کام تھا

---

[1] سراج الحسن صاحب سراج لکھنؤ کے معروف شعرا میں سے ہیں قریب ۳۶، ۳۷ برس کی عمر ہے۔ بیس بائیس برس سے شعر کہتے ہیں۔ آپ کی شاعری نے کئی پلٹے کھائے ہیں اور مختلف ادوار میں مختلف احوال کی پابند رہی ہے۔ اول اول اپنے استاد باقر صاحب حمید اور پیارے صاحب رشید (جو لکھنؤ کے نامی گرامی مرثیہ گو تھے) کے اتباع میں آپ زبان اور روزمرہ کا زیادہ لحاظ کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ زمانہ کی دیکھا دیکھی اور ماحول کے اثر سے آپ کے یہاں ترکیبات بھی شروع ہوئیں اور وہ قدیم رنگ سرمہ مسی والا ——— متروک ہوتا گیا۔ اس رنگ میں سوز و گداز کا زیادہ خیال تھا۔ مگر سوز و گداز بیشتر مرثیت اور بین و بکا کی صورت میں رہا اسکے بعد شاعری کا رُخ جدید الفاظ کی طرف مڑ گیا اور اب اکثر ایسے شعر بھی آپ کے یہاں ملتے ہیں جن میں زمانہ کے جدید رنگ اور عالمگیر ہوا کا اثر پایا جاتا ہے۔

سراج صاحب کی لیاقت علمی انگریزی میں انٹرنس تک ہے اسی کے ساتھ کچھ فارسی بھی پڑھی ہے سردست آپ کو مضامین نویسی سے بھی ایک لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ بہت سے مضامین لکھے ہیں بعض مضامین کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ کتب فن کی رائج کتابوں کا کبھی کبھی آپ مطالعہ کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں آپ لکھنؤ کی شاعری کے حامی بنکر اکثر لوگوں کے جواب بھی لکھتے رہتے ہیں۔

رشید

جناب عبدالرشید صاحب رشید لکھنؤ کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان شاعر ہیں انگریزی (ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲۲ پر)

اعتراض رشید - اس مطلع پر غور کرو تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ شاعر کا مقصود شاعری سے صرف یہ ہی کہ شعر میں کسی نہ کسی طرح کوئی محاورہ ضرور نظم ہو - خواہ اس التزام سے مصرعوں میں ربط قایم رہے یا نہ رہے مطلع کے دونوں مصرعوں کے ٹکڑوں کو غور سے پڑھو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ محاورہ اور روزمرہ اس مطلع کا جزو اعظم ہے - الفاظ کے گورکھ دھندے کے سوا اس میں کچھ نہیں ہے - خدا جانے مصرعوں میں ربط کیا ہے معانی اس قدر ذلیل نکلتے ہیں کہ ان کے بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا - مطلب یہ ہے کہ نزع کے وقت وہ تشریف لائے مجھے بھی جانے کی جلدی تھی اور وہ بھی بوجہ ایک ضروری کام کے ٹھہر نہ سکتے تھے - اس لئے موت نے قصہ چکا دیا - اور میں قید حیات سے چھوٹ گیا - اب ذرا غور کرو -

(۱) معشوق کی موجودگی میں عاشق کے لئے جانے کی جلدی کیا معنی رکھتی ہے -

(۲) ضروری کام معشوق کی کونسی ادا ہے - اور ضروری کام کیا تھا - شاید غیر سے وعدہ ہو شعر سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے -

(۳) نزع کے ہنگام کی تخصیص کوئی ترقی شعر میں پیدا نہیں کرتی -

(۴) قصہ چکانا یہ محاورہ اس موقعہ پر بولتے ہیں جب کسی معاملے میں اختلاف ہو اور تیسرا شخص فیصلہ کرے لیکن یہاں تو کوئی اختلاف کی امکانی صورت ہی نہیں اگر یہ صورت ہوتی کہ معشوق نزع کے وقت موجود تھا - اور افسانۂ دل سن رہا تھا - موت اور زندگی میں کشمکش تھی آخر موت غالب آئی وغیرہ وغیرہ تو اس وقت ایسے محاورہ کا صرف صحیح تھا - لیکن یہاں تو معاملہ ہی بالکل برعکس ہے - عاشق کو جانے کی جلدی - معشوق کو ضروری کام اور اس کے ٹھہرنے کی اُمید فضول ایسی صورت میں اس کے مرنے میں کونسی چیز سدراہ ہو سکتی تھی - لہذا اس محاورے کا صرف غلط - میں نہیں سمجھ سکتا کہ آخر اس مطلع میں کیا ہے -

---

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۱) میں بی اے تک تعلیم پائی ہے فارسی اور قدرے عربی سے بھی باخبر ہیں - تقریباً پندرہ برس سے شعر کہتے ہیں - جدت خیال - تازگی مضامین - ندرت بیان کے ساتھ بلندی جذبات کا بھی خیال رکھتے ہیں - نثر نگاری اور تنقید کا بھی اعلیٰ ذوق ان میں موجود ہے - نہایت نیک نفس - زندہ دل - دوست پرست خوش مزاج رنگیں طبع ہیں - میرے قدیمی دوست مخلص کرم فرما ہیں - سراج صاحب کے بعض اشعار پر ان کی تنقیدیں شایع ہوئیں - جن کا جواب منشی قدیر احمد صاحب قدیر لکھنوی نے دیا - رشید صاحب کی عمر اب ۳۰ سال کی ہے اور اکثر کتب بینی کا مشغلہ رہتا ہے -

(مولف) معترض کا یہ اعتراض ایک حد تک ناقابل قبول ہے کہ شعر محاورے کے لئے کہا گیا ہے بلکہ کہنا یہ چاہئے تھا کہ اس قافیہ کے باندھنے کے واسطے یہ شعر کہا گیا ہے۔ جو شعر میں موجود ہے۔

پہلا اعتراض اس وجہ سے ہے کہ فاضل معترض نے خیال کیا ہے کہ معشوق پہلے سے موجود تھا۔ اس صورت میں یہ اعتراض کرسی نشین ہے ——— کیونکہ معشوق کی موجودگی میں نزع کی حالت ہونا۔ اور اگر وہ بحالت نزع آیا تھا، تو نزع کا قایم رہنا اصول موضوعہ شاعرانہ کے خلاف ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نزع کی صورت کسی اور وجہ سے تھی جدائی کی وجہ سے نہ تھی تو پھر شعر میں معشوق کے آنے جانے کا ذکر اور اس ذکر سے عاشق کے حیات و ممات کو وابستہ کرنا فضول سی بات ہے۔ شعر میں یہ ٹکڑا (نزع کا ہنگام تھا) اس لئے لایا گیا کہ معشوق نزع کے وقت آیا۔ یا اس وقت موجود تھا۔ مگر انصاف یہ ہے کہ اس سے شاعر کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اور اصلی معنی پردۂ اخفا میں رہتے ہیں۔

دوسرا اعتراض۔ ضروری کام ڈالا کہ شاید غیر سے وعدہ ہو اگرچہ خیال میں آتا ہے مگر لازمی نہیں۔

تیسرا اعتراض بالکل صحیح ہے

چوتھا اعتراض بھی قرین قیاس ہے۔ یعنی قصہ چکانا اسی وقت بولا جاتا ہے۔ جب باہم کوئی کشمکش ہو۔ تو اس وقت کشمکش کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ معشوق و عاشق میں کشمکش تھی جانے اور نہ جانے پر۔ مگر یہ اس واسطے بعید معلوم ہوتی ہے کہ دونوں کو جانا تھا۔ پھر کشمکش کیوں تھی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ موت اور زندگی میں کشمکش تھی۔ اس حالت میں موت کو قصہ چکانا نہ چاہئے اس واسطے کہ دو جھگڑنے والوں میں ایک فریق فیصلہ کرنے کا کیونکر مجاز ہوا۔ انھیں صورتوں اور جرحوں کی وجہ سے شعر پر جو اعتراض ہوئے ہیں صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

سراج ۔ وہ تبسم آشنا لب ہلکی سی جنبش کے ساتھ سیکڑوں مفہوم تھے گو ایک ہی پیغام تھا

اعتراض ۔ جنبش لب میں سیکڑوں مفہوم تو مضمر ہو سکتے ہیں لیکن وہ ایک پیغام نہ جانے کونسا ہے جس کا علم صرف شاعر کو ہے اسی کو کہتے ہیں المعنی فی بطن الشاعر۔

(مولف) واقعی ایک ہی پیغام کا مفہوم ذہن میں متعین نہیں ہوتا۔

سراج ۔ جہاں اتنا دیا ہے ساتھ تم نے صبح کی تا رو سرانجام مریض شام ہجراں دیکھتے جاؤ

اعتراض ۔ بجائے انجام سرانجام فرمایا گیا ہے ۔ حالانکہ سرانجام کے معنے انتظام کے ہیں نہ کہ نتیجے کے

اور سرانجام بمعنی انجام اگر اہل فرس کے یہاں رائج ہو تو بھی اس جگہ قابل استناد نہیں علاوہ اس کے تاروں کے ساتھ صبح کی تخصیص کیسی جبکہ وہ شام ہی سے نکلے ہوئے تھے۔

جواب قدیر - لفظ سرانجام بمعنی نتیجہ شیخ سعدی نے استعمال کیا ہے ؎

سرانجام جاہل جہنم بود کہ جاہل نکو عاقبت کم بود

ایک اور شاعر لکھتا ہے ؎

نہ ہندوم نہ مسلماں نہ کافرم نہ یہود بحیرتم کہ سرانجام من چہ خواہد بود

یہ جو کہا گیا ہے کہ مراد عام تاروں سے ہے جو شام سے نکلے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جناب نے یہ کیسے فرض کرلیا۔ شعر تو صاف صاف بتا رہا ہے کہ شاعر کا کیا مطلب ہے یعنی اے صبح کے تارو جہاں تم نے اتنا ساتھ دیا ہے وہاں مریض شام ہجر کا نتیجہ بھی دیکھتے جاؤ۔ جسکے یہ الفاظ دیگر کھلے ہوئے یہ معنے ہوئے کہ اے صبح کے تارو قبل ڈوبنے کے ذرا مریض شام ہجر کا مرنا بھی دیکھتے جاؤ۔

(مولف) مجھے افسوس ہے کہ قدیر صاحب نے معترض کے اعتراض سے علٰحدہ ہوکر جواب دیا ہے۔ جب معترض یہ کہتا ہے کہ سرانجام بجائے انجام فارسی میں اگر ہو بھی تو یہاں قابل استناد نہیں ہے۔ تو پھر آپ کو یہ دو شعر جو بچے بچے کی زبان پر ہیں پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں کوئی اردو کا شعر پیش کرنا چاہئے تھا۔ اور جہاں تک خیال ہے اردو میں سرانجام بمعنی انجام متاخرین کے یہاں نہ ملیگا۔ شاید کسی نے متقدمین میں سے زبان فارسی کے تتبع میں لکھا ہو وہ قابل سند نہیں۔ تحقیق کلام یہ ہے کہ سرانجام سرآغاز کی طرح فارسی میں بولا جاتا ہے مگر سر وہاں بھی زائد مستعمل ہے۔ کسی کام کے انتظام اور ترتیب دینے کے لئے بھی بولتے ہیں۔ جیسا کہ صائب کے اس شعر میں ؎

از تن زارم اگر رشتہ سرانجام دہند مانع روشنی دیدۂ سوزن باشد

مگر یہ معنی مجازی ہیں کیونکہ کام کا مرتب ہونا اور کام کا انتظام ہونا آخر کار میں ہوتا ہے۔ اردو میں بھی لفظ سرانجام اسی مجازی معنے میں مستعمل ہے جیسا کہ میر انیس کے اس شعر میں بمعنی بند و بست لایا گیا ہے

وہ دشت نوردی وہ غم و صدمۂ و آلام منزل پہ بھی ممکن نہیں راحت کا سرانجام

مگر اصلی معنی میں انجام ہی بولا جاتا ہے اس لئے کہ کسی زبان کے زوائد ہمیشہ بجنسہ دوسری زبان میں منتقل نہیں ہوتے۔ لہذا جب تک کہ اردو میں دو چار شعر اس معنے کے نہ دیکھے جائیں سرانجام غلط نہیں تو غیر فصیح ضرور ہوگا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ سرانجام کی ایسی مثال متاخرین میں کہیں نہیں مل سکتی جہاں یہ لفظ انجام کے معنے میں آیا ہو۔

دوسرے اعتراض میں معترض اور مجیب دونوں مغالطے میں ہیں۔ نہ معترض نے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا اور نہ مجیب نے۔ بحث صبح کے تاروں پر ہے۔ معترض نے صبح کے تاروں سے وہ تارے مراد لئے ہیں جو صبح کے وقت طلوع ہوتے ہیں۔ اور مجیب نے وہ جو صبح کے وقت ڈوبتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ صبح کے تارے صبح کے ڈوبنے والے تاروں کو نہیں کہتے۔ صبح کو تو سب ہی تارے چھپ جاتے ہیں۔ اس میں تخصیص کیا ہے۔ البتہ صبح کا تارا اور صبح کا ستارا۔ زہرہ کو کہتے ہیں۔ مثال کے لئے دو شعر دیکھئے جن میں صبح کے تارے کا ذکر کرکے اس سے وہی صبح کا طلوع ہونے والا تارا مراد لیا ہے۔

نواب ؎ رات آخر ہوئی اور صبح کا تارا نکلا — مدعا دل کا نہ صد حیف ہمارا نکلا

ناسخ ؎ بُندا کانوں میں نہیں تعویذ بالوں میں نہیں — یہ ستارا صبح کا ہے وہ ستارا شام کا

جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ صبح کا تارا صرف صبح کے طلوع ہونے والے تارے زہرہ کو کہتے ہیں تو پھر "صبح کے تاروں" یعنی جمع کے ساتھ خطاب کے کوئی معنی نہیں۔ معترض کا یہ اعتراض بھی نہایت وزنی ہے کہ صبح کے تاروں کو مخاطب کیا ہے مگر مراد عام تاروں سے ہے جو شام سے نکلے ہوئے ہیں۔ فاضل مجیب فرماتے ہیں کہ یہ کیسے فرض کر لیا۔ غالباً انھوں نے (جہاں اتنا دیا ہے ساتھ) والے ٹکڑے کو غور سے نہیں دیکھا جس کے صاف صاف یہ معنے ہیں کہ جن تاروں سے خطاب ہے وہ شام سے مریض شام ہجراں کا ساتھ دے رہے ہیں۔

اس شعر میں یہ بھی کمی رہ گئی ہے کہ پہلے مصرع میں لفظ (جہاں) لایا گیا ہے جو دوسرے مصرع میں وہاں بھی چاہتا ہے۔ جس کا محذوف ماننا نہایت برا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے مصرع میں (بھی) کی بھی ضرورت ہے کیونکہ شعر کی نثر یوں ہونا چاہئے۔

اے صبح کے تارو جہاں تم نے اتنا ساتھ دیا ہے وہاں مریض شام ہجراں کا انجام بھی دیکھتے جاؤ۔

سراج - سرِ محشر ذرا قاتل کے تیور تو کوئی دیکھے — کیا ہے جیسے اپنا خون ناحق آپ ہی میں نے

اعتراض - کہنا یہ چاہئے تھا کہ جیسے اپنا خون میں نے آپ ہی کیا ہے۔ ناحق بالکل بیکار ہے۔

جواب - شعر سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ قاتل نے عاشق کا خون ناحق کیا۔ مگر محشر میں اُسکے تیور ایسے ہیں کہ گویا اس نے خون ناحق نہیں کیا بلکہ خود عاشق نے اپنا خون کیا ہے۔ اور صرف خون ہی نہیں بلکہ خون ناحق۔ یہ اس وجہ سے کہ معشوق پر خون ناحق کا الزام ہے اور وہ اس الزام کو اپنے انقلاب پسند تیوروں کی زبردستی سے بیگناہ عاشق پر عاید کرنا چاہتا ہے۔ مہربانی فرما کر آپ شعر کی نثر کیجئے معنی خود بخود

آپ کی سمجھ میں آجائیں گے کہ لفظ ناحق کی شعر میں ضرورت ہے یا نہیں۔

(مولف) نقاد کا اعتراض ہے صرف لفظ ناحق پر کہ یہ زاید اور بے معنی ہے۔ زائد لفظ کی پہچان اور جانچ اسی طرح ہوتی ہے کہ شعر کی نثر کر کے دیکھ لیا جائے کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اور یہاں خود مجیب نے اپنی نثر میں اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بلکہ زبردستی دوبارہ اس ناحق کے ٹکڑے کو شعر میں ٹال دیا یہاں "ناحق" بالکل بیکار ہے۔ کیونکہ خون کی صفت ناحق واقع ہوا ہے جیسا کہ خود مجیب کا بھی خیال ہے۔ اگر اس کو صحیح مانا جائے گا تو معنے ترکیبی یہ ہوں گے کہ گویا میں نے اپنا خون کر لیا ایسا خون جو بالکل ناحق تھا۔ میرے نزدیک ناحق بالکل بیکار ہے۔

سراج ۔ مری طرز روش اچھی نہیں اے حضرت ناصح اُدھر جائیں گے آپ اچھا تو یہ ہر راستا میرا

اعتراض ۔ طرز روش میں واؤ عاطفہ غائب ہے۔

جواب ۔ طرز کو مع اضافت کے پڑھیئے۔ اور دیکھئے کہ شعر معنی دیتا ہے یا نہیں۔

(مولف) اگرچہ طرز کو اضافت کے ساتھ پڑھنے سے معنے نکل آتے ہیں۔ مگر چونکہ دونوں لفظ ہم معنے ہیں اس واسطے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔

سراج ۔ دل کی بساط کیا تھی اک جز معاملہ تھا ناحق فتور آیا ایمان میں کسی کے

اعتراض ۔ جز بغیر ہمزہ یا واؤ کے صحیح نہیں یوں کہنا چاہیئے تھا۔ دل کی بساط کیا تھی جزئی معاملہ تھا

جواب ۔ بہار عجم میں لکھا ہوا ہے " درلغت عرب بمعنی پارہ است و در فارسی جُز و بدون ہمزہ ظاہر المخفف ہماں عربی است چوں آنرا مضاف نمایند بجیزے بجائے ہمزہ واؤ نویسند۔ گویند جزو طلا ہم طلا است۔ وہم چنیں جزو بدن و جزو آں۔ بہر تقدیر اسم است لیکن بہ اضافت مستعمل نیست۔"

آپ نے یہ بھی غور فرمایا کہ لفظ جز یہاں کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مہربان یہ روزمرہ کی اصطلاح ہے اور ہر اہل زبان اسے سمجھ سکتا ہے۔

(مولف) بوجہ محاورہ ہونے کے جواب صحیح ہے۔ اگرچہ محاورہ عوام کا ہے۔

سراج ۔ پابند وضع کل تک تھا انتظام فطرت اور آج اے شب غم تیری سحر نہیں ہے

اعتراض ۔ انتظام فطرت کے لئے پابند وضع ہونا ایک نئی بات ہے۔ پابند نظم کہنا چاہیئے۔

جواب - اول تو یہ بات نئی ہے نہیں - اور اگر ہے تو جناب سراج جدّت بندش پر خراج تحسین کے مستحق ہیں اس لئے کہ اس ترکیب میں کوئی غلطی نہیں ہے - اگر آپ لکیر کے فقیر ہیں تو ہوں بہر صورت شعر کا مطلب بالکل صاف ہے یعنی فطرت ہمیشہ سے اس نظام کی پابند ہے - الخ

(مولف) معترض کا اعتراض بالکل صحیح ہے - انتظام کے لئے پابند وضع کہنا سراسر غلط ہے - مجیب صاحب کا یہ جواب کہ اس ترکیب میں کوئی غلطی نہیں ہے بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص باپ کو بجائے قبلہ کے عزیز من کہکر جدت ترکیب کا دعویٰ کرے -

---

سراج - سر حشر بھی ہے قاتل مجھے پاس راز داری ترا نام لب تک آتا ہے مگر دبی زباں سے

اعتراض - دوسرا مصرع مہمل ہے - دبی زباں سے لب تک آتا ہے - عجیب وغریب بول چال ہے -

جواب - مہربان دل سے زبان تک جو بات آئیگی تو ظاہر ہے کہ کوئی چیونٹی وغیرہ نہیں جو رینگ کر چپکے سے زبان تک چلی آئے اور کسی قسم کی آواز نہ پیدا ہو - کلیہ یہ ہے کہ جب کسی کا نام لیا جائے گا تو کم وبیش صدا ضرور پیدا ہو گی - اسی طرح جب کسی مخصوص راز کی بات کسی سبب سے بیان کرنا ہوتا ہے تو اسے دبی زبان سے کہنا بولتے ہیں - چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ حشر کے روز بھی جبکہ کسی بات کو صیغۂ راز میں کہنا ناممکن ہے قاتل کا نام دبی زبان سے لب تک آیا - اسی کا نام پاس وفا ہے - کم از کم مجھے تو اس شعر میں کوئی غلطی نظر نہیں آتی -

(مولف) اعتراض صحیح ہے - دوسرے مصرع کی نثر نہیں ہو سکتی -

سرخوش[۱] و معترض

ایک مرتبہ ناصر علی کی تعریف میں کچھ شعر کہے ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے -

باشعر علی نمی رسد شعر کسے زانساں کہ خطِ کس بخط میر علی

---

[۱] محمد افضل نام تھا - عبداللہ خاں زخمی شاہجہاں آبادی کی سرکار کے نمک خوار تھے - خوشگو شخص تھے - ایک تذکرہ موسوم بہ کلمات الشعرا ان سے یادگار ہے - ۱۰۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور پچاس برس کی عمر پاکر ۱۱۰۰ھ میں بمقام دہلی انتقال کیا - یہ محمد علی ماہر - اور موسوی خاں فطرت کے شاگرد تھے - شیخ ناصر علی سرہندی کے بڑے دوست تھے -

جب یہ شعر کسی جگہ سنائے گئے تو اسی جلسہ میں ایک شخص نے اعتراض کیا کہ رسد کا تعدیہ حرف با کے ساتھ جیسا کہ اس شعر کے پہلے مصرع میں ہے سنا نہیں گیا

جواب آزاد بلگرامی — سند موجود ہے۔ قلی سلیم طہرانی

بالطف ساعدت ید بیضا نمی رسد ۔۔۔ پیش ببت سخن بہ مسیحی نمی رسد

سعدی و میر نور اللہ احراری

میر نور اللہ احراری سعدی کی مایہ ناز تصنیف گلستان کے شارح ہیں۔ شرح کے ضمن میں جہاں جہاں مناسب سمجھا ہے اعتراضات بھی کئے ہیں۔ سعدی کا شعر ہے۔

وان سلم الانسان من سوء نفسہ ۔۔۔ فمن سوء ظن المدعی لیس یسلم

یعنی اگر آدمی اپنے نفس کی برائی سے سلامت رہا تو دشمن کی بدگمانی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

اعتراض میر نور اللہ احراری مصرع ثانی میں لیس یسلم سے زیادہ فصیح لا یسلم ہے اس واسطے کہ لیس کے ہونے سے مصرع بڑھتا ہے

جواب میر عبد الجلیل بلگرامی — یہ بیت بحر طویل کے ان تین وزنوں میں سے ایک ہے جس کا عروض اور ضرب مقبوض آتا ہے۔ اور مصرع ثانی کی جس میں بحث ہے تقطیع اس طرح کی جائیگی فمن سوا (فعولن)، ظن المد (مفاعیلن) دعی لے (فعولن) س یسلم (مفاعلن)۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ تقطیع حقیقی طور پر یوں ہی ہے تو معلوم ہوا کہ لیس یسلم صحیح ہے نہ کہ لا یسلم جیسا کہ شارح کا گمان ہے۔ کیونکہ لیس کا لام اور ی) تو تقطیع میں لفظ دعی کے ساتھ ترکیب پا کر فعولن کے وزن پر ہوتا ہے اور لیس کا سین لفظ یسلم میں مل کر سیسلم ہو جاتا اور مفاعلن کے وزن پر آجاتا ہے۔ کیونکہ ضرب مقبوض ہے۔ اب رہا معترض کا یہ قول کہ لا یسلم ہونا چاہئے اس میں لفظ لا، دعی کے ساتھ مرکب ہو کر فعولن ہو گا اور یسلم فاعلن کے وزن پر آئیگا اور فاعلن بحر طویل میں آتا نہیں ہے۔ اسواسطے کہ بحر طویل میں ضرب ہوتی ہے یا مقبوض یا محذوف اور فاعلن ان تینوں قسموں سے علیحدہ ہے۔ پھر اس حالت میں میر صاحب کا یہ فرمانا کہ لیس سے مصرع زیادہ ہوتا ہے کم از کم میزان عروض کے مطابق تو ہے نہیں میر صاحب کی میزان طبع کے موافق ہو گا اور مزا یہ ہے کہ لا یسلم کی صورت میں مصرع کم ہوتا ہے اور کس قدر مناسب ہے یہ بیت جو خلیل بن احمد واضع فن عروض نے بحر طویل کے دوسرے وزن کے لئے مثالاً پیش کی ہے۔

ستبدی لک الایام ماکنت جاہلاً — ویاتیک بالاخبار من لم تزوّد

میر صاحب کی یہ عبارت کہ لاابسلم زیادہ فصیح ہے کیونکہ لیس ہونے کی صورت میں مصرع بڑھتا ہے بہت ہی عجیب وغریب ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصرع ناموزوں ہوتا ہے تو وہ مخل فصاحت ہوتا ہے گویا وزن عروضی کو عدماً اور وجوداً فصاحت شعر میں کوئی دخل ہے حالانکہ علمائے معانی میں سے کسی عالم نے فصاحت کی یہ تعریف نہیں لکھی۔

سلمان ساوجی[ا] ومولانا آزاد بلگرامی

سلمان ساوجی - چہ طپی ایدلِ واماندہ چو ماہی بر خشک — جاں بپرور کہ بجو آب رواں باز آمد

اعتراض - اگر مصرع اولی یوں ہوتا تو اور ہی لطف پیدا ہو جاتا ؎

چہ طپی ایدل واماندہ چو ماہی بر در

(مولف) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا کی اس اصلاح سے شعر میں حقیقی ترقی کیا ہوئی ہے۔ اس لئے ماہی کو خشکی پر تڑپنا چاہیئے نہ کہ دروازے پر۔ اگر اصلی الفاظ یہی ہیں اور کاتبان غلط نویس نے مولانا کی اصلاح پر اصلاح نہیں کی ہے تو کسی صورت سے سلمان کے مصرع سے یہ مصرع بہتر نہیں ہے۔

سنجر کاشانی[۲] و آزاد بلگرامی

سنجر کاشانی - بخسرو گو کہ شیریں دید ز اصطرلاب آئینہ — کہ فتح بیستوں از بازوے فرہاد می آید

[ا] سلمان ساوجی وہ مشہور ومعروف شاعر ہے جسکے کلام سے حافظ نے بھی استفادہ کیا ہے۔ اور اس کی مدح میں اس طرح رطب اللسان ہوا ہے ؎

سرآمد فضلائے زمانہ دانی کیست — ز راہ صدق ویقین نے ز راہ کذب وگماں

شہنشہ فضلا بادشاہ ملک سخن — جمال ملت ودیں خواجۂ جہاں سلماں

چالیس سال تک امیر حسن اور اس کی حرم وشاد خاتون اور سلطان اویس کی مدح گستری کرکے متعفی ہوا اور بعض کے نزدیک ۷۷۸ھ میں بعض کے نزدیک ۷۶۹ھ میں بعض کے نزدیک ۷۸۵ھ میں وفات پائی۔ مولانا آزاد بلگرامی نے اسکے ایک شعر پر اصلاح دی۔

[۲] سنجر میر حیدر معمائی کاشانی کا لڑکا تھا۔ اول اول شاہنشاہ اکبر اور حاشیہ نشیناں دربار اکبری کا مداح رہا اور میرزا جانی حاکم ٹھٹھہ اور اس کے صاحبزادے میرزا غازی کی ثنا گستری میں اوقات گزری بعد ازاں (ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴۰)

اعتراض آزاد - اصطرلاب حوادثات کونی کے پہچاننے کے واسطے نہیں ہوتا جس کا استعمال اس جگہ جائز و درست ہو بلکہ یہاں علم رمل ۔ نجوم شانہ وغیرہ کا ذکر مناسب تھا ۔ مصرع یوں ہوتا تو بہت اچھا تھا ؎

بخسرو گو کہ شیریں دیدہ است از شانۂ گیسو

(مولف) اعتراض صحیح ہے ۔ اُصطرلاب ایک آلہ ہوتا ہے جو پیتل سے بنا ہوا ہوتا ہے اور مدور ہوتا ہے اور اُس سے ستاروں کی بلندی اور آفتاب کا ارتفاع معلوم کرتے ہیں ۔ (اصطر یونانی میں ترازو کو کہتے ہیں اور لاب آفتاب کو ۔ چونکہ اس آلہ سے اکثر آفتاب کے حالات معلوم کرتے ہیں ۔ اس واسطے اس کو آفتاب سے منسوب کیا گیا)

مولانا کی اصطلاح بلحاظ تناسب الفاظ نہایت مناسب ہے ۔ سحر کے یہاں چونکہ آئینہ کو اُصطرلاب کہا گیا ہے یہ بھی کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ آئینہ منقش نہیں ہوتا اور اُصطرلاب پر نقوش ہوتے ہیں لفظ شانہ بہت مناسب ہے کیونکہ شانہ حوادث کے دریافت کرنے کا ایک علم ہے ۔ جو شگون اور فال سے مراد ہے ۔ فال اور شگون بتانے والے کو شانہ بیں کہتے ہیں ۔ اور اس عمل کو شانہ بینی ۔

میر سنجر نے سترہ شعروں کا ایک قطعہ اپنے باپ میر حیدر کے پاس بھیجا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

پدرا صاحبا خدا و ندا　　　اے تو مر بندہ را خدای دوم

دعوتت از دعاے حق واجب　　　خدمتت از نماز فرض اہم

اعتراض ۔ اس قطعہ میں حرکت ماقبل روی فتح ہے ۔ یعنی میم سے پہلا حرف مفتوح ہونا چاہئے مگر دوم کا واو مضموم ہے ۔ اس واسطے کہ تمام اہل زبان اعداد میں حرکت مضموم لاتے ہیں چنانچہ آذری کے اس شعر میں یہی ہے ؎

اے خطت اول شب رازدہ بر صبح دوم　　　ابروت چشم سیہ کردہ بجوں مردم

پس اس صورت میں اختلاف توجیہ لازم آتا ہے جو کسی حالت میں جائز نہیں ہے ۔

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۹) ایک طویل قصیدہ ابراہیم عادل شاہ کی تعریف میں کہکر نذر گزرانا بادشاہ نے ایک خلعت فاخرہ اور نہایت بیش بہا زمرد کی انگوٹھی انعام دی ۔ یہ ہنوز بیجاپور میں مقیم تھا کہ شاہ عباس صفوی کا فرمان طلب پہونچا ۔ مگر قبل وصول فرمان شاہی کے فرمان قضا پہونچگیا اور ۱۰۲۱ھ میں داعی اجل کو لبیک کہکر راہی فنا ہوا ۔ نہایت خوش فکر شاعر تھا ۔ ایک دیوان اس کی یادگار ہے جو کمیاب بلکہ نایاب ہے ۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں واجب کہا گیا ہے یہاں اوجب ہونا چاہئے اس لئے کہ دوسرے مصرع کے آخر میں بھی لفظ اہم صیغہ افعل التفصیل لایا گیا ہے۔

(مولف) پہلا اعتراض صحیح ہے لیکن دوسرے اعتراض میں یہ کہنے کی گنجائش باقی ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں ہے بلکہ اگر پہلے مصرع میں بھی اہم کے جواب میں افعل التفضیل کا صیغہ لے آتے تو اور بہتر تھا۔ ورنہ ایسا بھی اکثر ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ واجب کے مقابلہ میں اوجب غیر فصیح ہے۔

مرزا رفیع سودا[لہ]۔ وانشا

سودا۔ راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کی ہجو میں کہتے ہیں ؎

تم اپنے فیل معنی کو نکالو　　　مرے ہاتھی سے دو ٹکر لڑا لو

لہ سودا میر کے معاصر اور اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا نام میرزا رفیع اور باپ کا نام مرزا محمد شفیع تھا۔ اُن کے والد تجارت کرتے ہوئے کابل سے ہندوستان پہونچے شہر دلی اس زمانے میں تمام اہل کمال۔ تاجروں اور ہنرور لوگوں کا مامن و مسکن تھا۔ یہیں کی خاک دامنگیر نے ان کا بھی دامن کھینچ لیا۔

سودا ۱۱۲۵ھ میں یہیں پیدا ہوئے۔ یہیں کی مٹی سے گوشت پوست بنا یہیں کی خو بو۔ یہیں کا رنگ ڈھنگ یہیں کی وضع قطع اختیار کی۔ یہیں تعلیم و تربیت پائی یہیں شاعری شروع کی یہیں کے مشہور و معروف استاد شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ مگر آب و دانہ اور خاک گور کی کشش نے آخر عمر میں وطن سے نکالا۔ دلی کی خانہ جنگیوں اور دشمن کے حملوں نے سوائے میر درد کے اور کسی کے یہاں قدم جمے نہ رہنے دیئے یہ بھی مسافر رہنورد بنکر وطن سے نکلے اور پہلے سیدھے فرخ آباد پہونچے نواب بنگش کے پاس رہے۔ پھر خاک گور کھینچکر لکھنؤ لے آئی۔ اور وہاں ۱۱۹۵ھ میں ہمیشہ کے لئے آغوش لحد میں سو گئے۔

انشاء اللہ خاں انشا

انشاء اللہ خاں نام تھا اور میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے اسلاف نامدار کشمیر سے آئے اور دہلی میں بود و باش اختیار کرلی نہایت شریف النسب اور فاضل اجل تھے اردو عربی فارسی ترکی مرہٹی گجراتی سب زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ نظم میں تمام اصناف کے ماہر۔ عروض و قوافی کے جاننے والے۔ زبردست نقاد تھے۔ مزاج میں ظرافت اور شوخی کوٹ کوٹ بھری ہوئی تھی۔ سن کہولت میں دلی سے نکل کر لکھنؤ آئے اور بڑے بڑے (ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۲)

اعتراض انشا - دوٹکر کی بجائے - دوٹکریں لکھنا چاہئے
جواب آزاد - یہ سید صاحب کی سینہ زوری ہے -
(مولف) آزاد نے سینہ زوری کا جواب تو دیدیا - مگر یہ نہ لکھا کہ انشا کی سینہ زوری کیا ہے - واقعہ یہ ہے کہ دلی والے اب تک اس بات کا خیال نہیں رکھتے - وہاں برابر اسی طرح بولتے ہیں - میری دو بات سن لو مجھے آپ سے دو بات کہنا ہیں - اور لکھنؤ میں اس کی پابندی کیجاتی ہے کہ اگر ایک جملہ میں ایک سے زیادہ اعداد لائیں گے تو اس کے ساتھ اسم کو بھی بطریق جمع لائیں گے - میں جب لکھنؤ کے پہلے مشاعرہ میں شریک ہوا تو مینے یہ شعر پڑھا ؎

ابھی ہاں ہاں ابھی جاتا ہوں ظالم تیری محفل سے ۔۔۔ مجھے دو بات کرلے رے مرے جھپڑے ہوئے دل سے

"دوبات" - پر مجھے لوگوں نے دیکھا - کیونکہ یہاں کی بول چال کے موافق مجھے دو باتیں کہنا چاہئے تھا - بعض لوگوں نے مجھ سے پوچھا - کہ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے - میں نے سوچا کہ آخر میں بھی انسان ہوں ہمیں کی وضع قطع ہے - مجھے کیونکر پہچان لیا - آخر یہ راز معلوم ہوا - اب جو سمجھتا ہوں تو خود میرے کانوں کو برا معلوم ہوتا ہے - یہی سید انشا کو خیال ہوا - اتفاق کی بات ہے کہ دریائے لطافت اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے - نہیں تو اعتراض اور محل اعتراض - نوعیت اعتراض کو دیکھ لیتا - سمجھ لیتا - پھر بھی جہانتک مجھے یاد ہے - انشا نے اُسی محل پر لکھا ہے - جہاں دلی اور دوسری جگہ کی زبان کے فرق دکھائے ہیں -

---

سودا و فدوی

سودا نے تو اپنے کلیات میں فدوی کو ہر جگہ یہی لکھا ہے کہ بقال بچہ ہے - پنجاب کا رہنے والا ہے مگر قدیم تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ فدوی اس وقت دو تھے اور دونوں شاہجہاں آباد کے رہنے والے

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۱) مشاعروں میں شریک ہوئے، شعراء اور فضلائے عصر سے معرکے ہوئے - ۱۲۳۳ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا - ایک کلیات ان سے یادگار ہے جس میں ہر قسم کا کلام نظم جمع ہے غزلوں - مخمسوں - مسدسوں تک پر بڑی مثنویاں اور نظمیں ہیں - ایک کتاب دریائے لطافت ہے جسے معانی و بیان کی کتاب کہئے یا تنقید کی منطق کا رسالہ کہئے یا فلسفۂ زبان کا سب کچھ موزوں ہے - اس میں بعض بعض اعتراض بھی کئے ہیں ایک جگہ سودا پر بھی کرم کیا ہے

ایک کا محمد محسن نام تھا۔ دوسرے کا مرزا بچھو۔ مگر محمد محسن فدوی کا ذکر سودا کے معاصر میر حسن نے متقدمین میں کیا ہے اور مرزا بچھو کا اپنے معاصرین اور متاخرین میں۔ اس لئے جن فدوی سے سودا کا معرکہ ہوا ہے وہ در اصل پنجاب کے باشندے تھے۔ ان کا نام مکند لال تھا۔ ریعان شباب ہی میں مسلمان ہو گئے تھے اصل وطن لاہور تھا۔ مگر دلی میں مقیم تھے اور نواب ضابطہ خان کے وظیفہ خواروں میں تھے۔ شاہ صابر علی کے شاگرد تھے۔ یہ بزرگ عہد محمد شاہی کے بڑے نامور اور مشہور و معروف شاعر تھے۔ فدوی نہایت حسن پرست، اور جانباز عاشق مزاج شاعر تھے۔ اسی حسن پرستی کی بدولت بہت سے جھمیلے ہوئے لڑائیاں ہوئیں۔ معرکے رہے۔ بعض بعض دفعہ انہیں باتوں میں چھری کٹار تک کی نوبت آگئی۔ اور یہ سخت زخمی ہوئے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے لکھا ہے کہ بعض اہل تذکرہ کہتے ہیں کہ فدوی قوم مغل سے تھے۔ فدائی بیگ نام تھا۔ سودا سے ان سے کسی طرح چل گئی اور ہجو گوئی کا ایک رن پڑ گیا۔ سودا برہنہ شمشیر تھے۔ مگر میاں فدوی بھی کچھ ایسے ویسے نہ تھے کہ دب جاتے۔ انھوں نے بھی لے ڈالا اور ایسی خبر لی کہ سودا بھی کانپ گئے ہوں گے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی کہی ہوئی ہجویں ملتی نہیں ہیں۔ ایک مصرع اور ایک بیت میاں آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے:-

کچھ کٹ گئی ہے بنی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا ۔۔۔ دُم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا

بھڑ دا ہے مسخرا ہے سودا اُسے ہوا ہے

بہرحال یہ معلوم ہوتا ہے کہ فدوی بڑے دبنگ آدمی تھے اور فن شعر و انشا سے واقفیت رکھتے تھے اسی واقفیت نے خود بیں بنا دیا تھا۔ جیسے بعض لوگوں کی خصلت ہوتی ہے کہ ہر ایک کے کلام پر ایراد اور اعتراض کرتے ہیں ایسے ہی فدوی بھی تھے جسے دیکھا دو سنا دیں۔ جس کو پایا اسی سے لڑ بیٹھے۔ سودا نے اعتراض و جواب یوں نظم کیا ہے:-

شعر پہ ہر ایک کے کرتے ہیں وہ اعتراض ۔۔۔ جامی کے دیواں سے خوب جانیں ہیں اپنی بیاض
سب پہ کرے ہے وہ طعن جتنے کہ استاد ہیں ۔۔۔ شعر پہ میرے بھی اب ان کے یہ ایراد ہیں
شعر وہ میرا سنا جا کے انھوں نے کہیں ۔۔۔ شیخ و برہمن کو ہے جس میں کہ نسبت بہ دیں
اپنی سخن فہمی پر کہتے ہیں وہ ہو کے گرم ۔۔۔ دین تو ہے شیخ کے اور برہمن کے دہرم
اس کا سخن پوچ ہے آپ ہے وہ پوچ تر ۔۔۔ شاعری و شعر پہ کچھ نہیں رکھتا خبر
سن کے غرض ہیں یہ بات بولوں ہوں جل کے ہنکر اب ۔۔۔ کھولیے ٹک گوش فہم سن لیں یہ احباب سب
میری زبانی انھیں گر ہیں یہ قرآن خواں ۔۔۔ پوچھے تو اتنا کوئی تم ہیں سے ای مہرباں

آیۂ قرآن کو کیوں دھوئے ڈالو ہو تم — کافروں کو ہے خطاب جس میں لکم دینکم
دونوں پہ اطلاق دیں از روئے قرآن ہے — خواہ برہمن کوئی خواہ مسلمان ہے
شیخ ہی سمجھے ہو دین کی نسبت فقط — اپنی زلیخائی پہ کتنے ہو بر خود غلط
دین اگر ہووے ایک جمع نہ ادیان ہو — وہ ہی نہ سمجھے اسے اُن سا جو نادان ہو
ان کا غرض اعتراض دیکھو تو معقول ہے — بات جو معروف ہے اُنپہ وہ مجہول ہے
شعر کی اُن کو سند دیکھ لیں حق کا کلام — اپنی غلط فہمی پہ طعن کریں ہیں مدام

(مولف) قدوی کا اعتراض یہ تھا کہ دین فقط مسلمان یا شیخ کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ برہمن کو دین سے مطلب نہیں۔ سودا نے جو کچھ جواب دیا وہ قاعدہ سے صحیح ہے اس لئے کہ دین کے معنی مذہب کے ہیں۔ مگر انصاف یہ ہے کہ اردو شاعری میں دین برہمن کے لئے شاید کہیں مستعمل نہیں اور اگر کہیں ہو بھی تو اس شذ و دسے عمومیت کا فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ دین موسوی۔ دین عیسوی وغیرہ تو اردو فارسی میں ہے۔ جیسے ذوق کا یہ مصرع ؎

عیسائی اپنے دیں پہ ہے موسائی اپنے دیں پہ ہے

مگر دین برہمن کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ دیکھئے عرفی دین کے لفظ کو چھوڑ کر کیش کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

بہ کیش برہمناں آنکس از شہیدان است — کہ در عبادت بُت روئے بر زمیں میرد

غالب بھی یوں بچا کر کہتے ہیں ؎

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے — مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

سودا نے قرآن شریف کی آیت کو سپر بنا لیا ہے اُس کے ہوتے ہوئے کس کو انکار کی گنجائش ہے اور کون کافر ہے جو سر تسلیم خم نہ کرے مگر قرآن شریف زبان کے قواعد اور محاورات کو بدلنے اور دنیا کے مختلف حصص زمین کی زبانوں اور محاوروں کے خلط مبحث کرنے کے لئے نہیں آیا ہے۔

شررؔ و سجادؔ

شررؔ۔ بعد مدت کے لکھا یار نے لو گر کاغذ — بھول آیا ہے وہیں ہائے پیمبر کاغذ

۵؎ آپ کا نام عبدالحلیم تھا غدر ۱۸۵۷ء کے تین سال بعد لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بزرگ چونکہ دربار واجد علی شاہی سے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ ۔ ششماہی تین روپیہ
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

د ۲۲	فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۲ء	شمارہ ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۲	نومبر ۱۹۳۲ء	شمارہ ۵

ملاحظات

اگر آج ہماری قوم سے جوتہ سینے والے فنا ہوجائیں تو ہم کو کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے اسی طرح اگر پارچہ باف، رنگریز، لوہار، سونار، بڑھئی، معمار وغیرہ معدوم ہوجائیں تو ہماری ضروریات زندگی کو کتنا سخت صدمہ پہونچے اور اِن کو بھی جانے دیجئے صرف شاعروں کو لے لیجئے کہ اُن سے زیادہ بیکار جماعت بظاہر کوئی نظر نہیں آتی، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوں تو ہماری بہت سی لطیف صحبتیں ختم ہوجائیں ——— مگر ——— خدا کے لئے کوئی بتائے کہ اگر آج روئے زمین سے اس جماعت کو فنا کردیا جائے جو ہمارے مذہب واخلاق کی ضامن بنی ہوئی ہے تو اس سے ملک وقوم کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے؟ ——

ہر چیز کی اہمیت کا اندازہ اُس خدمت کے لحاظ سے متعین کیا جاتا ہے جو اُس سے اِس دنیا میں متعلق ہوتی ہے۔ پھر اگر وہ خدمت زیادہ اہم ہے تو اُس چیز کا وجود بھی اتنا ہی اہم سمجھا جاتا ہے اور اگر وہ چنداں اہم نہیں ہے تو اس کے وجود کی بھی

زیادہ پرواہ نہیں ہوتی، یہاں تک کہ اگر کوئی چیز بالکل بیکار ہے تو اُسے مٹ جانا چاہیئے۔

اچھا اب غور کیجئے کہ اس جماعت سے کیا خدمت متعلق ہے یا اُس سے دنیا کو کیا فائدہ پہونچ رہا ہے۔ انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک وہ جس کا تعلق مادیات سے ہے اور دوسرا وہ جو اخلاقیات سے متعلق ہے۔ پھر یہ تو ظاہر ہے کہ مادی زندگی کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ نہایت فخر و ناز کے ساتھ دنیا دکاروبار دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ رہی اخلاقی زندگی سو آج تک یہی نہیں متعین ہو سکا کہ وہ کس اخلاق کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اور دنیا کا وہ کونسا اخلاق ہے جو انسان کو دنیا سے بیزاری کا درس دے سکتا ہے۔

اسلام کی گزشتہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء اور شاہان اسلام مادیات و روحانیات یا دنیا و دین دونوں کے مرکز سمجھے جاتے تھے اور اسی سلئے اسلام میں قدرتاً وہ اصول زندگی پیدا ہو گئے جو مذہب کو کاروبار دنیا اور ہنگامۂ حیات کے دوش بدوش لیجانے کے ضامن تھے اور یہی سبب تھا کہ اسلام کے عہد وسطےٰ میں جو یقیناً اس کا زریں دور تھا، ایک شخص کے لئے یہ متعین کرنا دشوار تھا کہ مسلمانوں کے اصول زندگی میں کس جگہ خط فاصل کھینچکر اُن کے دین کو دنیا سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، جاگنا سونا الغرض ان کا ہر دنیاوی عمل مذہب ہی کے لئے تھا جس طرح اُن کے تمام دینی اعمال دنیاوی ترقی کے روح رواں تھے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے حکمراں جماعت اور علماء دین کے گروہ کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر رکھا تھا اور اگر اتفاق سے کوئی قاضی یا مفتی، مولوی یا عالم حکومت کے مصالح کے خلاف کوئی فتویٰ دینے کی جرأت کرتا تھا تو اُسے قید و بند میں ڈالا جاتا تھا۔ ممکن ہے کوئی شخص اسے حکومت کی زیادتی یا سلطنت کا ظلم قرار دے لیکن جہاں تک اصول سیاست کا تعلق ہے اس طرز عمل پر نکتہ چینی کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ بہرحال مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کے عہد ترقی میں یہ جماعت کبھی آزاد و خود سر نہیں رکھی گئی اور ہمیشہ ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ حکومت کے مصالح، اور سیاست کی ضروریات کو سامنے رکھکر اپنے احکام فقہی میں تبدیلی پیدا کرتے رہیں۔ پھر یہ تو یقیناً ہوا کہ جس چیز کو سلطنت کی مصلحت بتایا گیا وہ بارہا مستبدانہ خود غرضی ثابت ہوئی۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی عالم دین نے اس خود غرضی کا احساس کر کے صدائے احتجاج بلند کی ہو اور اس کی زبان کو حرکت کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو ——

پھر غور کیجئے کہ اگر مسلمانوں کی حکومت بدستور قائم رہتی اور اگر بجائے عیسائی حکومتوں کے آج اُنھیں کی حکومت روئے زمین پر غالب ہوتی تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت جو حالت ہمارے یہاں کے علماء دین کی نظر آتی ہے، اس وقت بھی پائی جاتی۔ قیامت تک ممکن نہ تھا کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے سے احتراز کرتے اور ان کو زندہ و سلامت رہنے دیا جاتا۔ کیونکہ ایک پاپائے روم کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی کلیسہ کی دنیا علحدہ قائم کرکے کاروبار و عالم سے کوئی واسطہ نہ رکھے لیکن مسلمانوں کے ذہن و دماغ سے کبھی یہ بات نہیں نکل سکتی کہ انکا مذہب ان کی دنیا سے علحدہ کوئی چیز نہیں اور نہ کبھی

یہ بات اُن کی عقل میں آسکتی ہے کہ مذہب کے علاوہ ایک چیز قومیت و وطنیت اور بھی ہے جو غیر مذاہب والوں کو بھی اپنے میں شامل کرکے خالص دنیادی تمدنی ترقی کے لئے زبردست مرکزیت پیدا کرسکتی ہے ۔

الغرض حکومت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر کوئی مذہب چل سکتا ہے تو صرف اسی طرح کہ وہ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اپنے احکام و قوانین میں بھی تبدیلی پیدا کرے ورنہ اس کا فنا ہوجانا بالکل یقینی ہے ۔ چنانچہ آج ترکی و ایران کے حالات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ وہاں مذہب کی کیا حالت ہے اور علماء مذہب غریب کس بیچارگی و بے بسی کے عالم میں زندگی بسر کررہے ہیں ۔ ہندوستان میں جہاں نہ مسلمانوں کی حکومت ہے نہ اکثریت نہ ان میں علم ہے نہ واقفیت، مولوی جو چاہے سمجھا دے، جو بدعت جی میں آئے کرتا پھرے لیکن ترکی و ایران میں تو جاکر کہدے کہ بنک میں روپیہ جمع کرنا حرام ہے ۔

اب اتنا پڑھنے کے بعد آپ پھر ابتدائی سطور پر غور کیجئے اور ٹھنڈے دل سے فیصلہ فرمائیے کہ اس جماعت سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہونچ رہا ہے یا اس کی کیا توقع کی جاسکتی ہے ۔ حکومت تو ہماری ہے نہیں کہ یہ حضرات اس کا ساتھ دیکر عوام پر سلطنت کے اقتدار کو قوی بنائیں اور اس کے عوض میں گرانقدر معاوضے حاصل کرتے رہیں ۔ اور چونکہ یہ خون ان کے منھ لگ گیا ہے اس لئے وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ خود اپنی ہی ذات کو دنیا و دین کا مرکز قرار دیکر عوام کو اپنی طرف بلائیں اور اس غرض کے لئے وہ سب کچھ جائز و ناجائز روا رکھیں جو ان کے اسلاف نے شاہان اسلام کے لئے روا رکھی تھیں ۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایک مولوی کے تمام تعلیمات و نصائح مذہبی کا موضوع صرف مابعد الطبیعیات کی دنیا ہوتی ہے اور وہیں کے خوفناک تاریک مناظر سے ڈرا ڈرا کر وہ اپنی پرستش کرایا کرتا ہے، اسکو مطلق اس سے بحث نہیں کہ دنیا کہاں جارہی ہے، زمانہ کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے، جہل و تاریکی کس تیزی کے علم کی روشنی میں پیچھے ہٹ رہی ہے، وہ برابر یہی کہے جائیگا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسی کو برحق جانو، اور زمین کو ہمیشہ چپٹی اور ساکن سمجھتے رہو کیونکہ ہدیۂ سعیدیہ میں مولوی فضل حق خیرآبادی ایسا ہی لکھ گئے ہیں ۔ وہ اس سے بالکل ناآشنا ہے کہ اس وقت کے اقتصادی مسائل ہم سے کیا چاہتے ہیں، وہ غریب اس سے مطلق آگاہ نہیں کہ ہندوستان کی سیاسیات کا مستقبل کیا ہے، مخلوط و غیر مخلوط انتخاب کس جانور کا نام ہے، فیڈریشن کس کھیت کی مولی ہے اور راونڈ ٹیبل کانفرنس کیا بلا ہے ۔ پھر لطف یہ ہے کہ وہ اس جہل پر فخر بھی کرتا ہے اس نادانی پر نازاں بھی ہے اور کہتا ہے کہ اہل جنت تو ایسے ہی سیدھے سادھے بھولے بھالے لوگ ہوتے ہیں ۔ درآنحالیکہ یہ جنت کی مخلوق جو ان معاملات میں اپنے آپ کو اس قدر نیک و بے خبر ظاہر کرنے پر مخر کرتی ہے، کتنی ہوشیار و باخبر ہے غریبوں کا روپیہ وصول کرنے میں، اور جاہلوں کا گھر اجاڑ اجاڑ کر اپنا گھر بسانے میں ۔ جس وقت یہ کسی مجمع میں وعظ فرماتے ہوتے ہیں تو ان کی صورت و حالت یونان کے اس حیوپیٹر دیوتا کی سی ہوتی ہے جس کے ایک ہاتھ میں دوزخ کے انگارے ہیں

اور دوسرے میں جنت کی گلفشانیاں اور وہ بالکل مالک ومختار ہیں خواہ چشم زدن میں دنیا کو جلا کر خاکستر کر دیں، خواہ بہ یک جنبش چشم وابرو ہر ہر ذرہ کو گل وگلزار بنا دیں ۔ ان لوگوں کی اولین کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگوں کو دنیا وکسب دنیا کے خیال سے منحرف کر دیں ۔ اور اس کے لئے وہ بالکل غلط توجیہ وتاویل کے ساتھ کلام مجید کی آیتیں بھی پڑھتے ہیں احادیث نبوی سے بھی استناد کرتے ہیں، اقوال ائمہ کبار بھی سناتے ہیں اور مثنوی مولانا روم کے اشعار بھی خاص لحن کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس تعلیم کا مقصود حقیقی سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جب لوگ دولت کو حقیر سمجھنے لگیں گے تو بہ آسانی اسے اُن کے حوالہ کر دیں گے ۔ اسی کے ساتھ وہ دوسری نفسیاتی ضرب یہ لگاتے ہیں کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور عہد سلف کے اولیاء کرام کے واقعات سنا کر اُن کے خوارق عادات اور کرامات کی داستانیں سنانے لگتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح سیکڑوں سال کی غرق شدہ بارات کو دریا سے زندہ باہر نکال دیا، ایک شخص پر نگاہ ڈالتے ہی کیونکر اسکے دل کا تمام حال بتا دیا، کسی کے بھاگے ہوئے غلام کو کس طرح صرف ایک تعویذ لکھ کر واپس بلا دیا اور پھر آخر میں وہ سارے وعظ کی تان علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل پر توڑتا ہے اور احمق وجاہل مسلمانوں پر اپنی عظمت وبزرگی، اپنی غیر معمولی قوت روحانی اور اپنے محیر العقول کارناموں کا سکہ بٹھا کر آخر کار اُن کی جیبیں خالی کرا لیتا ہے ۔۔۔ تمام دنیا کی قومیں اس اصول پر ترقی کر رہی ہیں کہ عقول انسانی کی تربیت کے لئے تمام موانع کو دور کر دینا چاہئے، لیکن یہ فرماتے ہیں کہ نہیں عقلی ترقی روحانی انحطاط ہے اور اب دنیا میں کوئی شخص سوچنے سمجھنے کا مجاز نہیں، جو ہونا تھا ہو چکا، جو کچھ سمجھ میں آ سکتا تھا آ گیا اور اسی علم ویقین یا ضلالت وگمراہی کو سامنے رکھ کر اپنا دائرہ عمل قائم کرتے ہیں ۔ چنانچہ ان کی تصنیف وتالیف، تبلیغ واصلاح پند وہدایت سب اسی اصول کے ماتحت ہوتی ہے اور اس دائرہ سے ایک انچہ ادھر ادھر ہٹنا گوارا نہیں کرتے ۔۔ اس وقت ہندوستان میں اس قسم کے ادارے جو معمولی یا ادنیٰ قسم کے ہیں ان کا تو خیر ذکر ہی کیا، آپ بڑے بڑے اداروں کو بھی اسی مرض میں مبتلا پائیں گے اور انکی تگ ودو بھی اُسی تیلی کے بیل کی سی نظر آئے گی جس کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے اور وہ ایک ہی دائرہ کے اندر چکر لگانے کو منزلیں طے کرنا باور کرتا ہے ۔۔

ایک قوم کے اندر انقلاب کی ہمیشہ دو صورتیں ہوا کرتی ہیں، ایک یہ کہ اس قوم کے اندر حسن اتفاق سے بعض افراد صالح ایسے پیدا ہو جائیں جو قومی جمود کو دور کر دیں، یا پھر خود افراد قوم کے اندر کسی خارجی اثر سے ذہنی اضطراب پیدا ہو جائے ۔ امر اول کی تو بظاہر کوئی اُمید ہندوستان میں نظر نہیں آتی لیکن دوسری صورت کے آثار ضرور رونما ہو چکے ہیں اور ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے جو علماء دین کی تعلیمات کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگی ہے ۔ لیکن چونکہ یہاں انسان کی ذہنی وعقلی آزادی کو گہوارہ ہی سے چھیننا شروع کر دیا جاتا ہے اور نہ جانے کتنے زمانہ سے نسلاً بعد نسلٍ اس پر عمل ہوتا چلا آ رہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ یہ عادت چھٹتے ہی چھٹتے چھٹے گی اور ہندوستان کا مسلمان مستقبل قریب میں کوئی اُمید اپنے لئے قائم نہیں کر سکتا علی الخصوص اس وقت جبکہ ملک

کی ایک بڑی قوم نہضت وارتقاء کی منزل میں تیزی سے گامزن نظر آرہی ہو اور وہ اس قدر بے نیاز ہو گئی ہو کہ کون ہمارا ساتھ دے رہا ہے اور کون نہیں۔ الغرض ہندوستان کا مسلمان اسوقت جن راہوں سے گزر رہا ہے وہ اس قدر دشوار گزار ہیں کہ اگر کوئی فوری انقلاب نہایت ہی شدید قسم کا ان میں رونما نہ ہوا تو ان کے نجات کی کوئی صورت نہیں اور ان کا بالکل وہی حشر ہوگا جو ہسپانیہ کے مسلمانوں کا ہوا کہ چند منہدم آثار تو ان کے باقی رہ گئے ہیں لیکن وہ خود کہیں نہیں پائے جاتے۔ ہندوستان کا مولوی یا عالم دین (جو بدقسمتی سے ہمارا قائد ورہنما، ہمارا محافظ ومصلح بنا ہوا ہے) دوزخ وجنت کی روایات بیان کرنے میں رات دن لوگوں سے نمازیں پڑھوانے کی فکر میں تو بیشک منہمک نظر آتا ہے۔ لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کرتا کہ جس قوم سے وہ اپنے لئے لذائذ دنیوی حاصل کر رہا ہے اسکی اقتصادی حالت کیا ہے اور اس کا انحطاط کس حد تک پہونچ چکا ہے۔

میں کہتا ہوں بہ آواز بلند کہتا ہوں اور بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے کہ مسلمان نماز پڑھتا ہے یا نہیں روزے رکھتا ہے یا نہیں، دوزخ وجنت کا قائل ہے یا نہیں بلکہ صرف یہ سوچنے کا ہے کہ مسلمان کے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں۔ اگر علماء دین ہمارے حقیقی بہی خواہ ہوتے اور ان کے دلوں میں ہمارا سچا درد ہوتا تو اس وقت تمام مواعظ مذہبی کو چھوڑ کر صرف اس پر غور کرتے کہ مسلمان اپنا پیٹ کس طرح بھریں۔ ان کے بچے بھوک کی تکلیف سے کیونکر محفوظ رہیں اور انکی عورتیں کس تدبیر سے اسباب ستر پوشی حاصل کر سکیں ــــ آپ ایک مسلمان کو موٹر پر سوار، نفیس لباس پہنے ہوئے دیکھ کر اس کی خوشحالی ومسرت کا اندازہ نہ کیجئے بلکہ اس کے گھر میں جا کر دیکھئے کہ کیا حالت ہے اور اس کے دل میں سما کر معلوم کیجئے کہ وہ کس تکلیف وعذاب میں مبتلا ہے ــ پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے اس قاید ورہنما کو ہمارے اس دینی ودنیوی رہبر کو کبھی اس کا خیال ہوا ہے کہ جس وقت وہ اپنے وسیع دسترخوان پر نفیس نفیس غذائیں کھانے میں مصروف رہتا ہے، ٹھیک اسی وقت اسکی پڑوس میں کتنے مسلمان ایسے ہیں جو بھوکے پیاسے پڑے ہوئے ہیں اور کتنے بچے ایسے ہیں جنکی مائیں اپنی خشک چھاتیوں سے ایک قطرہ دودھ کا ان کے منھ میں نہیں ٹپکا سکتیں۔ جسوقت وہ حریر وکمخواب، یا لکھنؤ کی باریک چکن اور ولائتی تہذیب کی اچکن پہن کر، پاؤں میں زرکار جوتی کو دیکھتا ہوا ایک ادائے معشوقانہ کے ساتھ موٹر پر سوار ہونے کے لئے گھر سے باہر نکلتا ہے۔ کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی اس کا خیال اس حقیقت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس کی قوم کے کتنے افراد اس وقت جھلسا دینے والی دھوپ میں ننگے بدن، برہنہ پا پتھر توڑ رہے ہیں۔ کیا اس سے زیادہ دنیا میں کوئی بےغیرتی، بے حیائی اور بے شرمی ہو سکتی ہے کہ جو افراد فاقہ کر کرکے، اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کے لئے یہ نعائم ولذائذ فراہم کرے انھیں کے درد دکھ کی طرف سے وہ یوں بےخبر وبے پرواہ رہے ــ ہرچند فرعون ونمرود کو گزرے ہوئے زمانہ گزر گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی اولاد اتبک دنیا میں باقی ہے اور اُسی اخلاق سوز، وانسانیت شکن خصوصیات کے ساتھ باقی ہے جو کسی وقت اُن کے اسلاف میں پائی جاتی تھیں مگر صرف یہ ہے کہ ان پر عذاب نازل ہو چکا اور ان کے لئے ہنوز دست خدا میں انتظار کر رہا ہے۔

لکھنوی علماء کے کسی مجمع میں ایک بار میں نے دریافت کیا کہ "فرمائیے آپ کیا ارادہ ہے اور قومی فلاح وبہبود کے لئے کونسی عملی تحریک آپ کے پیش نظر ہے" ان میں سے ایک نے کہا کہ "ہاں عرصہ سے ہمارا خیال ہے کہ یہاں کے مسلم کلب کی حالت درست کی جائے اور

انسائیکلو پیڈیا کے قسم کی ایک کتاب اردو میں لکھی جائے"۔ یہ سنتے ہی میرے بدن میں آگ لگ گئی، میں نے کہا "قبلہ! اپنے جھونپڑے کو محل بنانے سے پہلے کیوں آپ اس کی آرائش و زینت کی فکر میں مبتلا ہیں، تمدن کی ترقی، جاہ و ثروت کے تنعم کے ساتھ یہ سب کچھ اپنے آپ ہو رہے گا، نہ جانے کتنے کلب قائم ہو جائیں گے، کتنی انسائیکلو پیڈیا بن جائیں گی۔ اسوقت تو سوال جزحیات کا ہے، بقاء زندگی کا ہے، تن پوشی اور دفع گرسنگی کا ہے۔ اس لئے طریقۂ زکوٰۃ کو منظم کیجئے، قومی بیت المال کی طرح ڈالئے، گھر گھر جاکر دیکھئے کہ کون کس حال میں مبتلا ہے اور سب سے پہلے اس زخم کا علاج کیجئے جس نے ساری قوم کو مفلوج بنا رکھا ہے"۔ یہ سنکر فرمانے لگے "کہ ہاں، تحریک یہ بھی ضروری ہے اور انشاء اللہ الرحمان اسپر غور کریں گے"۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ جب مولوی کسی بات کو انشاء اللہ سے شروع کرتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔

یہ ہے حال ان تمام اداروں کا جنھیں ہم مدرسہ و خانقاہ کہتے ہیں اور جہاں سے یہ زہریلے افعی نکل نکل کر ہندوستان کی تمام مسلمان آبادی کو ڈس رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ادارے ایسے ہیں جو صرف تصنیف و تالیف کے لئے وقف ہیں اور جن کے مدیروں کو فخر ہے کہ وہ دنیا میں بڑا کام کر رہے ہیں، مسلمانوں کی عظیم الشان خدمت انجام دے رہے ہیں، لیکن چونکہ انکی ذہنیتیں بھی اسی مسموم ماحول میں پیدا ہوئی ہیں، اس لئے ان کی جملہ تصانیف بالکل غیر ضروری، غیر اہم بلکہ ایک حد تک مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں۔ یہ بڑی بڑی کتابیں تاریخ و جغرافیہ کی لکھ رہے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت داستان پارینہ دہرانے سے زیادہ کچھ نہیں، یہ فلسفہ و مذہب پر موٹی موٹی تالیفات پیش کر رہے ہیں، لیکن بالکل اُس اندھے کی طرح جس کا سہارا ایک لکڑی کے سوا کچھ نہ ہو۔ اول تو اُن کو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ وقت اس قسم کی تصنیف و تالیف میں ضایع کرنے کا نہیں۔ بلکہ دوڑ کر اپنے آپ کو طوفان میں ڈالدینے اور ڈوبتے ہوؤں کو باہر نکالنے کا ہے، اور اگر یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے تو پھر کم از کم ایسے لٹریچر پیش کرنے کا ہے جو دوسروں میں یہ ولولہ پیدا کرے۔ جس وقت کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو علوم و فنون کا ذخیرہ وہ خود اپنے ساتھ لے آتی ہے اور رہر جگہ علمی ادارے قائم ہونے لگتے ہیں، لیکن جب اس میں انحطاط ہوتا ہے تو یہ ادارے خود بخود ضعیف ہونے لگتے ہیں اور ان کو کوئی قوت سنبھال نہیں سکتی۔ اس لئے جس رنگ کی تصانیف ہمارے یہاں کے بڑے بڑے مصنفین پیش کر رہے ہیں، وقت کے لحاظ سے بالکل لغو و بیکار ہیں اور ان سے ملک و قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا، بلکہ مضرت کا اندیشہ ہے کیونکہ انکا موضوع اور ان کے اصول ترتیب وہی آزادی عقل و ضمیر کے چھیننے والے اور اندھی تقلید کو مضبوط کرنے والے ہیں جس نے مسلمانوں کو نکبت و ذلت کی اس منزل تک پہونچا دیا ہے۔

پھر جب حالات یہ ہیں تو سوال صرف یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے اور اپنی بقاو تحفظ کے لئے کیا تدابیر عمل میں لانا چاہئے۔ اس کا جواب نہایت آسان ہے اور آئندہ اشاعت میں ہم اس پر مفصل بحث کریں گے۔

نیاز

صفحہ ۱۱ پر جو اعلان جنوری سنہ ۱۹۲۳ء کے نگار کے متعلق شایع ہوا ہے اُسے منسوخ سمجھئے

جنوری سنہ ۲۳ء کا نگار کم از کم ۱۶۰ صفحات کا ہوگا اور وقف ہوگا صرف ایک موضوع کیلئے

جسے انگریزی میں (Sexology) کہتے ہیں اور میں اسکو "شہوانیات" کہتا ہوں عنوانات کی فہرست ذیل میں ملاحظہ ہو:—

فحاشی کی تعریف — اس کے متعلق مختلف نظریے — فحاشی کی ابتدا — اس کے مختلف اسباب فحاشی علم الحیات کے نقطۂ نظر سے — اس کا اخلاقی پہلو — اس کا اثر تمدن پر — فحاشی وحشی اقوام میں — اس کے محرکات — مذہبی فحاشیاں — فحاشی کی قسمیں :—

استلذاذ بالضد — استلذاذ بالمثل — استلذاذ بالنفس — استلذاذ بالوحوش —

استلذاذ بالخیال ان کے اسباب ونتائج اور تاریخی قدامت —

فحاشی عہد قدیم میں — عہد قدیم میں زن ومرد کے تعلقات — یونانیوں اور اہل روما کی فحاشیاں — ہندوستان قدیم کی فحاشی — فحاشی دیگر ممالک مشرق میں — فحاشی عہد وسطیٰ میں — فحاشی اور اثرات مسیحیت — فحاشی پر حالات مجلسی کا اثر — دور احیاء علوم وفنون اور فحاشی — تغیرات معاشی وصنعتی کا اثر فحاشی پر — دور حاضر میں یورپ کی فحاشیاں — یورپ کی ناجائز اولاد — دوشیزگان فرنگ — مختلف ملکوں کے قحبہ خانے — انسداد فحاشی کی تدابیر — نکاح کی ابتدا — وحدت ازدواج — اشتراک فی النسواں — نظام امتہالی — نظام بطریقی — اقسام ازدواج — طلاق وخلع کی صورتیں مختلف ممالک میں — اسقاط حمل — استقرار حمل مصنوعی ذرایع سے — فحاشی کا مستقبل — وغیرہ وغیرہ — اس قسم کے سیکڑوں عنوانات ہیں۔

الغرض یہ ایک مستقل کتاب ہوگی جس میں پوری تفصیل ووضاحت کے ساتھ ہر قسم کی تاریخی، علمی، نفسیاتی اور جنسی تحقیق پیش کی جائے گی۔

اڈیٹر ۔ نگار لکھنؤ

عریانی و عریانیات

تہذیب کے اس دور میں عریانی کی قدر وقیمت اور اس کے نفسیاتی اثرات' پر بحث کرنا جرارت کا کام ہے۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں اتنی اخلاقی جرارت ہو کہ اگر وہ برہنگی کو خلاف شرم نہ سمجھتا ہو تو اس رائے کا اظہار ہی کر دے چہ جائیکہ اس پر عمل کرنا۔

بہر حال یہاں برہنگی اور اس کے متعلقہ مسائل سے علمی بحث کی جارہی ہے اور یہ بتایا جانا مقصود ہے کہ بچوں کو برہنگی سے کس حد تک مانوس کرنا چاہیے اور اسکے نفسیاتی اثرات کیا ہیں۔ اس مسئلہ پر مختلف زمانوں میں مختلف رائیں پائی گئی ہیں اور موجودہ زمانہ کے علماء تعلیمیات کے ذہن میں تو ایک عظیم الشان تغیر اس باب میں پیدا ہو گیا ہے یہ رائیں کیا تھیں اور یہ تغیر کیا ہے ان کے دلائل و وجوہ سے اس مضمون میں واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

یونانِ قدیم' اقوام عالم کا رہنما' علم کا آماج گاہ' فلسفہ و سائنس کا معلم اس مسئلہ کے متعلق واضح تعلیم دیتا ہے اسپارٹا اور یونان کے مختلف شہروں میں کسی زمانہ میں عورتیں برہنہ رقص کرتی تھیں اور بدنی ریاضتوں میں مشغول رہتی تھیں اور برہنہ مرد بھی وہاں موجود ہوتے تھے۔ فلاطون نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ریپبلک میں عریانی کے رواج کو پسند کیا ہے اور جو لوگ اس کا استہزا کرتے تھے ان کی رائے کو وہ "شجر علم کا کچا پھل" کہتا ہے عمر کی آخری منزل تک فلاطون نے اور مسایل میں بہت سی رائیں بدلیں لیکن اس مسئلہ میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا "قوانین" جو ان کے فلسفیانہ فکر کا آخری نتیجہ ہے اس میں بھی وہ اس رائے کی تائید کرتا ہے اور زندگی کے تمام کاموں میں مرد و زن کے تعاون کو ضروری سمجھتا ہے تاکہ خواہش نفسانی کی تیز دھار کند ہو جائے۔ اسی غرض سے وہ نوجوان مردوں اور عورتوں کے باہمی میل جول کو ضروری سمجھتا ہے۔ یہ اس ہستی کی رائیں ہیں جس نے فلسفہ و مذہب میں نظام "تصوریت" پیش کیا تھا اور اس سے زیادہ حیرت انگیز و شاندار نظام فکر انسان کی تخلیقی قوت نے پیدا ہی نہیں کیا۔

اہل روما کے نزدیک برہنگی و بے شرمی مترادف تھے' انھیں یونانیوں کی طرح برہنگی کے اخلاقی و اصلاحی اثرات کا ادراک نہ تھا ان کے یہاں عریانی اسٹیج کی حد تک محدود تھی اور عوام اس سے لطف اندوز ہوتے تھے فلورالیا میں تو لوگ اس کو اپنا حق سمجھتے تھے کہ ایکٹروں کو اسٹیج پر برہنہ ایکٹ کرتا دیکھیں لیکن یہاں کام کرنے والوں کے

لئے ان کے نزدیک سوائے حقارت کے اور کوئی تحفہ نہ تھا۔

یوں تو عیسائیت نے فلاطون کے بہت سے خیالات کو قبول کیا لیکن برہنگی کے متعلق فلاطون کی رائے اس کے نزدیک کسی طرح قابل قبول نہ تھی۔ کیونکہ عیسائیت نے مجنونانہ اشتداد کے ساتھ حیوانی جذبات و خواہشات کے خلاف جنگ جذبہ شروع کردی تھی اور چونکہ ان خواہشات کا خارجی مظہر انسانی بدن ہے اس لئے ان کا نظریہ یہ تھا کہ خواہشات بُرے تو بدن بھی بُرا اور اس لئے بدن کو بھی مستور رکھنا چاہئے! حالانکہ ان کو سمجھنا چاہئے تھا کہ اس طرح بدن کو مستور رکھنا اور زیادہ خواہشات نفسانی پیدا کردینے والا ہے۔

اس کے بعد ہرچند عیسائیت سارے یورپ پر مسلط ہوگئی تھی اور یونان کی "خواہش زندگی" یا مسرّت حیات "گناہ" و "مرتاضیت" کے خیالات سے افسردہ ہوگئی تھی لیکن برہنگی کا قلع قمع پھر بھی نہ ہوسکا۔ مختلف رسوم میں اور مختلف مواقع پر لوگ کسی نہ کسی حد تک ضرور برہنہ نظر آتے تھے۔ پبلک حماموں میں مرد و عورت برہنہ دکھائی دیتے تھے۔ اور بقول شالٹز اعلیٰ خاندان کی عورتیں ان حماموں میں بالکل برہنہ نہایا کرتی تھیں اور ان کے جسم پر سوائے ایک ہار اور ٹوپی کے کچھ نہ ہوا کرتا تھا۔ سولھویں صدی میں فرانس کی عورتیں اپنے عشاق کو نہاتے وقت بلالیا کرتی تھیں۔ اعلیٰ خاندان کی عورتوں نے کمر تک برہنہ ہوکر اپنی تصویریں کھنچوائی ہیں چنانچہ شانتی لے میں اس قسم کی متعدد تصویریں مل سکتی ہیں۔

برہنگی کے خلاف تحریک کہیں انیسویں صدی میں آکر پوری کامیاب ہوتی ہے، اس صدی میں پبلک مقامات میں ہر طرح کی برہنگی بالکل منع کردی گئی لیکن یہ واقعہ ہے کہ اب یہ تحریک کوئی مذہبی و اخلاقی تحریک نہ رہ گئی تھی بلکہ محض رسمی چیز ہوگئی تھی، چنانچہ انیسویں صدی کا مرد جب کسی برہنہ عورت کو دیکھتا تو یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اسکی غیرفانی روح اب نجات ابدی کی مستحق نہیں رہی یا یہ کہ ان کے اخلاق گندہ ہوگئے یا کفارہ اس پر لازم ہوگیا۔ بلکہ وہ اس نظارہ کو محض "ناشائستہ" یا زیادہ سے زیادہ "قابل نفرت" سمجھتا تھا۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ وہ عریانی کو عواید رسمیہ یا زیادہ سے زیادہ ذوق جمالیات کے خلاف سمجھتا تھا۔

رفتہ رفتہ اسی صدی میں برہنگی کے متعلق نئے خیالات کی ابتدا ہوئی اور جسم انسانی کو روحانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا۔ بلیک نے انگلستان میں اپنی صوفیانہ تعلیم کی اشاعت شروع کی جس میں انسانی جسم کی روحانی شان کا اظہار تھا اور لباس کی طرف سے بیزاری و حقارت ٹپکتی تھی۔ اسی طرح جرمنی میں فریڈرش شلی گل، امریکہ میں وھٹمن، تھورو، بروز نے بھی فطرت کی طرف رجوع کرنے کی دعوت شروع کردی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں مہذب ممالک میں برہنگی کی قدر و قیمت اور اس کی ضرورت پر کافی لٹریچر شایع ہونے لگا۔ تھورو ۱۸۵۲ میں چند لڑکوں کو ندی میں برہنہ نہاتے ہوئے دیکھ کر لکھتا ہے "ان کے جسموں کا رنگ

دھوپ میں فاصلے سے خوش کن معلوم ہوتا ہے۔ مجھے ان کے کھیل کود کی آوازیں پانی پر تیرتی سنائی دے رہی ہیں۔ ہمیں اب تک فطرت کے خوش نصیب انسان میسر نہیں۔ کیا ہی تعجب خیز بات ہوگی اگر کوئی فرشتہ زمین پر سیر کرنے آئے اور اپنی نوٹ بک میں یہ یادداشت لکھ کے جائے کہ زمین پر انسان کو اپنا جسم ظاہر کرنے پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں!"

سٹراٹز کہتا ہے کہ مشرکوں نے تو اپنے برہنہ خداؤں کی پرستش کی، لیکن حضرت مسیح کے پیروؤں نے اس خیال کو پیدا کیا کہ برہنگی شہوت پرستی ہے اس لئے مخرب اخلاق ہے حالانکہ صلیب کی آسمانی بلندیوں پر خود مسیح کا برہنہ جسم ضیا پاشی کر رہا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برہنگی کی ایک نئی شکل نمودار ہو رہی تھی جس کو فنی برہنگی کہنا چاہئے۔ اس کی ابتدا قدیم یونانیوں سے ہوئی اس میں شک نہیں کہ فنی برہنگی اپنی نوعیت میں برہنگی کے فطری یا شہوانی تصور سے بالکل جدا چیز ہے۔

لیکن انیسویں صدی میں برہنگی کا جو نیا پہلو اختیار کیا گیا اس کا تعلق اخلاق و روحانی فوائد سے نہ تھا، بلکہ حفظان صحت سے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ان تمام نیم مہذب اقوام پر نظر کرو جو اپنی زندگی تقریباً برہنہ بسر کرتی ہیں اور ان کی صحت و قوت کو دیکھو جہاں کہیں ان ابتدائی اقوام نے برہنگی کو ترک کر کے لباس اختیار کیا فوراً بیماری درد، دکھ اور زوال ان میں نمایاں ہونے لگے، اس میں شک نہیں کہ لباس کے استعمال کے ساتھ دوسری بری عادتیں بھی عام طور پر سیکھ لی جاتی ہیں۔ جو ان کے انحطاط کا باعث ہوتی ہیں، لیکن یہ مسلمہ امر ہے کہ تمام توانا و قوی وحشیوں میں عام طور پر برہنگی رائج ہے

جرمنی میں ڈاکٹر لوڈر اور ان کی ولڑ نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں اور صرف حفظان صحت کے لحاظ سے بلکہ اخلاقی و فنی لحاظ سے بھی اس کی تائید کی۔ ان کے نزدیک بدنی ریاضتوں میں برہنگی علاج اور اصلاح کا بہترین طریقہ ہے رکلی نے آسٹریا میں "آفتاب و ہوا کے غسل خانے" کھولے۔ اس کا قول تھا کہ "روشنی، صداقت اور آزادی، طبعی و اخلاقی صحت کے زبردست محرک ہیں" مختلف بیماریوں میں غسل آفتابی کی اہمیت کو طب نے تسلیم کر لیا ہے اور جرمنی میں آج کل بیشمار "آفتابی غسل خانے" رائج ہوگئے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر لنکاموق عصبی امراض، کمی خون وغیرہ ——— میں اسی قسم کے غسل کی ہدایت کرتا ہے۔ ہائٹر خارش کی اصل وجہ آفتاب کی روشنی کی کمی قرار دیتا ہے کیونکہ یہ حبشیوں اور گرم ممالک میں نہیں پائی جاتی۔

اس مجمل (شاید آپ کے نزدیک مہمل!) تاریخی خاکہ کے بعد ہمیں اپنے ہم عصروں کے خیالات اور دلائل پر ذرا تفصیل سے نظر کرنا ہے۔

ان دنوں جن علمائے تعلیمات کی نظر نوجوانوں کی حفظان صحت وجنسی ضروریات پر حاوی ہے وہ ان کی اخلاقی

وبدنی صحت کے لئے برہنگی کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں' ان سب کے نزدیک بدن کا کھلی ہوئی صاف ہوا پانی اور روشنی میں رہنا بدنی صحت کا باعث ہے۔ برہنہ بدن سے مانوس ہونا خواہش حیوانی کو دور کرتا ہے' حاسہ جمال میں شائستگی پیدا کرتا ہے اور صحت روحانی کو ترقی دیتا ہے لیکن برہنگی کا رواج کس حد تک فروغ پائے اور کس عمر میں اسکی ابتدا ہو — یہاں آکر رایوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر گرہارڈ کہتا ہے کہ پہلے پختہ عمر کے حضرات کی اس بارے میں تعلیم ہونی چاہئے کیونکہ جنسی معاملات میں بچوں سے زیادہ یہی تعلیم و تفہیم کے محتاج نظر آتے ہیں۔ والدین بچوں کو ابتدا ہی سے شہوت پرستی کی تعلیم دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حیا اور اخلاق ان کے ذہن نشین کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف خود اپنی ابتدائی زندگی کے حالات پیش کرتا ہے جو کسی گرم ملک میں بسر ہوئے تھے اور جہاں وہ شروع ہی سے برہنگی کا عادی تھا وہ لکھتا ہے کہ جب میں اپنے وطن جرمنی میں آیا تو میری عمر بیس برس کی تھی' وطن پہونچتے ہی مجھے یہ بتایا گیا کہ جسم انسانی شاید کوئی مکروہ چیز ہے اور اُس کو پوشیدہ رکھنا چاہئے۔ چنانچہ جب جسم انسانی میری نگاہوں سے بالکل پوشیدہ کر دیا گیا اور متعدد دفعہ مجھ سے یہ کہا گیا کہ کپڑوں کے اندر کوئی شرم انگیز چیز مستور ہے تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ کیا معاملہ ہے ...... اس وقت تک میں یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ برہنہ بدن صرف اپنی برہنگی کی وجہ سے شہوت خیز احساسات پیدا کر سکتا ہے۔ مجھے اس قسم کے احساسات کا تجربہ ضرور تھا۔ لیکن یہ برہنہ بدن کو دیکھنے سے نہیں پیدا ہوتے تھے۔ بلکہ ہماری روحوں کے امتزاج سے رفتہ رفتہ شگفتہ ہوتے تھے" ممکن ہے کہ قدیم روایات میں نشو و نما پائے ہوئے لوگ اس واقعہ کو بالکل سمجھ نہ سکیں' لیکن ہمارے مشورہ کو جو ابتدا اسی مضمون میں پیش کیا گیا ہے ملحوظ رکھکر وہ خلاف طبیعت خیالات کی صحت پر غور کرنے کی عادت ڈالیں اور جذبات کو عقل کا خادم سمجھیں نہ کہ اس کے برعکس!

اسی طرح فارل' گرہارڈ کا ہم زبان ہو کر کہتا ہے کہ اگر ابتدا ہی سے بچوں کے سامنے جسم کے چھپانے کی کوشش کی جائے گی تو ضرور وہ آئندہ چلکر برہنگی کو شہوانی جذبات کا ہیجان سمجھنے لگیں گے' لیکن اگر شروع سے یہ بات ان کے ذہن نشین کر دی جائے کہ جسم میں کوئی عضو غیر فطری نہیں جس کی وجہ سے ہم شرمندہ ہوں تو یہ جذبہ ابتدا ہی سے دور ہو جائے گا۔

برہنگی کا بچوں پر مخرب اخلاق یا شہوانی اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ ان میں ہیجانات شہوانیہ کی تکمیل نہیں ہوتی ہے اس لئے جہاں تک جلد ممکن ہو سکے اُنھیں برہنگی سے مانوس کر دینا چاہئے تاکہ جنسی احساسات کا قبل از وقت نشوونما نہ ہو۔ اس طرح بچے ابتدا ہی سے ناپاک اثرات سے محفوظ ہو جائیں گے اور بعد میں جب برہنگی سے واسطہ پڑے گا تو ان میں شہوی جذبات پیدا نہ ہوں گے۔

اسی طرح بولشے کہتا ہے کہ نہاتے وقت تو ہم ایک حد تک برہنہ ہوتے ہیں' لیکن ضرورت ہے کہ جسمانی ریاضت

کے وقت بھی برہنہ ہوں۔ پہلے پہلے مرد عورت علیحدہ علیحدہ برہنہ ہوں لیکن جب ہم اس خیال سے مانوس ہو جائیں تو بعض اوقات دونوں ایک ساتھ ہو جائیں۔ ہم میں یہ قابلیت پیدا ہونی چاہیئے کہ غیر جنس کے افراد کے برہنہ جسم کو اس قدر ضبط نفس اور پاک باطنی سے دیکھ سکیں کہ برہنگی مہیج شہوت نہ رہے۔

بہرحال ان علماء کا یہ خیال ہے کہ عہد طفولیت ہی سے بچوں کو برہنگی سے مانوس ہونا چاہیئے، ہر خاندان میں اسکے موقعے موجود ہیں مثلاً کھیل کود میں، باغ میں، اور خصوصاً نہاتے وقت اگر کسی خاندان میں صرف ایک ہی جنس کے بچے ہوں تو والدین کو چاہیئے کہ کسی دوسرے خاندان سے جہاں دوسری جنس کے ہم عمر بچے موجود ہوں دوستانہ تعلقات قائم کریں تاکہ یہ آپس میں مل جل کر رہیں اور انس و محبت کی فضا میں نشو و نما پائیں۔ اس طرح برہنگی شہوت انگیزی کے ہم معنی نہ رہیگی بلکہ ایک معصوم فطری چیز ہو جائیگی اور احساسِ جمال میں شائستگی پیدا کرے گی۔

اس امر کے واضح کرنے کی غالباً ضرورت نہیں کہ برہنگی اور بے شرمی دونوں علیٰحدہ علیٰحدہ چیزیں ہیں اس لئے اگر برہنگی کی وجہ سے نوجوان خود اپنی ذات کو حقیر سمجھنے لگیں یا اپنے بزرگوں کی وقعت ان کے دل میں باقی نہ رہے تو جان لینا چاہیئے کہ برہنگی کے لئے ہم نے بہت زیادہ قیمت ادا کی ہے۔ یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ فقدانِ لباس اور فقدانِ حیا میں کوئی نسبت لزومی نہیں ہے، کیونکہ اکثر وحشی قبائل جو بالکل برہنہ زندگی بسر کرتے ہیں، اِن وحشیوں سے زیادہ حیا دار ہوتے ہیں جو کپڑے پہنے رہتے ہیں۔ پلوٹارک کا بھی یہی خیال تھا کہ حیا کا تعلق لباس سے ضروری نہیں، کیونکہ باحیا عورت کا لباس خود اس کی حیا ہے اور اگر کبھی وہ اپنی چادر دور کرتی ہے تو حیا کے آنچل کی اوٹ کر لیتی ہے۔ جاپان کی ایک ممتاز خاتون نے ڈاکٹر ہیلز سے کہا تھا کہ "عورت برہنہ ہونے کے باوجود حد درجہ شریفانہ زندگی بسر کر سکتی ہے"

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے یہ سوال بڑا اہم ہے کیونکہ قومی روایات کی وجہ سے ہم برہنگی کو بے شرمی کا مترادف سمجھنے لگے ہیں اور جب ہم اس نقطۂ نظر سے ایک برہنہ عورت کو دیکھتے ہیں تو وہ فوراً ہماری نیت کا حال جان لیتی ہے اور جذبۂ حیا اس کو ستر پوشی پر مجبور کر دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر ممالک میں جہاں عورتیں برہنہ رہنے کی عادی ہیں یورپین سیاحوں کی بُری نگاہوں کی تاب نہ لاکر اپنے جسم کو ڈھانک لیتی ہیں۔ سٹرائز جس کا کچھ زمانہ جاپان میں گزرا ہے یہاں کی عورتوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ غیر ممالک کے باشندوں کے سامنے برہنہ جانے سے انکار کرتی ہیں۔ سٹرائز خود چونکہ ڈاکٹر تھا اور جاوا میں ایک عرصہ تک رہ چکا تھا جہاں برہنگی کا عام رواج ہے اسلئے جاپانی عورتیں اس کے سامنے برہنہ آنے سے احتراز نہیں کرتی تھیں۔

جذبۂ حیا کی طرح "جذبۂ نمود" بھی بالکل فطری ہے اور اسی جذبہ کے تحت نہ صرف نیک طینت و پاکباز مردوں میں بلکہ نوجوان عورتوں میں بھی یہ میلان پایا جاتا ہے کہ اپنے خوبصورت بدن کو نہ صرف خود دیکھیں بلکہ مناسب

[redacted]

موقع و محل، پر غیروں کے سامنے بھی اس کی نمائش کریں، وحشیوں میں بھی یہ بات دیکھی گئی ہے کہ اپنے جسم اور اعضاء کے حسن اور نشوو نما پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سیرے کہتا ہے کہ عضو جنسی کو چھپانے کی خواہش صرف ان نوجوانوں میں پائی جاتی ہے جن کا نشوو نما پوری طرح نہ ہوا ہو لیکن جو فطری طور پر اچھی طرح نشوو نما پاتے ہیں ان میں یہ جھجک بہت کم پائی جاتی ہے۔

برہنگی کا سب سے پہلا فایدہ تو یہ ہے کہ نوجوانوں کی جنسی صحت (Sexual Hygiene) پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ دوسرا فایدہ یہ ہے کہ اس کا اثر ان لوگوں پر بھی اچھا پڑتا ہے جو عمر میں کسی قدر زیادہ ہیں کیونکہ اس سے ان کا حاسۂ جمال نشوو نما پاتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ برہنگی کا رواج اخلاق انسانی پر ایک قسم کا قوی نفسیاتی اثر ڈالتا ہے اور بجائے ضعیف و منفی اخلاق کے انسان میں قوی اور ایجابی اخلاق پیدا ہونے لگتا ہے۔

بہت کم لوگ اس امر سے واقف ہوں گے کہ بچے جنس مقابل کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے کس قدر وقت، صبر، اور ذہنی قوت کو کام میں لاتے ہیں۔ ان کی یہ ساری کوششیں راز میں ہوتی ہیں، لیکن بعض وقت یہ راز فاش ہو جاتا ہے اور قانون کی نگاہوں میں "جرم" قرار پاتا ہے! جرمنی کے ایک مشہور مقنن نے حال ہی میں کہا تھا کہ اگر بچوں میں جنس مخالف کے اعضائے جنسی اور ان کے فرائض سے ایک قسم کا انس پیدا کر دیا جائے تو نوے فیصدی ناجائز حرکات کا خاتمہ ہو جائیگا۔

نوجوانوں کے فطری تجسس کو کم کرنے کے علاوہ برہنگی کی روحانی اہمیت بھی ظاہر ہے۔ بالغ السن حضرات کے لئے جو نوجوانی کے جذبات کو رخصت کر چکے ہوتے ہیں برہنگی ایک قسم کی تحریک روحانی ہے، کیونکہ انسان کے جسم کا نظارہ ہمارے لئے دنیا میں سب سے زیادہ قریبی چیز ہے اور اس کی طاقت، اس کی لطافت و حلاوت زندگی کی بہترین نعمتوں میں سے ہے۔ دنیا کی کوئی حسین چیز حتیٰ کہ خوبصورت پھول، خوشنما ستارے شباب انگیز سمندر بھی جسم انسانی سے زیادہ حسین و مسرت بخش نہیں! کسی نے خوب کہا ہے "عورت کے جسم کی قوت محض مادی نہیں ہے بلکہ اس کی قوت اسی طرح روحانی ہے جیسی موسیقی کہ اس کا اثر ہوا کے ارتعاشات مٹنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے"

بولشے نے خوب کہا ہے کہ ہمیں انسان کے برہنہ جسم کو انھیں نگاہوں سے دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے جن نگاہوں سے ہم ایک خوبصورت پھول کو دیکھتے ہیں ہمیں اس کی قوت، صحت و حسن سے کیف اندوز ہونا چاہئے، کیونکہ پھول محض برہنہ جسم، ہی نہیں بلکہ وہ جسم کا ایک نہایت مقدس حصہ ہے یعنی پودے کا عضو نسلی ہے!"

ایک مشہور آسٹرین مصنف کا بیان ہے کہ وہ ایک روز دنیا سے تنگ تھا، اتفاقاً اس کی نگاہ ایک معصوم لڑکے پر جا پڑی جو بالکل برہنہ تھا، اس کے چہرے کی خوبصورتی، اس کے ہاتھ پاؤں کی نفاست نے" (وہ کہتا ہے)

"میرے دردمند دل کو مسرت اور نئی اُمیدوں سے بھر دیا، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں نے دل میں کہا کہ جب تک دنیا میں حسن کا وجود ہے میں اپنی ناکام کوششیں بھی برابر جاری رکھونگا"!

آخر میں برہنگی کا اخلاقی سوال پیش ہوتا ہے۔ گزشتہ پچاس سال سے اس پر کافی بحثیں ہو رہی ہیں، تاہم عوام الناس اس سے مانوس نہیں ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسم انسانی کوئی حقیر شے نہیں، اور اس کے نظارے میں دو عنصر پائے جاتے ہیں، ہیبت و جمال، جذب و دفع، انسان کا دل اس طرف مائل بھی ہوتا ہے اور ہٹ بھی جاتا ہے، اسی دوگونہ قوت کی وجہ سے نظارہ میں نیکی کا بھی اظہار ہوتا ہے اور جذبات شہوی کا روکنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن تجربہ یہی کہتا ہے کہ جذبات شہوانی کا تعلق زیادہ تر جسم مستور ہی سے ہے اور یہ امر عام طور پر مسلم ہو گیا ہے کہ لباس زیور اور آرائش کی مختلف چیزوں کا اصل مقصد خواہشات نفسانی کا اشتعال ہی ہے اور برہنہ جسم کو سنوارا ہی اس لئے جاتا ہے کہ اس کے نظارہ سے صنف مخالف میں ہیجان نفسی پیدا ہو جائے اس کی صداقت سے نقاشوں کے ماڈل، بخوبی واقف ہوتے ہیں اور وہ لوگ بھی جنھیں برہنہ بدن دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ چنانچہ مشہور مصنف ڈاکٹر شوفلڈ سے ان کے ایک ماڈل نے کہا تھا کہ جونہی وہ اسٹوڈیو میں داخل ہوتی تھی۔ وہ فوراً برہنہ ہو جاتی تھی، کیونکہ مرد اپنے جذبات پر قادر نہیں رہتے اور اس کو اس امر کا احساس تھا کہ وہ برہنگی کی حالت میں اس قدر جذبات کو مشتعل نہیں کر سکتی جس قدر کہ نیم برہنگی کی حالت میں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر شہوانی خواہشات پر تسلط حاصل کرنا زندگی کا مقصد وحید ہو تو یہ زیادہ قرین عقل ہوگا کہ لباس کا استعمال منع کر دیا جائے نہ کہ برہنگی کو جرم قرار دیں!

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ برہنگی کے نظارہ سے اشتعال ہوتا ہے تو پھر بھی یہ صحیح ہے کہ اس نظارہ کی وجہ سے ضبط نفس جیسی شریف صفات کے سیکھنے کا موقع ملتا ہے، حقیقت میں وہ نیکی نہایت ہی کمزور ہو جو محض ترغیبات سے محفوظ رکھنے کے لئے ہمیں جنگل میں بھیج دے۔ ہولبراخ نے صحیح کہا ہے کہ عقل صحیح جذبات کے انتخاب کا فن ہے اور تعلیم نام ہے قلوب انسانی میں اُن کو جاگزیں کرنے کا۔ برہنگی کا نظارہ اس نقطۂ نظر سے بہت قدر و قیمت رکھتا ہے کہ وہ ہمیں ایسی شے سے خوش ہونا سکھاتا ہے جس کے ہم مالک نہیں ہوتے، اور ہماری مسرت غرض سے خالی ہوتی ہے، یہ ایسا سبق ہے جو ہر معاشری زندگی کی تعلیم کا ضروری جزو ہے۔ اگر بچہ کو یہ تعلیم دیجاتی ہے کہ وہ خوبصورت پھول کو دیکھے اور اس کو توڑے نہیں، تو بالغ العمر۔ آدمی کو یہ سیکھنا چاہیئے کہ وہ عورت کے حسن و جمال کو دیکھے اور ملکیت کی خواہش نہ کرے۔ لوگ اس کو ناممکن سمجھتے ہیں لیکن دراصل یہ صحیح نہیں ہے۔ انسان کے دوسرے جذبات کی طرح یہ خواہش بھی فطری حدود کے اندر نشو و نما پا سکتی ہے۔ اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ شروع سے برہنگی کی اہمیت یا جاذبیت کے خیال کو محو کیا جائے

جن لوگوں کی تربیت خراب ہوئی ہے اُن کا — اہل یونان یا دوسری نفیس طبائع اقوام کی ذہنی حد تک پہونچنا اور انسان کے برہنہ جسم کے نظارہ سے جمالیاتی، علمی اور اخلاقی فوائد حاصل کرنا ناممکن معلوم ہوگا، لیکن ہمیں اس نقطۂ کمال تک پہونچنے کی کوشش میں کمی نہ کرنی چاہئے۔ ویسلے نے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ شیطان ہی کیوں ہمیشہ بہترین نغموں سے لطف اندوز ہوتا ہے، اسی طرح زمانۂ حال کے لوگ پوچھنے لگے ہیں کہ کیوں انسانی جسم — وہ الٰہی نغمہ جو تخلیق کے بہترین لمحوں میں ظہور پذیر ہوا ہے — انھیں لوگوں کی دیدہ بازی کے لئے مخصوص ہو جائے جو فحش کی تلاش میں رہتے ہیں" یہ وہ خیالات ہیں جن کو ہم آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے گو عوام کی جانب سے ان کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہو! —

"دور نظر"

(نگار) یہ مضمون ہے ایک ایسے بزرگ کا جو یورپ میں اپنی عمر کا معقول حصہ بسر کر کے ہندوستان واپس آئے ہیں اور علم و فضل کی بڑی بڑی سندیں اپنے پاس رکھتے ہیں۔ لیکن کیا حیرت کا مقام نہیں کہ وہی شخص جو "عریانی" کی حمایت میں اس قدر طویل مقالہ سپرد قلم کرتا ہے، وہ اتنی اخلاقی جرأت بھی اپنے اندر نہیں رکھتا کہ جسم تو جسم صرف اپنے نام ہی کو "عریاں" پیش کر سکے۔ اُنھوں نے اپنے اصلی نام کے بجائے صرف "دور نظر" لکھنا کافی سمجھا ہے، درانحالیکہ برہنگی یا عریانی سے لطف اندوز ہونے یا بقول اُن کے کسب روحانیت کے لئے "دور نظری" سے کام نہیں چلتا، بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے آنکھیں چار ہونے کی، اتصال جسم و لب کی اور "تو من شدی، من تو شدم" کی

نگار کی کسی گزشتہ اشاعت میں شعبۂ ادارت ہی کی طرف سے ایک مضمون اسی موضوع پر شایع ہو چکا ہے اور اس میں تقریباً یہی خیالات اور مغرب کے ائمۂ عریانی کے یہی اقوال پیش کئے گئے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ میں نے اس مضمون میں ایک حد تک ان خیالات کی مخالفت کی ہے اور ہمارے فاضل مقالہ نگار اس کے موافق ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ برہنگی کے جو فوائد ہم کو بتائے جاتے ہیں، وہ بڑی حد تک قابل لحاظ ہیں۔ لیکن اس کا ایک فائدہ جس پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ہم شروع ہی سے عریانی و برہنگی سے مانوس بنا دیئے جائیں تو ہمارے جذبات جنسی میں کسی کو عریاں دیکھ کر ہیجان پیدا نہیں ہو سکتا اور میں بھی اس کی صحت کو تسلیم کرتا ہوں

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے جذباتِ جنسی میں ہیجان پیدا کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں ؟ -
ظاہر ہے کہ کوئی صائب الرائے شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ جب انسان کے جذبات جنسی مفقود ہو جاتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ اضمحلال تو اء ضعف عقل و دماغ، فقدان ولولہ و نشاط، اور انحطاط حرکت و عمل کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا ہے - چنانچہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ وہی شخص جو جوانی میں یکسر پیکر عمل ہوتا ہے، ضعف و پیری کی حالت میں بیکار محض ہو جاتا ہے - اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس کا تعلق جذبات جنسی سے نہیں ہے بلکہ محض اس زمانہ سے ہے جب قوائے انسانی پوری طرح نشو و نما پا چکے ہوتے ہیں تو پھر میں یہ دریافت کرونگا کہ وہ نوجوان جن میں کسی خاص سبب سے ضعفِ رجولیت پیدا ہو جاتا ہے، کیوں دنیائے عمل میں بیکار ثابت ہوتے ہیں اور جب بوڑھے آدمیوں پر "اعادۂ شباب" کا آپریشن کیا جاتا ہے تو کیوں ان میں وہی تمام کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو جوانی کے زمانہ میں پائی جاتی تھیں

بہرحال اس سے انکار ممکن نہیں کہ شباب، اور شباب کی اُمنگ جس چیز سے عبارت ہے وہ صرف "خواہش جنسی" ہے اور اسی کا اضمحلال، شباب کا اضمحلال کہلاتا ہے - پھر جب اصل چیز یہی قرار پائی تو کیا ہمارا اصول معاشرت میں ایسی باتوں کا رائج کرنا، جو "جذبات جنسی" میں بجائے ہیجان پیدا کرنے کے اضمحلال پیدا کریں، کسی طرح مناسب قرار دیا جا سکتا ہے -

ہمارے فاضل مقالہ نگار نے خود ہی اس بات کو تسلیم کیا ہے اور واقعی تسلیم کرنے کی بات بھی ہے کہ ملبوس و آرائش کا مقصد ہی صرف جذبات جنسی میں ہیجان پیدا کرنا ہے اس لئے جب تک اصولاً اس امر کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ "ہیجان جذبات" بُری چیز ہے، اسوقت تک لباس و آرائش کی مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی -

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان عہد قدیم میں عریاں زندگی بسر کرتے کرتے تنگ آ گیا اور اُس نے محسوس کیا کہ مرد و عورت کے درمیان تعلق جنسی کی خواہش بھی ایک دوسرے کو برہنہ دیکھتے دیکھتے مفقود ہوتی جا رہی ہے، تو اس نے یہی تدبیر سوچی ہو گی کہ ایک دوسرے کی نگاہ کے لئے کچھ موانع و حجاب پیدا کئے جائیں اور جب اس کے اولین تجربات مفید ثابت ہوئے ہونگے تو اصولاً ستر پوشی کو لازم قرار دیا ہو گا تاکہ مرد و عورت کے خواہشات جنسی میں ہیجان و اشتعال پیدا ہوتا رہے، جو تمدن انسانی کی ترقی کے لئے از بس ضروری ہے -

اس میں کلام نہیں کہ جو وحشی قومیں عریاں رہتی ہیں ان کی صحت جسمانی اچھی رہتی ہے، لیکن انسان نام صرف صحت جسمانی کا نہیں ہے بلکہ صحتِ احساس و ادراک کا بھی ہے - اس کے علاوہ یوں بھی

ملاحظہ کیجئے کہ اگر آج ملبوس کا استعمال ممنوع قرار دید یا جائے تو انسانی تمدن کی ترقی کس قدر پیچھے ہٹ جائے گی اور ہماری کتنی صنعتیں محو ہو کر ہماری قوت ابداع و اختراع کو مضمحل کر دیں گی

وہ چیز جو انسان کو تمام دیگر مخلوقات سے ممیز و ممتاز بناتی ہے اس کا ذوق "وجدانیات" ہے جسے "جمالیات" بھی کہتے ہیں۔ اگر آج یہ ذوق مفقود ہو جائے تو انسان و حیوان دونوں برابر ہیں۔ پھر غور کیجئے کہ اس ذوق کا تعلق عریانی سے ہے یا ستر پوشی سے، اور ہیجانِ نفس جو اصل محرک اس ذوق کا ہے وہ جسم مستور سے وابستہ نظر آتا ہے یا جسم عریاں سے۔ آپ ہی غور کیجئے کہ اگر آج ہماری دنیا ننگی ہو جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میری رائے میں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کا فن تعمیر آرٹ یا رہیہ باقی آپ کا فن تزئین و آرائش اور تمام فنون لطیفہ مردہ ہو جائیں گے کیونکہ پھر نہ ہم کو عالی شان محلوں کی ضرورت ہوگی، نہ دیبا و حریر کی نہ ہمارے دلوں میں کوئی ہیجان پیدا ہوگا کہ نقش و نغمہ کی طرف متوجہ ہوں اور نہ کوئی خاص اُمنگ جو ہمیں محنت و عمل کی طرف مایل کرے الغرض مرد عورت کا وجود بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا اور انسانی زندگی ریگزار کی طرح ویران اور سنسان نظر آنے لگے گی۔

مرد عورت کا مستور رکھا جانا حقیقتاً بالکل نفسیاتی اصول پر مبنی ہے اور اس سے مدعا یہی ہے کہ دونوں میں باہم دگر کشش باقی رہے اور شوق کی آگ نہ بجھنے پائے۔ کیونکہ یہ فطرت انسانی ہے کہ جو چیز اس سے زیادہ چھپائی جائے گی اس کے لئے زیادہ عیر اسول ہوگی، اتنی ہی رغبت بڑھیگی اور اسی نسبت سے شوق و ولولہ میں اضافہ ہوگا۔ چنانچہ ایک بیوی کی طرف سے رغبت شہوانی کا آہستہ آہستہ کم ہو جانا خواہ وہ کتنی ہی جمیل کیوں نہ ہو اور غیر عورت کی طرف کھنچنا خواہ وہ کیسی ہی معمولی شکل و شمائل کی ہو، اسی نفسیاتی اصول کی بنا پر ہے۔

بہرحال عریانی کے اور جو فوائد بھی ہوں، لیکن اس کی یہ مضرت بالکل یقینی ہے کہ جذبات جنسی اس سے فنا ہو جاتے ہیں جن پر نوعِ انسانی کے ترقی کا مدار ہے۔

اس وقت یورپ میں جرمنی اس کا سب سے بڑا علمبردار ہے، لیکن میں نے جہاں تک غور کیا اس تحریک کا بڑا سبب وہاں کی اقتصادی مشکلات ہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اُن کا مقصود واقعی وہی ہے جو فاضل مقالہ نگار نے بتایا ہے تو افسوس ہے کہ اس کی اہمیت و صداقت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً مغرب و اہل مغرب کی ترقیاں اور ان کے اصولِ زندگی نہایت پاکیزہ و مستحکم ہیں لیکن بلا غور کئے ہوئے اُن کی ہر تحریک کو لبیک کہنا، وہی کورانہ تقلید ہے جس نے اہل ایشیا اور خصوصیت

کے ساتھ اہل ہند کو تباہ کر رکھا ہے۔

ممکن ہے صاحب مضمون کا تجربہ اس کے خلاف ہو، لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر آج مرد عورت دونوں ننگے پھرنے لگیں تو تھوڑے ہی زمانہ کے بعد انسانی نسل میں انحطاط شروع ہو جائے اور دونوں جنسوں میں رفتہ رفتہ اضمحلال پیدا ہو کر کائنات کی رونق خاک میں مل جائے۔

آئندہ جنوری سنہ ۱۹۳۳ء کا نگار

حسب معمول دو چند ضخامت پر شایع ہوگا اور عجیب و غریب مجموعہ ہوگا صرف حضرت نیاز فتحپوری کے افسانوں کا یا اُن کی تنقیدات عالیہ کا جو عہد حاضر کے بہترین شعراء کے کلام پر یکجا ئیں گی۔ ناظرین براہ کرم مطالعہ فرمائیں کہ وہ ان دونوں میں سے کس کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اگر کثرت رائے سے صورت اوّل اختیار کی گئی تو زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں اور اگر دوسری صورت اختیار کی گئی تو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حسب ذیل شعراء کے کلام پر تنقید کرکے بتایا جائیگا کہ کون کس مرتبہ کا ہے اور کس کے کلام میں کس قدر اور کس نوع کی غلطیاں یا خوبیاں پائی جاتی ہیں:۔

اقبال، دعلی، اختر (حیدرآباد)، اصغر، جگر، جوش، حسرت، سیماب، صفی، عزیز، فانی، یاس،

ایک تیسری صورت یہ ہے کہ گزشتہ دس سال میں باب الاستفسار کے ماتحت جو جوابات مختلف لوگوں کے سوالات پر حضرت نیاز نے دیئے ہیں اُن کا انتخاب شایع کر دیا جائے۔

بہرحال اس کا فیصلہ ناظرین نگار کے ہاتھ میں ہے اور انھیں کی پسند پر چھوڑا جاتا ہے لیکن یہ رائے زیادہ سے زیادہ ۲۵ نومبر تک دفتر میں پہونچ جانی چاہیئے۔ — منیجر نگار لکھنؤ

سیزر اور کلیوپیٹرا

(انگلستان کے مایۂ ناز ادیب برنارڈ شا کا ڈراما)

پہلا ایکٹ

مصر کے ۳۳ ویں خاندان کے اختتام پر (یعنی ۴۸ قبل مسیح) نخلستان سیریا کے حدود پر چاندنی رات کی ایک صبح کو، کرۂ آتشیں مشرق سے طلوع ہو رہا ہے، ستارے اور صاف آسمان، جو اس وقت ہمیں نظر آ رہے ہیں اس وقت ساڑھے انیس سو سال کم عمر تھے اور ان کے نیچے، تمدن انسانی کی دو یادگاریں نظر آتی تھیں، ایک محل اور دوسرا سپاہی۔

محل جو ایک قدیم شامی طرز کی عمارت ہے اور سفید اینٹوں سے بنائی گئی ہے اس قدر بدنما نہیں ہے جیسا قصر بکنگھم۔ اور اس کے کشادہ صحن میں جمع رہنے والے سپاہی موجودہ زمانہ کے انگلستانی عہدہ داروں سے زیادہ مہذب ہیں۔ مثلاً وہ اپنے دشمنوں کی نعشوں کو قبروں سے نکال کر ان کی بے حرمتی نہیں کرتے۔ جیسا کہ ہم لوگ کرامول اور مہدی کی نعشوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ دو جماعتوں میں منقسم ہیں۔ ایک جماعت اپنے کپتان بلزناک کی قمار بازی کی طرف متوجہ ہے جو ایک نجیم انگردست کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں منہمک ہے دوسرا گروہ ایک پہرہ دار کے گرد مجتمع ہے جو ابھی ابھی ایک نہایت پرلطف قصہ کہہ کر فارغ ہوا ہے اور جس کو سنکر سب لوگ ہنس رہے ہیں ان کی تعداد بارہ ہے۔ سب خوبصورت مصری جوان ہیں جو اسلحہ اور زرہ بکتر سے آراستہ ہیں بلزناک ایک مرد آزمودہ کار ہے اور بہت تیز و چالاک جہاں سخت ظلم و تشدد کی ضرورت ہو وہاں اس کی عیاریاں اور چالبازیاں کام کرتی ہیں اور جب اس کی ضرورت نہ ہو تو وہ بالکل سیدھا سادھا اور لڑکوں کی مانند بھولا انسان معلوم ہوتا ہے، یہ ایک بارعب سپاہی، ایک بے مثال افسر اور ایک زبردست حاکم ہے۔ وہ بجید انہماک کے ساتھ شطرنج کھیل رہا ہے دوسرے چھوٹے عہدہ دار اپنے نیزے دیوار سے لگائے ہوئے کھڑے ہیں صحن کے ایک گوشہ میں جسکا ایک رخ قصر کے سامنے پڑتا ہے، ایک بڑا دروازہ لگا ہوا ہے۔ دوسری طرف ایک دیوار ہے جس میں ایک پھاٹک لگا ہوا ہے، قصہ گو محل کی داستانیں کہہ رہا ہے۔ اور قمار باز دیوار کی طرف بیٹھا ہے کے قریب۔ دیوار کے سامنے ایک

بہت بڑا پتھر ہے جو اس قدر بلند ہے کہ ایک حبشی پہرہ دار اس پر کھڑا ہو تو دیوار کے باہر دیکھ سکتا ہے۔

ایک دیوار میں لگی ہوئی قندیل سے صحن روشن ہے اور عجمی سردار بازی جیت کر زمین پر پڑی ہوئی چھڑی اٹھا لیتا ہے۔

بلزنار :- ایپس کی قسم ہے عجمی، تیرے دیوتا تجھ پر بہت مہربان ہیں۔

عجمی :- او سردار، پھر ایک بار قسمت آزماؤ۔ یا تو دوگنا ملیگا یا پھر کچھ نہیں۔

بلزنار :- نہیں۔ اب نہیں، اس وقت کچھ میرا دل نہیں لگتا۔

سنتری :- (اپنی برچھی اٹھا کر) کھڑا رہ، کون جا رہا ہے؟

(سب کھڑے ہو جاتے ہیں ایک عجیب آواز باہر سے جواب دیتی ہے)

آواز :- بری خبروں کا پیغامبر

بلزنار :- (سنتری کو پکار کر) آنے دے۔

سنتری :- (اپنی برچھی زمین کی طرف جھکا کر) او بری خبروں کے پیغامبر، میرے قریب آ۔

بلزنار :- (شطرنج کو جیب میں رکھ برچھی کو اٹھاتے ہوئے) ہم کو اس آدمی کا خیر مقدم کرنا چاہئے کیونکہ وہ بری خبریں لا رہا ہے۔

(محافظ اپنی اپنی برچھیاں لیکر پھاٹک پر جمع ہو جاتے ہیں اور آنیوالے کے لئے بیچ میں راستہ چھوڑ دیتے ہیں)

عجمی :- (گھٹنے کے بل اٹھتے ہوئے) کیا بری خبریں ہیں؟

بلزنار :- او وحشی عجمی، میری بات سن، مصر میں اچھی خبریں لانے والا دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ لیکن بری خبریں لانے والے کا خون، کوئی دیوتا قبول نہیں کرتا۔ اس لئے جب ہم کو اچھی خبریں ملتی ہیں تو ہم ان کو غلام کے منھ سے سنتے ہیں اور بری خبریں وہ شرفا لاتے ہیں جو اپنی اہمیت کو لوگوں کی نظروں میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

(آنے والے پھاٹک کے پاس پہنچ جاتے ہیں)

سنتری :- او جوان سردار، جا اور ملکہ کی حضور میں سر تسلیم خم کر۔

آواز :- جا اور اپنی برچھی پر سور کی چربی مل لے کیونکہ صبح ہونے سے قبل ہی رومی سپاہی اُسے تیرے حلق میں داخل کر دیں گے۔

آواز دینے والا ایک خوبصورت بالوں والا، خوش پوشاک نوجوان ہے جو محافظوں سے بالکل مختلف کئی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ہے پھاٹک میں ہنستا ہوا داخل ہوتا ہے اس کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی جنگ میں شریک ہو کر آیا ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں پٹی بندھی ہوئی ہے اور داہنے میں کسی رومی سپاہی کی ایک تلوار ہے جو میان میں رکھی ہوئی ہے وہ صحن میں پہنچتا ہے۔ بلزنار، اور محافظ سپاہی اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

بلزنار :- تو کون ہے جو ملکہ، کلیوپیٹرا کے محل اور بلزنار کے سامنے یوں ہنستا ہے۔

اجنبی :- میرا نام بلافرکس ہے اور میں دیوتاؤں کی نسل سے ہوں۔

بلزنار :- (رسماً) خوش آمدید - برادر -

سب مل کر :- (عجمی کے سوا) خوش آمدید برادر -

عجمی :- او اجنبی میرے سوا ملکہ کے تمام محافظ دیوتاؤں کی نسل سے ہیں میں البتہ ایک عجمی ہوں اور دنیاوی بادشاہ رساکی نسل سے -

بلزنار :- اے بلا فریس، تم جنگ میں رہ چکے ہو، اور جانتے ہو کہ سپاہی کسے کہتے ہیں اس لئے مجھے اُمید ہے کہ تم ملکہ کی کنیزوں کو سب سے پہلے اپنی خبریں نہ سناؤ گے -

بلا فریس :- اس سے سوا میں، اور کوئی خبر نہیں لایا کہ ہم سب کے سر قلم کر دیئے جانے والے ہیں - سپاہیوں کے، عورتوں کے اور سب کے!

عجمی :- (بلزنار سے) میں نے بھی تم سے یہی کہا تھا -

سنتری :- (جو ابتک سن رہا تھا) آہ افسوس -

بلا فریس :- صبر، صبر، قسمت دیوتاؤں کے ساتھ ہے جنھوں نے مجھے سیاہ رنگ میں رنگا ہے -

(بلزنار سے) اس آدمی (عجمی کی طرف اشارہ کرکے) نے تم سے کیا کہا ہے؟

بلزنار :- اس نے کہا کہ روم کا جولیس سیزر جو ایک مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ ہمارے ملک میں آپہنچا ہے - خود مصر کا حکمران بنجائیگا کسان اس لئے ہیں کہ ہل جوتیں - لوہار، سنار اور رنگریزوں کے بیٹے سارے کام کاج کرنے کو بنائے گئے ہیں اور ہم تو شرفا میں سے ہیں اور ہتھیاروں کو متبرک سمجھنے والے دیوتاؤں کی نسل سے!

عجمی :- دیوتا اپنے غریب رشتہ داروں پر ہمیشہ مہربان نہیں ہوتے -

بلزنار :- (غصہ سے عجمی کو دیکھ کر) انسان کی اولاد کیا ہم سیزر کے غلاموں سے بھی بدتر ہیں؟

بلا فریس :- (ان کے درمیان آکر) لے انسان کی اولاد و سنو، ہم مصری ایسے ہی افضل ہیں جیسے دیوتا رومیوں کے مقابلہ میں -

محافظ :- آہا ہا -

بلا فریس :- لیکن یہ سیزر - آدمی کے مقابلہ میں آدمی کو کچھ نہیں سمجھتا - وہ اپنی فوج سے اس مقام پر حملہ کرتا ہے جہاں تمھاری حالت بہت کمزور ہو - وہ گویا پہاڑ پر سے ایک پتھر پھینکتا ہے اور اس کا لشکر یوں سمجھو کہ ایک ایسا آدمی ہے جس کے سر صرف ایک ہی ہے مگر ہاتھ ہزاروں ہیں اور مذہب کوئی نہیں رکھتا میں نے اس کا مقابلہ کیا ہے اور میں اس سے پوری طرح واقف ہوں -

بلزنار :- کیا بھائی تم ڈر گئے تھے -؟

محافظ سپاہی خوفناک قہقہہ لگاتے ہیں اور ان کی آنکھیں اپنے سردار کی اس بات پر چمکنے لگتی ہیں

بلا فریس :- نہیں بھائی - لیکن مجھے شکست اٹھانی پڑی - وہ ڈر گئے تھے شاید - لیکن انھوں نے ہم کو بھوسے یا چھلکے کی طرح پراگندہ کر دیا -

محافظ نفرت آمیز لہجہ میں باہم رائے زنی کرتے ہیں

بلزنار :- کیا تم نہ مر سکتے تھے؟

بلا فریس :- نہیں - کیونکہ ایک دیوتا کی نسل سے ہونا

بہت سی مشکلوں سے بچا لیتا ہے - اس کے علاوہ اسکا وقت بھی نہ تھا - یہ سب کچھ پلک مارتے ہو گیا - حملہ ہیں ہوا جہاں ہم کو ذرا بھی توقع نہ تھی -

بلز نار :- اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رومی بزدل ہیں

بلافریس :- وہ بزدلی کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے وہ جینے کے لئے لڑتے ہیں جنگ کی عظمت و شرافت انکے نزدیک بے معنی چیز ہے -

عجمی :- ذرا جنگ کے واقعات تو بیان کرو - کیا کیا ہوا؟

سب محافظ :- (بلافریس کے گرد خواہشمندانہ طور پر جمع ہوتے ہوئے) ہاں جنگ کی داستان ہم بھی سنیں

بلافریس :- تو تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں معبد را کے محافظوں میں ایک ادنیٰ درجہ رکھتا ہوں یعنی نہ میں کلیوپیٹرا کی خدمت گذاری کرتا ہوں نہ اس کے بھائی ٹالمی کی - البتہ بڑے دیوتاؤں کی اطاعت میں ضرور رہا ہوں - ایک بار ہمنے محض اس غرض سے سفر کیا کہ کلیوپیٹرا کو سیریا بھگا دینے کا سبب ٹالمی سے دریافت کریں اور یہ کہ ہم مصریوں کو پمپئی کے ساتھ (جو اس وقت فارسیلیا میں سیزر کے ہاتھوں شکست اُٹھا کر ہمارے ملک میں وارد ہوا تھا) کیا سلوک کرنا چاہئے - تمھارا کیا خیال ہے کہ ہم کو کیا معلوم ہوا؟ مجھ سے سنو - ٹالمی نے پمپئی کو قتل کر ڈالا - جس کا کٹا ہوا سر وہ فاتح کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے محفوظ رکھے ہوئے ہے -

(محافظوں میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے)

بلکہ اس سے بھی زیادہ اضطراب آفریں بات ہم کو یہ معلوم ہوئی کہ سیزر آ پہنچا ہے کیونکہ ابھی ہم نے نصف روز کا سفر بھی طے نہ کیا تھا کہ ایک ایسے شہر میں پہنچے جہاں کے لوگ اس کی فوج کے ڈر سے بھاگ رہے تھے -

بلز نار :- اور تم مندر کے محافظ! کیا تم نے اس لشکر کا مقابلہ نہیں کیا؟

بلافریس :- انسان جتنا کیا کر سکتا تھا جو ہم نے کیا - لیکن اسی وقت بگل کی آواز کانوں میں آئی جو ایک سیاہ پہاڑ کی بد دعا کی مانند تھی تب ہم نے دیکھا کہ ڈھالوں کی ایک دیوار سی ہماری طرف آ رہی ہے - تم جانتے ہو کہ دل کس قدر جلنے لگتا ہے جب تم قلعوں سے محفوظ مقام پر حملہ کرتے ہو؟ لیکن جب خود قلعہ کی دیوار تم پر حملہ کرے تو کیا ہو؟

عجمی :- (لوگوں سے) کیا یہ میں نے نہیں کہا تھا؟

بلافریس :- جب وہ دیوار قریب آئی تو آدمیوں کی ایک صف میں تبدیل ہو گئی - جو بالکل معمولی تھے لیکن خود اور چمڑے کے لباس پہنے تھے، ان کے سینے آہنی زرہ سے محفوظ تھے - ان میں سے ہر آدمی نے اپنی برچھی سے وار کیا - ایک جو میری طرف آیا اس نے میری ڈھال میں چھید کر دیا - یہ دیکھو (وہ اپنے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کرتا ہے) اور اگر میں جھک نہ جاتا تو وہ میری گردن میں پیوست ہو جاتی - وہ اس وقت دو دو کر کے حملہ کر رہے تھے اور کچھ اپنی چھوٹی چھوٹی تلواریں لیکر ہم پر آ پڑے، تم سمجھ سکتے ہو کہ جب کوئی آدمی تمھارے پاس ایسی تلوار لیکر پہنچ جائے، تو تم اپنے ان ہتھیاروں سے کچھ نہیں کر سکتے - کیونکہ وہ سب بہت لمبے ہیں؟

عجمی :- تم نے کیا کیا ؟
بلافریس :- میں نے گھونسا تان کر رومی کے جبڑوں پر مارا - بہرحال وہ آدمی ہی تھا ایک گڑھے میں گر پڑا - اور میں نے اس کی تلوار چھین لی - (تلوار میان سے کھینچ کر) یہ دیکھو ایک رومی کی تلوار جس پر رومی خون کے قطرے ہیں -
محافظ :- (تعریف کرکے) بہت خوب بہت خوب
(وہ تلوار لیکر یکے بعد دیگرے دیکھتے ہیں اور اسکا امتحان کرتے ہیں)
عجمی :- اور تمھارے آدمی ؟
بلافریس :- بھاگ گئے - بھیڑوں کی طرح تتر بتر ہو گئے
بلزنار :- (غضبناک ہو کر) بزدل، کمینے، بھاگ گئے دیوتاؤں کے عزیزوں کو قرباں ہونے کے لئے چھوڑ دیا
بلافریس :- (نہایت بے پروائی سے) دیوتاؤں کے رشتہ دار قربان ہو جانے کے لئے نہیں ٹھہرے - بھائی یہ طاقتوروں کی، جنگ نہیں تھی، بلکہ دوڑ تھی سب سے زیادہ تیز آدمیوں کی - رومیوں نے جن کے پاس رتھ نہیں تھے ہمارے تعاقب میں سواروں کا ایک دستہ روانہ کیا اور مجمع کو قتل کر ڈالا تب ہمارے بڑے دیوتاؤں کے سردار نے بارہ دیوتاؤں کے رشتہ داروں کو روانہ کیا - اور یہ کہلا بھیجا کہ ہم لڑتے ہوئے مر جائیں - میں نے جی میں کہا کہ بہ نسبت اس کے کہ میں اپنے ہوش و حواس کھو دوں، اور پشت پر زخم کھاؤں، سامنے مقابلہ کرنا بہتر ہے

اس لئے میں نے اپنے سردار کا ساتھ دیا اور وہیں کھڑا رہا تب رومیوں نے ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا - کیونکہ کوئی شخص شیر پر اس وقت حملہ نہیں کرتا جب سارا میدان بھیڑ اور بکریوں سے بھر جائے، الغرض اس طرح ہم اپنی جان بچا کر بھاگے - اور میں اب اس امر کی اطلاع دینے آیا ہوں کہ تم کو سیزر کے استقبال کے لئے اپنے پھاٹک کھول دینے چاہئیں - کیونکہ اس کا ہراول ایک گھنٹہ کے اندر ہی یہاں پہونچ جائے گا - اور مصر کا کوئی جوانمرد زندہ نہ بچے گا -
سنتری :- آہ افسوس ! (وہ اپنی برچھی زمین پر پھینک دیتا ہے اور محل کی طرف بھاگتا ہے)
بلزنار :- اس کو دروازہ میں کیلوں سے جڑ دو - جلدی ! (محافظ برچھیاں لیکر اس کی طرف دوڑتے ہیں لیکن وہ ان سے زیادہ تیز دوڑتا ہے) اب یہ خبر آگ کی طرح محل میں پہنچ جائے گی -
بلافریس :- ہمیں عورتوں کو رومیوں سے بچانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے ؟
بلزنار :- ان کو مار کیوں نہ ڈالیں ؟
عجمی :- مگر ان میں سے بعض کے لئے ہمیں تاوان دینا پڑے گا - اس لئے بہتر ہے کہ رومی ہی ان کو قتل کر ڈالیں - اس طرح سستے چھوٹ جائیں گے -
بلزنار :- (اس کی ذہنیت سے مبہوت ہو کر) او مکار اور سانپ !
بلافریس :- لیکن تمھاری ملکہ ؟
بلزنار :- سچ ہے، ہمیں کلیوپیٹرا کو لیکر بھاگ جانا چاہیئے

بلا فریس :۔ کیا تم اس کے فرمان کا انتظار کروگے ؟

بلزنار :۔ فرمان ! ایک سولہ برس کی لڑکی کا —— نہیں ہم انتظار نہیں کریں گے ۔ میں اُسے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر لے جاؤنگا اور جب ہم لوگ اُسے سیزر کی دسترس سے باہر لیجائیں گے ——

عجمی :۔ مجھسے سنو بلزنار۔

بلزنار :۔ بول، کیا کہتا ہے ؟

عجمی :۔ کلیوپیٹرا کا بھائی ٹالمی اس سے برسرپیکار ہے آؤ ہم اُسے ٹالمی کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔

محافظ :۔ او مکار، او سانپ ۔ !

بلزنار :۔ ہم میں اس کی جرارت نہیں۔ ہم دیوتاؤں کی نسل سے ہیں۔ لیکن کلیوپیٹرا دریائے نیل کی نسل سے ہے ۔ اور اگر دریائے نیل میں طوفان اور سیلاب نہ آئیں تو پھر ہمارے باپ داداؤں کی زمینوں میں غلہ نہ پیدا ہو —— اور ہماری زندگی کتوں سے بدتر ہو جائے۔

عجمی :۔ یہ سچ ہے —— —— لیکن مجھسے ایک بات اور سنو ۔ او سیرئیس کے عزیزو۔

محافظ :۔ بول،

عجمی :۔ کیا میں نے ابتک تم سے سیزر کے متعلق سچ سچ نہیں کہا ؟

محافظ :۔ بالکل سچ ! بالکل سچ !

بلزنار :۔ (اعتراف کرتے ہوئے) یہی بلزنار بھی کہتا ہے ۔

عجمی :۔ تو اس کے متعلق اور سنو ۔ سیزر عورتوں کا بہت شیدائی ہے وہ ان کو بہت عزیز رکھتا ہے یہ ان سے مشورہ لیتا ہے ۔

بلزنار :۔ اوہ ۔ مگر یہ عورتوں کی حکمرانی تو مصر کو تباہ کرکے رکھ دیگی ۔

عجمی :۔ مگر نہیں ۔ سیزر اب معمر ہوتا جارہا ہے ۔ وہ پچاس برس سے زیادہ بڈھا ہو گیا ہے ۔ وہ جوان عورتوں کی لئے بہت ضعیف ہے ۔ اور بڈھی عورتیں اس قدر عقلمند ہیں کہ وہ اس کی پرستش نہیں کرسکتیں

بلا فریس :۔ عجمی ذرا ہوشیاری سے کام لے ۔ سیزر اب ہم سے صرف بالشت بھر کے فاصلہ پر ہے ۔

عجمی :۔ کلیوپیٹرا بھی جوان عورت نہیں ہے ۔ اور نہ عقلمند ہی ہے تاہم وہ عقلمندوں کو چکر میں ڈالدیتی ہے ۔

بلزناز :۔ ہاں یہ اس لئے کہ وہ دریائے نیل کی نسل سے ہے پھر کیا ہو ؟

عجمی :۔ وہ یہ کہ ہم خفیہ طور پر اُسے ٹالمی کے ہاتھ فروخت کردیں اور پھر اپنے آپ کو سیزر کے سامنے رضاکار کے طور پر پیش کریں اور ٹالمی کو تخت سے اتارنے اور کلیوپیٹرا کو تخت نشین کرنے کے لئے لڑیں

محافظ :۔ او سانپ !

عجمی :۔ اگر ہم ملکہ کی تصویر اپنے منھ میں دبا کر اس کے پاس جائیں تو وہ ہماری سنے گا ۔ وہ فتح کرکے کلیوپیٹرا کے بھائی کو مار ڈالے گا ۔ اور مصر میں ملکہ کے ساتھ حکمرانی کرے گا ۔ اور ہم اس کے محافظ ہوں گے ۔

محافظ :۔ او سب سے زیادہ ہوشیار سانپ ۔

[redacted]

بلافریس :- تمھاری باتیں ختم ہونے سے قبل ہی وہ نازل ہوجائیگا ! او باتیں بنانے والو !

بلزنار :- یہ سچ ہے - (محل کا ایک خوفناک شور اس کی گفتگو میں خلل پیدا کر دیتا ہے) دروازہ کی حفاظت کرو

(سپاہی دروازہ کی طرف دوڑتے ہیں اور اس طرف اپنی برچھیوں کی نوکیں لگا کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ عورتوں، اناؤں اور خادماؤں کا گروہ نمودار ہوتا ہے جو آگے ہیں وہ برچھیوں سے خوفزدہ ہو کر پیچھے والیوں کو پیچھے ہٹنے کے لئے شور کرتی ہیں، جب بلزنار چلاتا ہے تو اس کی آواز سب پر غالب آتی ہے)

واپس جاؤ - اندر جاؤ - بے مصرف جانورو ——

فتاتا، ملکہ کی خاص انا کو ہمارے پاس بھیجو

عورتیں :- (محل میں پکار کر) فتاتا، فتاتا، آؤ - آؤ بلزنار سے باتیں کرو -

ایک عورت :- اوہ پیچھے رہو - تم مجھے برچھیوں کی نوک پر ڈھکیلے دیتی ہو -

(ایک بڑھی جسیم، قد آور، مضبوط عورت جس کے چہرہ پر جھریوں کا ایک جال سا بن گیا ہے ہاتھوں کی رگیں ابھری ہوئی ہیں - منہ شکاری کتے کی طرح، اور جبڑے بلڈاگ کے مانند کھلے ہوئے ہیں محافظوں کو بہت غصہ سے ڈانٹتی ہے -)

فتاتا :- ملکہ کی خاص انا کے لئے راستہ صاف کرو -

بلزنار :- (سنجیدہ تکبر سے) فتاتا، تجھے معلوم ہے کہ میں ملکہ کے محافظوں کا سردار اور دیوتاؤں کی نسل سے ہوں -

فتاتا :- (تمکنت کے ساتھ) بلزنار - میں ملکہ کی خاص انا فتاتا ہوں - تمھارے آبا و اجداد اُن بادشاہوں کے حرموں میں، جنکی میرے والد نے اطاعت کی ہے، منقوش کئے جانے پر خوش ہوتے تھے - (عورتیں فتحمندانہ طور پر ہنستی ہیں)

بلزنار :- (دانت پیسکر طنز سے) فتاتا زبان دراز، کوتاہ چشم کی بیٹی ! رومی سر پر آپہنچے ہیں - (عورتیں خوف سے چیخ مارتی ہیں اور وہ بھاگ جانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن برچھیوں کی وجہ سے بہ مجبوری ٹھہر جاتی ہیں) اور خود دیوتاؤں کی اولاد ان کو روک نہیں سکتی کیونکہ ان میں ہر آدمی کے سات ہاتھ ہیں اور ہر ایک کے پاس سات سات برچھیاں ہیں - خون ان کے جسم میں پگھلنے والے پارہ کی طرح ابل رہا ہے اور ان کی بیویاں تین گھنٹے میں ماں بنجاتی ہیں - دوسرے روز قتل کر ڈالی جاتی ہیں اور کھالی جاتی ہیں - (عورتوں پر ایک خوف طاری ہوجاتا ہے - فتاتا سپاہیوں کو نفرت سے دیکھکر بھیڑ میں اپنے لئے راستہ نکالنے لگتی ہے، اور برچھیوں کا خوف نہیں کرتی -)

فتاتا :- تو اے معمولی مٹی کے بنے ہوئے دیوتاؤں کے بزدل لڑکو، بھاگ جاؤ اور اپنی جان بچاؤ - ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دو

بلزنار :- نہیں جب تک تم ہمارے حکم کی تعمیل نہ کرو یہ نہیں ہوسکتا - ملکہ کلیوپیٹرا کو ہمارے پاس لاؤ - اور پھر جہاں تمھارا جی چاہے چلی جاؤ -

فتاتا :- (ایک نفرت آمیز قہقہہ کے ساتھ) ہاں

اب مجھے معلوم ہوا کہ دیوتا کیوں اُسے لے گئے -؟
(محافظ ایک دوسرے کو متعجب انداز سے دیکھنے لگتے ہیں -) او بیوقوف سپاہی ! تجھے جان لینا چاہیے کہ ملکہ غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ بعد ہی غائب ہو گئی ہے -

بلزنار :- (غضبناک ہو کر) ڈائن - تو نے اسی سیزر یا ٹالمی کے ہاتھ فروخت کر دینے کے لئے چھپا دیا ہے
(اس کی بائیں کلائی پکڑ لیتا ہے اور چند محافظوں کی مدد سے کھینچتے ہوئے صحن کے درمیان لاتا ہے جہاں وہ اُسے گھٹنوں کے بل گرا دیتے ہیں - وہ ایک خوفناک چاقو نکالتا ہے) وہ کہاں ہے ؟ وہ کہاں ہے ؟
(وہ اس کی گردن جدا کر دینے کو ڈراتا ہے -)

فتاتا :- کتے ، مجھے ہاتھ لگایا تو یاد رکھ نیل میں سات برس تک سیلاب نہ آئے گا -

بلزنار :- (خوفزدہ ہو کر عجمی سے) تمھارے باپ دادا کی زمینیں نیل سے بہت فاصلہ پر ہیں - تم اس کو قتل کر دو -

عجمی :- (چاقو نکال کر) یہ ان کا صرف ایک خدا ہے لیکن بوڑھی عورتوں کا خون اسے بہت مرغوب ہے ! بول کلیوپیٹرا کہاں ہے ؟

فتاتا :- اے عجمی ، اوسیریس دیوتا سے پوچھ جس کی مقدس بلیوں کو گود میں لینے کی وجہ سے ہم پر یہ آفتیں نازل ہوئیں - میں نے ملکہ سے کہا تھا کہ جب رومی یہاں آئیں گے تو وہ اپنے انکار کی سرزنش میں یہاں تن تنہا چھوڑ دی جائیگی ، چنانچہ اب وہ چلی گئی — بھاگ گئی - چھپ گئی - میں سچ کہتی ہوں ، میں اسیریس کو گواہ ٹھہراتی ہوں -

عورتیں :- (حاکمانہ طور پر اعتراض کرتے ہوئے) وہ سچ کہتی ہے - بلزنار !

بلزنار :- تم نے لڑکی کو ڈرا دیا ہے وہ چھپی ہوئی ہے تلاش کرو - جلد — محل میں - کونا کونا ڈھونڈ ڈالو -

(سب محافظ بلزنار کی رہنمائی میں ، محل کے اندر داخل ہوتے ہیں عورتیں صحن کے دروازے سے باہر بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں)

فتاتا :- (چلا کر) اس قدر بے حرمتی - ملکہ کے محل میں اس طرح آدمیوں کی بھرمار !

(عجمی اس کی گردن پر چاقو رکھتا ہے وہ چپ ہو جاتی ہے)

بلافریس :- (فتاتا کے بائیں شانے پر ہاتھ رکھکر) اے عجمی ایک لمحہ کے لئے ٹھہر جا (فتاتا سے) مادر مہربان اب تمھارے سب دیوتا سو گئے ہیں - یا شکار کھیلنے چلے گئے ہیں اور تلوار تمھاری گردن پر ہے - اس لئے جاؤ ملکہ کو ڈھونڈ کر ہمارے پاس لے آؤ تاکہ تمھاری جان بخشی کر دی جائے -

فتاتا :- (نفرت انگیز لہجہ میں) اگر بڑے دیوتاؤں کا منشا نہیں ہے تو ایک بیوقوف کے ہاتھ میں تلوار کب رہ سکتی ہے ؟ سنو او ناسمجھ جوانو - میری باتیں توجہ سے سنو - کلیوپیٹرا مجھ سے خود ڈرتی ہے لیکن میری بہ نسبت وہ رومیوں سے زیادہ خائف ہے - صرف ایک ہی مگر زبردست طاقت اس کی آنکھوں میں ہے جو ابوالہول دیوتا کی وجہ سے

اُسے حاصل ہے۔ وہ دیوتا جو ریگستان میں بیٹھا رہتا ہے اور سمندر جانے والے راستہ کی نگہبانی کرتا ہے۔ جو کچھ کلیوپیٹرا اس سے پوچھنا چاہتی ہے اُسے مقدس بلیو۔ل کے کان میں کہدیتی ہے۔ اور سالگرہ کے روز وہ ابوالہول دیوتا پر اپنے چڑھاوے چڑھاتی ہے۔ اس لئے تم لوگ اس ریگستان میں جاؤ اور کلیوپیٹرا کو ابوالہول کے سایہ میں تلاش کرو۔ مگر یہ خیال رہے کہ اس کی کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچنے پائے۔

بلا فریس :- (عجمی سے) اوہوشیار مرد، کیا ہم اس کا یقین کریں۔

عجمی :- رومی کس طرف سے آرہے ہیں؟

بلا فریس :- سمندر سے، ریگستان کے راستہ سے، جو ابوالہول دیوتا کے نزدیک سے گزرتا ہے۔

عجمی :- (فتاتا سے) او عیار تونے یہ کہانی اس لئے گھڑی ہے کہ ہم دونوں ریگستان جائیں اور رومیوں کی برچھیوں کا نشانہ بنکر ختم ہوجائیں (چاقو اٹھاکر) لے موت کا مزہ چکھ

فتاتا :- مگر لڑکے تیرے ہاتھوں سے نہیں۔

(وہ عجمی کے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیکر محل کے اندر بھاگ جاتی ہے اور اندھیرے میں غائب ہوجاتی ہے بلا فریس عجمی کو قلابازی کھاتا دیکھکر ایک خوفناک قہقہہ لگاتا ہے۔ سپاہی بلزنار کے ہمراہ بہت سے قیدیوں کو لئے ہوئے محل سے باہر کی طرف جلتے ہیں)

عجمی :- کیا کلیوپیٹرا مل گئی؟

بلزنار :- نہیں وہ بھاگ گئی۔ ہم نے کونا کونا چھان مارا مگر وہ نہیں ملی۔

حبشی پہرہ دار :- (محل کے پھاٹک پر آکر) مصیبت۔ آفت۔ بھاگو۔ بھاگو۔

بلزنار :- کیا خبر ہے؟

پہرہ دار :- مقدس سفید بلی چُرالی گئی!

سب مل کر :- افسوس! افسوس!

(ایک عام انتشار — سب غصّہ سے چیختے ہوئے بھاگتے ہیں۔ بھیڑ میں مشعل پھینکدی جاتی ہے اور وہ گل ہوجاتی ہے — تاریکی — قیدیوں کی آوازیں آنی بند ہوجاتی ہیں — کامل سکوت — وقفہ — خاموشی اور تاریکی کا طلسم ٹوٹتا ہے۔ روشنی اب زیادہ صاف ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ مجسمہ ابوالہول کی بڑی بڑی آنکھیں نظر آنے لگتی ہیں، جو سامنے غیر محدود فضا میں نگرانی کر رہا ہے۔ اس کے پاؤں پر ایک لڑکی بے حس وحرکت لیٹی ہوئی ہے۔ جس کے منتشر بال اس طرح چمک رہے ہیں، جیسے چاندنی میں کسی طائر کے پر و بال۔ ناگہاں بہت دور سے ایک خوفناک آواز سنائی دیتی ہے۔ سکوت — پھر چند بگلوں کی آوازیں آتی ہیں — پھر سکوت — پھر ایک آدمی دبے پاؤں جنوب کی طرف سے آتا ہے اور خیالات کی کشمکش میں کھویا ہوا ابوالہول دیوتا کے بائیں جانب کھڑا ہوجاتا ہے اور اس کا سینہ

ابوالہول کے بازوؤں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔)

اجنبی :۔ اے ابوالہول ، جولیس سیزر کی طرف سے بندگی قبول ہو۔ میں اس کھوئے ہوئے مقام کی تلاش میں پھرتا رہا ہوں ، جہاں سے مجھے جلاوطن کر دیا گیا ہے ۔ مجھے ایسے لوگوں کی صحبت ضرور ملی جیسا میں خود ہوں ، لیکن آج تک دوسرا سیزر نہیں ملا۔ مجھے کہیں کی ہوا میں وطنیت کی بو نہیں آتی۔ کوئی انسان مجھے اپنا رشتہ دار نہیں معلوم ہوتا۔ کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو دن بھر میری طرح کام کر سکے ، اور رات بھر خیالات کا ہجوم دماغ میں پیدا کرتا رہے ۔ اس مختصر دنیا میں اے ابوالہول میرا مرتبہ اتنا ہی بلند ہے جتنا تیرا اس ریگستان میں ، فرق یہ ہے کہ میں ہمیشہ آوارہ گردی کرتا رہتا ہوں اور تو ایک جگہ ساکت بیٹھا ہوا ہے ۔ میں فتح کرتا رہتا ہوں اور تو قناعت سے کام لیتا ہے ۔ میں کام کرتا اور متعجب ہوتا ہوں تو نگہبانی کرتا ہے اور انتظار کرتا ہے ۔ میں اوپر دیکھتا ہوں اور آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں ۔ نیچے دیکھتا ہوں اور ان میں اندھیرا چھا جاتا ہے ۔ چاروں طرف دیکھتا ہوں اور ایک کشمکش میں گرفتار ہو جاتا ہوں ۔ اس کے برعکس تیری آنکھیں کبھی نہیں تھکتیں —— اس لئے اے ابوالہول ، تو اور ہم ہرچند انسانی اقوام سے بیگانہ ہیں — لیکن ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں ہیں ۔ کیا میرے دل میں ، پیدائش کے وقت سے تیرے اور اس مقام کے متعلق خیالات پیدا نہیں ہوتے رہے ہیں ؟ روم ایک پاگل کا خواب ہے ، یہ میرا اعتقاد ہے تیری ان ستارہ نما چراغوں کو ، میں نے بہت دور برطانیہ اندلس اور تھیسلی سے دیکھا ہے ۔ تو نے اپنے بعض پرستاروں کو بعض بہت بڑے راز بتا دیئے ہیں اے میری زندگی کے غیر فانی حصہ کے مجسمے ، اے خیالات سے معمور ۔ اور اے اس ریگستان میں تنہا زندگی بسر کرنے والے ابوالہول ! میں رات کی تاریکیوں میں پہاڑوں پر چڑھا ہوں ، تاکہ بہت دور آندھیوں کے دبے پاؤں چلنے کی آوازیں سن سکوں ، جو تیری ریت کو اپنے کھیل کود سے منتشر کرتی پھرتی ہیں —— میرا اس راستہ پر آنا مقدر میں تھا ۔ کیونکہ میں وہی ہوں جس کی اعلیٰ ذہنیت کی تو ایک نشانی ہے ۔ کیا اے ابوالہول ، میں نے تیرے معمہ کو حل کر لیا ہے ۔

لڑکی :۔ (جو بیدار ہو چکی ہے جھانک کر دیکھتی ہے کہ کون بول رہا ہے) بڈھے شریف آدمی ؟

سیزر :۔ (گھبرا کر تلوار کے دستہ پر ہاتھ رکھکر) غیر فانی دیوتا ؟

لڑکی :۔ بڈھے شریف آدمی ۔ مت بھاگو ۔

سیزر :۔ (گھبرا کر) بڈھے آدمی مت بھاگو ! یہ سب کچھ جولیس سیزر سے کہا جا رہا ہے

لڑکی :۔ بڈھے شریف آدمی !

سیزر :۔ اے ابوالہول تو بہت زیادہ ضعیف ہے اور میں تجھ سے کم عمر ہوں ۔ مگر تیری آواز اب بھی ایک لڑکی کی سی ہے ۔

لڑکی :۔ یہاں چڑھکر آؤ ۔ جلدی ، ورنہ رومی آکر تم کو زندہ نگل لیں گے "

[redacted]

سیزر :- (آگے بڑھ کر لڑکی کو دیکھتے ہوئے) اوہ، ابوالہول کے سینہ پر ایک لڑکی - ایک آسمانی مخلوق!

لڑکی :- جلدی اوپر آؤ -

سیزر :- (تعجب سے) تم کون ہو؟

لڑکی :- کلیوپیٹرا - مصر کی ملکہ!

سیزر :- یعنی یونانیوں کی حکمراں!

کلیوپیٹرا :- تمھیں میری توہین نہ کرنی چاہیئے - ورنہ ابوالہول تم کو رومیوں سے ہلاک کرا دیگا - اوپر آؤ یہ مقام بہت آرام دہ ہے -

سیزر :- (آپ ہی آپ) کیسا خواب ہے؟ کسقدر پُرلطف خواب ہے - کاش میں اس خواب سے بیدار نہ ہوں "

(وہ ابوالہول کے نیزہ پر چڑھتا ہے اور پھر اس کا داہنا بازو پھاند کر لڑکی کے پاس پہنچ جاتا ہے)

کلیوپیٹرا :- ہاں اب ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ - تمھارے لئے اس کا دوسرا پاؤں بھی بیٹھنے کے لئے خالی ہو سکتا ہے یہ بہت مضبوط ہے اور ہم کو بچا سکتا ہے - لیکن (کانپتے ہوئے تنہائی کی دہشت سے) وہ میرا کوئی خیال نہ کریگا - نہ مجھے اپنی صحبت میں رکھیگا - مجھے مسرت ہے کہ تم آگئے ہو، میں اپنی تنہائی سے بہت بے چین تھی - کیا تم نے کہیں کسی سفید بلی کو دیکھا ہے؟

سیزر :- (تعجب سے، داہنے پاؤں پر آہستہ بیٹھکر) کیا تمھاری کوئی بلی کھو گئی ہے؟

کلیوپیٹرا :- ہاں سفید مقدس بلی - کیا یہ خوفناک بات نہیں ہے؟ میں یہاں اسے ابوالہول کی قربانی کے لئے لائی تھی - لیکن جب ہم شہر سے کچھ دور نکل گئے تو ایک سیاہ بلی نے اُسے پکارا وہ میرے ہاتھوں سے نکل کر اس کے پاس بھاگ گئی - کیا تمھارا خیال ہے کہ وہ سیاہ بلی میری نانی کی نانی تھی "

سیزر :- (گھورتے ہوئے) تمھاری نانی کی نانی؟

ہاں کیوں نہیں؟ مجھے آج رات کوئی چیز متعجب نہیں کر سکتی -

کلیوپیٹرا :- میں خیال کرتی ہوں کہ اس سے تم کو متعجب ہونا چاہیئے تھا - میری نانی کی نانی سفید مقدس بلی کا سیاہ بچہ تھی - اور نیل دیوتا نے اسے اپنی ساتویں بیوی بنایا تھا - اسی لئے میرے بال اس قدر لہردار ہیں اور میں ہمیشہ یہی چاہتی ہوں کہ جو کچھ میں کرنا چاہوں مجھے کرنے دیا جائے، خواہ اس میں دیوتاؤں کی مرضی شامل ہو یا نہیں - کیونکہ میرا خون نیل کے پانی سے بنایا گیا ہے -

سیزر :- تم یہاں رات کی ایسی وحشتناک تاریکی میں کیا کر رہی ہو؟ کیا تم یہاں رہا کرتی ہو؟

کلیوپیٹرا :- حقیقت میں تو ایسا نہیں ہے، میں ملکہ ہوں اور جاکر اپنے قصر میں رہونگی - مگر شرط یہ ہے کہ میں اپنے بھائی کا خاتمہ کر دوں کیونکہ اس نے مجھے وہاں سے بھگا دیا ہے اور جب میری عمر اور زیادہ ہو جائیگی تو جو کچھ میرا دل چاہیگا کرونگی - میں غلاموں کو زہر دیدونگی اور ان کو تڑپ تڑپ کر جان دیتے ہوئے دیکھونگی، اور فتاتا سے کہونگی کہ دیکھ اب تو آگ کی بھٹی میں

ڈال دی جائے گی ۔
سیزر :- ہوں ! اس وقت تک تم اپنے گھر جاکر بستر پر کیوں نہیں لیٹیں ۔ ؟
کلیوپیٹرا :- اس لئے کہ رومی ہم سب کو نگلنے آرہے ہیں مگر تم بھی تو اپنے گھر میں نہیں ہو، اور نہ اپنے بستر پر ؟
سیزر :- (مطمئن انداز سے) ہاں، میں تو ایک خیمے میں رہتا ہوں اور اس وقت اسی کے اندر گہری نیند میں ڈوبا ہوا ہوں اور خواب دیکھ رہا ہوں کیا تم یہ سوچتی ہو کہ مجھے تمھاری اصلیت پر یقین ہے ؟
کلیوپیٹرا :- (اس کی طرف بڑھتے ہوئے) تم ایک ظریف بڈھے آدمی ہو ۔ میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں ۔
سیزر :- اوفہ ۔ تمھارا یہی کہنا تو میرے خواب کو، خواب پریشاں بنا دیتا ہے ۔ تم یہ خواب کیوں نہیں دیکھتیں کہ میں جوان ہوں ؟
کلیوپیٹرا :- میں چاہتی ہوں کاش تم جوان ہوتے ! میں یہ سوچتی ہوں کہ مجھے تم سے اور زیادہ ڈرنا چاہئے ۔ میں آدمیوں کو ضرور پسند کرتی ہوں ۔ مگر صرف جوان آدمیوں کو جنکے شانے طاقتور اور گول ہوں، بازو خوبصورت ہوں ۔ تم بڈھے آدمی ہو اور کسی حد تک کمزور ۔ لیکن تمھاری آواز بہت دلکش ہے ۔ اور میں چاہتی ہوں کہ کوئی شخص مجھ سے باتیں کرتا رہے ۔ گو میرا خیال ہے کہ تم کسی قدر دیوانے بھی ہو ۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ چاند ہے جو تم کو ایسی دیوانی باتیں کرنے پر مجبور کر رہا ہے
سیزر :- کیا تم نے سنا تھا ـــــــ جب میں ابوالہول دیوتا کی عبادت اور تعریف کر رہا تھا

کلیوپیٹرا :- لیکن یہ بڑا ابوالہول نہیں ہے ۔
سیزر :- (مجسمے کی طرف دل شکستہ انداز سے دیکھ کیا) کیا ؟
کلیوپیٹرا :- یہ تو ابوالہول کی ایک بلی کا چھوٹا بچہ ہے ۔ کیوں ؟ ۔ بڑا ابوالہول تو اتنا بڑا ہے کہ اس کے پنجوں کے بیچ میں ایک بڑا مندر تعمیر کیا گیا ہے، یہ میرا عزیز ہے ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمھاری دانست میں رومیوں کے پاس ایسے جادوگر ہیں جو ہم کو اپنے جادو کے ذریعہ ابوالہول سے الگ کر سکیں ؟
سیزر :- کیوں ؟ کیا تم رومیوں سے ڈرتی ہو ؟
کلیوپیٹرا :- (بہت سنجیدگی سے) اوہ ۔ وہ اگر ہم کو پا جائیں تو زندہ نگل جائیں ۔ وہ ظالم ہوتے ہیں ان کا سردار جولیس سیزر کہلاتا ہے ۔ اس کا باپ ایک شیر تھا اور اس کی ماں ایک آتشی پہاڑ، اس کی ناک ہاتھی کی سونڈ کی طرح لمبی ہے ۔
(سیزر غیر ارادی طور پر اپنی ناک ٹٹولنے لگتا ہے)
اور وہ کیا، سب رومیوں کی ناکیں لمبی ہوتی ہیں ۔ اُن کی دُمیں چھوٹی ہوتی ہیں اور ہر ایک کے سات ہاتھ ہوتے ہیں ۔ اور ہر ہاتھ میں سو سو تیر ہوتے ہیں ۔ اور وہ انسان کے گوشت پر زندگی بسر کرتے ہیں ۔
سیزر :- اگر تم مجھے اجازت دو تو میں تمھیں ایک اصل رومی کو دکھاؤں !
کلیوپیٹرا :- (مبہوت ہوکر) نہیں ۔ تم مجھے ڈرا رہے ہو !
سیزر :- کوئی ہرج نہیں ۔ یہ صرف ایک خواب ہے ۔
کلیوپیٹرا :- (گھبراتے ہوئے) یہ خواب نہیں ہے ۔

[redacted]

یہ خواب نہیں ہے۔ دیکھو۔ دیکھو۔
(وہ اپنے بالوں سے ایک آلپین نکال کر سیزر کے بازو
میں چبھو دیتی ہے)
سیزر:- ہا ہا ہا۔ ٹھہرو (غصہ سے) تم نے یہ کیا
حرکت کی؟
کلیوپیٹرا:- (شرمندہ ہو کر) تم نے کہا تم خواب دیکھ
رہے ہو میں تم کو یہی بتانا چاہتی تھی کہ ——
سیزر:- (نرمی سے) اٹھو آؤ - ادھر [illegible] آتی کیوں
ہو؟ ایک ماں کو روتا چاہئے (وہ اس حقیقت کے انکشاف
پر اپنے دونوں ہاتھ ملنے لگتا ہے) کیا واقعی میں بیدار ہوں؟
(وہ اس حقیقت پر یقین کرنے کے لئے اپنا ہاتھ ابوالہول پر
پٹکتا ہے) نہیں ناممکن - دیوانگی - پاگل پن - (بیتاب
ہو کر) خیمے کو واپس ——— خیمے کو۔
(وہ پھر سے عجلت سے نیچے کود پڑنے کو اٹھتا ہے)

کلیوپیٹرا:- (خوفزدہ ہو کر اس کو دونوں ہاتھوں سے
پکڑتے ہوئے) نہیں۔ تمھیں اکیلا چھوڑ کر نہ جانا چاہئے
نہیں نہیں مت جاؤ۔ میں ڈرتی ہوں میں رومیوں سے
بہت ڈرتی ہوں۔
سیزر:- (یہ یقین کرنے کے لئے وہ حقیقت میں
بیدار ہے) کلیوپیٹرا کیا تمھیں میرا چہرہ صاف نظر
آتا ہے؟
کلیوپیٹرا:- ہاں چاندنی میں وہ اور سفید نظر آتا ہے۔
سیزر:- کیا تمھیں یقین ہو کہ چاندنی نے میرے چہرہ کو
کو اہل مصر کے چہرہ سے زیادہ گورا بنا دیا ہے (اضطراب
کے ساتھ) کیا تم یہ بھی دیکھتی ہو کہ میری ناک کچھ
لمبی ہے۔
کلیوپیٹرا:- (ایک خوفناک شبہ سے متاثر ہو کر) اوہ!
سیزر:- یہ ایک رومی ناک ہے۔ کلیوپیٹرا۔
کلیوپیٹرا:- آہ (ایک دلخراش چیخ کے ساتھ وہ اچھل
کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ابوالہول کے بائیں بازو کی
طرف جھپٹتی ہے۔ ریتیلی زمین پر کود پڑتی ہے۔ اور
اپنے دونوں گھٹنوں پر جھک کر دردناک لہجے میں
کہتی ہے) ابوالہول! اس کو کاٹ کر دو ٹکڑے کر دے
اس کو کاٹ کر دو ٹکڑے کر دے۔ میرے کہنے کا مقصد
سفید بلی سے ہے میرا مقصد اسی سے ہے۔ میں (سیزر
پتھر کے چبوترے پر سے کود پڑتا ہے اور کلیوپیٹرا کے شانے
پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے) آہ (وہ اپنا منہ اپنے ہاتھوں
سے چھپا لیتی ہے)
سیزر:- کلیوپیٹرا۔ اگر کہو تو تمھیں ایک ایسی تدبیر بتاؤں
جس سے تم سیزر کے مظالم سے محفوظ رہو۔
کلیوپیٹرا:- (اس سے لپٹ کر ملتجی انداز سے) ہاں
ہاں بتاؤ۔ ضرور بتاؤ۔ میں فتاتا کے زیور چرا کر تم کو
دیدونگی۔ میں دریائے نیل سے کہدونگی کہ وہ تمھارے
کھیتوں کو سال میں دو بار شاداب کر دیا کرے۔
سیزر:- خاموش رہ۔ اے لڑکی۔ تیرے دیوتا بھی
رومیوں سے ڈرتے ہیں۔ تم نے دیکھ لیا کہ تیرے
ابوالہول نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ اور وہ مجھے تم کو
سیزر کے پاس لیجانے سے منع نہ کر سکا۔

کلیوپیٹرا:- (رحم طلب کرتی ہوئی دھیمی آواز میں) تم نہ لیجاؤگے؟ تم نے ابھی کہا کہ مجھے نہ لیجاؤگے۔

سیزر:- سیزر عورتوں کو نہیں نگلتا۔

کلیوپیٹرا:- (امید افزا انداز سے خوش ہوکر) کیا!

سیزر:- (موثر انداز سے) لیکن وہ لڑکیوں کو نگل لیتا ہے (وہ غمزدہ ہوجاتی ہے) اور تم بلیوں کی ایک چھوٹی بیوقوف لڑکی ہو، تم کالی بلی کی نسل سے ہو۔ تم بلی بھی ہو اور لڑکی بھی۔

کلیوپیٹرا:- (کانپتے ہوئے) تو کیا وہ مجھے نگل جائیگا۔

سیزر:- ہاں! جب تک تم اُسے یہ یقین نہ دلادو کہ تم ایک عورت ہو۔

کلیوپیٹرا:- اوہ۔ تو تم میرے لئے کوئی جادوگر بلاؤ تاکہ وہ مجھے عورت بنادے۔ کیا تم جادوگر ہو؟

سیزر:- شاید! لیکن اس میں بہت وقت صرف ہوگا۔ اور آج ہی رات کو تمھیں اپنے محل میں سیزر کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔

کلیوپیٹرا:- نہیں۔ نہیں مجھ سے نہیں ہوسکتا۔

سیزر:- تمھارے دل میں خواہ کیسی ہی دہشت کیوں نہ پیدا ہو۔ اور سیزر کتنا ہی خوفناک کیوں نہ نظر آئے ——— تمھیں ایک بہادر عورت اور ایک عالی شان ملکہ کی طرح اسے نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھنا چاہئے اور تم کو اس سے ذرا بھی خوف محسوس نہ ہونا چاہئے۔ اگر تمھارا ہاتھ کانپا——— اور تمھاری آواز بھرائی——— تو ــ رات ہی اور موت (وہ رنجیدہ ہوجاتی ہے) لیکن اگر وہ تمھیں حکومت کرنے کے قابل سمجھیگا تو اپنے پاس تخت پر بٹھالیگا۔ اور مصر کا سچا فرمانروا بنادیگا۔

کلیوپیٹرا:- (نا امیدی سے) نہیں وہ میری اصلیت کو جان لیگا۔ وہ مجھے پہچان لیگا۔

سیزر:- (غمگین انداز سے) وہ عورتوں سے بہت جلد دھوکہ کھاجاتا ہے عورتوں کی آنکھیں اس کی نظروں کو خیرہ کردیتی ہیں۔ وہ انھیں اس حالت میں نہیں دیکھتا جس میں وہ دراصل ہوتی ہیں بلکہ اس حالت میں دیکھتا ہے، جس میں وہ خود انھیں دیکھنا چاہتا ہے۔

کلیوپیٹرا:- (اُمید افزا انداز سے) تو ہم اُسے دھوکہ دینگے میں فتاتا کے سر کا دوپٹہ اوڑھ لونگی اور وہ مجھے بالکل بڈھی عورت سمجھ لے گا۔

سیزر:- اگر تم ایسا کروگی تو وہ تمھیں فوراً نگل لیگا۔

کلیوپیٹرا:- لیکن میں اُسے جادو کی ایک ایسی روٹی دونگی جس میں سفید بلی کے سات بال بھی گوندھے گئے ہیں اور ـــ

سیزر:- (قطع کلام کرتے ہوئے) اونہہ۔ تم بڑی بیوقوف لڑکی ہو۔ وہ تمھیں اور تمھاری روٹی دونوں کو کھاجائیگا

(وہ متنفر انداز سے اس کی طرف سے رُخ پھیر لیتا ہے)

کلیوپیٹرا:- (دوڑکر اس کے ہاتھوں سے چمٹتے ہوئے) مجھپر مہربانی کرو۔ تم جو کہوگے میں وہی کرونگی۔ میں بالکل چپ چاپ رہونگی۔ میں تمھاری لونڈی بنجاؤنگی ———

(پھر ایک بار صحرا کی سنسان فضاؤں میں بگل کی خوفناک آواز بلند ہوتی ہے)

سیزر:- سنو۔ سنو۔

کلیوپیٹرا:- (کانپتے ہوئے) یہ کیا تھا؟

سیزر:- سیزر کی آواز!

[redacted]

کلیوپیٹرا:- (اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے) چلو بھاگ چلیں - آؤ - آہ آؤ -

سیزر:- جب تک تم سیزر کے استقبال کے لئے اپنے تخت پر نہیں بیٹھتیں، اس وقت تک میرے ساتھ محفوظ ہو - چلو مجھے اس طرف لے چلو -

کلیوپیٹرا:- (مسرور ہوکر) ہاں - چلو میں ضرور لے چلونگی (بیل نگار کی آواز آتی ہے) اُف ، دیکھو دیوتا غضبناک ہو رہے ہیں کیا تم نہیں محسوس کرتے کہ زمین لرز رہی ہے

سیزر:- یہ سیزر کی فوج کی رفتار ہے -

کلیوپیٹرا:- (اُسے کھینچتے ہوئے) اس طرف چلو ہمیں چاہئے کہ چلتے چلتے سفید بلی کو بھی تلاش کرتے چلیں - اسی نے تو تم کو رومی بنا دیا ہے -

(سیزر اس کے ساتھ جاتا ہے - اور وہ جس قدر آگے ریگستان میں بڑھتے جاتے ہیں - بگل کی آواز اور زیادہ صاف سنائی دیتی ہے چاندنی پھیکی پڑ جاتی ہے اُفق پر سیاہی نمودار ہوتی ہے - آسمان تاریکی کے پردہ میں روپوش ہو جاتا ہے اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا - دفعتہً ایک مشعل کی روشنی بہت دور سے ان مصری ستونوں پر پڑتی ہے جو ایک شاندار غلام گردش کو سنبھالے ہوئے ہیں - اس غلام گردش کے دوسرے کنارے پر ایک حبشی غلام مشعل لئے ہوئے نظر آتا ہے - سیزر کلیوپیٹرا کے کہنے کے مطابق خاموشی سے اس کے ساتھ جاتا ہے وہ غلام گردش سے نیچے اترتے ہیں - سیزر یہاں کے فن تعمیر کو غائر نگاہوں سے دیکھتا جاتا ہے - ستون کے نقوش کو دیکھتا ہوا آگے چلکر دیوار ایک گوشہ کی طرف مڑ جاتی ہے اور ایک اونچا برآمدہ نظر آتا ہے - سیزر اپنے داہنی جانب تختِ شاہی دیکھتا ہے اور اس تخت کے پیچھے ایک دروازہ نظر آتا ہے - تخت کی ہر دو جانب ایک سیدھا ستون ہے جس پر ایک شمع رکھی ہے)

سیزر:- یہ کون سا مقام ہے ؟

کلیوپیٹرا:- یہ وہ جگہ ہے جہاں میں تخت شاہی پر بیٹھتی ہوں - جب میں شاہی لباس پہن کر تاج سر پر رکھتی ہوں

(غلام تخت کو دکھانے کے لئے مشعل بلند کرتا ہے)

سیزر:- غلام کو حکم دو کہ وہ شمع روشن کر دے -

کلیوپیٹرا:- (شرمندگی سے) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں حکم دے سکتی ہوں ؟

سیزر:- کیوں نہیں ! تم ملکہ ہو (وہ ہچکچاتی ہے) کہو

کلیوپیٹرا:- (ڈرتے ہوئے غلام سے) شمعیں روشن کرو -

فتاتا:- (تخت کے پیچھے سے یکایک باہر نکل کر) ٹھہر جاؤ

(غلام ٹھہر جاتا ہے وہ غضبناک انداز سے کلیوپیٹرا سے مخاطب ہوتی ہے جو شیر کے بچے کی طرح دبک جاتی ہے) یہ تیرے ساتھ کون ہے ؟ اور تو نے بلا میری اجازت کے شمعیں روشن کرنے کی جرأت کیونکر کی ؟ -

(کلیوپیٹرا خوف سے چپ رہتی ہے)

سیزر:- یہ کون ہے ؟

کلیوپیٹرا:- فتاتا -

فتاتا:- (نخوت سے) ملکہ کی خاص انا ، دایہ !

سیزر:- (قطع کلام کر کے) تمہارے غلام اور ملازم

تم سے اسی طرح کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اسے باہر نکال دو (غلام سے) اور کیا تو ملکہ کے حکم کی تعمیل نہیں کر رہا ہے؟ (غلام شمعیں روشن کرتا ہے۔ کلیوپیٹرا فتاتا کے خوف سے سہمی ہوئی کھڑی ہے) تم ملکہ ہو۔ اسے باہر نکال دو۔

کلیوپیٹرا:۔ (نرمی سے) پیاری فتاتا تمھیں ایک لمحہ کیلئے باہر چلا جانا چاہیئے۔

سیزر:۔ تم اسے باہر جانے کا حکم نہیں دے رہی ہو بلکہ اس سے درخواست کر رہی ہو۔ تم ملکہ نہیں ہو۔ تم نگل لی جاؤ گی۔ لو میں جاتا ہوں خدا حافظ۔

(وہ جانے لگتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (پکڑتے ہوئے) نہیں۔ نہیں۔ مجھے اکیلا چھوڑ کے نہ جاؤ"

سیزر:۔ ایک رومی ایسی ملکہ کے پاس نہیں رہتا جو اپنے خادموں سے ڈرتی ہو۔

کلیوپیٹرا:۔ میں ڈرتی نہیں ہوں۔ مجھے ذرا بھی خوف نہیں معلوم ہوتا۔"

فتاتا:۔ اچھا تو مجھے دیکھنا ہے یہاں کون ڈرتا ہے۔ کلیوپیٹرا!

سیزر:۔ او عورت اپنا سر جھکا کر باتیں کر کیا میں بھی کوئی بچہ ہوں جو مجھے دھمکاتی ہے (وہ کلیوپیٹرا کے پاؤں کے پاس زمین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فتاتا کسی قدر مبہوت انداز میں کھڑی رہتی ہے سیزر حبشی غلام کو پکارتا ہے۔ غلام حاضر ہوتا ہے) کیا تو ایک سر کاٹ سکتا ہے؟

(حبشی غلام نفی میں سر ہلاتا ہے اور اس کے دانت باہر نکل آتے ہیں۔ سیزر میان سے تلوار کھینچ لیتا ہے اور تلوار غلام کو دینے کے لئے بڑھتا ہے۔ پھر فتاتا کو مخاطب کرتے ہوئے) کیا تو اپنی ہستی بھول گئی۔

(فتاتا کلیوپیٹرا کے سامنے سر تعظیم خم کر دیتی ہے)

فتاتا:۔ او عالی شان ملکہ، اپنی عظمت و حکمرانی کے زمانہ میں اپنی قدیم انا کو۔ بھول جانا۔

کلیوپیٹرا:۔ (تعجب سے دیکھتے ہوئے) جاؤ۔ چلی۔ جاؤ۔ جاؤ یہاں سے۔ (فتاتا اٹھتی ہے اور دروازے سے نکل کر واپس چلی جاتی ہے۔ کلیوپیٹرا اس کی تعظیم کو بے چینی سے دیکھتی ہے اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو ملنے لگتی ہے۔ پھر یکایک چیخ کر کہتے ہوئے) لاؤ مجھے کوئی چیز دو۔ میں اسے مار کر بھگاؤں۔

(وہ تخت سے ایک سانپ کی کھال اٹھا لیتی ہے۔ اور فتاتا کے پیچھے دوڑتی ہے اور سانپ کی کھال کو گھماتی رہتی ہے۔ سیزر دوڑتا ہے اور اُسے پکڑ لیتا ہے فتاتا بھاگ جاتی ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (خود کو چھڑاتے ہوئے) میں کسی کو اسوقت ضرور مارونگی۔ میں اس غلام کو مارونگی۔ (وہ غلام کو مارتی ہے۔ غلام جان بچانے کو اِدھر اُدھر بھاگتا ہے آخر غلام گردش میں بھاگ کر جان بچاتا ہے۔ کلیوپیٹرا سانپ کی کھال پھینک دیتی ہے اور تخت کی سیڑھیوں پر دونوں ہاتھ ہلاتی اور چلاتی ہوئی چڑھنے لگتی ہے) آخر کار میں ایک سچی ملکہ۔ یعنی کلیوپیٹرا ہوں (سیزر اپنا سر ہلاتا ہے وہ سیزر کو تعریف کی نگاہوں سے دیکھنے لگتی ہے پھر وہ سیڑھیوں سے نیچے کودتی ہے۔ اس کی طرف دوڑتی ہے اور اپنے دونوں بازو اس کی گردن میں ایک ادائے محبت و مسرت سے ڈال دیتی ہے۔ اور پھر جوش و مسرت سے کہتی ہے) آہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ کیونکہ تم نے مجھے

[redacted]

ملکہ بنا دیا۔

سیزر:۔ لیکن شہزادیاں تو صرف بادشاہوں سے محبت کرتی ہیں۔

کلیوپیٹرا:۔ لیکن میں اب ان سب آدمیوں کو جنھیں میں چاہتی ہوں، بادشاہ بنا سکتی ہوں میں تمھیں بھی بادشاہ بنا دونگی ۔ میں اور بہت سے نوجوانوں کو بادشاہ بناؤنگی جن کے بازو خوبصورت اور طاقتور ہوں گے۔ اور جب میں ان سے بیزار ہو جاؤنگی تو انھیں تازیانے مار مار کر ہلاک کر دونگی۔ لیکن تم ہمیشہ بادشاہ بنے رہوگے میرے اچھے، مہربان، عقلمند بڈھے بادشاہ، (مضطرب انداز سے) کیا تم سیزر سے یہ نہ کہوگے۔ کہ میں ملکہ ہوں؟ ایک سچی ملکہ ہوں، سنو ہم دونوں یہاں سے بھاگ چلیں اور جب تک سیزر یہاں سے چلا نہ جائے کہیں چھپے رہیں۔

سیزر:۔ اگر تم سیزر سے ڈرتی ہو۔ تو بھی ملکہ نہیں ہو اور اگر تم کسی ہرم کے پیچھے چھپ جاؤگی تو بھی وہ سیدھا وہیں جاکر تم کو ڈھونڈے گا۔ اور ہرم کو ایک ہاتھ سے اٹھا لیگا۔

(وہ اپنے دانت پیستا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (کانپتے ہوئے) اوہ!

سیزر:۔ اگر تم ڈرتی ہو تو ڈرو۔ (بگل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ خوف سے چلا اٹھتی ہے۔ سیزر طعن آمیز لہجہ میں اظہار مسرت کرتے ہوئے) آہا ہا۔ سیزر کلیوپیٹرا کے تخت کے پاس آرہا ہے۔ آؤ اپنی جگہ پر بیٹھو۔ (وہ کلیوپیٹرا کا ہاتھ پکڑ کر تخت کی طرف لیجاتا ہے کلیوپیٹرا اس قدر غمگین ہوکر کچھ نہیں بولتی) ہوں۔ طیطاتوتا۔ تم اپنی خادمہ کو کس طرح پکارتی ہو؟

کلیوپیٹرا:۔ (بیدلی سے تخت پر بیٹھکر کانپتے ہوئے) تالی بجاؤ۔

(وہ تالی بجاتا ہے فتاتا واپس آتی ہے)

سیزر:۔ ملکہ کا لباس اور تاج لاؤ خادماؤں کو بلاؤ اور ملکہ کو سنوارو

کلیوپیٹرا:۔ (مسرور ہوکر) ہاں تاج فتاتا میں تاج سر پر رکھونگی۔

فتاتا:۔ مگر یہ سب کس کے لئے پہنے گی۔

سیزر:۔ ایک رومی کے لئے۔ ایک بادشاہوں کے بادشاہ کے لئے طوطاتیتا۔!

کلیوپیٹرا:۔ (فتاتا کو مارتے ہوئے) تجھے سوال کرنے کی جرات کیونکر ہوئی؟ جا اور جو حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کر۔ (فتاتا دانت پیستی ہوئی جاتی ہے۔ کلیوپیٹرا آرزومندانہ انداز سے سیزر کے پاس جاتی ہے) تو جب سیزر میرا لباس اور تاج دیکھیگا تو اس کو معلوم ہو جائیگا کہ میں ملکہ ہوں! کیوں؟

سیزر:۔ نہیں اُسے کس طرح معلوم ہوگا کہ تم ایک ملکہ کے لباس میں کنیز نہیں ہو؟

کلیوپیٹرا:۔ تمھیں کہدینا چاہئے۔

سیزر:۔ وہ مجھ سے نہ دریافت کریگا۔ وہ خود کلیوپیٹرا کو اس کی عظمت وشان اور نخوتِ حسن سے پہچان لے گا۔ کیا تم کانپ رہی ہو؟

کلیوپیٹرا:۔ (خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے) نہیں میں

میں ——— (نہایت دھیمی آواز میں) نہیں۔

(فتاتا اور تین عورتیں لباس وغیرہ لیکر آتی ہیں)

فتاتا:۔ ملکہ کی سب خادمائیں بھاگ گئیں۔ صرف یہی تین باقی رہ گئی ہیں۔

(وہ کلیوپیٹرا کو لباس پہنانے لگتی ہیں)

سیزر:۔ خیر۔ تین ہی کافی ہیں۔ غریب سیزر کو تو اپنا لباس خود ہی پہننا پڑتا ہے۔

فتاتا:۔ (حقارت سے) مصر کی ملکہ ایک ظالم رومی نہیں ہے۔ (کلیوپیٹرا سے) میری بچی دلیر بنی رہو۔ اور اپنا سر اس اجنبی کے سامنے بلند رکھو۔

سیزر:۔ (کلیوپیٹرا کی تعریف کرکے تاج اس کے سر پر رکھتے ہوئے) ایک ملکہ ہونا مسرت آفریں ہے یا تکلیف دہ۔ کلیوپیٹرا؟

کلیوپیٹرا:۔ تکلیف دہ!

سیزر:۔ خوف و دہشت کو دل سے دور کردو تو تم سیزر کو مفتوح کرلوگی، فتاتا کیا رومی قریب آگئے؟

فتاتا:۔ ہاں وہ بالکل قریب آگئے ہیں۔ اور پہرہ دار بھاگ گیا ہے۔

(حبشی غلام بھاگا ہوا آتا ہے)

غلام:۔ رومی احاطہ کے اندر آگئے ہیں۔

(ایک دروازہ سے نکل کر بھاگتا ہے۔ ایک چیخ کے ساتھ تینوں عورتیں اس کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ فتاتا کے چہرہ سے خوف کا اظہار ہونے لگتا ہے کلیوپیٹرا ان کے پیچھے بھاگنے سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتی۔ سیزر اُس کی کلائی پکڑ لیتا ہے اور اُس کو گھورتا ہے۔ وہ ایک بچہ کی طرح چپ کھڑی ہو جاتی ہے)

سیزر:۔ ملکہ کو تنِ تنہا سیزر کا مقابلہ کرنا چاہئے جواب دو۔ "ایسا ہی ہوگا"

کلیوپیٹرا:۔ (خوف سے سفید ہوکر) ایسا ہی ہوگا۔

سیزر:۔ (اس کو چھوڑتے ہوئے) بہت خوب۔

(فوج کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ بگل کی آواز بالکل قریب آجاتی ہے۔ کلیوپیٹرا بہت خوفزدہ ہوجاتی ہے، وہ چیخ مار کر دروازہ کی طرف دوڑتی ہے فتاتا اُسے دوڑ کر پکڑ لیتی ہے)

فتاتا:۔ تم نے ابھی وعدہ کیا تھا کہ "ایسا ہی ہوگا" اور اگر تم اس کے لئے مر بھی جاؤ تو تمھیں ایک ملکہ کے الفاظ کو سچا ثابت کرنے میں پس و پیش نہ کرنا چاہئے۔

(وہ کلیوپیٹرا کو سیزر کے سپرد کردیتی ہے جو اُسے تخت کی طرف واپس لے جاتا ہے کلیوپیٹرا دہشت کے مارے اپنے آپ میں نہیں رہتی)

سیزر:۔ اب اگر تم ہمت ہاردوگی ———

(وہ خود بھی اُس کے قریب تخت پر بیٹھ جاتا ہے وہ موت کا انتظار کرتی ہوئی خود فراموشی کے عالم میں سیڑھی پر کھڑی رہتی ہے۔ رومی سپاہی غلام گردش سے نکل کر شور و غل کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہیں جنکے ساتھ ان کا نقیب جھنڈا لئے ہوئے ہے اور بگلچی بھی ساتھ ہے جب وہ محل میں داخل ہوتے ہیں تو تعجب سے تخت کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ایک صف میں ترتیب دے لیتے ہیں۔ اپنی تلواریں

میانوں سے کھینچ لیتے ہیں۔ اور "سیزر زندہ باد" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ کلیوپیٹرا رخ پھیر کر مبہوت نگاہوں سے سیزر کو دیکھتی ہے اور پھر اس منظر کو دیکھ کر خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے سیزر کی آغوش میں گر پڑتی ہے۔)

ایکٹ دوسرا

اسکندریہ :-

محل کی پہلی منزل کا ایک دالان، جو ایک ایسے گوشے میں ختم ہوتا ہے جہاں دو سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس گوشے سے بحر قلزم نظر آتا ہے جس کی سطح صبح کی شعاعوں میں جھلمل جھلمل کر رہی ہے۔ دلکش مناظر، فرش اور ساز و سامان نے اس جگہ کو فرحت بخش، خوبصورت، سادہ اور ٹھنڈا بنا رکھا ہے۔

کمسن بادشاہ ٹالمی سیڑھیوں کے سرے پر دالان میں جانے کے لئے کھڑا ہے، اور اس کا سرپرست پوتھینس بھی اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے۔ دربار اس کے استقبال کے لئے آراستہ ہے ایک جماعت میں، جو ٹالمی کی دائیں جانب ہے، سب سے بڑی شخصیت ٹالمی کے اتالیق تھیوڈوٹس کی ہے۔ دوسرا گروہ جو ٹالمی کی بائیں جانب ہے اس میں ٹالمی کی فوج کا سپہ سالار اکیلس سب کا سردار ہے۔ تھیوڈوٹس ایک پستہ قد ضعیف آدمی ہے جس کے خدوخال اتنے ہی مردہ ہیں جتنے اس کے اعضا اور اس کا قد۔ اس کی ناک اونچی اور پیشانی سیدھی ہے، جو اس کے چہرہ میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت رکھتی ہے اسکی نگاہوں میں عقاب کی سی تیزی ہے اور دوسروں کی باتیں ایک فلسفی کی سی خبرداری سے سنتا ہے۔ اکیلس ایک پینتیس سالہ آدمی ہے جس کی سیاہ گھنی داڑھی میں پیچ پڑے ہوئے ہیں بظاہر وہ چالاک آدمی نہیں معلوم ہوتا البتہ ایک بارعب اور ممتاز شخصیت کا ضرور مالک ہے۔

پوتھینس خواجہ سرا، ایک طاقتور آدمی ہے مگر حدت پسند اور حاضر جواب۔ اس کی عمر پچاس برس کی ہے۔ لیکن اس کا دماغ بہت معمولی ہے۔ اس کی فطرت میں غصہ بہت ہے اور وہ اپنے غصہ کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ اس کے بال سمور کی مانند خوبصورت ہیں۔

"ٹالمی بادشاہ، اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ سنجیدہ اور معمر نظر آتا ہے۔ لیکن اس میں اب بھی لڑکپن موجود ہے وہ دوسروں کی رہنمائی پر چلنے کا عادی ہے۔ سب لوگ بادشاہ کا نہایت احترام سے استقبال کرتے ہیں۔ وہ اتر کر نیچے آتا ہے اور ایک کرسی کے قریب جو اس کے دائیں جانب ہے آکر کھڑا ہوجاتا ہے وہ اس پر بیٹھے ہوئے آئندہ ہدایات کے لئے نہایت بے چینی سے اپنے سرپرست پوتھینس کی طرف دیکھتا ہے جو خود بائیں طرف بیٹھ جاتا ہے۔

پوتھینس :- بادشاہ مصر کچھ کہنا چاہتا ہے - !

تھیوڈوٹس :- (موثر انداز سے) بادشاہ کا فرمان سننے کے لئے خاموش رہو۔

ٹالمی :- (ایک رٹے ہوئے سبق کو دہرانے لگتا ہے) تم سب کو غور سے سننا چاہئے ۔ میں تمھاری بانسری بجانے والے بادشاہ آنی ٹیس کا سب سے پہلا بیٹا ہوں میری بہن بیرنیس، اسے تخت سے ہٹا کر خود حکومت کرنے لگی۔ لیکن، لیکن، (وہ رک جاتا ہے)

پوتھینس :- (چپکے سے لقمہ دیتے ہوئے) دیوتاؤں کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

ٹالمی :- ہاں - دیوتاؤں کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا ــــ نقصان نہ پہنچے گا (وہ چپ ہو جاتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بے معنی انداز سے) میں بھول رہا ہوں کہ دیوتاؤں کو کیا نقصان نہ پہنچے گا۔

تھیوڈوٹس :- بہتر ہے کہ بادشاہ کا سرپرست پوتھینس بادشاہ کے خیالات کا اظہار کرے۔

پوتھینس :- (اپنی بے چینی کو مشکل سے ضبط کرتے ہوئے) بادشاہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ دیوتا ہرگز اس امر کو برداشت نہ کریں گے کہ اس کی شریر بہن، بلا سزا پائے چلی جائے

ٹالمی :- (جلدی سے) ہاں اب مجھے یاد آگیا۔ (وہ پھر کہنے لگتا ہے) اس لئے دیوتاؤں نے ایک اجنبی شخص مارک انطونی، رومی سواروں کے ایک سردار کو اس ریگستان میں بھیجا اور اس نے میرے باپ کو پھر تخت واپس دلا دیا۔ اور میرے والد نے میری بہن بیرنیس کا سر قلم کر دیا۔ اور اب گو میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ تاہم میری ایک دوسری بہن کلیوپیٹرا مجھ سے تخت و ملک چھین کر خود میری جگہ حکومت کرنا چاہتی ہے لیکن دیوتا اس کو برداشت نہ کریں گے۔ (پوتھینس نصیحتاً زور سے کھانستا ہے) دیوتا - دیوتا برداشت نہ کریں گے۔

پوتھینس :- (لقمہ دیتے ہوئے) برقرار نہ رکھیں گے۔

ٹالمی :- ہاں ٹھیک! وہ ایسی زبردستی کو برقرار نہ رکھیں گے۔ اور وہ اس کا سر بھی، اس کی بہن کی طرح قلم کر دیں گے۔ لیکن اس نے چڑیل فتاتا کی مدد سے جولیس سیزر پر اپنا جادو چلا دیا ہے۔ تاکہ وہ اس کو حکومت کرنے میں اس کے غلط اور بے بنیاد دعوؤں کو سچ ثابت کر دکھائے۔ تو اب تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں یہ برداشت نہ کرونگا ــــ میں یہ برداشت نہ کروں گا۔ (پوتھینس سے مستفسرانہ) ہاں میں کیا برداشت نہ کرونگا؟

پوتھینس :- (یکایک نہایت زور اور سیاسی جوش کے ساتھ) بادشاہ ہرگز یہ برداشت نہ کرے گا کہ ایک غیر ملکی، اس سے، اس کا تخت چھین لے۔ (نعرۂ تحسین) اَچیلس! بادشاہ کی خدمت میں عرض کرو کہ رومی کے ساتھ کتنے سوار اور سپاہی ہیں؟

تھیوڈوٹس :- بہتر ہوگا کہ شاہی افواج کا سپہ سالار اس کا اظہار کرے۔

اچیلس :- جہاں پناہ! صرف تین ہزار سپاہی اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار سوار۔

(درباری ایک نفرت آگیں قہقہہ لگاتے ہیں اور

[redacted]

رور زور سے باتیں ہونے لگتی ہیں۔ اس اثنا میں ایک رومی سردار (روفیو) دالان میں وارد ہوتا ہے۔ وہ ایک اوسط عمر کا بارعب آدمی ہے جس کے چہرہ پر سیاہ گھنی لمبی داڑھی ہے۔ یہ شخص بہت ترش مزاج ہے۔ اس کی آنکھیں تیز اور چھوٹی ہیں۔ ناک بہت اونچی اور گال پھولے ہوئے ہیں)

روفیو:- (سیڑھی سے) خاموش (قہقہے اور سرگوشیاں یک لخت بند ہوجاتی ہیں) سیزر آرہا ہے۔

تھیوڈوٹس:- (ہوش وحواس بجا رکھتے ہوئے) بادشاہ رومی حاکم کو آنے کی اجازت دیتا ہے۔

سیزر، سادہ لباس میں دالان سے نکلتا ہے اسکے ساتھ اس کا برطانوی معتمد بری ٹینس بھی ہے، جس کی عمر تقریباً چالیس برس کی ہے۔ اس کا قد اونچا۔ مزاج سنجیدہ اور سر کسی قدر گنجا ہے۔ مونچھیں بڑی بھوری اور نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہیں۔ وہ نیلے لباس میں باقاعدگی سے ملبوس ہے۔ اس کی کمر کی پیٹی میں کاغذ، دوات، اور ایک قلم بھی موجود ہے۔ اسکا چہرہ جولیس سیزر کے بامروت چہرہ سے بالکل متضاد ہے وہ اپ موجودہ منظر کو، جو اس کے لئے بالکل نیا ہے ایک بچے کی طرح مستفسرانہ ادا سے دیکھ رہا ہے اور پھر بادشاہ کے تخت کی طرف پلٹتا ہے بری ٹینس اور روفیو، سیڑھی کے قریب دوسری جانب کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سیزر:- (پوتھینس اور ٹالمی کی طرف دیکھکر) بادشاہ کون ہے؟ لڑکا یا وہ آدمی؟

پوتھینس:- میں اپنے جہان پناہ شاہ ٹالمی کا سرپرست پوتھینس ہوں۔

سیزر:- (ٹالمی کے شانوں کو تھپتھپاتے ہوئے) تم بادشاہ ہو! اوہ تمھاری عمر کے لئے یہ خدمت کس قدر لغو ہے (پوتھینس سے) تمھارا ملازم پوتھینس! (وہ بے پروائی سے پلٹتا ہے اور بیچ میں آہستہ آہستہ آتا ہے اور دونوں طرف کے درباریوں کو دیکھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اچیلس کے پاس پہنچ جاتا ہے) اور یہ شخص؟

تھیوڈوٹس:- اچیلس! شاہی افواج کا سپہ سالار۔

سیزر:- (اچیلس سے دوستانہ طور پر) ایک سردار ہو نہ! میں بھی ایک سردار ہوں۔ لیکن میں نے بہت دیر میں یہ زندگی اختیار کی، بہت ضعیفی میں۔ تم کو تندرستی اور صدہا فتحمندیاں نصیب ہوں اچیلس!

اچیلس:- جیسی دیوتاؤں کی مرضی ہو سیزر۔

سیزر:- (تھیوڈوٹس سے) اور جناب آپ؟

تھیوڈوٹس:- تھیوڈوٹس! بادشاہ کا اتالیق۔

سیزر:- تم آدمیوں کو بادشاہ بننا سکھاتے ہو۔ تھیوڈوٹس! یہ تم میں کمال ہے (جب وہ تھیوڈوٹس کی طرف سے پلٹ کر پھر پوتھینس کی طرف جاتا ہے تو دیوار پر دیوتاؤں کی تصویریں دیکھتے ہوئے) اور یہ مقام؟

پوتھینس:- بادشاہ کے خزانچیوں کا کونسل ہال سیزر!

سیزر:- ہاں مجھے خوب یاد آیا۔ مجھے کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔

پوتھینس :۔ بادشاہ کا خزانہ خالی ہے سیزر!
سیزر :۔ ہاں میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ صرف ایک ہی کرسی ہے۔
روفیو :۔ (کسی قدر غصہ سے چلاکر) جاؤ تم میں سے کوئی جاکر سیزر کے لئے ایک اور کرسی لائے۔
طالمی :۔ (شرمندہ ہوکر اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے) سیزر۔
سیزر :۔ (نرمی سے) نہیں نہیں میرے لڑکے یہ تمھارا شاہانہ تخت ہے۔ تم بیٹھ جاؤ۔

(وہ طالمی کو پھر بٹھادیتا ہے اس اثناء میں روفیو اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے اُسے قریب کے ایک گوشے میں دیوتار اکا مجسمہ نظر آتا ہے۔ جس کی شکل ایک بیٹھے ہوئے آدمی کی مانند ہے۔ اور سرباز کی طرح اُس کے سامنے ایک پیتل کی تپائی رکھی ہے جس پر عود و عنبر سلگ رہا ہے۔ روفیو' اپنی آزادانہ فطرت کے مطابق' دیگر غیر ملکی رسوم وعقائد کی پروانہ کرتے ہوئے تیزی سے تپائی اُٹھالیتا ہے عود و عنبر پھینک دیتا ہے اس کی راکھ پھونک دیتا ہے اور بیچ ہال میں سیزر کے پیچھے رکھدیتا ہے)

روفیو۔ سیزر! اس پر بیٹھ جاؤ۔ (سارے دربار میں ایک بے چینی کی لہر دوڑجاتی ہے اور اس مذہبی بے ادبی پر سرگوشیاں ہونے لگتی ہیں)
سیزر :۔ (بیٹھتے ہوئے) پوتھینس اب ہم کو اصل معاملہ پر غور کرنا چاہئے۔ مجھے روپے کی شدید ضرورت ہے
بری ٹینس ۔ (تمہید کو نظرانداز کرتے ہوئے) میرے آقا اب یہ فرمائیں گے کہ مصر کے ذمہ روم کا بہت بڑا قرض باقی ہے' جو بادشاہ کے مرحوم والد کی ضمانت پر دیا گیا تھا اور اب یہ سیزر کا فرض ہے کہ اپنے ملک کے لئے فوراً اس کی واپسی کا مطالبہ کرے۔
سیزر۔ اوہ۔ میں بھول گیا۔ میں نے یہاں اپنے ہمراہیوں کو نہیں بتایا کہ یہ کون ہیں؟ یہ بری ٹینس ہے میرا معتمد۔ یہ مغربی جزیرہ کا ایک باشندہ ہے (بری ٹینس تعظیماً سر جھکاتا ہے) یہ رومی روفیو ہے اور جنگ میں ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ (روفیو سر ہلاتا ہے) پوتھینس مجھے ایک ہزار چھ سو ٹیلنٹ[1] سکہ کی ضرورت ہے۔

(درباری خوف زدہ ہوجاتے ہیں اور تھیوڈوٹس اور پوتھینس اتنی بڑی رقم کے تقاضے پر ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں)

پوتھینس ۔ (تعجب سے) چالیس لاکھ سسٹرس[2] ناممکن! بادشاہ کے خزانے میں اتنی دولت نہیں ہے۔
سیزر ۔ (ہمت افزائی کرتے ہوئے) صرف سولہ سو ٹیلنٹ' اسے سسٹرس میں کیوں شمار کرتے ہو؟ ایک سسٹرس تو صرف ایک روٹی کی قیمت کے برابر ہے
پوتھینس ۔ اور ایک ٹیلنٹ' ایک گھوڑ دوڑ کے گھوڑے کی قیمت کے مترادف ہے۔ میں کہتا ہوں یہ ناممکن ہے ہمنے یہاں لڑائی کے موقع پر اچھی طرح چھان بین کرلی ہے کیونکہ بادشاہ کی بہن کلیوپیٹرا' زبردستی تخت کی دعویدار بن بیٹھی ہے اور بادشاہ کو اپنی رعایا سے

---

[1] قدیم مصری اشرفی۔
[2] قدیم مصری نقرئی سکہ

[redacted]

نگان وصول نہیں ہوا۔

سیزر - ہاں وہ وصول کر لیا گیا ہے ——— میرے سردار تمام صبح وصول کرتے رہے ہیں۔

(درباریوں میں اضطراب کے ساتھ سرگوشیاں ہونے لگتی ہیں۔ اور کبھی کبھی قہقہے بھی بلند ہوتے ہیں)

روفیو - (سختی سے) تمھیں دینا چاہئے' پوتھینس بیکار باتیں کیوں کرتے ہو؟ تم بہت سستے چھوٹے جا رہے ہو۔

پوتھینس - (ترش روئی سے) یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا کا فاتح سیزر' ہمارے ملک کے محاصل وصول کرنے میں اپنا وقت ضائع کرے - ؟

سیزر - میرے دوست - دنیا کے فاتح کے لئے یہی سب سے زیادہ اہم شے ہے۔

پوتھینس - تو پھر خبردار ہو جاؤ اے سیزر آج مندروں کی دولت اور خزانہ کی متاع ٹکسال بھیجی جائیگی' تاکہ پگھلا کر ہمارا زرِ بہائی ادا کرنے کے کام آسکے دیوتا ہمیں دیواروں کے پیچھے بیٹھا ہوا اور لکڑی کے پیالوں میں شراب پیتا ہوا دیکھیں گے اور ان کا غصہ تم پر نازل ہوگا '

سیزر ہم کو مذہبی بے ادبی اور اس کی تحقیر کرنے پر مجبور مت کرو

سیزر - مت ڈرو پوتھینس دنیا اچھی طرح جانتی ہے کہ چوبی پیالوں میں شراب بہت زیادہ لطیف اور لذیذ ہو جاتی ہے میں تمھاری اس دریادلی کے معاوضہ میں اس تخت کے جھگڑے کا تمھارے حق میں فیصلہ کر دونگا۔ اگر تم پسند کرو۔ کہو تمھارا کیا منشا رہے؟

پوتھینس - اگر میں انکار کروں تو کیا تم اس سے باز آجاؤگے؟

روفیو - نہیں۔

سیزر - تم کہتے ہو کہ یہ معاملہ ایک سال سے چل رہا ہے - پوتھینس کیا میں اس کے متعلق صرف دس منٹ غور کر سکتا ہوں؟

پوتھینس - بیشک' آپ اپنی مرضی کے مطابق کرنے کے مجاز ہیں۔

سیزر - خوب لیکن سب سے پہلے کلیوپیٹرا کو بلاؤ۔

تھیوڈوٹس - وہ اسکندریہ میں نہیں ہے وہ سیریا بھاگ گئی۔

سیزر - مجھے یقین نہیں آتا - (روفیو سے) طوطا تیتا کو بلاؤ۔

روفیو - (پکار کر) او تیتا طوطا - (فتاتا ——— داخل ہوتی ہے اور سیڑھیوں کے سرے پر کھڑی ہو جاتی ہے)

فتاتا - ملکہ کی خاص انا فتاتا کا نام کون لے رہا ہے۔

سیزر - کوئی شخص نہیں لے سکتا۔ طوطا - صرف تم ہی لے سکتی ہو۔ تمھاری ملکہ کہاں ہے؟

(کلیوپٹرا' جو فتاتا کے پیچھے چھپی کھڑی ہے مسکرا کر جھانکتی ہے۔ سیزر کھڑا ہو جاتا ہے)

سیزر - کیا ملکہ صرف ایک لمحہ کے لئے ہم کو شرف دیدار بخشیں گی؟

کلیوپیٹرا - (فتاتا کو ایک طرف ہٹا کر خود سامنے آجاتی ہے) کیا مجھے ایک ملکہ کی طرح آنا چاہئے؟

سیزر - ہاں۔

(کلیوپیٹرا فوراً تخت شاہی کے قریب آجاتی ہے ٹالمی کو گھسیٹ کر تخت سے اتار دیتی ہے اور خود

(بیٹھ جاتی ہے۔ فاتا دور سے سیڑھیوں پر بیٹھکر اس منظر کو غائر نگاہوں سے دیکھتی ہے۔)

ٹالمی۔ (آنسو بہاتے ہوئے) سیزر! دیکھو یہ ہمیشہ اسطرح مجھ سے سلوک کرتی ہے۔ جب میں بادشاہ ہوں تو پھر اسکو مجھ سے تخت چھین لینے کا کیا حق حاصل ہے؟

کلیوپیٹرا۔ (قہر آلود نگاہوں سے) تو بادشاہ نہیں ہو سکتا اے رونے والے بچے۔ رومی تجھے نگل لیں گے۔

سیزر۔ (ٹالمی کی دردناک حالت سے متاثر ہوکر) ادھر آ میرے لڑکے، میرے پاس کھڑا ہو۔

(ٹالمی سیزر کے پاس جاتا ہے جو تپائی پر بیٹھکر ہمت افزائی کے طور پر ٹالمی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے کلیوپٹرا حاسدانہ نگاہوں سے گھورنے لگتی ہے)

کلیوپیٹرا۔ (تمتماتے ہوئے رخساروں سے) لے اپنا تخت لے مجھے نہ چاہیئے۔ (وہ تخت سے اتر کر ٹالمی کے پاس آتی ہے۔ جو پیچھے ہٹ جاتا ہے) جا۔ جلدی جا اور اپنے تخت پر بیٹھ

سیزر۔ جاؤ ٹالمی! جب تم کو کوئی تخت دیا جائے تو فوراً قبول کر لیا کرو۔

روفیو۔ مجھے اُمید ہے کہ جب ہم روم واپس جائیں گے تو تم اپنی رائے کے مطابق عمل کرنے کی سعی کرو گے سیزر!

(ٹالمی آہستہ آہستہ اپنے تخت پر واپس جاتا ہے۔ اور کلیوپیٹرا سیزر کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

سیزر۔ پوتھینس ——

کلیوپیٹرا۔ (دخل دیتے ہوئے) کیا تم مجھ سے گفتگو نہ کرو گے؟

سیزر۔ خاموش رہو۔ اگر تم نے میری اجازت بغیر منھ کھولا تو نگل لی جاؤ گی۔

کلیوپیٹرا۔ میں اس سے نہیں ڈرتی۔ ایک ملکہ کو بزدل نہ ہونا چاہیئے میرے شوہر کو، تمھارا جی چاہے تو کھا جاؤ، وہ ڈرتا ہے۔

سیزر۔ (گھور کر) تمھارا شوہر۔ تمھارا شوہر! کیا معنی اس کے؟

کلیوپیٹرا۔ (ٹالمی کی طرف اشارہ کرتے ہوے) وہ چھوٹی سی چیز ——

(دونوں رومی اور برطانی ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگتے ہیں)

تھیوڈوٹس۔ سیزر، تم یہاں ایک اجنبی ہو اور ہمارے قوانین سے بالکل نا آشنا۔ مصر کے شاہی خاندان کے لوگ غیر سے شادی نہیں کر سکتے۔ ٹالمی اور کلیوپیٹرا بھائی بہن پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس لئے میاں بیوی بھی ہیں"

بری ٹینس۔ (خوف زدہ ہوکر) سیزر یہ تو نہایت نامناسب بات ہے۔

تھیوڈوٹس۔ (غضبناک ہوکر) کس طرح؟

سیزر۔ (خودداری کا احساس کرتے ہوے) اُسے معاف کرو۔ تھیوڈوٹس! وہ ایک وحشی ہے اور اپنے جزیرہ کے رسوم و اطوار کو قانون قدرت سمجھتا ہے۔

بری ٹینس۔ یہ بات نہیں، سیزر۔ یہ مصری وحشی ہیں اور تم ان کی ہمت افزائی کرنے میں غلطی پر ہو۔ میں کہتا ہوں یہ انتہائی شرارت و بدتہذیبی ہے۔

سیزر۔ شرارت ہو یا نہ ہو، مگر میرے دوست یہ امن و سکون کا دروازہ کھول دیتی ہے (وہ پوتھینس کو

سنجیدگی سے مخاطب کرتا ہے) سنو! میں اپنی رائے تم سے کہتا ہوں

روفیو۔ ادھر سنو! سیزر!

سیزر۔ ٹالمی اور کلیوپیٹرا، دونوں ملکر مصر پر حکومت کریں گے۔

اچیلس۔ اور بادشاہ کے چھوٹے بھائی، اور کلیوپیٹرا کی چھوٹی بہن کے متعلق؟

روفیو۔ (تشریح کرتے ہوئے) لوگ کہتے ہیں سیزر، ایک اور چھوٹا ٹالمی موجود ہے۔

سیزر۔ تو خیر چھوٹا ٹالمی دوسری بہن سے شادی کر سکتا ہے۔ اور ہم ان دونوں کو جزیرہ سائپرس بطور تحفہ پیش کریں گے۔

پوتھینس۔ (بے چینی سے) سائپرس کسی کے لئے کسی کام کا بھی نہیں ہے۔

سیزر۔ کوئی حرج نہیں۔ یہ صرف تم کو صلح کے معاوضہ میں دیدیا جائیگا۔

بری ٹینس۔ (خود فراموشی کے عالم میں ——— کچھ سوچتے ہوئے) عزت کے ساتھ صلح کرلو۔ پوتھینس!

پوتھینس:۔ (سرکشی سے) سیزر! ایماندار بنو! جس رقم کا تم مطالبہ کر رہے ہو وہ ہماری آزادی کی قیمت ہو تم یہ رقم لے لو۔ اور ہم کو ہمارے جھگڑے خود طے کر لینے کے لئے چھوڑ دو۔

ایک دلیر درباری۔ (پوتھینس کے لہجہ اور سیزر کی خاموشی سے متاثر ہو کر) ہاں ٹھیک ہے مصر مصریوں کے لئے ہے۔

(اب مجلس میں زیادہ گرمی پیدا ہو جاتی ہے مصری کو غصہ آنے لگتا ہے۔ سیزر خاموش بیٹھا رہتا ہے لیکن روفیو بہت غضبناک اور خوفناک شکل اختیار کرتا جاتا ہے اور بری ٹینس کے چہرہ پر بھی غصہ کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں)

روفیو۔ (حقارت سے) مصر مصریوں کے لئے! کیا تم بھول گئے کہ یہاں ایک رومی لشکر موجود ہے جسے آلیکس گینی نس نے، جب تمھارے بادشاہ کو تخت پر بٹھایا تو یہیں چھوڑ دیا تھا۔

اچیلس۔ (تہورانہ انداز سے) ہاں اور اب اس فوج کا سپہ سالار میں ہوں۔ سیزر! میں ہی یہاں وہ رومی سردار ہوں۔

سیزر۔ (ہنسکر) اور اب مصری فوج کا بھی سردار ہو؟

پوتھینس۔ (فتحمندانہ) ہاں ایسا ہی ہے سیزر۔

سیزر۔ (اچیلس سے) تو تم روم کی خاطر مصر میں جنگ کر سکتے ہو۔ اور رومیوں سے اگر ضرورت سمجھو تو مصر کی خاطر؟

اچیلس۔ ہاں ایسا ہی ہے سیزر۔!

سیزر۔ تو اے سردار میں تم سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت تم کس طرف ہو؟

اچیلس۔ دیوتاؤں اور صحیح جماعت کی طرف

سیزر۔ ہوں! تو اچھا تو تمھارے پاس کتنی فوج ہے؟

اچیلس یہ اس وقت معلوم ہوگا جب میں میدان جنگ میں آؤنگا۔

روفیو۔ (تندخوئی سے) کیا تمھارے سپاہی رومی نہیں ہیں؟ اگر نہیں تو پھر اس کی پرواہ نہیں کہ کتنے ہیں؟ ہمارے دس تمھارے پانچ سو پر بھاری ہیں۔

پوتھینس۔ ہم کو شرمندہ کرنا فضول ہے روفیو سیزر

پہلے بھی شکست کھا چکا ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ بھی پس پا ہو - کچھ زمانہ گذرا کہ سیزر جان بچانے کے لئے پمپئی کے پاس بھاگا بھاگا پھرتا رہا - اور ممکن ہے چند مہینوں کے بعد وہ اپنی جان بچانے کے لئے افریقہ کے بادشاہ، کیٹو اور جوبا کے پاس پناہ ڈھونڈنے جائے -

اچیلس - (پوتھینس کی تقریر کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے) تم چار ہزار سپاہیوں سے کیا کر سکتے ہو؟

تھیوڈوٹس - (اچیلس کے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتی ہوئی) اور بالکل مفلس ؟

سب درباری - (غل مچا کر سیزر کے پاس جمع ہوتے ہوئے) تم چلے جاؤ - مصر مصریوں کے لئے ہے تم چلے جاؤ یہاں سے !

(روفیو غصہ سے داڑھی چبانے لگتا ہے اور اسکی زبان سے بات نہیں نکلتی - سیزر اس قدر مطمئن انداز سے بیٹھا رہتا ہے جیسے کوئی تماشہ دیکھ رہا ہو اور کوئی بلی اس کے پاؤں کے پاس کھیل رہی ہو)

کلیوپیٹرا - تم ان کو ایسی باتیں کیوں کرنے دیتے ہو سیزر؟ کیا تم ان سے خوفزدہ ہو؟

سیزر - کیوں میری پیاری، جو کچھ وہ کہتے ہیں بالکل سچ ہے -

کلیوپیٹرا - مگر تمہارے چلے جانے کے بعد میں ملکہ نہ بن سکوں گی -

سیزر - مگر جب تک تم ملکہ نہ بنجاؤ گی میں یہاں سے جاؤں گا نہیں -

پوتھینس - اچیلس، اگر تم بیوقوف نہیں ہو تو اس لڑکی کو جبکہ وہ تمہارے قابو میں ہے قید کر لو -

روفیو - (طعن سے) ضرور، اور سیزر کو بھی اچیلس

پوتھینس - روفیو تم نے ٹھیک کہا -

روفیو - کوشش کرو، اچیلس (پکار کر) اس طرف حفاظت کرو -

(دالان میں سیزر کی فوج یکایک آکر جمع ہو جاتی ہے اور تلوار سونت کر سیڑھی کی چوٹی پر کھڑی ہو جاتی ہے اور حملہ کی منتظر رہتی ہے ایک لمحہ تک مصری نخوت و تمکنت کے انداز سے ان کا سامنا کرتے ہیں اور پھر اپنی اپنی جگہ واپس چلے جاتے ہیں)

بری ٹینس - تم سیزر کے قیدی ہو — تم سب

سیزر - (دریا دلی سے) اوہ - نہیں نہیں کسی طرح نہیں - بلکہ سیزر کے مہمان،

کلیوپیٹرا - کیا تم ان کے سر قلم نہ کرو گے؟

سیزر - کیا تمہارے بھائی کا سر کاٹ ڈالوں؟

کلیوپیٹرا - ہاں ضرور! اگر اسے موقع ملا تو وہ میرا قلم کر دیگا — کیا تم ایسا نہ کرو گے ٹالمی؟

ٹالمی - (غمگین مگر مستقل مزاجی سے) ضرور - میں جو ہو کر ضرور اس کا سر اڑا دونگا -

(کلیوپیٹرا اپنی نئی حاصل شدہ حاکمانہ عظمت کے خیال میں محو ہو جاتی ہے اور ایک طفلانہ اضطراب کے ساتھ ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے اور جب سیزر اپنی نشست سے اٹھتا ہے تو اس پر بیٹھ جاتی ہے)

پوتھینس - سیزر اگر تم ہم کو یہیں ٹھہرنے پر مجبور کرو

روفیو - ہاں ہاں اے مصریو، اس امر پر تیار ہوجاؤ - ہمارے قبضہ میں محل، سمندر کا ساحل اور مشرقی بندرگاہ ہے - روم کا راستہ کھلا ہوا ہے اور اگر سیزر نے پسند کیا تو تمھیں اسی راستہ پر سفر کرنا پڑے گا -

سیزر - (نہایت خوش خلقی کے ساتھ) میں اپنے سپاہیوں کی حفاظت کے لئے پوتھینس، اس سے کم اور کچھ نہ کرسکتا تھا - میں ان میں سے ہر ایک کی جان کا جواب دہ ہوں لیکن تم بالکل آزاد ہو - اور اسی طرح یہاں محل کے اور سب آزاد ہیں -

روفیو - (اس برتاؤ سے متعجب ہوکر) کیا یہ بیدین اور سب؟

سیزر - (اس جملہ کو لطیف بناتے ہوئے) رومی فوج اور سب لے روفیو -

پوتھینس - (سختی سے) تو میں سیزر کے انصاف سے آخری درخواست کرتا ہوں - کہ وہ ہمارے لئے اس کا ثبوت پیش کرے - رومی مقامی فوج، دنیا کے سب سے بڑے سپاہی کی نگرانی میں، سیزر کو اپنے رحم و کرم پر سر تسلیم خم کرتے پائے گی (دالان میں پکار کر) او لوسیس سیپٹیمیس (سیزر بے حد متاثر ہوکر متحیر ہوتا ہے) اگر میری آواز تم تک پہنچ سکتی ہے - تو باہر نکل آؤ اور سیزر کے سامنے آکر امتحان کرو -

سیزر - (گھبرا کر) نہیں - نہیں -

تھیوڈوٹس - ہاں میں کہتا ہوں کہ حاکم فوج کو شہادت پیش کرنے دو -

(لوسیس سیپٹیمیس، ایک بے ریش و پروت نہایت متناسب الاعضاء چالیس سالہ خوبصورت نوجوان ——— ایک رومی سردار کے لباس میں، دالان سے نکلکر باہر آتا ہے وہ اپنا چہرہ پہلے اپنے دامن میں چھپا لیتا ہے پھر ——— دامن ہٹا دیتا ہے - اور تمکنت سے فوجی حاکم کو دیکھتا ہے)

پوتھینس - لوسیس سیپٹیمیس شہادت پیش کرو - سیزر یہاں اپنے دشمن کے تعاقب میں آیا ہے کیا ہم نے اسکے دشمن کو پناہ دی؟

لوسیس - جیسے ہی پمپیئی کے پاؤں مصری ساحل پر پڑے، میں نے ایک وار میں اس کا سر جدا کر دیا -

تھیوڈوٹس - اور اس کی بیوی اور بچوں کے سامنے سیزر، ذرا سوچو تو - انھوں نے اس کو قتل ہوتے دیکھا اور اسی جہاز میں سے، جس کو اس نے اسی وقت خیرباد کہا تھا ہم نے تمھیں انتقام کا اطمینان بخش ثبوت دیا ہے -

سیزر - (خوفزدہ ہوکر) - انتقام!

پوتھینس - جب دنیا کی شہنشاہی کا اعلان کرنے کو تمھارا جہاز ہمارے بندر میں داخل ہوا تو ہمارا سب سے پہلا نذرانہ تمھارے حریف کا سر تھا - لوسیس گواہی دو، کیا یہ سب سچ نہیں ہے؟

لوسیس - ہاں بالکل درست ہے! اس ہاتھ سے جس نے پمپیئی کو قتل کیا، میں نے مقتول کا سر سیزر کے قدموں پر ڈال دیا -

سیزر - قاتل! اگر پمپیئی فارسیلیا میں فتحمند ہوتا تو تم اسی طرح سیزر کو بھی قتل کر دیتے -

لوسیس - مفتوح پر لعنت، سیزر! جب میں

پمپیؔ کا اطاعت گذار تھا۔ تو میں نے ایسے آدمیوں کو بھی قتل کیا، جیسا وہ خود تھا۔ اور آخرکار اُس کی بھی باری آئی ۔۔۔

تھیوڈوٹس ۔ (خوشامدانہ) یہ کام تمھارا نہیں تھا سیزرؔ بلکہ ہمارا تھا ۔۔۔۔ نہیں صرف میرا ۔ کیونکہ یہ سب کچھ میری تدبیر سے ہوا ۔ ہماری بدولت تمھاری شہرت بھی باقی رہی اور انتقام بھی پورا ہوا ۔

سیزر ۔ انتقام، انتقام، اوہ، اگر میں انتقام لینے پر آمادہ ہوتا تو تم سے اس مقتول کے خون کے عوض کیا کچھ نہ لیتا ۔ (وہ سب خوفزدہ اور نا اُمید ہو جاتے ہیں) کیا وہ میرا داماد نہ تھا؟ کیا وہ بیس برس تک روم کا حکمراں اور تیس سال تک نصرت و فتحمندی کا علمبردار نہ رہا تھا؟ کیا ایک رومی ہونے کی حیثیت سے اس کے ساتھ میری بھی شہرت نہیں ہوئی؟ کیا قسمت جس نے ہمیں دنیا کو فتح کرنے پر مجبور کیا، ہماری بنائی ہوئی تھی؟ میں جولیس سیزر ہوں یا کوئی اور جو تم ایک بڈھے سپاہی کا سر میری طرف پھینک رہے ہو ۔ مشہور فاتح، جوانمرد اور دلیر رومی دھوکہ اور مکاری سے، اس بدمعاش کے ہاتھوں قتل ہوا اور پھر تم اس کو میرے شکریہ کا مستحق بھی ٹھہراتے ہو (لوسیس سے) دور ہو میری نظروں سے، تو مجھے خوف و دہشت سے سراسیمہ کر رہا ہے ۔

لوسیس ۔ (سردمہری اور دلیری سے) ہوں، تم نے بہت سے سر پہلے بھی تن سے جدا دیکھے ہیں سیزر، اور میرا خیال ہے بہت سے کٹے ہوئے ہاتھ ۔ مگر جب تم نے ورسنگی ٹورکس پر فتح پائی تو کیا اُسے یونہی چھوڑ دیا؟ ۔۔۔ کیا یہ انتقام نہ تھا؟

سیزر ۔ نہیں دیوتاؤں کی قسم، میں چاہتا ہوں کاش ایسا ہی ہوتا ۔ انتقام آخرکار ایک انسانی فطرت کا خاصہ ہے ۔ نہیں! میں کہتا ہوں کہ وہ تمام کٹے ہوئے ہاتھ اور ورسنگی ٹورکس کی موت جو دارالخلافہ میں گردن دبا کر مارا گیا، دونوں دانائی کے ماتحت تھے ۔ جہالت اور چھوٹی باتیں ایک سچے انتقام سے دس گنا زیادہ خونی اور خوفناک ہوتی ہیں ۔ میں اس وقت یقیناً بیوقوف بن گیا تھا ۔ جب میں نے سوچا کہ انسانوں کی جا[ن] ایسے بیوقوفوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دی جائے (انکسا[ر] سے) لوسیس مجھے معاف کرو ۔ ورسنگی ٹورکس کا قاتل پمپیؔ کے قاتل کو کیوں بُرا کہے ۔ ؟ تم بھی سب کے سا[تھ] آزاد ہو تمھارا دل چاہے تو ٹھہرو ۔ میں تم کو اپنے پاس کوئی خدمت دے سکونگا ۔

لوسیس ۔ دیوتا تمھارے خلاف ہیں، سیزر ۔ میں جاتا ہوں ۔

(وہ دالان کی طرف جانے کو پلٹتا ہے)

روفیو ۔ (اپنے شکار کو بچکر جاتے ہوئے دیکھکر غصہ سے) اس [کے] یہ معنی ہیں کہ یہ جمہوریت پسند ہے ۔

لوسیس ۔ (دالان کی سیڑھیوں پر پلٹ کر) اور تم کیا ہو

روفیو ۔ سیزر کے دوسرے سپاہیوں کی طرح ایک خیر خواہ ۔

سیزر ۔ (اخلاقاً) لوسیس، یقین کرو کہ سیزر سیزر ہی نہیں ہے ۔ اگر روم میں حقیقی جمہوریت ہو[تی] تو سیزر سب سے پہلا جمہوریت پسند ہوتا لیکن اب[تک]

اپنی رائے قائم کر لی ہے اس لئے خدا حافظ۔

لوسیس۔ آؤ اچیلس! تاہم ابھی کچھ وقت باقی ہے

(سیزر یہ دیکھ کر کہ روفیو اپنے غصہ سے بہت بے حال ہو رہا ہے، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور اسے خطرے سے باہر نکال لاتا ہے برٹینس سیزر کی دائیں جانب ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ یہ تینوں اچیلس کے گروہ کے پاس پہنچتے ہیں جو وہاں سے اُٹھکر دوسری طرف تھیوڈوٹس سے ملجاتا ہے۔ لوسیس سٹیمپس دالان کے سپاہیوں کے بیچ میں سے ہوکر باہر چلے جاتے ہیں۔ پوتھینس تھیوڈوٹس اور اچیلس مع تمام درباریوں کے اس کے پیچھے جاتے ہیں۔ اور فوجوں میں جو اپنے آپ کو پہلی صف میں ترتیب دے لیتی ہیں بالکل بے اعتمادی کا احساس کرتے ہوئے ان کے پیچھے بلا کسی خاص احترام کے باہر جاتے ہیں بادشاہ، قابل رحم حالت میں، بے حد رنجیدہ اور تنہا رہ جاتا ہے۔ اس اثنا میں روفیو برہم لہجہ میں کہتا ہے)

روفیو۔ (لوسیس کے جانے کے بعد) کیا تمھارا خیال ہے کہ اگر وہ ہمارے سروں کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو تمکو جلا جانے دیا جائیگا۔

سیزر۔ مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں اس کی تدبیروں کو اپنے ارادوں سے زیادہ ذلیل خیال کروں۔

روفیو۔ ہوں۔

سیزر۔ روفیو۔ اگر میں لوسیس کو اپنے لئے ایک قابل تقلید نمونہ قرار دوں تو کیا اس وقت بھی تم میری اطاعت کروگے؟

برٹینس۔ سیزر، یہ کوئی دانائی کی بات نہیں ہے تمھارے رومی فرائض تم سے اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس کے دشمن ملک کو آئندہ کوئی ضرر نہ پہنچانے پائیں۔

(سیزر ایک استغنا کے ساتھ مسکراتا ہے)

روفیو۔ اس سے گفتگو کرنا بے سود ہے

برٹینس۔ غور سے سنو سیزر، مانا کہ بردباری تمھارے لئے بہت مفید ہے لیکن وہ تمھارے سپاہیوں کے لئے کس کام کی ہے؟ جنھیں کل انھیں آدمیوں سے لڑنا پڑے گا جن کو تم نے کل رہا کر دیا ہے۔ تمھارا جو دل چاہے حکم دو لیکن میں تو یہ عرض کرونگا کہ تمھاری دوسری فتح کے معنی قتل عام کے ہیں۔ میں کسی شخص کو گرفتار نہ کرونگا۔ بلکہ تمام دشمنوں کو میدان ہی میں قتل کر ڈالونگا۔ اور مجھے ان سے دوبارہ لڑنا نہ پڑے گا۔

(وہ جانے کا قصد کرتا ہے)

سیزر۔ (پلٹ کر طالمی کو دیکھتے ہوئے) کیا ---؟ وہ سب لڑکے کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے شرم شرم!

روفیو۔ (طالمی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے) آئیے بادشاہ سلامت

طالمی۔ (روفیو سے ہاتھ چھڑا کر سیزر سے) کیا یہ مجھے اپنے محل سے باہر نکال رہا ہے۔

روفیو۔ (دانت پیسکر) اگر آپ چاہیں تو یہاں ٹھہر سکتے ہیں

محشر عابدی

(باقی آئندہ)

عزیز لکھنوی کی شاعری

مولانا نیاز اڈیٹر نگار نے عزیز صاحب کی شاعری کے متعلق میرا مضمون مئی کے پرچہ میں درج کرکے مجھکو مزید تنقید و تبصرہ کی دعوت دی ہے میں موصوف کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور جناب عزیز کا جستہ جستہ کلام دیکھنے کے بعد اپنے مضمون کی پہلی قسط پیش کرتا ہوں -

دنیائے ادب میں جناب عزیز کی شخصیت محتاج تعارف نہیں لیکن ادبی دنیا کا اکثر حصہ اُن کے کلام کا نظر عمیق سے مطالعہ کئے بغیر محض تقلیداً ان کو آٹھویں دور کے ممتاز شعراء میں تصور کئے ہوئے . . . ہے - میں خود بھی اسی غلط خیالی کا شکار ہو رہا تھا - لیکن گلکدۂ عزیز کے مطالعہ نے مجھپر یہ ظاہر کر دیا کہ عزیز صاحب کو ممتاز شعراء کی صف میں جگہ دینا غلطی ہے - ان کو شعر و سخن کے فن سے کوئی خاص نسبت نہیں - بعض اشعار تو ایسے ہیں جنکے ایک مصرع کا دوسرے مصرع سے کوئی تعلق نہیں - اور بعض متروکات حاضرہ سے بے نیازی اور زبان و محاورہ کی کم علمی ظاہر کر رہے ہیں - البتہ بجلیوں کی رو، ذرہ ہائے دل - عالم نزع وغیرہ چند مرکبات ایسے ہیں جو جا و بیجا استعمال کئے جاتے ہیں - چند اشعار ملاحظہ ہوں -

حسن ہی کیا تہ و بالا جو نہ عالم کر دے　　　دل ہی کیا جس میں کوئی جذبۂ فطری نہوا

کیا پابندیٔ ردیف سے مجبور ہو کر "نہوا" بمعنی "نہیں" استعمال کرنا کسی قادر الکلام شاعر کے لئے مناسب ہے؟ [۱]

عزیز اب سخت مشکل ہے بہلنا دل سے وحشی کا　　　وہ ہو شہروں کی آبادی کہ سناٹا بیاباں کا

معلوم نہیں یہ مطلع ہے یا شعر، اگر مطلع کہا جائے تو "بیاباں" کا قافیہ موجود نہیں اور اگر شعر ہے تو مصرع اولیٰ میں "کا" کا استعمال کیسا؟ اگر یہ مصرع اس طرح کہا جاتا تو یہ عیب دور ہو سکتا تھا [۲] -

عزیز اب دل سے وحشی کا سنبھلنا سخت مشکل ہے

کچھ نہ پوچھو شب وعدہ مری گھر کی رونق　　　اللہ اللہ وہ سامان سے ساماں ہونا

"سامان سے ساماں" غلط محاورہ ہے؟ لفظ "سامان" میں نون کا اعلان اور دوسرے میں نون غنہ درست نہیں [۳]

---

[۱] یقیناً نہوا یہاں نہ ہوا یا نہیں کی جگہ استعمال ہوا ہے جو نہ ہوتا تو اچھا تھا - (اڈیٹر) [۲] یقیناً یہ مصرع بہتر ہے - (اڈیٹر) [۳] علاوہ اعلان نون و نون غنہ کے ایک نقص یہ بھی ہے - سامان سے ساماں میں بجائے سے کے سا ہونا چاہیے تھا - (اڈیٹر)

اُن کی اس کوشش بجد کا پتہ دیتا ہے ۔۔۔ چارہ سازوں کا میری لاش پہ گریاں ہونا

جب آپ نے یہ دیکھا کہ مصرع اولی پورا ہوتا نظر نہیں آتا تو مجبوراً " اس " کا اضافہ کرکے ہموزن بنالیا۔ حضرت! اس کو فن شاعری میں " حشو " کہتے ہیں اور حشو بھی قبیح [۵۱]۔

ہم تو دل ہی پر سمجھتے تھے بتوں کا اختیار ۔۔۔ نصب کعبہ میں بھی اَب تک ایک پتھر رہ گیا

مصرع ثانی میں " اَب تک " اور " نصب رہگیا " کو ملا کر دیکھئے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ کیا غلطی ہے۔ " اب تک نصب ہے " کہنا چاہیئے تھا نہ کہ " اب تک نصب رہگیا [۵۲]"۔

جا چکے احباب رو کر اُٹھ چکی ماتم کی صف ۔۔۔ آپ کب آئے کہ جب خالی میرا گھر رہ گیا

اللہ رے بے بسی، ردیف کی پابندی نے اس درجہ مجبور کردیا کہ غلط و صحیح کا امتیاز اُٹھ گیا مصرع اولی کے مفہوم کا خیال کرتے ہوئے یوں کہنا چاہیئے تھا۔

" آپ کب آئے کہ جب خالی مرا گھر ہوگیا [۵۳]"

چارہ سازوں میں بہم مشورہ کیا کیا نہ ہوا ۔۔۔ نہ ہوا آپ کا بیمارِ غم اچھا نہ ہوا

حضرت! مشورہ تو بہم ہی ہوا کرتا ہے پھر " بہم " لکھنے کی کیا ضرورت تھی " مشورہ " کے ساتھ " بہم " غلط اور خلاف محاورہ ہے [۵۴]۔

جا جا کے پلٹ آئے میرے نالۂ دل سب ۔۔۔ جب تنگ بہت گنبدِ دوّار کو دیکھا

" سب " کی زیادتی کی داد دینا محال ہے ایسی مثالوں سے آپ کا دیوان بھرا پڑا ہے [۵۵]

وقت اَب وہ ہے کہ احباب تو احباب ہیں سب ۔۔۔ میری بالیں سے نہیں ہے کوئی بیگانہ جدا

شعر ہذا میں " احباب تو احباب ہیں سب " ایسا پاکیزہ اور پُر معنی جزو ہے جو خود اپنی داد ہے۔ شعر کیا ہے اچھا خاصہ معمہ ہے شعر کو بار بار پڑھیئے اور مطلب سوچیئے۔ انشاء اللہ العزیز ہزار مرتبہ پڑھنے پر بھی مطلب براری نہ ہوگی [۵۶]۔

---

۵۱ بیشک اس کا استعمال یہاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ (اڈیٹر) ۵۲ یقیناً اعتراض درست ہے۔ (اڈیٹر) ۵۳ مصرعہ ثانی میں بجائے ہوگیا کے رہگیا استعمال ہوا ہے۔ علاوہ اس کے " آپ کب آئے کہ جب " بھی کانوں کو بُرا معلوم ہوتا ہے۔ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا " آپ بھی کب آئے، جب خالی مرا گھر ہوگیا "۔ (اڈیٹر) ۵۴ میں اس اعتراض کو درست نہیں سمجھتا۔ مانا کہ مشورہ باہم ہی ہوتا ہے لیکن اس کے اظہار میں کیا حرج ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جب " مشورۂ بہم " کا ذکر اس طرح کیا جائے گا تو اس سے مخالفت کا مفہوم پیدا ہوگا جو یہاں مقصود نہیں۔ (اڈیٹر) ۵۵ یقیناً زائد ہے۔ (اڈیٹر) ۵۶ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اَب وقت ہے کہ احباب تو احباب، میری بالیں سے اب کوئی بیگانہ بھی جدا نہیں " اس لئے پہلے مصرع میں لفظ " سب " بیکار ہے اور دوسرے مصرع میں بیگانہ کے بعد لفظ بھی آنا چاہیئے تھا۔ (اڈیٹر)

ہوئی پیمائش راہِ محبت بعد میرے جب — مسافت ایک منزل کی تھی ہر نقش قدم میرا

"بعد میرے جب" کیا پاکیزہ بندش ہے! دوسرے مصرع کا مفہوم غالباً یہ تھا کہ "میرا ہر نقش قدم ایک منزل کی مسافت پر تھا" لیکن آپ نے ہر نقش کی مسافت ایک منزل ظاہر کرکے مفہوم کو کچھ سے کچھ بنا دیا اب اس کے سوا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ ہر نقش قدم کی مسافت (طوالت و فاصلہ) ایک منزل تھی[۱]

کچھ رنگ عزیز اب نظر آتا ہے مجھے اور — شاید کہ یہ درد آج سے اٹھکر نہ اُٹھے گا

"آج سے اُٹھکر نہ اُٹھے گا" بالکل غلط ہے اور خلاف محاورہ ہے یوں کہنا چاہئے کہ "آج اُٹھکر پھر نہ اُٹھیگا"[۲]

اپنی حد سے سوزِ دل اب بڑھ گیا — آخری درجہ تھا پارہ چڑھ گیا

"اب" اور "تھا" تصریف سے مستغنی ہیں دونوں غلط اور بے محل استعمال ہوئے ہیں یوں کہئے

اپنی حد سے سوز دل جب بڑھ گیا — آخری درجہ پہ پارہ چڑھ گیا[۳]

غیر کو دیکھ کے کرتے وہ نظر کاشش عزیز — رنگ خوردہ ہی کوئی تیر نکالا ہوتا

"غیر کو دیکھکر" آخر کس طرف دیکھتے[۴]!

یہ سعی بیخودی پئے تسکین شوق تھی — واقف ہوں میں کہ آپکا ملنا محال تھا

مصرع ثانی میں "ہوں" سے زمانہ حال ظاہر ہوتا ہے اور مصرع اول ماضی بعید میں، یہ یوں بھی کہا جا سکتا تھا "واقف تھا میں کہ الخ"[۵]

دل نام کوئی چیز کبھی پاس تھی عزیز — یا بھولتے ہو یہ کوئی خواب و خیال تھا

ضمیر غائب "وہ" ہے "یہ" نہیں ہے[۶]۔

امتحانگاہِ محبت میں وہی دل دل ہے — مطمئن وہ جسے میں جسکو پریشاں سمجھا

"وہ جسے میں جس کو" کی ترکیب کتنی دلکش ہے! آپ نے مصرع اولیٰ فعل حال میں، اور مصرع ثانی فعل ماضی میں نظم کرکے اپنی قادر الکلامی و مشاقی کا کتنا انوکھا ثبوت دیا ہے[۷]

آپ دم بھر کو اگر آ کے چلے بھی جاتے — ایک بیمار کو مرنے کا سہارا ہوتا

آپ فرماتے ہیں کہ "اگر آپ دم بھر کو آکر چلے بھی جاتے تو ایک بیمار کے مرنے کا سہارا ہو جاتا" کیا دس بیس بیمار تھے جو "ایک" کی تخصیص کی گئی[۸]؟

جب کوئی ذرہ مرے خاکستر دل کا اڑا — جاتے جاتے انکی محفل تک وہی پروانہ تھا

"اڑا" کے ساتھ "ہوا" استعمال کرنا چاہئے تھا[۹]۔

---

۱ "بعد میرے جب" یقیناً مکروہ ہے لیکن مفہوم کے لحاظ سے کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا (اڈیٹر)، ۲ یقیناً آج کے بعد سے بالکل غلط ہے۔ (اڈیٹر) ۳ اصلاح موزوں ہے۔ (اڈیٹر) ۴ چونکہ شعر سے اصل مفہوم تبادر ہے اس لئے اظہار ضمیر کی ضرورت نہیں۔ (اڈیٹر) ۵ اعتراض چنداں اہم نہیں ہے۔ (اڈیٹر) ۶ اعتراض درست ہے (اڈیٹر) ۷ شعر کا مفہوم کیا ہے۔ (اڈیٹر) ۸ یہاں ایک تنکیری ہے تخصیصی نہیں (اڈیٹر)، ۹ یہ انداز بیان غلط نہیں (اڈیٹر)

[redacted]

دفتر عشق میں دل کو نہ سمجھنا مہمل — لفظ بھی ہوگا یہی اور یہی معنی ہوگا

جب مصرع ثانی میں "لفظ" کے ساتھ "بھی" استعمال کیا گیا تو "معنی" نے کیا قصور کیا تھا! اس کے لئے بھی تو کسی صورت سے "بھی" کا استعمال کیا ہوتا۔[1]

ہوگئی مستوں پہ طاری آج دونی کیفیت — تھیں نشیلی انکھڑیاں ساقی کی ساغر کا جواب

"کیفیت" کی یائے ثانی بالتشدید ہے اس کا صحیح تلفظ بروزن مفعولن ہے نہ کہ فاعلن — رند لکھنوی کہتے ہیں

یہ کیفیت اُسے ملتی ہے جس کے مقدر میں

مے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں[2]

اول تو "انکھڑیاں" قدیم لفظ متروک الاستعمال ہے دوم "انکھڑیاں" جمع اور ساغر واحد، پھر آنکھیں ایک ساغر کا جواب کیسے ہوسکتی ہیں؟[3]

کیا سونپتا ہے خوں بھری تلوار دیکھکر — اے ناشناس اہل وفا میں ترے نثار

سونپنا کانوں اور "خوں بھری" میں نون غنہ کا استعمال قابل غور ہے۔

جا کبھی نجد کی جانب بھی عزیز — روح مجنوں کو ذرا شاد تو کر

"بھی" اور "تو" کے اضافہ سے روح مجنوں شاد ہوگی یا ناشاد؟[4]

چھپے ہو تم تو بھلا پھر کہاں سے آئے بہار — حجاب اُٹھاؤ تو چلنے لگے ہوائے بہار

"ہوائے بہار" تو یقیناً چلنے لگے گی لیکن "بھلا" کا حسن استعمال آپ کی حسن شاعری پر نقاب پوشی ہی کرتا رہیگا۔[5]

پھبکتے آتے ہیں پودے گھٹائیں اُمڈی ہیں — عجب سماں نظر آتا ہے مجھکو ہائے بہار

کیا اہل لکھنؤ کا یہ کوئی مخصوص محاورہ ہے کہ "پودے پھبکتے ہیں" اس جدید محاورہ سے کان آشنا نہیں! جب "عجب" کہدیا تو "ہائے" کی کیا ضرورت رہی۔[6]

گرمیٔ حسن سے کچھ آئی ہے تاثیر بہار — یہ پسینہ ہے کہ ہے روغن تصویر بہار

"روغن تصویر" کی جدید ترکیب نے اس شعر کو اتنا بلند کر دیا کہ بے نیاز معنی ہو کر رہ گیا۔[7]

---

[1] میرے نزدیک ضروری نہیں۔ (اڈیٹر) [2] کیفیت بغیر تشدید یا اردو میں مستعمل ہے۔ لفظ انکھڑیاں ان متروکات میں سے نہیں ہیں جن کا استعمال کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ رہا انکھڑیوں کا جواب ساغر ہونا — محض کیفیت کے لحاظ سے ہے اس لئے اس میں ایک اور دو کی بحث چھیڑنا درست نہیں۔ (اڈیٹر) [3] یقیناً تو کا استعمال مناسب نہ تھا۔ (اڈیٹر) [4] بھلا کا استعمال بالکل درست ہوا ہے۔ (اڈیٹر) [5] پھبکنا محاورہ ہے۔ البتہ ہائے کا استعمال درست نہیں۔ (اڈیٹر) [6] صحیح معنی میں لکھنوی رنگ کا شعر ہے۔ (اڈیٹر)

حلق پر پھیر کہ بر آئیگی امید وصال — عکس تیرا ابھی ہے شمشیر میں شامل قاتل

مصرع اولیٰ کی تو کیا تعریف کروں البتہ اس کے جزو اول "حلق پر پھیر" کی ضرور تعریف کرونگا تاکہ ہر سامع کو ذم کا پہلو نظر نہ آئے "بھی" تو مستغنی تحسین و مرحبا ہے گویا قاتل کے سوا کسی دوسرے کا عکس بھی داخل شمشیر ہے[۵۱]

مایوس کب ہوئے دل جذب آفریں سے ہم — کروٹ ابھی لوائیں گے سطح زمین سے ہم

یقیناً زمین کا کروٹ لینا یا لوانا تو داخل محاورہ ہے لیکن "سطح زمین کا کروٹ لوانا" عجیب بات ہے[۵۲]۔

حسرت تعمیر ہے اپنے خرابے کی ہمیں — آسماں اس فکر میں ہے اور ہم ویراں کریں

"ہمیں" کے بعد "ہم" کی کیا ضرورت تھی[۵۳]۔

بے سبب تیرے لب نہیں خاموش — کر رہی ہیں تری نظر باتیں

جمع کے ساتھ جمع استعمال کیجئے، یوں کہنا چاہئے (نثر) تیری نظریں باتیں کر رہی ہیں[۵۴]۔

ہے اک فریب ہمت و ناکامیٔ خیال — مشکل جو کام ہے وہی دشوار بھی نہیں

ناکامیٔ خیال کے ساتھ "فریب ہمت" سبحان اللہ کتنی دلکش ترکیب ہے مصرع ثانی میں "جو" کے ساتھ "وہ" استعمال کرنا چاہئے تھا اور اگر "وہی" کا استعمال مناسب تھا تو "بھی" کس مصرف کا[۵۵]؟

پھر حسن و عشق میں تھا بھلا امتیاز کیا — ہوتا اگر یہ دل ہی میرے اختیار میں

"یہ" کہنے کی کیا ضرورت ہے "دل" دو تو نہیں کہ اُن کے لئے اشارہ کرنا لازمی ہو "ہی" اور "بھلا" کا کیا ذکر، بے نیاز داد ہیں[۵۶]

چھپتے کیوں ہو جو سر تا بقدم دیکھتے ہیں — یہ کوئی اور نہیں ہے تمھیں ہم دیکھتے ہیں

اس جگہ "یہ" بے نیاز معنی ہے اگر یوں ہوتا کہ "یہاں" کوئی اور نہیں تو خیر مطلب صاف ہو جاتا[۵۷]

یاد پھر آئی کوئی صحبت دیرینہ عزیز — مجلس وعظ میں اب آپ کو کم دیکھتے ہیں

حضرت! "یاد پھر آئی" کو مصرع ثانی سے کیا نسبت! یوں کہئے "یاد آتی ہے ہمیں صحبت دیرینہ عزیز[۵۸]"

اس کے حریم ناز کا کیا پوچھنا بھلا — گھیرے ہوئے ہے عرش کو جو آشیانے میں

آشیانہ میں عرش کا گھیرنا کیا معنی[۵۹]؟

---

۵۱ ذم کا کوئی پہلو موجود نہیں اور نہ "بھی" کا استعمال غلط ہوا ہے۔ (اڈیٹر) ۵۲ مبالغہ میں عجیب ہی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ (اڈیٹر) ۵۳ لفظ "ہم" کہیں آسمان کے لئے نہ ہو یعنی ویرانی کی فکر آسمان نہ کر رہا ہو۔ (اڈیٹر) ۵۴ "ممکن" ہو "کر رہی ہے" ہو۔ ۵۵ مصرعۂ اولیٰ میں تو کوئی غلطی نہیں، البتہ دوسرا مصرعہ قابل اصلاح ہے۔ (اڈیٹر) ۵۶ یقیناً شعر محتاج اصلاح ہے۔ ۵۷ "یہ" کا استعمال درست ہے۔ (اڈیٹر) ۵۸ اصلاح ضروری نہیں ہے۔ (اڈیٹر) ۵۹ معنی تو ہیں لیکن نہ ہونے کے برابر۔ (اڈیٹر)

ذیل میں پانچ چار شعر صرف ایسے درج کرتا ہوں جن میں حشو قبیح نمایاں ہے[۵۱]

کون سمجھا ہے بھلا وسعت کاشانۂ دل — شرح کونین ہے دیباچۂ افسانۂ دل
دم الٹ جائے گا عزیز عزیز — رہ نہ خاموش کچھ تو کر باتیں
اب تک کچھ آشیاں کا سماں سا نظر میں ہو — گو میں قفس میں تازہ گرفتار بھی نہیں
بس اب تو چین سے سو شور بھی جہاں میں نہیں — کہ سانس تک ترے بیمار ناتواں میں نہیں
زہر دیتے ہیں مجھے یا کہ دوا دیتے ہیں — چارہ سازوں سے یہ پوچھو تو کہ کیا دیتے ہیں[۵۲]

چارہ گر چپ ہیں کیوں علاج کریں — کچھ تو اپنے کئے کی لاج کریں

شعر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ چارہ گر نے کیا تکلیف دی[۵۳]۔

عبرت اے اہل نظر جیسہ بُرا وقت پڑے — کیا کرے آہ رہ چلتے میں بھی بیڑا رنہ ہو

"چلتے میں بھی" کیا انوکھا ٹکڑا ہے جس نے شعر کو بے نیاز معنی کر دیا[۵۴]۔

چارہ سازوں سے نکالی ہے کہاں کی دوستی — وہ نہیں جب مہرباں تو مہرباں کوئی نہ ہو

عزیز صاحب نے پابندی ردیف سے مجبور ہو کر "نہو" بمعنی "نہیں" استعمال کیا[۵۵]۔

وہ ستم پیشہ فلک ظلم ایجاد — اُنسے ہوتی ہے تو ہو لینے دو

جہاں تک میرے مطالعہ کتب کا تعلق ہے، اساتذۂ متقدمین و متوخرین کے کلام میں "ستم ایجاد" نظم دیکھا گیا ہے اور بعض مسلم الثبوت اساتذۂ ہند سے یہی سُنا بھی ہے اس لئے "ظلم ایجاد" قابل تسلیم نہیں[۵۶]۔

دیکھو انجام کہ آنکھوں میں بھر آئے آنسو — ظلم ہے یوں بھی کسی کو نہ ہنساتے جاؤ

عزیز صاحب معشوق سے مخاطب ہو کر کہنا چاہتے ہیں کہ "یوں کسی کو نہ ہنساؤ کہ آنکھوں میں آنسو بھر آئیں" لیکن ردیف کی پابندی نے مجبور کر دیا کہ بجائے ہنساؤ کے ہنساتے جاؤ لکھیں[۵۷]۔

---

۵۱ پہلے شعر میں بھلا حشو نہیں ہے، البتہ بجائے سمجھا ہے کے اگر سمجھے گا ہوتا تو بہتر تھا۔ دوسرے شعر میں عزیز حشو نہیں ہے بلکہ عزیز (تخلص) کی صفت ہے۔ تاہم یہ تکرار اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ تیسرے شعر میں لفظ بھی البتہ غیر ضروری ہے۔ چوتھے شعر میں بھی بیشک بیکار ہے۔ پانچویں شعر میں تو اور کہ دونوں درست ہیں (اڈیٹر) ۵۲ غالباً یہ تکلیف کہ محبوب کو چہ سے پکڑ کر بردستی لے آئے تاکہ جنون کا مداوا کریں (اڈیٹر) ۵۳ یقیناً یہ ٹکڑا کوئی معنی نہیں رکھتا، اور اگر اس کے معنے آخری وقت کے ہیں تو زیادہ مہمل ہے (اڈیٹر) ۵۴ جو یقیناً غلط ہے۔ (اڈیٹر) ۵۵ اگر ظلم و ستم دونوں مترادف ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ستم ایجاد تو صحیح ہو اور ظلم ایجاد غلط۔ ستم ایجاد ان محاوروں میں سے نہیں ہے جن میں تصرف نادرست قرار دیا جائے۔ (اڈیٹر) ۵۶ گر ردیف کی پابندی نہ ہو تو دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہئے "ظلم ہے یوں بھی کسی کو نہ ہنسائے کوئی"۔ صحیح مفہوم صرف ہنساؤ سے بھی نہیں پیدا ہوتا۔ (اڈیٹر)

کھینچ کر آہ اڑا دونگا ورق کو تیرے   اے زمانہ کی روش تجھکو بہت ناز نہ ہو

عزیز صاحب کے کلام میں اکثر ایسی ہی انوکھی ترکیبیں ہوتی ہیں کہ شعر مہمل ہو جاتے ہیں۔ "زمانہ کی روش کا ورق" شائد ہوتا ہو لیکن صرف زمانہ کا ورق کبھی سننے میں نہیں آتا - اسی طرح "ناز نکر" کی بجائے "ناز نہو" کہنا بھی مناسب نہیں[1]۔

آج صیاد نے فرمانِ رہائی تو دیا   مگر ان کو کہ جنھیں طاقت پرواز نہ ہو

"نہیں" یا "نہ تھی" کہنے کی جگہ "نہو" کہدیا گیا جو درست نہیں[2]۔

تمنا وصل کی تھی جس کو سمجھے دم نکلتا ہے   یہی ارمان ہے جو زندگی میں کم نکلتا ہے

مصرع اولیٰ میں تمنا کہنے کے بعد مصرع ثانی میں "ارمان" کی کیا ضرورت رہتی[3]؟

ہاں ملادے دشت کو اے وسعت شوق جنوں   ہے بہت کم اپنے کاشانے کی بربادی مجھے

"مجھے" بمعنی "میرے لئے" کہکر محاورہ میں اضافہ کیا گیا[4]۔

یارب ایسے رشک کا بھی کچھ ٹھکانا ہے کہیں   خود نہیں منظور اسکے گھر کی دربانی مجھے

"کچھ" کے بعد "کہیں" کی ضرورت کو عزیز صاحب ہی بخوبی سمجھ سکتے ہیں[5]۔

اے خدا اس بزم میں اس بیکسی کی داد دے   میں اکیلا اک طرف اور ساری محفل ایک ہے

"اس بزم" کی بجائے "انکی بزم" کہتے تو خیر کوئی معنی نکل سکتے تھے، یہ کیا؟ "میں اکیلا اک طرف اور ساری محفل ایک ہے" "اکیلا اک طرف" کی ساتھ مصرع کے توازن کا خیال رکھتے ہوئے "ساری محفل اک طرف" کہنا چاہئے تھا[6]۔

چراغ راہ ہے بن نوردیدۂ یعقوب   کہ دشت عشق میں ہے یوں ہی جستجو ہوتی

مصرع ثانی میں "ہے" اور "ہوتی" کا فاصلہ، فن شاعری میں سخت معیوب ہے[7]۔

ہے یہ وقتِ امتحانِ چشمِ تر   رونے والے آبرو رہ جائیگی

"اگر تو نے اشکباری کی" یا اسی قسم کا کوئی دوسرا جملہ اضافہ کئے بغیر مفہوم شعر کی تکمیل نہیں ہوتی[8]۔

---

[1] زمانہ کا ورق"۔ اور - "زمانہ کی روش کا ورق" دونوں غلط ہیں تاوقتیکہ پہلے زمانہ کو کسی ایسی چیز سے منسوب نہ کریں جس میں ورق پایا جاتا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں "ورق کتاب دہر" بیشک درست ہے - ناز نہ ہو میں کوئی غلطی نہیں ہے - یہاں "نہ ہو" "نہ ہونا چاہئے" کے مفہوم میں مستعمل ہوا ہے۔ (اڈیٹر) [2] یقیناً نامناسب ہے۔ (اڈیٹر) [3] ارمان کی تکرار دوسرے مصرعہ میں نادرست نہیں ہے - (اڈیٹر) [4] فارسی میں تو بیشک مرا اس معنی میں مستعمل ہوتا ہے، لیکن اردو میں مجھے کا استعمال اس مفہوم میں یقیناً غلط ہے۔ (اڈیٹر) [5] اگر کہیں کی جگہ بھلا ہوتا تو بہتر تھا - (اڈیٹر) [6] اعتراض درست ہے۔ (اڈیٹر) [7] علاوہ اس کے دوسرا عیب اس شعر میں یہ ہے کہ یونہی کا صرف سمجھ میں نہیں آتا - (اڈیٹر) [8] دوسرے مصرعہ حقیقتہً اس مفہوم کے ساتھ پیش کرنا چاہئے تھا کہ "اگر تو نہ رویا تو آبرو جائیگی" لیکن بجائے منفی جملہ شرطیہ کے مثبت استعمال کیا گیا جس نے شعر کی قوت کو بہت کم کر دیا۔ علاوہ اس کے جیسا کہ معترض کا اعتراض ہے پورے ایک فقرہ کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے - (اڈیٹر)

[redacted]

یقین ہے مجھ سے ملاقات اُس سے ہو جائے　　تیری تلاش میں پہلے جو آپ کھو جائے

مصرع اولیٰ میں "اُس سے" کی بجائے "اس کی" ہونا چاہئے تھا علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں پہلے کا اضافہ بھی بیکار ہے[1]

دکھلا دی سکوں ہو مشق طاقت جذب کامل کی　　کھنچے بیٹھے ہیں وہ یاں ٹوٹی جاتی ہیں رگیں دل کی

"جذب کامل کی طاقت" اور "یاں" کی تو کیا تعریف کی جائے، یہ شعر ہر صاحب عقل و فہم کی سمجھ سے ارفع و اعلیٰ ہے معلوم نہیں کہ طاقت جذب کامل کی دکھانی ہے یا "دل کی رگیں ٹوٹنے" کا افسوس[2] -

یاد آہی جاتا ہے کبھی ناصح کا قول بھی　　سب کیجئے جہاں میں محبت نہ کیجئے

"سب" کی بجائے کسی صورت سے "سب کچھ" کہا جاتا تو مصرع ثانی با معنی ہو سکتا تھا - مصرع اولیٰ میں "ہی" اور "کبھی" کے بعد "بھی" کی کیا ضرورت رہی[3] ؛

برق سے خورشید سے گلہائے رنگا رنگ سے　　مختلف شکلوں سے صورت اُس نے دکھلا دی مجھے

"دکھلا دی" اول تو متروک ہے دوسرے معنی و مفہوم کے لحاظ سے "دکھلائی" کی جگہ "دکھلا دی" استعمال کیا گیا[4] -

دہر رہے ہو تم جیسے تلوار ٹیک کر　　تقریر کیا ہی تھی کسی عذر خواہ کی

"ٹیک کر" یہ لفظ اکثر گاؤں کے باشندوں کی زبان سے سننے میں آیا کرتا تھا آج معلوم ہوا کہ اہل لکھنؤ کے یہاں بھی مروج ہے اگر تھوڑی دیر کے لئے اس سے قطع نظر کیجائے تو شعر میں شروع سے آخر تک "تلوار ٹیکنے" کی نہ وجہ معلوم ہوئی نہ جگہ - خدا جانے مقصد کیا ہے[5] ؟

صبح ہجراں ہے نسیم سحری آتی ہے　　سانس کچھ کچھ ابھی بیمار میں بھی آتی ہے

"بیمار کے سانس آنے کی" علت؟ صبح ہجراں میں نسیم سحری کی آمد سے بیمار میں سانس کیونکر آئے گی؟ معلوم ہوتا ہے کہ مطلع بنانے کے لئے "سحری" کے قافیہ کے لئے "بھی" کا استعمال کیا گیا جو یقیناً بلا ضرورت ہے[6]

کوئی سیلِ خرابے ہے دم سے سب گزرا　　غور سے دیر تک اُس نے وہ مکاں دیکھا ہے

کوئی خرابے پہ "گزرتا ہے" یا خرابے سے "خرابے" یعنی ویران جگہ، جو مقام ویران ہو اس کو مکان کیسے کہہ سکتے ہیں؟ "دیکھا" کے ساتھ "ہے" کی ضرورت جبکہ مصرع اولیٰ میں صرف "گزرا" لکھا گیا[7] -

---

[1] اعتراض بالکل درست ہے (اڈیٹر) [2] یہ شعر اپنے معنے کے لحاظ سے بہت ناقص ہے - پہلے مصرعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جذب کامل کی طاقت دکھانا چاہتا ہے - در انحالیکہ دوسرے مصرعہ میں "کھنچے بیٹھے ہیں وہ" کہکر بجائے طاقت کے اسکا ضعف ثابت کیا جا رہا ہے (اڈیٹر) [3] "سب کچھ" ہوتا تو بہتر تھا دوسرا اعتراض درست نہیں - (اڈیٹر) [4] "دکھلا دیا" کیوں متروک مانا جائے - (اڈیٹر) [5] ٹیکنا محاورہ ہے اور اہل لکھنؤ کا - تلوار ٹیکنے کی حالت بطور محاکات دکھائی ہے تاکہ قاتل یا محبوب ... "صبح خون آشامی" ... دونوں اعتراض غلط ہیں - (اڈیٹر) [6] اس شعر پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں "آتی ہے" بجائے "باقی ہے" کے استعمال کیا گیا ہے - یوں نہیں بولتے کہ بیمار میں ابھی سانس آتی ہے "بلکہ ... کہتے ہیں - (اڈیٹر) [7] ... مکاں ... استعمال کیا گیا ... ہوتا تو بہتر تھا - دوسرے مصرعہ میں "ہے" یقیناً بیکار ہے - (اڈیٹر)

کب سے دکھا رہا ہوں دل داغ داغ کو　　کچھ تو نگاہ ناز سے تنقید کیجئے

"کو" کا بے محل استعمال داد طلب ہے اگر "کو" کی جگہ "میں" کہدیا جاتا تو کسی حد تک یہ عیب دور ہو سکتا تھا۔[۱]

دیدنی ہے بزم مے میں دور دور بیخودی　　رندادھر بیہوش ہیں ساقی ادھر بیہوش ہے

"بزم مے میں" تین میم کا اجتماع اور اسپر "دور" کی تکرار لائق صد تحسین و مرحبا ہے، شاعر نے "دور دورۂ بیخودی" کی لطیف مرکب کو "دور دور بیخودی" کے کثیف مرکب سے تبدیل کرکے اور ظلم کیا۔[۲]

اُف ری گرمی آفتاب حسن محشر خیز کی　　دیکھتا ہوں جس کو میں غرق عرق تا دوش ہے

"آفتاب حسن محشر خیز" کی پاکیزہ ترکیب کا کیا کہنا! اُس پر "تا دوش" کا اضافہ اور بھی لطف دے رہا ہے۔ پسینے میں کاندھے تک غرق ہو جانا بھی شان استادی ہے۔[۳]

یہ مشورہ ہم اُٹھتے ہیں چارہ جو کرتے　　اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے

"مشورہ" ہم ہی ہوا کرتا ہے نہ کہ تنہا، پھر "ہم" کی کیا ضرورت رہی؟ "چارہ جو کرتے" خلاف محاورہ ہے "چارہ جو کرکے" کہنا چاہیے تھا۔[۴]

ہوئی ہے دیر کہ کچھ ہوش بخیہ گر کو نہیں　　کھو کہ زخم جگر میں یہ کیا رفو کرتے

حالت مفعولی میں ہمیشہ اسم جمع "ون" کے ساتھ آتا ہے، اس لئے بجائے "بخیہ گروں" کے صرف "بخیہ گر" لکھکر اس سے جمع مراد لینا قاعدہ کے خلاف ہے اور اگر اسے واحد تصور کیا جائے تو دوسرے مصرع میں ردیف غلط ہوئی جاتی ہے۔[۵]

مجھے جب غور سے دیکھا عیادت کرنیوالوں نے　　بساط خواب پر دھندلی سی اک تصویر نکلی ہے

"دیکھا" اور "نکلی" دونوں ہم زمانہ، پھر "نکلی" کے ساتھ "ہے" کیسا؟[۶]

---

[۱] معترض کے اس اعتراض سے تو مجھے اتفاق نہیں ہے، لیکن دوسرا مصرعہ معنی کے لحاظ سے ضرور محل نظر ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ تنقید نگاہ ناز کریگی یا محبوب کریگا اس حال میں کہ نگاہ ناز صرف ہو رہی ہوگی۔ مدعا شاعر کا صرف یہ ہے کہ کب سے میں دل پُر داغ دکھا رہا ہوں، ایک نگاہ دیکھ تو لیجئے اسلئے دیکھنے کے مفہوم کو "نگاہ ناز کی تنقید" سے ظاہر کرنا محض تصنع و آورد ہے۔ (اڈیٹر) [۲] مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا۔ بزم میں یہ بیخودی کا دور بھی ہے دیدنی۔ لفظ مے کا اظہار پہلے مصرعہ میں غیر ضروری ہے جبکہ دوسرے مصرعہ سے بزم کی نوعیت ظاہر ہے۔ (اڈیٹر) [۳] "آفتاب حسن محشر خیز" میں تو کوئی حرج نہیں، لیکن دوسرا مصرعہ بالکل مہمل ہے اور تا دوش کی تعیین لغو۔ پسینہ سر سے کیوں نہیں گزر گیا۔ علاوہ اس کے مفہوم بھی کوئی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ جب مقصود واقعی پسینہ نہیں ہے تو پھر تا دوش کیا؟ (اڈیٹر) [۴] اُٹھتے ہیں اور کرتے کے درمیان اس قدر فصل ہے کہ مصرعہ معیوب ہو گیا علاوہ اس کے مفہوم کے لحاظ سے بھی شعر ناقص ہے۔ مریض کو قبلہ رو کر دینا کوئی ایسا اہم مسئلہ نہ تھا کہ چارہ گر اس کے لئے باہم مشورہ کرنے بیٹھ جاتے کیا خود ایسا نہ کر سکتے تھے۔ (اڈیٹر) [۵] علاوہ اس نقص کے بیان کی تعقید بھی پائی جاتی ہے۔ (اڈیٹر) [۶] اعتراض درست ہے (اڈیٹر)

[redacted]

گرد اڑی ہے صبح کو جو رفت و روب دیپ سے
کعبہ جلتے وقت وہ چہرہ پہ ملتے جائیں گے

"رفت و روب دیر" کی جدت ترکیب قابل داد ہے۔[1]

یہ درازی شب غم کی یہ بلاؤں کا ہجوم
اس پہ اندھیر کہ آنکھوں میں کٹی رات مجھے

"مجھے آنکھوں میں رات کٹی" کیا پاکیزہ محاورہ اور چست بندش ہے؟[2]

یہ مانا کہ فرصت بہت تم کو کم ہے
ٹھہر جاؤ دم بھر ابھی دم میں دم ہے

کس کے دم میں دم ہے؟ اگر قافیہ کے ماقبل "دم" کو "مجھ" سے تبدیل کر دیا جاتا تو یہ نقص نکل جاتا۔[3]

کبھی دل میں میرے جھلک سی اُٹھی تھی
اب ایک آبلہ آج سر تا قدم ہے

مصرع ثانی میں "اب" اور "آج" کا اجتماع قابل غور ہے۔[4]

مٹے طلسم تصور تو اب قدم اُٹھیں
کہ ذرہ ذرہ پہ تصویر یار راہ میں ہے

شعر کو ہزار بار نظر غائر سے دیکھا لیکن کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آیا۔[5]

دیکھکر وہ نزع کی تکلیف ان کا التفات
زندگی بھر میں ہیں راحت کبھی ایسی نہ تھی

کونسا عالم نزع؟ آخر "وہ" کا اشارہ کس طرف ہے؟[6]

دیکھنا عزیز آنکھ کو گردش دم آخر
بیٹھے ہیں سرہانے ترے ارباب نظر بھی

"گردش نگاہ" کی جگہ آپ نے "آنکھ کی گردش" لکھا۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں لفظ "بھی" سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید غیر ارباب نظر بھی بیٹھے تھے۔[7]

---

[1] پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا۔ "گرد اڑی ہے صبح کو جو آستاں دیپ سے" دوسرے مصرعہ میں لفظ "وہ" بھی محل نظر ہے جو "اُسے" کی جگہ استعمال ہوا ہے (اڈیٹر)
[2] "مجھے" "میری" جگہ استعمال کیا گیا جو غلط ہے۔ شعر مفہوم کے لحاظ سے بھی ناقص ہے۔ کیونکہ جب شب غم میں بلاؤں کا ہجوم ہوگا تو "آنکھوں میں رات کٹنا" کونسی حیرت انگیز بات ہے جس پر اندھیر کی صدا بلند کی جاتی ہے۔ (اڈیٹر)
[3] یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ شعر کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں کہ کس کا دم مراد ہے۔ (اڈیٹر)
[4] اس نقص کے علاوہ دوسرا نقص یہ ہے کہ "سر تا قدم" آبلہ کون ہے دل یا خود شاعر؟ اگر دل مقصود ہے تو سر تا قدم کہنا مہمل بات ہے اور اگر اس سے مراد شاعر ہے تو دوسرے مصرعہ میں بجائے "ہے" کے "ہوں" ہونا چاہئے اگر "ہے" کا فاعل جھلک کو قرار دیا جائے تو بیشک تاویل ہو سکتی ہے لیکن مصرعہ کے الفاظ سے جو انتشار خیال پیدا ہوتا ہے اس کا کیا علاج؟ (اڈیٹر)
[5] شعر کا مفہوم ظاہر ہے۔ مدعا یہ ہے کہ چشم تصور نے ہر ہر ذرہ کو تصویر یار بنا دیا ہے اس لئے جب تک طلسم تصور نہ مٹے قدم کیونکر اُٹھ سکتے ہیں۔ (اڈیٹر)
[6] پہلا مصرعہ بری طرح نظم کیا گیا ہے۔ یوں ہونا چاہئے تھا۔ "نزع کی تکلیف میں مجھ پر وہ ان کا التفات"! (اڈیٹر)
[7] دونوں اعتراض غلط ہیں "آنکھ کو گردش دینا" نہ خلاف محاورہ ہے نہ خلاف واقعہ" رہا غیر ارباب نظر کا موجود ہونا سو یہ بھی ناممکن نہیں۔ (اڈیٹر)

معاذ اللہ کچھ پوچھو نہ میرے دل کی بربادی نگاہوں میں مرے ویرانہ ہی ویرانہ آتا ہے

"میری نگاہوں میں ویرانہ ہی ویرانہ آتا ہے" کیا معنی؟ "نگاہوں میں ہے" کہنا چاہئے تھا[51]۔

مری مردہ حسرتوں پردہ میں کون آنسو والے کوئی نوحہ خوان آئے کوئی اشکبار آئے

"نوحہ خوان" کے نون کی کیا داد دیجا سکتی ہے[52]؟

الٰہی وہ شفق بنکر دیار حسن میں پھولے برابر خون دل جو صبح سے تا شام آتا ہے

اردو اور فارسی میں "از صبح تا شام" یا "صبح تا شام" نظر سے گزرا ہے شائد اب "صبح سے تا شام" جدید محاورہ کا اضافہ کیا گیا ہو۔ "خون دل" نہیں معلوم منہ سے نکلتا ہے یا آنکھوں سے یا کہیں اور سے، شعر میں تو کوئی صراحت نہیں[53]۔

مگر ہم آج جذب خاک دامنگیر دیکھیں گے زمین کوچۂ جاناں تری تاثیر دیکھیں گے

مصرعہ اولیٰ میں "مگر" کی افزائش کتنی اچھی معلوم ہوتی ہے[54]!

مزہ نہ دیگی بھلا تمہے داستاں میری کہاں زبان تمھاری کہاں زباں میری

"بھلا" کو نظر انداز کرنے پر بھی مصرع ثانی میں "زبان" میں ایک جگہ نون معلن اور دوسری جگہ نون غنہ کا استعمال کیا گیا ہے[55]۔

جس کو سمجھ رہا ہوں کہ میری حیات ہے بگڑے وہ بات بات پہ کہنے کی بات ہے

بغیر اس کے کہ عزیز صاحب نے تین جگہ "بات" کو نظم کر دیا اور کیا فائدہ ہوا دونوں مصرعوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے "کہنے کی بات ہے[56]" یا "نہیں" اسی طرز پر ایک اور شعر سنکر لطف اندوز ہوجیے۔

آج کل تیار اُن کا ہاتھ ہے دل اڑا دینا بھی کوئی بات ہے

"تیار" بمعنی موجود، حاضر، "ہاتھ کا تیار" ہونا کیا معنی! "ہاتھ" ہائے مخلوط پر ختم ہوتا ہے نہ کہ تائے فوقانی پر، بات، رات، کے ساتھ قافیہ کر لینا خاندان داغ کے علاوہ جائز نہیں[57]۔

وہ دن رہے عزیز نہ وہ رات رہ گئی اہل نظر میں صرف مری بات رہ گئی

"دن رہے" کی ساتھ "رات رہی" کہنا چاہئے تھا[58]۔ اسی طرز پر ایک اور شعر فرماتے ہیں۔

---

[51] یقیناً آتا ہے بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔ (اڈیٹر) [52] اعلان نون بالکل غلط ہے۔ (اڈیٹر) [53] اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ لفظ برابر نہایت نامناسب جگہ لایا گیا ہے۔ (اڈیٹر) [54] مگر کا استعمال کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ لیکن شعر مفہوم کے لحاظ سے کچھ نہیں ہے۔ (اڈیٹر) [55] بھلا کا استعمال بالکل صحیح ہے اور زبان میں ایک جگہ نون معلن اور دوسری جگہ نون غنہ کا استعمال بھی غلط نہیں۔ (اڈیٹر) [56] مجھے اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ محبوب کو جان کہا جاتا ہے یا حیات! ۔ (اڈیٹر) [57] ہاتھ، نظم میں بات کے ساتھ آسکتا ہے اور ہاتھ کا تیار ہونا محاورہ ہے جس کے معنے مشاق کے ہیں۔ (اڈیٹر) [58] اس اعتراض سے مجھے اختلاف ہے۔ (اڈیٹر)

حد ہوئی مشقِ ستم کی آپ کے حد ہو گئی　　کوئی بھی وہ سرزمیں ہے جس جگہ تربت نہیں

اس میں بھی ایک جگہ "حد ہوئی" اور دوسری جگہ "حد ہو گئی" کہا گیا۔[1]

کون سنتا ہے جناب شیخ کی[2]　　اب زمانہ آج کل آزاد ہے

"اب" اور "آج" کا اجتماع قابلِ ملاحظہ ہے۔

منزلِ ہستی میں اے آئندگانِ رفتنی　　دیکھتے جانا ٹھہر کر خانۂ ویرانی مری

"آئندگانِ رفتنی" کی پاکیزہ ترکیب کی کوئی کیا داد دے سکتا ہے؟ "اے جانے کے لائق آنے والو" تجدید کی حد ہو گئی![3]

جبہ سائی نے ابھارا سوزِ دل کو اس قدر　　سنگِ در سے اُن کے لو دے اٹھی پیشانی مری

"پیشانی کا لو دینا" کوئی محاورہ نہیں۔ اگر شمعِ پیشانی کہا جاتا تو درست ہو سکتا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اظہارِ مفہوم میں مجبور ہے جس کی وجہ سے شعر اچھا خاصہ معما بن گیا۔[4]

مضمون طوالت پکڑتا جاتا ہے لہٰذا ذیل میں پانچ سات شعر لیے درج کر کے ختم کرتا ہوں جن میں حشو قبیح نمایاں ہے:[5]

کون سنتا ہے دردِ دل کو عزیز　　کس سے یہ شکوہ و شکایت ہے

کچھ تو ہے بیٹھے ہوئے ہیں واعظانِ شہر سب　　ورنہ میخانہ میں تو صحبت کبھی ایسی نہ تھی

ہے یہ بھی خبر جذبۂ تاثیر کے مالک　　محتاج ہے تیرا کوئی مایوس اثر بھی

اربابِ عشق میں تھا باہم آج مشورہ　　اُس مقبرہ عزیز کا تعمیر ہو نہ جائے

کہتی ہے روحِ نزع میں رستہ دکھا چکے　　جاتے ہیں ہم خود آپ ہاں وہ تو آ چکے

ترے وعدے کی حقیقت کو ہمیں سمجھ رہے ہیں　　وہ مریضِ زندگی ہے جسے اعتبار آئے

مانا کہ دردِ دل کی جہاں میں دوا بھی ہے　　اے چارہ گر بتا کہ کوئی شے قضا بھی ہے[5]

شاد صابری

[1] حد کی تکرار اچھی نہیں ہے۔ (اڈیٹر) [2] اب اور آج کل کا اجتماع نامناسب ہے۔ (اڈیٹر) [3] یقیناً تغزل میں ایسی ترکیبوں کا استعمال موزوں نہیں (اڈیٹر) [4] محاورہ کا بیان کوئی ذکر نہیں کہ اس پر نگاہ کی جائے۔ لیکن مفہوم کے لحاظ سے ضرور تھوڑا سا نقص پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب سوزِ دل جبہ سائی کی وجہ سے اُبھرا تو پیشانی کیوں لو دے اٹھی۔ پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا۔ "سوزِ دل نے جبہ سائی کو اُبھارا اس قدر"۔ (اڈیٹر) [5] ان میں سے کسی شعر میں حشو قبیح نہیں ہے۔ (اڈیٹر)

شاعر کا انجام ۱ر بحر تبسم ۸ر موج تبسم ۱۲ر فراست الید ۸ر مذاکرات نیاز ۱۲ر (منیجر نگار لکھنؤ)

باب الاستفسار

ہاروت و ماروت، زہرہ، اسم اعظم

(جناب سید زین العابدین صاحب - حیدر آباد دکن)

براہ کرم مطلع فرمائیے کہ قرآن پاک میں "ہاروت و ماروت" کا جو ذکر آیا ہے، اس کا صحیح مطلب کیا ہے اور عام طور پر جو قصہ ہاروت و ماروت کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دو فرشتے تھے اور زمین پر آکر زہرہ نامی کسی فاحشہ عورت سے آلودہ ہوکر چاہ بابل میں قید کر دئے گئے اور زہرہ اُن سے اسم اعظم سیکھ کر آسمان پر پہونچ گئی، کہاں تک قابل اعتنا ہے اور اس روایت کا صحیح ماخذ کیا ہے۔

(نگار) دوران قیام حیدر آباد میں متعدد استفسارات زبانی و تحریری مجھ سے کئے گئے، جن میں سے بعض کا جواب تو میں زبانی دے چکا ہوں اور بعض کا ذریعہ نگار دیتا ہے۔ ان میں زیادہ اہم استفسار ایک تو یہی ہے جو درج کیا جاتا ہے اور دوسرا جوش ملیح آبادی اور علی اختر کی شاعری کے متعلق ہے کہ ان دونوں کی شاعری میں کیا فرق ہے اور کس کو کس پر ترجیح دی جانی چاہئے۔ اس اشاعت میں استفسار اول کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور دوسرے استفسار کو اشاعت آئندہ پر ملتوی کرتا ہوں۔

کلام پاک میں ہاروت و ماروت کا ذکر جس آیت میں آیا ہے وہ سورۂ بقر کی آیت ۱۰۲ ہے اور اسکے الفاظ یہ ہیں:-

وما کفر سلیمان ولکن الشیٰطین کفروا یعلمون الناس السحر۔ وما انزل علی الملکین ببابل ھاروت وماروت وما یعلمان من احد حتی یقولا انما نحن فتنۃ فلا تکفر فیتعلمون منھما مایفرقون بہ بین المرء و زوجہ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:-

اور سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا جو لوگوں کو سحر سکھاتے تھے اور بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر کچھ نازل نہیں کیا گیا۔ اور وہ کسی کو سحر نہ سکھاتے تھے جب تک نہ کہدیتے کہ ہم امتحان میں پڑے ہوئے ہیں۔ تم کفر میں مبتلا نہ ہو۔ پس وہ لوگ سیکھتے تھے ان دونوں سے وہ چیز جس سے میاں بیوی میں جدائی ہوتی

اس آیت کے اگر معنی یہی ہیں اور بغیر کسی تاویل کے اس کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے تو اس سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:-

۱- بابل میں دو فرشتے تھے جن کا نام ہاروت و ماروت تھا۔
۲- وہ کسی عذاب میں مبتلا کئے گئے تھے جس کی صراحت نہیں کی گئی۔
۳- جب وہ کسی کو جادو سکھاتے تھے تو پہلے اس کو باز رکھتے تھے۔
۴- لوگ ان فرشتوں سے میاں بیوی کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کا جادو سیکھا کرتے تھے۔

مفسرین نے احادیث کے استناد پر اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"جب فرشتوں نے بزمانۂ حضرت ادریس انسانوں کے خراب اعمال دیکھے تو انھوں نے خدا سے کہا کہ اے خدا کیا یہ اعمال اسی مخلوق کے ہیں جسے تو نے اپنا خلیفہ و نائب بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ یہ سنکر خدا نے ارشاد فرمایا کہ "اگر میں تم کو بھی انھیں خواہشات کے ساتھ زمین پر بھیجتا جو نوع انسان میں پیدا کی گئی ہیں تو تم بھی وہی کرتے جو انسان کرتا ہے"۔

یہ سنکر فرشتوں نے کہا کہ "اے رب، یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم سے تیری مرضی کے خلاف کوئی حرکت سرزد ہو"۔ اللہ نے فرمایا کہ "اچھا تم اپنے میں سے دو بہترین فرشتے منتخب کرو، میں اُنھیں زمین پر بھیجوں گا"۔ بس اُنھوں نے دو فرشتے منتخب کئے جو نہایت متقی و پرہیزگار تھے۔

ثعلبی اور کلبی نے لکھا ہے کہ اللہ نے تین فرشتوں کے انتخاب کا حکم دیا، چنانچہ تین فرشتے منتخب کئے گئے ایک کا نام عزّا تھا (یعنی ہاروت) دوسرے کا عزابا (یعنی ماروت) اور تیسرے کا عزرائیل۔

جب انتخاب کی کارروائی عمل میں آچکی تو اللہ نے ان فرشتوں میں انسانی خواہشات بھر دیں اور زمین کی طرف بھیجدیا۔ چلتے وقت اُن کو حکم دیا گیا کہ دیکھو شرک و قتل، زنا و میخواری سے بچنا اور لوگوں کا فیصلہ پورے انصاف سے کرنا۔

عزرائیل نے تو یہ کیا کہ ان خواہشات کے پیدا ہوتے ہی اُس نے اپنے رب سے معافی مانگ لی اور درخواست کی کہ اسے آسمان پر بلا لیا جائے چنانچہ خدا نے اسے معاف کر دیا اور آسمان پر اُٹھا لیا، لیکن وہ چالیس سال تک سجدہ میں پڑا رہا اور شرم کے مارے گردن نہ اُٹھائی۔

باقی دونوں فرشتے بدستور زمین پر رہے لیکن صورت یہ تھی کہ تمام دن تو وہ انسانوں کے باہمی نزاعوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے اور شام کو اسم اعظم پڑھکر آسمان پر چلے جاتے تھے۔

قتادہ کا بیان ہے کہ جب ایک مہینہ اسی حال میں گذر گیا تو ایک دن زہرہ جو نہایت ہی جمیل عورت تھی اُن کے پاس ایک مقدمہ لائی (ایک راوی حدیث کا قول ہے کہ یہ عورت فارس سے وابستہ تھی اور اپنے ملک کی ملکہ تھی) اس کو دیکھ کر دونوں فرشتے بدحواس ہو گئے اور سوال وصل کر بیٹھے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ جب دوسرے دن وہ پھر آئی تو ان فرشتوں نے پھر اپنی التجا پیش کی اس نے جواب دیا کہ "جب تک تم میرے بت کی پوجا نہ کرو اور

کسی کو قتل کرکے شراب نہ پیو، تمھاری خواہش پوری ہونا محال ہے"۔ انھوں نے انکار کردیا اور وہ پھر چلی گئی۔ تیسرے دن جب وہ آئی تو اپنے ساتھ جام شراب بھی لائی۔ فرشتوں نے پھر وہی خواہش پیش کی اور آخرکار یہ فرشتے اس بات پر راضی ہوگئے کہ شراب پی لیں گے کیونکہ تینوں شرطوں میں سب سے زیادہ آسان شرط یہی تھی ـــ جب شراب پی کر وہ بدمست ہوئے تو عین حالت اختلاط میں کسی آدمی نے ان کو دیکھ لیا، انھوں نے اس کو قتل کر ڈالا ـــ کلبی بن انس کی روایت ہے کہ انھوں نے بت کی بھی پوجا کی ـــ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے زہرہ کو ایک ستارہ بنادیا ـــ اس کے ستارہ بنائے جانے کی تفصیل بروایت کلبی وعلی وسعدی یہ ہے کہ "اس عورت نے کہا کہ تم مجھے اس وقت تک حاصل نہیں کرسکتے جب تک وہ بات نہ بتاؤ جس کے ذریعہ سے تم آسمان پر چڑھ جاتے ہو۔ آخرکار فرشتوں نے اسم اعظم اس کو بتادیا اور وہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان تک پہونچ گئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ستارہ بنادیا ـــ"

مجھے اس وقت مذہبی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر کوئی گفتگو نہیں کرنا ہے اس کو مولویوں کی جماعت جانے اور اُن کا اسلام مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ یہ داستان جو ہاروت و ماروت اور زہرہ کے متعلق اسلامی لٹریچر، اسلامی احادیث و تفاسیر میں پائی جاتی ہے یہ کوئی نئی بات تھی جو بتائی گئی یا اُس سے قبل بھی کسی اور قوم یا مذہب میں پائی جاتی تھی۔
اس جستجو میں جب ہم مسیحی اور یہودی کتابوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان کے بعض ٹکڑے مسیحی کتابوں میں بھی ہیں اور یہودیوں کے یہاں تو تقریباً یہی قصہ جوں کا توں موجود ہے چنانچہ ہم یہودیوں کے صحیفۂ مقدس مدراشِ یلقوت باب ۴۴ سے اس کو ذیل میں درج کرتے ہیں:ـــ

"ربی یوسف کے شاگردوں نے اس سے دریافت کیا کہ عزائیل کیا ہے (عزائیل اور عزرائیل میں فرق صرف ایک "ر" کا ہے) اُس نے جواب دیا کہ جب نوح کی قوم بت پرستی کرنے لگی تو خدائے قدوس کے حضور میں دو فرشتے شمحازائی اور عزائیل آئے اور عرض کیا کہ "اے رب العالمین انسان میں کیا بات ہے جو تو اس کی اتنی رعایت کرتا ہے" خدا نے فرمایا کہ "اگر تم کو دنیا پر غلبہ دیا جائے تو خواہشات نفسانی میں تم انسان سے زیادہ مبتلا ہوجاؤ"۔ یہ سنکر فرشتوں نے کہا کہ ان سے کبھی سرکشی ممکن نہیں۔ تو خدا نے فرمایا کہ "اچھا جاؤ اور اُن کے ساتھ رہو"۔ دنیا میں آکر فرشتے شمحازائی نے ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھا جس کا نام اسطہر (Estahar) تھا[1]۔ فرشتے نے اس لڑکی پر اپنی آنکھیں جمالیں اور بولا کہ "مجھ سے التفات کی باتیں کر" اس نے کہا کہ تیری

[1] قزوینی نے اس کا نام زہرہ، اناہید اور بیدخت بتایا ہے۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ اسطہر یا استارہ اشتار دراصل زہرہ ستارہ ہی کے مختلف نام ہیں۔

باتیں میں نہ سنوں گی جب تک مجھے وہ اکادہ عجیب نام نہ بتاؤ ے جس کو پڑھکر تو آسمان پر چلا جاتا ہے"۔ تب فرشتے نے وہ نام بتا دیا اور وہ لڑکی آسمان پر چڑھ گئی ۔ خدا نے حکم دیا کہ " اسے ہفت کواکب میں شامل کر دو"۔

اس کے بعد ان فرشتوں نے دو بیویاں کریں اور دو لڑکے حوّا اور حیا پیدا ہوئے ۔ عزائیل کے پاس بہت سا زیور اور اسباب آرائش موجود تھا جن کی وجہ سے مرد عورتوں کی طرف مائل ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں"[1]

یہودیوں کی اس روایت کو پڑھکر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی روایت و یہودی روایت میں کتنا فرق ہے ۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ یہودیوں میں یہ روایت کیونکر آئی ۔ آیا یہ کوئی صحیح واقعہ تھا جو الہام ربانی کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا یا کیا ؟ ۔ اسی سلسلہ میں یہ امر بھی قابل تحقیق ہے کہ ہاروت و ماروت کہاں سے آئے اور اس عورت کا نام زہرہ کیونکر معلوم ہوا ۔

اسلامی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان فرشتوں کے نام ہاروت و ماروت ارتکاب معصیت کے بعد رکھے گئے تھے ۔ ورنہ اس سے قبل ان کے نام عزا اور عزایا تھے ۔ مدراش یلقوت میں ان کے نام شمحازای اور عزائیل بتائے گئے ہیں ۔ رہا یہ امر کہ ان عربی و یہودی ناموں میں کوئی مناسبت ہے یا نہیں ۔ زیادہ قابل لحاظ نہیں کیونکہ کلام پاک میں یہ نام کسی جگہ درج نہیں ہیں ۔ البتہ ہاروت و ماروت کے متعلق تحقیق ضروری ہے کہ ان کی اصلیت کیا ہے ۔ بعض محققین زبان عربی کی رائے ہے کہ یہ دونوں لفظ ہرت و مرت سے نکلے ہیں جن کے معنی عربی زبان میں پھاڑنے اور توڑنے کے ہیں ۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں ناموں کا پتہ اور قوموں کے لٹریچر میں بھی چلتا ہے ۔ چنانچہ ڈاکٹر لسٹڈل کی تحقیق ہے کہ یہ دونوں نام قدیم ارمن بتوں کے ہیں جن کی تیسری چوتھی صدی میں پرستش کی جاتی تھی اور جن کا نام ارمنی زبان میں ہوروت اور موروت تھا ۔ ڈاکٹر موصوف نے ایک ارمن مصنف کا بیان درج کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں دیوتا معاون مانے جاتے تھے ایک اور دیوی کے جس کا نام اسپندرامیت تھا اور ان دیوتاؤں کی خدمت یہ تھی کہ زمین کی پیداوار میں اضافہ کریں ۔

لیکن اس تحقیق کو اور آگے بڑھائیے تو معلوم ہوگا کہ آرمینیا میں یہ خیال یقیناً قدیم ایرانیوں سے آیا کیونکہ اوستا میں بھی ایک دیوی سپنتا آرمنی کا وجود پایا جاتا ہے ۔ (جو آرمینیوں کی اسپندرامیت ہے) اور اُس کے بھی دو معاون دیوتا ہوراوات اور امرتات تھے جن کے معنے علی الترتیب کثرت و افراط اور قیام و بقا کے ہیں[2]
(واضح ہو کہ یہی دونوں لفظ بعد کو خورداد و مُرداد ہو گئے جن پر تیسرے اور پانچویں عجمی مہینوں کے نام رکھے گئے)

---

[1] اس اخیر کے فقرہ پر ہم آئندہ بحث کرکے بتائیں گے کہ اسلامی روایت میں اس سے کیا کام لیا گیا

[2] ارمنی دیوتاؤں (ہوروت و موروت) کی خدمت اضافۂ پیداوار سے کس قدر قریب کا تعلق رکھتے ہیں ۔

اَب جسوقت ہم اوستا کے ان ناموں پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اصل آریہ زبان اور سنسکرت میں اُن کی اصل صورت سروتا ر Sarvatata) اور مرتا (Amretata) پائی جاتی ہے۔ پہلا نام رگ وید میں بصورت سروتاتی (Sarvatatata) آیا ہے اور آریہ روایتوں میں بھی یہ دیوتا زمین کو زرخیزی بخشنے والے ظاہر کئے جاتے ہیں۔

اَب زہرہ کے متعلق تحقیق کیجئے کہ اس کا نام کہاں سے آیا تو معلوم ہوگا کہ یہودی روایت میں اس لڑکی کا نام استھر (Estehar or Esstuar) بتایا گیا ہے جو دراصل قدیم اہل بابل کی دیوی اشتار (Ishtaar) تھی اور جس کی پرستش شام و فلسطین میں اشتوریث (Ashtoreth) کے نام سے ہوتی تھی۔ یہ عشق و محبت کی دیوی جس کا نام یونانیوں میں آفرودایت (Aphrodita) اور رومیوں میں وینس (Venus) تھا۔ پھر چونکہ اسی دیوی کو سیارہ وینس (Venus) بھی بتایا جاتا تھا جسے اہل عرب زہرہ کہتے ہیں، اس لئے یہ آسانی خیال میں آسکتا ہے کہ عربی روایتوں میں فرشتوں کی بہکانے والی لڑکی کا نام زہرہ کس وجہ سے رکھا گیا۔ کیونکہ جس طرح زہرہ کا آسمان پر چلا جانا بیان کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح بابلی و آشوری روایات قدیمہ میں اشتار دیوی کے متعلق ظاہر کیا جاتا ہے۔

اہل بابل کی قدیم روایت ہے کہ اشتار (یعنی وہی دیوی جسے رومیوں میں وینس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جسے اہل عرب زہرہ کہتے ہیں) ایک مرتبہ کسی بہادر شخص گلگامیش پر فریفتہ ہوگئی لیکن جب وہ کسی طرح مایل نہ ہوا تو ناراض ہوکر آسمان پر چلی گئی اور خداوند انو کے حضور میں حاضر ہوگئی۔

اسی قسم کا ایک قصہ مہا بھارت میں بھی پایا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں دو بھائی سندا اور اپسندا تھے جو بہت بڑے مرتاض تھے۔ برہما نے اُن کی آزمائش کے لئے ایک حسین لڑکی پیدا کی جس کا نام تلوتما تھا۔ دونوں بھائی اس کو دیکھکر فریفتہ ہوگئے اور جوش رقابت میں باہم لڑکر فنا ہوگئے۔ اس کے بعد تلوتما برہما کے پاس واپس چلی گئی اور برہما نے اس کو برکت دی کہ "تمام دنیا میں تو گردش کرتی رہیگی اور کوئی شخص تیرے حسن و جمال کی درخشانی کو نظر جماکر نہ دیکھ سکے گا"۔ سنسکرت کی اس روایت سے بھی اس عورت کا سیارہ ہوجانا یا کسی سیارہ کو عورت سے تعبیر کرنا ظاہر ہوتا ہے۔

الغرض ان تمام بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف عیسوی و یہودی بلکہ قدیم بابلی و آشوری، ایرانی و ہندی، یونانی و رومی لٹریچر میں ایسی روایات موجود تھیں جن سے فرشتوں کا آسمان سے اتر کر ایک عورت کی محبت میں آلودہ ہوجانا مستنبط ہوسکتا تھا اور غالباً عہد نبوی سے قبل یہودیوں میں یہ داستان رائج تھی جسے مسلمان مفسرین

اور رواۃ احادیث نے ہاروت و ماروت والی آیت سے متعلق کرکے اسی شان کے ساتھ بیان کر دیا، دراں حالیکہ خود کلام مجید میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اسم اعظم کا خیال کہاں سے پیدا ہوا۔ سو اس کا ماخذ بھی یہودی روایت ہے کیونکہ اُن کے یہاں یہ اعتقاد پایا جاتا تھا کہ جو شخص خدا کا اسم اعظم (Tetragrammaton) جانتا ہے وہ بڑے بڑے کام انجام دے سکتا ہے۔ چنانچہ یسوع مسیح کے متعلق بھی بعض یہودی مصنفین نے لکھا ہے کہ وہ خدا کا یہی نام لیکر معجزے دکھایا کرتے تھے۔

قرآن شریف میں ہاروت ماروت والی آیتوں کے سلسلہ میں ایک آیت یہ بھی ہے کہ:۔ فیتعلمون منہما ما یفرقون بہ بین المرء و زوجہ (یعنی لوگ ہاروت و ماروت سے ایسی بات سیکھ لیتے تھے جس سے میاں بیوی میں باہم جدائی پیدا کر دیتے تھے) ـــ

اس کے متعلق مخالفین اسلام کا خیال ہے کہ یہ صحیفہ ادریس سے لیا گیا ہے جس میں باغی فرشتوں کا ذکر کرتے ہوئے قصہ کا سلسلہ اس طرح جاری رکھا گیا ہے کہ:۔

"انھوں نے اپنے لئے بیویاں پسند کریں اور انھوں نے ان عورتوں کو سحر بتایا اور جنتر منتر وغیرہ سکھایا علاوہ اس کے زیور اور اسباب زیبائش و آرائش طیار کرنا بھی بتایا"

اب اس سلسلہ میں اسلامی نقطہ نظر سے دو باتیں غور طلب ہیں ایک یہ کہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں جو ہاروت ماروت کا ذکر ہے آیا اس کی حقیقت وہی ہے جو عام مفسرین نے بیان کی ہے (اور جس کا خلاصہ ابتدا مضمون میں دیدیا گیا ہے) یا کچھ اور۔ دوسرے یہ کہ اگر تفسیر والوں کے اس بیان کو درست سمجھ لیا جائے تو پھر علمار اسلام کیا جواب دیں گے ان تمام اعتراضات کا جو تحقیق سابق کے سلسلہ میں وارد ہوتے ہیں اور اگر کوئی اور مفہوم ہے تو اس کا متعین کرنا ضروری ہے۔ میں نے کلام مجید کا جو مدعا ان آیتوں سے سمجھا ہے اس کے اظہار کو میں فی الحال ملتوی رکھتا ہوں نہ صرف اس لیے کہ میں اس کے بیان پر مکلف نہیں ہوں بلکہ اس بنا پر بھی کہ میں غالباً (علمار کرام کے نقطۂ نظر سے) کافر و ملحد ہو کر اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔

بہر حال میں سب سے پہلے علمار کرام سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے ان آیات کی شان نزول کیا قرار دی ہے، ان کے نزدیک ان آیات کا کیا مفہوم و مدعا ہے، ہاروت ماروت کے باب میں ان کی کیا تحقیق ہے، زہرہ و اسم اعظم کے باب میں وہ کیا فرماتے ہیں اور پھر اگر ضرورت ہوئی تو بتاؤں گا کہ میں کیا سمجھتا ہوں اور کس مفہوم پر مطمئن ہو سکتا ہوں۔

جذبات بھاشا ۱۲ر تاریخ ۸ر فراست التحریر مکمل ۸ر خواب و خیال ۸ر زہر عشق ۸ر "مینیجر نگار لکھنؤ"

کیا عیسیٰ ہندوستان کی تامیل قوم سے تھے؟

"یہودیوں کا اصل وطن ہندوستان ہے" - یہ وہ خبر تھی جو ایک یہودی عالم نے ارسطو کو دی تھی، لیکن چونکہ عیسائی ماہرین الہیات اس حقیقت کو نظر انداز کر چکے ہیں، اس لئے وہ انجیل مقدس کو متعدد مبہم و مشتبہ واقعات سے لبریز پاتے ہیں جن کی توضیح ان کے امکان سے باہر ہے۔ چنانچہ ذیل میں ہم صرف دو واقعات بیان کرکے اس کی وضاحت کریں گے۔

(۱) متی باب ۱۴ آیت ۹ اور مرقس باب ٦ آیت ۱۴ میں ہیروڈ آنٹی پاس کو (جو ایک ٹیٹرارک تھا اور جو عیسیٰ کے مقدمے میں رومی گورنر پیلاطس کے حکم سے منصف مقرر ہوا تھا) بادشاہ کے خطاب سے یاد کیا گیا ہے، درانحالیکہ رومی حکومت میں ایک صوبے کے صرف چوتھائی حصے کے حاکم کو ٹیٹرارک کہتے تھے اور یہ حاکم صوبہ کے گورنر کا ماتحت ہوتا تھا۔ اس لئے یہ امر غور طلب ہے کہ انجیل میں ایک ماتحت افسر کو کیوں بادشاہ کے لقب سے یاد کیا گیا جبکہ وہ بادشاہ نہ تھا۔

(۲) عہد آخر کے مغربی مصنفین نے ہیروڈ آنٹی پاس کے باپ ہیروڈ اعظم کو (جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے ولادت مسیح پر معصوم بچوں کا بالکل اس طرح قتل عام کیا تھا، جسطرح کامسا نے کرشن جی کی پیدائش پر) کیوں اعظم کا خطاب دے رکھا ہے جبکہ کوئی ایسی شہادت بھی موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ اعظم جیسے خطاب کا اہل تھا؟ ایسی بین غلطی کیوں کی گئی اور کیوں کی جا رہی ہے؟

اب ہم دیکھیں گے کہ علماء مغرب ان دو معموں کو واضح کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا بیبلیس بائبل میں جو فینڈال بارنس کی ادارت میں شائع ہوئی ہے صفحہ ۴۷۳ پر مرقوم ہے کہ باوجود ان تمام ایضاحی کوششوں کے جو آلفورڈ، وھیڈن وغیرہ نے کی ہیں ناقدین اب تک سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انجیل کیوں متواتر ہیروڈ آنٹی پاس کو بادشاہ کہتی ہے جبکہ وہ یقیناً بادشاہ نہ تھا بلکہ رومی گورنمنٹ کا ایک معمولی افسر ٹیٹرارک تھا۔

سوال دوم کے متعلق ایوالڈ کا خیال ہے کہ ہیروڈ کے ساتھ اعظم کی نسبت غالباً اس کے سکوں کو دیکھکر دی گئی ہوگی لیکن مسٹر ماڈن اپنی کتاب دی جوکش کوائنیج میں لکھتے ہیں کہ ابتک کہیں ایسے سکہ کا نشان نہیں ملا جس پر اس بادشاہ کے نام کے ساتھ لفظ اعظم بھی پایا جاتا ہو۔ ماڈن اور مورسین کی رائے یہ ہے کہ

[redacted]

ہیرودؔ کو اعظم کا خطاب اس لئے دیا گیا کہ وہ ہیرودؔ خاندان کے دیگر اراکین صغار میں ممیز نظر آئے لیکن ایسے محل پر لفظ اکبر (ELDER) استعمال کیا جاتا ہے نہ کہ اعظم (GREAT) اسلئے یہ رائے بھی درست نہیں معلوم ہوتی۔

یوروپین مصنفین ان معموں کو حل کرنے سے اس لئے قاصر ہیں کہ وہ اس سرزمین کی جانب متوجہ ہوتے ہی نہیں جس کی نسبت ارسطو کے مخبر نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ قوم یہود کا وطن اصلی ہے۔ اب اس خبر کی مدد سے (جو ارسطو کے شاگرد رشید کلیارکس آف سولی اور مشہور و معروف یہودی مورخ جوزفس کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہے) ۱۹۲۳ء میں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ فلسطین درحقیقت جنوبی ہند کی ایک نوآبادی تھی اور نہ صرف یہ بلکہ یہودی زبان عبرانی دراصل قدیم تامیلی زبان تھی اور آرامی جو عیسےٰ کی مادری زبان تھی اور بعد میں آرادام کہلانے لگی حقیقت میں جدید تامیلی زبان تھی۔ کیمبرج ہسٹری آف اینشنٹ انڈیا کی جلد اول میں صفحہ ۵۹۲ پر پروفیسر ہنٹ تحریر فرماتے ہیں کہ باعتبار روایات قدیمہ چونکہ گجرات کسی وقت دراوڈین قوم ہی کا مسکن تھا اس لئے جنوبی ہند اور فلسطین کے دو مستند شہروں کا ایک ہی نام یعنی سالم سے موسوم ہونا اور گجرات کی ایک ریاست اور مغربی ایشیا کے ایک ملک کا جس میں قوم یہود اپنے وطن سے ہجرت کرکے آباد ہوئی تھی ایک ہی نام بالیٹا یا پالستانا ہونا جو تامیلی اور سنسکرت شکلیں ہیں پالسٹائن (یا فلسطین) کی محض اتفاق پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات مسلم ہے کہ کسی نوآبادی کے حالات سے کامل طور پر واقف ہونا محال ہے جب تک اس کے وطن اصلی کا بغور مطالعہ نہ کیا جائے اور اسی اصول کے ماتحت اگر فلسطین کے متعلق تحقیق کی جائے تو انجیل کے بہت سے معمے حل ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کو مدنظر رکھکر اب ہم بتائیں گے کہ انجیل میں ہیرودؔ آنٹی پاس کو بادشاہ کیوں کہا گیا ہے جبکہ وہ محض ایک ٹیٹرارک تھا۔ اگر ہم توریت مقدس کی تفاسیر سے مدد لیں تو معلوم ہوگا کہ ایزاکیل نے جلد ۳۸ صفحہ ۲ و ۳ پر اور جلد ۳۹ صفحہ ۱ پر ہیرودؔ آنٹی پاس کا خطاب دیا ہے جس کے معنے انگریزی مترجمین بائبل نے شہزادہ خاص کئے ہیں اور چونکہ عبرانی اور آرامی تامیلی زبان کی مختلف شکلیں تھیں اس لئے لفظ روس کا تامیلی لفظ راسا یعنی بادشاہ ہونا بھی واضح ہو گیا۔ نیز توریت مقدس میں اس لفظ کے استعمال سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ لفظ اس وقت عام طور پر رائج تھا کیونکہ کتب سماوی عوام و خواص دونوں کی ہدایت کے لئے نازل کی جاتی ہیں لہذا اگر ان میں ایسے الفاظ مستعمل ہوں جو عوام کی سمجھ سے بالاتر ہوں تو مقصد نزول ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اب ذرا اپنی توجہ جنوبی ہند کی جانب منعطف فرما کر ملاحظہ کریں کہ اب بھی جبکہ یہاں انگریزی راج قائم ہے لوگ احتراماً والیان ریاست کو راسا کہکر خطاب کرتے ہیں حالانکہ وہ صحیح معنوں میں

بادشاہ کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں۔ بالکل اسی طرح اگر فلسطین یعنی جنوبی ہند کی ایک نوآبادی میں ہیروڈ آنٹی پاس کے زیر اقتدار لوگ اپنے وطن اصلی کے رواج کے مطابق اسے راآسا (روس یعنی بادشاہ) کہکر خطاب کرتے ہوں تو جائے تعجب نہیں یونانی مترجمین بائبل نے جب آرامی زبان کی انجیل میں ہیروڈ انٹی پاس کے نام کے ساتھ روس کا خطاب دیکھا تو انھوں نے یونانی تراجم متی ومرقس میں اُسے بادشاہ ہیروڈ آنٹی پاس لکھدیا اور ان کی پیروی دیگر یوروپین مصنفین نے بھی اپنے ترجموں میں کی۔

مذکورۂ بالا اصول ہی کے ماتحت ہم یہ بھی بتائیں گے کہ مغربی مصنفین نے ہیروڈ آنٹی پاس کے باپ ہیروڈ اعظم کو کیوں اعظم کا خطاب دیا جبکہ ایسا کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی وجہ موجود نہ تھی۔ تامیلی زبان میں راآسا بمعنی بادشاہ اور مہاراآسا بمعنی بڑا بادشاہ آج کل عام طور پر بولے جاتے ہیں لیکن اسی زبان کی لغات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو ایسا بھی کہتے ہیں اور مہیسا یا مہاایسا کے معنے مہاراآسا کی طرح بڑے بادشاہ کے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ سنسکرت ہے اور تامیل زبان میں اس کا تلفظ مگیسا ہوتا ہے۔ آج بھی عام طور پر لوگ شیو کو مہیسا کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ کائنات کا سب سے بڑا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ بھی عہد قدیم میں زبان زد عام تھا۔ اور جس طرح لوگ ہیروڈ آنٹی پاس کو تعظیماً راآسا کہتے تھے اسی طرح ہیروڈ اعظم کو تعظیماً یا تملقاً مگیسا کہتے تھے۔ اور جسطرح راآسا روس بنگیا اسی طرح مگیسا مگاس ہوگیا۔ چنانچہ جوزفس نے اپنی تاریخ میں ہیروڈ اعظم کو میگاس ہی کا خطاب دیا ہے اور جس طرح ہیروڈ آنٹی پاس یونانی مترجمین کی وساطت سے مغربی مصنفین میں بادشاہ مشہور ہوگیا۔ اسی طرح اس کا باپ ہیروڈ میگاس (اعظم) کہلانے لگا۔

اراٹا تامیلی لفظ ہے اور اس کے معنے بادشاہ کے ہیں اور بقول مشہور مستشرق مسٹر برنل یہی لفظ اب ریڈی کی صورت میں جنوبی ہند کی طرف رائج ہے گو انگریزی حکومت کے دفتر میں اس لفظ سے گاؤں کا پٹیل مراد لیا جاتا ہے لیکن اس لفظ کے اصلی معنے بادشاہ ہیں اور اگلے وقتوں میں یہ لفظ اسی معنے میں استعمال ہوتا تھا چنانچہ اب بھی جو لوگ اپنے نام کے ساتھ لفظ ریڈی لگاتے ہیں وہ عام طور پر قدیم حاکم قبیلوں کے پس ماندگان تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جب تامیلی زبان نے فلسطین میں آرامی زبان کا بھیس بدلا تو لفظ اراٹا ہیروڈ کی شکل میں نمودار ہو اس وضاحت کے بعد قارئین کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ہیروڈ خاندان کا مطلب اراٹا خاندان یعنی شاہی خاندان ہوتا ہے۔ اگرچہ آنٹی پاٹر ایک معمولی افسر تھا لیکن جب اس کے بیٹے ہیروڈ اعظم نے خاندان کے نام کو چمکایا اور اسے قابل قدر اہمیت بخشی اور اس کی سوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ جگایا تو اس کے اراکین افتخاراً اپنے لئے (ہیروڈ یا اراٹا یا ریڈی) کا خطاب استعمال کرنے لگے۔

[redacted]

فلسطین چونکہ جنوبی ہندوستان کی نو آبادی تھی اس لئے وہاں لوگوں کے نام بھی عام طور پر ہندوستانی ہی ہوا کرتے تھے لیکن جب سکندر اعظم کی قیادت میں یونانی اس ملک پر قابض ہو گئے اور اپنی حکومت قائم کر لی تو جیسا کہ عموماً محکوم قومیں کرتی ہیں فلسطینیوں نے بھی اپنے حاکموں کا تمدن اختیار کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ سوا تین سو سال بعد یعنی ولادت عیسیٰ کے زمانے تک اکثر و بیشتر فلسطینوں نے اپنے ہندوستانی ناموں کو توڑ مروڑ کر یونانی ناموں یا کم سے کم یونانی الفاظ کے مشابہ بنا لیا تھا اور اس میں یونانی بھی معاون ہو گئے کیونکہ انھیں اپنے محکوموں کے غیر مانوس ناموں کو یاد اور استعمال کرنے سے الجھن ہوتی تھی۔ الغرض اگر ان ناموں سے زمانے اور حوادث کے تغیرات و اثرات کو نظر انداز کر دیا جائے تو ثابت ہو گا کہ یہ الفاظ دراصل ہندوستانی ہیں۔ مثلاً تلاش و جستجو کے بعد جب ہم کو متعدد روایتیں ایسی ملیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنٹی پاٹر کا باپ کسی معبد سے متعلق تھا تو ہم پر فوراً واضح ہو گیا کہ آنٹی پاٹر اور آنٹی پاس دراصل تامیلی آنڈی پاٹر اور آنڈی پا ہیں۔ اور ہیرود آنٹی پاس اور ہیرود میگاس حقیقت میں اراٹا انڈیا اور اراٹا ملیسا ہیں ....

.... بہرحال اگر یوروپین علما بھی بائبل کو اسی روشنی میں دیکھیں جس کے لئے ہم یقیناً ارسطو کے مخبر یہودی عام کے زیر بار احسان ہیں تو انجیل کی بہت سی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔

(کرانکل - سنڈے ایڈیشن) حاجی دادا جدہ والا (بمبئی)

چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کے امن و سکون کا راستہ معلوم کریں تو اس کو ملاحظہ فرمائیے

مادئین کا مذہب

وجود باری کے ثبوت میں بے مثل مضمون

حرکت کے کرشمے

اگر آپ قدرت کے کرشموں کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے ملاحظہ فرمائیں تینوں ایک ہی جلد میں قیمت معہ محصول عہ

تقابلِ حسن

چھیڑ رہا تھا سازِ فطرت، زمزمے تھے بیقرار　　بلبل نغمہ سرا تھی، مایۂ حسنِ بہار
پھول کی ہر پنکھڑی سے ہو رہا تھا آشکار　　ہوشیار اے اہلِ بینش اہلِ عبرت ہوشیار
پتی پتی میں نہاں ہے اضطرابِ آرزو
ذرے ذرے میں درخشاں آفتابِ آرزو

تھا یہی منظر یہی عالم بہارِ صبح کا　　ناگہاں اتنے میں آئی سامنے اک دلربا
شعلہ رو غنچہ دہن سیمیں بدن نازک ادا　　جلوۂ فطرت سمجھئے یا کوئی برقِ بلا
"حسنِ مغرب" تھا عبارت جس سے وہ تشکیل تھی
اختراعِ فائقہ تھی، جدتِ تکمیل تھی !

بید لرزاں کی نزاکت زلفِ برہم سے عیاں　　تھی صباحت کہکشاں کی فرقِ انور میں نہاں
موجِ صہبا کی لطافت چشم و ابرو سے چکاں　　عارضِ گلرنگ پر کچھ کچھ تبسم کا نشاں
آنکھ کی پتلی تھی یا وہ داغ جو لالے میں ہو
یا کہ "ماہِ نیم مہ" ، جو جلوہ گر ہالے میں ہو

عارض شاداب وہ جسمیں رواں رنگِ چمن　　دانت وہ جن پر فدا تابانیِ درِ عدن
جنبش اسکے لب میں یوں ہوتی تھی ہنگامِ سخن　　جس طرح لرزاں نسیمِ صبح سے برگِ سمن
وہ درخشانی تھی اس کی گردنِ پُر نور میں
بجلیاں جیسے بھری ہوں ساغرِ بلور میں

اس کے سینے سے عیاں تھا اس طرح جوشِ شباب　　جس طرح مینا میں اُن بھر دے کوئی رنگِ شباب
ساعدِ سیمیں سے شرماجائے حسنِ ماہتاب　　پنجۂ رنگیں کے ٹپکاتی تھی وہ ہر دم شراب
صد گلستاں درکنار و صد تبسم در نظر
بالبِ خاموش کیف صد تکلم در نظر !

آخر کار آئی میرے پاس بھی وہ فتنہ گر　　اور بے خوف وخطر پہلو میں میرے بیٹھکر
گویا مجھ سے اور خود اپنے سے بھی ہے بے خبر　　اس ادا سے اس نے پھیری ڈالکر مجھ پر نظر
بھینی بھینی، ہلکی ہلکی نکہتیں آنے لگیں
مغربی پھولوں کی روحیں دل کو تڑپانے لگیں!

قربِ حسنِ بے محابا، باعثِ صد جوش تھا　　کچھ زباں سے کہہ نہ سکتا تھا مگر خاموش تھا
ساقیِ رنگیں ادا گو میکدہ بر دوش تھا　　میں مگر احساس ہی سے بے پئے بیہوش تھا!
گفتگوئے شوق کیسی لب تو ہل سکتے نہ تھے
اور کبھی ہلتے بھی تو پھر کھل کے ہل سکتے نہ تھے

میں اسی حیرت میں تھا اتنے میں آئی اک صدا　　یعنی چھیڑے کوئی پنگھٹ پہ ہو نغمہ سرا
مڑکے دیکھا تو کھڑی تھی دوسری اک مہ لقا　　بھر رہی تھی اپنی گاگر بے تصنع، بے ریا!
بال بھی سر کے کھلے آنچل بھی کچھ ڈھلکا ہوا
یعنی بھیگی رات تھی اور جام تھا چھلکا ہوا

اس قدر معصوم ایسی اپنی آن سے بے خبر　　جیسے کچھ ہوتا نہ ہو اس پر نگاہوں کا اثر
بھر کے گاگر جب اٹھایا یوں ہوئی دہری کمر　　جس طرح بل کھا کے جھک جائے کوئی شاخِ شجر
بھیگنے کے خوف سے ساری اٹھائے ہاتھ میں
چھوٹنے کے خوف سے آنچل دبائے گات میں

چشمہ میں سے باہر آگئی وہ خوش ادا　　ہر قدم کی لغزشیں کرنے لگیں آفت بپا
بھڑ گئی اس طرح اس کو چھیڑنے موجِ صبا　　چھٹ گیا آنچل کبھی تو کھل گئی زلفِ دوتا!
غیرتِ دوشیزگی نے اس کو حیراں کر دیا
جانے کیا احساس تھا جس نے پشیماں کر دیا

بن گئیں اس کی نگاہیں مرکزِ صد اضطراب　　دفعتہً پھر جلوۂ رخ آگیا زیرِ نقاب
چال کی شوخی میں بھی پیدا ہوا اک انقلاب　　یعنی کچھ سنجیدگی بھی اس میں تھی اور کچھ تھا عتاب
جھک گئیں میری نگاہیں اس کو حیراں دیکھ کر
دل کی الجھن بڑھ گئی اس کو پریشاں دیکھ کر

ہمنشینِ مغربی نے ہنس کے مجھ سے یہ کہا　　بات بے موقع ہے لیکن اسکو بھی سن لو ذرا

بزدلی ہے اصل میں وہ جس کو کہتے ہیں حیا شرم کہتے ہیں جسے وہ فی الحقیقت ہے ریا
شرم آجائے نظر سے یہ بھی کیا غیرت ہوئی
آنکھ بھی اوپر نہ اُٹھے یہ بھی کیا عصمت ہوئی
طعن کی باتیں سنیں تو آگیا مجھکو بھی جوش سخت لہجے میں کہا میں نے کہ ای جلوہ فروش
اے فروغ سحر باطل ای عدوی عقل و ہوش سن لے ای تو وہ کہ تیری زندگی ہے ناؤنوش
جو نہیں ہے پیکر عصمت وہ عورت ہی نہیں
اور جو عورت نہیں وہ گھر کی زینت ہی نہیں

حافظ غازیپوری

کاجل۔ سرمہ۔ چورن۔ منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کرکے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے۔ دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو۔ سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا ایک شیشی اور بھیج دیجئے۔

کاجل۔ آشوب، سُرخی ضعف بصارت کے لئے از بس مفید ہے ایک ڈبیہ جو ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہے۔ قیمت عہ

سرمہ۔ یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں نہ ممیرہ ہے نہ کوئی معمولی سرمہ ہے جن کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر طیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھوند، موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے قیمت فی پڑیہ عہ علاوہ محصول۔

چورن۔ یہ وہ اکسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد، قبض نفخ ریاح کا پیدا ہونا سوء ہضم، دستوں کا آنا سب یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول۔

منجن۔ اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول

نوٹ:۔ سب چیز منگانے والے کو محصول ڈاک معاف

پتہ:۔ م بیگم ذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ

رباعیاتِ طالب

اے عقدہ کشائے سازِ دیبازِ من و تو　　آتا ہی نہیں سمجھ میں رازِ من و تو
تو مجھ سا نہ بن مجھے بنا لے خود سا　　آخر کب تک؟ یہ امتیازِ من و تو!

مدہوشِ خیال کس طرف بہکا ہے؟　　دنیا کو پسِ نقاب کیا سمجھا ہے؟
تیری ہی نگاہ نور بکھیر دیتی ہے　　ہر مہر فریب، ہر قمر دھوکا ہے!

ہر رنگِ فریب کو حقیقت سمجھا　　ہر درد کو بیخودی میں راحت سمجھا!
اُف ہوش گنوا کے دل نے سمجھا بھی تو کیا　　تقدیر کے کھیل کو "محبت" سمجھا!

ہوگی دُنیا "سرائے فانی" ہوگی　　ہر چیز یہاں کی "آنی جانی" ہوگی
باتوں میں نہ کاٹ، رات ہی کتنی ہے!　　یہ سوچ کہ کل کہاں "جوانی" ہوگی!

تقویمِ جہاں کے انقلابات — فریب!　　تنظیمِ ازل یہ اہتمامات — فریب!
اپنے ہی کو دیکھ، اپنا ماحول نہ دیکھ　　تو خود ہے فریب، تیری ہر بات فریب!

ہر لمحہ عذاب، عمرِ فانی کے لئے　　ہر فعل گناہ نوجوانی کے لئے!
مطلق غم و درد سے عبارت ہے مگر　　دنیا مرتی ہے زندگانی کے لئے!

طالب باغپتی

نعرۂ سرمدی

کیوں دست فسردہ بیٹھا ہے، چہرے پہ تبسم پیدا کر — جو روح کو زندہ کردے وہ انداز تکلم پیدا کر

اک کشمکش پیہم ہے حیات انسانی خاموش نہ ہو — جب تک نہ پلائے ساقیٔ دوراں جام اجل مدہوش نہ ہو

اُمید سے روشن رکھ دل کو، اُمید شرار ہستی ہے — امید کے دم سے ہی قائم اس دنیا کی ہر بستی ہے

اُمید شکستہ سازوں سے نغموں کے سَیل بہاتی ہے — امید فسردہ روحوں میں تسکین کی شمع جلاتی ہے

سیماب کی برقی خاصیت اجزائے زیست میں پنہاں ہے — کیوں موت کا پیکر بنتا ہے، ناداں تو زیست کا طوفاں ہے

تاچند تذبذب کا عالم، تاچند یہ مہلک خاموشی — مٹ جائے نہ تیرے دل سے کہیں صہبائے عمل کی سرجوشی

معلوم نہیں کیا؟ موت اجل سے ڈرنے کا خمیازہ ہے
مردوں کا لہو ہے جو وہ عروس حیات کے رخ کا غازہ ہے

عدم

(نوٹ) یہ بحر اس قدر نامقبول ہے کہ بڑے بڑے مشاق شعراء بعض اوقات بہک جاتے ہیں۔ اس لئے اُمید ہے کہ عدم صاحب اس قسم کی بحر میں آئندہ بہت زیادہ احتیاط سے کام لیں گے۔ (نیاز)

جواب

نوا میری اگر خوابیدہ روحوں کو جگاتی ہے
مرے نغموں کی لرزش گردوں میں ڈوب جاتی ہے

اگر درس تپش دیتے ہیں شعلے میری آہوں کے
اشارے گر حدیث درد ہیں میری نگاہوں کے

اگر میں غفلتوں میں چھیڑتا ہوں ساز بیداری
اگر میری صدا ہے مرہم زخم زیاں کاری

اگر لیتی ہے مجھ سے چشم انساں درس بینائی
اگر تصویر کو دیتا ہوں میں تعلیم گویائی

سمجھتا ہوں اگر میں نبض فطرت کی پریشانی
مجھے بخشا گیا ہے گر کمال نطق انسانی

اگر میری زباں میں ہے روانی موج ساحل کی
مرے خامہ کی جنبش کھول دیتی ہے گرہ دل کی

مری خلوت کے ذرے شکل انجم گر چمکتے ہیں
اگر اجزائے دانش میری صہبا میں جھلکتے ہیں

اگر میری نگاہیں آشنا ہیں حسن سرمد سے
سحر کو متصل کرتا ہوں گر میں شب کی سرحد سے

اگر دیتا ہوں میں درس حقیقت سطح بینوں کو
اگر میں آسمانوں سے ملاتا ہوں زمینوں کو

اگر صرصر مرے دشت بلا میں گنگناتی ہے
مرے گلشن میں گر سلمائے فطرت مسکراتی ہے

تو میری خستگی کو دیکھ کر اس پر نہ حیراں ہو!
کبھی اے کاش تو بھی محرم اسرار عرفاں ہو!!

چمن کے خار کو غنچے سے بڑھ کر دل کشا کر دے
یہ ہے انعام فطرت جس کو وہ چاہے عطا کر دے

یہ مانا حسن ظاہر میں نہ حصہ مل سکا مجھ کو
نہیں فطرت کی فیاضی سے لیکن کچھ گلا مجھ کو

نہ پایا دخل اس میں شب فشاں اجزائے ظلمت نے
سنوارا ہے مرے باطن کو یوں صناع فطرت نے

ملا تاریکیوں میں دیدۂ حسن آشنا مجھ کو
دیا قدرت نے دل ایسا کہ سب کچھ دیدیا مجھ کو

مری دنیا میں ہے مفقود آئین ریاکاری
مبارک ہو تجھے ارباب دولت کی پرستاری

تجھے طوق غلامی چاہیے جس کو نہ جنبش ہو
مجھے وہ روح آزادی کہ تازہ آفرینش ہو

مری تسکین دل ہے روح کی پیہم پرافشانی
تجھے خوابیدہ رکھتی ہے غلط بیں تیری نادانی

جہاں ہوتا ہے تو بیم و رجائے بندگی یکسر
شکن ہلکی سی بھی پڑتی نہیں واں تیرے ماتھے پر

نہ تو ہوگا نہ یہ عقل آزما بیچارگی تیری
سمجھتا ہے کہ شاید سرمدی ہے زندگی تیری

مگر مجھ کو زمانہ محو کر سکتا نہیں ہرگز!
فنا ہو کر بھی میں نادان! مر سکتا نہیں ہرگز

علی اختر (حیدرآباد دکن)

میرا محبوب

مہ و خورشید جس کی جستجو میں جادہ پیما ہیں
ستارے جسکے شوقِ دید میں حسرت سراپا ہیں
وہ جسکے عشق کے آثار ہر ذرے میں پیدا ہیں
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا

گذر محفل میں جس کی قدسیوں کا ہو نہیں سکتا
ملائک کو کبھی جس کا نظارا ہو نہیں سکتا
وہ — جس کا راز — انسانوں سے رسوا ہو نہیں سکتا
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا

ابد ہے جس کی زلفوں کی سیہ پوشی کے سایہ میں
ازل — جس کی حسین آنکھوں کی مدہوشی کے سایہ میں
محبت، نغمہ گر ہے جس کی خاموشی کے سایہ میں
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا

وہ جس کی بے نیازی ہے نیازِ عشق کا حاصل
وہ جس کی کج ادائی امتیازِ عشق کا حاصل
وہ جس کا شوق ہے، سوز و گدازِ عشق کا حاصل
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا

تصور جس کا تسکین بخشِ احساس و فاکوشی
وہ جس کی یاد کیف سرمدیت سے ہم آغوشی
بقا ہے یاد جس کی اور فنا جس کی فراموشی
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا

جسے میری تمنا ہے مجھے جس کی تمنا ہے!
جسے ڈھونڈا ہے میں نے اور جس نے مجھکو ڈھونڈا ہے
میں جس کے دل کی دنیا ہوں جو میرے دل کی دنیا ہے
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا

جو خود میری طرح مجبورِ بیانِ جدائی ہے
جو مجھ سے دور رہکر خود بھی حیرانِ جدائی ہے
روشش جس کی محبت داغِ حرمانِ جدائی ہے
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا

روشش صدیقی

انتظار کیجئے جنوری ۱۹۳۳ء کے نگار کا جو ۱۶۰ صفحات کو محیط ہوگا اور جس میں وہ کچھ ہوگا جو آپ نے اس وقت تک دیکھا ہی نہیں۔
"منیجر نگار لکھنؤ"

معلومات

ایک گدھا جس نے معدن دریافت کی

گدھوں کی دنیا میں یہ واقعہ غالباً اپنی قسم کا بالکل پہلا واقعہ ہوگا کہ کسی گدھے نے کوئی معدن دریافت کی ہو اور معدن بھی وہ جس کی قیمت کروروں اشرفیاں ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ گدھا اتنے عظیم الشان اکتشاف کے بعد بھی گدھا ہی بنا رہا لیکن اپنے مالک کو جتنا فائدہ پہنچا گیا اس کی مثال انسانی دنیا میں بھی کم ملتی ہے۔

دو شخص اور ورک اور کلوک امریکہ کے مقام ریڈ آہو میں پہاڑیوں میں پھرا کرتے تھے اور کسی معدن کا دریافت کرنا ان کا مقصود زندگی تھا۔ ایک بار انھوں نے وہیں کے کسی آدمی سے گدھا سواری کے لئے کرایہ پر لیا اور اس پر چڑھ کر کسی پہاڑی کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب چلتے چلتے وہ تھک گئے تو ایک جگہ اتر کر آرام کرنے لگے اور گدھے کو چرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ چند گھنٹوں کے بعد جب وہ آرام کر چکے تو انھوں نے پھر آگے چلنے کا ارادہ کیا اور گدھے کو ڈھونڈنے لگے۔ لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ آخر کار کافی جستجو کے بعد یہ گدھا ایک اونچے ٹیلے پر چرتا ہوا دکھائی دیا۔ انھوں نے وہاں پہنچکر اُسے کھینچ کر لانا چاہا۔ لیکن وہ بُری طرح اڑ گیا اور اپنے اگلے سموں سے ٹاپ مارنے لگا۔ اتفاق سے ان دونوں کی نگاہ جو زمین پر پڑی تو دیکھا کہ جہاں جہاں گدھے نے ٹاپ ماری تھی وہاں کچھ ذرات چاندی اور سیسے کے پڑے ہوئے ہیں اور اس طرح وہ دنیا کی عظیم الشان معدن دریافت ہوئی جس کا نام "Bunker mine and Sullivan mine" ہے۔ اس واقعہ کے بعد معدن کی ملکیت کے متعلق آپس میں نزاع ہوئی۔ گدھے کا مالک نے اپنی ملکیت کا دعویٰ کیا اور گدھے کے سواروں نے اپنی ملکیت کا جس کا فیصلہ ۱۸۸۵ء میں عدالت نے یہ کیا کہ نصف نفع گدھے کے مالک کو ملنا چاہئے۔ چنانچہ گذشتہ سال تک اسّی لاکھ اشرفیاں بصورت نفع گدھے کے مالک کو مل چکی ہیں۔

انسانی آبادی کی حقیر وسعت

کسی سے کہو کہ کرۂ زمین کے تمام باشندے اگر جمع کرکے صف بصف اوپر نیچے کھڑے کئے جائیں تو ان کے لئے نصف میل مکعب سے زیادہ جگہ درکار نہ ہوگی تم سمجھتے ہو کیا وہ اس کا یقین کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے۔

نصف مکعب میل کے معنی یہ ہیں کہ اُس میں اٹھارہ ارب اٹھالیس کرور ستانوے لاکھ چوالیس ہزار مکعب فیٹ پائے جاتے ہیں۔ اچھا اب فرض کرو کہ ہر انسان کے لئے ہم اوسطاً چھ فٹ لمبی دو فٹ چوڑی اور

ایک فٹ عمیق جگہ کی ضرورت ہے تو نہایت آسانی سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی ایسی مکعب جگہ میں جس کے ایک ضلع کا طول نصف میل ہو ایک ارب پچاس کرور انسان سے زیادہ سما سکتے ہیں۔

کاغذی دودھ

حال ہی میں ڈنمارک کے کسی کاشتکار نے ایک عجیب وغریب اختراع غذا کی دنیا میں کی ہے یعنی وہ دودھ کو کاغذ کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے جو بہت عرصہ تک خشک ومحفوظ رکھا جا سکتا ہے اس کا بیان ہے کہ اگر اس کے اصول کے مطابق ورق شیر طیار کئے جائیں تو وہ سالہا سال تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اسی قسم کا ایک ورق گرم پانی کے ایک پیالہ میں ڈالنے سے نہایت نفیس دودھ تیار ہو گیا جو مزہ اور خوشبو میں بالکل تازہ دودھ کی طرح تھا۔ اب ڈنمارک میں مستقلاً ایک کمپنی اس صنعت کے لئے قائم کی جا رہی ہے۔ جس میں یہ کاغذی دودھ تیار کیا جائیگا اور ڈبوں میں بند کرکے دنیا کے تمام بازاروں میں بھیجا جائے گا۔

جاپان کی آبادی کا حیرت انگیز نشوونما

جاپان میں جس نسبت سے انسانی آبادی بڑھ رہی ہے اُس کی مثال کسی اور ملک میں نظر نہیں آتی۔ گذشتہ سال وہاں کی مردم شماری سے یہ تحقیق ہوا ہے کہ صرف جزیرۂ جاپان میں اس وقت چھ کروڑ چالیس لاکھ چار ہزار انسان آباد ہیں۔ جاپانی نوآبادیوں کی آبادی اس کے علاوہ ہے۔ ۱۹۲۵ء میں جتنی آبادی جاپان میں پائی جاتی تھی اس میں اب سینتالیس لاکھ تیرہ ہزار ایک سو اسی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے اتنی ہی مدت میں صرف سینتیس لاکھ تیرہ ہزار سات سو اتھتر آدمیوں کا اضافہ ہوا تھا۔ جاپان میں ہر سال تقریباً سولہ فی ہزار کا اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اقتصادئین کی رائے ہے کہ جاپان کی آبادی بہت جلد دس کرور تک پہنچ جائے گی اور دول کبریٰ میں آبادی کے لحاظ سے اس کا تیسرا درجہ ہو جائیگا۔ لیکن اسی کے ساتھ جو اقتصادی مشکلیں پیدا ہو جائیں گی وہ بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہیں اور غالباً یہی وہ خیال ہے جو جاپان کو چین کے خلاف جنگ کرنے اور منچوریا میں اپنے اثرات وسیع کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

آئندہ جنوری ۱۹۳۳ء کا رسالہ نگار وقف ہوگا ایک ایسے موضوع کے لئے جس پر اردو میں اس وقت تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

مینیجر رسالۂ نگار لکھنؤ

ادبِ اُردو کا مکمل ذخیرہ

تاریخ اردوئے قدیم | وہ مکمل جامع تاریخ ہے جس میں زبانِ اردو اور اسکی نظم و نثر کی مفصل اور مکمل تاریخ اور عہد بعہد کی ترقیوں کا مکمل تذکرہ ہے زمانہ ابتدائی زبانِ اردو سے لیکر بارہویں صدی ہجری کے نصف اول تک کا ذکر اور اسی کے ضمن میں تمام شعراء اور مصنفین کے نہایت صحیح اور مفید دلچسپ حالات بھی تحریر ہیں جس کو حکیم سید شمس اللہ قادری ماہر علوم آثار قدیمہ نے عربی فارسی اردو انگریزی فرانسیسی جرمنی وغیرہ کی مشہور مستند کتابوں سے اخذ کر کے مرتب و مدون کیا جو ۱۹۲۵ء سے عثمانیہ یونیورسٹی کے امتحان ایم اے میں بھی داخل ہے قیمت عہ

تاریخ ادبِ اُردو | یعنی ہسٹری آف اردو لٹریچر کا اردو ترجمہ جسمیں نظم و نثر کی تدریجی ترقیوں کو اس حسن و خوبی کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ اس سے بہتر آج تک کسی کتاب میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ خوبی یہ ہے کہ دور اول سے لیکر زمانہ حال تک کے تمام شعراء اور نثر نگاروں کے واقعات زندگی اور انکی سوانح کو بھی انتہائی شرح و بسط کے ساتھ دکھایا گیا ہے ساتھ ہی ساتھ تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے۔ دو جلدیں ہیں ایک جلد میں نظم اور دوسری میں نثر کا تذکرہ ہے تقریب تقریب سو مصنفین کی تصاویر بھی اسمیں دی گئی ہیں۔ اور ایک تذکرہ بھی شامل کیا گیا ہے اس میں دوسرے تذکروں کی غلطیاں بھی دکھائی گئی ہیں چھپائی اس قدر مرغوب ہے کہ دیکھکر جی خوش ہوتا ہے قیمت لعہ

تذکرۃ الخواتین | اردو اور فارسی کی نہایت مشہور و معروف شاعرہ عورتوں کا جامع تذکرہ ہے۔ بہترین کلام کا تذکرہ ہے اور عورتوں کا کوئی تذکرہ اس سے بہتر نہیں دیکھا گیا قیمت عہ

دیوان خواجہ میر درد | خواجہ میر درد کے کلام کو نہایت صحت کے ساتھ نہایت قدیم نسخوں سے ملا کر چھاپا گیا ہے شروع میں خواجہ صاحب کا تذکرہ اور ان کے شاگردوں کے جامع حالات مقدمہ میں درج ہیں قیمت ۱۲ار

مذاہب الاسلام | ایک خاص قسم کا تذکرہ ہے جسمیں مسلمانوں کے تمام فرقوں کے حالات و عقاید کا نہایت تفصیل اور تشریح کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر اس فن میں کوئی کتاب نہیں ہے نہایت دلچسپ کتاب ہے قیمت للعہ

سخن شعراء | مولوی عبد الغفور صاحب نساخ کا لکھا ہوا اردو شعراء کا نہایت جامع تذکرہ ہے اور مشکل سے اسمیں اس زمانہ کے شعراء چھوٹے ہیں۔ جابجا کلام کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے نہایت عمدہ اور نایاب تذکرہ ہے قیمت عہ

تذکرہ حسینی فارسی | اس قدر بہترین اور دلچسپ تذکرہ ہے کہ شاید اس کی نظیر فارسی کے کسی دوسرے تذکرہ میں آپ کو نہ مل سکیگی شعراء کے حالات اور کلام کے علاوہ جس قدر لطائف اُنسے متعلق ہیں وہ بھی لکھدیے گئے ہیں یہ تذکرہ زمانہ عالمگیر بادشاہ میں لکھا گیا تھا قیمت ۱۱ر

تذکرہ گلشن بیخار | نواب مصطفٰے خاں مرحوم کا مشہور اور مقبول اردو شعراء کا زبان فارسی میں تذکرہ ہے قیمت ۱۰ار

انتخاب نادرہ | تمام شعراء کے بدیع اور لطیف لطائف کو تواریخ کی کتابوں سے انتخاب کر کے لکھا گیا ہے قیمت سہر

المشتہر
منیجر نولکشور پریس صیغہ بکڈپو لکھنو

اعتراض - پہلا حُسن تو اس شعر کا یہ ہے کہ مصرع اولیٰ پڑھا نہیں کہ یہ مصرع یاد آگیا ؎

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۴) متعلق تھے اسی وجہ سے اودھ کے شاہی خاندان کی معیت میں ولایت گئے اور اس کے بعد ۱۲۸۵ھ میں مٹیا برج کلکتہ چلے گئے اور وہیں تعلیم و تربیت کی بنیاد پڑی - انیس برس کی عمر میں کلکتہ سے واپس ہوئے اور لکھنؤ چلے آئے بیس سال کی عمر میں شادی ہوئی اور پھر دہلی تشریف لیجاکر مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی سے علم حدیث کی تکمیل کی ۱۸۸۰ء میں اودھ اخبار میں ملازم ہوئے - شباب کا جوش - قلم میں قدرت - دل میں اُمنگ - نظر میں وسعت موجود تھی جو لکھتے کم تھا ——— ایسے ایسے چوٹیلے مضامین لکھے کہ پڑھنے والے پھڑک پھڑک اُٹھے - صلہ بھی دلخواہ ملا - کہ یہی مضامین شہرت ابدی کے سنگ بنیاد ہوگئے - پھر ایک رسالہ محشر نکالا - اُس سے اور قیامت ڈہائی ایسی علمی ادبی خدمتیں کیں جن کی آج تک زمانے میں دہوم ہے - آپ کی مفصل سوانح عمری مختلف رسالوں میں چھپ چکی ہے آپ نے ۱۹۲۶ء میں انتقال فرمایا -

سب سے بڑا اہم واقعہ جو آپ کی ادبی خدمات کی زندگی میں نمایاں درجہ رکھتا ہے وہ یہ تھا کہ پنڈت برج نرائن چکبست نے ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۴ء میں مثنوی گلزار نسیم پر ایک مقدمہ لکھکر چھپوایا - مولانا اس زمانے میں دلگداز نکالتے تھے بحیثیت اڈیٹر کے آپ کی خدمت میں بھی یہ مثنوی پیش کی گئی آپ نے اس کو دیکھکر نسیم کے طرز کلام اور مثنوی کے بعض اشعار پر اعتراض کئے اس مثنوی کے مقدمہ لکھنے اور اس کو عمدہ حیثیت سے پیش کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ منشی سجاد حسین مرحوم اڈیٹر اودھ پنچ کا تھا جو چکبست کے بڑے دوست تھے - اُن کو مولانا کے اعتراض دیکھکر تاب نہ رہی پہلے تو جواب لکھا اور اس کے بعد اودھ پنچ کے ذریعہ سے وہ ہنگامہ برپا کیا کہ تمام ملک میں شور بلند ہوگیا - اُنھوں نے اعتراض کا تانتا باندھ دیا - اور مولانا شرر کی ادنیٰ و اعلیٰ نظم و نثر غرضکہ تمام تصانیف کو کسی نہ کسی طرح سے مجروح کیا انھیں میں سے (بدرالنساء اور اس کی مصیبت) مولانا کا ایک ناول ہے جو پردے کے خلاف لکھا گیا تھا اُسپر بھی قلم اُٹھایا -

منشی سجاد حسین

۱۸۵۶ء بمقام کاکوری میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کرکے کیننگ کالج لکھنؤ میں ایف اے کی تعلیم میں مصروف ہوئے - مگر طبیعت کے جوش نے پڑھنے سے بیزار کردیا ؎

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل ——— کچھ اور چاہئے وسعت مری بیاں کے لئے

طالب علمانہ زندگی کی زنجیریں توڑکر فیض آباد پہونچے - فوج میں اُردو پڑھانے پر ملازم ہوگئے - مگر ازلی منشی اور فطری انشاء پرداز کو معلمانہ زندگی سے نسبت ہی کیا - جی نہ لگنا تھا نہ لگا - اور چند ہی روز میں لکھنؤ چلے آئے - اور اودھ پنچ کی بنیاد ڈالدی جو ۱۸۷۷ء سے لیکر ۱۹۱۳ء تک نہایت شان کے ساتھ نکلتا رہا - سچ یہ ہے کہ اس اخبار نے ظریفانہ خدمات ہی انجام نہیں دیں بلکہ سیکڑوں ادبیانہ نکات اس کے ذریعہ سے حل ہوئے - آخر ۱۹۱۲ء میں منشی صاحب کی (ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۶)

بعد مدت کے پھنسا ہے یہ پُرانا چنڈول

علاوہ اس کے پاکیزگی زبان کا یہ عالم ہے کہ سبحان اللہ خصوصاً (لوگر) ترکیب نے تو شعر میں جان ڈالدی سفید کاغذ - سیاہ کاغذ - تہمن کاغذ - دبیز کاغذ آج تک سنا تھا - یہ (لوگر کاغذ) شرر کے دماغ کی پیپرمل سے بنکر نکلا ہے ہو نہو (لوگر) فرانسیسی زبان کا کوئی لفظ ہے جو بغیر فرانسیسی ڈکشنری دیکھے سمجھ میں نہیں آسکتا اور سئیے خط کے معنوں میں کاغذ کا استعمال کس قدر مناسب ہے یہ خاص لکھنؤ کی مستند زبان ہے - جس کا پتہ گلزار نسیم میں نہیں ملتا - نیز پیامبر کے بدلے پیمبر کتنا فصاحت میں شرابور ہے - مولانا تو لغوی معنوں پر مٹے ہوئے ہیں اسی طرح (پیمبر) کے معنے لغت میں قاصد کے ہیں - سب پر طرہ یہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں ربط کس قدر ہے - ایک گندھی ہے تو دوسرا مولوی -

(مولف) اس میں شک نہیں کہ مولانا شرر کے شعر میں تعقید نہایت بد نما ہے - اس شعر کی نثر یہ ہوگی :—— "لو - بعد مدت کے اگر یار نے کاغذ لکھا —— تو ہائے پیمبر کاغذ میں بھول آیا ہے" - مگر غلط کوئی نہیں ہے - معترض کے اعتراض سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ کاغذ کو خط کے معنے میں صحیح نہیں جانتا - مگر یہ خیال غلط ہے فصحاء کاغذ بمعنی خط اردو میں اور نیز فارسی میں مستعمل کیا ہے گو آج قریب قریب متروک ہے فارسی کی مثال ملاحظہ ہو محمد قلی سلیم ؎

بزندگی بے میراث خوارہم صد بار ۔۔۔ گرفتہ ہمچو کبوتر زمن ہما کاغذ
کند بہار بہ برگ شگوفہ یاد ترا ۔۔۔ چو آشنا کہ فرستد بہ آشنا کاغذ
گماں بری کہ بہم ریخت دفتر افلاک ۔۔۔ زبس بکوئے تو می پرد از ہوا کاغذ

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۵) صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ اخبار بند ہوا اور اس کے چند ہی روز بعد ۱۲۹۳ھ میں منشی صاحب نے بمقام لکھنؤ انتقال فرمایا - تقریباً دو سال تک اخبار بند رہا -

منشی صاحب کو چونکہ چکبست صاحب سے دلی الفت و محبت تھی اور پنڈت برج نرائن صاحب بھی ان کا بزرگانہ اور استادانہ ادب کرتے تھے اس لئے منشی صاحب نے شرر صاحب پر اعتراض کئے اور خود سپر بنکر اُن تمام اعتراضات کی تردید کی جو شرر مرحوم نے چکبست کی ترتیب کردہ مثنوی گلزار نسیم پر کئے تھے - اس میں شک نہیں کہ شرر صاحب کے مقابلے پر منشی صاحب نے ذرا زیادتی سے کام لیا - مگر اس سے اس خلوص کا پتہ چلتا ہے جو انھیں اپنے احباب کے ساتھ تھا - بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خود منشی صاحب ہی نے گلزار نسیم کی ترتیب دیکر چکبست مرحوم کا نام کر دیا تھا - مگر چکبست خود ایک روشن دماغ نوجوان تھے - اس لئے یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی -

اردو میں مثالیں بہت سی مل سکتی ہیں - چنانچہ شاہ ظفر مرحوم لکھتے ہیں :-

قبول رے نہ کہیں مارد ہاڑ یں کاغذ

رہا پیمبر والا اعتراض اس کا جواب دیا جائے تو یہ کہنا کافی ہے کہ جب قاعدہ سے صحیح ہے تو اس پر اعتراض کی کیا وجہ ہے فارسی میں بھی پیامی کے معنوں میں ہے اور اردو میں بھی ملتا ہے - پیارے صاحب رشید لکھنوی جو دور آخر کے ایک مشہور مرثیہ گو تھے اپنی ایک غزل میں پیغمبر کا لفظ اس ترکیب سے لاتے ہیں -

کروں کیونکر نہ تعظیم اس کی جو لائے خط جاناں　　که اکثر ایسے ہی لوگوں میں پیغمبر نکلتے ہیں

مگر حق یہ ہے کہ عرف عام میں چونکہ یہ لفظ نبی مرسل کے لئے خاص ہے اس لئے میں اس کا استعمال ایک قاصد کے لئے نہایت مکروہ جانتا ہوں اور جیسے گھوڑے کا گوشت مصلحتاً اور آدمی کا گوشت کھانا تعظیماً منع ہے - اسی طرح میں شاعری میں اس لفظ کو سمجھتا ہوں - باقی پورے اعتراض میں ظرافت ہی ظرافت ہے -

---

شعر -　　وصف تنگیٔ دہن کا جو لکھا بر کاغذ　　ہو گیا غنچۂ وابستہ سمٹ کر کاغذ

اعتراض - اول تو تنگی دہن میں (ی) کا زور ملاحظہ ہو بس پہی کی طرح لٹکی پڑتی ہے - اور بر کاغذ کی تو لوگر کاغذ سے بھی بڑھی ہوئی ہے آخر بر کاغذ کیا بلا ہے - مولوی صاحب نے تو غالباً بر کے معنے او کے لئے ہیں جس سے کل مصرع کے معنے یوں ادا کئے جا سکتے ہیں - کہ وصف تنگی دہن کا جو لکھا اوپر کا کے - مگر ممکن ہے مولانا کی طبع بکر کا منشا یہ ہو کہ (بر) میں حرف با پر بجائے زبر کے کوئی اور علامت رہے لیکن قا سے مجبور ہو گئے - چنانچہ تنگی دہن، غنچۂ وابستہ اور سمٹ کر کی رعایت بھی موجود ہے -

(مولف) بر کاغذ اگرچہ صحیح ہے - مگر نہایت بھونڈی ترکیب ہے -

شعر -　　دلیہ جھرمٹ دم تحریر کیا شوق نے کیا　　لکھا کچھ بھی نہیں جب پر لکھا دن بھر کاغذ

دیکھئے اس شعر میں کاغذ کس قدر ضروری ہے بس استاد کا مصرع یاد آجاتا ہے ؎

ہے بستاں فارسی ہندی لسوڑا سانپ کا

دوسرے مصرع میں دونوں جگہ لکھا کا الف گندہی کی ٹانگ کی طرح کمزوری کے مرض میں مبتلا ہے بس دبا جاتا ہے - شوق کا جھرمٹ بھی ملاحظہ طلب ہے - نیز آخر میں کیا کتنا فصیح معلوم ہوتا ہے - آخ اس کم بخت شعر کے معنے کیا ہیں -

(مولف) شعر کے معنے یہ ہیں کہ ـــ خط لکھتے وقت دلپر شوق کا ہجوم تھا کہ یہ بھی لکھوں اور وہ بھی لکھوں۔ گرطلب الکل فوت الکل کا مضمون ہوا اور کچھ بھی نہ لکھ سکا۔ اگرچہ شعر کی بندش سست اور خیالات مبتدیانہ ہیں مگر ظاہرا اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔

شعر۔ نامہ بر قتل کئے نوچے کبوتر کے پر ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ اب بھلا بھیجیں گے بولو تمھیں کیونکر کاغذ

اعتراض۔ واللہ مولانا نے اپنے پنجۂ فکر سے کیا شاعری کو نوچا کھسوٹا ہے (بولو) دوسرے مصرع میں خواہ مخواہ دہنسا پڑتا ہے اور کاغذ تو حسب معمول خط کے معنوں میں اس شعر میں بھی استعمال ہوا ہے نسیم کے اس مصرع پر کہ ؎

خاتم کے نگیں بنائے ہوتے

تو شرر کا یہ اعتراض تھا کہ بغیر انھوں نے کے مصرع نامکمل ہے مگر اس شعر کے دوسرے مصرع میں یہ نہ سوجھا کہ بغیر ہم کے مطلب خبط رہتا ہے۔

(مولف) معترض کا اعتراض قابل تسلیم ہے۔

شعر۔ دل سے پھر آیا تو پھر بھیجا پھرا پھر بھیجا ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ یونہی کتنے دنوں کھایا کیا چکر کاغذ

اعتراض۔ واللہ پہلے مصرع کے پھیر پھر سے شعر پھیر کی بن گیا۔ جیسے دوسرے مصرع میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ۔ (کھایا کیا چکر کاغذ) اس شعر میں ایک اور حسن ہے کہ مصرع اولی موزوں پڑھا نہیں کہ بھیجا کا الف ٹوٹی زیرپائی کے تلے کی طرح سٹ سے نکل گیا۔

(مولف) مصرع اولی کو کہنے والے نے اپنے نزدیک بڑی صنعت کے ساتھ کہا ہے مگر افسوس کہ وہ سست ہی رہا۔ الف کے گرنے کا اعتراض اس لئے تو صحیح ہے کہ فصحائے متاخرین نے حروف علت کے گرنے اور دبنے کو معایب شعر میں سے سمجھا ہے اور غلط اس لئے ہے کہ یہ غلط اور ناجائز نہیں حروف علت کا بشرطیکہ وہ اصلی نہ ہوں۔ اردو میں گرجانا لوگوں نے جائز ضرور سمجھا ہے اور اس کی ہزارہا مثالیں موجود ہیں۔

شاعر و تمنا

تمنا صاحب شاعر جناب ذاخر لکھنوی کے بڑے صاحبزادے ہیں اور فی الحال ریاست رامپور میں ملازم ہیں۔ آپ کی لیاقت عربی فارسی کی خاصی ہے۔ شعر بھی اپنے ہم عمروں میں اچھے کہتے ہیں آپکی

ایک نظم (صبح صبح ایک گلوری) کے عنوان سے شایع ہوئی تھی۔ اسپر سجاد حسین صاحب تمنا نے اعتراض کیے ہیں۔

جناب تمنا

مجن صاحب تمنا۔ جناب جاوید مرحوم کے برادر نسبتی ہیں۔ نہایت نیک مزاج خوشگو ہیں اس وقت کوئی چالیس پینتالیس برس کی عمر ہوگی۔ کم از کم بیس پچیس برس سے مشق سخن جاری ہے اعتراضوں سے پتہ چلتا ہے کہ معترض کو شاعری کے متعلق اچھی خاصی فنی معلومات ہے۔

شاعر ؎ کشتی مرادابادی جس میں نفیس صابن

اعتراض ۔ یہ کس طرح موزوں ہو سکتا ہے اور کس طرح تقطیع میں پورا آسکتا ہے ...... میرے خیال ناقص میں آپ کے اس مصرع میں لفظ (آباد) کا پہلا الف جوکہ الف ممدودہ ہے اور جس کی تقطیع میں بجائے ایک کے دو الف لئے جاتے ہیں۔ وہ الف پورا زاید ہے اور تقطیع اس کی یہ ہے ؎ کشتی مُ مفعولُ راد بادیِ فاعلاتن جس مے نَ مفعولُ ۔ فیس صابن فاعِلاتن ۔ اب ملاحظہ ہو کہ اس میں آباد کا پورا الف جوکہ دو الفوں کے برابر ہے تقطیع سے بالکل خارج ہوگیا یانہیں۔ رہی وہ حرکت جوکہ مراد کی دال پر آگئی ہے جسکو آپ غالباً الف وصل کی حرکت سمجھے ہوئے ہیں' وہ اصل میں الف وصل کی حرکت نہیں ہے۔ بلکہ دوسرا ساکن ہونے کی وجہ سے آگئی ہے اس کی مثال مثنوی قلق کے حسب ذیل شعر سے ملاحظہ ہو۔ جناب قلق مرحوم فرماتے ہیں ؎

سب جو عاشق مزاج رہتے تھے عشق آباد اس کو کہتے تھے

مذکورہ شعر جوکہ بحر خفیف میں ہے اس کے مصرعہ ثانی کی تقطیع یہ ہے۔ عشق ابا فاعِلاتن ۔ دِ سکُ کہہ مفاعلن' تے تے ۔ فعلن ۔ دیکھئے اس مصرع میں عشق کا قاف جوکہ دوسرا ساکن حرف ہے اس پر حرکت بھی آگئی ہے اور آباد کا الف ممدودہ بھی دو الف ہوکر آیا ہے۔ بخلاف اس کے آپ کے مصرع میں بعد دال کی حرکت کے ایک الف بھی باقی رہتا ہے اب دوسری مثال ملاحظہ ہو جناب ظریف لکھنوی بحر ہزج میں فرماتے ہیں ؎

برہمن جب سفر سوئے الہ آباد کرتے ہیں

برہمن جب مفاعیلن ۔ سفر سوئے ۔ مفاعیلن' الہ آبا مفاعیلن' د کرتے ہیں ۔ مفاعیلن ۔ دیکھئے اس میں بھی الف ممدودہ کی تقطیع میں دو الف آئے ہیں۔ اب تیسری مثال ملاحظہ ہو ؎

میں اُسے یاد آوں گا وہ مجھے یاد آئے گا

تقطیع ہے اُسے یا۔ مفتعلن، دِ آ دُ نگا۔ مفاعلن، دو بجے یا۔ مفتعلن، دِ آ ئے گا۔ مفاعلن۔ دیکھئے یہ مصرع بھی بعینہ آپ کے مصرع کی مثال ہے۔ یعنی آپ کے مصرع میں جس طرح مراد کی دال دوسرے ساکن حرف الف وصل کے قبل جوکہ الف ممدودہ بعد ہے۔ واقع ہوا ہے۔ اسی طرح اس مصرع میں بھی یاد کی دال آدُ نگا کے الف ممدودہ کے قبل جوکہ الف وصل بھی ہے واقع ہوئی ہے۔ مگر اس مصرع میں بھی یاد کی دال پر حرکت آنے کے بعد دونوں الف تقطیع میں باقی رہتے ہیں خیر ایک قاعدہ تو یہ تھا جس کی مثالیں دی جا چکیں۔ اب رہا دوسرا اسکو بھی پہلے ہی سے بیان کردینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ بعض موقعوں پر حسب ضرورت اور حسب قاعدہ دوسرے ساکن کی حرکت نہیں بھی لی جاتی۔ اور حرف وصل ہی کی حرکت اپنے ماقبل حرف پر باقی رہتی ہے جس کی مثال ناسخ مرحوم کے اس مطلع سے جوکہ بحر مضارع میں ہے پیش کرتا ہوں ملاحظہ ہو۔

ناسخ ؎ دیکھا جو دوپہر کو جلال آفتاب کا آیا دھیان خیال کسی بے نقاب کا

اس مطلع کے مصرعہ اولی کی تقطیع حسب ذیل ہے۔

دیکا جِ۔ مفعول، دو پ ہر کُ۔ فاعلات، جلالاف۔ مفاعیل، تاب کا۔ فاعلن۔ دیکھئے اس مصرع میں جلال کا لام دوسرا ساکن حرف ہے اور آفتاب کا پہلا الف، یعنی الف ممدودہ الف وصل ہے۔ جس کی تقطیع میں دو الف آنا چاہئے تھے۔ مگر یہاں بعد لام کی حرکت کے صرف ایک ہی الف باقی رہتا ہے چنانچہ وجہ اس کی یہی ہے کہ حسب ضرورت اور حسب قاعدہ دوسرے ساکن حرف کی حرکت کو حذف کردیا ہے اور الف وصل جوکہ اتفاق سے الف ممدودہ بھی ہے اُس کی ایک حرکت تو ماقبل حرف پر یعنی جلال کے لام پر آگئی ہے۔ اور دوسرا الف تقطیع میں باقی رہا ہے۔ یعنی لاف تقطیع میں آیا ہے۔ اب اس طریق کی دوسری مثال لفظ مراد آباد کی ملاحظہ ہو۔ سید مجاور حسین صاحب تمنا لکھنوی کا ایک قطعہ تاریخ جوکہ بحر رمل میں ہے۔ اور کنکوے کے متعلق شائع ہوا تھا اُس کے ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

آگرہ۔ میرٹھ۔ مرادآباد میں دیکر شکست وال کے استادوں میں خوب اپنی بڑھائی آبرو

اس مصرع اولے کی تقطیع یہ ہے۔ آگرامے۔ فاعلاتن۔ رٹھ مرادا فاعلاتن، بادمے دے۔ فاعلاتن۔ کر شکست۔ فاعلات۔ اس مصرع کے بھی دوسرے ساکن حرف کی حرکت جو بسبب ممدودہ ہونے کے برابر دو الف کے ہے اس کی ایک حرکت تو ماقبل پر یعنی مراد کی دال پر آگئی ہے۔ اور دوسرا الف تقطیع میں باقی رہا ہے۔ یعنی (دا) رہ گیا ہے۔

تیسری مثال الف غیر ممدودہ کی ملاحظہ ہو جوکہ ایک ہی حرف سمجھا جاتا ہے۔ اور تقطیع میں اس کی حرکت بھی ایک ہوتی ہے۔ یہ الف جب کہ دوسرے ساکن حرف کے بعد الف وصل قرار پاتا ہے اور ضرورت

یہی ہوتی ہے تو دوسرے ساکن حرف کی حرکت کو حذف کرکے صرف ایک اسی الف وصل کی حرکت اس کے قبل جو صرف ہوتا ہے۔ اس پر لے آتے ہیں جیسے منیر مرحوم کی مثنوی کے اس شعر سے جو کہ بحر ہزج میں ہے پایا جاتا ہے۔منیر۔

کیا راہب نے قصد اس بوستاں کا　　نظر آیا وہاں موسم خزاں کا

اس شعر کے مصرع اولیٰ کی تقطیع یہ ہے۔

کیا راہب۔ مفاعیلن۔ ن قصد اس بو مفاعیلن۔ ستا کا فعولن۔ دیکھئے اس شعر میں قصد کی دال دہرا ساکن حرف ہے۔ مگر حرکت اس پر صرف ایک ہی آئی ہے۔ یعنی دوسرے ساکن کی حرکت حذف ہوگئی۔ اور صرف الف وصل کی حرکت باقی رہی۔ مختصر یہ کہ الف ممدودہ کی تقطیع میں ہر جگہ دو الف لئے جاتے ہیں اور غیر ممدودہ کا ایک اور دوسرے ساکن کی حرکت کے لینے یا نہ لینے کا انحصار ضرورت پر ہوتا ہے مگر ان صورتوں میں سے کوئی بھی صورت آپ کے مصرع میں نہیں پائی جاتی۔ اور پورا پورا ایک الف ممدودہ جو کہ دو الفوں کی برابر ہے تقطیع سے خارج ہوا جاتا ہے۔ یعنی دو حرف تقطیع سے زیادہ ہیں۔ ہاں اگر آپ یہ جواب دیں کہ ہم نے مراد آباد نظم کیا ہے۔ یا یہ صورت دیگر مراد آباد بغیر الف مدّہ کے یعنی آباد بروزن فساد نظم کیا ہے۔ تو ہم ان دونوں صورتوں میں مصرع کا موزوں ہونا تو مان لیں گے۔ مگر شہر کا نام غلط ہوجائے گا۔ یعنی شہر کا نام مراد باد۔ یا مرادَ باد نہیں ہے۔ بلکہ مراد آباد بہ الف ممدودہ ہے۔

اعتراض ۲ صابن بھی ہماری نظر سے کسی لغت میں نہیں گزرا۔ ہاں صابون بیشک دیکھا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ نے کسی اردو لغت میں صابن بھی دیکھا ہو۔ اگر صابون کا مخفف ہند ہو کر صابن رہگیا ہے تو پھر مفتوح کیونکر ہوگیا۔

(۳) بحر مضارع مثمن۔ اخرب میں لفظ مراد آبادی کس طرح نظم ہو سکتی ہے یعنی میرے نزدیک لفظ مراد آباد مع یائے نسبتی کے مذکورہ بحر میں کسی جگہ پر نظم ہو ہی نہیں سکتا۔

(مولف) معترض نے اگرچہ تفصیل کی وجہ سے اعتراضات کو غیر معمولی طور پر طویل کردیا ہے۔ مگر اس تطویل کو لاطایل نہ کہنا چاہئے۔ کیونکہ وہ اسی کے ذریعہ سے اپنے اعتراض کو بے انتہا مستحکم کرتے ہوئے چلے گئے ہیں پہلے اعتراض میں جواب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یقینی مصرع معترض علیہ میں الف گیا ہے ———— اور اس کی کوئی تاویل نہیں ہوسکتی۔ اور جو تاویلیں تھیں وہ بھی معترض نے ختم کردی ہیں۔ تیسرا اعتراض پہلے ہی اعتراض کے متعلق ہے۔

دوسرا اعتراض صابُن پر ہے۔ جس میں اگرچہ اعتراض کو واضح نہیں کیا گیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے

اس مصرع میں لفظ صابن بغیر واؤ کے لکھا ہے جو معترض کے نزدیک صحیح نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ یہ لفظ عربی ہے اور دوسری زبانوں میں بھی **مشترک ہے**۔ عربی اور فارسی والوں نے اس کو بغیر واؤ کے **استعمال نہیں کیا**۔

چنانچہ محمد قلی سلیم کا یہ شعر ؎

چناں افراخت تیغ آن فتنہ قامت — بجو نریزی کہ تا روز قیامت

عجب کز دامن دریا رود خوں — زند آنرا صدف ہر چند صابوں

درویش والہ ہروی ؎ گسترده سخن رسا یہ متاب — صابوں زدہ خاک را بصد آب

طاہر وحید ؎ نمد پوش ہم ہست مدفون او — ہر کس رسید ہست صابون او

اردو میں دونوں صورتوں سے مستعمل ہے۔ صابون بواؤ۔ اور صابن بغیر واؤ۔ بضم بائے موحدہ جو معہ واؤ کے مستعمل ہے وہ عربی ہے۔ مثال کے لئے شعور کا یہ شعر دیکھئے جس میں نون کو غنہ کی صورت میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور افیون وغیرہ کا قافیہ بنایا ہے ؎

کرے گا جامۂ عریاں اتنی کو صاف اک دم میں — تمہارا بچہ بھی ہے برش میں تار صابوں کا

دوسرا بغیر واؤ کے مثلاً رنگیں دہلوی کا یہ شعر ؎

جب پڑنے لگیں اُدھر سے صابن کے مول — سونے کی طرح تب سے گیا خوب گھڑا

ممکن ہے کہ اس شعر میں صابوں پڑھا جائے۔ کیونکہ (کے) کی (ے) گرنے سے صابن میں واؤ موزوں ہوجاتا ہے۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس واسطے کہ صابن کے مول پڑنا۔ ایک محاورہ ہے۔ جس کو کنایتہً استعمال کیا جاتا ہے۔ معنی۔ بہت سی جوتیاں پڑنا یے کھاؤ کی پڑنا۔ لہذا صابون بواؤ کہنے سے محاورے میں ایک تصرف ہوجائے گا۔ <u>دوسرا محاورہ بھی موجود ہے</u>۔ جس میں صابون بغیر واؤ (صابن) عام طور سے مستعمل ہوتا ہے۔ شیخ کیا جانے صابن کا بھاؤ۔ اس لحاظ سے (صابن) بغیر واؤ مہند ماننا پڑے گا۔ اگرچہ مہند کی صورتیں اس میں موجود نہیں ہیں۔ مگر ایک شرط کہ اس کے حروف میں کمی بیشی ہوگئی ہے۔ تمام شرائط سے بہت زیادہ ہے۔ اسی خیال سے یہ اعتراض نہ سنگیں ہے۔ اور نہ واجب التسلیم ہے جیسے ہندوستان میں سیکڑوں قسم کا صابن تیار ہوتا ہے۔ اگر ایک لفظ بھی اس کے لئے تیار کرلیا گیا تو کیا نقصان ہوا۔ اسپر اعتراض کیوں کیا جائے

شوکت بخاری - و مرزا فاخر مکین

شوکت تخلص نام محمد اسحٰق تھا۔ بخارا کا رہنے والا تھا۔ پہلے نازک تخلص کرتا تھا اس کے بعد شوکت اختیار کیا

اس کی شاعری کی ابتدا یوں ہوئی کہ جب اسکا باپ جو صرافی کا پیشہ کرتا تھا مر گیا تو اس کے بجائے شوکت دکان پر بیٹھنے لگا۔ اس زمانے میں مرزا صائب کے کلام کی بڑی شہرت تھی۔ ہر شخص کی زبان پر صائب ہی کا کلام تھا۔ شوکت بھی تذکرۃً لوگوں سے کلام سنتا تھا اور لطف اٹھاتا تھا۔ شدہ شدہ طبیعت اور زیادہ لگ گئی تو کبھی کبھی کچھ خود بھی کہہ نکلتا تھا۔ آخرکار مشق بڑھتے بڑھتے کمال پر پہونچگئی اور استاد ہوگیا۔ ۱۱۰۷ھ یا ۱۱۱۱ھ میں انتقال کیا۔ شوکت حالات زمانہ سے کچھ ایسا متاثر ہوا تھا کہ فقیر ہوگیا۔ اور آخر عمر تک فقیر ہی رہا بیان کرنے والے بیان کرتے ہیں کہ شوکت نے جو لباس فقیرانہ فقیری اختیار کرتے وقت پہنا تھا۔ پھر وہ آخر عمر تک نہ اتارا اور وہی اس کا کفن بنا۔ آخر میں لوگوں سے میل جول ترک کردیا تھا۔ نہ بولتا تھا۔ نہ بات کرتا تھا۔ گم سم بیٹھا رہتا تھا۔ کھانے پینے کی یہ کیفیت تھی کہ دو تین دن میں ایک روٹی کا ٹکڑا کھا لیتا تھا۔ مرزا فاخر مکین نے جنکا ذکر پہلے آچکا ہے ان کے اس شعر پہ بےمعنی ہونے کا اعتراض کیا۔

شوکت ؎ کسے می سنجد آں دندان و یاقوت لب ورا | کہ از شبنم بود سنگ و زبرگ گل ترازویش

یعنی۔ وہ شخص اس کے دانتوں اور اس کے یاقوت لب کو تول سکتا ہے جس کے پاس شبنم کے باٹ اور برگ گل کی ترازو موجود ہو۔ اس شعر کو دیکھکر سراج الدین علی خاں آرزو نے یوں بنایا۔

نہ سنجد گوہر دنداں و یاقوت لبش آنکس | کہ از شبنم بود سنگ و زبرگ گل ترازویش

اعتراض مرزا فاخر مکیں - نہ پہلی صورت میں کوئی معنے تھے اور نہ سراج الدین علی خاں آرزو کی اصلاح کے بعد کوئی معنے پیدا ہوئے۔

جواب سودا - صاحبان طبع مستقیم و مالکان ذوق سلیم جانتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں معنے دیتا ہے۔

(مولف) میں نہیں سمجھ سکتا کہ خان آرزو نے شوکت بخاری کے شعر پر اصلاح کیوں دی تھی اور اس کی کونسی خاص وجہ تھی۔ ممکن ہے انھوں نے کہیں اسی طرح لکھا ہوا دیکھا ہو۔ ورنہ بظاہر اس دخل درمعقول کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا۔ رہی فاخر مکین کی تنقید اور سودا کا جواب۔ اس کے متعلق میں کہتا ہوں کہ شوکت کے اصل شعر کے معنوں میں آرزو نے اپنے دخل سے ترقی [illegible] یعنی شوکت نے تو کہا تھا کہ اس کے دانتوں اور یاقوت لب کو وہ تول سکتا ہے جس کے پاس شبنم کے باٹ اور برگ گل کی ترازو موجود ہو۔ مگر آرزو نے بتایا کہ اس شخص کے لئے بھی ان کا تولنا ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ [illegible] نازک ہیں۔ غالباً سودا نے بھی اسی ترقی کو ترقی کہا ہے۔ اب غور فرمایئے فاخر مکین کے اعتراض [illegible] خیال میں وہ بھی صحیح ہے۔ کیونکہ شعر کی بنا محض مبالغہ اور ایک سبب [illegible] خیال پر ہے [illegible] معنی کی شوکت کے اصل شعر میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ کہتا ہے ع

کس [illegible] سنجد آں دندان و یاقوت لب ورا

حالانکہ یہ [illegible] کہیں تو [illegible] جاتے۔ خواہ اُن کے لئے شبنم کے باٹ اور برگ گل کی ترازو مہیا

کی جائے یا کچھ اور ــــ شعر میں جو معنوی سقم تھا اس اصلاح سے وہ تو ضرور دور ہو گیا - اس لحاظ سے مرزا فاخر مکین کے اعتراض کو صحیح ماننا پڑے گا - غالباً یہی وجہ ہے کہ سودا نے جواب دینے میں چشم پوشی کی ہے اور تائید زبانی کے سوائے کوئی تشریح نہیں کی -

---

ملا شیدا و ملا فیروز

ملا شیدا کے اسلاف فرقہ تکلّو سے تھے جو اصل وطن مشہد مقدس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہکر ہندوستان میں آئے تھے - اور یہاں فتحپور سیکری میں سکونت اختیار کر لی تھی - ملا شیدا کا مولد و منشا یہی قصبہ ہے - تعلیم و تربیت پانے کے بعد ملازمان شاہ جہانگیر میں داخل ہوا - اور احدیوں کے زمرہ میں منسلک ہو گیا - عبدالرحیم خانخاناں کے مداحوں میں بھی رہا جس کے عوض میں ایک گرانقدر صلہ حاصل کیا - آخر میں کشمیر جاکر عزلت گزیں ہو گیا - اور یہیں ۱۰۸۰ھ میں رحلت کر گیا - شیدا نہایت زبردست نقاد اور سخن سنج تھا - تذکرے والے لکھتے ہیں کہ ایک لاکھ شعر اس سے یادگار ہیں - مگر متفرق کلام کے سوا کوئی پورا دیوان نہ مرتب ہو سکا - اور نہ کہیں ملتا ہے

شیدا نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے شاعروں پر زبردست اعتراضات کئے - بہت سے لوگوں کی ہجو لکھی - ہزاروں کے کلام کو اغلاط سے مجروح کر دیا - مگر دو واقعے اس کی شاعرانہ زندگی میں ایسے گزرے ہیں جن کی نظیر مشکل سے ملیگی ایک تو وہی واقعہ کہ اس نے ایک شعر شراب کی تعریف میں کہا اور اسے سنکر شاہجہاں کا مزاج اس وجہ سے کہ اس نے ایک حرام شے کے لئے ایسے محترم الفاظ استعمال کئے منحرف ہو گیا - شعر یہ تھا -

چیست میدانی مے گلگوں مصفا جوہرے   حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

شاہجہاں نے یہ سنکر حکم دیدیا تھا کہ ممالک محروسہ سلطانی سے اس کو نکال دیا جائے - مگر ملا شیدا نے یہ عذر پیش کیا کہ ملا جامی رحمۃ اللہ نے بھی یہ شعر کہا ہے - جب ان کے اوپر کوئی حد شرعی جاری نہیں ہوئی تو آخر میں کیوں عتاب سلطانی میں گرفتار ہوتا ہوں - بات معقول تھی سنکر بادشاہ نے خطا معاف کر دی شعر جامی ؎

از صراحی دو بار قلقل مے   پیش جامی بہ از چہار قل است

اس کے علاوہ معذرت کے لئے ایک قصیدہ بھی لکھا جسکا یہاں لکھنا بیکار ہے -

دوسرا یہ واقعہ ہے کہ شیدا پر سرقہ کا الزام لگایا گیا تھا ــــــ ایکروز اجمیر میں ملا فیروز استاد لطف اللہ خاں کے مکان پر شعراء کا مجمع تھا - ملا عطائی جونپوری - ملا نور لاہوری ملا مخترع - ملا طفیلی وغیرہ موجود تھے شعر و شاعری کا ذکر تھا - کہ اتنے میں کہیں سے شیدا کی شامت اعمال شیدا کو بھی یہاں کھینچ لائی -

لوگوں نے جب شیدا کو آتے دیکھا تو صلاح ہوئی کہ اس شخص نے سب کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے کسی پہ اعتراض کرتا ہے کسی کی ہجو کرتا ہے۔ کسی کو بُرا کہتا ہے غرض ایک طومار باندھ رکھا ہے اور ایک قیامت برپا کئے ہے اور غضب یہ ہے کہ دوسروں کے مضمون اڑاتا ہے اور اپنے الفاظ میں دوسروں کو سناتا ہے۔ آج اس کی خبر لینا چاہئے۔ ملا فیروز کو متقدمین کے بہت سے شعر یاد تھے لوگوں نے ان سے استدعا کی کہ ہاں آج ذرا اسکی خبر لے ڈالئے بہت اتراتا ہوا پھرتا ہے۔ ملا فیروز بھی راضی ہوگئے۔ اتنے میں شیدا مجلس میں آپہونچے۔ ——————

—————— لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا تعظیم کے لئے اُٹھے مزاج پرسی ہوئی اس کے بعد وہی شاعرانہ تواضع یعنی کچھ تازہ کلام سنائیے۔ شیدا غریب کو کیا خبر کہ زمانہ برسر جنگ ہے۔ بیچارے نے یہ مطلع جو اسی زمانے میں کہا تھا بے تکلف سنا دیا۔

شیدا ؎ چیست میدانی مے گلگوں مصفا جوہرے حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

ملا فیروز نے کہا کہ واہ جناب یہ مضمون تو ردو کی کا ہے۔ شیدا نے کہا کیونکر۔ ملا فیروز نے کہا سنئے۔ اور فوراً شعر پڑھ دیا ؎

عشق را تو پیمبری لیکن حسن را آفریدگار توئی

شیدا یہ سنکر دانت پیسکر رہ گیا۔ مگر کیا کرتا۔ دوسرا شعر یہ پڑھا۔

زبسکہ کردہ غمت بند در جگر ناخن چو پشت ماہیم از پائے تا بہ سر ناخن

ملا فیروز نے کہا چہ خوش جناب یہ مضمون غیاثائے حلوائی کا ہے سنئے یہ شعر ہے

؎ از بسکہ سینہ کندم و ناخن براں نشست چوں پشت ماہی است سراپائے سینہ ام

شیدا کو یہ شعر سنکر بڑا غصہ آیا۔ اور کہا کہ اچھا آپ بڑے سخن فہم ہیں تو اس شعر کا جواب سنائیے ؎

گر بصحرا مو شکافی وحشت پر سنبل شود در بدریا رو بہ شوئی خار ماہی گل شود

ملا فیروز نے کہا کہ کاشی دو سو سال پہلے یہ مضمون لکھ چکا ہے ؎

گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ خار ماہی را رود در قعر دریا پا بہ گل

شیدا نے یہ شعر سنا اور نہایت مشتعل ہو کر غصہ کی باتیں کہنا شروع کیں۔ اسی حالت اشتعال میں کہا کہ بڑے وہ ہو تو کوئی ایسا شعر نعت میں سناؤ۔

شیدا ؎ ذات تو بود صحیفہ کون کہ کرد ازروئے ادب مہر خدا بر پُشتت

ملا فیروز نے حاضرین مجلس سے کہا کہ ذرا انصاف کیجئے اور دیکھئے کہ جب ہاتفی نے ڈیڑھ سو سال پہلے یہ شعر کہا ہے تو کیونکر مان لیا جائے کہ یہ مضمون شیدا نے پیدا کیا ہے۔

باتفی سے   بنوت راتوئی آں نامہ درمشت   کہ از تعظیمت آمد مُہر بر پشت

یہ سنکر لوگوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اُن کا ہنسنا گویا بارود کے لئے چنگاری ہوگیا۔ ملا شیدا نے لوگوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ اور لطف یہ تھا کہ جس قدر یہ برا بھلا کہتا جا رہا تھا لوگ معافی مانگ رہے تھے۔ اور برابر فرمائش کر رہے تھے کہ کچھ اور سنائیے۔ تو انہوں نے پھر یہ شعر سنایا۔

شیدا ؎   زلف او را رشتۂ جاں گفتم و گشتم خجل   زانکہ این معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

ملا فیروز نے کہا۔ کہ ملا شیدا میرے مہمان ہیں اس لئے مجھے کچھ کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ شعر بھی شیدا کا نہیں ہے یہ مضمون بھی ایک شخص کہا ہے وہ یہ ہے ؎

کس نیارد مصرعۂ پیچیدۂ زلف بجست   زانکہ این معنی چو زلفت پیش پا افتادہ است

القصہ جس قدر شعر ملا شیدا نے پڑھے۔ ملا فیروز نے اُن سب کا جواب دیا۔ یہاں تک ملا شیدا خاموش ہوگیا۔

ایک روز کسی جلسہ میں ملا شیدا کا یہ شعر پڑھا گیا لوگوں نے بڑی تعریف کی آزاد بلگرامی بھی وہاں موجود تھے شعر یہ ہے :-

بسکہ بنگاشتہ اشکم رُخ کاہی ازخوں   مژہ ام بستہ بہم چوں پر ماہی ازخوں

علامہ آزاد بلگرامی نے کہا کہ شیدا کے مطلع میں پہلا مصرع اچھا نہیں لگا۔ یہ مضمون یوں بہت اچھا ادا ہوتا ہے ؎

بسکہ میریزد سرشک از دیدۂ گریاں من   بستہ ازخوں چوں پر ماہی ہم مژگاں من

معلوم کیونکر یہ مطلع سراج الدین علی خان آرزو تک پہونچا اُنھوں نے کہا کہ ہرگز یہ مطلع شیدا کے مطلع کے برابر نہیں ہے۔ اس زمین میں جس میں شیدا نے مطلع کہا ہے اوسی کا کام تھا۔ دوسرے کا مقدور نہیں اس میں پہلا مصرع دوسرے کی علت نہیں ٹھہر سکتا۔

آزاد کو خان آرزو کی یہ رائے معلوم ہوئی تو انھوں نے یہ اعتراض کیا کہ شیدا کے مطلع کا مصرع ثانی مصرع اولی میں صرف اسی قدر مضمون چاہتا ہے کہ چشم من ازبسکہ خوں ریخت ـــ اور اتنے مضمون کے لئے وہ جس قدر عبارت لایا ہے اور جس قدر اس کو اہتمام کرنا پڑا ہے وہ نقاد سخن پر پوشیدہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ مصرع میں لفظ بنگاشتہ بالکل بے جوڑ ہے۔ کیونکہ نگاشتن کا کوئی سامان موجود نہیں ہے۔ کاش یہ مصرع یوں کہا جاتا ؎

اشک در دیدۂ من تا شدہ راہی ازخوں

آرزو کا یہ قول کہ مصرع اول علت مصرع ثانی نمی تواند شد۔ قابل غور ہے۔ کیونکہ شیدا کے مصرع اول میں لفظ بسکہ۔ اور (خوں) موجود ہے اور یہی لفظ خوں بستگی مژگاں کی علت ہے۔ آرزو نے جو دلیل بیان کی ہے وہ مفید مدعا نہیں ہوسکتی اُن کا مدعا یہ ہے کہ دوسرا مطلع شیدا کے مطلع کے برابر نہیں ہے اس کے لئے

چاہئے تھا کہ مطلع شیدا میں کوئی ایسی حسن تعبیر دکھاتے جو دوسرے مطلع میں نہ ہوتی - آرزو نے صرف دلیل پیش کی ہے - کہ اس زمین میں ایسا مطلع بس شیدا ہی کہہ سکتا ہے اور کسی کی مجال نہیں - یہ دلیل بالکل ناکافی اور بیکار ہے - اس لئے کہ میں نے اسی زمین میں ایک غزل ذو مطلعین کہی ہے

توعبث منکری اے طفل سپاہی از خوں　　　برزبان تیغ تو آورد گواہی از خوں
تا شود کشتۂ آن شوخ سپاہی از خوں　　　دامنش رشک چمن باد الٰہی از خوں

میر اولاد محمد ذکا طاب ثراہ کا بھی ایک مطلع ہے ۔

کردۂ دامن خود سُرخ کماہی از خوں　　　بازاے قاتل بے رحم چہ خواہی از خوں

میر عبدالقادر مہربان لکھتے ہیں ۔

بہ چمنم ساختہ آن شوخ سپاہی از خوں　　　ہمچو گل داد مرا خلعت شاہی از خوں

(مولف) علامہ آزاد کی جودت طبع کا جواب نہیں - مگر میرے نزدیک آرزو کا یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ شیدا کے مطلع کا جواب نہیں - اس کا دوسرا مصرع اس قیامت کا ہے کہ وہ پہلے مصرع کے سقم کو ظاہر نہیں ہونے دیتا - اگرچہ پہلے مصرع میں ضرور نگاشتن کے لئے سامان کی کمی ہے - لیکن آزاد کے اس شعر میں ؎

بسکہ میریزد سرشک از دیدہ گریان من　　　بستہ از خوں چوں پر ماہی ہم مژگان من

بڑی کمی ہے - پہلے مصرع میں کہا ہے کہ میری آنکھوں سے سرشک گرتے ہیں - دوسرے مصرع میں کہا ہے کہ مچھلی کے پروں کی طرح میری پلکیں خوں سے جکڑ رہی ہیں - لہذا پہلے مصرع میں سرشک خونی کہا جانا چاہئے تاکہ دوسرے مصرع کے لئے سامان پیوستگی پیدا ہوجائے - ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ سرشک پانی کے ہوتے ہیں اور عام طریقہ سے سرشک پانی کے آنسوؤں کو کہا جاتا ہے - یا محض آنسو کو - لہذا آنسو میں خون کی قید لگانا ضروری تھی کہ مصرع کے لئے مفید ہوتی پہلا مصرع اگر یوں ہوتا تو بہت بہتر تھا -

"اشک رنگیں می چکد از دیدۂ گریان من"

شیدا کے مطلع کا پہلا مصرع اگرچہ صاف نہیں ہے پھر بھی اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ میرے آنسوؤں نے چونکہ میرے رُخ کاہی کو خون سے رنگدیا ہے اسی وجہ سے میری مژگان پر ماہی کی طرح خوں سے بستہ ہوگئی ہیں اب سمجھئے کہ یہاں سامان نگاشتن کی ضرورت ہی کیا ہے کہ اہتمام کیا جاتا - ضرورت صرف اس بیان کی تھی کہ آنکھوں سے خون بہا - اور وہ موجود ہے کہ آنسوؤں نے رخسار کاہی کو خون سے رنگدیا - تو اس صورت میں تمام نقص رفع ہوگیا -

رہے آزاد - ذکا - اور مہربان اورنگ آبادی کے مطلعے وہ سب اپنی اپنی جگہ پر اچھے ہیں مگر شیدا

ے مطلع کو نہیں پہنچتے۔ اسی لئے آرزو کا اعتراض ایک قول فیصل ہے جس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہئے

مرزا صائب و معترض

صائب کا نام محمد علی تھا اصفہاں کا رہنے والا تھا۔ مذہب سنی رکھتا تھا۔ زمانہ شباب میں جب جہانگیر کی حکومت نے ہندوستان کو گلزار ارم بنا رکھا تھا ہندوستان آیا۔ اور اپنے کلام بلاغت نظام سے قدر دانان سخن کو محظوظ کرتے رہے اور اپنا سکہ استادی جما کے ۱۰۴۲ھ میں کشمیر ہوتا ہوا اصفہان چلا گیا وہیں ۱۰۸۸ھ میں عالم فانی کو وداع کیا معترض کا حال معلوم نہیں۔ مگر مولانا آزاد بلگرامی نے خزانہ عامرہ میں لکھا ہے کہ ایک معترض نے مرزا صائب کے اس شعر پر اعتراض کیا۔

صائب - سرو من طرح نو انداختۂ یعنی چہ   جامہ را فاختہ ساختہ یعنی چہ

معترض - یعنی یہ غلط ہے یہاں صیغۂ خطاب لایا جاتا۔ اور یعنی چہ کہا جاتا۔

مرزا صائب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا

(مولف) جواب نہ دینا غالباً اس بنا پر تھا کہ محاورہ اسی طرح ہے اور محاورہ میں تصرف جائز نہیں۔ ورنہ واقعتاً یعنی چہ صحیح ہے

صائب و آزاد

صائب - سخن بلند چو گردد بوحی مقرون است   گواہ ما سر مصحف کلام موزون است

آزاد - یہ مضمون نہایت اچھا ہے مگر پہلا مصرع اچھا نہیں لگا ہے۔ کیونکہ مضمون یہ ہے کہ جو سخن بلند ہوتا ہے وہ مرتبہ وحی پر فائز ہو جاتا ہے۔ اب دو صورتیں ہیں۔ یا وہ سخن نظم ہوگا یا نثر۔ اگر شاعر کی مراد سخن سے نظم ہے۔ تو کوئی تخصیص نہیں ہو سکتی اس واسطے کہ جو نثر بلند ہو وہ بھی مرتبۂ وحی پر فائز ہو سکتی ہے۔ بلکہ دیکھئے تو تمام قرآن شریف نثر ہی ہے۔ نظم تو خال خال ہے۔ ثبوت میں جو مصرع ثانی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ کلام موزوں کلام منثور سے بلند ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں مدعا اور دلیل میں تطابق نہیں ہے۔ یہاں دلیل کا اقتضا یہ ہے کہ مدعا کچھ اور ہو۔ مثلاً یوں کہا جائے ؎

خوش است نثر ولے ہست نظم موزوں است   گواہ دعویٰ ما مصحف ہمایوں است

اور اسیطرح اس شعر میں جیسا کہ دلیل کا اقتضا یہ ہے کہ مدعا کچھ اور ہو مدعا بھی یہ چاہتا ہے کہ دلیل کچھ اور ہو

مثلاً اس طرح۔

سخن بلند چو گردد بوحیٔ مقرون است — گواہ دعویٰ ما مصحف ہمایون است

(مولف) صائب کا مقصد یہ ہے کہ سخن اگر بلند واقع ہو تو وہ وحی سے قریب ہوجاتا ہے۔ جیسے کہ بسم اللہ کہ وہ موزوں ہے اسی نے قرآن شریف میں چوٹی کی جگہ پائی ہے اور وہی کلغی بنی ہے۔ ورنہ قرآن شریف باوجود اس کے کہ وحی ہے مگر مقرون بوحی بسم اللہ کی طرح نہیں ہے۔ اس صورت میں دلیل و مدعا دونوں مطابق ہیں مولانا آزاد کا اعتراض صحیح نہیں۔ غلطی معنے سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے مولانا آزاد نے یہ سمجھا کہ جو سخن بلند ہو وہ وحی کے درجہ پر فائز ہوجاتا ہے۔ حالانکہ صائب کا مقصد یہ ہے کہ وہ عالم وحی سے زیادہ قریب ہوتا ہے جیسا کہ بعض محققین کا قول ہے کہ بچہ کا ہنسنا اور خوش ہونا۔ اچھلنا کودنا اس واسطے ہے کہ وہ عالم ارواح سے زیادہ قریب ہے اور جیسے جیسے وہ عمر میں بڑھتا جاتا ہے اسی قدر عالم ارواح سے دور ہوتا جاتا ہے۔ اور وہ کیفیت فنا ہوتی جاتی ہے۔ باایں کہ نوزائیدہ بچہ بھی جنس حیوانی میں تھا اور جوان ہو کر بھی جنس حیوانی میں شامل ہے۔ مگر چونکہ وہ اس وقت اس عالم سے زیادہ قریب تھا اسی لئے اس میں وہ کیفیات تھیں جو جوانی میں مفقود ہوگئیں۔ اسی طرح گو تمام قرآن شریف وحی ہے مگر قرب وحی کی جگہ بسم اللہ کو حاصل ہے اور یہ بوجہ اس کے موزوں ہونے کے ہے۔ اور چونکہ بسم اللہ ہی قرآن شریف میں سب سے پہلے ہے لہذا مبدء وحی اور مظہر وحی اسی کو مانا جائے گا۔ کیونکہ یہیں سے سلسلۂ وحی کا آغاز ہوتا ہے۔

مولانا نے جو دلیل کے لئے دوسرے مدعا کی فراہمی کے واسطے اصلاح دیکر شعر میں مصرع اولیٰ بہم پہنچایا ہے۔ اس میں صائب کا مقصد ادا نہیں ہوتا۔ بلکہ شان اصلاح کے خلاف اصل مقصد سے بالکل دور ہوجانا پڑتا ہے یعنی ؎

خوش ہست نثر و لے شان نظم افزون است — اثاثۂ سر مصحف کلام موزون است

مطلب یہ ہے کہ نثر بھی اچھی چیز ہے۔ مگر نظم اس سے بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ ہے۔ دلیل اس پر یہ ہے کہ قرآن شریف میں بسم اللہ سب سے اوپر ہے۔ اگرچہ پورا قرآن جو نثر میں ہے وہ بھی اچھا ہے۔ ظاہر ہے کہ صائب کا اصل مقصد فوت ہوگیا۔ اور بالکل نیا مضمون پیدا ہوگیا۔ اسی طرح جو مدعا کے لئے دوسری دلیل لائے ہیں ؎

سخن بلند چو گردد بوحی مقرون است — دلیل دعوے ما مصحف ہمایون است

اس میں دوسرا مصرع بالکل مہمل ہے اور کچھ نہیں کھلتا کہ ہمارے دعوے کی دلیل مصحف ہمایوں کیونکر ہے۔ ہاں اس صورت میں کہ یہ کہا جائے کہ سخن خواہ نثر ہو یا نظم اگر وہ بلند ہے تو وحی ہے جیسا کہ قرآن پاک باوجود یکہ تمامتر

نثر ہے مگر چونکہ بلند ہے اس لئے وحی ہے ۔ اس میں ایک نقص تو یہ ہے کہ قرآن شریف کے وحی کی دلیل صرف یہ لائی گئی ہے کہ وہ بلند ہے حالانکہ یہ نہیں ہے مت سی باتیں ہیں کہ جن کی وجہ سے قرآن کا وحی ہونا ثابت ہوتا ہے دوسرے یہ کہ صائب کا جو منشا تھا اس کا اس اصلاح میں بھی کچھ ذکر نہیں ۔ ان دلایل کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کا اعتراض صحیح نہیں ہے ۔

میر وزیر علی صبا و مولوی عصمت اللہ[له]

صبا ۔
کولھو میں گردش نگہ یار سے پسا — تل تیں ہو کے رہ گیا چشم غزال کا
شیریں لبوں کے عشق میں یہ گردش نصیب — کولھو میں عضو تن نہ پڑیں ٹینکر کی طرح

اعتراض ۔ آپ کے شعر میں کولھو کا لفظ بہت ہے ۔ اس کی وجہ نہ معلوم ہوئی دونوں شعروں کو روغن دار کہوں یا حسب محاورۂ جہال مرغن

جواب ۔ جناب آپ ذہن کند ہوتا ہے ۔ گستاخی معاف یہ وہی مثل ہے ۔ تیلی کا تیل جلے ۔ خ کیا الفاظ نظم محدود ہیں ۔ یا یہ کوئی غریب اور غیر فصیح لفظ ہے ۔ اور ذرا آپ اپنے اعتراض کی عبارت تو ملاحظہ کیجئے (ان کے شعر میں کولھو کا لفظ بہت ہے) اس کے کیا معنے ۔ بہت کو ثابت کیجئے یا اپنی جہالت کے قائل ہوجئے واہ آپ با اینہمہ اپنے تئیں غیر جہال سے بھی جانتے ہیں ۔ آپ کو شرم نہیں آتی ۔

(مولف) حسب خلاف شان تنقید ذاتیات پر اتر آئے ہیں ۔ اور وہ باتیں کہہ گئے جو تنگ تنقید ہیں ۔

اگرچہ دو شعروں میں کولھو کا لفظ آجانے سے صبا کے اوپر کوئی اعتراض نہیں پڑتا ۔ اس لئے کہ اول تو کولھو دونوں جگہ دو معنوں میں آیا ہے ۔ ایک جگہ وہ کولھو جس سے تیل نکالا جاتا ہے اور دوسری جگہ وہ کولھو جس میں گنے وغیرہ پیلے جاتے ہیں اس صورت میں اعتراض فضول تھا ۔ کم سے کم پانچ سات جگہ تو یہ لفظ

له میر وزیر علی صبا ولد میر بندہ علی لکھنوی سراشرف علی نامی لکھنوی کے بھانجے اور خواجہ آتش لکھنوی کے ایک سربرآوردہ شاگرد تھے ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گر کر راہی فنا ہوئے ۔ ایک دیوان موسوم بہ غنچۂ آرزو ان سے یادگار ہے ۔ قدیم وضع کے پابند تھے اور اس زمانہ کے رنگ کے موافق اچھا کہتے تھے مولوی عصمت اللہ صاحب شاگرد مولانا عبدالغفور نساخ نے ان پر اعتراضات کئے تھے ۔ اور مولوی آغا علی صاحب مدرس مدرسہ ریاست ٹمکور نے ۱۸۷۸ء میں ان اعتراضات کے جواب ایک رسالہ موسوم بہ تردید الاعتراضات میں دیئے تھے ۔

UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
DELHI.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شایع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ ۔ ششماہی تین روپیہ
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۲	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۲ء	شمارہ ۶

اس اعلان کے علاوہ جتنے اور اعلانات و اشتہارات جنوری ۳۳ء کے نگار کے تعلق اس اشاعت میں یا اس سے قبل شایع ہوئے ہیں اُن کو منسوخ سمجھا جائے

(جنوری ۳۳ء کے خاص نمبر کے متعلق ایک اور اہم تجویز)

جس وقت یہ اعلان کیا گیا کہ جنوری ۳۳ء کا نگار مخصوص ہوگا صرف ایک موضوع "تاریخ الفحشاء" کے لئے، تو بعض احباب نے مشورہ دیا کہ اس کو علحدہ کتابی صورت میں نکالنا زیادہ مناسب ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ ممکن ہے بعض حضرات اسے پسند نہ فرمائیں بلکہ اس لئے بھی کہ تجارتی نقطۂ نظر سے اس میں دفتر کا نقصان ہے۔ میں بھی کامل غور کے بعد اسی نتیجہ پر پہونچا اس لئے میں تمام ناظرین نگار کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ تاریخ الفحشاء تو علحدہ کتابی صورت میں شایع ہوگی۔ اور جنوری ۳۳ء کا نگار مخصوص ہوگا صرف حضرت نیاز کے ملاحظات و مکتوبات کیلئے جنوری کا نگار تو حسب معمول جنوری کے پہلے ہی ہفتہ میں شایع ہو جائے گا، لیکن یہ کتاب آخیر جنوری تک طیار ہوگی اور علاوہ محصول ۵ روپیہ میں مل سکیگی۔ لیکن خریداران نگار اس کو نصف قیمت میں حاصل کر سکیں گے۔

جس طرح جنوری کا نگار حضرت نیاز کا مجموعۂ ملاحظات ہونے کے لحاظ سے عجیب و غریب چیز ہوگا، اسی طرح یہ کتاب بھی ایک نادر نمونہ معلومات جنسی کا ہوگا۔ اسی سلسلہ میں کتاب زیر بحث کے متعلق چند باتیں

ضرور ذہن نشین کر لیجئے :-

۱- اس کتاب میں "جنسیات" کے موضوع پر وہ سب کچھ موجود ہے جو اصولاً ہونا چاہیئے۔

۲- یہ نہ اس قسم کی کتاب ہے جیسی آج کل بازاروں میں "دولہا دلہن" "میاں بیوی" وغیرہ کے نام سے ہر جگہ ملتی ہیں اور نہ اس میں "تعلق جنسی" کی ترکیبیں بتا کر اس کو کوک شاستر بنایا گیا ہے۔ بلکہ نہایت مہذب و شائستہ، حد درجہ متین و سنجیدہ لٹریچر میں پیش کی جائے گی۔

۳- یہ خالص علمی و تاریخی کتاب ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ عہد وحشت سے لیکر اس وقت تک انسان کا میلان معصیت کیونکر رونما ہوا، اس ذوق نے کس طرح ترقی کی اور اس کے اسباب ترقی کیا تھے

۴- اس کتاب میں یہ بتایا جائے گا کہ آج کل علم و تہذیب کی دنیا جس تمدن پر فخر کر رہی ہے اور مغرب جس چیز کو ترقی سے تعبیر کر رہا ہے، وہ کس قدر اخلاق شکن اور کس درجہ بہیمیت کرنے والا ہے۔

۵- اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا کی تمام تہذیبوں میں، عالم کے تمام مذاہب میں، صرف ایک ہی ادارۂ تہذیب ایسا تھا جس نے فحاشی کو پوری طرح روکا۔ صرف ایک ہی دین ایسا تھا جس نے اس کا سدّباب کیا اور وہ اسلام تھا۔

۶- اس کتاب میں واقعات عالم، نفسیات انسانی اور شواہد تاریخی کی بنا پر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جنسی معاصی کے روکنے کی بہترین تدبیر وہی ہو سکتی تھی جو اسلام نے مخصوص اصول ازدواج مقرر کرنے کے بعد اختیار کی۔

۷- یہ کتاب کسی مذہب سے بحث نہیں کرتی کسی خاص جماعت سے خطاب نہیں کرتی بلکہ عمومی طور پر انسان قدیم سے لیکر موجودہ عہد کے انسانی تمدن کے قوانین حیات کو سامنے رکھکر اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ دنیا ترقی کا نام لیکر کس قدر قعر مذلت میں گرتی جارہی ہے

اور اس سے بچنے کا واحد ذریعہ کیا ہے۔

۸۔ یہ کتاب فی الحقیقت ایک نشتر ہے اُس فاسد مادہ کے لئے جو آج کل کے نوجوانوں میں پیدا ہو رہا ہے اور علاج ہے اُس خود سری، آزادی اور بے ادبی کا جسنے اخلاق و مذہب دونوں کے صحیح مفہوم کو پس پشت ڈال دیا ہے

۹۔ اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نظام عالم میں انسان کے بنائے ہوئے قوانین کیسے نامضبوط و ناکافی ثابت ہوتے ہیں اور دنیا میں انسان کو صحیح "درس انسانیت" دینا صرف مذہب کا کام ہے جس کی حکومت ظاہری اعضا، پر نہیں بلکہ انسان کے دل پر، انسان کی روح پر قائم ہوتی ہے۔

۱۰۔ یہ کتاب مغرب کی تہذیب اور مغرب کے اخلاق کو بے نقاب کرنے والی ہے اور ملک کے نوجوانوں کے سامنے ایک درس عبرت و بصیرت پیش کرنے والی ہے تاکہ اُن کے اخلاق درست ہوں اور وہ سوچیں کہ کیا انسان اُسی جانور کا نام ہو سکتا ہے جس سے ایسی ایسی ناشائستہ حرکات سرزد ہوں۔

منی آرڈر کے ذریعے سے چندہ بھیجنے میں آپ کو چار آنے کی بچت ہے کیونکہ منی آرڈر میں آپ کے پانچ روپیہ دو آنے صرف ہوں گے اور وی پی آپ کو چھ روپیہ دیکر وصول کرنا پڑے گا۔ اب آپ کی مرضی ہے جو مناسب معلوم ہو اسپر عمل کیجئے۔

جو صاحب نگار کی خریداری اب جاری رکھنا نہیں چاہتے وہ زحمت فرماکر مطلع فرمادیں تاکہ اُن کو وی پی نہ بھیجا جائے۔ کیونکہ اگر وی پی واپس آیا تو دفتر کو ۸؍ کا نقصان ہوگا۔ آپکے اخلاق سے اُمید ہے کہ اس التجا کو رد نہ فرمائیں گے۔

اسی کے ساتھ ایک استدعا اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر نگار کی خدمت آپ کے نزدیک کوئی وقعت رکھتی ہو تو زیادہ نہیں صرف ایک خریدار اپنے حلقۂ اثر میں پیدا کرکے ہماری حوصلہ افزائی فرمایئے۔

منیجر نگار لکھنؤ

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے ملاحظات ختم کرتے ہوئے میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس ماہ کی اشاعت میں، مسلمانوں کے موجودہ حالات پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے انجام پر غور کروں گا کہ اس کے آثار اس وقت کیا نظر آرہے ہیں اور مستقبل کے خطرات کو دور کرنے کی کیا تدابیر ہو سکتی ہیں - ہر چند اس موضوع پر ملاحظات کے آٹھ صفحات یوں بھی کسی طرح کافی نہ ہو سکتے تھے، لیکن اس مرتبہ منیجر نے تین صفحے مجھ سے چھین کر، میرے لئے میدان کو اور زیادہ تنگ کر دیا- اس لئے کسی مختتم گفتگو کی توقع قائم کئے بغیر، آپ چند ابتدائی باتیں اس اشاعت میں سن لیجئے، اس کے بعد تو پھر مسلسل مجھے کئی اشاعتوں تک اس سلسلہ کو جاری رکھنا ہے -

ا - غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت کرۂ زمین پر مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے - تقریباً ۲۵ کرور - اور اسی کے ساتھ غالباً یہ بھی آپ کے علم میں ہوگا کہ یہ آبادی کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے آپ نقشہ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف یہ سلسلہ مغربی افریقہ کے سواحل اتلانتک سے شروع ہو کر بحر روم کے جنوبی ساحل کو اپنی آغوش میں لیتا ہوا مصر اور مغربی ایشیا تک پہونچتا ہے، اور پھر سواحل بحر قلزم و بحر اسود سے ہوتا ہوا سائبیریا اور منگولیا تک پہونچ جاتا ہے - دوسری طرف مشرقی ساحل افریقہ سے شروع ہو کر، مدغاسکر کے عرض البلد پر منتہی ہوتا ہے اس کے بعد ایک سلسلہ وہ ہے جو افغانستان کے کوہستانوں کو عبور کر کے ہندوستان تک پہونچتا ہے - اور یہاں سے جزیرہ نمائے ملایا ہوتا ہوا مشرقی مجمع الجزائر تک پہونچ جاتا ہے -

اچھا اب اسی کے ساتھ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی یہ ترقی تدریجی ترقی نہ تھی بلکہ ایک سیلاب کی سی ترقی تھی جو وقتاً فوقتاً اٹھتا رہا اور چند صدیوں میں کرۂ ارض کے اتنے وسیع حصہ پر محیط ہو گیا یعنی سنہ ۶۳۰ء اور سنہ ۷۵۰ء کے درمیان ہسپانیہ و مراکش سے لیکر وسط ایشیا تک پھیل گیا اور تقریباً ڈھائی صدی تک اسی جگہ محدود رہا- اس کے تقریباً ڈھائی صدی بعد سنہ ۱۰۰۰ اور سنہ ۱۱۰۰ کے درمیان اس کی وسعت مغربی افریقہ سے لیکر، ایشیا کوچک، وسط ایشیا اور شمالی ہند تک پہونچ گئی - پھر دو صدی گزرنے کے بعد ایک اور لہر اٹھی جس نے (سنہ ۱۳۰۰ اور سنہ ۱۴۰۰ کے درمیان) جزیرہ نمائے بلقان سے لیکر سائبیریا، ہندوستان اور مجمع الجزائر تک تمام حصہ کو اپنے اثر میں لے لیا- اور اس طرح جو نقشہ مسلم آبادی کا سنہ ۱۴۰۰ء میں قائم ہو گیا

تھا، تقریباً وہی اب بھی نظر آتا ہے۔

اس وقت میں اس امر سے بحث نہیں کروں گا کہ اس ترقی کے کیا اسباب تھے، یعنی کوئی خاص اخلاقی خوبی اسلام میں ایسی تھی جس کا اثر دنیا پر پڑا یا یہ کہ صرف اس کی عسکریت کو اس کا امتیاز دینا چاہیئے۔ بہرحال حقیقت یہ ہو یا وہ ہمیں اس سے بحث نہیں دیکھنا یہ ہے کہ اسلام جہاں جہاں گیا کن خصوصیات کے ساتھ گیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ لیکن اس پر غور کرنے سے قبل بطور اصول موضوعہ ہم کو یہ متعین کر لینا چاہیئے کہ اسلام سے ہماری مراد اس مضمون میں کیا ہے۔

میں اس سے قبل بھی نگار کی کسی اشاعت میں لکھ چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ دین و مذہب دونوں بالکل علحدہ چیزیں ہیں، یعنی دین نام ہے اس خاص اعتقاد کا جو متعلق ہے ہماری عبادات سے، ہماری مابعد الطبیعیات سے اور اس سکون نفس سے جو کسی مخصوص عقیدہ کی بناء پر انفرادی طور پر ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے، سوسائٹی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن مذہب نام ہے اس تہذیب و تمدن کا جو کسی دین کے ماتحت دنیا میں قائم ہو جاتا ہے اور جس کا تعلق انسان کی ہیئت اجتماعی سے ہوتا ہے۔ اس کا میں وہی مفہوم قرار دیتا ہوں جو انگریزی لفظ (Culture) کا ہے پس میری مراد بھی مضمون زیر بحث میں مذہب سے ہے نہ کہ دین سے یعنی میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اسلام بہ لحاظ اعتقاد مذہبی نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک خاص مذہب (Culture) ہونے کے کیا خصوصیات اپنے ساتھ ہر جگہ لے گیا۔

اب اس سلسلہ میں آپ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا اُس وقت اس کا ماحول کیا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ اسلام پیدا ہوا ایشیا ہی کے ایک گوشہ سے لیکن اثر اس نے قبول کیا یوروپ کی اس تہذیب کا جس کے لئے صحیح لفظ میرے خیال میں صرف "یونانیات" ہو سکتا ہے۔ یہاں یونانیات سے مراد صرف ملک یونان کی تہذیب نہیں ہے بلکہ وہ تمام مغربی تہذیب مقصود ہے جو حقیقتاً مجموعہ تھی رومہ و یونان دونوں کی تہذیب کا اور جس سے نہ صرف سارا یوروپ بلکہ جزیرہ نمائے عرب بھی عرصہ تک متاثر رہنے کے بعد اپنے دور انحطاط میں بھی اسی کے زیر اثر نظر آتا تھا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ولادت نبوی و بعثت کے وقت سرزمین حجاز میں بھی یہود و نصاریٰ ہی کا اثر قائم تھا اور اہل عرب باوجود اس کے کہ ان کی وثنیت شدید قسم کی بُت پرستی تھی، نصاریٰ و یہود کے علماء کا خاص احترام کرتے تھے۔ اور ان کے علم و فضل اور روحانیت کے قائل تھے۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ اہل عرب میں بت پرستی کا خیال خود یونان و رومہ سے آیا تھا، لیکن اس کی بڑی وجہ سلطنت رومہ کے اقتدار و وسعت، ہیبت و جبروت کی وہ روایات قدیمہ تھیں جو عرب میں ایک ایک بچہ کے ذہن نشین ہو چکی تھیں اور قدرتاً ہونا چاہیئے تھیں جبکہ اُس وقت بھی

قسطنطین اعظم کا مسیحی جھنڈا آبنائے باسفورس پر لہراتا ہوا ہر شخص کو نظر آتا تھا۔

ہر چند اسلام نے اپنی فتوحات کا اولین ہدف یونان و روما ہی کی حکومت کو قرار دیا، لیکن، بجائے اس کے کہ یونانیات کا اثر زائل ہوتا مسلمانوں پر اور زیادہ رنگ اس کا چڑھ گیا یعنی گو ظاہری حکومت تو اہل یورپ کی ضرور چھن گئی، لیکن اس کی تمدنی حکومت عربوں پر اور زیادہ قائم ہو گئی، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ عربوں نے نہ صرف علوم و فنون میں یونانی لٹریچر کا اثر قبول کیا بلکہ تدوین شرع و فقہ میں بھی ارسطو کی تصانیف سے مدد لی گئی۔ حتیٰ کہ بعض مفسرین نے تو اسکندر اعظم کو پیغمبر تک قرار دیدیا۔ ایک ہی تہذیب کی مختلف قوموں میں ایک کا دوسرے سے برسرِ پیکار ہو جانا کوئی نئی بات نہیں ہے، ہمیشہ ہوا ہے اور ہوگا۔ خود مسلمانوں میں باہم جس قدر جنگ و خونریزی ہوئی ہے کسی سے مخفی نہیں۔ الغرض مسلمانوں کا روما و یونان کے مقبوضات کو تصرف میں لے آنا اگر ایک طرف اسلامی حکومت کی فتح تھی، تو دوسری طرف یونانیات کی بھی کامیابی تھی جس سے اسلام برابر متاثر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اگر ایرانی تہذیب جو جزیرہ نمائے عرب میں کہیں کہیں اکاسرۂ عجم کے سطوت و اقتدار کو قائم کئے ہوئے تھی اس وقت نہ پائی جاتی جس سے اہل عرب ایک حد تک متاثر ہو چکے تھے، تو آج مسلمانوں کی تہذیب یکسر مغربی تہذیب ہوتی اور اس میں ادنیٰ شائبہ بھی مشرقیت کا نہ پایا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ ترقی میں علوم و فنون کی بڑی خدمت انجام دی لیکن اسکی بنیاد بھی وہی یونانیات تھی جس نے کسی وقت اسلام کا ساتھ نہیں چھوڑا اور آخر کار ان کے تمام شعبہ ہائے حیات کو اس قدر سختی کے ساتھ جکڑ لیا کہ آج ہندوستان میں بھی جہاں مسلمانوں کو رہتے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں، وہی مغربی خصوصیت ان کی قائم ہے اور جس نے ان کے مستقبل کو مشرق میں حد درجہ تاریک بنا رکھا ہے۔

آپ اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان جہاں گئے اپنی تہذیب اپنے ساتھ لے گئے اور کسی مفتوحہ ملک کے تمدن سے متاثر نہیں ہوئے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ بالکل یہی مغربی ذہنیت ہے اور اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنا یورپی اقوام کی خصوصیت خاصہ ہے۔

ہندوستان میں ایک غضب اور یہ ہوا کہ دورِ مغلیہ ختم ہونے کے بعد انگریزوں کی حکومت شروع ہو گئی جو ایک مغربی قوم تھی اور اپنی تمام مغربی خصوصیات اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس لئے جس وقت بلا بات عناد و انتقام مسلمانوں کے سر پڑ گئے تو پھر وہی اُن کی تقلید میں پیش پیش نظر آنے لگے اور اپنے اوپر افرنجیت طاری کرنے میں نمایاں سبقت کا اظہار کیا۔

چنانچہ اس وقت بھی جبکہ ہندوستان میں ایک سخت سیاسی انقلاب کے آثار پیدا ہوگئے ہیں بہت کم مسلمان ایسے ہیں جو ہندوؤں کے ساتھ شیر و شکر ہوکر حقیقی معنے میں خدمت وطن پر آمادہ نظر آتے ہوں، ورنہ اکثر حصہ انھیں افراد کا ہے جو انگریزوں کی طرف مائل ہیں اور ان کو ہندوؤں پر ترجیح دیتے ہیں۔

آپ کسی مسلمان سے جس نے کچھ بھی مذہبی تعلیم حاصل کی ہے دریافت کیجئے کہ وہ انگریزوں اور ہندوؤں میں کس کو بہتر سمجھتا ہے تو فوراً انگریزوں کا نام لے دیگا اور دلیل یہ بیان کرے گا کہ وہ صاحبِ کتاب ہیں اور یہ کافر، ان کی لڑکیوں سے ہم شادیاں کر سکتے ہیں اور ان کی لڑکی سے نہیں۔ کلام پاک اُن کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور مشرکین و کفار سے نہیں۔ الغرض وہ بہت سے اسباب و دلائل نصاریٰ کی ترجیح میں پیش کر سکے گا۔ پھر چونکہ مسلمانوں کی یہ ذہنیت بہت قدیم ہے اور صدیوں کی پڑی ہوئی عادت کا ترک ہونا تقریباً محال ہے، اس لئے اگر اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی قومی و ملکی تحریکوں میں کوئی قابلِ ذکر حصہ نہیں لیا، تو یہ اُن کی فطرت تھی ان کی مذہبی ذہنیت کا اقتضا تھا جس میں وہ بڑی حد تک مجبور رکھے اور رہیں۔

میں نے جہاں تک مسلمانوں سے اس باب میں تبادلۂ خیال کیا ہے، اسی نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ وہ اپنی تہذیب یا اپنے مذہب (Culture) کو بدلنے کے لئے تیار نہیں اور اُن کو یقین ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ ملکر کام کرنا اسوقت تک ممکن نہیں جب تک اُن کی سطح پر نہ آیا جائے، اور ان کی سطح پر آنا اپنی قدیم تہذیب کی روایات کو صدمہ پہونچانا ہے۔

اس لئے اب سب سے پہلا اصولی سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان کے مسلمان اپنی قدیم روایات تہذیب کو صدمہ پہونچائے بغیر کوئی ملکی یا وطنی جذبہ ہندوستان کے متعلق قائم کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر نہیں تو پھر نتیجہ کیا ہونا ہے۔

سوائے ہندوستان کے اور جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں ان کے حالات پر ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کو منطبق نہیں کر سکتے، کیونکہ ترکی، ایران، افغانستان، عرب و مصر میں نہ وہ محکوم کی حیثیت سے ہیں، نہ اجنبی اقوام میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ اُن کا ملک ہے، ان کی آبادی ہے، ان کی حکومت ہے اور اس لئے اگر وہاں کے مسلمانوں کو ان کی مغربی ذہنیت، یوروپ کی طرف کھینچ رہی ہے تو درست ہے اور وہ انھیں اصول کو سامنے رکھکر ترقی کر سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان اگر ان کی پیروی کرنا چاہیں تو یہ کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں، جبکہ ہندوؤں کی بیداری نے مغربی حکومت کا جوا اپنی گردن سے علحدہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے اور مسلمانوں کے لئے یہ رہا سہا سہارا ابھی ختم ہوتا نظر آتا ہے۔ یہی وہ اصل مسئلہ ہے جس پر ہم آئندہ بحث کرینگے۔ نیاز

انقلاب روس کی عبرتناک داستان

اور

خاندان زار کا عبرت انگیز منظر ذبح و قتل

انقلاب فرانس کے بعد غالباً انقلاب روس ہی ایک ایسا واقعہ دنیا کا ہے جس پر ہمیشہ دفتر کے دفتر لکھے جائیں گے اور لوگوں کو تسکین نہ ہوگی۔ لیکن باوجود ان تمام پیچیدگیوں کے باوصف ان تمام گتھیوں کے جو انقلاب روس کے صحیح اسباب معلوم کرنے کے سلسلہ میں ایک مورخ کے سامنے آتی ہیں، اس پر یقیناً سب کو متفق ہونا پڑے گا کہ زوال سلطنت روس کا سبب اولین خاندان رومانوف کا وہ جبر و استبداد تھا جس نے اندرون ملک میں ہر جگہ حکومت کے خلاف نفرت و بے چینی کی لہر دوڑا دی تھی۔

ہر چند روس کے ملوکیت پرست طبقوں میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انقلاب روس قطعی غیر فطری "غیر روسی" تھا یعنی وہ صرف جرمن عسکریت کی اندرونی ریشہ دوانیوں اور یہودیوں کی غیر عصبیت سے ظہور میں آیا۔ لیکن واقعات کی شہادت بالکل اس نظریہ کے خلاف ہے اور ان کی بنا پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ انقلاب روس بیرونی اثرات سے نہیں بلکہ خود اندرونی اضطراب کا نتیجہ تھا اور وہاں کے فلسفہ و جغرافیہ سیاسیات و اقتصادیات، نسل و مذہب اور نفسیات سب سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتا تھا

(۱) چونکہ انیسویں صدی کے آخری نصف حصہ میں بہت سے روسی اہل قلم اور مفکرین فلسفہ قنوطیت (Pessimism) کو رواج دے چکے تھے اور یہ فلسفہ ہمیشہ خیالات و جذبات میں پستی پیدا کرتا ہے اس لئے رفتہ رفتہ تمام سلطنت روسیہ نکبت و ادبار کے انتہائی درجہ تک پہونچ گئی اور وہ ولولۂ عمل جو ایک قوم کو میدان مسابقت میں لاکر کھڑا کر دیتا ہے بالکل مفقود ہو گیا تھا۔

(۲) ہندوستان کی طرح روس بھی زیادہ تر زراعتی ملک ہے اور ہر روسی کسان زمین کا بھوکا لیکن حکومت نے اس جماعت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اس کی اہمیت کو نظر انداز کرکے اس قدر پامال کیا گیا کہ عہد قدیم کی غلامی بھی شاید اس سے بہتر رہی ہوگی۔

(۳) ملک کے بعض حقیقی خیر خواہوں کی طرف سے کبھی کبھی یہ صدا بلند ہوتی تھی کہ نظم و نسق کی طرف توجہ کی جائے لیکن سننا تو درکنار ان کے خلاف حکومت کا طرز عمل یہ ہوتا تھا کہ یا تو وہ جلاد کے سپرد کر دیئے جاتے تھے یا برفستان سائبیریا کی طرف جلاوطن کر دیئے جاتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "زار دزاریت" کا تختہ الٹ دینے کے لئے سیکڑوں

خفیہ انجمنیں ملک میں پیدا ہوگئیں۔ اور لوگوں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیکر بیباکانہ سیاسی خونریزیوں کا بازار گرم کردیا۔

(۴) ملک کی صنعت وحرفت میں (۱۸۶۰ء سے ۱۹۱۴ء تک) نہایت سریع نشو ونما ہوا مگر مزدوروں اور کاریگروں کی حالت میں ترقی دیگر کوئی توازن قائم نہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبقہ عمال میں نہایت تلخ قسم کا احساس پیدا ہوا اور اسی جذبۂ نفرت وحقارت نے انقلاب روس میں مقدمتہ الجیش کا کام دیا

(۵) جس طرح ہندوستان میں سیکڑوں قومیں آباد ہیں اور صدہا قسم کے مذاہب رائج ہیں اسی طرح روس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے ماسکو کے بڑے بازار میں کھڑے ہوجائیں تو آپ کی نظروں سے سلافی، قرغیز، قزاق، قلماق، جاذش، ترکمان، چینی، تاتاری، ترک، یہودی، مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے لوگ گزر جائیں گے۔ اور جس طرح ہندوستان میں "قومیت" کا پیدا ہونا دشوار ہے اسی طرح روس میں بھی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ جس ملک میں مذہب وقومیت کے اختلاف کا یہ عالم ہوگا وہاں اندرونی فتنہ وفساد کی کیا کمی ہوسکتی ہے۔

(۶) یہودیوں، مسلمانوں اور بودھ مت والوں کے علاوہ خود روس کے عیسائیوں میں صدہا فرقے موجود تھے جن میں کبھی اتفاق نہ پیدا ہوسکا تھا اور چونکہ دولت روس نے اپنا سرکاری مذہب یونانی کلیسا قائم کردیا تھا اس لئے جو لوگ اس فرقہ سے مختلف العقائد ہوتے تھے ان پر جبر وظلم کیا جاتا تھا اور اس لئے لوگوں کے سینوں میں جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی وہ انقلاب کے وقت پوری طرح بھڑک اٹھی۔

بیسویں صدی میں جبکہ جمہوریت کا سیلاب عظیم تمام عالم میں ملوکیت و استبداد کا تخت وتاج بہائے لئے جارہا تھا روس ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں جبر واستبداد اور حکومت شخصی کی لعنت پوری قوت کے ساتھ کام کررہی تھی اور عسکریت کے مظالم سے تمام آبادی چیخ اٹھی تھی۔ شہنشاہ کے فرامین کی تعمیل تلواروں اور نیزوں کی مدد سے کرائی جاتی تھی اور کامل ۳۰۰ سال روسی آبادی کو اسی عذاب میں مبتلا ہوئے گزر گئے تھے۔ بالآخر "مظلوم بڑھیا کے تنور" سے طوفان اٹھا اور سیلاب کے دروازے کھول دئے گئے۔ مگر یہ دروازے کس نے کھولے؟ غالباً ایک عورت نے! یہ عورت جرمن ریاست ہیسی کی شہزادی اور زار روس کی بیگم تھی یہ متکبر ومغرور، خوددار وخودسر مگر باہمت ومستقل مزاج عورت اپنے متلون مزاج، ضعیف القلب اور بے خوف شوہر پر اس قدر خوفناک اثر رکھتی تھی کہ خاندان شاہی کے افراد اور اخوان قاہرہ کے بڑے بڑے سردار بھی ہر وقت کانپا کرتے تھے اور اگر کسی کی طرف سے ذرا سی بھی مخالفت ہوتی تھی تو اسے جلا وطن کردیا جاتا تھا۔

الغرض روس میں آلام ومصائب اور بدنظمی کی انتہا ہوگئی تھی اور جس وقت جنگ عظیم میں اس نے حصہ لیا تو حالت یہ تھی کہ سامان رسد ناکافی تھا، سلسلۂ مواصلات متزلزل تھا، اور سامان جنگ کی بہم رسانی نہ صرف ناکافی تھی بلکہ اس میں قصداً خرابیاں پیدا کردی جاتی تھیں، چنانچہ پھٹنے والے گولے جو اسی کارخانوں میں بنائے جاتے تھے وہ دوسری

توپوں میں نہ آتے تھے سپاہی محاذ جنگ پر برہنہ پا بھیجے جاتے تھے - امریکن سفیر متعینۂ روس کا بیان ہے کہ "روسی سپاہی میدان جنگ میں اس طرح بھیجے جاتے تھے کہ دو آدمیوں کے پاس ایک رائفل ہوتی تھی اور یہ ہدایت کر دی جاتی تھی کہ جب ایک سپاہی مرجائے تو دوسرا اس کی بندوق لے لے" اس طرف یہ حالت تھی اور ادہر پروپیگنڈا کرنے والوں نے روسی فوج اور رعایا کی اخلاقی حالت اس درجہ خراب کر دی تھی کہ مرکزیت و تنظیم کا کہیں وجود ہی نہ رہگیا تھا - بعض وزراء جو ان حالات سے باخبر ہو کر احتجاج کرتے تھے وہ فوراً علیحدہ کر دئے جاتے تھے - چنانچہ تھوڑے ہی زمانہ میں کابینۂ وزارت کے اکیس ارکان یکے بعد دیگرے معتوب ہو کر برخواست ہوئے اور محض ایک آوارہ گرد فقیر راسپوٹین کے اشارہ سے - یہ شخص سائبیریا میں ایک کسان کے گھر پیدا ہوا تھا - اس کا دعویٰ تھا کہ اس کو الہام ہوتا ہے - یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ راسپوٹین کو راہب کہا جاتا تھا مگر وہ کلیسا کے کسی طبقہ سے تعلق نہ رکھتا تھا - بلکہ وہ ایک آوارہ گرد فقیر تھا جو روسی دیہات میں بہ تعداد کثیر پائے جاتے ہیں اس کے اس قدر مشہور ہونے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ اپنی مقناطیسی قوت یا توجہ سے کام لیکر بیماروں کو اچھا کر دیتا تھا -

روس کے نہ صرف عوام بلکہ تعلیم یافتہ طبقے بھی اس قدر ضعیف الاعتقاد واقع ہوئے ہیں کہ ان کے نزدیک معمولی شعبدہ گر بھی خدا رسیدہ اور صاحب کرامت سمجھا جاتا ہے - چنانچہ ۱۹۰۵ء سے قبل جبکہ راسپوٹین کی رسائی دربار میں نہ ہوئی تھی وہاں فرانس کا ایک قصاب زادہ (فلپ) ولی اللہ بنا بیٹھا تھا کہا جاتا ہے زارینہ پر راسپوٹین کا اس قدر زبردست اثر صرف اس وجہ سے تھا کہ وہ ولیعہد روس کو جو اکثر بیمار ہو جاتا تھا کسی پُر اسرار طریقہ سے اچھا کر دیا کرتا تھا

زار و زارینہ کی شادی کو اگرچہ عرصہ گذر چکا تھا مگر چار بیٹوں کے سوائے کوئی اولاد نرینہ پیدا نہ ہوئی تھی بالآخر ۱۹۰۴ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا جسپر زار و زارینہ دونوں ہر وقت جان چھڑکا کرتے تھے - لیکن بدقسمتی سے شہزادہ کو یہ بیماری تھی کہ اس کے جسم میں ذرا سی بھی خراش لگ جاتی تھی تو سیروں خون بہ جاتا اور بند ہونے کا نام نہ لیتا تھا - جس کی وجہ سے شہزادہ ہمیشہ کمزور و مضمحل رہتا تھا - علاج کی ہر ممکن تدابیر اختیار کی جاتی تھیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا - اس وقت اتفاق سے راسپوٹین کی رسائی دربار روس میں ہوتی ہے - یہ شخص حد درجہ شرابخوار و زانی تھا مگر اسی کے ساتھ بے انتہا ہوشیار و چالاک بھی تھا - اور کہا جاتا ہے کہ اپنی آنکھوں میں مقناطیسی قوت بھی رکھتا تھا - بہر حال کچھ بھی ہو - وہ شہزادہ کی تکلیف رفع کر دیتا تھا - الغرض ماں کی مامتا، مذہبی خوش عقیدگی اور راسپوٹین کا پُر اسرار عمل یہ سب ایسی چیزیں تھیں جنکی وجہ سے زارینہ اس کے اثر میں آگئی تھی ایک مرتبہ شہنشاہ زار کے حکم سے راسپوٹین کو پیٹروگراڈ سے نکال دیا گیا - لیکن اتفاق سے اسی زمانہ میں

ولیعہد بیمار پڑا ڈاکٹروں نے کوئی تدبیر اٹھا نہ رکھی مگر اُسے آرام نہ ہوا۔ اور خون کے بہنے سے اس کی حالت بہت نازک ہوگئی مجبور ہو کر زارینہ نے پھر راسپوٹین کو طلب کیا۔ اس نے آتے ہی شہزادہ کی خون آلود پٹیوں پر صلیب کا نشان بنایا اور پھر کچھ آہستہ آہستہ پڑھ کر بیمار پر دم کیا جس سے فوراً خون بند ہوگیا۔

راسپوٹین کے پُراسرار عمل کی نسبت دو نظریے قائم کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کو کسی قسم کی مقناطیسی قوت حاصل تھی۔ دوسرا یہ کہ ایک عورت دلیرو بوخہ جو راسپوٹین کی مرید اور زارینہ کی خواص تھی، وہ اوقات مقررہ پر شہزادہ کو ایک دوا کھلا دیتی تھی جس سے خون بہنے کا دورہ بڑھ جاتا تھا اور راسپوٹین آکر اس وقت شہزادہ پر عمل کرتا تھا جبکہ دوا کا اثر زائل ہو چکتا تھا۔

الغرض زارینہ اور اس کا حلقۂ احباب راسپوٹین کو ولی اللہ یا نبی یا مامور من اللہ خیال کرتا تھا۔ اور اس کا اثر اس درجہ قوی ہوگیا تھا کہ وزرا سلطنت اور افسران لشکر کا عزل و نصب بھی اسی کے اشارہ پر ہوتا تھا چنانچہ اسی کے کہنے سے ساز انوف وزیر خارجیہ کو برخاست کرکے اس کی جگہ دوسرا شخص مقرر کیا گیا جو جرمنی کا طرفدار تھا۔ اور اسی کی وجہ سے گرانڈ ڈیوک نکولاس معتوب ہو کر قفقاز کے محاذ جنگ پر بھیجا گیا۔ ایک مرتبہ راسپوٹین نے گرانڈ ڈیوک نکولاس کو جو اس وقت عساکر روس کا سپہ سالار تھا تار دیکر اجازت چاہی کہ وہ اگر روسی فوج کو برکت دینا چاہتا ہے۔ اس کا جواب گرانڈ ڈیوک نے یہ دیا کہ: "ضرور آؤ تاکہ میں تمھیں سولی پر لٹکا دوں" اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ راسپوٹین بگڑ گیا اور اس نے زارینہ پر اثر ڈال کر گرانڈ ڈیوک کو اس حد تک ذلیل کر دیا کہ آخرکار وہ ایک معمولی جنرل بنا کر ترکوں کے خلاف محاذ قفقاز پر بھیج دیا گیا۔

زارینہ نے جو خطوط زار کو محاذ جنگ پر صدہا کی تعداد میں ارسال کئے تھے ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس میں راسپوٹین کی تعریف نہ کی گئی ہو۔ خیرخواہ افسروں کے خلاف زور نہ ڈالا گیا ہو ضعیف الطبع مردوں کی لگام عورتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مرد جذبات کے مرید ہوتے ہیں اور یہ جذبات عورت پیدا کرتی ہے۔ مرد انقلاب کرتے ہیں مگر واقعات کی ترتیب عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زار چاہتا تھا کہ وہ قوم کے مطالبات پورے کرے مگر زارینہ جو غرور و نخوت کا مجسمہ تھی ہمیشہ زار کو اس کے ارادوں سے منحرف کر دیتی تھی۔ اپنے قول کے ثبوت میں ہم زارینہ کے دو خطوں کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ انقلاب روس میں سب سے بڑا ہاتھ ایک عورت ہی کا تھا۔ وہ اپنے ایک خط میں شہنشاہ کو نصیحت کرتی ہے:۔

شہنشاہ بنو! اور یہ یاد رکھو کہ تم مطلق العنان شہنشاہ ہو۔ جب اپنے وزیروں سے گفتگو کرو تو اس طرح جیسے کوئی آقا اپنے غلاموں سے کرتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ نیکدل ہونا اچھا نہیں۔ دنیا سے یہ نہ کہو کہ تم ملک پر تباہی لا رہے ہو۔ تمھاری فرشتہ خصلتی، تمھاری تحمل مزاجی، اور تمھارا صبر و ضبط تمام دنیا کو معلوم ہے۔ اسی سے ہر شخص فائدہ اٹھاتا ہے جلدی کرو

میری جان جلدی۔ تمھاری ننھی سی بیوی تم کو ہمیشہ آگے بڑھاتی رہیگی"

ایک دوسرے خط میں اس طرح حکم دیتی ہے :۔

"پیٹر اعظم، اور شہنشاہ پال کی طرح بنو۔ سب کو کچل ڈالو۔ ہنسو نہ، لوگ تم پر حکومت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور میں یہ چاہتی ہوں کہ تم ان پر حکومت کرو"

ان باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب دسمبر ۱۹۱۶ء میں قوم کی طرف سے حکومت دستوری کا مطالبہ کیا گیا۔ زار نے جواب دیا کہ :۔ جس بات کی آپ درخواست کرتے ہیں وہ ناممکن ہے میں نے اپنی تاجپوشی کے دن قسم کھائی تھی کہ ہمیشہ مطلق العنان رہونگا۔ اور مجھے اپنی یہ قسم اپنے بیٹے کی خاطر قائم رکھنا پڑے گی"۔

الغرض جب لوگ بالکل مجبور ہوگئے تو شرفا کی ایک جماعت نے جن میں سے بعض خاندان شاہی سے بھی تعلق رکھتے تھے موت اور زندگی کو اپنے ہاتھ میں لینے کا عزم صمیم کرلیا اور پہلا شکار جو منتخب کیا گیا وہ راسپوٹین تھا۔

۳۰ دسمبر ۱۹۱۶ء کی رات کو لوگ اس "مامور من اللہ" راسپوٹین کو بہکا کر پرنس فیلکس یوسفاف کے محل میں لے گئے جو لب دریا واقع تھا اور اس کو ہلاک کرکے پانی میں غرق کردیا۔

جب زارینہ کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ بہت غضبناک ہوئی اور اس نے تمام سازش کرنے والوں کو جلا وطن کرنا شروع کیا۔ خاندان شاہی کے افراد اور تمام روسا و امرا نے زار سے عرض کیا کہ قوم غضبناک ہو رہی ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ اس کے مطالبات پورے کردئے جائیں چنانچہ اس محضر پر خاندان شاہی کے سترہ ارکان نے دستخط کردیئے لیکن زارینہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ حتی کہ اس نے اپنی ساس یعنی زار کی ماں کو بھی پایہ تخت سے نکلوادیا اور اس طرح گویا اس نے انقلاب کی بنیاد کو اور زیادہ مستحکم کردیا۔

راسپوٹین کے ختم ہوتے ہی پروٹوپاپوف وزیر داخلیہ کو موقع مل گیا کہ زارینہ پر اپنا اثر قائم کرے چنانچہ اس نے فوراً یہ اعلان کردیا کہ راسپوٹین کی روح اس کے سر آتی ہے۔ بعض اوقات پبلک کے سامنے اس پر وجدانی حالت طاری ہوجاتی تھی اور جب کبھی وہ زارینہ سے باتیں کرتا ہوتا تو وقتاً فوقتاً انگلی کے اشارہ سے بتلانے لگتا کہ راسپوٹین کی روح وہ کھڑی ہے۔ کچھ دن بعد وہ اس سے بھی تجاوز کرگیا اور کہنے لگا کہ خود حضرت مسیح کھڑے ہوئے شہنشاہ بیگم کو برکت دے رہے ہیں اسی کے ساتھ اس نے مکر و فریب سے بھی کام لیا۔ یعنی اکناف ملک میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے اس نے ایسے خطوط ملکہ کے پاس روانہ کرائے جن میں گویا زراعت پیشہ طبقہ زارینہ کی مدحت سرائی کرتے ہوئے التجا کررہا ہے کہ وہ اپنی استبدادی پالیسی پر بدستور قائم رہے۔

مگر اب ان تدبیروں کا چلنا مشکل تھا۔ کیونکہ حکومت کے خلاف اب علی الاعلان مظاہرے ہونے لگے تھے یعنی راسپوٹین

لہرانے لگا۔ اور دکانوں کے سامنے بلوی کے قتل کو چند دن گزرے تھے۔ پایۂ تخت کے بازاروں میں "سرخ جھنڈا" لہرانے لگا۔ اور دکانوں کے سامنے بلوی ہونے لگے۔ گورنمنٹ کی کوئی نہیں سنتا تھا۔ ہر طرف فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیوقوف پروٹو پاپوف نے رعایا پر تشدد کرنا شروع کر دیا۔ اور بازار میں ہر طرف مشین گنیں نصب کر دی گئیں۔ چنانچہ ۸ مارچ کو پیٹروگراڈ میں جب حکومت کے خلاف جلوس نکالا گیا تو فوجیوں نے پروٹو پاپوف کے حکم سے مجمع پر فیر کر کے سیکڑوں کو خاک و خون میں لٹا دیا لیکن اس طرف مجمع اور زیادہ مشتعل ہو گیا اس نے بھی کافی بیدردی سے کام لیا اس وقت زار پایۂ تخت سے باہر فوجی ہڈکوارٹرس میں مقیم تھا۔ ۱۱ مارچ کو اس نے کابینۂ وزارت کو برخاست کرنے کی کوشش کی مگر بے سود کیونکہ اب صورت حال قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ پریشان ہو کر پریزیڈنٹ موسیو روڈزیان کو نے زار کی خدمت میں حسب ذیل تار ارسال کیا:-

"صورت حال نازک ہو گئی ہے۔ پایۂ تخت میں ہر طرف بدنظمی پھیلی ہوئی ہے۔ حکومت مفلوج ہو گئی ہے ایندھن اور سامان خوراک کی بہم رسانی کا سلسلہ متزلزل ہو گیا ہے ہر طرف بے چینی اور شورش پھیلتی جاتی ہے۔ بازاروں میں اندھا دھند گولیاں چلتی ہیں۔ فوراً کسی ایسے شخص کی ماتحتی میں وزارت قائم کر دی جائے جس پر ملک کو اعتماد ہو"

مگر شہنشاہ زار نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ زارینہ کے خطوط نے اس کی قوت فیصلہ ماؤف کر دی تھی۔ ۱۲ مارچ کو اس نے دوسرا تار اس مضمون کا دیا:-

"صورت حال بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اگر کچھ کرنا ہے تو ابھی کیجئے کیونکہ سر سے پانی گذر جائیگا۔ آخری گھنٹی بج گئی ہے اور وطن اور خاندان شاہی کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے"۔

اسی روز دوپہر کے وقت زار کے بھائی گرانڈ ڈیوک مائیکل الگزینڈر رووچ نے پیٹرو گراڈ سے بذریعہ ٹیلیفون زار کی خدمت میں عرض کیا کہ فوراً ایسی گورنمنٹ قائم کر دی جائے جس پر ملک کو اعتماد ہو۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ مشورہ کا شکریہ مگر اس کا فیصلہ ہم خود کر سکتے ہیں"۔ اسی کے بعد ایک تار پرنس گولٹسائن کی طرف سے زار کی خدمت میں پہونچا جس میں حسب سابق مشورہ دیا گیا تھا۔ مگر اس کے جواب میں شہنشاہ کا یہ فرمان جاری ہوا کہ "بلوے فرو کرنے کے لئے مزید سپاہ پیٹرو گراڈ بھیجدی جائے"۔

اس واقعہ کے بعد ہی شہنشاہ بذریعہ ٹیلیفون زارینہ سے ایک گھنٹہ تک باتیں کرتا رہا اور اس گفتگو کے بعد فوراً زار نے پرنس گولٹسائن کو لکھا کہ موجودہ حکومت میں ہرگز کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اور حسب معمول حکم دیا کہ پیٹرو گراڈ کی قلعہ نشین فوج میں اگر کسی قسم کی انقلاب انگیز تحریک پائی جائے یا وہ شورش کرے تو فوراً سر کچل دیا جائے۔ لیکن اب شورش اس قدر وسعت اختیار کر چکی تھی کہ آخر کار زارینہ نے بھی خوفزدہ ہو کر شہنشاہ کو اس

مضمون کا تار دیا کہ "ملک کو مراعات کا دیا جانا ناگزیر ہوگیا ہے" یہ پہلا موقعہ تھا کہ زارینہ کا سر نیچا ہوا۔ مگر اب اس کا وقت نہ تھا۔

۱۳ ر مارچ کو زار نے بذریعہ ٹرین اپنے پایۂ تخت تک پہونچنے کی کوشش کی مگر باغی فوج نے بجائے پیٹرو گراڈ کے بمقام پسکاف پہونچا دیا۔ ۱۴ ر مارچ کو شہنشاہ زار نے سلسلۂ ٹیلیفون قائم کرکے پریزیڈنٹ رودزیانکو سے مراعات کے متعلق گفتگو کرنا شروع کی لیکن اس طرف سے جواب آیا "اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ سب فوجین انقلاب پسندوں سے مل گئی ہیں۔ اب عطائے مراحمات کا وقت نہیں بلکہ تخت وتاج سے دست برداری کا وقت ہے" ۱۵ ر مارچ کو قوم کے دو نمائندے گچکاف اور شولگین زار کی خدمت میں پہونچے اور اس کو قوم کے منشا سے مطلع کیا۔ زار سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور ٹھنڈی سانس لیکر بولا :- ہائے مجھے دھوکا دیا گیا - اور دست برداری پر دستخط کردئے۔ یہ تاریخی دستاویز ۱۵ ر مارچ ۱۹۱۷ء کو گیارہ اور بارہ بجے شب کے درمیان ہوئی۔ زار نے اپنے بھائی کے حق میں تخت وتاج سے دست بردار ہوکر پنسل سے کاغذ پر دستخط کردئے - اور بطور گواہ ماڈنٹ فریڈریکس لارڈ چیمبرلین نے سیاہی سے دستخط کئے - لیکن گرانڈ ڈیوک یعنی زار کے بھائی نے یہ خطرناک منصب قبول کرنے سے انکار کردیا - اور ۱۶ ر مارچ کو وہ بھی تخت وتاج سے دست بردار ہوگیا۔

تخت وتاج سے دست بردار ہونے سے پیشتر شہنشاہ زار کے خطابات اس قدر تھے کہ اگر انھیں مفصل درج کیا جائے تو کم از کم نصف صفحہ سیاہ ہوجائے لیکن اس دست برداری کے بعد عارضی گورنمنٹ نے حکم جاری کردیا کہ سابق زار کے پاس جس قدر خطوط اور اخبارات وغیرہ بھیجے جائیں ان کے پتہ میں سوائے لفظ کرنل کے اور کسی خطاب سے زار کو مخاطب نہ کیا جائے۔ یہی حال زارینہ کا ہوا یعنی اس کے نام سے پہلے "ہر مجسٹی" کا لفظ اڑا دیا گیا اور اب وہ صرف معمولی "الگزینڈرا" رہ گئی۔

دست برداری کے دوسرے دن زار ماہیلیف کو روانہ ہوگیا جو بڑی فوج کا ہڈکوارٹر ہے تاکہ اپنی فوج سے رخصت ہوجائے - یہاں وہ ۲۱ ر مارچ تک رہا - اسی دوران میں گورنمنٹ کے چار نمایندے ماہیلیف پہونچے اور انھوں نے جنرل الگزیف کو مطلع کیا کہ سابق زار حراست میں لے لیا گیا ہے لہٰذا اُسے زارسکو سیلو روانہ کردیا جائے اس سے قبل زار نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ کریمیا چلا جائے اور بقیہ زندگی اپنی شاہی جاگیر میں بسر کرے - مگر یہ درخواست گورنمنٹ نے منظور نہیں کی۔ اس کے بعد آخری درخواست اس نے یہ کی کہ اُسے اپنی فوج سے رخصت ہونے کی اجازت دیجائے چنانچہ اس بات کی اجازت دیدی گئی اور اُس نے ایک رخصتی پیغام فوج کے نام مرتب کیا جس میں سپاہیوں کو نصیحت کی گئی تھی کہ وہ ملک پر اپنی جانیں نثار کردیں اور آخری دم تک دشمن کے سامنے سے منھ نہ موڑیں۔ مگر گورنمنٹ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ اس پیغام کو شائع نہ کیا جائے۔

۱۲ مارچ کو ایک نہایت دردناک واقعہ پیش آیا۔ یعنی زار کا عزیز گرانڈ ڈیوک سائرل اپنی رجمنٹ لیکر ماہیلیف پہونچا۔ یہ وہ شخص تھا جس کے سینہ پر سر رکھ کر عالم شہزادگی میں زار سویا کرتا تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کے دل بھر آئے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ دوسرا واقعہ اسی روز یہ ہوا کہ وہ پہلا شخص جس نے دست برداری کے بعد زار کا ساتھ دیا وہ اس کی والدہ تھی مگر جب ۲۱ مارچ کو زار گرفتار کرکے زارسکوسیلو بھیجا گیا تو ماں اور بیٹے دونوں کو جدا کر دیا گیا۔ اور پھر ان کو ایک دوسرے کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ دل شکستہ ماں ہجرت کر کے ڈنمارک چلی گئی اور ہمیشہ روتی رہی۔

۲۲ مارچ کو پرنس ڈانگرو کی مارشل آف دی کورٹ کی معیت میں زار اپنے قصر زارسکوسیلو واقع پیٹرو گراڈ میں پہونچا جہاں زارینہ اس کا بیقراری کے ساتھ انتظار کر رہی تھی۔ اسی اثنا میں زار کے پہونچنے سے قبل جنرل کارنیلاف کمانڈر افواج علاقہ پیٹرو گراڈ زارینہ کو اطلاع دے چکا تھا کہ وہ گورنمنٹ کے حکم سے زیر حراست کر لی گئی ہے یہ خبر سنتے ہی زارینہ پر ایسا گہرا سکوت طاری ہوا گویا اس کی روح پرواز کر گئی ہے اب اس کو انقلاب کی حقیقت کا احساس ہوا جنرل کارنیلاف کی آمد پر زارینہ پوری شان کے ساتھ ملاقات کے کمرہ میں جا بیٹھی اور جنرل مذکور کو حاضر ہونے کی اجازت دی۔ جس وقت جنرل زارینہ کے سامنے پہونچا تو اس نے اس مغرور و متکبر عورت کو جو چند روز قبل کرۂ ارض کے چھٹے حصہ کی مالک تھی اس طرح خطاب کیا:۔

جنرل:۔ مادام! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کھڑی ہو جائیں اور جو حکم میں آپ کو پہونچاتا ہوں اُسے گوش ہوش سنیں۔

زارینہ:۔ حکم!

گزشتہ تین صدی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ خاندان رومانوف کے کسی فرد نے اس قسم کے الفاظ سنے ہوں مگر کیا کرتی مجبور تھی اور آخر کار اُسے یہ احکام سننا پڑے کہ وہ خود کو زیر حراست سمجھے۔ آئندہ افسر انچارج قصر شاہی کی اجازت کے بغیر نہ کوئی خط لکھے نہ وصول کرے تن تنہا باغ یا احاطہ میں گلگشت نہ کرے۔ اور جو حکم آئندہ دیا جائے اس کی فوراً تعمیل کرے۔

جس دن سے زارینہ الگزینڈرا نے سرزمین روس پر قدم رکھا تھا اس روز سے سیکڑوں بدشگونیاں ہو رہی تھیں۔ عین تاجپوشی کے دن پولس اور عوام کے درمیان تصادم ہوا جس میں صدہا آدمی مارے گئے قصر شاہی میں اسی شب بزم رقص و سرود برپا تھی مگر ماسکو کے سیکڑوں گھروں میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ لوگوں نے اس واقعہ کو شگون بد سمجھا تھا۔ اہل روس کے دل کبھی زارینہ کی محبت سے معمور نہ ہوئے اور وہ اسکو ہمیشہ مشتبہ نظروں سے دیکھتے اور غیر سمجھتے رہے۔

الغرض زار اور اس کا خاندان پانچ ماہ تک اپنے قصر گرما میں مقید رہا۔ لیکن اُن کے آرام و راحت اور احترام و عزت کا گورنمنٹ کو بہت خیال تھا۔ زار اپنا وقت مختلف قسم کے تفریحی مشاغل میں صرف کرتا تھا۔ جب کبھی بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا جاتی تھی تو باغ میں گلگشت کرنے لگتا یا بیلچہ لیکر زمین کھودتا اور درخت نصب کرتا یا برف کھودنے لگتا۔ یا اگر زیادہ ورزش کی طرف طبیعت مائل ہوتی تو لکڑی چیرنے لگتا تھا۔ مگر زارینہ ہر وقت اپنے بچوں کی غور و پرداخت اور خدمت میں مصروف رہتی تھی کیونکہ تین شہزادیاں اور ولیعہد بیمار ہو گئے تھے۔ اور جس وقت اسے فرصت ملتی تھی تو وہ انجمن صلیب احمر کے لئے کپڑے سینے یا زخمیوں کے لئے پٹیاں بنانے لگتی۔ مگر زار و زارینہ کو ایک تکلیف انتہا درجہ کی یہ تھی کہ انھیں کھانے کے وقت بھی باتیں کرنے کی اجازت نہ دی جاتی تھی

قصر شاہی باقاعدہ محصور رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک سنتری نے ہیجان پیدا کر دیا۔ اس نے رات کے وقت بندوق کا فیر کرکے اپنے افسر کو بلایا اور رپورٹ کی کہ قصر کی کھڑکیوں میں سے سُرخ و سبز روشنی کے ذریعہ سے خبر رسانی کی جا رہی ہے۔ افسر فوراً قصر کے اندر پہونچا اور تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ زار آرام کرسی پر بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا اور اس کے لیمپ کا شیڈ سُرخ تھا۔ دوسری طرف شہزادی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کچھ سی رہی تھی اور اس کے لیمپ کا شیڈ سبز تھا۔ جب کبھی وہ ٹوکری میں سے قینچی یا کوئی دوسری چیز اٹھانے کے لئے جھکتی تو کھڑکی میں سے یکے بعد دیگرے سرخ و سبز روشنیاں نمودار ہوتی تھیں یہی بات دیکھ کر سنتری گھبرا گیا تھا۔ اُس نے سمجھا کہ سرخ و سبز روشنیوں سے اشارہ کرکے کسی سے باتیں کی جا رہی ہیں۔

موسیو کرنسکی جو عارضی گورنمنٹ کا پرکیوریٹر جنرل تھا۔ اکثر قصر شاہی میں جاکر ملاقات کیا کرتا تھا۔ ۱۳ اپریل کو اس نے جاکر زارینہ سے ملاقات کی اور کہا کہ :- ملکۂ انگلستان سابق زارینہ کی خیر و عافیت دریافت فرماتی ہیں"۔
یہ سنکر زارینہ کسی قدر شرمندہ ہوگئی کیونکہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اسے "سابق زارینہ" کے لفظ سے خطاب کیا گیا۔
برطانیہ کو معزول زار و زارینہ کی حفاظت و سلامتی کا بڑا خیال تھا۔ اور برطانیہ کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ خاندان شاہی کو انگلستان بھیجدیا جائے مگر یہ تجویز نامنظور ہوئی۔ کیونکہ اس وقت بالشویکوں کا غیظ و غضب بھڑکا ہوا تھا۔ اور انھوں نے یہ دھمکی دی کہ اگر خاندان زار کو انگلستان بھیجنے کا ارادہ کیا گیا تو وہ ریلوے لائن اُکھاڑ کر پھینکدیں گے۔ یہ حالت دیکھ کر گورنمنٹ مجبور ہوگئی۔ ممکن تھا کہ بعد میں یہ تجویز بروے کار آسکتی مگر اسی اثنا میں لائڈ جارج کی پالیسی بدل گئی تھی۔
ایام اسیری زار نے تو قطعی بے پروائی کے ساتھ بسر کر دئے مگر زارینہ کو سخت صدمہ تھا۔ وہ ایک طرف رعایا سے بگڑی ہوئی تھی تو دوسری طرف زار سے کیونکہ اس نے اپنی دست برداری کے ساتھ ولیعہد کو بھی محروم الارث کر دیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اب اس کے خاندان کی قسمت کا فیصلہ ہوچکا ہے چنانچہ ایک روز اس نے مادام موچا ناؤ سے کہا کہ :-

"یہ لوگ ہمیں کسی قلعہ میں قید کر دینگے اور پھر ہم کو اسی طرح قتل کر ڈالیں گے جیسا کہ فرانسیسیوں نے لوئی شانزدہم کو کیا تھا" جب تقدیر اس طرح پلٹ گئی تو شہزادی انا ستانیہ محسوس کر کے ایک دن رونے لگی۔ اس پر زارینہ نے کہا: "ابھی کیوں روتی ہو، یہ گریہ و زاری کسی دوسرے دن کے لئے ملتوی کرو"
۱۰ اگست کو حکومت کے وزیر اعظم نے زار سے ملاقات کی اور حکم سنایا کہ خاندان شاہی سائبیریا کو منتقل کیا جائے گا۔"

خاندان زار کو اس طرح یکایک سائبیریا میں منتقل کئے جانے کی وجہ موسیو کرنسکی نے شہنشاہ کو یہ بتائی کہ آج کل ملک میں فتنہ و فساد برپا ہو رہا ہے اس لئے خاندان زار کی جانوں کو سخت اندیشہ ہے اور حکومت یہی مناسب سمجھی ہے کہ خاندان زار کو سائبیریا بھیج دیا جائے۔

الغرض ۱۴ اگست کو صبح کے چھ بجکر دس منٹ پر سائبیریا کا سفر شروع ہوا۔ اس سے ایک روز قبل ولیعہد کی تیرہویں سالگرہ منائی گئی تھی۔ چھیالیس آدمی ... کے ساتھ بطیب خاطر جانا منظور کیا۔ اس طرح علاوہ فوجی دستہ کے شاہی جماعت ترپین آدمیوں پر مشتمل تھی ... چونکہ سامان بہت زیادہ تھا اس لئے دو ٹرینیں درکار ہوئیں۔ مقام ٹیومین تک بذریعہ ریل سفر کیا گیا۔ پھر وہاں سے ... خانی جہاز میں سوار ہو کر دریائی سفر کیا گیا۔ ۱۹ اگست سہ پہر کو یہ جلا وطن شاہی جماعت منزل مقصود پر پہونچی۔

ٹوبولسک میں چند ماہ تک نہایت امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر ہوتی رہی۔ شہر کے گرجا میں خاندان شاہی کے لئے خاص طور پر نماز ہوتی تھی ... میں شریک ہونے کے لئے خاندان بھر کو اجازت دیدی جاتی تھی۔ بچے ہر طرح خوش تھے۔ شہر کے لوگ خاندان ... سے ادب و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اور شاہی خاندان کو ادب کے ساتھ سلام کرتے تھے۔ بعض لوگ ... کھانے پینے کی چیزیں بھی لا کر پیش کرتے تھے۔ مگر شکایت تھی تو یہ کہ زندگی شب و روز یکساں گذر رہی ہے اور تو ... نہیں ملتی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

ستمبر ۱۹۱۷ء سے اس یکساں زندگی میں خلل پڑنا شروع ہوا ... پانکراتوف اور نکولسکی یہاں پہونچے اور انھوں نے آتے ہی خاندان شاہی کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محل کے در و دیوار پر خاندان شاہی کو گالیاں لکھی جانے لگیں۔ سپاہیوں نے سلام کرنا بند کر دیا۔ شہر کے گرجا میں جانا بھی روک دیا گیا اور نکولاس کو حکم دیا گیا کہ وہ آئندہ سے اپنے شاہی نشانات اور تمغے استعمال نہ کرے۔

ادھر ماسکو میں رفتہ رفتہ موسیو کرنسکی کی حکومت کا زوال اور بالشویک کا عروج شروع ہوا۔ کرنسکی کے بجائے لینن کا نام لیا جانے لگا۔ دستوری جمہوریت کی جگہ اشتراکیت عسکریہ نے لے لی۔ گویا روس میں دوسرا انقلاب

رونما ہوگیا جس نے خاندان رومانوف کو اس کے بدترین دشمنوں کے حوالہ کردیا اور ماہ نومبر میں خاندان شاہی پر سختیاں ہونا شروع ہوگئیں۔ یہاں تک کہ کافی، دودھ، بالائی، مکھن اور شکر بھی بند کردی گئی۔

۲۲ اپریل کو جاکولیف یہاں پہونچا اور زار کے محل میں جاکر اس نے زارینہ کو حکم دیا کہ وہ فوراً کمرہ سے چلی جائے مگر اس نے تعمیل کرنے سے انکار کردیا۔ یہ سنکر جاکولیف نے زار سے کہا کہ۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ماسکو کی مرکزی اگزیکیٹو کمیٹی کا نمائندہ ہوں اور مجھے اس لئے مامور کیا گیا ہے کہ میں شاہی خاندان کو ٹوبولسک سے لیجاؤں۔ لیکن چونکہ اس وقت آپ کا بیٹا بیمار ہے اس لئے میرے پاس دوسرا حکم اس مضمون کا ہے کہ میں صرف آپ کو یہاں سے لیجاؤں"۔ زار نے یہ سنکر کہا کہ میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔ اس پر جاکولیف نے کہا کہ آپ انکار نہ کریں۔ کیونکہ میں گورنمنٹ کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر آپ انکار کریں گے تو میں یا تو آپ کو جبراً یہاں سے لیجاؤنگا یا مستعفی ہوجاؤنگا۔ دوسری صورت میں ممکن ہے کہ گورنمنٹ کسی زیادہ سخت افسر کو تعینات کرنیکا فیصلہ کرے۔ بہرحال اگر آپ تنہا چلنا پسند نہیں کرتے تو آپ اوروں کو بھی اپنے ساتھ لے سکتے ہیں بہرحال آپ تیار ہوجائیں۔ کیونکہ ہم کل چار بجے روانہ ہوجائیں گے"۔

جاکولیف نے یہ نہیں بتایا کہ وہ خاندان شاہی کو کہاں لیجانا چاہتے ہیں۔ الغرض یہ قرار پایا کہ زار کے ساتھ زارینہ اور شہزادی ماریہ جائیں اور دو شہزادیوں کو مع ولیعہد وہیں چھوڑ دیا جائے۔ لیکن ان کے روانہ ہونے سے چھ گھنٹہ پیشتر ٹوبولسک سے ایک اور شخص چپ چاپ روانہ ہوچکا تھا۔ یہ ایک یہودی النسل جاسوس زاسلافسکی تھا۔ یہ شخص مقامی گارڈ سے ملکر جاکولیف کی باتیں معلوم کیا کرتا تھا اور بذریعہ تار ماسکو میں سفردلاف کو اطلاع دیتا تھا یہ شخص وہاں سے روانہ ہوکر چھ گھنٹہ پیشتر ایکاٹیرنبرگ پہونچا۔ اور وہاں اس نے موت کا جال بچھانا شروع کردیا

۲۶ اپریل کو ٹوبولسک سے سفر شروع ہوا۔ چونکہ اس وقت کوئی معقول سواری دستیاب نہ ہوسکتی تھی اس لئے دیہاتی چھکڑوں میں سفر کیا گیا۔ اور چونکہ راستہ خراب تھا اس لئے مسافروں کو سخت اذیت پہونچی اور اسی طرح ٹیومین کے ریلوے اسٹیشن تک ۲۰۰ میل کا سفر کیا گیا۔ ۲۸ اپریل کو ٹوبولسک میں خبر دی گئی کہ مسافر بخیریت ہیں۔ لڑکے کا حال بیان کرو"۔

اس کے بعد ۷ مئی تک بالکل خاموشی طاری رہی۔ بعد ازاں ایکاٹرنبرگ سے خیروعافیت کا خط پہونچا۔ اور ۲۳ مئی کو ولیعہد مع اپنی بہنوں کے اپنے والدین کے پاس پہونچ گیا۔ لیکن اب ولیعہد کے اتالیقوں کو اس سے علیحدہ کردیا گیا تھا۔

اس کے بعد قیدمیں بے انتہا سختی شروع ہوگئی۔ عزت واحترام کی جگہ شقاوت برتی جانے لگی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نگہبان سپاہی اور افسر جوش انتقام سے اندھے ہورہے ہیں۔ ایپاتیف کا محل جس میں خاندان

شاہی تھا۔ جیلخانہ بن گیا۔ محل کے چاروں طرف تختوں سے دو حصار تعمیر کرا دیئے گئے۔ محل کی تمام کھڑکیاں بند کر دی گئیں حصار اور محل کے چپہ چپہ پر سخت پہرہ لگا رہتا تھا۔ ایک روز ایک شہزادی نے گھبرا کر جو کھڑکی کھولی تو فوراً سنتری نے گولی مار دی۔ شہزادی بال بال بچ گئی۔ محل کے سامنے ایک مکان کی چھت پر مشین گن نصب کر کے اس کا منہ محل کی طرف کر دیا گیا۔ محل کے زیریں منزل میں بالشویک گارڈ تعینات کیا گیا اور دوسری منزل پر خاندان شاہی کو رکھا گیا۔ جب شہزادیاں پاخانہ یا غسل خانہ میں جاتیں تو ان کو سپاہی چھیڑتے اور فحش بکتے۔ کھانا بہت خراب دیا جانے لگا۔ گارڈ کے سپاہی خاندان شاہی کے ساتھ بیٹھکر کھانا کھاتے۔ اور اس وقت بھی پریشان کرتے ایک روز ادویف زار و زارینہ کے درمیان بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے دفعتہً اپنا بازو اس طرح موڑا کہ کہنی زار کی ٹھوڑی میں لگی۔ محل کے در و دیوار خصوصاً پاخانہ اور غسل خانہ کی دیواروں پر فحش باتیں لکھی جاتیں جن سے خاندان شاہی کو سخت روحانی اذیت پہونچتی۔ راسپوٹین اور زارینہ کے فحش کارٹون کھینچکر دیواروں پر بنائے جاتے ایک مرتبہ گارڈ کا ایک سپاہی حصار کی لکڑیوں پر چڑھ کر زارینہ کے کمرہ کی کھڑکی تک پہونچا اور اس کے سامنے فحش گیت گانے لگا۔ شہزادیوں نے باغ میں ایک جھولا ڈال رکھا تھا سپاہیوں نے اس کے تختے پر فحش باتیں کھود دیں خاندان شاہی کو باغ کی سیر کے لئے صرف پانچ منٹ دیئے جاتے تھے۔

اوائل ماہ جولائی میں گارڈ بدلا اور پہلے سے بھی زیادہ سختی کی جانے لگی۔ اب اس منظر میں تین نئے آدمی نمودار ہوئے جیورانسکی جو گارڈ کا افسر تھا۔ گولوشکین جو بالشویک پارٹی کا سرگرم ممبر تھا اور بیلو بورودُاف جو کوہستان یورال کی سودیٹ گورنمنٹ کا نوجوان پریزیڈنٹ تھا۔ اس کی عمر صرف ۲۵ سال تھی یہ تینوں روسی خفیہ پولس کے سرگرم ممبر تھے۔ ان تین نوواردوں کے ساتھ لٹویہ کے رہنے والے دس سپاہی بھی آئے تھے جو اپنی شقاوت قلبی اور خون آشامی میں جواب نہ رکھتے تھے۔

اس دوران میں گولوشکین دو ہفتہ کے لئے چلا گیا اور وہاں سفر دلات سے صلاح و مشورہ کرتا رہا۔ جب ۱۲ جولائی کو گولوشکین ماسکو سے واپس آیا تو اس نے اسٹورجیف نامی ایک پادری کو طلب کر کے حکم دیا کہ وہ خاندان شاہی کے لئے نماز پڑھے۔

۱۵ جولائی کو چار عورتیں محل میں لائی گئیں اور ان سے تمام زمین صاف کرائی گئی۔ اسی روز دو راہبہ عورتیں خاندان شاہی کے لئے دودھ لیکر آئیں ان کو حکم دیا گیا کہ وہ دوسرے روز نہ صرف دودھ بلکہ ٹوکری میں پچاس عدد انڈے بھی لائیں۔ چنانچہ ۱۶ جولائی کو اس فرمائش کی تعمیل کر دی گئی۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ انڈے جلادوں کے ناشتہ کے لئے منگائے گئے ہیں چنانچہ جس جگہ لاشیں جلائی گئی تھیں وہیں انڈوں کے چھلکے بھی ملے۔

۱۶ جولائی کو بروز منگل خاندان شاہی کو قتل کرنے کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ پانچ سرکاری لاریاں آدھی رات

کے وقت محل کے پاس لاکر کھڑی کی گئیں - ان میں ایک لاری پر دو پیپے پیٹرائن تیل کے اور چند مرتبان گندھک کے تیزاب کے رکھے ہوئے تھے۔

۱۶ جولائی ۱۹۱۸ء کو نصف شب کے وقت خاندان شاہی پڑا سو رہا تھا کہ جیورافسکی نے شہنشاہ زار کے کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب زار نے دروازہ کھولا تو جیورافسکی نے کہا کہ امیرالبحر کولچک کی فوج ایکاٹیرنبرگ آرہی ہے اور اب بازاروں میں گولیاں چلنے والی ہیں - اس لئے خاندان شاہی کو نیچے کی منزل میں اتر آنا چاہیئے اُس نے فوراً کہنا مان لیا اور تمام خاندان شاہی کپڑے پہنکر نیچے اتر آیا - اس وقت ان کے کپڑوں اور بستروں میں تقریباً پانچ لاکھ ڈالر کے جواہرات خفیہ طور پر سِلے ہوئے تھے۔

اوپر کی منزل سے اتر کر یہ لوگ نیچے صحن میں پہونچے - اور پھر وہاں سے ایک دالان میں گئے۔ اس کے آگے ایک کمرہ تھا جس کا صرف ایک دروازہ تھا - اور کمرہ کے اندر کافی روشنی ہو رہی تھی - جیورافسکی نے خاندان شاہی کو کمرہ میں داخل ہونیکا حکم دیا۔ سب سے پہلے وہ خود داخل ہوا اس کے بعد خاندان شاہی کے افراد و متوسلین جب یہ سب وہاں پہونچ گئے تو گیارہ سپاہی ریوالوروں سے مسلح داخل ہوئے۔

کمرہ میں داخل ہوکر نکولاس نے خاندان شاہی کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں طلب کیں جو فوراً مہیا کی گئیں اُن پر سب لوگ بیٹھ گئے تو جیورافسکی نے یکایک شہنشاہ سے کہا کہ :- چونکہ تمھارے رشتہ دار تمھاری رہائی کی کوشش کر رہے ہیں اور ہم تمھیں بچا نہیں سکتے، اس لئے ہم مجبور ہیں کہ سب کو قتل کر دیں - زار نے دریافت کیا :- "تمھارا کیا مطلب ہے"؟ جیورافسکی نے کہا :- "یہ" اور جیب سے ریوالور نکال کر فوراً زار کو گولی مار دی اور وہ مظلوم ایک ہی گولی میں فوراً سرد ہوگیا۔

اس کے بعد گیارہ فیر اور ہوئے اور تمام خاندان شاہی خاک و خون میں غلطاں نظر آنے لگا - بارہواں فیر اس واسطے کیا گیا کہ خاندان شاہی کے ساتھ ایک کتا بھی تھا۔

اس کے بعد تمام لاشیں موٹر لاریوں پر بار کرکے ایکاٹیرنبرگ سے بارہ میل کے فاصلہ پر جھیل السیٹ کے کنارہ کے جنگل میں پہونچادی گئیں اور وہاں مٹی کا تیل اور تیزاب ڈال کر اُن کو پھونک دیا گیا۔

جنوری ۱۹۳۳ء کا نگار

جس میں عہد وحشت سے لیکر اس وقت تک عالم شہوانیات کی مکمل تاریخ ہوگی اور جو عجیب و غریب معلومات سے لبریز ہوگا ملاحظہ فرمانے کی چیز ہے۔

مینیجر نگار لکھنؤ

سحرِ موسیقی

(ایک نیم مزاحیہ)

راجکمار رنبیر سنگھ ایک خوش پوشاک خوشرو بائیس سالہ نوجوان، ایک عالیشان ہوٹل کے آراستہ کمرے میں سوفے پر دراز ہے۔ قریب ہی ایک ڈاکٹر بیٹھا ہوا اس کی تسلی و تشفی میں مصروف ہے۔ ڈاکٹر عمر میں اپنے مریض سے تقریباً دس بارہ سال بڑا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی حرکات و سکنات سے چستی و چالاکی سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ابھی خود کو بیس اکیس سال سے زیادہ عمر کا نوجوان سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے

کمرے کے وسطی دروازے نہایت فراخ اور بلند ہیں، لیکن بند ہیں۔ دروازوں کے بائیں جانب کمرے کے اندر کونے میں ایک بڑا ہارمونیم رکھا ہوا ہے جس کے محاذ میں ایک کرسی پڑی ہوئی ہے۔ داہنی طرف ایک کھڑکی ہے جس کے مقابلہ میں وہ سوفہ ہے جس پر مریض نوجوان پڑا کراہ رہا ہے۔ قریب ڈاکٹر کی کرسی ہے جس کے برابر ایک چھوٹی سی میز پر ڈاکٹر کی ٹوپی، ایک پلیٹ، ایک دو شیشیاں، ایک گلاس اور ایک گھنٹی رکھی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر۔ آؤ، آگے بڑھو، آدمی ہو، یہ بڑی بدتمیزی ہے۔ یہ بچوں کی سی طرح مچلنا تمہیں ہرگز زیب نہیں دیتا یقین کرو کہ تم بالکل اچھے خاصے ہو، تمہیں کوئی بھی مرض نہیں ہے۔ اس وہم کو چھوڑ دو۔ بالفرض اگر اس ہجوم پر تم نے گولی چلا ہی دی تو کونسی قیامت آگئی جو بار بار اسی بات کو دہرا رہے ہو۔؟

راجکمار۔ (جوش کے ساتھ ڈاکٹر کی بات کاٹتے ہوئے) اُس ہجوم پر گولی چلانے میں میری کوئی زیادتی نہیں ہے۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے امن کی خاطر مجھے تمام رعایا کو تہ تیغ کر دینے کے اختیارات حاصل ہیں۔ قسمیہ اُس ہجوم پر گولی چلانے میں میری کوئی زیادتی نہیں ہے۔ اس ہجوم پر گولی چلانے میں میری کوئی زیادتی نہیں ہے۔ (ہمدردی کے لئے ڈاکٹر کا ہاتھ کھینچتے ہوئے) ڈاکٹر تم یقین کرو۔ قسمیہ اس ہجوم پر گولی چلانے میں میری کوئی زیادتی نہیں ہے —— اس ہجوم پر...

ڈاکٹر۔ (اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اور مریض کو کوچ پر لٹاتے ہوئے) خدا کے لئے بار بار ان الفاظ کو مت دہراؤ ورنہ تم مجھے بھی اپنے ساتھ دیوانہ بناؤ گے —— یہ سب اعصاب کے متاثر ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ ہوٹل ہے۔ اگر تم زیادہ بیہودگیاں کرو گے تو نکال دیئے جاؤ گے۔

راجکمار۔ (آبدیدہ ہو کر) لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ ڈاکٹر کوئی بھی نہیں سمجھتا کہ اس ہجوم پر گولی چلانے میں.........

ڈاکٹر۔ (پریشان ہوکر چیختے ہوئے) اس ہجوم پر گولی چلانے میں تمھاری کوئی زیادتی نہیں ہے" یہ جملہ تین سو ساٹھ مرتبہ تم دہرا چکے ہو!

راجکمار۔ (اسی طرح چیختے ہوئے) پھر تم کیوں بار بار مجھ سے وہی سوال کرتے ہو؟ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میں تم سے ہزار مرتبہ کہہ چکا کہ " اُس ہجوم پر گولی چلانے میں ....

ڈاکٹر۔ (گفتگو کاٹتے ہوئے) ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ سن لیا۔ مجھے معلوم ہے۔ خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ تمھاری کوئی زیادتی نہیں۔ تمھارا مطلق قصور نہیں ہے۔ اب میرا قصور بھی معاف کردگے؟

راجکمار۔ تمھارا کیا قصور تھا۔ دنیا مجھے ہی قصوروار ٹھہراتی ہے۔ صرف مجھے، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اُس ہجوم پر گولی چلانے میں میری کوئی زیادتی نہیں ہے۔

ڈاکٹر۔ توبہ ہے! .... اچھا —— تم ویلیرین کی ایک خوراک اور پیو، اور ابھی پیو۔ (گلاس اٹھاکر مریض کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے) ٹھیک ہے ... . ذرا لیٹ جاؤ (کچھ دیر بعد) اب کہو کیا حال ہے؟

راجکمار۔ (خستہ و ماندہ آواز میں) معلوم نہیں ویلیرین مجھے کیوں اتنا سکون پہونچاتی ہے جبکہ بلی پر اس کا اثر بالکل الٹا پڑتا ہے وہ آخر کیوں اُسے پی کر چیخنے چلانے لگتی ہے؟ .... یہ .... بیشک یہ مسئلہ غور طلب ہے —— تجھے ڈاکٹر، واقعہ یہ ہے کہ مجھے فلاسفر بنانا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر۔ فلاسفر پیدائشی ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے۔

راجکمار۔ یہ ایک عام بات ہے۔ ہر شخص پیدا ہوتا ہے۔ بنایا نہیں جاتا۔

ڈاکٹر۔ شاباش —— معلوم ہوتا ہے کہ اب رفتہ رفتہ تمھارے اندر سمجھ آرہی ہے آج تمھارے ہوش و حواس بالکل جلتے رہے کل سے بھی زیادہ سخت دورہ پڑا۔ مجھے تمھاری حالت پر بڑا افسوس ہوتا ہے کاش میں اس دماغی اختلال کو یک لخت دور کر سکتا! .. .. اچھا بالفرض اگر تم ہارمونیم سے دل بہلاؤ تو کیا برا ہے؟

راجکمار۔ ہارمونیم میں نہیں بجا سکتا۔ میری انگلیاں میرے ارادے پر کام نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ میں اب ہارمونیم کی آواز کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ آج صبح میں نے اتفاق سے اُسے چھیڑ دیا تو بے ساختہ میری چیخ نکل گئی۔

ڈاکٹر۔ خیر تم خود نہ سہی، کسی دوسرے بجانے والے کو کیوں نہیں بلا لیتے؟

راجکمار۔ فرض کرو کہ میں اس کی آواز کو برداشت بھی کر لوں تو میں کسی بجانے والے کو بلا سکتا ہوں؟ .... تم بھی تو بجانا جانتے ہوگے؟

ڈاکٹر۔ اونہہ —— صرف میں ہی دنیا میں ایک شخص نہیں رہ گیا ہوں۔

راجکمار۔ پھر؟ —— اگر کوئی غیر شخص میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں بالکل دیوانہ ہو جاؤنگا۔

سچ کہتا ہوں اس کھڑکی سے باہر کود کر خودکشی کر لونگا۔ میں ہارمونیم کی آواز کو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ مجھے اس سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ بھاڑ میں جائے۔

ڈاکٹر۔ تو پھر بڑی مشکل آ پڑی۔ تم سمجھتے ہو؟

راجکمار۔ کیوں مشکل کیا آ پڑی؟

ڈاکٹر۔ یہ کہ جب تمھیں سرود و موسیقی سے بھی کچھ مس نہیں ہے۔ تو تمھارا بنیگا کیا؟ اور کسی قابل تو تمھارا دماغ ہے نہیں۔

مریض۔ میں شہزادگاں کی کونسل میں ہوں۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں مدارالمہام بھی ہوں

ڈاکٹر۔ یہ تو اس لئے ہے کہ تمھارا باپ راجہ ہے اور تم ولیعہد سلطنت ہو۔ اگر تم کسی جمہوریت میں ہوتے تو شاید جوتے صاف کرنے کے قابل بھی نہ سمجھے جاتے۔ سنو راجکمار اگر تم نے بڑی صحبت نہ چھوڑی اور موسیقی سے تمھیں کوئی دلچسپی نہ ہوئی تو یقین کر لو کہ مغربی سوسائٹی کے نزدیک تم بالکل مردہ ہو۔ میں ہز ہائینس کو مشورہ دونگا کہ وہ تمھیں ہرگز یورپ نہ بھیجیں

راجکمار۔ (چونک کر) کیا واقعی ڈاکٹر؟

ڈاکٹر۔ ہاں —— لیکن تمھارے لئے علاج موسیقی ابھی ذرا قبل از وقت ہے۔ یہ رانی صاحبہ کا خیال ہے۔ میرے خیال میں ابھی ایک دور ذرا اور دیکھا جائے۔ غالباً وہ کسی مشہور ماہر موسیقی کو اس غرض کے لئے پابند بھی کر چکی ہیں —— بہرحال اب مجھے جانا چاہئے۔ پھر آؤنگا۔ اس دوران میں جتنا تم سے آرام کیا جا سکے کرو۔ اگر سو نہ سکو تو کچھ پڑھو۔

راجکمار۔ کیا پڑھوں؟

ڈاکٹر۔ کوئی میگزین —— کوئی رسالہ۔

راجکمار۔ لیکن رسالے تو بہت خشک ہوتے ہیں۔ انھیں میرا دماغ برداشت نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر۔ اوہو —— تو جانے دو۔ بس سو رہو۔ میں تمھیں ایک اور خواب آور دوا دیتا ہوں (وہ جیب سے دواؤں کا کیس نکالتا ہے) راجکمار یہ کیا ہے؟ —— ورنال؟

ڈاکٹر۔ ہاں —— اس طرح مت ڈرو۔ یہ ایک پرانا نسخہ ہے۔ یعنی محض افیون .... لو! (راجکمار اس کے ہاتھ سے گولی لیتا ہے)

ڈاکٹر۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کامیاب ثابت ہو گی۔ اگر آدھ گھنٹہ بعد تم یہ محسوس کرو کہ اس سے تمھارا جوش و خروش بڑھ گیا ہے تو دوسری بھی کھا لینا۔ میں رکھے جاتا ہوں (وہ پلیٹ میں ایک گولی اور رکھ دیتا ہے اور دواؤں کے ڈبے کو جیب میں

ڈال لیتا ہے)

راجکمار۔ زیادہ بہتر ہوتا اگر تم بہت سی گولیاں چھوڑ جاتے۔ میں گولیوں کو ہمیشہ پسند کرتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ شکریہ! میں تمھیں عدالتی ملزم نہیں سمجھ رہا ہوں جس کی ہر درخواست پر رعائتی نظر ڈالنا پڑتی ہے۔ تمھیں معلوم ہوگا، اگر معلوم نہیں ہے تو ہونا چاہئے کہ افیون زہر ہے۔

راجکمار۔ بیشک افیون زہر ہے۔ لیکن گولیاں تو زہر نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر۔ بحیثیت ڈاکٹر میں گولیوں سے تمھیں متنفر کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ اتنی گولیاں تمھارے پاس چھوڑ بھی نہیں سکتا جن سے تم اپنا کام تمام کرلو (وہ اپنی ٹوپی سنبھالتا ہے)

راجکمار۔ مہربانی فرماکر آپ باہر جاتے ہوئے لوگوں سے کہتے جائیں کہ یہاں آنے کی کوئی صاحب زحمت نہ فرمائیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ اگر کوئی غیر آدمی میرے پاس آیا تو میں کھڑکی سے کود کر جان دیدونگا۔ تم جانتے ہو کہ میں اجنبی آدمیوں کو مطلق برداشت نہیں کرسکتا۔

ڈاکٹر۔ فی الحال تمھیں مار ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ کوئی نہیں آئے گا۔ اچھا خدا حافظ! (وہ وسطی دروازے کی طرف قدم بڑھاتا ہے)

راجکمار۔ تم اس دروازے سے نہیں جاسکوگے میں نے رانی صاحبہ سے کہکر اس میں قفل لگوا دیا ہے اور کنجی انہی کے سپرد کردی ہے۔ مجھے بالکل اطمینان ہے کہ کوئی شخص اس دروازے سے اندر نہیں آسکتا جبتک کہ خود رانی صاحبہ اسے کنجی نہ دیں۔

ڈاکٹر (واپس لوٹ کر) ٹھیک ہے۔ اچھا! .... اب اپنی روانگی سے پہلے میں تمھیں بحالت آرام دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرے جانے سے قبل تمھیں سوجانا چاہئے۔ (راجکمار کروٹ بدل کر سونے کے لئے لیٹ جاتا ہے ڈاکٹر دبے پاؤں چھوٹے دروازے کی طرف بڑھتا ہے اور چپکے سے باہر نکل جاتا ہے)

راجکمار (یکایک مجنونانہ انداز سے اٹھکر، ہارمونیم کی طرف خوف سے تکتے ہوئے) ڈاکٹر! ڈاکٹر!! دوڑو!! مجھے بچاؤ!!!

ڈاکٹر۔ (تیزی سے کمرے میں داخل ہوکر) کیا ہوا خیر ہے؟؟

راجکمار (ہارمونیم کی طرف دوبارہ مشتبہ نگاہیں ڈال کر) کچھ نہیں! (پھر سونے کے لئے لیٹ جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ ایں کچھ نہیں۔ ضرور کچھ نہ کچھ بات ہے ورنہ تم اس طرح نہ ڈکارتے (اس کا ہاتھ کھینچکر اپنی طرف کروٹ دلاتے ہوئے) ادھر دیکھو! ——— بتاؤ کیا افتاد پڑی؟

راجکمار۔ کچھ نہیں! اب تو چلا گیا۔

ڈاکٹر۔ کیا چلا گیا؟

راجکمار۔ گھڑیال!

ڈاکٹر۔ گھڑیال؟!!

راجکمار۔ ہاں گھڑیال! اُس نے پہلے تو مجھے دیکھ کر قہقہہ لگایا اور پھر اپنی دُم سے ہارمونیم بجانا چاہتا تھا

ڈاکٹر۔ صرف افیون کا کرشمہ ہے! وہ کم مقدار میں تمھیں موافق نہیں آئی میرے عزیز دوست تمھیں دوسری گولی بھی ابھی کھانی پڑے گی۔ (پلیٹ سے دوسری گولی اٹھاتے ہوئے)

راجکمار۔ لیکن اگر اب کی مرتبہ دو گھڑیال آ گئے۔ تو؟!

ڈاکٹر۔ بیوقوف ہو! اب نہیں آئیں گے۔ اگر کوئی چیز آئی بھی تو اس مرتبہ وہ ضرور کوئی خوبصورت چیز ہوگی۔ افیون کا یہی قاعدہ ہے وہ اسی طرح اثر کیا کرتی ہے۔ بہرحال دس منٹ کے اندر تمھیں ضرور نیند آ جائیگی۔ لو اسے بلا تامل نگل جاؤ!

راجکمار۔ (گولی نگلنے کے بعد) واقعی مینے بڑی بزدلی دکھائی۔ لیکن ڈاکٹر یہ واقعہ ہے کہ مینے اس گھڑیال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

ڈاکٹر۔ دیکھا نہ ہوگا۔ اس چیز کے متعلق پریشان ہونا فضول ہے جسے بند آنکھوں سے دیکھا جائے۔

راجکمار۔ یہ صحیح ہے ——— اچھا تم جا رہے ہو۔ خدا حافظ........ ..... ذرا سننا، تمھیں تکلیف تو ہوگی لیکن جانے سے پہلے ذرا اس صوفے کے نیچے اور دیکھتے جاؤ۔ کہیں وہ کمبخت اُس کے نیچے نہ چھپا بیٹھا ہو———

ڈاکٹر۔ آپ خود ہی تکلیف فرمائیے۔ اور زیادہ اطمینان ہو جائیگا۔

راجکمار۔ میری تو ہمت نہیں پڑتی۔

ڈاکٹر۔ احمق کہیں کا ——— (صوفے کے نیچے دیکھ کر) بالکل میدان صاف ہے۔ کسی گھڑیال وغیرہ کا پتہ نہیں ہے۔ بالکل پاؤں پھیلا کر سوؤ ——— خدا حافظ۔ (وہ باہر چلا جاتا ہے)

راجکمار آنکھ بند کرکے لیٹ جاتا ہے۔ پانچ منٹ کے بعد وسطی دروازے کا قفل کھلتا ہے اور ایک نوجوان حسین عورت اپنے ہاتھوں میں پھولوں کا گچھا لئے ہوئے داخل ہوتی ہے اور کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالتی ہے۔ پھر جیب سے ایک خط نکالتی ہے اور اُسے پڑھتے ہوئے بار بار کمرے میں تجسس نگاہ ڈالتی جاتی ہے۔ ہارمونیم دیکھ کر ایک اطمینان کا سانس لیتی ہے۔ راجکمار کو سوتا ہوا دیکھ کر بھی اُسے کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ وہ اُس سے مخاطب ہونا بیکار سمجھتی ہے۔ بالآخر جب اُسے پورا اطمینان اس امر کا ہو جاتا ہے کہ وہ ٹھیک پتہ پر آئی ہے تو وہ ہارمونیم کے پاس آ جاتی ہے اور باہر کھڑے ہوئے شائقین کے انتظار کو اسی طرح بڑھاتی ہے کہ پہلے پھولوں کا گچھا شمعدان پر

رکھتی ہے پھر اپنے دستانے نزاکت سے اُتار کر پھولوں کے پاس رکھ دیتی ہے۔ پھر انگلیوں سے جواہرات کی انگوٹھیاں نکال کر احتیاط سے جیب میں رکھ لیتی ہے پھر بورڈ اٹھاکر سُروں پر ایک مبصرانہ نگاہ ڈالتی ہے اور کرسی پر بیٹھ کر آہستہ سے دھونکنی پر پاؤں جما دیتی ہے ——— غرض ایک پیشہ ور ماہر فن کے وہ تمام ارکان پورے کرنے کے بعد جو وہ اپنے فن کی نمائش سے قبل بطور فرض ادا کرتے ہیں ——— وہ بالآخر ہارمونیم پر اپنی انگلیاں رواں کر دیتی ہے اور نہایت ہی دل کش طرز میں ایک راگ چھیڑ دیتی ہے ——— راگ کی آواز پر راجکمار چیخ مار کر چونک اُٹھتا ہے۔ اور صوفے سے گر کر خوفناک آوازیں نکالتے ہوئے فرش پر لوٹنے لگتا ہے۔

نوجوان حسینہ یکایک اپنا ہاتھ روک لیتی ہے اور حیرت و استعجاب سے اس کی صورت دیکھنے لگتی ہے۔

راجکمار۔ اوہ! اوہ! اوہ!! ——— گھڑیال ——— مگر مچھ ——— ارے دوڑو ——— بچاؤ ——— ٹھہرو (وہ آنکھیں پھاڑ کر بغور ہارمونیم کی طرف دیکھتا ہے اور نوجوان حسینہ پر اپنی نگاہیں گاڑ کر زیر لب کہتا ہے) ایں؟ .... اچھا ——— یہ بات ہے!

نووارد حسینہ۔ اس بیہودہ شور و شغب کا کیا مطلب ہے؟ خصوصاً اس وقت جبکہ میں اپنا آرٹ دکھا رہی ہوں۔ مجھے تمھاری جسارت پر حیرت ہے۔ کیا تم بالکل خارج از عقل ہو؟ کیا تمھیں عمر بھر کسی سوسائٹی میں بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا؟ ——— جواب دو۔!

راجکمار۔ (فرش پر بیٹھے ہوئے) مجھے افسوس ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔

نووارد حسینہ۔ معافی؟ ——— تم اس کا جواب دو کہ تم نے یہ بدتمیزی کی کیوں؟

راجکمار۔ مینے یہ خیال کیا کہ تم گھڑیال ہو!!

نووارد حسینہ۔ کتنی لغویات ہے! کس قدر بیہودہ ——— کیا میری صورت گھڑیال سے مشابہ ہے؟!

راجکمار۔ نہیں۔

حسینہ۔ پھر کیا میں گھڑیالوں جیسا ہارمونیم بجاتی ہوں۔

راجکمار۔ (ہوشیاری سے اُٹھ کر اس کے قریب پہنچتے ہوئے) نہیں .... میں یہ نہیں کہہ سکتا، اس لئے کہ یہ اندازہ کرنا بہت دشوار ہے کہ ایک گھڑیال کس قسم کا ہارمونیم بجا سکتا ہے ——— پھر مقابلہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

حسینہ۔ لغویت ——— (وہ پھر بجانا شروع کر دیتی ہے)

راجکمار۔ بس! (وہ اُس کا ہاتھ کھینچکر پردوں پر تختہ کھینچ لیتا ہے) براہِ مہربانی یہ بتایئے کہ آپ کو اندر آنے کی اجازت کس نے دی؟ اور آپ آئیں کس راستہ سے؟

حسینہ - (غصہ سے اٹھکر) تمھیں اس سے کیا غرض ؟

راجکمار - (بزدلی سے ہٹکر) یہ میرا کمرہ ہے - شاید آپ کو معلوم نہیں -

حسینہ - کمرہ ہوٹل والے کا ہے اور رانی صاحبہ امورگڈھ کے پاس کرایہ پر ہے - یقیناً یہی وہ کمرہ ہے جس کی اُنھوں نے مجھے کنجی دی ہے اس لئے کہ کنجی اس کمرے کے قفل میں صحیح لگی ہے -

راجکمار - مگر اُنھوں نے ایسا کیوں کیا ؟ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں' بشرطیکہ آپ کو ناگوار ہو

حسینہ - بیشک مجھے ناگوار ہے' اس لئے کہ عام آدمیوں کو مجھ سے یہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے - بہرحال تمھیں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ تم مخاطب کس سے ہو ——— میں مشہور ماہر موسیقی "تارا بائی" ہوں - !

راجکمار - کیا "بلبل بنگال" مس تارا بائی ! ——— خوبصورت بلا" تارا بائی ——— ؟ ؟

تارا بائی - ہاں میںنے "خوبصورت بلا" میں پارٹ کیا' اور اس کھیل کی شہرت بھی میری ہی وجہ سے ہوئی - لیکن تمھاری گفتگو کا انداز نہایت گستاخانہ ہے - کوئی بھلا آدمی کسی باوقار کنواری سے اس طرح پیش نہیں آ سکتا جس طرح تم میری تذلیل کر رہے ہو - بس اب تمھاری خیر اسی میں ہے کہ سیدھے اپنے سونے پر جاکر دراز ہو جاؤ اور اپنی زبان کو لگام دو - ورنہ کمرے سے نکل جاؤ -

راجکمار - لیکن تمھیں معلوم ہے کہ میں بیمار ہوں -

تارا بائی - بیمار ہو تو شفاخانہ جاؤ یا ڈاکٹر بلانے کے لئے آدمی بھیجو - (یہ کہکر وہ پھر ہارمونیم کھول لیتی ہے)

راجکمار - (دوزانو ہوکر ہاتھ جوڑتے ہوئے) پرماتما کے لئے تم ہارمونیم نہ بجاؤ - میں کسی طرح اسے برداشت نہیں کر سکتا اگر تم نے ذرا بھی کسی پردے کو ہاتھ لگایا تو میں اپنے ہوش و حواس کھو دونگا -

تارا بائی - (تختہ اٹھاتے ہوئے) تو پھر مجھے ضرور ہی بجانا چاہئے -

راجکمار - (بدحواسی سے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) تم ہرگز نہیں بجا سکتیں -

(تارا بائی برہمی سے اٹھتی ہے - راجکمار بدستور اس کے ہاتھ کھینچے رکھتا ہے - اور اسی حالت میں بے ساختہ کہنے لگتا ہی) آہ ! تمھارے ہاتھ کتنے سندر ہیں ! ؟

تارا بائی - (فرش پر دھکا دیکر گراتے ہوئے) صرف ایک بات تم نے بالکل سچ کہی ہے -

راجکمار - (فرش پر پڑے پڑے گھورتے ہوے) تم طاقتور بھی ہو !

تارا بائی - (میرے بازوؤں کی قوت بائیں سپتک کا ٹپہ بجانے میں بڑھی ہے) اس طرح ! (وہ بائیں سپتک پر ایک راگ چھیڑ دیتی ہے اور ایک نہایت دلآویز تان لیتی ہے ——— راجکمار کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہے مگر بدستور اُسے گھورتا رہتا ہے)

تارابائی - (رک کر) میں اس طرح ہرگز نہیں گا سکتی کہ میرے سامنے ایک شخص اپنے کانوں میں انگلیاں دیئے بیٹھا ہو - یہ میرے فن کی توہین ہے - آپ فوراً کمرے سے نکل جائیے !!

راجکمار - لیکن یہ کمرہ میرا ہے - تمھارا نہیں -

تارابائی - (اُٹھ کر) کوئی مضائقہ نہیں - فوراً یہاں سے نکل جاؤ - میں حکم دیتی ہوں - ورنہ ابھی گھنٹی بجا کر ملازموں سے نکلوا دونگی - (وہ بڑھ کر میز کے قریب جاتی ہے اور اپنی نازک انگلی گھنٹی پر رکھ دیتی ہے)

راجکمار - (اس کے پیچھے دوڑ کر) نہیں ! اپنی جوانی کا صدقہ، مجھپر رحم کرو - تم گھنٹی بجاؤ گی تو ضرور کوئی نہ کوئی آجائیگا اور میں اس کی صورت دیکھتے ہی دیوانہ ہو جاؤنگا -

(تارابائی اپنے بائیں ہاتھ کے جھٹکے سے اُسے پیچھے گرا دیتی ہے - وہ پھر ملتجی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بجاجت ... کہتا ہے) ——— کیا تمھیں میری حالت پر ترس نہیں آتا ؟ تم نہیں دیکھتیں کہ میں بیمار ہوں ؟ !

تارابائی میں دیکھتی ہوں کہ تمھارا دماغ خراب ہے - لیکن اس سے مجھے کیا - رانی صاحبہ نے پانچسو گنی صرف اسی غرض سے میرے نذر کی ہیں کہ میں دو گھنٹہ تک اس کمرے میں اپنے فن کے جوہر دکھاؤں - میں اسکی عادی نہیں ہوں کہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کروں خصوصاً پانچسو گنی والا وعدہ ایفا کرتا تو میں اپنی زندگی کا پہلا فرض سمجھتی ہوں - (وہ پھر باجے کی طرف بڑھاتی ہے)

راجکمار - لیکن کیا رانی صاحبہ نے میرے متعلق کچھ نہیں کہا -

تارابائی - (رخ پھیرتے ہوئے) ہاں اُنھوں نے کہا تھا کہ اس کمرے میں ایک بیوقوف نوجوان پڑا ہوا ہے، مگر اس کا بھی مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ صرف اپنے ہی لئے خطرناک ہے دوسرے کے لئے نہیں (وہ راجکمار کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اُسے نیچے بٹھا دیتی ہے) واضح رہے کہ میں تمھاری ان بیہودگیوں کو اب برداشت نہیں کرونگی کہ جسوقت میں کوئی راگ شروع کروں تم کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھ جاؤ ——— سنو یا نکل جاؤ !

راجکمار - (مجبور ہو کر) اچھا تو میں زینہ میں بیٹھ جاؤنگا اس لئے کہ دوسرے کمروں میں آدمی بیٹھے ہونگے وہاں میں کیسے جا سکتا ہوں ؟

تارابائی - بیوقوف ! زینہ میں بھی سیکڑوں آدمی بیٹھے ہیں - ہر سیڑھی پر پانچ پانچ چھ چھ سے کم نہیں ہیں وہ مجمع علحدہ رہا جو میری آواز سننے کے لئے نیچے سڑک پر بیتاب ہے -

راجکمار - کتنی خوفناک بات ہے ؟ ! (آبدیدہ ہو کر) مجھے اس طرح لاچار کرنے کا تمھیں کوئی حق نہیں ہے - میں بیمار ہوں - میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا اور اگر تم گانا شروع کر دوگی تو میں کھڑکی سے گر کر خودکشی کر لونگا -

تارابائی - (ہنستے ہوئے) تمھیں میری قسم ضرور کرو - یہ میری شہرت کے لئے بہترین اشتہار ہوگا اور

میں تمھاری بیحد ممنون ہونگی (یہ کہکر وہ پھر ہارمونیم کے سامنے آبیٹھتی ہے اور بجانے کے لئے تیار ہوجاتی ہے)

راجکمار۔ (کھڑکی کے پاس آکر) جب تم میرا مردہ جسم چُور چُور دیکھوگی تو یقیناً تمھیں اس کا افسوس ہوگا کہ تم نے میری حالت پر ترس نہ کھایا۔ (یہ کہکر وہ کھڑکی کھول کر باہر کی طرف جھانکتا ہے اور چیخ کر تیزی سے بند کرلیتا ہے) کتنا بڑا ہجوم ہے ـــــــ پرماتما!!

تارا بائی۔ (خوش ہوکر) اب غالباً تم شوق سے میرے فن کی داد دینے کے لئے تیار ہو؟ (وہ نہایت مدھم سروں میں ایک راگ شروع کرتی ہے)

راجکمار۔ (عاجز آکر) میں اُس موت کے مقابلہ میں اِس موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

تارا بائی۔ (باجے پر بدستور ہاتھ رواں رکھتے ہوئے۔ طنزاً) شکریہ!

راجکمار۔ واقعہ یہ ہے کہ میں خود بھی اچھا خاصہ بجانا جانتا ہوں۔

تارا بائی۔ (بدستور بجاتے ہوئے) غالباً مبتدی ہو!

راجکمار۔ مجھسے میرے اکثر دوستوں نے کہا کہ اگر میں موسیقی کا شوق جاری رکھوں تو اچھے اچھے پیشہ وروں کو نیچا دکھا سکتا ہوں۔ مگر میری جیسی پوزیشن رکھنے والے کے لئے پیشہ وروں کے مقابلہ میں آنا نازیبا ہے

تارا بائی۔ (یکایک باجے سے ہاتھ ہٹاکر) یہ تو تم نے خوب بات بتائی۔ حالانکہ مجھے اس کا یقین نہیں تاہم کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کون کون سے راگ کی آپ کو مشق ہے۔

راجکمار۔ اُونھ، کیا گنتی ہوسکتی ہے، سب اچھی اچھی راگنیوں سے میں واقف ہوں۔

تارا بائی۔ مثلاً

راجکمار۔ میری جان تم مجھسے واقف نہیں ہو۔

تارا بائی۔ (برہمی سے) احمق! یہ الفاظ کہنے کی تجھے کیونکر جرارت ہوئی؟ کیا تو نے مجھے پیشہ ور عورت سمجھا ہے؟

راجکمار۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی۔ یہ تو ایک راگ ہے جس کا مینے نام لیا۔ سنو میں تمھیں بجاکر دکھاتا ہوں۔ (وہ ہارمونیم پر بیٹھ جاتا ہے) غالباً تمھیں اس کا یقین نہیں ہے کہ میں باجہ بجانا جانتا ہوں۔

تارا بائی۔ جی نہیں۔ یقین کیوں نہیں۔ مینے سرکس میں ایک گدھے کو بھی ہارمونیم بجاتے دیکھا ہے مجھے اب ہر بات کا یقین ہے۔

راجکمار۔ ہائے ـــــــ "میری جان تم مجھسے واقف نہیں ہو" (وہ ہارمونیم پر نکالتا ہے) آہا میری جان" تم مجھسے واقف نہیں ہو" ـــــــ دیکھا! کچھ سمجھیں؟

تارا بائی - کیا کہنے ہیں! واقعی موسیقی پر تمھارا بڑا زبردست احسان ہے!

راجکمار - آہا - میری چھوٹی سی گڑیا!

تارا بائی - مزے میں آگئے ——— پاجی کہیں کا (یہ کہکر وہ اُسے کرسی سے دھکا دیکر گرا دیتی ہے اس طرح کہ وہ دو تین قلابازیاں کھاکر فرش پر دور جا گرتا ہے۔) ——— واقعی خوب گڑیا ہے -!!

راجکمار - ارے - یہ تمھیں یکایک کیا ہوا؟ تمھیں معلوم نہیں کہ یہ بھی ایک راگ ہے - معلوم ہوا کہ تم بہترین قسم کے گانوں سے بالکل ناواقف ہو - (کوٹ جھاڑتے ہوئے اُٹھکر) ذرا طبیعت کو قابو میں رکھکر - غور سے سنو - (پھر ہارمونیم کے سامنے کرسی ڈال کر بجانے لگتا ہے) "آہا رے - آہا رے - میری چھوٹی سی گڑیا ——— چھوٹی سی گڑیا ——— ننھی سی گڑیا ——— آہا جی، آہا جی میری ...."

تارا بائی - بس معاف کیجئے! آپ میرا نام کیوں بدنام کر رہے ہیں - لوگ نیچے سمجھتے ہوں گے کہ یہ حماقت مجھ سے ہو رہی ہے، انھیں کیا معلوم کہ آپ شوق فرما رہے ہیں - ہٹو - اب میں تمھیں بتانا چاہتی ہوں کہ موسیقی کیا چیز ہے

راجکمار - (ڈرکر) تمھاری مراد پکے گانوں سے تو نہیں ہے؟

تارا بائی - ہاں ——— (راجکمار دوڑ کر زینہ کے دروازے پر پہونچ جاتا ہے)

تارا بائی - (برہمی سے) احمق کہیں کا! (بیٹھ کر بجانے لگتی ہے)

راجکمار - (بھاگ کر تارا بائی کے پاس آتے ہوئے) میں بھول گیا - زینہ پر بہت آدمی بیٹھے ہیں - پورا ہجوم ہے آہ! اب میں کیا کروں؟ خدا کے لئے پکے راگ نہ چھیڑو - پکی چیزوں کو رہنے دو - میں بالکل برداشت نہیں کر سکتا - (تارا بائی راجکمار کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالتے ہوئے اور نہایت ہی سہانے سروں میں "بہاگ" الاپتی ہے)

راجکمار - واہ — واہ - یہ تو خوب چیز ہے! (تارا بائی نگاہوں میں مسکراتی ہے)

راجکمار - (کچھ دیر خاموش سنتا رہتا ہے - پھر یکایک کہتا ہے) آہاہاہا - میں سچ کہہ رہا ہوں اس وقت میرے دل میں یہ خواہش ہے کہ تم صرف میری چھوٹی سی گڑیا ہوتیں - (تارا بائی یکایک پنچم کے سروں میں شاہانہ شروع کر دیتی ہے - راجکمار بیچین ہوکر چلانے لگتا ہے) بس رہنے دو - پرماتما کے لئے اسے بند کر دو میں مرا - ....!

تارا بائی (انترہ پورا کر کے دوبارہ انگلیاں اُٹھاتے ہوئے) بولو؟ اب تو بیہودہ الفاظ نہیں کہوگے؟

راجکمار - نہیں - مجھے قصور ہوا!

تارا بائی - (مطمئن ہوکر باجے سے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے) خیر!

راجکمار - (پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے) اُف وہ! یہ تو بہت ہی ٹھوس قسم کا پکا گانا تھا - میرے کان کے پردے اُڑ گئے!

تارا بائی۔ تمھاری ہمت کو مضبوط بنانے کے لئے اسی کی ضرورت تھی۔ علاوہ اس کے میں صرف تفریحی راگ سنا کر خود کو پانچوں گنی پانے کا مستحق نہیں سمجھتی۔ اچھا اب سخت سے سخت چیز سننے کے لئے تیار ہو جاؤ میں تمھیں آدمی بنانا چاہتی ہوں۔

راجکمار۔ (گھبرا کر) کس طرح ؟

تارا بائی۔ باگیسری اور بھاگ کے صرف کومل سروں سے مالکوس نکال کر ——— تم دل میں یہ خیال کرو گویا کسی جنگ پر جا رہے ہو۔

راجکمار۔ باگیسری ——— مالکوس ——— !! (پھر دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور پہلے کی طرح پھر واپس آ کر گڑگڑانے لگتا ہے) لوگوں کا ہجوم پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے ۔ کیا تمھیں میری حالت زار پر ذرا ترس نہیں آتا۔

تارا بائی۔ اچھا۔ ادھر آؤ۔ یہ مت خیال کرو کہ تم جنگ پر جا رہے ہو۔ محض یہ خیال کر لو گویا تم بہادری کے ساتھ لڑ کر اپنے ملک کو دشمنوں کے پنجے سے چھڑا کر ابھی ابھی میدان جنگ سے واپس ہوئے ہو اور اس وقت اپنی قوم کی اُن حسین و جمیل لڑکیوں میں بیٹھے ہو جو تمھارے شاندار کاموں پر فخر کر رہی ہیں کیا تم تھوڑی دیر کے لئے یہ خیال اپنے ذہن میں لا سکتے ہو ؟

راجکمار۔ ہا ——— ں۔ کیوں نہیں۔ بلکہ میں تو خود کو عموماً اسی حال میں پاتا ہوں۔

تارا بائی۔ تو ٹھیک ہے ——— اب سنو ! (وہ رفتہ رفتہ باگیسری شروع کر دیتی ہے، پھر اس میں مختلف راگنیوں کے سر ملا کر مالکوس نکالتی ہے۔ راجکمار پہلے یکایک چونک اٹھتا ہے پھر بتدریج اس کو سکون ہو جاتا ہے پھر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر سپاہیانہ انداز سے ٹہلنے لگتا ہے اور کبھی کبھی بہادرانہ طور پر سینہ نکال دیتا ہے۔ تارا بائی ہمت افزا، محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہتی ہے اور نہایت تادرانہ طور پر ساز و آواز کو ملا کر ایک سماں باندھ دیتی ہے)

راجکمار۔ (بہت دیر تک اسی طرح مدہوش رہ کر) واہ، واہ ! کیا سماں ہے !

تارا بائی۔ (گانا بند کر کے محض باجہ بجاتے ہوئے) کیا تم یہ سُر نکال سکتے ہو ؟ محض یہ سُر (وہ بھیرویں کے صرف ابتدائی سروں کو چھیڑتی ہے) پھر آواز سے اُنھیں الاپتی ہے۔

راجکمار۔ (فخر سے) ہاں ہاں کیوں نہیں صرف ——— سا۔ گا۔ ما۔ رے۔ سا ——— سا۔ گا۔ ما۔ رے۔ سا۔ (وہ باجے پر بیٹھ جاتا ہے) سا۔ گا۔ ما۔ رے۔ سا ....

تارا بائی نہیں۔ (اپنی انگلیوں سے) ایسے ! ——— سنو۔ مدہم سے پنچم کی طرف (الاپ کر) آ۔ آ۔ آ۔ آ۔

آ - (دہراکر بتدریج آواز اُٹھاتے ہوئے) آ - آ - آ - آ - آ ———— پہلے نہایت آہستہ پردے کو چھیڑو - بالکل شاما جیسا نغمہ - پھر رفتہ رفتہ سُر بڑھاؤ، یہاں تک کہ تمھاری روح تمھاری آواز کی ہمنوا ہوجائے -

راجکمار - میں سمجھ گیا - بیٹھو - ایک سِتار پر تم بیٹھ جاؤ، ایک پر میں دونوں ساتھ بجائیں گے - (وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ کر بجاتے ہیں - ہر اختتام پر راجکمار جوش سے چلا اٹھتا ہے ——— ہاں ایک بار پھر! .... کئی بار بجانے کے بعد تارا بائی راجکمار کا ہاتھ جھٹک دیتی ہے اور تنہا پھر دیس شروع کرتی ہے)

راجکمار - (بڑبڑاتے ہوئے) عجیب وغریب عورت ہے! بالکل حیرت انگیز! ———— تمھارے بےمثل فن کا میں دل وجان سے قائل ہوگیا ہوں - سُنتی ہو پیاری تارا ——— ! (وہ یکایک بھیانک سروں کو چھیڑ دیتی ہے)

راجکمار - نہیں ——— میں بھولا ———— مس تارا بائی، "بلبل بنگال"!

تارا بائی - اب ٹھیک ہے لیکن میں خود کو تمھاری زبان سے "عجیب وغریب عورت" کہلوانا زیادہ پسند کرتی ہوں -

راجکمار - مس تارا، تم یقیناً عجیب وغریب عورت ہو، تمھارا گانا سننے کے بعد میں اپنے اندر ایک نمایاں تبدیلی محسوس کررہا ہوں - اجازت ہو تو ذرا سی ولیرین پی لوں - اس لئے کہ مجھ میں جوش ذرا زیادہ بڑھ گیا ہے / ———— (ایک خوراک پی کر) آہا ہا - اب نسبتاً مجھے بہت سکون ہے - میری پیاری! (تم اس طرح نہ دیکھو یہ الفاظ میرے دل سے نکل رہے ہیں) واقعہ یہ ہے کہ میری زندگی مسرور نہیں ہے - میں اپنی موجودہ حالت سے اکتا گیا ہوں - پبلک سے مجھے سخت نفرت ہے اور راج کے انتظامی معاملات سے میرے دماغ کو کوئی لگاؤ نہیں ہے - گھر پر تین بدمزاج بہنوں کے ساتھ مجھے زندگی بسر کرنی پڑتی ہے - جو بالکل مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتیں بلکہ اپنا زیادہ وقت سیر و تفریح میں گذارتی ہیں - ایسی سیر و تفریح جسے میں شرمناک سمجھتا ہوں تمھیں معلوم ہے انھوں نے میرا کیا نام رکھا ہے؟

تارا بائی - (نرمی سے) بھولے کنور جی!؟

راجکمار - نہیں جی - وہ مجھے بزدل رنبیر کہتی ہیں ———— بیشک میں اس کا اقبال کرتا ہوں کہ میں بزدل ہوں اور بے یار و مددگار - دنیا میں مجھ سے کوئی کام نہیں ہوسکتا - میں ایک قوی بازو کا سہارا چاہتا ہوں، ایک منچلے ساتھی کی مجھے تلاش ہے جس پر میں ناز کرسکوں - ایک ایسے مونس وغمخوار کی مجھے ضرورت ہے جو میری ضروریات زندگی کو اپنی قوتِ بازو سے پورا کرسکے - اور مجھے حکمرانی یا سیاست کے بھیانک مسائل کی طرف مطلق غور نہ کرنے دے ————————

——— پیاری تارا - میں نہایت ہی حقیر اور ادنیٰ ہستی ہوں لیکن پھر بھی تمھاری پرستش کرنے کی جرأت

مجھے بہترین کھانے پکانے آتے ہیں ، میں ضرور رکھتا ہوں - مصوری اور نقاشی کی طرف میرا فطری رجحان ہے
کھانے کے بعد دلچسپ قصے سنا سکتا ہوں - اور چاہے تمھیں اس کا یقین آئے یا نہ آئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ
میں ملازمین سے نہایت اچھی طرح کام لے سکتا ہوں اور امور خانہ داری کو بہت عمدگی سے انجام دے سکتا ہوں
بال بچوں سے بھی مجھے ایک قدرتی اُنس ہے اس لئے کہ وہ بڑے آدمیوں کی طرح ٹھوس باتیں کر کے میرا دماغ
پراگندہ نہیں کرتے ——— بہرحال میں ہر لحاظ سے خانگی زندگی بسر کرانے کے لئے (بسر کرنے کے لئے
نہیں) بہترین شریک زندگی ثابت ہو سکتا ہوں اور اس سلسلے میں اگر میرا شریک زندگی مجھ پر کسی قسم کی سختی
بھی روا رکھے تو اُسے بنسی خوشی برداشت کر سکتا ہوں - بلکہ غالباً اس کی مجھے تمنا ہے کہ کوئی مجھے جھڑکے
میں اُسے سنوں ، کوئی مجھے بڑا بھلا کہے اور میں اس کی منت کروں اس لئے کہ اس حال میں اس فکر سے تو میں آزاد
ہونگا کہ اب مجھے کیا جواب لکھنا چاہئے اور فلاں ملکی مسئلے کو حل کرنے کے لئے کونسی سیاسی چال چلنی چاہئے ؟
——— پیاری تارا ! کیا تم ایسے سیدھے سادھے مسکین شوہر کے ساتھ نباہ کر سکتی ہو جسے
سوائے تمھاری رضا جوئی کے دنیا میں اور کسی بات کا خیال ہی نہ ہو - جو سوائے اپنے گھر کے بیرونی زندگی
سے سروکار ہی نہ رکھتا ہو - جسے عام شوہروں کی طرح سیاست یا حکومت کا مطلق خبط نہ ہو اور جس کے ساتھ
اس دنیا کے بکھیڑوں سے الگ تھلگ رہتے ہوئے تمھیں آزادانہ طور پر اپنے کمالات کی نمائش کرنیکا
حق حاصل ہو ——— کیا میں تم سے اس قسم کی توقع رکھوں ؟

تارابائی - (ہارمونیم سے اٹھکر راجکمار کے قریب آتے ہوئے) میرے بھولے راجکمار ! تم دیکھتے ہو کہ میں ایک
ترش مزاج ، سخت گیر اور آزاد عورت ہوں ، میں جسم و جثہ میں تم سے کہیں زیادہ قوی ہوں - پھر سمجھ میں
نہیں آتا کہ تم ایسے نازک اور ملائم جسم و جثہ کے انسان کو مجھ میں وہ کونسا حسن نظر آتا ہے جس سے محبت
کی جا سکے ——— ازدواجی زندگی میں اس کا ہر وقت امکان ہے کہ مجھ سے تمھیں کوئی جسمانی اذیت ،
یا کوئی اعصابی نقصان پہونچ جائے - بلکہ شاید ——— ہاں مجھے صاف صاف اقبال کرنا چاہئے ———
میں ذرا بد مزاج ہوں اور بعض اوقات بہت ہی بھڑک اٹھتی ہوں اس لئے ممکن ہے ، بلکہ اغلب ہے کہ میں
غصہ کی حالت میں کبھی تمھیں مار بھی بیٹھوں -

راجکمار - ہاں - ضرور ، ضرور - تم اس طرح مجھ پر نہ ہنسو - یقیناً یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے لیکن بچپن سے
میرے دل میں ایک ہی تمنا پرورش پاتی رہی ہے اور وہ یہ کہ کسی شاندار ، قوی ہیکل اور خوبصورت عورت
کے ہاتھ سے خوب اچھی طرح پٹوں -

تارابائی - (متاثر ہو کر) رنبیر ——— میرے خیال میں اسی نام سے رانی صاحبہ تمھیں پکارتی ہیں ؟

راجکمار - نہیں وہ رنو کہتی ہیں!
تارا بائی - ہاں پیارے رنو مجھے بھی اپنے دل کی کچھ باتیں تم سے کہنی ہیں، میں بھی محبت کا ایک راگ الاپنا چاہتی ہوں - سنوگے؟
راجکمار - کہو میری پیاری تارا!
تارا بائی - ہاں میں بھی عمر بھر ایک خواب دیکھتی رہی ہوں اور اس خواب نے محنت و مشقت کی اُن بھاری اور طویل گھڑیوں کو روشن بنائے رکھا ہے جب میں مسلسل آٹھ آٹھ نو نو گھنٹے گانے کی مشق کیا کرتی تھی - اس خواب نے ہندوستان اور بیرونی ممالک میں ہر اسٹیج پر جہاں ہزارہا انسانوں کے مجمع نے میرے کمال کو سراہا ہے، میرے دماغ پر تسلط رکھا ہے - وہ خواب یہ ہے کہ کسی نازک مرد کا ایک تنہا سا کمزور دل میرے دل کے مقابل دھڑک رہا ہو، ایک ملائم آواز مجھے گھر پر خوش آمدید کہہ رہی ہو، بار ریک بار ایک ریشم جیسی ملائم مونچھیں میری تھکی ہوئی انگلیوں کو بوسہ دے رہی ہوں اس حال میں کہ میں کئی گھنٹے اسٹیج پر کام کرنے کے بعد تھک کر گھر لوٹی ہوں - کوئی بالکل فرماں بردار، قطعی لاچار، مطلق بے سہارا —— میرا اور صرف میرا پرستار شوہر مجھے میسر آجائے جس کی صرف میں کفیل ہوں اور کسی دوسرے سے اُسے کوئی علاقہ نہو -
راجکمار - لیکن تمھیں کسی دن غصہ آجائیگا، ناقابل ضبط اور بے پناہ غصہ، اس حالت میں تم اُس شخص کو پامال کردوگی جس سے تمھیں محبت اور پرستاری کا دعوی ہوگا - وہ تمھارے پیروں سے لپٹ کر عفوِ تقصیر چاہیگا اور تم اُسے کچل دوگی ——!
تارا بائی - بیشک یہ بالکل ممکن ہے - تم اس بات کا اقبال کرنے کے لئے مجھے کیوں مجبور کرتے ہو - شاید میں اسے مارتے مارتے لب دم کردوں - اُسکی ہڈی ہڈی توڑ دوں اور پھر ممکن ہے کہ مجھے اپنے کئے پر پشیمانی ہو اور اپنے گرم گرم بوسوں سے اُس کے جسم میں زندگی کی تازہ روح پھونک دوں -
راجکمار - (فیصلہ کن طور پر) مجھے یہ سب بدل و جان منظور ہے - میں اس خدمت کے لئے خود کو پیش کرتا ہوں -
تارا بائی - تم میں ہمت ہے کہ ایسی خطرناک زندگی کو برداشت کرسکو؟ پھر سوچ لو!
راجکمار - سوچ لیا - میں اس زندگی کو خوش آمدید کہتا ہوں - مجھے تم سے محبت ہے میں مطلق تمھارا ہوچکا ہوں اب مجھے اپنی آغوش سے وابستہ ہوجانے دو -
تارا بائی - (اپنی کرخت آغوش میں دباتے ہوئے) اب کوئی طاقت تمھیں اس آغوش سے جدا نہیں کرسکتی -
راجکمار - کوئی نہیں - اب مجھے کسی کی ضرورت نہیں -
تارا بائی - اب تو تمھیں کوئی دماغی عارضہ نہیں -

راجکمار - بالکل نہیں -

تارا بائی - آدمیوں سے تو نہیں ڈرو گے -

راجکمار - ہرگز نہیں -

تارا بائی - باہر چلو گے -

راجکمار - اسی وقت - (دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سرگوشیاں کرتے ہوئے کمرے کو چھوڑ دیتے ہیں)

(برنارڈ شا) **طالب باغپتی**

کاجل — سرمہ — چورن — منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کرکے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو: - سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا ایک شیشی اور بھیج دیجئے -

کاجل - آشوب سرخی، ضعف بصارت کے لئے از بس مفید ہے ایک ڈبیہ جو ایک شخص کیلئے سال بھر کو کافی ہے قیمت عہ

سرمہ - یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں نہ ممیرہ ہے نہ کوئی معمولی سرمہ جن کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھند، موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے قیمت فی پڑیہ عہ علاوہ محصول

چورن - یہ چورن اکسیری چیز ہے جس کا گھر میں رہنا ضروری ہے - پیٹ کا درد، قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا - سوء ہضم، دستوں کا آنا سب یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے قیمت فی ڈبیہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول -

منجن - اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں قیمت فی ڈبیہ ۸ تولہ ایک روپیہ علاوہ محصول

نوٹ: - یہ سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف -

ملنے کا پتہ

م بیگم ذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ

علم وعقل کی گمراہیاں

روحانیات پر ایک تنقیدی نظر

(ما لہ وما علیہ)

اس میں کلام نہیں کہ علم انسانی جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے، زندگی کے اسرار اتنے ہی زیادہ عمیق ہوتے جاتے ہیں اور طبیعیات کی موجودہ موشگافیاں بجائے حقیقت کو واضح کرنے کے اور زیادہ اس کو ناقابل فہم بناتی جاتی ہیں۔ کچھ زمانہ قبل سالمات (Atoms) کی نسبت سائنس نے ہم کو بتایا تھا کہ وہ غیر فانی وناقابل تجزیہ ہیں، مگر اب ماہرین علم الکیمیا کہتے ہیں کہ وہ فانی ہیں اور ان کا تجزیہ بھی ہوسکتا ہے۔ اب سے پہلے یہ باور کیا جاتا تھا کہ ہائیڈروجن کا سالمہ سب سے چھوٹا سالمہ ہے، مگر اب بتایا جاتا ہے کہ اس کے اندر بھی خدا جانے اور کتنے لطیف تر ذرات موجود ہیں جن کا نام انھوں نے برقپارہ (Electron) رکھا ہے۔ چنانچہ پارہ کے ایک سالمہ کے اندر ایک لاکھ برقپاروں کا وجود بتایا جاتا ہے۔

سر آئزک نیوٹن کا قول ہے کہ سالمات کا فصل ایک دوسرے سے بہ لحاظ ان کی جسامت کے اتنا ہی ہے جتنا ثوابت میں بہ لحاظ اُن کے حجم کے پایا جاتا ہے، اگر پھر بھی یہ حقیر ذرات اتنی زبردست طاقت اپنے اندر رکھتے ہیں کہ (بقول سر ولیم کروکس) صرف ایک گرام برقپارے برطانیہ کی سالے بیڑے کو چشم زدن میں سب سے بلند پہاڑ کی چوٹی پر اُٹھا کر رکھ دے سکتے ہیں۔ الغرض انسان کی عقلی جستجو نے اس وقت ایک عجیب قسم کا ہنگامہ پیدا کر رکھا ہے اور ہر شخص بہ اندازۂ ظرف اس سے متاثر ہو رہا ہے۔ بعض تو ایسے ہیں جو ان اکتشافات کو آگے بڑھنے کا زینہ سمجھ کر شکوک واوہام سے گزر جاتے ہیں اور بعض جن کے دماغ متحمل نہیں ہوسکتے ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ سب لغو ومہمل ہے اور کائنات کے کاروبار پر غور کرنا حماقت۔ اول الذکر جماعت وہ ہے جو اس وقت کی تمام علمی ترقیوں کی علمبردار ہے اور دوسری وہ ہے جنے تھک کر "روح وروحانیت" کی آڑ پکڑلی ہے اور ساری دنیا کو "قبرستان" سمجھ کر بھیانک نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ اس جماعت میں الیور لاج اور کنین ڈائل کے علاوہ ایک اور مشہور ہستی ولیم کروکس کی بھی ہے اور انھوں نے جو تجربات اپنی عملی روحانیت کے بیان کئے ہیں وہ سننے کے قابل ہیں۔ فرماتے ہیں:—

(۱) ایک بڑا پنجرہ بناکر اس میں ایک اکارڈین (باجہ) رکھدیا گیا اور ایک شخص مسٹر ہوم نے جو ولیم کروکس کا معمول یا وسیط تھا اپنے پاؤں سے اس باجہ کو پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باجہ ازخود بجنے لگا اور مختلف قسم کی راگنیاں اس سے پیدا ہوئیں۔

(۲) ۳۶ انچ لمبا - ½۹ انچ چوڑا اور ایک انچ موٹا لکڑی کا تختہ لیا گیا جس کا سرا میز کے کنارہ پر اس طرح رکھدیا گیا تھا کہ اگر ذرا بھی دباؤ تختہ پر پڑے تو وہ اوپر کو اُٹھ جائے۔ تختہ کا دوسرا سرا ایک کمانیدار ترازو پر لٹکا ہوا تھا جسے ایک تپائی سے لٹکا دیا گیا تھا۔ تمام حاضرین کی نظریں مسٹر ہوم کی طرف جمی ہوئی تھیں انھوں نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے سرے آہستگی کے ساتھ تختہ کے اس سرے پر رکھے جو میز پر ٹھہرا ہوا تھا اس کے بعد بہت جلد وہ تختہ اوپر نیچے ہونے لگا اور ترازو کی سوئی سے وزن کا کم زیادہ ہونا معلوم ہونے لگا۔ ایک مرتبہ سوئی نے ۹ پونڈ ظاہر کئے۔ اس طرح گویا ۶ پونڈ کا دباؤ بڑا کیونکہ تختہ کا وزن کل ۳ پونڈ تھا۔ اس کے بعد جہاں مسٹر ہوم نے تختہ پر اپنے ہاتھ کی انگلیاں رکھی تھیں وہاں ایک آدمی کھڑا ہو گیا اُس شخص نے بہت کچھ جھٹکے دیئے مگر پھر بھی دو پونڈ سے زیادہ وزن نہ بڑھا۔

دوسری مرتبہ ایک تختہ لیا گیا جس کا ایک سرا کمانی دار ترازو پر رکھدیا گیا اور دوسرا سرا ایک چھری کی دھار پر پھر اسی جگہ پانی سے بھرا ہوا ایک پیالہ رکھدیا گیا اور اس کے اندر ایک کٹوری تانبہ کی ڈالدی گئی جس کی پیندی میں باریک سوراخ تھا۔ اس کٹوری کی پیندی پانی میں ڈیڑھ انچ کے قریب ڈوبی ہوئی تھی۔ دوسرے سرے پر ترازو سے ملا ہوا ایک نقل پیما آلہ نصب کیا گیا۔ اس کے بعد جب مسٹر ہوم نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیاں کٹوری کے پانی میں ڈالیں تو معلوم ہوا کہ پانچ ہزار گرین کا دباؤ ترازو پر پڑ رہا تھا حالانکہ مسٹر ہوم بالکل علق اُٹھالے گئے تھے اور وہ کوئی طاقت صرف نہ کر سکتے تھے۔

(۳) ایک خاتون مس فاکس جب کسی چیز پر اپنا ہاتھ رکھ دیتی تھیں تو معاً "ٹھپ ٹھپ" کی آوازیں پیدا ہونے لگتی تھیں۔ بعض اوقات یہ آوازیں اس قدر بلند ہوتی تھیں کہ دور دور تک سنائی دیتی تھیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ان کے ہاتھ پاؤں پکڑ لئے گئے یا کسی جھولے میں بیٹھ گئیں لیکن آوازیں برابر آتی رہیں۔

(۴) اس قسم کا نہایت عجیب واقعہ ایک سوسائٹی کی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں درج کیا ہے کہ پہلے میز نے مختلف صورتوں میں کئی بار نقل و حرکت کی اس کے بعد کمیٹی کے گیارہ ممبر اس طرح بیٹھ گئے کہ ان کی کرسیوں کی پشت میز کی طرف تھی۔ اور کرسیاں میز سے تقریباً نو انچ کے فاصلہ پر تھیں انھوں نے اپنے ہاتھ میز کے اوپر بغیر اسے چھوے ہوئے پھیلا دئے۔ اس کے ایک منٹ بعد ہی میز نے چار مرتبہ حرکت کی۔ ایک مرتبہ ایک جانب سے تقریباً پانچ انچ اٹھی اور دوسری مرتبہ دوسری طرف سے تقریباً بارہ انچ بلند ہوئی پھر اسی طرح

علی الترتیب چار اور چھ انچ اٹھی" یہی تجربہ دوسری مرتبہ اس طرح کیا گیا کہ کرسیاں میز سے اور زیادہ فاصلہ پر ہٹالی گئیں - اور اس مرتبہ ارکان کمیٹی اپنے ہاتھ کرسیوں کی پشت پر رکھے ——— اس مرتبہ بھی میز مختلف سمتوں سے اُٹھی اور گری -

(۵) میں نے ایک خاتون کو دیکھا جو کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ کرسی بغیر کسی واسطہ کے فرش زمین سے کئی انچ بلند تھی - یہی تجربہ کئی بار سخت شرائط کے ماتحت کیا گیا اور عمل ہمیشہ صحیح اترا - ایک مرتبہ دو بچے کرسیوں پر بیٹھے اور ان کی کرسیاں زمین سے بلند ہو کر ہوا میں معلق ہو گئیں - ڈاکٹر والیس مس نکول کی نسبت لکھتے ہیں کہ:-
ہم ایک دوست کے گھر میں میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے چھت میں ایک بلوریں جھاڑ لٹکا ہوا تھا میرے ایک اجنبی دوست مس نکول کے قریب بیٹھے تھے اور اُنھوں نے خاتون کے دونوں ہاتھ پکڑ رکھے تھے - دوسرا شخص اپنے ہاتھ میں دیاسلائی کی ڈبیہ لئے تیار بیٹھا تھا کہ ضرورت ہو تو فوراً روشنی کرے - پہلے مس نکول کی کرسی اس کے نیچے سے نکال لی گئی جس کے باعث اُسے مجبوراً کھڑا ہونا پڑا - اس وقت بھی میرے دوست اس کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے - دو تین منٹ کے بعد مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے جھاڑ کے آویزے آپس میں رگڑ کھا رہے ہوں - اسی وقت فوراً میرے دوست نے آواز دی کہ مس نکول میرے ہاتھوں سے نکل گئی - فوراً دیاسلائی روشن کی گئی - کیا دیکھتے ہیں کہ مس نکول اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے اور وہ کرسی میز پر رکھی ہوئی ہے اور اس کا سر بلوریں جھاڑ سے مس ہو رہا ہے - واضح ہو کہ مس موصوفہ کا ہاتھوں سے نکل جانا اور پھر کرسی کا میز پر پہونچ جانا میرے نزدیک سخت ناممکن تھا"

(۶) میں نے تین مرتبہ مسٹر ہوم کو کمرہ کے فرش سے بلند ہو کر ہوا میں معلق ہوتے دیکھا - ایک مرتبہ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھے تھے - دوسری مرتبہ وہ اپنی کرسی پر دوزانوں بیٹھے تھے - تیسری مرتبہ وہ کھڑے ہوئے تھے - تینوں مرتبہ مجھے معلق ہونیکا واقعہ دیکھنے کا پورا پورا موقعہ ملا - ایک مرتبہ مسٹر ہوم میرے برابر بیٹھے ہوئے تھے - کہ وہ دفعتاً بول اُٹھے :- "خاموش رہو میں اوپر جا رہا ہوں" اس کے بعد ان کا پاؤں میرے شانہ سے لگا - لہذا میں نے محسوس کیا کہ کوئی مخمل جیسی چیز میرے رخسار سے مس کر رہی ہے - میں نے جو نظر اُٹھا کر اوپر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مسٹر ہوم اپنے ساتھ آرام کرسی بھی لے گئے - اس کے بعد وہ کمرہ میں چاروں طرف پیرتے پھرے لارڈ لنڈسے نے یہ بھی دیکھا تھا کہ مسٹر ہوم ایک مرتبہ ہوا میں اڑے اور کھڑکی سے باہر نکل گئے، پھر دوسری کھڑکی سے جو فرش زمین سے پچاسی فٹ بلند تھی داخل ہو گئے -

(۷) حاضرات کے سلسلہ میں نورانی ہاتھوں کا ظاہر ہونا بھی دیکھا گیا ہے - بعض لوگوں نے ان ہاتھوں کو

پکڑا بھی مگر وہ لطیف ذرات نور میں تحلیل ہوگئے اور پکڑنے والے کی مٹھی خالی رہ گئی۔ بعض اوقات ان تنویری ہاتھوں کی تشکیل مکمل نہیں ہوتی، اور کبھی کبھی لطیف نورانی ابر ہاتھ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور پھول توڑ کر سب کے سامنے پیش کرتا ہے ایسے ہاتھوں کو باجہ بجاتے بھی دیکھا گیا ہے۔

(۸) ایک صاحب کاغذ اور پنسل کبھی میز پر رکھ دیتے تھے کبھی گرجا کے زینہ پر یا قبروں پر اور چند قدم پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ لیکن کاغذ پر نظر رہتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ کاغذ اٹھایا جاتا تھا تو اس پر ہمیشہ کوئی بامعنی پیغام تحریر ملتا تھا یہ صاحب لکھتے ہیں کہ:—

سب سے پہلا تجربہ اس طرح کیا گیا کہ کاغذ اور پنسل ایک صندوقچہ میں رکھ کر بند کر دیا گیا۔ اور قفل کی کنجی انھیں کے پاس رہی)۔ اس بات کی خبر کسی کو نہیں تھی کہ وہ صاحب کوئی تجربہ اس قسم کا کر رہے ہیں بارہ دن کے بعد سطح کاغذ پر کچھ نشانات معلوم ہوئے۔ اس کے بعد صندوقچہ کو کھلا چھوڑ دیا گیا اور کاغذ کو دیکھتے رہے آخر کار، اس کاغذ پر بلا استعمال پنسل خود بخود تحریر پیدا ہوگئی"۔

ایک اور صاحب ظاہر کرتے ہیں کہ :-

میں نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اپنے سفری صندوقچہ میں بند کر کے اوپر سے اس کا تسمہ باندھ دیا۔ اور پھر اُسے اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا اس دراز میں میرے نہایت پرائیویٹ کاغذات رہتے تھے۔ اس لئے میں اسکی کنجی کبھی اپنے پاس سے علیحدہ نہیں کرتا تھا دوران تجربہ میں اس دراز پر میری نظریں ہمیشہ جمی رہیں۔ میں نے اس کاغذ کو چوبیس گھنٹہ تک یونہی رہنے دیا اس کے بعد جب اسے نکالا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس پر نہایت صاف اور واضح تحریر موجود ہے۔ میز کے وسط میں کاغذ کے چند تختے رکھ دیئے گئے اور ایک پنسل بھی رکھ دی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پنسل خود بخود اٹھی اور نوک سیدھی ہوگئی۔ چند بار اچک کر کاغذوں کی طرف بڑھی مگر گر پڑی۔ پنسل نے دوبارہ یہی عمل کیا۔ پھر گر پڑی۔ تیسری مرتبہ پھر یہی عمل کیا مگر اس مرتبہ بھی کوئی عمدہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ الغرض پنسل نے تین مرتبہ ناکامی کے ساتھ اقدام کیا۔ اس کے بعد لکڑی کی سلاخ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو میز پر پنسل کے قریب ہی پڑا ہوا تھا خود بخود اٹھا اور پنسل کی طرف چلا یہ لکڑی میز کی سطح سے کئی انچ ابھر گئی تھی۔ اس کے بعد پنسل پھر اٹھی اور لکڑی کے ٹکڑے کی طرف چلی۔ پھر دونوں نے ملکر کاغذ پر لکھنے کی کوشش کی مگر پھر دونوں گر پڑیں۔ پھر انھوں نے مشترکہ اقدام کیا۔ مگر پھر ناکامی ہوئی۔ تیسری کوشش کے بعد سلاخ نے کوشش چھوڑ دی اور اچھلتی کودتی اپنے مقام سابق پر آگئی پنسل بھی کاغذ کے تختہ پر گر پڑی۔ اس کے بعد حروف تہجی کے ذریعہ سے ہم کو ارواح کی طرف سے یہ پیغام ارسال کیا گیا کہ :- "ہم نے آپ کے کہنے کے مطابق کوشش کی مگر اس وقت ہماری تمام طاقت صرف ہو چکی ہے"۔

ایک صاحب اسی قسم کے ارواحی پیغام نہایت خوبی سے حاصل کر سکتے تھے۔ وہ اپنی نظر سلیٹوں پر سے ایک سکنڈ کے لئے بھی علیٰحدہ نہیں کرتے تھے۔ مگر جب عمل ہو چکتا تھا تو سلیٹوں کی اندرونی سطح پر تحریر پائی جاتی تھی۔ ایک مشہور و معروف مصنف جو اس موضوع پر اکثر مضامین لکھا کرتے ہیں، ایک حاضرات کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "دو نئی سلیٹیں خریدیں۔ اور ان کے چوکھٹوں میں دو نو طرف سوراخ کرائے۔ پھر دونوں سلیٹوں کو آپس میں باندھ دیا۔ اور ڈوروں کی گرہ پر لاکھ لگا کر مہریں ثبت کر دیں دونوں سلیٹیں نئی اور صاف تھیں جو نہ وسیط کے چارج میں کبھی دیگئیں۔ اور نہ کبھی میری نظروں سے دور ہوئیں۔ سہ پہر کا وقت تھا، کمرہ میں کافی روشنی موجود تھی کہ پنسل نے سلیٹ پر لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد میں نے سلیٹوں کے ڈورے کاٹ دیئے دیکھا کہ ایک سلیٹ تحریر سے پوری بھری ہوئی ہے جس پر میرے ایک مرحوم دوست کے دستخط موجود ہیں۔ کاغذ کا ٹکڑا لیکر اس پر نو آدمیوں نے اپنے دستخط کر دیئے۔ بعد ازاں کاغذ کو تہ کرکے بکس میں ایک ایسے شخص کے ذریعہ سے رکھوا دیا گیا جو روحانیات کا قائل نہیں تھا۔ بعد ازاں بکس کو سر بمہر کر دیا گیا۔ اس کے بعد وسیط پر جو میز سے دور بیٹھا ہوا تھا محویت طاری ہوئی اور ایک روح نے ——— آکر اپنا نام "سیموئل" بتایا اور دریافت کیا کہ اہل حاضرات کیا لکھوانا چاہتے ہیں کہا گیا کہ "لوئی کے نام پیغام محبت" لکھو یہ سنکر روح نے کہا کہ "بہتر ہے" اور فوراً ہی یہ کہا کہ بکس کھولکر دیکھئے۔ الغرض بکس کھولا گیا اور کاغذ نکال کر دیکھا تو واقعی اس پر وہ پیام درج تھا۔

(۹) ایک مرتبہ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ میز کے ایک چھوٹے سوراخ میں سے ایک خوبصورت ہاتھ نکلا اور اس نے مجھے ایک پھول دیا۔ ہاتھ اسی طرح تین مرتبہ ظاہر ہو کر غائب ہو گیا۔ وہ بالکل ایسا ہی اصلی تھا جیسا کہ خود میرا ہاتھ۔ اسی طرح مختلف احباب نے ایک ہاتھ دیکھا کہ وہ اچانک نمودار ہو کر باجہ بجانے لگا۔ اسی طرح مختلف ہاتھ عبارتیں لکھتے اور دیگر کام کرتے دیکھے گئے ہیں۔ مسٹر ای دیک کوک نے کئی مرتبہ ایسے ہاتھوں کو پکڑا اور محسوس کیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہلے ایک دھندلا سا نورانی ابر نمودار ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ منجمد ہو کر ہاتھ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کی کلائی پھر بھی ابر کی صورت بنی رہتی ہے۔ یہ ہاتھ مس کرنے پر کبھی سرد اور کبھی گرم محسوس ہوتا ہے لیکن جب کبھی کوئی شخص ان ہاتھوں کو پکڑ لیتا ہے تو وہ دھوئیں کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔

ایک دن شام کو مسٹر ہوم میرے مکان پر بیٹھے ہوئے حاضرات کر رہے تھے کہ دفعتاً "ایک کھڑکی کے پردے جو سر سے آٹھ فٹ بلند تھے ہلنے لگے۔ اور ایک انسانی صورت سایہ کی مانند جو نیم منور تھی کھڑکی کے برابر کھڑی نظر آئی جو پردوں کو اپنے ہاتھوں سے ادھر ادھر ہلا رہی تھی۔ جب ہم اس شبیہہ کی طرف غور سے دیکھنے لگے تو وہ صورت نظروں سے غائب ہو گئی اور پردے بھی ہلنا بند ہو گئے"۔ ایک مرتبہ کمرہ کے ایک گوشہ سے ایک شکل برآمد ہوئی جس نے باجہ اٹھایا اور باجہ بجاتی ہوئی کمرہ میں ادھر ادھر پھرنے لگی جب

وہ صورت ایک خاتون کے پاس پہونچی جو اوروں سے کسی قدر الگ بیٹھی ہوئی تھیں تو خاتون مذکور کے منھ سے ایک چیخ نکل گئی اور وہ صورت غائب ہو گئی۔

(۱۰) مسٹر جان کارسن تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب وہ لندن میں تھے تو ایک جلسۂ حاضرات میں شریک ہوئے۔ وہاں انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ کامنی کے تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ منگایا جائے چنانچہ وسیط نے اُن کی یہ خواہش فوراً پوری کر دی۔ مسٹر مذکور کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ پھول محض آزمائش کے طور پر طلب کئے تھے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ذرا سا بھی دباؤ پڑنے سے یہ نازک پھول بھورے پڑ جاتے ہیں اس لئے اگر ان پھولوں کو کوئی شخص دامن میں بھی چھپا کر لائے تو پھولوں کے رنگ روپ میں فوراً خرابی آجائے گی۔ مسٹر کارسن کہتے ہیں کہ یہ پھول بجائے ایک بند کمرہ کے اندر لا کر دیئے گئے۔ اور میں نے خوب غور کر کے دیکھا تو پھولوں کی ہر پنکھڑی اپنی اصلی حالت پر تھی ——

مشہور جرمن خاتون فراؤ روتھے ایک ایسی وسیط تھی جو پھول وغیرہ فراہم کر دیا کرتی تھی چنانچہ ایک گواہ کا بیان ہے کہ ایک سنترہ خود بخود ہوا میں تیرتا ہوا جا تو اس کے ہاتھ میں آیا جو اس نے گواہ کو دیدیا ایک اور گواہ نے بیان کیا کہ حاضرات کے جلسہ میں اُن کی پوری طرح جامہ تلاشی لے لی گئی تھی انھوں نے اپنے ہاتھ میز پر رکھدیے۔ تھوڑی دیر بعد نہایت تازہ اور شگفتہ پھول جن پر شبنم کے قطرے موجود تھے۔ رفتہ رفتہ اوپر سے برسنے لگے۔ ایک مرتبہ اُن کے ہاتھوں پر چھوٹے چھوٹے سیاہ داغ نمودار ہوئے جو رفتہ رفتہ بڑھتے۔ رنگ بدلا اور خود بخود شگفتہ پھول بن گئے جن پر شبنم کے قطرے موجود تھے۔ وسیط اپنے یہ کمالات ہر جگہ اور ہر وقت دکھا سکتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات جب وہ کھانا کھانے بیٹھتی اور روٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتی تو اس کے ہاتھ میں تازہ گلدستہ آجاتا۔ اور میز پر گلاب اور نرگس و شبو کے پھولوں کا ڈھیر لگ جاتا۔

(۱۱) ڈاکٹر ذولنر نے ستلی کا ایک ٹکڑا لیکر اس کو لاکھ سے چسپاں کر کے اپنے گلے میں ڈال لیا۔ دفتی پر لگے ہوئے سرے اُن کے سینے پر تھے۔ دن کا وقت تھا۔ وسیط کا ستلی تک ہاتھ نہ پہونچنے دیا گیا جب کچھ دیر بعد وہ ستلی گلے سے نکالی گئی تو اس میں چار گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور یہ بغیر کھلے ہوئے سروں کے ناممکن تھا۔ دوسرا تجربہ دن ہی کے وقت کیا گیا۔ دفتی کے کمبوں پر تھوڑے رکھکر اُن پر کاغذ منڈھ دیا گیا اور مہریں لگا دی گئیں۔ ان کمبوں کو میز پر رکھا گیا۔ اور ایک سلیٹ میز کے تختہ کے نیچے رکھی گئی۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا گیا تو تارے سلیٹ پر موجود تھے اور مہریں بحال پائے گئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک چھوٹی سی میز خود بخود غائب ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر ذولنر کیا دیکھتے ہیں

کہ وہ میز ہوا میں معلق ادہر اُدہر دوڑ رہی ہے -
ایک مرتبہ ڈاکٹر جارج وائلڈ نے تجربہ کیا کہ مسٹر ہسک وسیط کی حاضرات میں ایک میز کے گرد چند آدمی حلقہ جماکر بیٹھے۔ اس طرح کہ ایک شخص کا ہاتھ دوسرے نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ میز پر متعدد آہنی چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد یہ ہوا کہ ایک ایک چوڑی ہر شخص کے ہاتھ میں پڑی ہوئی نظر آئی

یہ ہیں وہ اعمال جن کو آج کل یورپ روح و روحانیات کے ثبوت میں پیش کرتا ہے اور انھیں شعبدوں کی بنا پر مابعد الطبیعیات کی گتھیاں سلجھائی جارہی ہیں -
اس سلسلہ میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں - ایک یہ کہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی حقیقت ہے یا نہیں اور اگر ہے تو ان واقعات کو عالم ارواح سے متعلق مان کر ہم کو عالم مابعد الموت کا کیا تخیل قائم کرنا پڑے گا مجھے ان واقعات کی صحت پر بہت شک ہے یعنی میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ جو کچھ معمولوں یا وسیطوں کے ذریعہ سے دکھایا جاتا ہے وہ شعبدہ یا مکر و فریب نہیں ہوتا بلکہ حقیقت ہوتی ہے - اس شک کا ایک سبب تو یہ ہے کہ بالکل اسی قسم کی بہت سی نظر بندیاں مشرق میں بھی رائج ہیں، لیکن نہ کبھی ان کو "روحانیات" سے متعلق سمجھا گیا اور نہ خود ان لوگوں نے کبھی اس قسم کا دعوی کیا۔ مشرق میں اس فن کا نام علم نیرنجات" تھا اور یہاں کے قدیم لٹریچر میں اس فن کے مظاہرے کی متعدد مثالیں ملتی ہیں - ہر چند ہم کو آگاہی نہیں کہ اس علم کے کیا اصول تھے لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ بعض شعبدے تو ہاتھ کی صفائی و مشق سے متعلق تھے اور بعض کا تعلق کیمیاوی تفاعل سے تھا۔ پھر جبکہ یورپ کے یہ تمام مظاہرے بھی تقریباً وہی ہیں جن کا یہاں صرف شعبدہ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کو بھی ویسا ہی نہ سمجھیں اور محض اس لئے کہ انھوں نے بہت سی علمی رنگ کی اصطلاحیں اس کے متعلق گھڑلی ہیں اُن سے مرعوب ہو کر ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔
اس وقت مغرب میں ایک اور چیز رواج پا رہی ہے جس کا نام مسمریزم ہے اور اس میں کلام نہیں کہ اس کا تعلق دماغی قوت اور خیال کی مرکزیت سے ضرور ہے، لیکن روح و روحانیت سے اس کو بھی کوئی واسطہ نہیں - بلکہ اگر زیادہ غائر نگاہ سے کام لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک قسم کا فریب ہے جو دماغ ہی سے پیدا ہوتا ہے اور دماغ ہی کو متاثر کرتا ہے - میں نے خود امریکہ کے ایک ماہر مسمریزم کو دیکھا جو دماغ انسانی پر نہایت قوی اثر ڈالتا تھا۔ مثلاً اگر وہ کسی سے کہہ دیتا کہ آپ کیوں ہنس رہے ہیں تو وہ ہنسنا شروع کر دیتا اور کوئی قوت اُسے نہ روک سکتی جب تک کہ عامل خود نہ اُسے باز رکھتا، میرے سامنے ایک صاحب سے اس نے کہا کہ آپ تو مجھے پاگل معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سنتے ہی ان کی حالت بالکل دیوانوں کی سی ہو گئی اور

لگے جیب ودامن کی دھجیاں اُڑانے۔ اس لئے اگر مکر وفریب یا نظر بندی اور ہاتھ کی صفائی نہ ہو تو بھی روحانیات
وحاضرات کے ان مظاہروں میں بڑا دخل اس قوت مقناطیسی کا ہے جس کا دوسرا نام مسمریزم یا ہپناٹزم
ہے۔ کیونکہ اس قوت کے ذریعہ سے بہ آسانی ایک شخص کو بہت سی خلاف حقیقت باتوں کا یقین دلایا جا سکتا
ہے اور دوسروں کو متاثر کرکے ان کے خیال ونگاہ دونوں کو گمراہ کیا جا سکتا ہے۔

اچھا اب آیئے دوسری صورت فرض کیجئے کہ یہ جو کچھ حاضرات وغیرہ کے ذریعہ سے دکھایا جاتا ہے
یہ سب حقیقت وواقعیت ہے اور فی الاصل خود روحیں آکر پنسل سے لکھدیتی ہیں، میز کو اوپر اٹھا دیتی ہیں
باجہ بجانے لگتی ہیں، پھول برساتی ہیں، تو اصولی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو روحیں اس قسم کے کام کرتی
ہیں وہ وہی ہیں جو کسی وقت اجسام انسانی سے تعلق رکھتی تھیں یا کچھ مختلف ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے
انکار نہیں ہو سکتا اور ان کو وہی روحیں ماننا پڑے گا جو جسم انسانی سے واسطہ رکھتی تھیں۔ پھر جب روحیں
وہی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ جسم سے متعلق رہنے کی حالت میں یہ کام نہ کرسکتی تھیں۔ اور اس کو بھی جانے دیجئے
سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر روحیں جسم سے جدا ہونے کے بعد یہ قدرت رکھتی ہیں کہ وہ جسم اختیار کرکے سامنے
آسکیں، باجہ بجا سکیں، ناچ سکیں تھرک سکیں، تو پھر گفتگو کرنے سے کونسی چیز اُن کو مانع آتی ہے۔

وہ مذاہب جو معاد کے قائل ہیں، یعنی جو یہ بتاتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسانی روحیں ایک وقت معینہ تک
عالم برزخ میں رہنے کے بعد عذاب وثواب کے جھگڑوں میں مبتلا کی جائیں گی، وہ کسی طرح مغرب کی ان روایات
وحکایات کو صحیح باور نہیں کرسکتے، کیونکہ اُن کے نظریہ کے مطابق اگر روحیں عالم برزخ میں مبتلائے تکلیف
ہیں تو ان کو اتنی آزادی ملنا محال ہے کہ وہ جہاں چاہیں گھومتی پھریں اور اگر مصروف راحت ہیں تو انکا
دنیاوی کاروبار میں پھر دلچسپی لینا سمجھ میں نہیں آتا ——

اب رہ گئے وہ لوگ جو معاد کے قائل نہیں ہیں اور مرنے کے بعد کسی اور عالم کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے،
سو وہ بدرجۂ اولیٰ ان باتوں کو لغو قرار دیں گے، کیونکہ وہ سرے سے روح کے علاحدہ وجود ہی کے قائل
نہیں ہیں اور مرنے کے بعد کی کیفیت کو وہ بالکل حالت عدم کی سی کیفیت سمجھتے ہیں۔

اس لئے ظاہر ہے کہ اہل مغرب کی یہ تحقیقات ایک اور تیسری صورت پیدا کرنے والی ہے یعنی یہ کہ مرنے
کے بعد نہ حشر ونشر ہے نہ حالت عدم، بلکہ بالکل اسی دنیا کی طرح ایک اور عالم ہے جہاں روحیں اپنی تمام اُنھیں
خواہشوں کے ساتھ پائی جاتی ہیں جو دنیائے آب وگل میں اُن سے متعلق تھیں۔ البتہ فرق صرف یہ ہے کہ دنیا
میں وہ جسم کی پابند تھیں اور یہاں وہ اس سے بے نیاز ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس حقیقت کو باور کرنے کیلئے
وہ واقعات کافی ہیں جو عام طور پر حاضرات وغیرہ کے سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں اور کیا اس کا یقین دلایا جا سکتا ہے
کہ مستقبل میں یہ تمام باتیں محض واہمہ وخیال کی طلسم سازیاں ثابت نہ ہونگی۔ نیاز۔

NATIONAL ... UNIVERSITY

سیزر اور کلیوپیٹرا

(مسلسل)

سیزر - (مہربان ہوکر) جاؤ میرے لڑکے تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ تم اپنے دوستوں کے ساتھ زیادہ محفوظ رہوگے۔ یہاں تم ایک شیر کے منھ میں ہو۔

ٹالمی - (ہٹتے ہوئے) میں شیر سے نہیں ڈرتا لیکن (روفیو کو دیکھکر) گیدڑ سے ڈرتا ہوں۔

(وہ دالان سے نکل جاتا ہے)

سیزر - (ہنستے ہوئے) بہادر لڑکے!

کلیوپیٹرا - (سیزر کے انصاف کو نگاہ حسد سے دیکھکر ٹالمی کو پکارتے ہوئے) چھوٹے بیوقوف تم اُسے بہت چالاک سمجھتے ہو۔

سیزر - برٹینس! بادشاہ کے ساتھ جاؤ اور اُسے پوتھینس کے حوالے کردو۔

(بریٹینس ٹالمی کے ساتھ چلا جاتا ہے)

روفیو - (کلیوپیٹرا کی طرف اشارہ کرکے) اے خوبیوں کا مجسمہ! اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔؟ —— میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اسے تمھاری مرضی پر چھوڑ دیا جائے (وہ چلا جاتا ہے)

کلیوپیٹرا - (شگفتہ ہوکر سیزر سے) کیا تم نے مجھے بھی سب کے ساتھ جانے کو کہا؟

سیزر - (کسی قدر محویت سے سرد آہ بھرتے ہوئے ٹالمی کی کرسی کے قریب جاتا ہے اور کلیوپیٹرا تمتماتے ہوئے رخساروں اور بند مٹھیوں کے ساتھ اپنے جواب کا انتظار کرتی ہے) تم جو چاہو کر سکتی ہو۔ کلیوپیٹرا۔

کلیوپیٹرا - تو تم کو میرے ٹھہرنے اور چلے جانے کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔

سیزر - (مسکراکر) میں تو فی الحقیقت یہی چاہتا ہوں کہ ٹھہرو۔

کلیوپیٹرا - کیا واقعی بہت زیادہ!

سیزر - (سر ہلاکر) بہت بہت، بہت زیادہ

کلیوپیٹرا - تو میں ٹھہرنا مناسب خیال کرتی ہوں کیونکہ یہ بات میری مرضی پر رکھی گئی ہے۔ لیکن میں تمہیں یاد رکھنا نہیں چاہتی۔

سیزر - یہ میں خوب سمجھتا ہوں (پکارتے ہوئے) طوطا تیتا۔ (فتا تا جو اب تک بیٹھی تھی اس کی طرف دیکھتی ہے۔ لیکن حرکت نہیں کرتی)

کلیوپیٹرا - (قہقہہ مارکر) اس کا نام طوطا تیتا نہیں ہے بلکہ فتاتا ہے۔ (پکارتے ہوئے) فتاتا (فتاتا اٹھکر کلیوپیٹرا کے پاس آتی ہے)

سیزر۔ (نام کو رٹتے ہوئے) تنفتا طیطا، فیتاطیطا ملکہ اسکندریہ میں اپنا دربار منعقد کرے گی عورتوں کو بلاؤ کہ اس کے احکام کی تعمیل کے لئے حاضر رہیں اس کے علاوہ اور جو ضروری انتظامات ہوں اُن کو انجام دو۔

فتاتا۔ تو کیا میں ملکہ کے محل کی مالکہ ہوں؟

کلیوپیٹرا۔ (تیزی سے) نہیں، محل کی مالکہ میں ہوں جاؤ تم سے جو کچھ کہا گیا ہے کرو۔ ورنہ میں تمھیں آج ہی سہ پہر کو دریائے نیل میں ڈال دونگی تاکہ نکر اور گھڑیال تم کو نگل جائیں۔

سیزر۔ (گھبرا کر) اوہ۔ نہیں نہیں۔

کلیوپیٹرا۔ ہاں، ہاں، تم بہت جذباتی ہو۔ اور جیسے چالاک ہو اور اگر تم میرے کہنے کے مطابق عمل کرو تو تم کو حکومت کرنا جلد آجائے گا۔

(سیزر اس شوخی سے بے حد متاثر ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور کلیوپیٹرا کو گھورنے لگتا ہے۔ فتاتا زبردستی ہنستی ہوئی جاتی ہے)

سیزر۔ کلیوپیٹرا میں یہ سوچتا ہوں کہ اب تم کو نگل لینا چاہیئے۔

کلیوپیٹرا۔ (اس کے قریب گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگتی ہے) تمھیں مجھے ایک بچے کی طرح باتیں نہ کرنی چاہئیں۔

سیزر۔ اس رات سے جب ابوالہول نے ہمارا تمھارا تعارف کرایا تھا تم بڑی ہوتی جا رہی ہو۔ اور تمھارا خیال ہے تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔

کلیوپیٹرا۔ (اپنی غلطی کی تصحیح کرتے ہوئے) نہیں یہ میری انتہائی بیوقوفی ہوگی۔ تاہم میں یہ ضرور جانتی ہوں مگر ——— (یکایک) کیا تم مجھ سے خفا ہو!

سیزر۔ نہیں

کلیوپیٹرا۔ (یقین کرتے ہوئے) تو تم اس قدر خیالات میں کیوں ڈوبے ہوئے ہو؟

سیزر۔ (اُٹھکر) مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے کلیوپیٹرا۔

کلیوپیٹرا۔ (ٹہلتے ہوئے) کام! (نفرت سے) تم باتیں کرتے کرتے تھک گئے ہو اور اب مجھ سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے ہو۔

سیزر۔ (بیٹھکر) خیر اور ایک منٹ سہی لیکن اس کے بعد پھر ——— کام!

کلیوپیٹرا۔ کام کیا لغو چیز ہے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اب تو ایک بادشاہ ہو اور میں نے تم کو بادشاہ بنا دیا ہے۔ بادشاہ کام نہیں کیا کرتے۔

سیزر۔ یہ تم سے کس نے کہا۔ چھوٹے بلی کے بچے؟

کلیوپیٹرا۔ میرا باپ مصر کا بادشاہ تھا اور اس نے کبھی کسی کام میں ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ لیکن وہ ایک بہت زبردست بادشاہ تھا اور اس نے میری بہن کا سر محض اس لیئے قلم کر دیا کہ اُس نے باپ سے بغاوت کی تھی اور اس سے اس کا تخت چھین لیا تھا۔

سیزر۔ بہت خوب! لیکن اُسے پھر اس کا تخت کیونکر واپس مل گیا۔؟

کلیوپیٹرا - (آنکھیں مسرت سے چمکنے لگتی ہیں) سنو! ایک حسین جوان آدمی، جس کے بازو، خوبصورت، گول اور مضبوط تھے، بہت سے سواروں کے ساتھ ریگستان میں وارد ہوا - اس نے میری بہن کے شوہر کو قتل کر ڈالا اور میرے والد کو تخت واپس دلا دیا - اُس وقت میری عمر صرف بارہ برس کی تھی، میں چاہتی ہوں کاش کہ وہ پھر آتا اور میں اسے اپنا شوہر بنا لیتی -

سیزر - شاید یہ ممکن ہو - کیونکہ وہ شخص میں ہی ہوں، جس نے اس خوبصورت آدمی کو تمھارے باپ کی مدد کے لئے بھیجا تھا -

کلیوپیٹرا - (خوشی سے پھول کر) تم اُسے جانتے ہو؟

سیزر - (سر ہلا کر) ہاں!

کلیوپیٹرا - کیا وہ تمھارے ساتھ آیا ہے؟ -

(سیزر سر ہلا کر انکار کرتا ہے، اس سے کلیوپیٹرا انتہائی درجہ شکستہ دل ہو جاتی ہے) کاش وہ آیا ہوتا ــــ کاش میں اور بڑی ہوتی کہ وہ مجھے تمھاری طرح صرف ایک بلی کا بچہ نہ سمجھتا - لیکن یہ شاید اس لئے کہ تم بڈھے ہو وہ تم سے عمر میں کئی سال چھوٹا ہے، کیا وہ چھوٹا نہیں ہے؟

سیزر - (جیسے ایک گولی نگل رہا ہو) ہاں وہ کسی قدر کم عمر ہے -

کلیوپیٹرا - کیا وہ میرا شوہر بننا پسند کریگا؟ کیا تمھارا خیال ہے کہ وہ میری اس درخواست کو منظور کر لیگا؟

سیزر - بہت ممکن ہے -

کلیوپیٹرا - لیکن مجھے اس سے کہنا نہ چاہئے - کیا تم اسکو مجھسے درخواست کرنے پر راغب نہیں کر سکتے؟ مگر اسے یہ نہ بتاؤ کہ یہ میری خواہش ہے -

سیزر - (اس کی معصومیت سے متاثر ہو کر) میری چھوٹی بچی!

کلیوپیٹرا - تم مجھے بچہ کیوں کہتے ہو؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم میرے لئے متاسف ہو؟ کیا اُسے اور کسی سے محبت ہے؟

سیزر - مجھے کچھ ایسا ہی خطرہ ہے!

کلیوپیٹرا - (اشک آلود کر) تو پھر میں اس کی پہلی محبوبہ نہ بن سکونگی -

سیزر - ہاں پہلی محبوبہ نہیں بن سکتی عورتیں اسکی بے حد مداح اور قدر دان ہیں -

کلیوپیٹرا - کاش میں سب سے پہلی محبوبہ ہوتی تاہم اگر وہ مجھسے محبت کریگا تو میں اُس کو مجبور کرونگی کہ وہ اور سب کو قتل کر ڈالے - کیا وہ اب بھی خوبصورت ہے؟ کیا اس کے خوبصورت طاقتور اور گول بازو سورج کی روشنی میں، سنگ مرمر کی طرح چمکتے ہیں؟

سیزر - وہ بہت تندرست ہے -

کلیوپیٹرا - اوہ، تم کو اس کے متعلق عام، دنیاوی باتیں نہ کہنی چاہئیں کیونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں وہ ایک دیوتا ہے -

سیزر - وہ سواروں کا بڑا سردار ہے اور دوڑنے میں سب رومیوں سے زیادہ تیز ہے -

کلیوپیٹرا - اس کا اصل نام کیا ہے؟

سیزر - (گھبرا کر) اس کا اصل نام ؟
کلیوپیٹرا - ہاں ! میں اس کو ہمیشہ ہورس کہتی ہوں کیونکہ ہورس ہمارے دیوتاؤں میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے لیکن میں اس کا اصل نام دریافت کرنا چاہتی ہوں۔
سیزر - اس کا نام مارک انطونی ہے۔
کلیوپیٹرا - (ترنم کے ساتھ) مارک انطونی، مارک انطونی - کس قدر پیارا نام ہے (وہ دونوں باز و سیزر کی گردن میں حائل کر دیتی ہے) آہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے کہ تم نے اسے میرے باپ کی مدد کو بھیجا ؟ کیا تمھیں میرے باپ سے محبت تھی ؟
سیزر - نہیں میری بچی ! لیکن تمھارے باپ نے کبھی محبت نہیں کی، جیسا کہ تم ابھی کر چکی ہو، اور میں ہمیشہ کام کرتا رہتا ہوں اس لئے جب اس نے اپنا تخت کھو دیا تو اس نے مجھے سولہ ہزار ٹیلنٹس اس شرط پر دینے کا وعدہ کیا تھا کہ میں اسے تخت واپس دلا دوں۔
کلیوپیٹرا - کیا اس نے وہ رقم ادا نہیں کی ؟
سیزر - سب نہیں۔
کلیوپیٹرا - وہ تو بالکل راستی پر تھا، کیونکہ اس اعانت کا یہ بہت زیادہ معاوضہ تھا - اور ساری دنیا کی قیمت سولہ ہزار ٹیلنٹس نہیں ہو سکتی۔
سیزر - ہاں ! شاید تمھارا کہنا ٹھیک ہو - غریب مصری مزدوروں نے اس قدر ادا کر دیا جتنا بادشاہ ان سے وصول کر سکتا تھا - اور باقی رقم اب بھی وصول طلب ہے - لیکن جہاں تک مجھے یقین ہے اب وہ مجھے نہ مل سکے گی - اس لئے اب مجھے اپنے کام پر جانا چاہیے - اس لئے تم ذرا دوڑ جاؤ اور میرے سکریٹری کو بلا لاؤ۔
کلیوپیٹرا - (خوشامدانہ) نہیں میں یہیں ٹھہرونگی میں یہیں ٹھہرنا چاہتی ہوں تاکہ تم سے مارک انطونی کے متعلق کچھ اور سنوں -
سیزر - لیکن اگر میں محنت نہ کروں تو پوتھینس اور دوسرے آدمی ہمیں بندرگاہ سے جدا کر دیں گے، اور پھر روم کا راستہ بند ہو جائیگا -
کلیوپیٹرا - کوئی پروا کی بات نہیں ہے، میں تمھیں چاہتی ہوں کہ تم پھر روم واپس جاؤ -
سیزر - لیکن تم وہاں سے مارک انطونی کو بلانا چاہتی ہو -
کلیوپیٹرا - (مسرت سے اچھل کر) اوہ - ہاں، ہاں، میں بھول گئی - جاؤ جلد اور کام کرو سیزر ! اور سمندر راستہ مارک انطونی کے لئے کھلا رہنے دو -

(وہ دالان میں بھاگ جاتی ہے اور اپنا ہاتھ مارک انطونی کے تصور میں سمندر کی طرف اٹھا کر چوم لیتی ہے)

سیزر - (دالان کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر دالان میں جاتے ہوئے) بری ٹینس ! (وہ ایک زخمی رومی سپاہی کے داخل ہونے پر چونک پڑتا ہے جو اسے اوپر کی سیڑھی سے تکنے لگتا ہے) کیوں ؟ کیا حال ہے ؟
سپاہی - (اپنے پٹی بندھے ہوئے سر کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے) میرے دو رفیق بازار میں قتل کر دیئے گئے اور میں زخمی ہوا۔
سیزر۔ (خاموشی سے غور کرتے ہوئے) مگر کیوں؟
سپاہی۔ یہاں اسکندریہ میں ایک فوج آئی ہے جو اپنے آپ کو رومی فوج بتاتی ہے۔
سیزر۔ رومی مقامی فوج ہاں؟
سپاہی۔ اچلیس کی نگرانی میں
سیزر۔ (اچھا؟
سپاہی۔ جب فوج پھاٹک میں داخل ہوئی تو شہری ہماری مخالفت پر تیار ہو گئے۔ جب یہ خبر پہنچی تو میں اپنے دو رفیقوں کے ساتھ بازار میں تھا لوگ ہم پر حملہ کر بیٹھے اور میں بمشکل تمام اُن سے بچکر یہاں تک پہنچ سکا۔
سیزر۔ خوب۔ میں تم کو دیکھکر مسرور ہوں۔
(روفیو بعجلت دالان میں داخل ہوتا ہے اور سپاہی کے پیچھے سے گذرتا ہے، تاکہ ایک محراب میں سے نیچے کا منظر دیکھ سکے)
روفیو ہم نظر بند کر لئے گئے۔
روفیو۔ کیا؟ بالکل؟
سیزر۔ ہاں بالکل،
(بری ٹینس اندر دوڑتا ہوا آتا ہے)
بری ٹینس۔ سیزر!
سیزر۔ (اس کے خیالات کو تاڑتے ہوئے) ہاں میں جانتا ہوں (روفیو اور بری ٹینس دالان کی متضاد سمتوں سے داخل ہوتے ہیں اور سیزر کے قریب سے گزر جاتے ہیں جو سپاہی کے قریب ایک فرش کے لئے کھڑا

ہو اسپاہی سے کچھ کہنا چاہتا ہے) ——— میرے دوست۔ مجھسے وعدہ کرو کہ یہاں سے نکل کر سمندر کے کنارے جاؤ گے اور کشتیوں کی حفاظت کرو گے جاؤ اپنے زخموں کی مرہم پٹی کراؤ (سپاہی چلا جاتا ہے، سیزر نیچے دالان میں بری ٹینس اور روفیو کے درمیان آتا ہے)۔
روفیو ہمارے بعض جہاز مغربی کنارے پر ہیں اُن کو جلا دو۔
روفیو۔ (تعجب سے) جلا دو!
سیزر۔ ہاں انھیں جلا دو اور مشرقی کنارے پر جتنی کشتیاں ہیں انھیں لیکر اس جزیرہ پر قبضہ کر لو جس میں روشن مینار نظر آتا ہے۔ ہمارے نصف رفیقوں کو وہیں چھوڑ دو تاکہ وہ ساحل کی حفاظت کریں اور محل سے باہر جانے کے راستہ کی پوری نگرانی رکھیں۔ یہی گھر کا راستہ ہے۔
روفیو۔ (نہایت بددلی سے) کیا ہم شہر چھوڑ دیں۔
سیزر۔ یہ ہم کو ملا نہیں ہے روفیو! صرف یہ محل ہمارا ہے اور ——— وہ دوسری عمارت دوسرے دروازہ کے پاس کونسی ہے؟
روفیو۔ تھیٹر۔
سیزر۔ ہم اسے بھی لے لیں گے، کیونکہ ساحل کی حفاظت کے لئے اس پر قبضہ ضروری ہے۔ باقی حصہ مصریوں کے لئے ہے۔
روفیو۔ ہوں! میرا خیال ہے کہ آپ سب سے بہتر جانتے ہیں ——— اور کچھ؟
سیزر۔ بس اور کچھ نہیں کہا وہ جہاز ابھی تک

نذر آتش نہیں کئے گئے؟
روفیو۔ گھبراؤ نہیں سیزر، میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرونگا
(وہ بھاگ جاتا ہے)
بری تنیس۔ سیزر، پوتھینس کو کوئی سبق دینا چاہئے
اس کا رویہ بے حد وحشیانہ ہے
سیزر۔ وہ کہاں ہے؟
بری تنیس۔ وہ باہر انتظار کر رہا ہے۔
سیزر۔ اچھا بلاؤ پوتھینس کو!
(پوتھینس داخل ہوتا ہے اور اُمڑ کر دالان میں سیزر کی بائیں جانب نہایت تند خوئی سے آتا ہے)
سیزر۔ پوتھینس؟
پوتھینس۔ سیزر، ہم تم کو آخری بار آگاہ کرنے آئے ہیں۔
سیزر۔ آخری آگاہی! دروازہ کھلا ہوا تھا جنگ کا اعلان کرنے سے قبل تم کو اس دروازہ سے نکل جانا چاہئے تھا۔ اب تم میرے قیدی ہو۔ (وہ کرسی کے قریب جاکر اس کی عبا کھوتا ہے)
پوتھینس۔ (نفرت سے) میں تمہارا قیدی! کیا تم کو معلوم نہیں کہ تم اسکندریہ میں ہو، اور بادشاہ ٹالمی ایک بیشمار فوج کے ساتھ جو تمہاری ذراسی فوج کے مقابلہ میں سوگنا زیادہ ہے، اسکندریہ کا حکمراں ہے!
سیزر۔ (بے پروائی سے اس کی عبا اتار کر تخت پر پھینک دیتا ہے) اچھا میرے دوست، اگر تم میں طاقت ہے تو یہاں سے بھاگ جاؤ اور اپنے دوستوں سے کہو کہ وہ بازار میں کسی رومی کو قتل نہ کریں ورنہ میرے سپاہی، جو میری طرح رحمدل اور حلیم نہیں ہیں، یقیناً تم کو مار ڈالیں گے، بری تنیس محافظ کو اطلاع کردو۔ اور میری زرہ لاؤ۔ (بری تنیس چلا جاتا ہے روفیو داخل ہوتا ہے) کیا خبر لائے؟
روفیو۔ (دالان میں سے ساحل کی طرف اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف اشارہ کرکے) اس طرف دیکھو۔ (پوتھینس بےچینی سے باہر دیکھنے کو سیڑھی کی طرف دوڑتا ہے)
سیزر۔ کیا؟ بالکل آگ لگادی، ناممکن ہے۔
روفیو۔ ہاں، پانچ بہترین جہاز، اور ہر ایک کے ساتھ ایک تیل سے بھرا ہوا خزانہ بھی لیکن یہ میرا کیا ہوا نہیں ہے، مصریوں نے مجھے اس تکلیف سے بچالیا، انھوں نے مغربی ساحل پر قبضہ کرلیا ہے۔
سیزر۔ (بےچینی سے) اور مشرقی ساحل، ہر روشنی کا مینار، روفیو؟
روفیو۔ (سیزر کے قریب آکر) کیا میں ایک فوجی دستہ کو جہاز پر صرف پانچ منٹ میں روانہ کرسکتا ہوں؟ پہلا دستہ ساحل پر پہنچ گیا ہے اگر آپ اس سے تیز کام چاہتے ہیں تو خود آکر کرلیجئے
سیزر۔ (تسکین دیکر) شاباش شاباش
تاہم صبر سے کام لو، روفیو، صبر!
روفیو۔ صبر! یہاں کون بےخبر ہے۔ آپ یا میں؟ اگر میں ان کو اس دالان سے نہ دیکھ سکتا تو کیا یہاں ٹھہرتا؟
سیزر۔ معاف کرو۔ روفیو۔ اور (بےچینی سے) جلدی کرو۔ جس قدر ممکن ہو —— (ایک بڑھے آدمی

کی دردناک آواز اس کی گفتگو کو منقطع کر دیتی ہے اور وہ آواز قریب آجاتی ہے۔ آخر کار تھیوڈوٹس اپنے بال نوچتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ روفیو اُسے دیکھنے کو نیچے اتر جاتا ہے اس کی اس حالت پر متعجب ہو کر پوتھینس سننے لگتا ہے)

تھیوڈوٹس۔ (سیڑھی پر دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھاکر) آہ ناقابلِ بیان خطرہ، بدقسمتی، افسوس، مدد!

روفیو۔ کیا ہوا؟

سیزر۔ (دھمکاکر) کون قتل ہوا؟

تھیوڈوٹس۔ قتل، آہ دس ہزار آدمیوں کی موت سے زیادہ خوفناک نقصان دنیائے انسانیت کا ناقابلِ تلافی خسارہ!

روفیو۔ آخر ہوا کیا؟ بھلے آدمی؟

تھیوڈوٹس۔ (دالان میں آتے ہوئے) تمھارے جہاز کی آگ مشتعل ہو چکی ہے اور دنیا کے سات عجائبات میں سے سب سے پہلی چیز برباد ہو رہی ہے اسکندریہ کے کتب خانہ میں آگ لگ گئی ہے۔

روفیو۔ اوہ۔ (وہ بالکل مطمئن انداز سے دالان کی طرف جاتا ہے اور ساحل پر فوج کی نقل و حرکت دیکھنے لگتا ہے)

سیزر۔ کیا یہی خبر ہے؟

تھیوڈوٹس۔ (اس کے ہوش و حواس پر یقین نہ کرتے ہوئے) یہی! سیزر، کیا تم ایک وحشی سپاہی کی طرح نسلاً بعد نسلٍ کتابوں کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہی بنے رہو گے؟

سیزر۔ تھیوڈوٹس! میں خود ایک مصنف ہوں، اور میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ بہتر ہے کہ مصری خود اپنی زندگی کو، زندگی کی طرح گذاریں بجائے اس کے کہ وہ کتابوں کی مدد سے اسے خواب بنائیں۔

تھیوڈوٹس۔ (گھٹنوں پر کھڑے ہو کر ادبی جوش و ذوق اور خود نمائی کے جذبہ کے ساتھ) سیزر، انسان کی دس پشتوں کے بعد دنیا کو ایک غیر فانی کتاب نصیب ہوتی ہے۔

سیزر۔ جسے معمولی سے معمولی آدمی بھی جلا سکتا ہے۔

تھیوڈوٹس۔ تاریخ کے بغیر موت تمھارے اور ایک سپاہی کے مابین کوئی امتیاز باقی نہ رکھیگی اور اس کے برابر سلادیگی۔

سیزر۔ موت تو ہر حال میں یہی کرے گی، مجھے اس سے بہتر قبر کی اتنا بھی نہیں ہے۔

تھیوڈوٹس۔ جو کچھ وہاں جل رہا ہے وہ انسانیت کا ذہن اور حافظہ ہے۔

سیزر۔ ایک شرم آلود حافظہ، اُسے جل جانے دو۔

تھیوڈوٹس۔ کیا تم ماضی کو برباد کر دو گے؟

سیزر۔ ہاں، اور اس کے ویرانوں پر مستقبل کی تعمیر کرونگا ——— (تھیوڈوٹس، عالم یاس میں مٹھیوں سے اپنی کنپٹیوں پر گھونسے مارنے لگتا ہے)۔ لیکن سنو تھیوڈوٹس بادشاہوں کے استاد، تم، جس نے پمپئی کے سر کی اتنی قیمت بھی نہ لگائی جتنی ایک چرواہا پیاز کی لگاتا ہے۔ اور تم جواب میرے سامنے اشک آلود آنکھوں سے چند بھیڑ والی

کی کھالوں کی جن پر کچھ گدا ہوا ہے، حفاظت کی درخواست کر رہے ہو، سنو کہ میں اس وقت تمھاری امداد ایک آدمی یا ایک کٹورا پانی سے بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن تم محل سے آزادانہ طور پر جا سکتے ہو۔ اچیلس کے پاس جاؤ اور اُس سے فوجیں مستعار لو۔ تاکہ وہ آگ بجھا دیں۔

(وہ اُسے سیڑھیوں پر تیزی سے دھکا دیتا ہے)

پوتھینس۔ (معنی خیز انداز سے) مجھے تھیوڈوٹس، اور میں ایک قیدی ہوں۔

تھیوڈوٹس۔ ایک قیدی!

سیزر۔ کیا جب انسان کا حافظہ جل رہا ہے تو تم باتیں کرنے کے لئے ٹھہرے رہو گے؟ (دالان میں سے پکار کر) وہاں جاؤ تھیوڈوٹس، باہر نکل جاؤ (تھیوڈوٹس سے) چلے جاؤ۔

تھیوڈوٹس۔ (پوتھینس سے) مجھے کتب خانہ کو بچانے کے لئے جانا چاہئے (وہ چلا جاتا ہے)

سیزر۔ جاؤ پوتھینس، اس کے ساتھ دروازہ تک جاؤ۔ اس سے کہو کہ وہ اپنے ساتھیوں سے یہ استدعا کرے کہ وہ میرے کسی اور سپاہی کو قتل نہ کریں۔ یہ صرف تمھاری خاطر ہے۔

پوتھینس۔ اگر تم نے میری جان لی، تو اس کا معاوضہ ادا کرنا دوبھر ہو جائیگا۔ یاد رکھو سیزر! (وہ تھیوڈوٹس کے پیچھے جاتا ہے)

(روفیو، جہاز کی طرف دیکھنے میں اس قدر محو ہوتا ہے کہ اُسے دونوں مصریوں کے جانیکا احساس نہیں ہوتا)

روفیو۔ (دالان سے ساحل کی طرف پکار کر) وہاں سب کچھ ٹھیک ہو گیا؟

ایک صوبیدار۔ (نیچے سے) سب ٹھیک ہے۔ ہم کو صرف سیزر کا انتظار ہے۔

سیزر۔ ان سے کہو کہ سیزر آرہا ہے۔ سیزر (پکار کر) برٹنیس۔

روفیو۔ (نیچے پکار کر) چلو سب لوگ بڑھو۔ صرف ایک بڑی کشتی رہنے دو اور اس کے پاس سیزر کے محافظ کھڑے رہیں (وہ برآمدہ سے اُتر کر دالان میں آتا ہے) وہ مصری کہاں ہیں۔ ان کو چلے جانیکی اجازت دیدی؟

سیزر۔ (زبان چبا کر) میں نے تھیوڈوٹس کو کتبخانے کو بچانے کے لئے جانے کی اجازت دیدی ہے۔ روفیو ہم کو ادب (لٹریچر) کی عزت کرنی چاہئے۔

روفیو۔ (بیزار ہوتے ہوئے) بیوقوفی۔ جہالت۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ ہسپانیہ، گال اور تھسلی کے تمام مُردوں کو زندہ کر سکتے تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان سے دوبارہ لڑیں۔

سیزر۔ کیا دیوتا ساری دنیا کو برباد نہ کردیں اگر صرف آئندہ سال تک مطمئن رہنے کا خیال ان کو ہو؟ (روفیو بے چینی اور غصہ سے منہ پھیر لیتا ہے۔ سیزر فوراً اُسکی آستین پکڑ لیتا ہے اور اس کے کان میں چپکے سے کہتا ہے) میرے دوست ایک مصری کو قید کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ دو رومی سپاہی اس کی حفاظت کے لئے مقید ہو گئے؟

(روفیو نہایت مردہ دل ہو کر سیزر کی طرف
سے پلٹتا ہے اور برآمدہ میں جاتا ہے اور سفر
کی طیاریوں کو دیکھکے پھر باہر چلا آتا ہے)

سیزر۔ کیا بری ٹینس سو گیا؟ میں نے ایک
گھنٹہ ہوا اُسے زرہ بکتر لانے کو بھیجا تھا۔ (پکار کر)
بری ٹینس! او برطانوی جزیرہ کے رہنے والے
بری ٹینس

(کلیوپیٹرا' سیزر کی زرہ اور تلوار لئے ہوئے
جو اس نے بری ٹینس سے لے لی تھی' برآمدہ کے
داخل ہوتی ہے۔ بری ٹینس اور دوسری چیزیں
لئے ہوئے پیچھے پیچھے آتا ہے۔ دونوں سیزر کے
پاس آتے ہیں۔ وہ سیزر کی دائیں جانب
اور بری ٹینس بائیں جانب کھڑا ہو جاتا ہے)

کلیوپیٹرا۔ میں تم کو کپڑے وغیرہ پہناؤنگی سیزر
بیٹھ جاؤ۔ (وہ بیٹھ جاتا ہے) یہ رومی خود ہے' بہت
موزوں ہے (وہ اس کی پگڑی اتار ڈالتی ہے) اوہ۔
(وہ قہقہہ مارتی ہے)

سیزر۔ تم کس بات پر ہنس رہی ہو؟

کلیوپیٹرا۔ تمھارے گنجے سر پر۔

سیزر۔ (گھبرا کر) کلیوپیٹرا۔

(وہ بری ٹینس کی سہولت کی خاطر' جو اُسے جوشن
پہنا رہا ہے کھڑا ہو جاتا ہے)

کلیوپیٹرا۔ اس لئے تم یہ پگڑی پہنتے ہو۔ اسے چھپانے
کے لئے۔

بری ٹینس۔ او مصری خاموش رہ یہ ایک فاتح کے
راز ہیں۔
(وہ جوشن باندھ دیتا ہے)

کلیوپیٹرا۔ چپ رہ۔ او جزیرے کے باشندے
(سیزر سے) تمھیں اپنے سر پر تیز سرکہ ملنا چاہئے
سیزر اس سے بال نکل آئیں گے۔

سیزر۔ (منہ بنا کر) کلیوپیٹرا اگر تم کہو تو یاد دلادوں
کہ تم ابھی بالکل جوان ہو۔

کلیوپیٹرا۔ نہیں۔

سیزر۔ (بیٹھکر اور پاؤں بری ٹینس کی طرف پھیلا کر)
اور میں بھی اس بات کو یاد رکھنا پسند نہیں کرتا کہ میں
کیا ہوں' ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بہتر ہے میں اپنی
زندگی کے بہترین دس سال تمھارے نذر کر دوں اس سے
تم چھبیس سال کی ہو جاؤ گی۔ اور مجھے چھوڑ دو۔ میرا
کیا ہے یہ سودا تمھیں منظور ہے؟

کلیوپیٹرا۔ منظور چھبیس خیال رکھو۔ (وہ اسی خود
پہنا دیتی ہے) اوہ۔ کس قدر خوبصورت ہے تم اسکو
پہنکر صرف پچاس برس کے معلوم ہوتے ہو۔

بری ٹینس۔ (کلیوپیٹرا کی طرف سختی سے دیکھکر) تم کو
سیزر سے اس طرح گفتگو نہ کرنی چاہئے۔

کلیوپیٹرا۔ کیا یہ سچ ہے کہ جب سیزر نے تم کو
اس جزیرہ میں پکڑا تھا تو نیلے رنگ سے رنگ دیا تھا؟

بری ٹینس۔ نیلا رنگ تمام برطانوی شرفا استعمال
کرتے ہیں۔ جنگ میں ہم اپنے جسم کو نیلا رنگ لیتے ہیں
(وہ کھڑا ہو جاتا ہے)

کلیوپیٹرا۔ (سیزر کی تلوار لیکر) مجھے یہ لٹکانے دو

اب تم بڑے شاندار معلوم ہوتے ہو۔ کیا روم میں تمھارا کوئی مجسمہ بنایا گیا ہے؟

سیزر۔ ہاں بہت سے مجسمے۔

کلیوپیٹرا۔ تو تم کو چاہیے کہ ایک رنگوا کر مجھے دو۔

(روفیو دوبارہ برآمدہ میں آتا ہے اور بے چین معلوم ہوتا ہے)

روفیو۔ سیزر! کیا باتیں ختم ہو چکیں؟ جیسے ہی تمھارا قدم جہاز پر ہوگا۔ ہمارے آدمیوں کی گرفتاری شروع ہو جائے گی۔ کشتیاں روشن مینار تک پہنچنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کریں گی۔

سیزر۔ (تلوار کھینچکر اس کی دھار چھوتے ہوئے) بریٹینس۔ کیا یہ تلوار آج بالکل ٹھیک ہے پہلے تو یہ ایک چھری کی طرح بالکل کند تھی۔

بری ٹینس۔ یہ آج ایک مصری کے بال کو بھی دو کر سکتی ہے۔

کلیوپیٹرا۔ (یکایک خوفزدہ ہو کر اپنے ہاتھ سیزر کی گردن میں حائل کرتے ہوئے) اوہ۔ تم جنگ میں تو نہیں جا رہے ہو کہ لڑ کر مارے جاؤ۔

سیزر۔ نہیں کلیوپیٹرا۔ کوئی شخص مرجانے کو جنگ میں نہیں جایا کرتا۔

کلیوپیٹرا۔ لیکن جانیوالے ضرور مر جاتے ہیں۔ میرا بہنوئی بھی لڑائی میں مارا گیا۔ تم کو نہ جانا چاہیے۔ اس کو جانے دو (روفیو کی طرف اشارہ کرتی ہے، سب ہنس پڑتے ہیں) اوہ خدا کے لئے مت جاؤ۔ اگر تم پھر واپس نہ آئے تو میری کیا حالت ہو گی؟

سیزر۔ (سنجیدگی سے) کیا تم خوفزدہ ہو؟

کلیوپیٹرا۔ (بے چینی سے) نہیں۔

سیزر۔ (خاموش اور بارعب انداز سے) جاؤ تم برآمدہ میں سے جا کر دیکھو کہ ہم جزیرہ پر کس طرح قبضہ کرتے ہیں۔ تمھیں جنگی مناظر دیکھنے کا درس لینا چاہیے جاؤ (وہ افسردہ دلی کے ساتھ جاتی ہے اور برآمدہ میں سے باہر کی طرف دیکھتی ہے) ہاں اب ٹھیک ہے۔ روفیو۔ چلو۔

کلیوپیٹرا۔ (یکایک تالی بجا کر) تم نہ جا سکو گے؟

سیزر۔ کیوں؟ اب کیا رکھا ہے؟

کلیوپیٹرا۔ اُدھر (اپنی بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے) ساحل پر فوجیوں کی ایک بڑی جماعت پانی ڈول سے نکال رہی ہے

روفیو۔ (ٹھٹھک کر دیکھتے ہوئے) سچ ہے۔ مصری فوج مغربی ساحل کے کنارے ٹڈی دل کی طرح حرکت کر رہی ہے۔ (وہ غصہ سے اتر کر سیزر کے پاس آتا ہے) یہ آپ کی بربادی کا سامان ہے سیزر تھیوڈوٹس ان کو اپنے ساتھ لایا ہے۔

سیزر۔ (خوش ہو کر) روفیو میں نے خود اس سے کہا تھا۔ وہ لوگ آگ بجھانے آئے ہیں اور جتنی دیر تک وہ کتب خانے کی آگ بجھانے میں منہمک رہیں گے ہم روشنی کا مینار اپنے قبضے میں کر لیں گے۔

(وہ برآمدہ میں تیزی سے جاتا ہے اور بری ٹینس بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے)

روفیو - (آزردہ خاطر ہو کر) انتہائی بیوقوفی -

(وہ باہر چلا جاتا ہے - ایک سپاہی کی آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ سیزر نیچے پہنچ گیا -)

صوبیدار - (نیچے) سب لوگ جہاز پر چلو اور راستہ خالی کرو -

کلیوپیٹرا - (اپنا رومال برآمدہ میں ہلاتی ہے) پیارے سیزر خدا حافظ ——— (باقی دارد)

(ترجمہ برنارڈ شا)　　　محشر عابدی

ایک ارزاں سودا

خواب و خیال	عا/
زہر عشق	۸/
شونپہار	عہ/
فلسفۂ مذہب	عہ/
تذکرۂ خندۂ گل	عا/
انتخاب گلابی اردو	۸/
عرب اور اس کا مستقبل	عہ/
شاعر کا انجام	۱۰/
بحر تبسم	۸/
موج تبسم	۱۲/
فراست الید	عہ/
مذاکرات نیاز	۱۲/
فلاسفہ قدیم	۸/
جذبات بھاشا	۱۲/
نقاب اٹھ جانے کے بعد	۵/
لالۂ رخ	عہ/
فراست التحریر مکمل	عہ/

ان سب کتابوں کی مجموعی قیمت علاوہ محصول ۱۱/۲ ہے لیکن یہ سب کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے میں آپ کو علاوہ محصول ۹ میں مل سکتی ہیں ہر آرڈر کے ساتھ چوتھائی قیمت آنا ضروری ہے -

"منیجر نگار لکھنؤ"

آیندہ جنوری سنہ ۱۹۳۳ء کا نگار

اردو میں بالکل پہلی چیز ہوگا

اس ماہ کے صفحہ ۱۲ اور صفحہ ۵۶ کو ملاحظہ کیجئے

منیجر نگار لکھنؤ

آئندہ جنوری (سنہ ۳۳) کے نگار کے چند مختلف ٹکڑے

تاریخ الفحشاء یا شہوانیات کے موضوع پر

(حضرت نیاز فتحپوری کے قلم سے)

ہیروڈوٹس مشہور مورخ لکھتا ہے کہ "سب سے پہلے اہل مصر میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہیکلوں اور معبدوں کے اندر عورت سے بات چیت کرنا ناجائز ہے اور اس میں اس حد تک غلو ہوا کہ اگر مندر میں داخل ہونے سے قبل وہ کسی عورت سے گفتگو کر لیتے تھے تو بغیر غسل کئے ہوئے اندر نہ جاتے تھے۔ لیکن اہل مصر کے علاوہ دیگر اقوام وملل کا نظریہ کچھ اور تھا وہ کہتے تھے کہ جب مندروں اور معبدوں کے اندر مختلف قسم کے جانور اور طیور باہم گر ملتفت ہوتے ہیں اور دیوتا اس سے ناخوش نہیں ہوتے تو کوئی وجہ نہیں کہ مرد وعورت کا اختلاط وہاں ناجائز قرار دیا جائے۔ یہ خیال رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کر گیا کہ معبدوں کے اندر اختلاط جنسی مذہبی عبادت قرار پایا

ایک عرب جغرافیہ داں نے یوروپ کی سلافی قوم کی نسبت حسب ذیل دلچسپ تحقیق پیش کی ہے :-
اگر سلافی قوم کی کوئی لڑکی کسی مرد پر فریفتہ ہو جاتی ہے تو وہ بالکل آزاد ہوتی ہے۔ اور اس پر بجائے ملامت کے اظہار فخر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات مشہور ہے کہ اگر شادی کے بعد لڑکی کی عصمت غیر مجروح پائی جاتی ہے تو اس کا مرد اس پر طعن کرتا ہے اور اگر گھر سے نہیں نکالتا تو بہت ذلت کے ساتھ رکھتا ہے۔

مغرب کی ایک پیشہ ور عورت نے جو اپنے تجربات لکھے ہیں وہ عجیب وغریب ہیں وہ لکھتی ہے :-
"میں گاؤں کی رہنے والی ہوں - ہمارے گاؤں میں کبھی کبھی ایک دولتمند شخص آتا اور میرے اور میری ہمسن لڑکیوں کے سامنے بالکل برہنہ ہو جاتا اور تھوڑی دیر کے بعد چلا جاتا۔ بعد کو یہ شخص گرفتار ہو کر قید میں ڈال دیا گیا - میں نے بعض مردوں میں اس سے زیادہ عجیب وغریب شوق دیکھے - مثلاً میرے پاس ایک نوجوان آتا اور ٹوکرے میں بند کبوتر کا ایک جوڑا بھی اپنے ساتھ لاتا - اس کے آنے کے بعد میں اور

میرے ساتھ کی دوسری لڑکی بہ حالت عریانی ایک ایک کبوتر اپنے ہاتھ میں لیتی اور ان کی گردنیں مروڑ کر زمین پر ڈالدیتی - اس جوان پر یہ منظر دیکھ کر سخت ہیجانِ نفس طاری ہوجاتا -

یہی عورت دوسری جگہ لکھتی ہے " ایک بار کا ذکر ہے کہ مجھے بازار میں ایک مرد ملا اور بولا کہ اگر آپ پسند کریں تو میرے ساتھ ہوٹل چلیں وہاں میں آپ کے بوٹ چاٹنا چاہتا ہوں، چنانچہ معاملہ طے ہوگیا اور ہم دونوں ایک ہوٹل میں داخل ہوئے - یہاں ہو کر میں میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور وہ میز کے نیچے گھس کر میرے بوٹ جو کیچڑ سے لتھڑے ہوئے تھے دیر تک چاٹتا گیا -

ایک اور صاحب کے متعلق لکھتی ہے کہ :-

وہ ہمیشہ اپنے ساتھ ایک قمچی لایا کرتا تھا اور میرے ساتھ کی لڑکی کو خوب مارتا تھا یہاں تک کہ اس کے جسم سے خون جاری ہوجاتا - یہی منظر اس کے لئے باعث ہیجان ہوا کرتا تھا -

---

قدیم یونان میں "استلذاذ بالضد" کا شوق خاص خاص لوگوں تک محدود تھا یعنی صرف آزاد شہریوں اور بانکے شہسواروں کو اس کی اجازت تھی - غلام یہ حرکت ہرگز نہ کرسکتے تھے، ان کے لئے سزائے موت مقرر تھی - بڑھتے بڑھتے جب یہ شوق عام ہوگیا تو مستقلاً اک معاشری ادارہ بنگیا اور حکومت نے بھی اس کی سرپرستی اختیار کرکے قوانین وضع کئے -

ملک اسپارٹا میں رواج تھا کہ جب لڑکا بارہ برس کا ہوجاتا تو وہ آزاد ہوتا کہ جس کے پاس چاہے رہے جزیرۂ کریٹ میں اس شوق نے اس قدر ترقی کی کہ باضابطہ شادیاں ہونے لگیں - اگر کوئی شخص کسی امرد پر مائل ہوتا تو وہ اس کے والدین یا اعزہ کو آگاہ کردیتا پھر اگر اس کے خاندان والے اس تعلق کو پسند کرتے تو اس کی حفاظت کرتے و نہ ملنے کی اجازت دیدیتے - نہ صرف جزیرۂ کریٹ بلکہ تھیبا اور تھیرا اس میں بھی اس قسم کی شادی کی رسم مذہباً جاری تھی - چنانچہ تھیبا میں اپالو کے مندر کے قریب ایک کتبہ اب بھی نظر آتا ہے - جس پر یہ عبارت کندہ ہے -

> اس مقدس مقام پر بادشاہ کریون نے باسقلیس کے بیٹے سے شادی کی اور
> اس نے اس یادگار میں یہ کبھی نہ محو ہونے والا نشان قائم کیا -

روم میں بھی یہی حالت تھی چنانچہ بیبل لکھتا ہے کہ عورتوں سے زیادہ یہاں امارد کے "فحش خانے" موجود تھے -

---

مردوں کی طرح عورتوں میں بھی استلذاذ بالمثل کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں اور تاریخ قدیم وجدید اس

قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔

وہ کون ہے جو سیفو کو نہیں جانتا اور اس کی شاعری پر ایمان نہیں لایا، لیکن غالباً آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ وہ بھی اس مرض میں مبتلا تھی۔ وہ لڑکیوں سے بالکل اسی طرح محبت کرتی تھی جس طرح مرد ایک عورت سے کرتا ہے چنانچہ ایک لڑکی فاؤن کی عشق میں وہ اس حد تک مبتلا ہوگئی کہ جان دینے کے لئے سمندر میں کود پڑی ——— وہ اپنی سہیلیوں کو اسی شوق و ذوق کے خط لکھا کرتی تھی جیسے الکائیس اپنے محبوب لڑکوں کو لکھا کرتا تھا۔

"استلذاذ بالنفس" کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی اور دوسری فحاشیوں کی۔ چنانچہ بابل و آشوریا کے کھنڈروں میں جو معابد برآمد ہوئے ہیں ان کی دیواروں پر مصنوعی اعضا کی تصویریں بکثرت نظر آتی ہیں صحیفہ حزقی ایل میں بھی ایک جگہ اشارہ موجود ہے (ملاحظہ ہو صحیفہ مذکور باب ۱۶ آیت ۱۷)

تونے مرے دئے ہوئے سونے چاندی کے زیور بھی لے لئے۔ تو ان سے

مردوں کے بت بناتی ہے اور اُن سے اپنی خواہش پوری کرتی ہے"

برطانیہ کے عجائب خانہ میں ایک قدیم یونانی گلدان موجود ہے جس پر ایک یونانی پیشہ ور عورت کی تصویر بنی ہوئی ہے اور وہ اپنے ہاتھ میں مصنوعی عضو جنسی لئے ہوئے ہے۔ اس قسم کا ایک دوسرا گلدان پامپیائی کے کھنڈروں سے برآمد ہوا جو اٹلی کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔

قدیم یونانی عورتوں میں اس آلہ کا نام اولسبوس تھا، لاطینی میں فلّس کہتے تھے، فرانسیسی میں اس کے لئے اصطلاح گاڈیمیشہ رائج تھی، انگریزی میں اس کا نام ڈلڈو تھا، اور جرمنی میں سمتھا نسے نسوانی عضو کا نام انگریزی اصطلاح میں مرکن تھا۔

الغرض کتاب تاریخ الفحشا، اسی قسم کے ہزاروں واقعات سے لبریز ہے اور فحاشی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر تاریخی، علمی، نفسیاتی بحث نہ کی گئی ہو۔ اس لئے جنوری ۱۹۳۳ء کے نگار کا جو کم از کم دس جزو دیر شائع ہوگا انتظار کیجئے۔

ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کتاب آج کل کی ان کتابوں کی طرح عریاں و مخرب اخلاق نہیں ہے جو عام طور سے بازار میں نظر آتی ہیں اور جو صرف نام بدل کر کوک شاستر کو پیش کرتی ہیں۔ یہ کتاب ایک نادر مجموعہ ہے تاریخی تحقیق کا نفسیاتی نظریوں کا اور بے مثل جنسی معلومات کا

تاجدار رقاصہ

(تاریخ کا ایک پوشیدہ ورق)

آج قصر فرعون دلھن کی طرح سجا ہوا ہے۔ جوق در جوق تماشائی ہر چار طرف سے کھنچ کھنچ کر چلے آ رہے ہیں فوج کے مسلح سپاہی باقاعدہ دروازوں پر کھڑے ہوئے نگرانی کر رہے ہیں۔ موسیقی کی آوازیں مختلف خوشبوؤں کے ساتھ لپٹی ہوئی اندر سے آ آ کر باہر تماشائیوں کے کانوں تک پہونچ رہی ہیں۔ جب کوئی کاہن یا سردار اندر داخل ہوتا ہے تو لوگوں کی صفیں پھٹ جاتی ہیں اور ان پر ہر طرف سے پھول برسائے جاتے ہیں آج فرعون نے جشن طرب برپا کیا ہے اور اپنے ملک کے تمام اکابر کو دعوت شرکت دی ہے

فرعون امنحوتب چارم اپنے طلائی جڑاؤ تخت پر پوری شان فرعونیت کے ساتھ جلوہ گر ہے، چاروں طرف امرا رحلقہ کئے ہوئے ہیں، رامشگر رقص و سرود میں مصروف ہیں۔ اور ہر طرف "فرعون زندہ باد" کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔

فرعون کے پہلو میں اس کی ماں ملکہ تیی بیٹھی ہوئی ہے جو امنحوتب ثالث کی بیوی تھی۔ امنحوتب ثالث، فراعنہ مصر میں نہایت ہی بہادر و قوی فرعون گزرا ہے۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی تیر ایسا نہیں چلایا جو نشانہ پر جا کر بھرپور نہ بیٹھا ہو۔ میدان جنگ میں اس کی شجاعت بجلی کا سا کام کرتی تھی اور جب شکار کو جاتا تھا تو صحرا کا صحرا درندوں سے خالی ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس نے دس سال کے عرصہ میں علاوہ اور بہت سے درندوں کے ایک سو بارہ شیر اپنی تلوار سے ہلاک کئے

اس کا بیٹا امنحوتب چارم بھی اپنے باپ کی طرح فتح ممالک کا شائق تھا لیکن اس کا طریق کار جدا تھا اس کے اسلحہ کچھ اور تھے۔ اس کا باپ تو تیر و تبر، تیغ و خنجر، نیزہ و کمان سے کام لیکر دشمنوں کو مغلوب کرتا تھا لیکن اس نے نئے دین اور نئے عقائد کا اجرا کر کے لوگوں کی روح کو مفتوح کرنا چاہا۔ اس نے کاہنوں کے اقتدار اور خدائے آمون کے پرانے معابدوں کو مٹا کر نئے ہیکلوں کی بنیاد ڈالی اور اسی وقت سے اس کا نام اخناتون ہو گیا۔

لیکن اس وقت جو جشن اس نے ترتیب دیا اس کا تعلق کسی مذہبی رسم سے نہ تھا بلکہ فرمانروائے سوریا و شرقیہ کے ایلچی کی پذیرائی کے لئے تھا۔

امنحوتب کی ماں ملکہ تیی نے ارادہ کیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لئے اپنی ہی یا غیر بادشاہوں میں سے کسی

بادشاہ کی بیٹی کو تلاش کرے اور چونکہ شاہ سوریا کی بیٹی حسن وجمال کے لحاظ سے اس وقت آشوب زمانہ بنی ہوئی تھی اس لئے اُس نے وہیں پیام دیا اور اس وقت وہیں کا ایلچی ہدایا وغیرہ لیکر آیا تھا تاکہ رسم نسبت ادا کی جائے اور شاہ سوریا کی بیٹی تادو' اخناتون کے رشتۂ ازدواج میں آکر ملکۂ مصر بنے۔

شاہ سوریا کے ایلچی نے اپنے بادشاہ کا مکتوب پیش کیا اور وہ ہدایا سامنے گزرانے جو اخناتون کے لئے بھیجے گئے تھے۔۔ اخناتون نے ان کو نہایت مسرت کے ساتھ قبول کیا اور افسر تشریفات کو حکم دیا کہ جلسۂ رقص شروع کیا جائے۔

اس حکم کے ملتے ہی مصر کی بہترین رقص کرنے والی لڑکیاں جو اپنے حسن وجمال اور فن دلربائی کے لحاظ سے نظیر نہ رکھتی تھیں دس دس کی جماعت میں سامنے آئیں اور اپنی سحر کاریوں سے ہر ہر شخص کو مبہوت بنانا شروع کیا۔

جب ان سب کا رقص ختم ہوگیا تو معلوم ہوا کہ ایک رقاصہ باقی رہ گئی ہے جو تنہا بغیر کسی کی معیت کے اپنے فن کی نمائش کرنا چاہتی ہے۔ فرعون نے حکم دیا کہ حاضر کی جائے۔

وہ اندر داخل ہوئی اور اس ادا سے گویا کہ وہ وادی نیل کی سب سے زیادہ لچکدار ناگن تھی۔ اُس نے ناچنا شروع کیا مگر اس انداز سے گویا کہ وہ اپنی ہر ہر حرکت رقصیہ سے کائنات کو الٹ دینا چاہتی ہے اس کی آواز میں' اس کی آنکھوں میں' اس کے جسم کی ہر ہر جنبش میں' ایک ایسا ملکوتی سحر پنہاں تھا کہ لوگ یہ محسوس کر رہے تھے کہ شاید وہ کسی اور دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رقص ختم ہوا تو اخناتون نے ایک عالم مسرت میں حکم دیا کہ اس کو سامنے لایا جائے۔ وہ ڈری کہ کہیں اس کے رقص کا الٹا اثر تو نہیں ہوا کیونکہ فراعنہ کی بہت سی داستانیں وہ سن چکی تھی اور متعدد مثالیں اس کے سامنے ایسی تھیں کہ سب سے زیادہ خونریزیاں انھوں نے اسی وقت کیں جب ان کے چہروں پر تبسم دوڑ رہا تھا اور آنکھوں سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ وہ سامنے گئی لیکن اس طرح ڈرتی ہوئی' کانپتی ہوئی گویا کہ وہ شاخ بید تھی جس سے باد صرصر گزر جائے۔

اخناتون نے کہا۔ "اور قریب آ" اس کو یقین ہوگیا کہ آج خیر نہیں۔ وہ آگے بڑھی لیکن بالکل اس طرح جیسے کوئی جسم بیجان کو پکڑ کر آگے بڑھا دے ـــــ اخناتون نے کہا "اور قریب آ" وہ اور آگے بڑھی' یہاں تک کہ فرعون کے چہرہ سے اس کے چہرہ کا فصل ایک بالشت سے زیادہ نہ تھا۔

فرعون نے پوچھا۔ "میں نے تجھے اس سے قبل قصر کے ارباب نشاط میں نہیں دیکھا۔ تو ابھی آئی ہے۔"
رقاصہ ـــــ "اے مالک مجھے یہاں آئے ہوئے کئی مہینے ہوگئے۔"

فرعون - "کیا رقص تجھے بہت محبوب ہے"
رقاصہ - " اے آقا، جنون کی حد تک"
فرعون - "کیا تو شرفاء مصر کے کسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے"
رقاصہ - "ہاں، اے آقا"
فرعون - "تیرا نام کیا ہے"
رقاصہ - "نفرتیتی"
فرعون - کس قدر پیارا نام ہے۔ نفرتیتی!"

دربار میں سکوت کامل طاری تھا کہ فرعون اٹھا اس نے رقاصہ کے دونوں گالوں پر ہاتھ رکھے اور اس کو اپنے سے اور زیادہ قریب کھینچکر آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا، ---- "اے نفرتیتی تیرے اس خوبصورت سر پر مصر کا تاج کس قدر بھلا معلوم ہوگا"

یہ سنتے ہی رقاصہ کے آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری ہوگئے اور فرعون نے اس کے بالوں کی لٹوں کو چھوتے ہوئے کہا ---- "اے نفرتیتی، تیرے اس خوبصورت سر پر مصر کا تاج کس قدر بھلا معلوم ہوگا"

ملکہ تیی یہ حالات معلوم کرکے بہت فکرمند ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے کو تنہائی میں بلاکر سمجھایا کہ اس طرز عمل سے شاہ سوریا کو سخت تکلیف پہونچے گی اور نقض عہد مناسب نہیں، کاہنوں نے کہا کہ اگر نفرتیتی سے شادی کا ارادہ کیا تو ملک پر بڑی بڑی مصیبتیں نازل ہونگی۔ کاہنوں کے سردار نے کہا کہ وہ رسم نکاح کو ادا نہ کرے گا۔ لیکن ان سب کا جواب اخناتون کے پاس صرف یہی تھا کہ "نفرتیتی کے خوبصورت سر پر مصر کا تاج کتنا بھلا معلوم ہوگا"

ایک مہینہ کے بعد سرزمین مصر نے ایک اور منظر جشن طرب کا دیکھا۔ جلوس راستہ سے گزر رہا ہے۔ فوجی دستے، مسلح سوار چاروں طرف حفاظت پر مامور ہیں، اور شاہ سوریا کی بیٹی زرین رتھ پر سوار قصر فرعون کی طرف جارہی ہے۔

اخناتون نے پورے شاہانہ اہتمام کے ساتھ اپنی بیوی کا خیر مقدم کیا، لیکن اس کی صورت دیکھنے سے انکار کردیا۔ ہفتوں پر ہفتے گزر گئے، لیکن اخناتون کسی طرح اس پر راضی نہ ہوا کہ وہ شاہ سوریا کی بیٹی سے خلوت میں ملے۔ آخرکار ملکہ تیی نے مجبور ہوکر اُسے شاہ سوریا کے پاس اس پیغام کے ساتھ

واپس کردیا کہ فرعون بیمار ہے اور اس کی بیماری تعلق ازدواج کے منافی ہے۔
ٹھیک اس وقت جبکہ تادور اپنے باپ کے سامنے سوریا میں اپنی تمام داستان درد دہرا رہی تھی مصر میں ہنگامۂ جشن برپا تھا اور نفرتیتی مصر کا تاج زیب سر کئے ہوئے اخناتون کے پہلو میں حکمرانی کر رہی تھی

امنوتب جس نے انقلاب دینی کے بعد اپنا نام اخناتون رکھ لیا تھا۔ ۲۸ سال کی عمر تک زندہ رہا اور نفرتیتی سے سات لڑکیاں پیدا ہوئیں، جن میں سے دوسری لڑکی ایک سردار سے بیاہی گئی جس کا نام توتو تھا اور جو بعد کو توت عنخ آمون کے نام سے مشہور ہوا۔
یہی وہ فرعون تھا جس کا مقبرہ چند سال ہوئے دریافت ہوا اور عرصہ تک اخبارات میں موضوع بحث بنا رہا ——

آیندہ جنوری ۳۳ء کا نگار

ہرچند بہت زیادہ تعداد میں چھپ رہا ہے لیکن اگر آپ نے اس کی خریداری میں کچھ بھی دیر کی تو پھر اس کا ملنا محال ہے۔اس لئے اگر آپ قدیم خریدار ہیں تو سالانہ چندہ پیشگی فوراً بھیجدیجئے اور اگر جدید خریداری منظور ہے تو ابھی سے نام درج رجسٹر کرائیے

"مینجر نگار لکھنؤ"

ایک دشمن محبت سلطنت

اخلاق انسانی میں سب سے زیادہ بلند چیز رشتۂ محبت سمجھا جاتا ہے اور اسی کو انسانیت کا مدار قرار دیا جاتا ہے، لیکن اس وقت دنیا میں ایک ایسی سلطنت و حکومت بھی ہے، جو اس جذبہ کی سخت دشمن ہے اور اس کو بیخ و بن سے فنا کر دینا چاہتی ہے۔ وہ سلطنت روس کی ہے، وہ حکومت بالشیوک ہے۔

مغرب میں اس سے قبل بھی اور اب بھی یہ رواج پایا جاتا ہے کہ جب کوئی مرد شادی کرنا چاہتا ہے تو پہلے وہ اس عورت سے ملنے کی تدبیریں سوچتا ہے۔ جس کی طرف اس کو میلان ہے، پھر رفتہ رفتہ اس سے مراسم بڑھاتا ہے، اس کے ذوق کا مطالعہ کرتا ہے اور مہینوں برسوں میں جا کر کہیں وہ منزل آتی ہے جب وہ کسی خنک شب ماہ میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی التجائے محبت پیش کرتا ہے۔

لیکن بالشیوک روس جو دنیا سے سعی و عمل میں اب صرف میکانکی انسان پیدا کرنے پر تلا ہوا ہے، ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کے لئے طیار نہیں اور وہ کہتا ہے کہ شادی سے قبل ان تمام تمہیدات میں زندگی کے قیمتی لمحات کھو دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

دیگر ممالک یورپ میں علاوہ جذبۂ محبت کی تسکین کے ایک مقصود شادی کا یہ بھی ہوتا ہے کہ مرد اہلی زندگی کے اُس سکون کو بھی حاصل کر سکے جسے صرف عورت ہی کی محبت بھری ذات مہیا کر سکتی ہے، یعنی وہ تربیت اولاد اور انتظام خانہ داری میں عورت کو شریک بنا کر اپنی معیشت و معاشرت کی راہوں میں بھی آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے، لیکن بالشیوک روس کہتا ہے کہ کہاں کی اہلی زندگی اور کیسی معاشرتی آسانی۔ انسان ہر وقت کام کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور اس میں مرد و عورت کی کوئی تفریق نہیں۔

روس کا مرد جب کسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے تو بغیر کسی تمہید کے نہایت صاف اور کھلے الفاظ میں اس سے کہتا ہے:-

"میں جوتا بنانے کے کارخانہ نمبر ۴۲ میں کام کرتا ہوں اور مجھے معلوم
ہوا ہے کہ تم بھی سلائی کے کارخانہ نمبر ۱۰ میں کام کرتی ہو اور مجموعی
طور پر ہم دونوں کی ہفتہ وار اجرت دو اشرفی ہوتی ہے، اس لئے
بتاؤ کہ شادی کرو گی یا نہیں۔"

وہ عورت یہ سنکر بغیر اس کے کہ اس کے چہرہ پر شرم وحجاب کی سرخی نظر آئے جواب دیتی ہے :۔
"کیا تمھارے پاس کوئی مکان یا کمرہ ایسا ہے جس میں ہم دونوں رہ سکیں"
وہ کہتا ہے ـــــ "نہیں، لیکن تمھارے پاس تو ہے اور اسی میں ہم دونوں بسر کر سکتے ہیں"
اس کے بعد ہی وہ دونوں "محکمۂ ازدواج" کے دفتر میں چلے جاتے ہیں ۔ یہاں دونوں کا وزن کیا جاتا ہے طبی معائنہ ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک کاغذ پر دستخط کر دیتے ہیں جو گویا اقرار نامہ ہے اس امر کا کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور چلے جاتے ہیں ۔ نہ جہیز ہے نہ مہر، نہ اقرار وفاداری ہے نہ خطبۂ نہ کوئی پادری ہوتا ہے نہ کلیسہ ۔

یوروپ کے دوسرے ممالک میں بھی فریقین کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے لیکن صرف اس لئے کہ امراض متعدیہ نہ پھیلیں ۔ مگر روس میں طبی معائنہ صرف اس اصول وغائت کے ساتھ ہوتا ہے کہ بچے مضبوط، قوی اور صحیح الاعضا پیدا ہوں ۔

روس کے جوانوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ محبت ایک جذبۂ مجہول ہے، ایک کیفیت ناکارہ ہے، اس سے مغلوب ہو جانا انسانیت کی توہین اور اس کے لئے سرگرداں رہنا وقت کا ضائع کرنا ہے ۔ بیوی بنانے کے لئے اس جذبہ سے کام لینے کی مطلق ضرورت نہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ اس سے اولاد صحیح و توانا پیدا ہو سکتی ہے یا نہیں ۔ بالشیوک حکومت نکاح کو ضروری قرار دیتی ہے لیکن اس کا کہنا یہ ہے کہ نکاح صرف نکاح کے لئے ہونا چاہئے، نسل بڑھانے کی غرض سے ہونا چاہئے نہ کہ لذت محبت کے لئے ۔

اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جو خدمات دیگر ممالک یوروپ میں عورت سے متعلق ہیں ان سے روسی عورت کو کوئی علاقہ نہیں ۔ ہر جگہ عام طور پر ایک بیوی کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ شوہر کے راحت وآرام کا خیال رکھے اس کے لئے کھانا پکائے، کپڑے درست رکھے گھر کا انتظام کرے ۔ لیکن روس کی بیوی ان تمام فرائض سے آزاد ہے ۔ کیونکہ جس طرح مرد گھر سے باہر نکل کر کام کرنے پر مجبور ہے، اسی طرح عورت بھی ہے اور خانگی انتظام کی صورت صرف یہ ہوتی ہے کہ مرد وعورت میں سے جو کوئی سب سے پہلے بیدار ہو وہ جلدی جلدی کام ختم کرے ۔

پھر جس طرح وہاں شادی کر لینا معمولی وآسان بات ہے، اسی طرح طلاق دینا بھی دشوار نہیں، جب میاں بیوی میں کوئی ایک یا دونوں جدائی چاہتے ہیں تو محکمۂ متعلقہ میں جاکر اس کی اطلاع کر دیتے ہیں ۔ اور اگر کوئی اولاد ہوتی ہے تو حکومت کے سپرد کر دیجاتی ہے جو ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ دار ہے ۔

وہاں فوج کے سپاہیوں کو جہاں اور عسکری تعلیم دیجاتی ہے، وہیں یہ بھی ذہن نشین کرا دیا جاتا ہے کہ

محبت سے زیادہ بُری چیز کوئی نہیں، پھر یہ کوشش اسی جگہ ختم نہیں ہوجاتی بلکہ تمام اطراف وجوانب میں مُبلغ روانہ کئے جاتے ہیں جن کا فرض صرف یہی ہوتا ہے کہ محبت کے خلاف پروپاگنڈا کریں۔

محبت کے خلاف اپنی نفرت کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ محبت کی گزشتہ تاریخ نہایت خطرناک ہے، اسی کے وجہ سے انسان مصائب میں مبتلا ہوتا ہے، یہی جذبہ سلطنتوں اور حکومتوں کی تباہی کا باعث ہوتا ہے اور بہت سے جرائم کی بنیاد بھی یہی ہے۔

جنوری ۱۹۳۳ء کا نگار

مخصوص ہوگا صرف حضرت نیاز کے **ملاحظات** کے لئے۔ یعنی پورے دس جزو میں ایک ایسا بیش بہا لٹریچر آپ کے پاس جمع ہو جائے گا کہ شاید ہی تنقیدی وادبی حیثیت سے کوئی دوسری نظیر اس کی مل سکے۔

اس لئے

امید ہے کہ ناظرین **نگار**، اپنے حلقۂ احباب میں اس کی توسیع واشاعت کا فرض انجام دیں گے اور جلد از جلد دفتر کو مطلع کریں گے کہ ان کی طرف سے کن کن حضرات کے نام وی پی روانہ کیا جائے۔

چندہ منی آرڈر کے ذریعہ سے بھیجنے میں آپ کو چار آنے کی بچت ہے کیونکہ وی پی پر دیکر آپ کو وصول کرنا پڑے گا۔

مینیجر نگار لکھنؤ

سرعت سیر کا مستقبل

اور

دوسرے کُروں تک انسانی پرواز

حیوان وانسان کے درمیان

پروفیسر اینڈ روز مشہور امریکن سیاح کا بیان ہے کہ وہ صحرائے گوبی میں اپنی موٹر پر جا رہا تھا کہ دفعتہً ایک ہرن جنگل سے نمودار ہوا اور موٹر کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ موٹر کی رفتار اس وقت ۵۰ میل فی گھنٹہ تھی، لیکن تھوڑی دیر میں ہرن موٹر سے آگے نکل گیا اور رفتہ رفتہ نگاہوں سے غائب ہوگیا۔ کیونکہ ہرن ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔

خرگوش کی رفتار کا اندازہ ۳۵ میل کیا گیا ہے اور شکاری کتے ۴۰ میل کی رفتار سے دوڑتے ہیں لومڑی اس سے بھی زیادہ تیز دوڑتی ہے اور بعض شکاریوں کا بیان ہے کہ چھوٹا ہرن ۵۰ میل کی رفتار سے بھاگتا ہے۔

چڑیوں کی پرواز ان سے زیادہ تیز ہے۔ چنانچہ حال ہی میں امریکہ کے ایک کبوتر نے ۳۰۰ میل کا سفر ۷۱ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طے کیا۔ یوروپ میں ایک خاص قسم کا گِدھ ہوتا ہے اس کے متعلق ایک ہوائی جہاز راں کا بیان ہے کہ ایک بار وہ اپنے جہاز پر جا رہا تھا کہ یہ گدھ مل گیا اور دونوں میں مقابلہ شروع ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گدھ ۱۱۰ میل کی رفتار سے اڑنے لگا اور جہاز سے آگے بڑھ گیا۔

ایک بار ایک ابابیل کو اس کے گھونسلہ سے نکال کر کسی دوسرے مقام پر جو ۱۴۸ میل دور تھا لے گئے اور چھوڑ دیا گیا: یہ ایک گھنٹہ ۸ منٹ میں پھر اپنے گھونسلہ میں داخل ہوگئی یعنی اُس نے ۱۳۴ میل کی رفتار سے اپنا سفر طے کیا۔

اب ان چوپایوں اور چڑیوں کے مقابلہ میں انسان کے عضلات کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بہت ضعیف ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ تیز چلنے والا فنلینڈ کا ایک شخص ہے جو ۱۴ میل فی گھنٹہ کے حساب سے چل سکتا تھا، البتہ اگر انسان اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو تو ۱۲ میل فی گھنٹہ طے کر سکتا ہے اور گھوڑے پر ۴۰ میل۔ پانی کے اندر وہ ڈھائی میل سے زیادہ نہیں جا سکتا، درانحالیکہ بڑی سی بڑی مچھلی دس میل جاتی ہے۔ البتہ اگر برف پر انسان پھسلے تو ۲۰ میل کی رفتار سے جا سکتا ہے۔ لیکن بااینہمہ وہ اپنی دماغی ترقی سے ایسے میکانکی

ذرائع ضرور پیدا کر لیتا ہے جو اس کے عضلات کی کمزوری کی پوری تلافی کرنے والے ہیں۔ چنانچہ سیگریو کا ۲۳۱ میل کی رفتار سے ساحل فلوریڈا پر موٹر چلانا، پھر کپتان کیمپل کا اس رفتار کو ۲۴۳ میل تک بڑھا دینا اسی طرح ہوائی جہاز کو اسٹنفورٹ کا ۴۱۵ میل کی رفتار سے لے جانا، یہ سب ایسی شہادتیں ہیں جن کو دیکھکر انسانی سرعت رفتار کے مستقبل کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے

تاریخ سرعت

اس میں شک نہیں کہ انسان کی یہ سرعت رفتار نہایت تدریج کے ساتھ اور کافی مدت میں ہوئی ہے۔ انجن سے پہلے صرف معدنوں کے اندر سے پانی کھینچنے کا کام لیا جاتا تھا اور کامل ایک صدی کے بعد خیال اس طرف منتقل ہوا کہ اگر انجن کسی گاڑی میں لگا دیا جائے تو اس کی رفتار بڑھ سکتی ہے۔ اول اول لوہے کی پٹری پر گھوڑوں کے ذریعہ سے گاڑیاں کھینچی جاتی تھیں، اور جب کامل دو صدیاں گزر گئیں تو انجن لگانے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلی گاڑی جو دخانی انجن سے چلائی گئی وہ ۱۸۰۴ء میں بمقام ویلز چلائی گئی جس کی رفتار ۵ میل فی گھنٹہ تھی۔ ۵ سال تک اس میں کوئی ترقی نہیں ہوئی حتی کہ ایک کمپنی قائم ہوئی اور اس مسئلہ پر غور کیا گیا۔

بات یہ ہے کہ اول اول لوگ سرعت رفتار کے خیال سے ڈرتے تھے، چنانچہ اُس وقت کے ایک اخبار نے لکھا ہے کہ "معمولی گاڑیوں کی رفتار سے دو چند رفتار کی برداشت محال ہے اور اگر تیزی کا ایسا ہی شوق ہے تو ہوائی میں بیٹھ کر کیوں نہ سفر کیا جائے"۔ اسی خوف کا نتیجہ تھا کہ پارلیمنٹ نے نہایت مشکل سے لورپول اور منچسٹر کے درمیان ریل کی پٹری بچھانے کی اجازت دی۔

ہر چند جارج اسٹونسن نے ایک دخانی گاڑی چلا کر تجربہ کرا دیا تھا، لیکن لوگوں کو اطمینان نہ تھا اور ایک شخص لارڈز نامی نے تو اپنی تقریر میں صاف صاف کہہ ہی دیا کہ دس میل سے زیادہ اگر گاڑیاں چلائی گئیں تو وہ وہیں ٹھیر کر رہ جائیں گی کیونکہ پہیے اس رفتار میں صرف اپنے محور ہی پر چکر کھا کھا کر رہجائیں گے اور آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ الغرض اسٹونسن کے اس خیال پر کہ ۲۰ میل کی رفتار سے کسی گاڑی کا چلنا ممکن ہے۔ لوگ اُسے پاگل ہی سمجھتے رہے۔ آخر کار اُس نے مجبوراً ۲۰ کا نام لینا ہی چھوڑ دیا اور صرف بارہ میل کہنے لگا۔ اسپر بھی ارکان پارلیمنٹ کو یقین نہ آتا تھا۔ آخر کار ہزاروں دقتوں کے ایک ریلوے کمپنی قائم ہوئی اور ایک انعام ۵۰۰ گنی کا اس مخترع کے لئے مقرر کیا گیا جو دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ۳۰ میل تک گاڑی کو لے جا سکے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۲۹ء میں دس ہزار آدمیوں کے مجمع میں پانچ اشخاص نے اپنی اپنی ریل گاڑیاں پیش کیں اُنھیں میں سے ایک اسٹونسن بھی تھا۔

اسٹونسن کے انجن کا نام راکٹ یعنی ہوائی تھا جس میں کئی گاڑیاں لدی ہوئی لگا دی گئی تھیں

آخرکار مقابلہ ہوا اور اس کے انجن نے ۱۵ میل کی رفتار سے راستہ طے کیا۔ اس کے بعد اسٹونسن نے انجن علیحدہ کرکے اس کی رفتار کا تجربہ کرایا۔ چنانچہ پہلے وہ دس میل کے رفتار سے لے گیا۔ پھر پندرہ میل کی رفتار سے حتیٰ کہ ۳۵ میل تک رفتار بڑھ گئی۔

لوگ حیران تھے کہ یہ کیا طلسم ہے اور کیونکر اتنی تیز رفتار کو لوہے کی پٹریاں اور پہیے برداشت کرسکتے ہیں، مگر چونکہ یہ ایک واقعہ تھا جو ان کی نگاہوں سے گزر رہا تھا اس لیے اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی اور سب خاموش تھے۔ امریکہ میں بھی تقریباً اسی تدریج کے ساتھ ریل کی ترقی ہوئی۔

موٹر اور ہوائی جہاز

اس کے بعد وہ دور آیا جب انجن کی تیزی رفتار کی طرف خاص توجہ کی گئی اور رفتہ رفتہ اتنی ترقی ہوئی کہ ۱۹۰۱ء میں ایک خط مستقیم پر پورے ۱۲۰ میل کا راستہ ایک گھنٹہ میں طے کیا گیا۔

موٹر کی ایجاد کے وقت اس قسم کی دشواریاں پیش نہیں آئیں اور ہنری فورڈ نے ۱۹۰۱ء میں اپنا سب سے پہلا موٹر پیش کیا جس کی رفتار ۴۵ میل تھی۔ اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں فورڈ نے اعلان کیا کہ اس کا جدید موٹر ۹۰ میل کی رفتار سے جا سکتا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ساری دنیا اس طرف متوجہ ہوگئی اور تمام کارخانوں نے کوشش کی کہ اس مسابقت میں بازی لے جائیں، چنانچہ ۱۹۱۰ء میں یہ رفتار ۱۷۰ میل تک ہوئی، ۱۹۲۰ء میں ۱۵۶ میل، ۱۹۲۶ء میں ۱۷۰ میل، ۱۹۲۷ء میں سیگریو ۲۰۰ میل کی رفتار سے گیا، ۱۹۲۸ء میں ایک اور شخص ۲۰۸ میل لے گیا۔ ۱۹۲۹ء میں پھر سیگریو نے مقابلہ کیا اور ۲۳۱ میل کی رفتار سے اپنے موٹر کو لے گیا۔ لیکن ابھی تیزی کی انتہا نہ ہوئی تھی کیونکہ اس کے بعد ایک اور شخص کیمبل نامی رونما ہوا اور ۲۴۳ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنے موٹر کو لے گیا۔

پھر انسان نے سرعت سیر میں صرف وحوش ہی کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ طیور کے سامنے بھی آیا اور ان کو بھی بڑی حد تک شکست دی۔

سب سے پہلے ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو اورویل رٹ ایک ایسے طیارہ میں بیٹھکر اُڑا جو ہوا سے زیادہ بھاری تھا اور اس نے ۶ میل فی گھنٹہ کے حساب سے راستہ طے کیا۔ لیکن ۱۹۰۵ء میں یہی شخص ۳۶ میل کی رفتار سے اڑا اور ۱۹۰۸ء میں ۴۴ میل کے حساب سے۔ اس کے بعد ۱۹۰۹ء میں امریکہ کے ایک شخص نے ۴۷ میل کے حساب سے پرواز کی، ۱۹۱۲ء میں یہ رفتار ۱۱۲ میل تک پہونچ گئی اور گزشتہ جنگ کے بعد ۱۷۰ میل تک۔

مائی طیاروں (پانی پر دوڑنے والے طیارے) میں بہت زیادہ ترقی ہوئی اور ۱۹۱۳ء سے لیکر

۱۹۳۱ء تک ان کی رفتار ۵۰ میل سے ۴۱۵ میل تک پہونچ گئی -

مستقبل اب سوال یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنی سرعت سیر میں انتہائی ترقی کرلی ہے اور اب اس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا؟ - تاہم کا بیان ہے کہ تجارتی ہوائی جہازوں کا ۳۰۰ میل فی گھنٹہ کے حساب سے سفر طے کرنا مستقبل قریب میں ہر شخص دیکھ لیگا - پروفیسر لو کا خیال ہے کہ مستقبل میں یہ سرعت ۵۰۰ میل تک بڑھ جائے گی - بالگریو یقین کرتا ہے کہ دس سال میں یہ سرعت ۷۰۰ میل تک پہونچ جائے گی اور مسٹر ملینڈ کہتے ہیں کہ ۱۹۵۰ء تک اس رفتار کا ایک ہزار میل فی گھنٹہ تک پہونچ جانا یقینی ہے - گویا اس کے معنے یہ ہیں کہ جب سرعت سیر اس حد تک پہونچ جائے گی تو وہ دور طیاروں کا نہ ہوگا - بلکہ ہوائیوں کا ہوگا

اس سلسلہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا انسان اس سرعت سیر کو برداشت کرسکتا ہے یا نہیں؟ پروفیسر اڈنگٹن کا بیان ہے کہ انسان فی الحال زمین کے ساتھ ساتھ بحساب ۲۰ میل فی سکنڈ آفتاب کے گرد گردش کر رہا ہے اور اگر اُس سلسلۂ کہکشاں کو دیکھا جائے جس میں ہمارا نظام شمسی شامل ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ ۲۵ میل فی سکنڈ کے حساب سے چکر کھا رہا ہے - اس لئے یہ سوال فضول ہے کہ انسان سرعت سیر کو برداشت کرسکتا ہے یا نہیں -

البتہ یہ ضرور ہے کہ بہت بلند فضا میں درجۂ حرارت صفر سے نیچے ہے اور وہاں کی ہوا بھی نہایت لطیف ہے جو انسان کی زندگی کو قائم نہیں رکھ سکتی، سو اس کا انتظام نہایت آسان ہے، اور ایسے بند کمرے ہوائی جہازوں میں بن سکتے ہیں جہاں درجۂ حرارت اور کثافت ہوا دونوں انسان کے بقائے حیات کے لئے قائم رہ سکیں -

الغرض سرعت سیر کی حرص جو انسان میں پیدا ہوئی ہے وہ اب کسی طرح مٹ نہیں سکتی اور وہ زمانہ آنے والا ہے جب انسان کی سرعتِ سیر کشش زمین پر غالب آجائے گی اور وہ کرۂ ارض سے دوسرے کروں تک پرواز کرکے جا سکے گا -

مثنوی لالہ رُخ

طامس مور کی معرکتہ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت معہ محصول عہ

مینیجر نگار لکھنؤ

[redacted]

باب الاستفسار

(علی اختر اور جوش کی شاعری)

(جناب ابوتراب محمد احمد صاحب (عثمانیہ) حیدرآباد دکن)

براہ کرم جوش اور علی اختر کی شاعری کے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرماکر ممنون کیجئے اور یہ تعین کیجئے کہ ان دونوں کی شاعری میں کیا فرق ہے۔

(نگار) اس بار حیدرآباد آنے کے ایک ہفتہ بعد ہی یہ استفسار مجھ تک پہونچ گیا تھا، لیکن میں اس کے جواب کی طرف متوجہ نہ ہوسکا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ میرے پاس ان دونوں حضرات کے کلام کا کوئی مجموعہ موجود نہیں اور دفتر سے دور ہونے کے باعث میں نگار کے گزشتہ پرچوں سے بھی استفادہ نہ کرسکتا تھا۔ یہی عذر اب بھی موجود ہے لیکن چونکہ مستفسر کا تقاضہ شدید ہے اس لئے بغیر کسی تفصیل کو سامنے رکھے ہوئے مجملاً اپنی رائے پیش کئے دیتا ہوں۔

قبل اس کے کہ میں ان دونوں کی شاعری پر مقابلتاً اظہار خیال کروں یہ متعین کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کی شاعری کا مقابلہ اصولاً صحیح بھی ہے یا نہیں یعنی یہ دونوں حضرات ایک ہی رنگ کے شاعر ہیں یا نہیں اور اُن کے مقصود شعری میں اتنا تفاوت تو نہیں ہے کہ مجھے زاویۂ نگاہ بالکل بدلنا پڑے۔

جوش کی شاعری با حیثیت شاعر اُن کے روشناس خلق ہونے کی تاریخ غالباً ۲۲ء سے شروع ہوتی ہے جب اول اول ان کی غزلیات، منظومات و منثورات کا باتصویر مجموعہ روح ادب کے نام سے شایع ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کتاب کا ذکر اب جوش صاحب کو بھی بھلا نہ معلوم ہو، لیکن میرے لئے اس کا بیان ناگزیر ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہوسکے کہ جوش کی شاعری نے تدریجاً کتنی ترقی کی۔

ہر چند جس وقت یہ مجموعہ شایع ہوا ہے، جوش صاحب اس وقت بچہ نہ تھے بلکہ دیوان شباب سے بھی گزر چکے تھے، لیکن اس مجموعہ میں بہت کچھ نشانیاں بچپن کی موجود تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ان کو بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف ٹیگور کو اس کی کتاب گیتان جلی پر نوبل پرائز مل چکا تھا اور ہندوستان میں اس کے طرز بیان پر ہر جگہ سر دھنا جا رہا تھا۔ دوسری طرف اقبال کی نظموں نے توا تصے ترکیب وحدت بیان کی طرف ذہین دماغوں کو متوجہ کر دیا تھا۔ ہر چند ٹیگور کی گیتان جلی اور اقبال کی نظموں میں لوگوں کو جو بات جدید و لذیذ معلوم ہو رہی تھی وہ حقیقتاً دنیا میں کوئی نئی چیز نہ تھی کوئی ابداع و اختراع نہ تھا بلکہ ایک پرتو تھا ادب متقدم کا اک نقش خام تھا سور داس و بیدل کے انداز بیان کا، لیکن چونکہ تعلیم جدید کا نصاب لوگوں کو اس کا موقعہ ہی نہیں دیتا کہ وہ اپنی اپنی کلاسکس کی طرف متوجہ ہوں، اس لئے ہندو، سور داس کی اہمیت سے ناواقف اور مسلمان بیدل کے مرتبہ سے بے خبر ہی باور کرنے لگا کہ ٹیگور و اقبال اپنے اپنے طرز ادا میں مخترع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہر حال میں اس کو بھی قدرت کی عنایت سمجھتا ہوں کہ جو لوگ خود متقدمین کے خیالات سے فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے ان کے لئے دو درمیانی کڑیاں ایسی پیدا کر دی گئیں ہیں جو حال کو سور داس و بیدل کے اس زمانہ سے ملا دینے والی تھیں جس کو بہ لحاظ رفعت خیال و بداعت تخیل بجائے ماضی کے ازل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

منجملہ ان بہت سے ذہین نوجوانوں کے جن کے سوئے ہوئے جذبات کو ٹیگور و اقبال نے بیدار کیا ایک جوش بھی تھے اور ہر چند جوش نثر نگاری کے لحاظ سے کسی قابل ذکر منزل تک نہ پہونچ سکے کیونکہ فطرت ان کے لئے اتنی فیاض ثابت نہ ہوئی کہ نظم و نثر دونوں کی اہلیت تامہ ان میں پیدا کر دیتی لیکن یہ واقعہ ہے کہ اقبال کی شاعری نے جوش کے جذبات شاعرانہ کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک چنگاری گھاس کے خشک ڈھیر کے ساتھ کر سکتی ہے۔

جوش نظرتاً نثر لکھنے کے لئے پیدا نہ ہوئے تھے اس پر روح ادب کے منثورات کا ہر فقرہ شاہد ہے کہ باوجود سعی و کاوش وہ ناقص تتبع بھی ٹیگور کا نہ کر سکے، جوش قدرتاً آرٹ کا صحیح درک نہ رکھتے تھے اس پر روح ادب کی وہ تصویریں گواہ ہیں جو ذوق صحیح کا خون کرنے کے لئے اس میں شامل کی گئی تھیں۔ لیکن جوش شاعر پیدا ہوئے تھے، اس کا ثبوت یقیناً روح ادب سے ملتا تھا اور اس کے ہر ہر شعر سے ملتا تھا۔

روح ادب میں غزلیں بھی تھیں اور نظمیں بھی، لیکن ان میں ہر چیز اپنی جگہ دل کو متوجہ کرنے والی تھی اور غزلگوئی و نظم نگاری کے پامال راستہ سے علحدہ ہٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہر چند جوش جوار لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ سے ان کا خاندان وابستۂ ملازمت بھی رہا، لیکن روح ادب میں ان کی شاعری بہت کم اس سخافت و رکاکت سے آلودہ نظر آتی ہے جو فرمانروایان

اودھ کے باشندوں

اودھ اور خصوصیت کے ساتھ "جان عالم پیا" کی عیش کوش و اخلاق کُش حکومت میں سرزمین اودھ کے باشندوں کا خمیر ہوگئی تھی۔

گو روح ادب میں اور نہ اس کی اشاعت کے بعد سے لیکر اس وقت تک کوئی غزل جوش کی ایسی نظر نہیں آئی جس کو صحیح معنے میں غزل کہا جا سکے لیکن میں اس کو فطرت کا بڑا معجزہ سمجھتا ہوں کہ لکھنوی ہونے کے باوجود جوش کے تغزل میں وہ سخافت و رکاکت نہیں پائی جاتی جو لکھنوی شاعری کا عنصر اصلی ہے۔ یقیناً جوش کی غزلوں میں وہ درد و تاثر نہیں پایا جاتا جو تغزل کی جان ہے' ان کا تغزل اس سوز' بروگ سے محروم ہے جو غزل کو زبان عشق و محبت بنا دیتا ہے' لیکن اُن کے یہاں وہ سرمہ مسی' وہ کنگھی چوٹی وہ نخرہ' وہ زنانہ پن بھی نہیں ہے جو لکھنوی غزلگوئی کی خصوصیت خاصہ ہے۔ جوش کی غزلوں میں تشبیہات و استعارات بھی ہیں' لیکن رنگ مستی لئے ہوئے مبالغہ و تصنع بھی ہے لیکن ایک خاص کیفیت جوش کے ساتھ اور یہی سبب ہے کہ اگر ان کی ادنیٰ سی ادنیٰ غزل لکھنوی معائب سے پاک ہے تو انکی بہتر سے بہتر غزل بھی ایک نظم کے حدود سے آگے نہیں بڑھتی جہاں اس کا مرتبہ یقیناً کافی بلند نظر آتا ہے۔

میں نے روح ادب کے مطالعہ کے بعد ہی یہ لگا دیا تھا کہ اگر جوش نے صرف غزلگوئی کو اپنا شعار قرار دیا تو ان کیلئے میدان زیادہ وسیع نہیں ہے اور اگر منظومات کی طرف توجہ کی تو انکا مستقبل یقیناً شاندار ہے چنانچہ فطرت نے انکی صحیح رہنمائی کی اور رفتہ رفتہ انکی غزلگوئی کم ہونے لگی۔ یہ تھا جوش کی شاعری کا ادلین دور جو روح ادب کے ساتھ پیدا ہوا اور اسی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اُن کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جس میں انھوں نے زیادہ تر محاکات کی شاعری کی اور مناظر کے ساتھ ساتھ جذبات محبت کی چاشنی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا؛ اور اس میں کلام نہیں کہ اس دور میں جوش نے جتنی نظمیں لکھیں وہ نہایت پاکیزہ تھیں لیکن افسوس ہے کہ اس رنگ کی انتہائی منزل تک پہونچنے سے قبل ہی وہ حیدرآباد آگئے جو ہندوستان میں سب سے بڑا مرکز نمائش جاہ و ثروت (Aristocracy) کا ہے جوش صاحب یا ان کا خاندان چونکہ خود بھی کسی زمانہ میں اعیان و اشراف اودھ میں شامل تھا اور امارت و دولت کی بو اُن کے دماغ میں ہنوز باقی تھی اس لئے حیدرآباد کے یہ مناظر تنعم و تعیش دیکھکر اُن کو بہت سے بھولے ہوئے خواب یاد آگئے' بہت سی خوابیدہ تمنائیں اُن کی بیدار ہوگئیں اور اُن کا وہ رنگ شاعری جو مایوسی کے بعد ترک تمنا کی حالت میں صرف قدرت و مناظر قدرت سے متعلق ہوگیا تھا متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

اگر جوش صاحب کی وہ تمنائیں جنکا یہاں آنے کے بعد نیا نیا حشر ہوا تھا پوری ہو جاتیں تو ان کی شاعری یقیناً ختم ہو جاتی۔ اور اگر ختم نہ ہوتی تو یقیناً وہ صرف اس سطح پر آ جاتی جسے شراب کی کیفیت نہیں بلکہ صرف

شراب کے بلبلوں سے تعلق ہوتا ہے، لیکن چونکہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور دنیا باندازۂ تمنا اُن پر وسیع نہ ہوسکی اس لئے ان میں جذبۂ انتقام پیدا ہوا اور دولت و سرمایہ داری کے خلاف انھوں نے لکھنا شروع کیا کاش کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں وہی انکا ایمان واعتقاد ہوتا، وہی ان کی روح کا پیغام ہوتا۔ لیکن ایک وہ کیا ہم سب کی یہی حالت ہے اور ایک قوم کے انتہائی دورِ انحطاط میں جو روباہ وشی پیدا ہو جاتی ہے اس سے نہ ہمارے یہاں کوئی مصنف خالی ہے نہ مولف، نہ شاعر بچا ہوا ہے نہ مغنی۔

یہ تو ایک عمومی تبصرہ ہوا ان کے مختلف ادوار شاعری کے متعلق اب رہا یہ امر کہ فن شعر کے لحاظ سے ان کا کیا مرتبہ ہے، اس کے متعلق بھی چند سطریں لکھنا ضروری ہیں۔ غزلوں کے متعلق میں پہلے ہی اپنا خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ ان میں والہانہ جوش، انداز مستی ضرور پائی جاتی ہے، مگر وہ سوز و تاثر جو تغزل کی جان ہے ان کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ اس لئے اُن کی غزلگوئی صرف حافظ کے حدود تک رہجاتی ہے اور وہاں سے گزر کر سعدی تک نہیں پہونچتی۔ اُن کی محاکاتی و منظری شاعری جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں بہت پاکیزہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ ان کی وہ نظمیں جو انگریزی خیالات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں نہایت ہی لطیف ہیں لیکن قبل اس کے کہ وہ اس رنگ میں ایک ذہن خلاق کے درجہ تک پہونچتے قومی و اشتراکی شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے اور ابھی اس میں پختگی پیدا نہ ہوئی تھی کہ رباعیات کی جانب انہماک پیدا ہوا جو یکسر خیام کی تقلید ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ قدرت نے جوش کو نابغہ پیدا کیا۔ اک ذہن خلاق کی تمام اہلیتیں ان میں ودیعت کر دیں، لیکن اس دل و دماغ کے ساتھ ہی ساتھ آنکھیں ایسی دیدیں جو صرف طلسم آب و رنگ سے لطف اٹھانے والی تھیں یہی سبب تھا کہ ہر منظر و ماحول کے ساتھ ان کی شاعری کا رنگ بدلتا رہا اور قبل اس کے کہ ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے نکلنے والی کوئی ایک صدا بلند ہو کر فضا میں پوری طرح گونجتی ان کے ذوق نظر نے اس کو دبا دیا اور دوسری کیفیت میں محو ہو کر رہ گئے۔

دنیا میں نابغہ دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جنکے تمام احساسات کا میلان ایک ہی مرکز کی طرف ہوتا ہے، ایک ہی آواز اُن کے منھ سے نکلتی ہے اور ایک ہی منزل کی طرف اُن کے قدم اُٹھتے ہیں یعنی ان کی روح کا ایک ہی پیغام ہوتا ہے، ان کے قلب کی ایک ہی صدا ہوتی ہے اور ان کا ساز ہستی تمام ہم آہنگیوں کے ساتھ ایک ہی نغمہ بلند کرتا ہے۔ دوسری قسم نابغہ کی وہ ہے جس کی قوت ادراک عام سطح سے تو بہت بلند ہوتی ہے، جس کے احساسات یوں تو نہایت لطیف و نازک ہوتے ہیں مگر اُن میں وزن کم ہوتا ہے اور تنوع زیادہ، ولولۂ انبساط زیادہ ہوتا ہے اور خواہش فکر و تامل کم، ان کے دلوں میں درد ہوتا ہے، ان کی روحیں غم آلود ہوتی ہیں مگر وہ چاہتے یہ ہیں کہ جب تک سطح آب و رنگ سے لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ اس درد و غم کو بھلا دیا جائے تو

بہتر ہے اور جس وقت تک ظاہری شیرینی لذت کام و دہن بنی ہوئی ہے، اندرونی تلخیوں سے جس قدر کم سروکار رکھا جائے مناسب ہے وہ تماشہ گاہ عالم میں اپنے غم سے ہلاک ہو کر پایۂ اعتبار و بیلش بننا نہیں چاہتے بلکہ اس مغموم ایکٹر کا سا پارٹ ادا کرنا چاہتے ہیں جو تھپیڑ کھانے کے بعد بھی ہنسنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس لئے اول الذکر نابغہ تو وہ ہے جو اپنے اندوہ احساس میں فنا ہو کر دنیا میں ایک پرستش گاہ اپنے بعد چھوڑ جاتا ہے اور موخر الذکر دنیا کی ظاہری حالت سے لطف اندوز ہونے کے لئے ان ہیکلوں کو بھی مٹا جاتا ہے۔ جنھیں وہ اپنے دل و دماغ میں اس پس و پیش کے ساتھ لئے پھرتا ہے کہ ان کو دنیا کے سامنے لاؤں یا نہ لاؤں۔

جوش اسی دوسری قسم کے نابغہ ہیں اور اگر قدرت نے ان کے حالات میں کوئی مستقل کیفیت ادھر یا اُدھر پیدا نہ کی تو مشکل ہے وہ کسی ایک رنگ پر قائم رہ سکتے ہیں، اور فطرت کی بہت سی ذہنی ودیعتوں کا یونہی رائگاں چلا جانا یقینی ہے۔ جوش اگر بادشاہ ہو کر اپنی ان تمام تمناؤں کو پورا نہیں کر سکتے جن کی حسرت میں انھوں نے اپنی جوانی گنوائی ہے اور جس کا انتقام وہ زمانہ سے صرف اسی طرح لے سکتے ہیں کہ اپنے آقا رنامدار واجد علی شاہ کی سنت دیرینہ کو پھر از سر نو زندہ کر دیں، تو ان کو مایوس ہو کر وہ زندگی اختیار کرنا چاہئے جو بظاہر بہت تلخ و ناگوار ہے، لیکن ان کی فطرت کی حقیقتوں کا راز اسی میں پنہاں ہے۔

وہ دولت و سرمایہ داری کی مخالفت اس لئے نہ کریں کہ وہ خود اس سے محروم ہیں، وہ درس آزادی اسلئے نہ دیں کہ جاہ و غرور سے انتقام لینے کی یہ بھی ایک صورت ہے، وہ صاحبان جبہ و عمامہ، ذاکران مجلس اور خانقاہ نشینوں کی برائی اس بنا پر نہ کریں کہ ان کی دنیاوی آسودگی پر انھیں رشک آتا ہے بلکہ وہ اپنے حال سے اپنے اخلاق سے، اپنی زندگی سے یہ ثابت کریں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اُن کے دل کی آواز ہے، ان کے روح کا پیام ہے اور ان کی فطرت کا تقاضہ ہے۔ ورنہ یوں آزادی کا درس دیتے ہوئے خود غلامی کی زندگی بسر کرنا صاحبان دولت وجاہ کی بُرائیاں کرتے ہوئے خود اُن کے سامنے دست سوال پھیلانا اور علمبرداران مذہب کے خلاف آتش بیانیاں دکھاتے ہوئے خود ایسے ہی اخلاق ذمیمہ میں مبتلا رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

بہر حال جوش اس میں شک نہیں کہ نابغہ ہیں لیکن دوسرے درجہ کے وہ فضائے شاعری کے اختر تابندہ ہیں مگر "قدر اول" کے نہیں — ان کی زبان میں حلاوت ہے، اُن کے الفاظ میں عذوبت ہے، اُن کی

ترکیبوں میں دلکشی وندرت ہے، اُن کی فکروجستجو میں ابداع و اختراع ہے، ان کے انداز بیان میں جوش وستی ہے، لیکن دردِ حقیقت سے خالی، دل کی تڑپ سے معرا، روح کے سوز سے ناآشنا اور پیام صداقت کی ہیبت وجلال سے محروم!

علی اختر صاحب کی شاعری کا علم مجھے جوش کے منصۂ شہود پر آنے سے تقریباً ۲ سال قبل اول اول غالباً ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا جب یادش بخیر مولانا ہوش کا ذخیرہ پوری آب وتاب کے ساتھ جاری تھا۔ اُن کی سب سے پہلی نظم جو میں نے دیکھی وہ "بہار کے آخری پھول" پر تھی۔ میں نے غور کیا کہ کہیں یہ انگریزی کی مشہور نظم (Last Rose of Summer) کا ترجمہ تو نہیں ہے، لیکن معلوم ہوا کہ اس سے بالکل علحدہ کوئی اور چیز ہے۔ ہرچند یہ وہ زمانہ تھا جب میں خود بھی تنقید کا اہل نہ تھا تاہم اس نظم کے پڑھنے کے بعد میں نے یہ اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ شاعری کے اسٹیج پر ایک اور ایکٹر حزن وملال کا پارٹ ادا کرنے کے لئے طیار ہو رہا ہے۔ اس کے بعد تیرہ سال کا طویل زمانہ گزر گیا اور میں بالکل بے خبر رہا کہ اختر کون ہیں اور ان کا رنگ شاعری کیا ہے۔ پھر ۱۹۲۹ء میں ان کی ایک نظم نگار میں شایع ہونے کے لئے مجھے موصول ہوئی اور یہ واقعہ ہے کہ میں اس نظم کو پڑھکر دیر تک سوچتا رہا کہ یہ کیسی آواز ہے، یہ شخص کون ہے جو اس صدا سے پکار رہا ہے۔ اس کے دل میں کیا ہے جو کہنا چاہتا ہے۔ معاً میرا خیال مجھے اسی "بہار کے آخری پھول" کی طرف لے گیا اور میں خوش ہوا کہ جو پیشین گوئی میں نے کی تھی وہ بڑی حد تک صحیح نکلی۔

اس کے بعد سے اس وقت تک برابر نگار میں جناب اختر کی نظمیں شایع ہو رہی ہیں اور اہل نظر سے مخفی نہ ہوگا کہ ان کی اور جوش کی شاعری میں کیا فرق ہے۔ میں اس فرق کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

پہلا فرق تو یہ ہے کہ جوش کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے اور اختر کی نظم سے، اختر کی سب سے پہلی نظم ۱۹۱۶ء میں پبلک کے سامنے آتی ہے اور اک مستقل کیفیت لئے ہوئے۔ جوش اس کے ۲ سال بعد روح ادب کے ذریعہ سے رونما ہوتے ہیں اور اس طرح کہ ان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہوتا ہے کہ آئندہ چلکر انھیں کیا بننا ہے۔ جوش کی شاعری کا اولین مظاہرہ رنگینی وستی کے ساتھ ہوتا ہے اور اختر کا حزن وملال کے ساتھ، جوش کی شاعری تغزل سے گزر کر مناظر ومحاکات پر آتی ہے اور پھر قومیاتی و اصلاحی رنگ اختیار کرکے ہزل دہجا کی صورت اختیار کر لیتی ہے، برخلاف اس کے اختر کی شاعری کا حزن وملال ترقی پاکر اک ایسا احساس درد بن جاتا ہے جس کا تعلق فرد سے نہیں بلکہ جماعت سے ہے۔ جوش نے بھی ملک وقوم کے

اسی دورِ انحطاط میں آنکھ کھولی جو اختر کے سامنے تھا، لیکن فرق یہ ہے کہ ایک نے اس سے بیخبر رہکر تیرو کی طرح نغمۂ شاعرانہ چھیڑا اور دوسرے نے موکیر کی طرح اپنے آپ کو اسی دردِ احساس کے لئے وقف کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ بعض بعض نظمیں جوش کی بھی ایسی ہیں جن سے ان کی فکر کی گہرائی تخئیل کی بلندی غیر معمولی طور پر ثابت ہوتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اخیر میں یا تو وہ بالکل "انفرادی" احساس کی چیز ہو کر رہگئی ہیں، یا شاعر کے خیال نے آہستہ آہستہ ایسی صورت اختیار کر لی ہے جیسے کوئی تھک کر سایہ میں آرام لینے لگے۔ برخلاف اس کے اختر کی تمام نظمیں فکر عمیق کا نتیجہ ہیں اور ان کی نظم کا ہر شعر ایک کے بعد دوسرا عمیق تر ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ خود بھی اس کے اندر گم ہو جاتے ہیں۔ جوش کی بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن کو انھوں نے اختر کے نقطۂ خیال سے شروع کیا ہے لیکن جوش تھوڑی دور تک گہرائی میں جانے کے بعد ہاتھ میں کچھ گل دریائیں لئے ہوئے باہر نکل آتے ہیں اور اسی کو معراج کمال سمجھتے ہیں، لیکن اختر کی غواصی برابر قائم رہتی ہے یہاں تک کہ کوئی موتی ان کے ہاتھ نہ آجائے۔

جوش بھی کبھی کبھی حیات انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن اس میں "انفرادی" حیثیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے، برخلاف اختر کے کہ ان کی نظر ہمیشہ اجتماعی پہلو پر جاتی ہے اور اس سے کوئی نظم خالی نہیں ہوتی۔

جوش کی قومی یا اصلاحی نظموں میں ایک خشونتِ انتقام ہے، لیکن اختر کی نظموں میں کیفیت التیام۔ ان کے پیام میں جرح وطعن ہے اور ان کے پیام میں لینت ورافت، ان کے یہاں عقدہ ہر ان کے یہاں محبت وہ تخریب چاہتے ہیں اور یہ تعمیر اور اس طرح جو اخلاقی فرق ان دونوں کی شاعری میں پیدا ہو گیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب مستقبل میں تعمیر قومیت و وطنیت کی تاریخ مرتب کیجائے گی تو اس میں اختر ہی کا نام زیادہ نمایاں و روشن نظر آئے گا۔

اب جوش کے درمیانی دور اور زمانہ حال دونوں کی نظموں کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اب جوش کی حالت اس طایر کی سی ہے جو اڑتے اڑتے تھک گیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت وہ تھر تھرا کر زمین پر آرہے، برخلاف اس کے اختر کا شہباز فکر یکساں طور پر بلندی کی طرف اڑتا چلا جا رہا ہے اور یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ یہ کہاں جا کر دم لے گا۔

اس میں شک نہیں کہ جوش بھی اختر کی طرح کبھی کبھی کائنات کی بعض تلخ حقیقتوں سے بحث کرتے ہیں، لیکن دونوں کے اندازِ بیان اور مقصود میں بہت فرق ہے، وہ دنیا کے سامنے منظرِ عبرت و

انتباہ پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ درس بصیرت وتحمل، ان کے یہاں غم ایک نیش ہے، ان کے یہاں نوش وہ اس سے احتراز کا درس دیتے ہیں، اور یہ اس کو گوارا کر لینے کا

جوش کی شاعری میں حلاوت وشیرینی زیادہ ہے۔ اور اختر کی شاعری میں وزن وگرانمایگی جوش کی شاعری ایک ایسا حسن صبیح ہے جو اول اول تو آنکھوں کو خیرہ کرکے دل کو ضرور بے چین بنا جاتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کا اثر زائل بھی ہو جاتا ہے، لیکن اختر کی شاعری ایک حسن ملیح ہے جس کا اثر اول اول تو زیادہ محسوس نہیں ہوتا لیکن بعد کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو ایک تیر تھا جو دل میں ترازو ہو گیا ہے اور جس کا نکالنا کسی طرح گوارا نہیں۔ علاوہ اس کے فن کے لحاظ سے بھی اختر کا مرتبہ بلند تر ہے، کیونکہ جوش کے یہاں نہ صرف معانی وبیان اور عروض وقافیہ کی غلطیاں پائی جاتی ہیں، بلکہ الفاظ وتراکیب کے نادرست استعمال کی بھی۔ اختر کے کلام میں ایسی غلطیاں شاذ نکلیں گی۔ عدم توازن دونوں کے کلام میں کہیں کہیں پایا جاتا ہے مگر فرق یہ ہے کہ اختر کے یہاں یہ عیب صرف الفاظ تک محدود رہتا ہے۔ اور جوش کے یہاں کبھی کبھی مصرعوں تک پہونچ جاتا ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ علم ومطالعہ کے لحاظ سے بھی اختر کی نظر بہ نسبت جوش کے زیادہ وسیع ہے۔

بہر حال میرے نزدیک اس وقت بھی اختر، جوش سے بہتر شاعر ہیں اور اگر مستقبل میں اختر نے ترقی کرکے اس ثقل کو بھی دور کر دیا جو کبھی کبھی ناگوار حد تک ان کے کلام میں پایا جاتا ہے تو میں یہ کہونگا کہ وہ اپنے رنگ میں ہندوستان کا ایک ہی شاعر ہوگا اور اس کا مثل پیدا کرنے کے لئے زمین کو حنا جانے کتنے جگر اور کھانا پڑیں گے۔

یہاں تک تو میں نے ایک عمومی تبصرہ کرکے دونوں کی شاعری کا فرق ظاہر کر دیا، لیکن اسی کے ساتھ ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ میں دونوں کے کلام سے اقتباس پیش کرکے اپنے دعوے کا ثبوت بھی فراہم کروں ——— سو اس کو میں کسی آئندہ اشاعت پر ملتوی رکھتا ہوں تاکہ لکھنؤ ہو کر بہ اطمینان سے ان دونوں کا کلام سامنے رکھنے کے بعد اس خدمت کو انجام دوں۔ تاہم تمہیداً جوش کی خامیوں کی چند مثالیں جو اس وقت مجھے زبانی یاد ہیں پیش کئے دیتا ہوں۔

ان کی ایک نظم محشرستان کانپور کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے :-

اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے، بدگماں

اے جبین ارض کے داغ، اے دنی ہندوستاں

دوسرا شعر اس کا یہ ہے :-

تجھ کو عورت نے جنا ہے جھوٹ ہے یہ ادلیں
آدمی کی نسل سے اور تو، نہیں ہرگز نہیں

پہلے شعر میں سرزمین ہندوستان سے خطاب ہے جسے جبین ارض کا داغ کہکر اور زیادہ موثق کر دیا گیا ہے، لیکن دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ "تجھکو عورت نے جنا ہے" درانحالیکہ ہندوستان کی سرزمین کو عورت نے کبھی نہیں جنا اور نہ وہ آدمی کی نسل سے ہے۔ یہ نقصِ معانی وبیان کا ہے۔ علاوہ اس کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ اولیں کا غیر ضروری استعمال کسی سے مخفی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ محض نہیں کا ہم قافیہ لانے کے لئے یہ آخریں کوشش کی گئی ہے۔

ایک شعر ہے :۔

تیری جانب اُٹھ رہی ہے دیکھ دوزخ کی نگاہ
سبحہ وزنار میں جکڑے ہوئے دیو سیاہ

دوسرے مصرعہ میں دیو سیاہ منادیٰ واقع ہوا ہے اور حرف ندا کہیں نہیں لایا گیا، درآنحالیکہ نن کی رو سے ایسی صورت میں کہ مصرعہ کا اکثر حصہ منادیٰ کی صفت واقع ہو حرفِ ندا لانا بالکل لازم ہے تاکہ ذہن سامع مشوش نہ ہو۔

اور ایک شعر ہے :۔

تیغ بُراں اور عورت کا گلا کیوں بدصفات
چھوٹ جائیں تیری نبضیں، ٹوٹ جائیں تیرے ہاتھ

دوسرے مصرعہ میں جو بددعا دی گئی ہے وہ غالباً اسی عورت کی طرف سے دی گئی ہے۔ جس کا گلا تیغ بُراں کے نذر ہوا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایسی پُرجوش نظم میں یہ نسائی قسم کی ضعیف و کمزور بددعا کیسی۔

ایک شعر یہ ہے :۔

کہنیوں سے یہ تری کیا ٹپکتا ہے لہو
یہ تو ہے اے سنگدل بچوں کا خونِ مشکبو

پہلے مصرعہ میں لفظ لہو بالکل بیکار ہے اور زور بیان کو ضعیف کرنے والا۔ اگر پہلے مصرعہ میں بغیر کسی تخصیص و تعین کے صرف استفسار ہوتا اور دوسرے مصرعہ میں تنکیری حیثیت سے اس کا جواب دیدیا جاتا تو شعر بہت بلند ہوجاتا۔ نثر میں ہم اس مفہوم کو یوں ادا کریں گے کہ :۔ یہ تیری کہنیوں سے کیا ٹپکتا ہے،

اے سنگدل سچ بتا یہ بچوں کا خون تو نہیں؟

ایک جگہ فرماتے ہیں :-

مرد ہے تو اس سے لڑ پہلے جو مارے پھر لڑے
تونے بچوں کو چباڈالا خدا غارت کرے

پہلے مصرعہ میں اخیر کے دو لفظ (پھر لڑے) بالکل بیکار ہیں، مفہوم بغیر ان کے پورا ہوجاتا ہے دوسرے مصرعہ میں "خدا غارت کرے" بھی وہی نسائیت لئے ہوئے ہے۔

ایک شعر ہے :-

دل میں کھوٹاپن، ارادوں میں بدی نیت خراب
اسپہ بدباطن یہ عالم اور آزادی کے خواب

یہ عالم کا اشارہ کس طرف ہے شعر سے متبادر نہیں۔ مفہوم بغیر اس کے اس طرح پورا ہوجاتا ہے کہ اسپہ بدباطن یہ آزادی کے خواب!"

جوش نے ایک نظم خاتون ہند کے عنوان سے لکھی تھی جس کا پہلا شعر ہے :-

سن اے خاتون ہندی انجمن سے کیا تجھے نسبت
کہ زیبا ہے تجھے تو خلوت اخلاق کی مسند

پہلے مصرعہ میں لفظ انجمن استعمال کیا گیا ہے جو مادی منظر کی چیز ہے اور مصرعہ ثانی میں مقابلتاً خلوت اخلاق کہا گیا ہے جو بالکل غیر مادی چیز ہے۔ انجمن کے مقابلہ میں صرف خلوت کہا جاسکتا تھا مگر محض مصرعہ پورا کرنے کے لئے لفظ اخلاق لایا گیا۔ علاوہ اس کے خلوت اخلاق یوں بھی بالکل مہمل فقرہ ہے۔ اگر اخلاق خلوت ہوتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ اس قسم کی غلط ترکیبیں جوش کے یہاں بہت نظر آتی ہیں۔ اسی نظم کا دوسرا شعر ہے :-

تری رعنائیوں پر حق نہیں بزم شبستاں کا
ترے عشووں کا مرکز ہے حیا و شرم کا گنبد

لفظ گنبد کو مسند کا ہم قافیہ استعمال کیا گیا ہے۔ درانحالیکہ صحیح تلفظ اس کا گنبد (بہ ضم با) ہے علاوہ اس کے بزم کے بعد شبستاں کی تخصیص بھی لغو ہے۔ اگر کوئی بزم دن میں منعقد ہو تو کیا عورت کی رعنائیوں پر اس کا حق ثابت ہوجائے گا!

ایک نظم میں اپنی شریک زندگی سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

کیوں نہیں روتی کہ دنیا دام میں آئی ہوئی
زر کے پیچھے دوڑتی پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

لفظ دام کے معنے جال کے ہیں اور مجازاً اس کا استعمال مکروفریب کے محل پر بھی ہوتا ہے، لیکن اصول معانی وبیان کے لحاظ سے مجازی معنی میں ایک لفظ ہمیشہ اس وقت استعمال کیا جائے گا جب اس کے بعد کوئی لفظ یا فقرہ ایسا نہ ہو جو لفظ کے اصل مفہوم کے متناقض ہو۔ درانحالیکہ یہاں دوسرے مصرعہ میں دوڑتی پھرتی کا فقرہ استعمال کیا گیا ہے جو دام کے اصلی معنی کے متناقض ہے۔ دام (جال) میں آنے کے بعد "دوڑتے پھرنا" کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

اسی نظم کا ایک شعر ہے :-

کیوں نہیں روتی کہ جنکے رخ پہ تھا رعب وقار
آج ان لڑکوں کی سج دھج دیکھ کر آتا ہے پیار

ظاہر ہے کہ جن کے رخ پر رعب وقار تھا وہ لڑکے اور تھے اور جن کی سج دھج پر پیار آتا ہے وہ اور ہیں پھر دونوں کو ایک کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اگر "ان کے لڑکوں کی سج دھج" کہا جاتا تو بیشک درست ہو سکتا تھا۔ افسوس ہے کہ اس وقت میرے سامنے جوش کی ایک بھی مکمل نظم موجود نہیں ورنہ ممکن تھا کہ میں کچھ مثالیں اور پیش کر سکتا۔

بہرحال میں اس بحث کو صحبت آئندہ پر موقوف رکھتے ہوئے، جوش صاحب سے عرض کرونگا کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے ان کی تنقیص مراد نہیں ہے۔ اُن کی شاعری کی بعض خصوصیات کا میں بیحد معترف ہوں اور میں اُن کو بھی کسی وقت دنیا کے سامنے پیش کروں گا۔

جنوری ۳۳ء کا نگار

وقف ہوگا صرف حضرت نیاز کے ملاحظات کے لئے کتاب شہوانیات علیحدہ طبع ہو رہی ہے اور ناظرین نگار کو بہت معمولی قیمت پر دیجائے گی۔
غیر خریداران نگار علاوہ محصول عہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔

مینیجر نگار لکھنؤ

دکھایا جاتا۔ تو اعتراض کی کوئی صورت پیدا ہوتی۔
مجیب کا یہ جواب کہ کیا الفاظ نظم محدود ہیں۔ یا یہ کوئی غریب اور غیر فصیح لفظ ہے۔ ناواقفی فن کا پتہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی شعرا کا کلام انھیں کے دوسرے کلام سے مل جاتا ہے اور مضمون کر بندھ جاتا ہے۔ محققین کے نزدیک اس کا کچھ مضائقہ نہیں اور اس کو اصطلاح شعرا میں تمغا کہتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ وہ مضمون مبتذل ہو جاتا ہے۔ شعرائے فارس میں سے مرزا صائب کے کلام میں اور شعرائے ریختہ میں سے میر تقی میر کے یہاں تکرار مضامین بہت پائی جاتی ہے۔
میرے نزدیک ایک مضمون کو طرح طرح سے کہنا کوئی عیب نہیں۔ بلکہ قوت نظم اور تخیل کے غیر محدود ہونے کا اسی سے پتہ چلتا ہے۔ اور اگر ایک ہی مضمون کو صرف بعض الفاظ کے تغیر سے بار بار کہا جائے تو وہ یقینی ابتذال ہے۔ اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

صبا۔ یہ ہم جلیس یہ ہمدم بزم ہستی تک لحد میں کوئی کسی کا شریک حال نہیں

اعتراض ہم جلیس غلط ہے سند چاہیے۔

جواب۔ یہ غلط العام ہے اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں

(مولف) یہ جواب غلط ہے۔ جلیس کے معنے خود ہم نشین اور مصاحب کے ہیں۔ غلط العام ہمیشہ قابل استعمال نہیں ہوتا۔ اگر کسی نے استعمال کیا ہے تو فصحا کے نزدیک وہ غلط ہی رہیگا۔ البتہ وہ الفاظ جنھوں نے ہند کی صورت اختیار کر لی ہے ضرور قابل استعمال ہیں خواہ وہ اصل زبان میں درست ہوں یا نہوں غلط العام کے جواز کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص نقل کے طور پر اپنی عبارت یا شعر میں لائے تو وہ صحیح ہے یا جیسا کہ مرزا غالب کے اس شعر میں کہا گیا ہے۔

ع دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہوگئے عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

صاحب بفتح حائے حطی ہائے غیرہ کا ہم قافیہ واقع ہوا ہے۔ مگر لفظ در اصل بکسر حائے حطی ہے۔ اس لئے اگر اس کو صحیح استعمال کریں گے تو اختلاف روی واقع ہوگا۔ لہذا یہ جواب دیا گیا ہے کہ صاحب غلط ضرور ہے مگر چونکہ یہاں مرزا صاحب دوسرے آدمی کی زبان سے یہ کہلا رہے ہیں اس واسطے اس کی زبان مانی جائیگی اور یہی اس کے جواز کی دلیل ہوگی۔

ع۔ مستفاد از بحر الفصاحت

صبا۔ ہوئی اس قدر مجھکو منظور دید — رُخ یار کا مردمک تل ہوئے

اعتراض ۔ مصرع دوم کی کیا خوب ترکیب ہے سبحان اللہ

جواب ۔ ہم ایسی تعریف کو پسند نہیں کرتے ۔ ہجو و تحسین ناشناس قابل اعتبار نہیں ۔ کوئی فصیح لکھنؤ اگر سبحان اللہ کہے تو البتہ جواب دینے کے لائق ہے

(مولف) نہایت مہمل جواب ہے جس میں تعصب کے سوائے کچھ بھی نہیں ۔ تحقیق یہ ہے کہ اعتراض بالکل صحیح ہے ۔ دوسرے مصرع کی تعقید نے بندش کو مہمل کر دیا ۔

صبا۔ عشق یوسف نے یہ کی خانہ خرابی برپا — ٹھوکریں کھاتی زلیخا سر بازار پھری

اعتراض ۔ خانہ خرابی برپا کرنا کہاں کا محاورہ ہے سند لائیے ۔

جواب ۔ خانہ خرابی برپا کرنا لکھنؤ کا محاورہ ہے اور یہی شعر مستند ہے اہل زبان سے محاورہ کی نسبت زباندان کا سند مانگنا یعنی چہ

(مولف) خانہ خرابی برپا کرنا غلط اور قطعاً غلط ہے ۔ شاید مرزا غالب کا شعر اس جواب کی تردید کے لئے کافی ہو جائے ؎

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا — غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھپر ہوا

اگر خانہ خرابی برپا کرنا ہی محاورہ ہے تو مرزا کا یہ شعر غلط ہونا چاہئے ۔ واقعہ یہ ہے کہ خانہ خرابی میں یائے مصدری ہے ۔ جو برپا کرنے کی ضرورت کو پوری کر رہی ہے پھر اس کے غلط نہونے کی کونسی وجہ ہے اور خانہ جنگی برپا کرنا ۔ خانہ پُری پوری کرنا ۔ خانہ بربادی قائم کرنا وغیرہ کی غلطی کا کیا سبب ہے ۔

رہا یہ جواب کہ اہل زبان سے زباندان کو سند مانگنے کا کیا حق ہے ایک تعصب آمیز جواب ہے جسے عقل کسی طرح قبول نہیں کرتی ۔ اس لحاظ سے کوئی اہل زبان اگر غلط کہے تو اسپر کسی کو اعتراض کرنے کی گنجائش نرہے گی ۔

صبا۔ موجد گلشن ہے تاثیر بیان عندلیب — ہے لڑے نخل گل نوک زبان عندلیب

اعتراض ۔ "تاثیر بیان عندلیب" موجد گلشن کیونکر ہو سکتی ہے ۔ لفظ موجد سے مصرع اول مہمل ہو گیا

جواب ۔ سامعین کے دلوں کا باغ باغ کرنا تاثیر بیانِ عندلیب کا کام ہے یہ صفت تاثیر بیان بلبل کی غیر معتبر نہیں مسلّم عام ہے یہی گلشن کی ایجاد ہے ۔ مگر اسباب کو وہی سمجھے گا جسے علم بیان کچھ یاد ہے

(مولف) اعتراض بالکل صحیح ہے جواب میں۔ جو معنے بیان کئے گئے ہیں وہ صرف غلط ہی نہیں بلکہ مضحک بھی ہیں۔ ایجاد عربی کا لغت ہے۔ اس کے معنے نئی چیز بنانے اور پیدا کرنے کے ہیں سحر کا یہ شعر اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے ؎

اے سحر تم نے بہت شعر بنا کر کے کہا قوت آخذہ کے حصہ میں ایجاد آیا

یا ؎ اوس ستم ایجاد نے طرز ستم ایجاد کی خاک بھی مجھ خانماں برباد کی برباد کی

اس کے بعد موجد گلشن کے معنے سمجھئے۔ غالباً ایک مہمل ترکیب ہو جائے گی۔ گلشن کی ایجاد یعنی چہ؟ کسی کا شعر ہے ؎

ثمرہ بڑا سہی مگر ای شیخ غور کر کتنا لطیف طبع تھا موجد گناہ کا

کسی شے۔ کسی فعل۔ کسی صفت۔ کسی کام کی ایجاد ہوا کرتی ہے نہ کہ انسان اور گلشن کی ایجاد۔ اسپر یہ معنی بیان کرنا کہ سامعین کے دلوں کا باغ باغ کرنا تاثیر بیان عندلیب کا کام ہے کس قدر لغو ہے شاعر کی مراد دلوں کو باغ باغ کرنے کی نہیں بلکہ وہ دوسرے مصرع میں نموئے نخل گل بھی لایا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی فغان بلبل ایجاد گلشن کرتی ہے۔ جو بالکل مہمل بات ہے

صبا۔ خط یہاں تک لکھوں اُسکو کہ کروں سبکو قلم ہاتھ لگجائے اگر دشت نیستاں مجھکو

اعتراض۔ اس شعر میں دشت کی کونسی ضرورت تھی۔

جواب۔ دشت نیستان (بہ اضافت) نہیں اصل میں دشت و نیستان ہے۔ آپ کے پاس جو دیوان ہے اس میں واؤ غلطیٔ کاتب سے رہ گیا ہوگا۔ اور مقصود مصنف یہ کہ اشجار دشت اور نیستاں کی نے سب قلم کر ڈالوں۔

(مولف) میرے پاس جو نہایت قدیم نسخہ دیوان صبا کا ہے اس میں بھی واؤ عاطفہ نہیں ہے۔

صبا۔ قرار اک دم نہیں ہے دیدۂ غم بیں میں آنسو کو نہیں آرام گہوارے میں بھی اس طفل بدخو کو

اعتراض۔ دیدۂ غم بیں کی ترکیب بھی دیدنی ہے۔

جواب۔ جس نے کچھ دیکھا نہو اس کے واسطے دیدنی ہے۔ میر ؎

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا آنکھیں تو کہیں تھیں دل غم دیدہ کہیں تھا

(مولف) میر کا جو شعر سند میں پیش کیا گیا ہے اس میں دل غم بین میں نون کا اعلان نہایت ہی بُرا

معلوم ہوتا ہے اسی وجہ سے کیا عجب ہے کہ دل غمگیں ہو۔ اور اگر میر نے اس ترکیب کا استعمال کیا ہے تو بھی میرے نزدیک یہ ترکیب نامانوس ہے۔

صبا۔ خدا کو انتہا لینی تھی ایدل جور گردوں کی ۔۔۔ دگرنہ کب عدم سے ہمسا آفت کوش آتا ہے

اعتراض۔ مصرع اول مہمل ہے۔ اگر انتہا کے بدلے امتحان کہتے تو مضائقہ نہ تھا۔

جواب۔ کسی چیز کی انتہا لینا۔ اس چیز کا اندازہ کرنا خاص اہل لکھنؤ کا محاورہ ہے اور بہت فصیح محاورہ ہے۔ یہ کیا ضرورت ہے کہ جن محاورات سے آپ ناواقف ہوں اس کا استعمال نہ کیا جائے۔

(مولف) بہت ممکن ہے کہ انتہا لینا اندازہ کرنے کے معنے میں لکھنؤ کا محاورہ اور بہت فصیح محاورہ ہو مگر میرے گوش زد نہیں ہوا تھاہ لینا۔ ایک محاورہ ہے جو ممکن ہے کہ انتہا لینا سے بگڑ کر بنا ہو یہی اب بولا جاتا ہے۔

صبا۔ سرمحفل بٹھا کر چاہنے والوں کو رلوایا ۔۔۔ نیا گانا نکالا آپ نے بیتال وبے سر کا

اعتراض۔ بے تال وبے سر کے درمیان واو عطف کیوں ہے تال لفظ ہندی ہے اور بے کا لفظ فارسی ہے۔

جواب۔ اپنے اعتراض کا تال سُر درست کیجئے۔ شعر میں حرف عطف کہیں ضرورت ہی نہیں اور نہ اصل میں ہے آپ نے کسی غلط دیوان میں دیکھا ہوگا۔

صبا۔ سرکشی پر جو وہ سرو ستم ایجاد آیا ۔۔۔ پاس آرے کے گھٹتا ہوا شمشاد آیا

اعتراض۔ گھسٹتا ہوا کی فصاحت کی تعریف کا نہ زبان کو یارا کہ بیان کرے اور نہ قلم کو توانائی کہ لکھے۔

جواب۔ بندہ پرور گھسٹتا ہوا کی عدم فصاحت پر دلیل کیا ہے۔ صرف آپ کا دعویٰ ہے جو ہرگز معتبر نہیں۔ یہ تو ہمارے واسطے ہے۔ کہ جس کو ہم کہدیں وہ فصیح ہے اور جس لفظ کو ہم غیر فصیح کہیں وہ فصیح نہیں

(مولف) گھسٹتا ہوا اگرچہ غیر فصیح نہیں ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ اس شعر میں کچھ اچھا بھی نہیں معلوم ہوتا

صبا۔ دوڑ چلنا راہ الفت میں کہاں یدل چاہئے ۔۔۔ رفتہ رفتہ چاہئے منزل بمنزل چاہئے

اعتراض۔ مصرع اول کو مصرع دوم سے کچھ ربط نہیں۔ یہ شعر مہمل ہے۔ مصنف نے اپنے زعم میں

جو معنے ٹھہرائے ہیں وہ اس ترکیب و بندش سے نہیں نکلتے

جواب - معنی شعر اور دونوں مصرعوں کا ربط تو ظاہر ہے مگر آپ زبان اُردو سے بخوبی واقف نہیں اس وجہ سے آپ سمجھ نہیں سکتے - چلنا بہ فعل آخر دوم سے محذوف ہے - اور معنے یہ کہ ایدل راہ الفت میں دوڑ کر چلنا نہ چاہیئے - بلکہ آہستہ آہستہ اور منزل بمنزل چلنا چاہیئے

(مولف) اعتراض درست ہے - رفتہ رفتہ دوڑ چلنا کوئی معنی نہیں رکھتا - راہ الفت میں دوڑنا منزل بمنزل چاہیئے یہ بھی ایسا ہی ہے - چلنا محذوف بتایا گیا ہے اس کا ذکر کہاں ہے

صبا - پئے گلگشت جو وہ طفل دبستاں ہو جائے   بوستاں دفتر اوراق پریشاں ہو جائے

اعتراض - "پئے گلگشت ہو جائے" بھی نیا محاورہ ہے

جواب - اگر نیا محاورہ ہے تو کیا قباحت ہے یہ بھی تو اہل زبان ہی کا محاورہ ہے - زبان داں کو اس پر عذر کرنے کا کیا حق پہونچتا ہے -

(مولف) فاضل مجیب اہل زبان ہونے کے زعم میں غلط محاوروں کو بھی صحیح بتانا چاہتے ہیں - حالانکہ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے کہ ہر شخص کو محاورہ کی ایجاد و اختراع کا مجاز کر دیا جائے - اگر یہی ہو تو ایک طوفان بے تمیزی برپا ہو جائے - اور پھر غلط اور صحیح کی کوئی پہچان نہ رہے میرے نزدیک ہو جائے صحیح ہے -

---

صبا - صبا یہ اس کا ہے موجد وہ اس کا موجد ہے   بشر ہے غم کے لئے اور غم بشر کے لئے

اعتراض - موجد غم بشر مہمل - اور غم موجد بشر مہمل - معلوم نہیں کہ مصنف نے اپنے زعم میں موجد کے کیا معنے ٹھہرائے ہیں -

جواب - یہاں موجد سے مجازاً باعث ایجاد مراد ہے - شعر ذیل میں لفظ قاتل ملاحظہ کیجئے شعر

گفتم مرو بکوئے بتاں دل رضا نداد   آخر بخوں نشاند دلم قاتل من است

دیکھئے یہاں بھی قاتل بمعنی سبب قتل ہے -

(مولف) موجد کے متعلق ایک جگہ بحث ہو چکی ہے - اُسی طرح سے بشر موجد غم یہاں بھی مہمل اور لغو ہے - یہ مضمون مومن و غالب نے بھی کہا ہے - مگر نہایت منطقی انداز سے ملاحظہ کیجئے -

غالب - قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن ۔ چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

ان دونوں شعروں میں بھی انسان کی زندگی کا سبب غم کو بتایا گیا ہے۔ مگر نہایت عمدہ طریق سے جس پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔

صبا۔ گھر چھٹے شہر چھٹے سارا زمانہ چھوٹے ایک وہ منتخب و چیدہ و مفرد ملجا ہے

اعتراض۔ مفرد کی بھی فصاحت دیدنی ہے۔

جواب۔ مفرد کی فصاحت میں بجز آپ کے کوئی شاعر نہ عذر کرے گا۔

(مولف) فرد کے معنے میں مفرد استعمال کیا ہے۔ میرے خیال میں مفرد مرکب کے مقابلہ پر مستعمل ہوتا ہے کسی کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے فن میں فرد ہے۔ مگر یہ نہ کہیں گے کہ وہ اپنے فن میں مفرد ہے۔ اگرچہ معنا دونوں ایک ہیں۔ مگر لغت اور قواعد کا دخل زبان اور محاورات میں نہیں ہو سکتا۔ اگر مفرد اس جگہ صحیح ہے۔ تو مجرد بھی صحیح ہونا چاہئے۔ اسی میں کیا عیب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مفرد اور فرد کے معنوں میں بڑا فرق ہے۔

صبا۔ صبا نہیں ہیں ایک طرح سب طرح روشن دل اندھیرا رہتا ہے پائے چراغ کے نزدیک

اعتراض۔ اس شعر کی ترکیب نہایت معقول ہے۔ پائے چراغ کے نزدیک اندھیرا رہنا عمدہ اور ایک طرح کا لفظ بھی قابل دید ہے۔

جواب۔ ترکیب شعر معقول تو ہے مگر معقول کے نزدیک اور پائے چراغ کے نزدیک اندھیرا رہنا بھی کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تو ایک بدیہی امر ہے۔ جس کو خدا نے بصارت دی ہے وہ روز دیکھتا ہے اور وہ لفظ کون ہے جو ایک طرح کا قابل دید ہے۔

(مولف) اعتراض صحیح ہے۔ اول تو محاورہ میں تصرف ہے۔ کیونکہ محاورہ یہ ہے۔ چراغ تلے اندھیرا یا دیے کے نیچے اندھیرا۔ اس کو پائے چراغ کے نزدیک اندھیرا کہنا فصیح نہیں ہے۔

صبا۔ مجھ سے نہ تم ملو جو محبت ہے زر کے ساتھ ممکن نہیں صفائی دل اس کدر کے ساتھ

اعتراض۔ لفظ دل بھی کس صفائی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

جواب۔ صفائی میں تو کچھ نقصان نہیں آپ کا دل ہی کچھ مکدر ہے۔

(مولف) یہ اعتراض کہ سقائی غلط ہے غلط ہے۔ مگر اس میں لفظ کذ بفتحتین واقع ہوا ہے جو اگرچہ درست ہے۔ مگر پھر بھی نہایت ہی ثقیل اور برا معلوم ہوتا ہے۔

صبا۔ مثل دیوانہ بہت شاہد آبی کف لائے وہ پری سیر کو جب دم لب دریا آیا
اعتراض۔ نہیں معلوم شاہد آبی کس جانور کا نام ہے اگر گومتی میں کوئی جانور آبی پیدا ہوتا ہو اور اس کو شاہد آبی کہتے ہوں تو کچھ گفتگو نہیں۔ اگر شاہد کے بدلے مردم آبی کہتے تو شعر درست ہو جاتا۔
جواب۔ مردم آبی کو اگر شاہد آبی کہا تو کیا بیجا کیا۔ اور آپ اپنے مقام سکونت سے تعجب ہے کہ واقف نہیں۔ گومتی چھوٹا سا دریا ہے۔ اس میں یہ جانور کہاں۔ دریائے شور کے ساحل پر یہ اکثر دکھائی دیتے ہیں۔

(مولف) مردم آبی۔ ایک جانور ہوتا ہے جو صورتاً انسان سے مشابہ ہے مگر صبا نے اُن میں بھی عاشقی معشوقی کا جھگڑا پھیلا دیا۔

صبا۔ کس یاس سے کہتا ہوں میں افسوس دم رخصت تو جاؤ تم اللہ نگہدار تمھارا
اعتراض۔ اللہ نگہدار تمھارا کیا فصیح محاورہ ہے۔ نگہدار کی جگہ نگہبان کہا ہوتا۔ مگر کیا کیجے ضرورت قافیہ نے مجبور کیا۔ استادی کے یہی معنے ہیں اول میں یاس کا لفظ بھی چسپاں نہیں۔
جواب۔ واقعی ضرورت ایسی ہی چیز ہے۔ اس زمانے کے بعض شاعر اسی ضرورت کی وجہ سے سرقہ کی ذلت گوارا کرتے ہیں۔ بعض نے فہرست شعرا میں نام لکھانے کی وجہ سے دفتر کے دفتر ترجمہ کر لئے بعض کو ضرورت نے ایسا مجبور کیا کہ انھوں نے کلام مشاہیر پر اعتراضات بیجا کیے۔ تاکہ وہ بھی پانچویں سواروں میں گنے جائیں۔ مگر شعر صبا سے تو میرے نزدیک مجبوری ظاہر نہیں اس واسطے کہ نگہدار اردو کیا فارسی میں بھی فصیح ہے۔ اور وہاں کے فصحا ہمیشہ سے اس لفظ کا استعمال کرتے چلے آئے ہیں مثنوی بزم وصال حال میں عجم سے آئی ہے اور انگریزوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں شایع ہوئی ہے اُسے دیکھئے ؎ کہ

یارب علی را نگہدار باش بہر کاوش از لطف خود یار باش

یہ شعر اسی مثنوی کا ہے۔ اور سعدی نے بوستان میں فرمایا ہے ؎

جہانت بکام و فلک یار باد جہان آفرینت نگہدار باد

جب آپ نے سیر بوستان سعدی بھی نہیں کی تو بزم وصال تک رسائی کجا - اور یاس کی نسبت بھی آپ کا عذر لنگ ہے اس کے چسپاں ہونے کی وجہ بیان کرنی چاہیئے تھی -

(مولف) معترض کا اعتراض تشدید پر اس کے صحیح اور غلط ہونے کے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ صبا نے جس جگہ اس کو صرف کیا ہے وہاں یہ فصیح نہیں ہے - اور یہ صحیح ہے کہ صرف ضرورت قافیہ سے مجبور ہو کر یہ لکھا گیا ہے ورنہ شاید ہرگز نہ لکھا جاتا -

---

صبا - نقد دل ہائے چرا کر بت پُرفن کیسا — چپکے بیٹھا ہے جھکائے ہوئے گردن کیسا

" دیکھکر رنگیں ترا رخسار قیصر باغ میں — گل سے بلبل ہوگئی بیزار قیصر باغ میں

" دیتے ہیں جان ہم لب لعلین یار پر — یاقوت کا تمام بنے گا مزار سرخ

اعتراض - اشعار مندرجۂ بالا میں مطلعوں کی ایک ردیف اور غیر مطلع کی ردیف بیکار ہے -

جواب - مطلع اول میں ردیفیں مختلف المعنی ہیں - اول کے معنے کس عیاری سے اور دوم کے معنے کس بھولے پن سے ہیں - کوئی ردیف بیکار نہیں - شعر دوم میں ایک جگہ قیصر خطاب ہے اور دوسری جگہ قیصر باغ نام مکان - شعر سوم میں بھی ردیفیں بیکار نہیں اس واسطے کہ یواقیت مختلف الالوان ہوتے ہیں اس وجہ سے رنگ کی تصریح کی گئی - ردیف بیکار کی مثال یہ ہے ؎

ناسخ - زمزمہ سنجی مری سن لے جو اے آئینہ رو — جائے طوطی باغ میں مرغ خوش الحاں سبز ہو

یہاں سبز ہو برائے بیت ہے - یہاں سبز ہونے کے معنے ہی کیا ہیں - اگر کہئے فارسی اصطلاح سبز شدن کا ترجمہ ہے - تاہم یہاں بے معنی ہے -

(مولف) میرے نزدیک پہلے دونوں مطلعوں میں ردیف بیکار ہے ؎ نقد دل ہائے چرا کر بت پرفن کیسا - میں کیسا کے معنے جیسا کہ بیان کئے ہیں ہرگز بھولے پن یا عیاری کے نہیں ہیں ------ قیصر باغ میں جو ایک جگہ قیصر کو مخاطب ٹھہرایا ہے - یہ تاویل اگرچہ صحیح ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ قیصر کیا شاعر کے معشوق کا نام تھا - یا بادشاہ اودھ واجد علی شاہ کے متعلق یہ ارشاد ہوا ہے - اور کیا واجد علی شاہ پر صبا جان دیتے تھے -

یواقیت کے مختلف الالوان ہونے کا دعویٰ صحیح - مگر دیکھنا یہ چاہیے کہ شاعر مزار کی صفت میں سرخ لایا ہے نہ کہ یاقوت کے لئے - اگر کھینچ تان کر اس کو مان بھی لیا جائے تو بھی زبردست تعقید کا الزام اسپر قائم رہے گا -

---

صفیؔ[1] و یاسؔ عظیم آبادی

صفیؔ - منھ میں کف ہاتھ پہ سر پاؤں میں زنجیر بہار
در زنداں میں کھنچی یوں مری تصویر بہار

اعتراض یاسؔ - منھ میں کف اور ہاتھ پہ سر ہے۔ نہ معلوم کس کا سر ہاتھ پر ہے۔ کیونکہ اگر اپنا ہی سر بُریدہ ہاتھ میں ہے۔ تو پھر کف کس منھ میں ہے۔ تن پر تو سر باقی نہ رہا اور اگر اسی سر بُریدہ کے دہن کف آلود کی طرف اشارہ ہے تو سبحان اللہ پھر نہ معلوم پاؤں میں زنجیر بہار کیسی۔ اول تو یہ تصویر ہی سر سے پاؤں تک منھ میں کف۔ ہاتھ پہ سر۔ پاؤں میں زنجیر بہار۔ مضحک ہے۔ دوم یہ نہیں معلوم تصویر کھنچی کس کی تصویر بہار کھنچی یا تصویر قائل۔ کیونکہ ایک لفظ تصویر کی اضافت دو دو طرف یعنی (مری) اور (بہار) سوائے مہمل ہونے کے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مری تصویر کے ساتھ ردیف بالکل بیکار ہے۔ مگر ان حضرات نزدیک ردیف محض ایک بیکار شے ہے۔ شعر سے کوئی معنوی تعلق ہونا ضرور نہیں۔ گویا اک سخن تکیہ ہے کہ اثنائے کلام میں جا و بیجا ٹھونس دیا جاتا ہے۔

(مولف) معترض نے سمجھا ہے کہ سر بریدہ ہے اس لئے کہ ہاتھ میں ہونا بیان کیا ہے مگر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ سر کو بحالت زندگی ہاتھ پر رکھ لیا جائے یہی مصنف کا مطلب ہے مری تصویر بہار سے مراد یہ ہے کہ میری وہ تصویر جو بہار میں کھنچی اس لحاظ سے ردیف بیکار نہیں۔ مضمون شعر یقینی مضحک ہے

صفیؔ - سنگ مدفن کو مرے غور سے دیکھا کس نے
خاک میں دوڑ گئے ریشۂ تاثیر بہار

---

[1] صفی کا نام سید علی نقی ہے۔ نہایت کہنہ مشق پُرگو۔ وسیع النظر استاد ہیں آپ کی عمر اب تقریباً ستر بہتر برس کی ہو گی۔ مگر مشق سخن جاری رہتی ہے۔ اور اب بھی لوگوں کے اصرار سے مشاعروں میں شرکت کر لیتے ہیں۔ پہلے شاید منصفی میں پیشکار تھے۔ اب عرصہ سے پنشن لیکر خانہ نشین ہیں۔ مولانا صفی کی شاعری لکھنؤ کے اختراعی جدید رنگ کی شاعری ہے۔ آپ ہی ایسے حضرات ہیں جنھوں نے لکھنؤ کے اس رنگ کلام کو جو ناسخ کے وقت سے بگڑا ہوا تھا درد و تاثر کی چاشنی دیکر درست کیا۔ ہر چند کہ اس رنگ میں مرثیت کا شمول بہت زیادہ ہو گیا۔ تاہم اس قدیم غزل گوئی کے رنگ اور قافیہ پیمائی سے بہت بہتر ہے۔

آپ کی بعض نظموں کا مجموعہ مرتب ہو کر شائع ہو گیا۔ ایک مثنوی بھی چھپی ہے جو اخلاقی رنگ میں بہت خوب ہے دیوان ہنوز طبع نہیں ہوا۔

[redacted]

اعتراض یاس - وہی مثل ہے کہ راجا دیکھا رانی دیکھی - حلق میں ککڑی کبھی نہ دیکھی شاید جناب صفی نے کوئی خورد بین ایجاد کی ہے جس سے ریشۂ تاثیر بہار کو بہت غور سے معائنہ فرمایا ہے - ورنہ آج تک ریشۂ تاثیرِ بہار کسی نے دیکھے نہ سنے - اینجا دبندہ اگرچہ گندہ - سنگ مدفن کو کسی نے غور سے دیکھا اور خاک میں ریشۂ تاثیر دوڑ گئے - آخر اس کا حاصل کیا ہوا -

(مولف) میرے خیال میں شاعر کا مقصد یہ ہے کہ میرے سنگ مزار کو کس نے غور سے دیکھا کہ اس کے دیکھنے کی تاثیر سے میری خاک مزار میں بہار کی تاثیر پیدا ہوگئی - رہا یہ سوال کہ جو الفاظ لائے گئے ہیں وہ اس مقصد کے اظہار کے واسطے کافی ہیں یا نہیں - اس کا جواب نفی میں ہے - میرے نزدیک شعر کا حاصل اچھا نہیں ہے اور معترض کا اعتراض صحیح ہے - اگر اس قدر تاویلوں کے بعد کوئی مطلب پیدا بھی ہو - تو وہ کوہ کندن کاہ برآوردن سے زیادہ نہیں ہے -

---

مرزا طاہر وحید قزوینی[۱] و آزاد بلگرامی

طاہر وحید - شاعراں جان از برای شعر فہماں می کنند
دختر ہر کس وجیہ افتاد مفت شوہر است

اعتراض - اس شعر میں وحید نے عجب بات لکھی ہے - اس قسم کے مضمون چاہے کسی قدر بلند کیوں نہ ہوں مگر ہرگز نہ لکھنا چاہئیں - عمق بخاری کو دیکھئے اپنے آپ کو کس سے تشبیہ دیتا ہے -

بخاری - بخون من شدہ مژگان او حریص چنان
کہ شیعیان حسینؑ علی بخون یزید

شیخ شیراز - بزیر بار تو سعدی چو خر بہ گِل درماند
دلت نسوخت کہ بیچارہ زیر بار من است

عرفی - شاہد عصمت تلاش صحبت من کے کند
خون حیض دختر رز جوشد از لبہای من

ملا ملک قمی - تا چند بو الفضول زندلان دوستی
داد ادب وحید و ملک را کتک زنید

---

[۱] مرزا طاہر وحید شاہ عباس ثانی کے دفتر میں جو ۱۰۵۲ھ ہجری میں تخت نشین ہوا خدمت توجیہ نویسی پر مامور تھا عہد شاہ سلیمان میں ترقی کرتے کرتے مسند وزارت پر جلوہ افروز ہوا اور سلطان حسین مرزا کے عہد میں جو ۱۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا مورد عتاب شاہی ہو کر مارا گیا - دو کتابیں ایک مثنوی ناز و نیاز اور ایک مخزنِ اسرار کی مقابل اس سے یادگار ہیں - اس کا دیوان قریب تیس ہزار شعروں کا ہے - مولانا آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں انتخاب کرتے ہوئے اس کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے -

نعمتخان عالی۔ بیا کہ شیشۂ مے در سجود جام شدہ است　　ببیں کہ خانۂ ما مسجد الحرام شدہ ہست

(مولف) مینے شاید کسی دوسری جگہ بھی یہ بحث لکھی ہے۔ مگر یاد نہیں کہ کس جگہ۔ بہر صورت یہاں دوبارہ لکھنا بیکار ہے مگر یہ اظہار کرنا ضروری ہے کہ وہ اشعار جن کے الفاظ میں ذم کے پہلو پیدا ہوجائیں خواہ وہ کوئی معنے دیتے ہوں نظر انداز کردینا چاہئیں۔ یا ایسی تشبیہیں جو رکیک ہوں اُن کی طرف توجہ نہ کرنا چاہئے۔

مولانا آزاد نے طاہر وحید کا جیسا شعر پیش کیا ہے ایسا ہی دو شعر کا ایک قطعہ بنائی ہروی کا ہے جو اس نے ضرورتاً کہا تھا۔ ضرورت یہ تھی کہ بنائی نے امیر علی شیر کی مدح میں ایک قصیدہ کہا اور نذر گزرانا۔ امیر علی شیر کی داد و دہش مشہور تھی۔ مگر وقت کی بات کچھ موانع ایسے تھے کہ جس قدر دینا چاہئے تھا اتنا صلہ بنائی کو نہ دے سکا۔ بنائی نے اس سے بھی زیادہ چالاکی سے کام لیا اور پورے قصیدے کو بدل بدلا کر سلطان احمد مرزا کے نام کردیا۔ سلطان احمد مرزا سلطان حسین مرزا کے ساتھیوں یا مقربین عشرہ میں سے ایک تھا۔ یہ چالاکی کرنے کے بعد دوسری زیادتی یہ کی کہ امیر علی شیر کے پاس ایک قطعہ لکھکر بھیجا وہ یہ ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو پہلے شعر میں جو چوٹ بڑی ہے اس کو دوسرے شعر میں اس صفائی سے بچایا گیا ہے کہ کسی اعتراض کے بجائے اور تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر پہلا شعر بالکل ایسا ہی ہے جیسا شعر طاہر وحید کا ہے کہتا ہے ؎

دخترانے کہ بکر فکر من اند　　ہر یکے را بہ شوہرے دادم
آنکہ کابین ندادؔ عنّین بود　　زو کشیدم بہ دیگرے دادم

یہی بنائی ہروی ہے جس کا مندرجۂ ذیل شعر نورجہاں کے نام سے مشہور ہے ؎

ترا نہ تکمۂ لعل است در لباس حریر　　شد است قطرۂ خوں منت گریباں گیر

ظہیرؔ[۱] فاریابی و آزاد بلگرامی

ظہیر۔ چوں بر زمیں طلیعۂ شب گشت آشکار　　آفاق کرد کسوت عباسیاں شعار

---

[۱] ظہیر فاریاب کا رہنے والا اور قزل ارسلاں کا مداح تھا۔ اُس کے علاوہ بہت سے ممدوحوں کی مدحیں اس سے یادگار ہیں اس کے قصائد اتنے زبردست ہیں کہ معاصرین میں سے کوئی اس کے پلے کا نہیں وہ بعض کے نزدیک ۵۹۸ھ میں اور بعض کے نزدیک ۵۵۲ھ میں فوت ہوا اس کی ایک تشبیب پر مولانا آزاد نے بیقاعدگی کا اعتراض کیا ہے۔

ظہیر- پیدا شد از کرانۂ میدان آسماں — شکل ہلال چوں سرچوگان شہریار
" دیدم زر ریختہ بریں تخت لاجورد — نونے کہ آں بخط خفی کردہ شد نگار

اعتراض آزاد - تشبیب کے دوسرے شعر میں ہلال کی تشبیہ سرچوگان شہریار سے دی گئی ہے - مگر شہریار کا ہنوز ذکر نہیں ہے - اس صورت میں چاہئے کہ یہ گریز - مخلص ہو جائے - مگر ظہیر نے تشبیب کا سلسلہ دور تک جاری رکھا ہے - چاہئے یہ تھا کہ یہیں سے بادشاہ کے معاملہ کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا

(مولف) اعتراض کے جوابات اس صورت سے دئے جا سکتے ہیں کہ اس قسم کی مثالیں ڈھونڈھ لی جائیں اور غالب ظن یہ ہے کہ مل جائیں گی - مگر پھر بھی اعتراض قائم رہے گا - یہاں مدح موجود ہے اور ممدوح غائب اشارہ موجود مشارٌ الیہ مفقود ہے اس کا جواب کہاں سے دیا جائے -

---

ظہیر و سعدی

ظہیر- نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا — تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں زند
اعتراض سعدی - چہ حاجت کہ نہ کرسی آسماں — نہم زیر پائے قزل ارسلاں

(مولف) سعدی نے اعتراض کا جو پھندا بنایا ہے وہ مبالغہ کی راہ سے ہے اور بالکل صحیح ہے مبالغہ اگر صرف مبالغہ ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن جب وہ غلو تک پہونچ جائے تو پھر اس پر جو کوئی جتنے اعتراض کرے صحیح ہیں - میں نے کہیں دیکھا ہے کہ کسی نے متاخرین میں سے اس شعر پر یہ اصلاح دی ہے -

نہ کرسیٔ فلک نہد اندیشہ زیر پا ہ — تا بوسہ بر رکاب شہ مرسلاں زند

اس مصلح نے شاید سعدی کے اعتراض کو بے ادبی ظہیر پر مبنی سمجھا ہے اور یہ اعتراض اس صورت سے رفع کر دیا ہے - خیر اعتراض تو اڑ گیا - مگر وہ بات کہاں -

سعدی نے بھی اعتراض کیا ہے مگر سچ پوچھئے تو اس اعتراض سے اور بھی اسی طرح کو مضبوط کر لیا ہے اور اسی اعتراض سے رتبہ بڑھا لیا ہے -

---

عالی[۵۱] شیرازی و آزاد بلگرامی

---

۵۱ عالی کا نام میرزا محمد تھا مگر نعمت خاں کے نام سے مشہور ہوئے ان کے والد حکیم (ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۳)

۵ بار دیگر کد خدا شد خان عالی منزلت   باکمال عز و تمکین و قرار و زیب و زین

عتراض - نعمت خاں کا پہلا تخلص حکیم تھا۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا کہ حکیم کی تصحیف کے خیال سے عالی تخلص ختیار کیا۔ اسی لئے اگر یہ قطعہ ہجو اس تبدیلی سے پہلے کہا ہے تو خیر اتنی ہی قباحت لازم آتی ہے کہ ہر خاں جو عالی درجہ ہو اس کو کہا جا سکتا ہے۔ اور اگر تبدیل تخلص کے بعد یہ قطعہ ارشاد ہوا ہے تو خان عالی ے نام سے نعمت خاں مشہور تھے پورا قطعہ اپنے اوپر آتا ہے۔ اور وہ تمام رکیک الفاظ جو کامگار ماں کے لئے استعمال کئے ہیں سب نعمت خاں کا حصہ ہوئے جاتے ہیں۔

(مولف) اعتراض بالکل صحیح ہے۔ ہمیشہ اس قسم کے جملے یا الفاظ کسی کی ہجو وغیرہ میں کہنا چاہئیں جن کا اثر خود اپنی ہی ذات پر مترتب ہو جائے۔

لاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۲) فتح الدین ہندوستان آئے عالی ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے مگر صغر سنی ہی میں باپ کے ساتھ شیراز چلے گئے اور وہیں تعلیم پائی جب پڑھ لکھ چکے تو پھر ہندوستان آئے۔ اور ملا شفیعائے یزدی کے شاگرد ہوئے ور عالمگیر بادشاہ کے زمرۂ ملکخوار اں میں داخل ہو گئے ابھی ان کی کوئی خاص شہرت اور وقعت نہ تھی۔ جس زمانہ میں انھوں نے یدرآباد کی فتح کی تاریخ لکھکر نذر گزرانی۔ اس وقت بادشاہ کی طرف سے خلعت ملا ۱۱۰۲ھ میں نعمت خاں خطاب ملا اور ورچی خانہ کے داروغہ ہو گئے۔ اور آخر عہد عالمگیری میں مقرب خان خطاب پایا۔ اس کے ساتھ داروغہ جواہر خانہ کا عہدہ بھی ملا معظم شاہ کے زمانے میں دانشمند خاں کا خطاب پایا اور شاہنامہ لکھنے پر مامور ہوئے اس نسخہ ے لکھتے ہی لکھتے ۱۱۲۱ھ میں نسخہ حیات تمام ہوا۔ مختلف کتب جنگ نامہ حسن و عشق مضحکات وقایع وغیرہ کے علاوہ ایک یوان غزلیات بھی ان سے یادگار ہے پہلے حکیم تخلص تھا۔ گر چونکہ حکیم کبھی حکیم بھی پڑھا جا سکتا ہے لہذا یہ تخلص دل کر عالی تخلص رکھا۔

نعمت خان عالی کی ہجویں اس بلا کی ہیں کہ تیر و تلوار میں اس قدر اثر نہیں ہے جس قدر کہ ان میں ہے انہیں ہجووں سے ایک ہجو وہ تھی۔۔ جو کامگار خاں پسر دوم عمدۃ الملک نواب جعفر خاں وزیر اعظم عالمگیر کی شادی پر لکھی ہے اور وہ وہ رافات جمع کئے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اتفاق کی بات۔ چاہ کن را چاہ در پیش والا معاملہ ہوا ہے۔ پہلے ہی شعر میں ایک ایسی ٹھوکر کھائی ہے کہ پوری ہجو اپنے اوپر منطبق ہو گئی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ خود نعمت خاں عالی کے زمانہ میں کسی نے س پر خیال نہ کیا ہو مگر مولانا آزاد بلگرامی کو اس کا احساس ہوا

عاقل و مرزا فاخر مکیں

عاقل شاہجہاں آبادی عہد عالمگیری کا نہایت مشہور و معروف شاعر تھا۔ مرزا فاخر مکیں نے اس کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے۔

عاقل ۔ گواہی میدہد عالم بہ وحدت ذات بیچوں را   کہ خاصیت یکے باشد ز چندیں جز و معجوں را

اعتراض ۔ اس شعر میں ذات بیچوں کو معجون سے تشبیہ دی ہے اور اہل عالم کو اس معجون کے اجزاء میں سے شمار کیا ہے۔ ہر چند کہ معجون کے معنے آمیختہ شدہ کے بھی لئے گئے ہیں۔ مگر جس معنی میں معجون مشہور ہے اس معنے میں اس شعر سے سوء ادب کا احتمال ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسی بُری تشبیہیں استعمال کرنا اچھا نہیں ہے۔ ہاں اسوقت بُری تشبیہ کا استعمال جائز ہے کہ جب کسی قبیح شے کے واسطے استعمال کی جائے کاش یوں کہتا۔

بود آمیزشے باہم بطینت ربع مسکوں را   کہ کیفیت یکے باشد ز چندیں جز و معجوں را

اگر شعر بالخن فیہ میں عالم کو معجون قرار دیا ہے تو مصرع اولیٰ میں معنی کا ربط نہیں

جواب سودا ۔ میرے نزدیک جناب مرزا مکیں نے شعر کے معنے سمجھے ہی نہیں۔ اس شعر میں مصنف نے عالم کو اجزائے معجون سے تشبیہ دی ہے کیونکہ عالم کی خلقت بھی عناصر سے ہوئی ہے۔ اور صفت معجون کو وحدت سے تشبیہ دی ہے۔ سامنے کی بات تھی مگر مرزا صاحب قبلہ نے ذرا بھی غور و فکر سے کام نہیں لیا۔ زبردستی سوئے ادب کا اعتراض پیدا کر دیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ایک بے معنی مصرع بھی لگا دیا ہے۔

بود آمیزشے باہم بطینت ربع مسکوں را   کہ کیفیت یکے باشد بچندیں جز و معجوں را

اعتراض سودا بر مصرع فاخر مکیں ۔ ہر ذی شعور جانتا ہے کہ ربع مسکوں کے معنے چہارم حصۂ زمین کے ہیں جو آباد ہے۔ چنانچہ ریاضی داں فرقے نے جو زمین کی حقیقت بیان کی ہے اس میں ایک رُبع کو مسکون قرار دیا ہے۔ پس ایسی صورت میں قطع زمین کی باہم آمیزش کی کونسی صورت ہے۔ بلکہ اس کی طینت میں آمیزش ہر کہ سب کی ترکیب عناصر سے ہوئی ہے۔ قطعہ زمین صرف عنصر خاکی ہے۔ اور آمیزش کثرت چاہتی ہے اگرچہ اس کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ زمین بھی بسیط ہے اور اس میں بھی آمیزش موجود ہے کیونکہ کثرت اس میں موجود ہے۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ جو کثرت خیال کی جاتی ہے وہ باعث فعل و انفعال نہیں ہو سکتی جس سے اس بحث میں مراد لی جاتی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ معجون لفظ مضحک ہندوستان

کی زبان میں ہے' ایک مغل کو اس کے متعلق کیا معلوم کہ وہ اپنے شعر میں نہ لائے۔
(مولف) عاقل نے شعر کے یہ معنے لئے ہیں کہ عالم خدا کی وحدت پر گواہ ہے اگرچہ وہ مختلف چیزوں سے مل کر عالم ہوا۔ مگر پھر بھی خاصیت سب کی ایک ہی ہے سب اس کو واحد جانتے ہیں اور باوجود اس کثرت کے بھی یہی ایک قاعدہ تمام عالم میں جاری و ساری ہے۔ اور گویا اس کثرت میں بھی وحدت کی شان پیدا ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایک معجون کی سی ہے جو مختلف اجزا سے تیار کی جاتی ہے لیکن ترکیب پانے پر اس کا خاصہ اور اس کی کیفیت اور اس کا فائدہ ایک ہوتا ہے۔ مگر مرزا فاخر مکیں نے یہ معنے سمجھے ہیں کہ خدا ایک معجون مرکب ہے جو معاذ اللہ اتنے اجزائے عالم سے تیار ہوا ہے اور اب بھی اس میں وحدانیت ہے جیسے کہ تمام معجونوں کی خاصیت باوجود بہت سے اجزا سے تیار ہونے کے ایک ہی ہوتی ہے۔

انصاف یہ ہے کہ معنے تو وہی صحیح ہیں جو سودا نے بیان کئے ہیں۔ مگر فاخر کا خیال بھی درست ہے پہلے مصرع میں ایک قسم کی کھٹک ضرور ہے۔ جو بغیر غائر نگاہ ڈالنے کے دور نہیں ہوتی۔ سودا کا یہ جواب بھی صحیح ہے کہ مغل بیچارہ کیا جانے کہ ہندوستان میں معجون کے مضحک معنے کیا لئے جاتے ہیں اور کیوں لئے جاتے ہیں۔ مگر وہ الفاظ جن کے معنے ہندوستان میں بھی وہی ہیں اور ایران میں بھی وہی اُن سے البتہ احتراز ضروری ہے جیسے کہ عرفی کا یہ مصرعہ

خونِ حیضِ دختر از جوشد از لبہائے من

یا آتش کا یہ مصرع ؎

میکدے میں خونِ حیضِ دخترِ رز کا جوش ہے

دونوں جگہ خونِ حیض کے ایک معنے ہیں اب اس کو استعارے کے طور پر لا کر عرفی نے اپنے لبوں تک پہونچا دیا ہے۔ اور آتش نے میخانے میں اس خون کے دریا بہائے ہیں یہ طریقہ مذموم ہے اور اس سے ہمیشہ احتیاط ضروری ہے۔

مگر باوجود اس کے کہ سودا نے مکیں کے اعتراض کا جواب بھی دیا۔ اور ان کی اصلاح پر اعتراض بھی کیا مگر مکیں کا یہ اعتراض دفع نہیں ہوتا کہ ایسی تشبیہ دینا بُرا ہے ایسی تشبیہات کا اچھی جگہ صرف کرنا نہایت ہی خطرناک ہے۔ لکھنؤ کے اکثر شعرا کے یہاں اس قسم کی بُری تشبیہیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً چند ملاحظہ کیجئے۔

آتش:— حلقۂ دیوانگاں ہے اس پری پیکر کے ساتھ ٭ اس طرح اصحاب ہوں جس طرح پیغمبر کے ساتھ

اس میں آتش کا پیری بیکر معشوق پیغمبر ہے اور اصحاب دیوانے ہیں۔
گویا ؎

گھر ترا ہے جنت کے گلستان کی برابر　　چاؤش ہیں دروازے کے رضواں کے برابر

معشوق کے بالاخانے کو جنت کہا ہے اور معمولی نوکروں کو رضوان قرار دیا ہے رکیک تشبیہوں کی مثالیں اور ملاحظہ کیجئے۔

امانت — دیکھے اس پستاں پہ زلفوں کو تو کچھ بھی کہہ　　دودھ پینے کے لئے بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا
بحر — آسیا سی ہیں چکیاں اور پتھر چھاتیاں　　موگاس چھاتی پر دلینگی یہ ستمگر چھاتیاں
امانت — صندل اس کی ہے مانگ میں کیا خوب　　راہ ظلمات میں یہ دلدل ہے
وزیر — خط پہ خط لائے جو میرے نامہ بر　　بولے ان مرغوں کا دربا کھل گیا
جلال — آرہی زلف ہوا سے جو ترے پستاں پر　　ابر نے لے لیا آغوش میں کہساروں کو
نادر — سیاہی ایسی پر یوں عیاں ہے تیری پستان کی　　سیہ زنبور ہو جیسے نہاں نارستاں میں
امانت — خون اس کی مہاسے سے جو عارض پہ نکلا　　یاقوت کی کنی مہ کامل میں جڑی ہے
قلندر — نہیں ہے تل ترے آنکھوں کے نزدیک　　یہ بھونرا پاس بیٹھا ہے کنول کے
رسا — مہاسے اور داغ چیچک اس روئے منور پر　　لب تنگ شکر پر مور قایم ہیں شکر پیدا
برق — جھکا بار پستاں سے چلنے میں قد　　اناروں سے خم شاخ تر ہو گئی
ناسخ — غم خانہ تیرے یاد میں ہے بہ بہشت　　زہر غم فراق مزے میں ہے در بہشت

غرضکہ اس قسم کی ہزارہا تشبیہیں ہیں جو اہل لکھنؤ کے کلام میں بیشتر اور اہل دہلی کے یہاں خال خال مستعمل ہیں۔

عاقل و آزاد بلگرامی

عاقل — تا توانی تختہ بند یک مقام عاقل مباش　　خاک بر سر میکند در خانۂ آئینہ آب

اعتراض — اس میں مقام کے میم کو عاقل کے الف سے وصل کر دیا ہے اور عین گر گیا ہے اسی قسم کی خرابیاں عاقل کے کلام میں بہت سی ہیں۔

ناصر علی نے بھی ایک جگہ عین گرایا ہے۔

UNIVERSITY کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی DELHI

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

- گودڑ کا لال
- شوکت آرا بیگم حصہ اول و دوم
- " حصہ سوم
- سعیدہ کے خطوط
- پیاری سہیلی ۱۰؍
- نئی نویلی پیاری سہیلی
- عورتوں کی انشا
- انشائے نسواں ۸؍
- سیرۃ الکبریٰ
- طرز زندگی
- محذرات تیموریہ
- ازواج النبی ۱۲؍
- ازواج الانبیا
- سیرۃ عائشہ صدیقہ
- عفت المسلمات
- سبیل الجنان
- بچوں کی پرورش
- حرز اطفال
- تہذیب نسواں
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- تربیت اطفال ۱۲؍
- فرائض مادری ۱۲؍
- انشائے نادر جہاں
- اقبال دولہن
- حسن معاشرت
- ایامیٰ
- سولہ کہانیاں ۱۲؍
- سترہ کہانیاں ۱۲؍
- سولہ قصے ۸؍
- مراۃ العروس ۸؍
- بنات النعش ۸؍
- توبۃ النصوح
- کنیز فاطمہ ۸؍
- [illegible]
- نصیحت کا کرن پھول ۸؍
- برکات سلطانی ۸؍
- ابن الوقت
- چند پند ۴؍
- منتخب الحکایات ۴؍
- تندرستی
- حفظ صحت
- طبیب نسواں
- رہبر صحت ۸؍

ناول، ڈرامے اور افسانے

- قطرات اشک
- جتندر ناتھ
- بس کا روگ
- فسانۂ سعید ۸؍
- خوفناک [illegible]
- سیلاب اشک باتصویر
- بے زبان محبت
- جمال ہم نشین
- کنیز عصمت
- جوہر قدامت
- تائید غیبی ۸؍
- پر اسرار قتل
- افغان آزادی
- سرگزشت ہاجرہ ۱۰؍
- قصۂ زندگی
- قلب حزیں ۸؍
- عروس کربلا
- شہید مغرب
- ماہ عجم
- تیغ کمال
- سراب مغرب ۸؍
- منازل السائرہ کامل
- موہنی ۱۲؍
- وداع ظفر
- یاسمین شام
- طوفان اشک
- شاہین و دراج ۸؍
- درس عشق
- کرور پتی چور
- تین بندوق باز
- کرشمۂ رقابت ۸؍
- انقلاب قسطنطنیہ
- شاہد رعنا
- ڈیڈیا کی سرگذشت ۴؍
- شگوفۂ محبت
- نسوانی زندگی ۸؍
- ولایتی [illegible]
- شمع خاموش ۸؍
- شب زندگی کامل
- مودودہ ۸؍
- چندر کلا ۸؍
- گلستان خاتون
- صبح زندگی
- شام زندگی

تاریخ و سوانح عمریاں

- تاریخ مغرب
- مختصر تاریخ اسلامی
- " " حصہ ۲
- " " حصہ ۳ ۱۰؍
- " " حصہ ۴
- الصالحات
- امت کی مائیں
- الزہرا ۱۲؍
- اسوۂ حسنہ ۸؍
- ہند کے شعراء
- شعر ہند
- سوانح اکبر الہ آبادی
- سفرنامہ عراق
- تاریخ افاغنہ
- اسلام اور غیر مسلم ۸؍
- سیر المصنفین حصہ ۱
- " حصہ ۲
- تاریخ اسلام ۵ جلد
- اخبار الاندلس ۳ جلد
- خلافت موحدین
- خلافت [illegible]
- عرب اور اس کا مستقبل

لغات و ادب

- بازاری زبان ۸؍
- لغات سعیدی
- لغات کشوری
- آئینۂ تحقیق مجلد
- غیاث اللغات فارسی
- محاورات نسواں ۸؍
- جواہر اللغات ۱۲؍
- گوہر اللغات ۱۲؍
- چراغ سخن
- دکھنی لغت ۸؍
- جواہرات کلیات نظیر
- عزیز اللغات
- تذکرہ ریختی
- تاریخ اردوئے قدیم
- دکن میں اردو
- منتخب کلام ہندی
- رباعیات عمر خیام
- منتخب کلام ہندی
- اردو کے اسالیب بیان
- تصحیح الاغلاط
- فیض اردو ۵؍
- نور اللغات ۴ جلد

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز
- کلیات عراقی
- دیوان حافظ
- دیوان بیدل
- دیوان عرفی ۱۲؍
- کلیات جامی
- کلیات غالب
- کلیات صائب
- دیوان ناصر علی
- کلیات سعدی
- کلیات حزیں
- دیوان عنصری ۱۲؍
- دیوان غنی کشمیری
- دیوان ہلالی
- [illegible]
- [illegible]
- پیام مشرق
- [illegible]

دواوین اردو

- کلیات ظفر ۱۲؍
- کلیات مومن
- دیوان ناسخ
- کلیات میر
- کلیات سودا
- کلیات انشا
- کلیات نظیر اکبر آبادی
- گلزار داغ
- دیوان درد
- دیوان ذوق
- [illegible]
- مرآۃ الغیب
- صنم خانۂ عشق
- فریاد داغ
- عالم خیال باتصویر
- دیوان شہیدی ۴؍
- کلیات اکبر الہ آبادی
- تغزل [illegible]

رجسٹرڈ نمبرے ۱۱۰۲

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبرے ۱۱۰۲

تذکرہ و تاریخ

- پیغمبر اعظم
- شبِ معراج
- ایک منیر
- پیغمبر عالم
- سوانح حضرت مکمل
- سید المرسلین
- حیدر کرار
- سیرۃ الصدیق
- عمر ابن خطاب
- ابوبکر صدیق
- دخترِ اسلام
- العجیب
- عمر بن عبد العزیز
- دولت فاطمیہ
- مکمل سوانح جہانگیر
- تذکرہ اولیا
- تذکرہ اولیائے ہند
- مراۃ الکونین
- قصص الانبیا مکمل
- سفرنامہ مصر
- تلخیص التاریخ
- خاتونِ جنت
- حکایات الصوفیہ
- خواتین اسلام
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- مکاشفات مکمل

جاسوسی ناول

- خزانہ فتح پور
- محاصرۂ پیرس
- شیخ چلی
- بہرام کی واپسی
- انقلاب فرانس
- بحری قزاق
- نظرتی جاسوس
- ترکی حرم سرا
- جگر خوار ابلیس
- بہرام چور
- زر پرست
- کنجی کا راز
- عبدالرحمن ناصر
- عروس مصر
- سیلاب خون
- سیاحت زمین
- سیاحت ہوا
- نازنین عاشق
- سمندر کی سیر
- اسرار بالفوریم
- ریحانہ لیلیٰ
- ابن عرب
- حجاج بن یوسف
- یوسف پاشا
- انقلاب عثمانی
- بہرام کی رہائی
- بہرام کی آزادی
- بہرام کی گرفتاری

مراثی

- مراثی دبیر
- مراثی انیس کامل
- مراثی ضمیر
- مراثی مونس
- مراثی دلگیر

عجائب و غرائب

- عجائب المخلوقات / تصویر رنگین
- بلا تصویر سادہ
- مجمع الفنون
- طلسم فرنگ
- کارخانۂ عالم

انگریزی ناولوں کے ترجمے

- الہ دین و لیلیٰ
- فریب حسن
- سوزنِ عشق
- روزا لیمبرٹ
- ناول اسرار
- شام جوانی
- حرم سرا

ناول سجاد حسین

- احمق الذی
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

ناول جوالا پرشاد

- مرنا لنی
- مار آستین
- بنگالی دلہن
- معشوقۂ فرنگ
- پرتاپ
- روہنی

ناول سرشار

- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ مع ہزار ناول
- کامنی
- سوانح عمری عیار

ظفر عمر بی اے

- چھدوں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزمِ خیال
- مشاطۂ سخن
- مکاتیب محسن الملک

تذکرۃ الشعراء

- تذکرۂ حسینی
- گلشن بہار
- سراپائے سخن
- سوانح نظیر اکبر آبادی

ناول شرر

- جنید بغدادی
- مقدسات
- جویائے حق
- لعبت چین
- فاتح و مفتوح
- بابک خرمی
- ایام عرب
- قیس و لبنیٰ
- یوسف و نجمہ
- زوال بغداد
- حسن کا ڈاکو
- دربارِ حرام پور
- مینا بازار
- قدرس نازنین
- رومۃ الکبریٰ
- طاہرہ
- شوقین ملکہ

مولانا شبلی نعمانی

- سیرۃ النبی جلد اول
- دوم
- سوم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- رسائل شبلی
- مقدمہ سیرۃ النبی
- کلام شبلی اردو
- الکلام
- علم الکلام
- شعر العجم
- سوم
- چہارم
- پنجم

نگار بک ایجنسی

مطبوعہ نگار پریس ... لکھنؤ باہتمام ... سید نوفل حسین